تفسیر قرطبی مترجم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ۰ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیرِ قرطبی جلد چہارم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی ؒ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری ؒ

مُترجمین

مولانا ملک محمد بوستان — مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی — مولانا شوکت علی چشتی

زیرِ اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد چہارم)
مفسر	امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
	مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی
	من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیر اہتمام	ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اکتوبر 2012ء، بار اول
کمپیوٹر کوڈ	QT54

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 32630411-32212011-021۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ لَا یَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ وَ مَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعۡلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَ لَا رَطۡبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۵۹﴾

''اور اسی کے پاس ہے ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا انہیں سوائے اس کے، اور جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور سمندر میں ہے۔ اور نہیں گرتا کوئی پتا، مگر وہ جانتا ہے اس کو، اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں''۔

اس میں تین مسائل ہیں

مسئلہ نمبر 1۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے ساتھ بارہ ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفاتح الغیب خمس لا یعلمها إلا الله لا یعلم ما تغیض الأرحام الا الله ولا یعلم ما فی غد الا الله ولا یعلم متی یأتی المطر إلا الله ولا تدری نفس بأی أرض تموت إلا الله ولا یعلم متی تقوم الساعة إلا الله۔

''غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جانتا جو کچھ رحمیں چھپائے ہوئے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا اسے جو کچھ کل ہونے والا ہے سوائے اللہ کے، اور کوئی نہیں جانتا بارش کب ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نفس نہیں جانتا کون سی زمین میں اسے موت آئے گی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا قیامت کب قائم ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

اور صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت موجود ہے انہوں نے فرمایا: جس نے گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے کل میں ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل: 65) ''آپ فرمائیے: (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

مَفَاتِحُ مفتح کی جمع ہے، اس میں لغت فصیحہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مفتاح کی جمع ہے اور اس کی جمع مفاتیح آتی ہے اور یہ ابن سمیقع کی قرأت ہے۔ مفاتیح اور مفتح ہر اس شئ سے عبارت ہے جو کسی بند شئ کو کھول دیتی ہے چاہے وہ بند محسوس ہو جیسا کہ گھر کا تالا یا معقول ہو جیسا کہ نظر۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم بستی نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من الناس مفاتیح للخیر مغالیق للشر وان من الناس مفاتیح للشر مغالیق للخیر فطوبی لمن جعل اللہ مفاتیح الخیر علی یدیہ وویل لمن جعل اللہ مفاتیح الشر علی یدیہ ۔(1)

''بے شک لوگوں میں بعض خیر اور بھلائی کی چابیاں (اور) شر اور برائی کے تالے ہیں۔ اور بلاشبہ لوگوں میں سے بعض شر کی چابیاں اور خیر کے تالے ہیں۔ پس مبارک ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے خیر کی چابیاں عطا فرمائیں اور ہلاکت و بربادی ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے شر کی چابیاں رکھیں''۔

اور آیت میں یہ لفظ استعارۃً غیوب تک پہنچنے کے معنی میں ہے جس طرح کہ ظاہر میں چابی کے ذریعے کسی انسان کی غیب چیز تک پہنچا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے: یہ لوگوں کے اس قول سے ماخوذ ہے افتح علی کذا یعنی مجھے عطا کیجئے یا مجھے وہ سکھا دیجئے جس کے ذریعے میں اس تک پہنچ جاؤں۔ پس اللہ تعالیٰ کے پاس ہی علم غیب ہے اور اسی کے دست قدرت میں اس تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا سوائے اس کے، پس وہ ان پر جسے مطلع کرنا چاہے اسے مطلع کر دے، اور جس پر انہیں چھپانا چاہے اس سے چھپا لے۔ اور اس کی طرف سے یہ عطا اور فیضان نہیں ہوتا مگر رسولوں پر (علیہم الصلوٰات والتسلیمات)۔

اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد ہیں: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران: 179) ''اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لیے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے''۔

اور مزید فرمایا: عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ الآیۃ (جن) ''(اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفاتح سے مراد خزائن رزق ہیں، یہ سدی اور حسن رحمہما اللہ سے منقول ہے اور مقاتل اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس سے مراد زمین کے خزانے ہیں۔ اور یہ مجاز ہے۔ اور ان سے اس (شئی) کو تعبیر کیا گیا ہے جس کے ذریعے ان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کے علاوہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں حدیث کے معنی متضمن ہیں یعنی اس کے پاس عمروں کا علم اور ان کے گزرنے کے وقت کا علم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عمروں کا انجام اور اعمال کے خواتم کا علم ہے۔ علاوہ ازیں بھی کئی اقوال ہیں۔ لیکن مختار پہلا قول ہی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کی کئی آیات میں علم غیب کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے سوائے اپنے بندوں میں سے ان کے جنہیں اس نے چن لیا۔ لہٰذا جس کسی نے کہا: بلاشبہ وہ کل بارش برسائے گا اور اس کا یقین کر لیا تو وہ کافر ہے، اس نے اس کے بارے ان علامات اور نشانیوں کے سبب خبر دی جن کے سبب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب ابواب فی فضائل اصحاب رسول اللہ، باب من کان مفتاحا للخیر، حدیث 232-233، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس نے یہ دعویٰ کیا یا نہیں۔ اسی طرح جس نے کہا: بلاشبہ وہ اسے جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے تو وہ کافر ہے(1)۔ اور اگر اس نے یقین نہ کیا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ عادۃً نوء (ایک ستارہ کا مغرب میں غروب ہونا اور اس کے بالمقابل اسی ساعت میں مشرق میں ایک ستارہ کا طلوع ہونا) کے سبب بارش برساتا ہے، اور وہ عادۃً بارش کا سبب ہے اور یہ کہ وہ بارش کا سبب اس بنا پر ہے کہ اس نے اس کا اندازہ لگالیا ہے اور وہ پہلے اس کے علم میں آچکا ہے تو وہ کافر نہیں، مگر اس کے لیے مستحب اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ وہ اس کے بارے کلام نہ کرے، کیونکہ اس میں اہل کفر کے کلام کے ساتھ مشابہت ہے اور اس میں اس کی لطیف حکمت سے جہالت ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے بارش نازل فرمادیتا ہے، کبھی ستارے کے غروب وطلوع کے سبب اور کبھی اس کے بغیر۔ اللہ تعالیٰ نے (حدیث قدسی میں) ارشاد فرمایا ہے: أصبح من عبادی مؤمن بی و کافر (2) بالکوکب ''میرے بندوں میں سے (بعض نے) میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے اور ستارے کے ساتھ کفر کرتے ہوئے صبح کی) اس کا بیان سورہ واقعہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اور اسی طرح طبیب کا قول بھی ہے: جب عورت کے دائیں پستان کا سرا سیاہ ہو جائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر بایاں پستان اس طرح ہو جائے تو پھر بچی ہوتی ہے اور اگر عورت دائیں پہلو کو بوجھل پارہی ہو تو بچی ہوتی ہے۔ اور انہوں نے خلقت کے بارے میں یہ دعویٰ عادۃً کیا ہے نہ کہ واجباً، لہٰذا یہ نہ کفر ہے اور نہ ہی فسق ہے۔ اور وہ آدمی جس نے مستقبل میں کسب اور کمائی کا دعویٰ کیا تو وہ کافر ہے یا اس نے مجمل یا مفصل واقعات ہونے کے بارے خبر دی اس سے پہلے کہ وہ وقوع پذیر ہوں تو اس کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں۔ اور جس نے سورج اور چاند گرہن کی خبر دی تو ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے تادیباً کچھ سزا دی جائے گی لیکن اسے قید نہیں کیا جائے گا۔ رہی اس کی عدم تکفیر تو اس کے بارے ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ یہ ایسا امر ہے جسے حساب اور تقدیر منازل کے ساتھ جانا جاسکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (یٰسین: 39) ''اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لیے منزلیں''۔

اور جہاں تک ان کے لیے تادیبی سزا کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو شک میں ڈال دیتے ہیں، کیونکہ وہ تو اس کے اور اس کے غیر کے درمیان فرق کرنا نہیں جانتے۔ پس وہ اپنے عقائد کے بارے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے یقینی قواعد کو چھوڑ دیتے ہیں، پس تم انہیں ادب سکھاؤ تاکہ جب وہ اسے پہچان لیں تو وہ مخفی اور پوشیدہ رکھیں اور وہ اس کے بارے اعلان نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی باب سے وہ بھی ہے جو صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من أتی عرافا (فسأله عن شیٔ) لم تقبل له صلاة اربعین لیلة ''جو کسی نجومی اور کاہن کے پاس آیا اور کسی شیٔ کے بارے اس سے پوچھا تو اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جائے گی''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 730　2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء باب قول اللہ تعالیٰ وتجعلون رزقکم الخ، حدیث نمبر 980

اور عراف سے مراد اندازہ لگانے والا اور وہ نجومی ہے جو علم غیب کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ عرافہ سے ماخوذ ہے اور اسے جاننے والے کو عراف کہا جاتا ہے، اور وہ وہ ہے جو ایسے اسباب اور مقدمات کے ساتھ امور پر استدلال کرتا ہے جن کی معرفت اور پہچان کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ اور اس فن کے بعض لوگ اس بارے میں کہا پرندہ اڑا کر فال پکڑنے، جادو منتر کے طور پر کنکریاں مارنے اور ستاروں کے ساتھ قوت اور مدد حاصل کرتے ہیں اور اس میں بھی اسباب عادیہ ہیں۔ اور یہی فن عیافہ (یا کے ساتھ) ہے اور ان تمام پر کہانت کا اسم بولا جاتا ہے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے اور کہانت سے مراد علم غیب کا دعویٰ کرنا ہے۔

ابوعمر بن عبدالبر نے کتاب ''الکافی'' میں کہا ہے: وہ کمائی جس کے حرام ہونے پر اجماع ہے وہ سود، فاحشہ عورتوں کی اجرت، حرام کی کمائی، رشوت، اور نوحہ کرنے اور گانا گانے پر اجرت لینا، کہانت، غیب کا دعویٰ کرنے اور آسمان کی خبریں دینے پر اجرت لینا، بانسری بجانے، لہو ولعب اور ہر باطل کام کی اجرت ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ان زمانوں میں نجومیوں اور کاہنوں کے آنے کی وجہ سے احوال تبدیل ہو چکے ہیں بالخصوص دیار مصر میں، ان کے رؤساء، اتباع اور امراء میں نجومیوں سے ملنا عام ہو چکا ہے، بلکہ بہت سے فقہ اور دین کی طرف منسوب لوگ بھی دھوکہ کھاتے ہیں وہ ان کاہنوں اور نجومیوں کے پاس آتے ہیں پس وہ ان پر سراسر فساد کی باتیں رکھتے ہیں اور وہ ان سے مال و دولت نکال لیتے ہیں، پس وہ ان کی باتوں سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے دین کے بارے میں فساد اور گمراہی میں واقع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب گناہ کبیرہ میں سے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جاتی''۔ تو کیا حال ہوگا ان کا جنہوں نے ان کی باتوں پر اعتماد کیا اور ان پر اپنا مال خرچ کیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انهم ليسوا بشیء ''بلاشبہ وہ کوئی شئ نہیں ہیں''۔ تو لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک بسا اوقات وہ ہمیں ایسی شئ کے بارے بتاتے ہیں جو بالکل حق اور سچ ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تلك الكلمة من الحق يخطفها الجنی فيقرها فی اذن وليه (قر الدجاجة) فيخلطون معها مائة كذبة ''وہ کلمہ جو حق ہوتا ہے اسے جن اچک کر لے آتے ہیں اور چپکے سے اپنے ولی (یعنی جس کے وہ تابع ہو) کے کان میں ڈال دیتے ہیں (جیسے مرغی اپنی آواز منقطع کر لیتی ہے) اور وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ اور ملا لیتے ہیں''۔

حمیدی نے کہا ہے: یحییٰ بن عروہ کی اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس روایت کے سوا صحیح میں کوئی روایت نہیں ہے۔ اور اسے امام بخاری نے بھی ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن کی حدیث سے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الملائكة تنزل فی العنان وهو السحاب فتذكر الامر قضی فی السماء فتسترق الشياطين السمع فتسمعه فتوحيه الی الكهان فيكذبون معها مائة كذبة من عند انفسهم۔

''بے شک فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہ اس امر کا ذکر کرتے ہیں جس کا فیصلہ آسمان میں ہو چکا ہوتا ہے پس شیاطین سننے کے لیے چھپے رہتے ہیں اور اسے سنتے رہتے ہیں اور پھر اسے کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ اور بولتے ہیں''۔ اس کا بیان سورۂ سبا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** اللہ کریم نے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر فرمایا ہے، کیونکہ یہ دونوں انسان کے جوار میں اعظم المخلوقات ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شی کو جانتا ہے جو خشکی اور سمندر میں ہلاک ہوتی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: وہ خشکی میں نباتات، دانوں اور گٹھلیوں میں ہر شی کو اور سمندر میں رہنے والے جانوروں اور اس میں ان کے رزق میں سے ہر شی کو جانتا ہے۔ **وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا** یزید بن ہارون نے محمد بن اسحاق سے، انہوں نے نافع سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من زرع على الأرض ولا ثمار على الأشجار ولا حبة في ظلمات الأرض إلا عليها مكتوب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ رزق فلان بن فلان ''زمین پر کوئی کھیتی نہیں اور درختوں پر کوئی پھل نہیں اور زمین میں چھپا ہوا کوئی دانہ نہیں مگر اس پر یہ لکھا ہوا ہے **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** (یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے)''(1)۔

اور یہی اللہ تعالیٰ کی محکم کتاب میں ارشاد ہے: **وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ**

نقاش نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ ورقہ سے مراد اولاد بنی آدم میں سے وہ بچے لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت گر جاتے ہیں اور حبہ سے مراد وہ لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت نہیں گرتے اور رطب سے زندہ مراد لیے جاتے ہیں اور یابس سے مراد مردہ لیے جاتے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول طریقہ رموز و اشارات پر جاری ہے، اور جعفر بن محمد سے صحیح (مروی) نہیں ہے لہٰذا اس کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ** کا معنی ہے کہ درخت کا کوئی پتہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب گرے گا، کہاں گرے گا اور کتنے وقت تک ہوا میں اڑتا رہے گا اور کوئی دانہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب آئے گا، کتنی مقدار میں وہ اگیں گے اور انہیں کون کھائے گا۔ اور **فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ** سے مراد زمین کا اندرونی اور باطنی حصہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہی حدیث کے موافق ہے اور یہی آیت کا مقتضی ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ۔

اور **فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ** کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں سے نیچے ہے۔ **وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ** یہ دونوں لفظ پر عطف کی بنا پر مجرور ہیں۔ ابن السمیقع اور حسن وغیرہما نے ان دونوں کو من ورقۃ کے محل پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں من تاکید کے لیے ہوگا۔ **اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ** کتاب مبین سے

1۔ الوسیط للواحدی، جلد 2، صفحہ 281

مراد لوح محفوظ ہے، کیونکہ ملائکہ وہیں سے (نصائح) اخذ کرتے ہیں، نہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی نسیان کی وجہ سے اسے لکھ رکھا ہے جو اسے لاحق ہوسکتا ہے، اس کی ذات تو اس سے منزہ اور برتر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس نے اسے تعظیم امر کے لیے لکھا ہے حالانکہ وہ اسے جانتا ہے، یعنی تم جان لو کہ یہ وہ ہے جس میں نہ ثواب لکھا ہوا ہے اور نہ ہی عقاب، تو پھر اس کے بارے کیا کیفیت ہوگی جس میں ثواب اور عقاب ہوگا؟۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾

''اور وہ وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو، پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن میں تاکہ پوری کر دی جائے (تمہاری عمر کی) معیاد مقرر، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ بتائے گا تمہیں جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ اور وہی ہے جو تمہیں سلا دیتا ہے۔

اور وہ تمہارے ان نفوس کو قبضہ میں لے لیتا ہے جن کے ساتھ تم (چیزوں میں) تمیز کرتے ہو۔ اور وہ فی الحقیقت موت نہیں بلکہ نیند کے سبب تصرف سے ارواح کو قبضہ میں لینا ہے جیسا کہ وہ انہیں موت کے ساتھ قبضہ میں لے لیتا ہے۔ اور التوفی کا معنی استیفاء الشئی (کسی شی کو پورا کرنا) ہے۔ اور توفی المیت کہا جاتا ہے (کیونکہ) وہ اپنی عمر کے ایام کی تعداد کو پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ جو سو جاتا ہے گویا اس نے اپنی بیداری کی حرکات کو پورا کر لیا ہوتا ہے اور الوفاۃ کا معنی موت ہے۔ اور أوفیتك المال، وتوفیته، واستوفیته کہا جاتا ہے جب تو سارے کا سارا مال لے لے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إن بنی الأدرم لیسوا من أحد　　ولا توفاهم قریش فی العدد

اس میں ولا توفاھم (پورا کرنے) کے معنی میں ہے۔

اور کہا جاتا ہے: حالت نیند میں جب روح بدن سے نکلتی ہے تو اس میں حیات (زندگی) باقی رہتی ہے، اس لیے اس میں حرکت اور سانس لینا وغیرہ موجود رہتا ہے۔ اور جب اس کی عمر کی مقرر میعاد گزر جائے اور اس کی روح نکل جائے تو اس کا سلسلہ حیات منقطع ہو جاتا ہے اور وہ مردہ ہو جاتا ہے پھر نہ وہ حرکت کرتا ہے اور نہ ہی اس کی سانس جاری رہتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: (سونے والے سے) روح خارج ہوتی ہی نہیں بلکہ اس سے ذہن نکل جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: یہ ایک ایسا امر ہے جس کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور یہی صحیح ترین قول ہے، واللہ اعلم۔

ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ پھر وہ تمہیں دن میں (نیند سے) اٹھاتا ہے یعنی بیدار کرتا ہے۔

لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى یعنی تاکہ ہر انسان اس مدت کو پورا کر لے جو اس کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

ابو رجاء اور طلحہ بن مصرف نے ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیَقْضِیَ اَجَلًا مُّسَمًّى پڑھا ہے۔ یعنی جو میعاد اس کے نزدیک مقرر ہے وہ

اسے پورا کر دے۔ اور جَرَحْتُمْ بمعنی کسبتم ہے۔ اور سورۃ المائدہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اور آیت میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر عبارت اس طرح ہے ھو الذی یتوفاکم باللیل ثم یبعثکم بالنھار و یعلم ما جرحتم فیہ اس کی میعاد میں سے جو اہم ترین ہے اسے مقدم کیا اور بعث (دوبارہ اٹھانا) دن کے وقت واقع ہوتا ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ، ای فی المنام پھر وہ تمہیں خواب میں اٹھاتا ہے۔ آیت کا معنی ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کفار کو مہلت دینا ان کے کفر سے غفلت کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس نے ہر شے کی تعداد گن رکھی ہے وہ اسے جانتا ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے، بلکہ اس لیے ہے تاکہ وہ رزق اور حیات میں سے مقرر مقدار پوری کر دے، پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہ انہیں (ان کے اعمال کا بدلہ) اور جزا دے گا۔ اور یہ بعث (دوبارہ اٹھایا جانا) حشر و نشر (کے برحق ہونے پر) دلیل ہے، کیونکہ نشاۃ ثانیہ کا مرتبہ نشاۃ اولیٰ کے بعد ہے اسی طرح بیداری کا مرتبہ نیند کے بعد ہے۔ اس بارے میں کہ جو ذات ان میں سے ایک پر قادر ہے تو وہ دوسرے پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝

''اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آ جائے تم میں سے کسی کی موت تو قبض کر لیتے ہیں اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور وہ کوتاہی نہیں کرتے، پھر لوٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے سنتے ہو اسی کا حکم ہے اور وہ سب سے تیز حساب کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ یعنی وہی عظمت اور رتبہ میں فوقیت رکھتا ہے (اس میں) مکان اور جہت کے اعتبار سے فوقیت مراد نہیں ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً یعنی ملائکہ میں سے نگہبان تم پر بھیجتا ہے۔ ارسال کا حقیقی معنی اطلاق الشیء بما حمل من الرسالۃ ہے (یعنی کسی شی کو اس کے ساتھ چھوڑنا ہے جو وہ پیغام وغیرہ میں سے اٹھائے ہوئے ہو) پس مقصود ملائکہ کو اس حفاظت اور نگہبانی کی ذمہ داری کے ساتھ بھیجنا ہے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ (انفطار) یعنی ملائکہ بندوں کے اعمال کی نگہبانی کرتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور حَفَظَةً حافظ کی جمع ہے، جیسا کہ کتبۃ کاتب کی جمع ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ دو فرشتے رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو فرشتے دن کے وقت ہوتے ہیں، ان میں سے ایک خیر اور نیکی لکھتا ہے اور دوسرا شر اور برائی لکھتا ہے، اور جب انسان چلتا ہے تو ان میں سے ایک اس کے آگے ہو جاتا ہے اور دوسرا اس کے پیچھے، اور جب بیٹھتا ہے تو ان میں سے ایک اس کی دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا بائیں طرف۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ الآیۃ (ق) ''(ان میں سے) ایک دائیں جانب اور (دوسرا) بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے''۔ اور کہا جاتا ہے: ہر انسان کے لیے پانچ فرشتے

ہیں: دو رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو دن کے ساتھ خاص ہیں اور پانچواں رات اور دن میں سے کسی بھی وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

ومن الناس من يعيش شقيا جاهل القلب غافل اليقظة

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو شقاوت، جہالت قلب اور بیداری میں غافل رہتے ہوئے زندگی گزارتا ہے''۔

فإذا كان ذاوفاء ورأى حذر الموت واتقى الحفظة

''اور جب وہ صاحب وفا اور صاحب رائے ہو تو وہ موت سے ڈرتا ہے اور نگہبان فرشتوں سے بچتا ہے''۔

إنما الناس راحل و مقيم فالذى بان للمقيم عظة

''بلاشبہ لوگ کوچ کر رہے ہیں اور مقیم ہیں پس جو ظاہر ہے وہ مقیم کے لیے نصیحت ہے''

قولہ تعالیٰ: **حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ** مراد موت کے اسباب کا آنا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ **تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا** جماعت کے مؤنث ہونے کی بنا پر فعل مؤنث مذکور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ** (مائدہ:32) اور کذبت رسل اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر اسے توفاہ رسلنا پڑھا ہے۔ اور اعمش نے تتوفاہ رسلنا تاء کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے اور مراد ملک الموت علیہ السلام کے معاونین اور مددگار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ روح کو جسم سے آہستہ آہستہ نکالتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کے قبض کا وقت ہوتا ہے تو ملک الموت علیہ السلام اسے قبض کر لیتے ہیں (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: حضرت ملک الموت علیہ السلام جسم سے روح قبض کرتے ہیں پھر اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اگر وہ مومن ہو یا ملائکہ عذاب کے سپرد کر دیتے ہیں اگر وہ کافر ہو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک الموت علیہ السلام کے ساتھ سات ملائکہ رحمت ہوتے ہیں اور سات ملائکہ عذاب ہوتے ہیں، پس جب وہ کسی مومن کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے ثواب کی بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں اور وہ اسے لے کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی کافر کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ عذاب کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے عذاب کی بشارت دیتے ہیں اور اسے خوب خوفزدہ کرتے ہیں، پھر اسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، پھر اسے سجین کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور بندہ مومن کی روح علیین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے (2)۔

اور التوفی (موت دینا) کی نسبت کبھی ملک الموت علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ** (سجدہ:11) ''فرمایئے جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ'' اور کبھی ملائکہ کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہی اس کے والی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت اور دیگر آیات میں ہے۔ اور کبھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 291 2۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 490

کیونکہ حقیقت میں وہی موت دینے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر: 42) ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت''۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ (الجاثیہ: 26) ''فرمایئے اللہ نے زندہ فرمایا ہے تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں''۔ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (الملک: 2) ''جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو''۔

پس ملائکہ میں سے ہر مامور فرشتہ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ یعنی نہ وہ اسے ضائع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ادائیگی میں کوتاہی (اور غفلت) کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پوری پوری اطاعت اور پیروی کرتے ہیں، اور اس کا اصل معنی تو آگے بڑھنا اور پیش پیش ہونا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور فرط کا معنی ہے عجز کو پیش کرنا (اور طاقت نہ ہونے کا اظہار کرنا)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) وہ کوئی کوتاہی اور لاپرواہی نہیں کرتے۔

عبید بن عمیر نے لا يُفْرِطُون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ اس بارے میں حد سے تجاوز نہیں کرتے اکرام اور اہانت میں سے جس کے بارے انہیں حکم دیا جائے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کر کے حساب کے لیے اٹھائے گا۔ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ یعنی وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، وہ انہیں دوبارہ اٹھانے والا بھی ہے اور ان کا مالک بھی۔ الْحَقِّ قرات جمہور کے مطابق یہ مجرور ہے، کیونکہ یہ اسم جلالت کی نعت اور صفت ہے اور جس نے اسے الحق منصوب پڑھا ہے یا تو اس بنا پر کہ اس سے پہلے اعنی فعل مضمر ہے، یا پھر یہ مصدر ہے یعنی حقا۔

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ یعنی جان لو اور کہو: قیامت کے دن صرف اسی کا حکم ہوگا، یعنی قضا (فیصلہ) اور فصل صرف اور صرف اسی کا ہوگا۔ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ یعنی وہ کسی فکر، رؤیت کا محتاج نہیں اور نہ ہی ہاتھ کی گانٹھوں پر گننے کا محتاج ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

''آپ فرمایئے کون نجات دیتا ہے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں جسے تم پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ (اور کہتے ہو) اگر نجات دی اللہ نے ہمیں اس (مصیبت) سے تو ہم ضرور ہو جائیں گے اس کے شکر گزار (بندے)۔ فرمایئے اللہ ہی نجات دیتا ہے تمہیں اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اس میں ظلمات سے مراد) خشکی اور سمندر کی تکالیف اور مصیبتیں ہیں: کہا جاتا ہے: یوم مظلم یعنی شدید اور مشقت آمیز دن۔ نحاس نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: یوم مظلم جب دن شدید اور سخت ہو، اور اگر دن کی شدت بہت زیادہ بڑھ جائے تو پھر کہتے ہیں: یوم ذو کواکب (یعنی ایسا دن جس میں ستارے نظر آئیں، اس میں مراد شدت اور تکلیف ہوتی ہے) اور سیبویہ نے کہا ہے:

بنی أسدٍ هل تعلمون بلاءَنا　　إذا کان یوم ذوکواکب أشنعا

''اے بنی اسد! کیا تم ہماری آزمائش اور مصیبت کو جانتے ہو، جب دن ستاروں والا ہو تو وہ انتہائی شنیع اور تکلیف دہ ہوتا ہے''۔

ظُلُمٰتِ کو جمع اس بنا پر لایا گیا ہے، کیونکہ اس سے مراد خشکی کی تاریکی، سمندر کی تاریکی، رات کی تاریکی اور بادلوں کی تاریکی ہے، یعنی جب تم غلط راستے پر گامزن ہو جاؤ اور تمہیں ہلاکت کا خوف اور ڈر ہو تو تم اسے چھوڑ دو۔

لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو نے ہمیں ان مصائب سے نجات دی۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم ضرور شکر گزار اور فرمانبردار بندے ہو جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے شدائد و مصائب کے وقت اسے پکارنے پر انہیں ملامت کی اور جھڑکا۔ کیونکہ وہ آرام اور خوشحالی کی حالت میں اس کے ساتھ اوروں کو بھی پکارتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (پھر تم شریک ٹھہراتے ہو)

اعمش نے وخیفة پڑھا ہے یہ خوف سے ماخوذ ہے، اور ابوبکر نے حضرت عاصم سے خِفیة خاء کے کسرہ کے ساتھ قرآت کی ہے اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور فراء نے خُفوة اور خِفوة کا اضافہ کیا ہے اور کہا ہے: اس کی نظیر حُبیه، حِبیة، حُبوة اور حِبوة ہے۔ اور اعمش کی قرأت بہت بعید ہے۔

کیونکہ تَضَرُّعًا کا معنی ہے کہ تم گڑگڑانے (اور انتہائی عجز و انکساری) کا اظہار کرو اور خفیة کا معنی ہے کہ تم اسی کی مثل چھپاؤ (اور اپنے اندر رکھو) اور کوفیوں نے لئن أنجانا پڑھا ہے۔ اور معنی کا سیاق تو تا کے ساتھ ہے جیسا کہ اہل مدینہ اور اہل شام نے قرآت کی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ کوفیوں نے اسے تشدید کے ساتھ يُنَجِّيْكُمْ پڑھا ہے اور باقیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا گیا ہے: دونوں کا معنی ایک ہے جیسا کہ نجا، أنجیته اور نجیته ہم معنی ہیں۔ اور کہا گیا ہے: تشدید، کثرت کا معنی بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور الکرب کا معنی وہ غم ہے جو نفس کو پکڑ لیتا ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: رجل مکروب (غمزدہ آدمی)۔ عنترہ نے کہا ہے:

و مکروبٍ کشفتُ الکرب عنه　　بطعنة فیصل لما دعانی

اور کربة اسی سے مشتق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ اس میں انہیں دھمکانا اور جھڑکنا مقصود ہے، جیسا کہ سورت کی ابتدا میں ہے۔ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۝ کیونکہ حجت جب معرفت کے بعد قائم ہو تو اخلاص واجب ہوتا ہے، اور انہوں نے اس کا بدل بنا لیا اور وہ اشراک (شرک کرنا) ہے۔ پس یہ اچھا ہے کہ انہیں اس جہت پر جھڑکا جائے اور انہیں ڈرایا دھمکایا جائے اگرچہ وہ نجات سے پہلے مشرک تھے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ

يَفْقَهُوْنَ ⁽⁶⁵⁾

"فرمائیے وہ قادر ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے اور خلط ملط کر دے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی۔ دیکھو کیونکہ ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلوں کو تاکہ یہ لوگ (حقیقت کو) سمجھ لیں"۔

یعنی وہ تمہیں کرب اور مصیبت سے نجات دلانے پر بھی قادر ہے اور تمہیں عذاب دینے پر بھی۔ اور مِنْ فَوْقِكُمْ کا معنی ہے (اوپر سے) پتھر برسانا، طوفان، سخت چیخ اور ہوا، جیسا کہ اس نے عاد، ثمود، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم، اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کیا۔ یہ حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر وغیر ہما سے مروی ہے۔ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسانا) اور زلزلہ وغیرہ ہے جیسا کہ اس نے قارون اور اصحاب مدین کے ساتھ کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ فَوْقِكُمْ سے مراد ظلم کرنے والے امراء (اور حکمران) ہیں۔ اور اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے مراد سفلہ مزاج اور برائی کرنے والے غلام ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا اور ابو عبداللہ مدنی سے اَوْ يُلْبِسَكُمْ یا کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی وہ تمہیں عذاب کے ساتھ ڈھانپ دے (تم پر عذاب مسلط کر دے) اور اسے تم پر عام کر دے، اور یہ لفظ اللبس (لام کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے۔ اور فتحہ کی قرأت اللبس سے ماخوذ ہے۔ یہ مشکل مقام ہے اور اعراب اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

یعنی وہ تم پر تمہارا معاملہ خلط ملط کر دے، پس دو مفعولوں میں سے ایک کو اور حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (مطففین: 3) (یعنی ان میں بھی مذکورہ حذف موجود ہے) اور یہ اختلاط یہ ہے کہ وہ ان کے معاملے کو خلط ملط کر دے اور ان کی خواہشات اور چاہت میں اختلاف پیدا کر دے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا کا معنی ہے کہ وہ تمہارے دشمن کو قوی کر دے یہاں تک کہ وہ تم میں مخلوط ہو جائے اور جب وہ تمہارے ساتھ آ ملے تو تحقیق وہ تم میں خلط ملط ہو گیا (اور تم پر قوت پکڑ گیا)۔ شِيَعًا کا معنی مختلف گروہ اور فرقے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے مختلف گروہ بنا دے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قتال کرنے لگو۔ اور یہ ان کا معاملہ خلط ملط ہو جانے اور طلب دنیا پر ان کے امراء کے متفرق ہونے کے سبب ہے۔ اور اس ارشاد گرامی وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ کا یہی معنی ہے یعنی فتنہ میں جنگ و قتل کے ساتھ تم میں سے بعض کو دوسروں کی شدت چکھائے۔ یہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں اور کفار تمام کو عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں خاص ہے اور حسن نے کہا ہے: یہ اہل صلوٰۃ (اہل قبلہ) کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ عملاً اور وجوداً اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے، ہم نے اپنے شہروں میں دشمن کے ساتھ

اختلاط کیا اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے والی بنے، ایسے فتنہ کے ساتھ جو ہم پر غالب اور مسلط رہتا کہ ہمارے بعض نے بعض کو قتل کیا اور بعض نے دوسروں کے مالوں کو مباح سمجھا۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر و ما بطن (ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں ایسے فتنوں سے جو ظاہر ہوئے اور جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے)

اور حضرت حسن سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس کی تاویل کی ہے جو کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہوا(1)۔ مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إن اللہ زوی لی الأرض فرأیت مشارقها و مغاربها وإن أمتي سیبلغ ملکها ما زوی لی منها وأعطیت الکنزین الأحمر والأبیض الی آخر الحدیث۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین لپیٹ دی تو میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور عنقریب میری امت کی سلطنت اور حکومت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لیے اسے لپیٹا گیا اور مجھے دو خزانے سرخ و سفید (سونا اور چاندی) عطا فرمائے گا اور میں نے اپنے پروردگار سے اپنی امت کے لیے یہ التجا کی ہے کہ وہ اسے عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہ کرے اور یہ کہ وہ ان پر ایسے دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان میں سے نہ ہو اور وہ ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھنے لگے۔ اور میرے رب نے فرمایا ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو اسے رد نہیں کیا جاتا۔ میں نے آپ کو آپ کی امت کے لیے یہ عطا فرما دیا کہ میں انہیں عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہیں کروں گا اور یہ کہ میں ان پر کسی بیرونی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھ لے اگرچہ وہ ان پر اطراف و اکناف سے جمع ہو جائے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض بعض کو ہلاک کرنے لگیں اور بعض بعض کو قیدی بنالیں“۔

نسائی نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور وہ ساری رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہبانی کرتے رہے یہاں تک کہ فجر ہوگئی، تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نماز سے سلام پھیرا تو جناب خباب رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں آپ نے آج کی رات ایسی نماز ادا کی ہے میں نے آپ کو اس طرح کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جی ہاں بلاشبہ یہ انتہائی عجز اور خوف کی نماز تھی میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی التجا کی ہے۔ ان میں سے دو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرما دی ہیں اور ایک کو مجھ سے روک لیا ہے۔ میں نے اپنے پروردگار سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں اس کے ساتھ ہلاک نہ کرے جس کے ساتھ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ مجھے عطا فرما دیا ہے (یعنی میری التجا کو قبول کر لیا ہے) اور میں نے اپنے رب سے یہ التجا کی ہے کہ وہ ہم پر کسی بیرونی دشمن کو غلبہ نہ دے، تو اس نے یہ بھی مجھے عطا فرما دیا ہے اور میں نے اپنے رب سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں مختلف گروہوں میں خلط ملط نہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہیں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 305

فرمایا"۔ ہم نے یہ اخبار کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہیں۔ والحمدللہ

اور یہ روایت بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل امین علیہ السلام سے کہا: "اے جبریل! کیا میری امت کی بقا اسی پر ہے"؟ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے عرض کی: بلاشبہ میں آپ کی مثل بندہ ہوں آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اور اپنی امت کے لیے التجا کیجئے"۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے، وضو فرمایا اور خوب اچھی طرح وضو کیا (نفل) نماز پڑھی اور خوب اچھی طرح نماز پڑھی، پھر (رب کریم کی بارگاہ میں) دعا کی تو حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: یا محمد إن اللہ تعالیٰ سمع مقالتك واجارهم من خصلتين وهو العذاب من فوقهم ومن تحت أرجلهم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو سنا ہے اور انہیں دو خصلتوں سے پناہ عطا فرما دی ہے اور وہ عذاب ہے ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے جبریل! کیا میری امت باقی رہے گی جب ان میں خواہشات مختلف ہیں اور وہ ان کے بعض کو بعض کی شدت چکھائے گا"۔

تو حضرت جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا، الآیہ (عنکبوت:2) (الف، لام، میم کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا)۔

حضرت عمرو بن دینار نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: اعوذ بوجه الله (میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں (اس عذاب سے)) اور جب یہ نازل ہوئی اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ تو آپ نے کہا: هاتان اهون (یہ دونوں بہت آسان ہیں) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح و شام ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم إني أسئلك العافية في الدنيا والآخرة (اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی التجا کرتا ہوں) اللهم إني أسئلك العفو والعافية في ديني و دنياي اهلي ومالي (اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا، اپنے گھر والوں اور اپنے مال کے لیے عفو اور عافیت کی التجا کرتا ہوں)۔ اللهم أستر عوراتي وآمن روعاتي و أحفظني من بين يدي ومن خلفي وعن يميني وعن شمالي ومن فوقي وأعوذ بك أن أغتال من تحتي (1) (اے اللہ! مجھے بے پردگی سے محفوظ فرما، مجھے خوف سے، ڈر سے امن عطا فرما، میرے سامنے سے، پیچھے سے، میرے دائیں اور بائیں سے اور میرے اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں اپنے نیچے کی جانب سے ہلاک ہوں) وکیع نے کہا ہے: اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسنا) ہے۔

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ دیکھو کیونکر ہم ان کے لیے حجتیں اور دلائل بیان کرتے ہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ اس

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب ما يدعو به الرجل اذا اصبح اذا امسى، حدیث نمبر 3860، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے مراد اس شرک اور گناہوں کا بطلان ہے جن میں وہ مبتلا تھے۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ؕ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور جھٹلایا اسے آپ کی قوم نے حالانکہ یہ حق ہے فرمایئے نہیں ہوں میں تمہارا ذمہ دار۔ ہر ایک خبر (کے ظہور) کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب جان لو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ، ای بالقرآن یعنی آپ کی قوم نے قرآن کو جھٹلایا ہے۔

ابن ابی عبلہ نے وکذبت تاء کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ وَ هُوَ الْحَقُّ حالانکہ اس کے قصص حق ہیں۔ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ حسن نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) میں تمہارے اعمال کا محافظ نہیں ہوں کہ میں تمہیں ان پر جزا اور بدلہ دوں، بلاشبہ میں تو ڈرانے والا ہوں میں نے پیغام (حق) پہنچا دیا ہے، اس کی مثل یہ آیت بھی ہے وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ (انعام) (اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوتا) میں تم پر تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا ہوں۔

پھر یہ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ان کا ایمان آپ کی وسعت میں نہیں ہے۔ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ یعنی ہر خبر کی ایک حقیقت ہے، یعنی ہر شی کے لیے ایک مقررہ وقت ہے جس میں وہ بغیر تقدیم و تاخیر کے واقع ہو جاتی ہے۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے: ہر عمل کی جزا ہے۔ حسن نے کہا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کفار کے لیے وعید ہے، کیونکہ وہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار نہ کرتے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایسی شی کے ساتھ وعید ہو جو دنیا میں ان پر نازل ہوگی۔

سدی نے کہا ہے: بدر کے دن ان پر وہ عذاب آ پڑا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں ڈرا رہا ہے۔ اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بعض تفاسیر میں دیکھا ہے کہ یہ آیت داڑھ کے درد کے لیے باعث نفع ہے جب اسے کاغذ پر لکھ کر دانت پر رکھا جائے۔

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾

''اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بیہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ وہ الجھنے لگیں کسی اور بات میں اور اگر (کہیں) بھلا دے تجھے شیطان تو مت بیٹھو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے پاس''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ المحرر الوجیز

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا یعنی وہ ہماری آیتوں کی تکذیب اور ان کے ساتھ استہزا کی بیہودہ بحثیں کرتے ہیں فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ تو آپ ان سے اعراض کرلیں۔ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مومنین بھی اس خطاب میں داخل ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ علت اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث سننا ہے اور یہ علت مومنین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبھی کو شامل ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد اکیلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین سے اٹھنا ان پر شاق گزرتا تھا اور مومنین ان کے نزدیک اس طرح نہ تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اختلاف (اور نفرت) کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں جب کہ وہ استہزا کریں اور بیہودہ بحث کریں تاکہ وہ اس سے ادب سیکھیں اور بیہودہ بحث کرنا اور استہزا کرنا چھوڑ دیں۔

الخوض کا اصلی معنی ہے پانی میں غوطہ زن ہونا، پھر بعد میں ان اشیاء میں گم ہو جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جو جاہل بنا دینے والی ہیں، یہ غمرات الماء کے ساتھ تشبیہ ہے، پس محسوس کو معقول کے لیے بطور مجاز استعمال کیا گیا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خلط (باہم ایک دوسرے سے ملنا) سے ماخوذ ہے اور ہر وہ شی جس میں تو غوطہ زن ہو تو اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اسی سے خاض الماء بالعسل بھی ہے جب تو پانی کو شہد کے ساتھ ملا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھلایا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرک قوم کے پاس بیٹھتے تھے، آپ انہیں نصیحت فرماتے تھے اور انہیں دین اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور وہ قرآن کریم کے ساتھ استہزا کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے منہ پھیر لیں جس طرح کہ انکار اور نفرت کرنے والا اعراض کرتا ہے۔ تو اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب آدمی کسی دوسرے کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے اور اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کی بات قبول نہیں کرے گا تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے منکر کے اعراض کی طرح اعراض کر لے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں بیان کیا ہے وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ استہزا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ساتھ بیٹھنے سے منع فرما دیا ہے سوائے اس کے کہ آپ بھول جائیں۔ اور جب یاد آ جائے تو پھر اٹھ کھڑے ہوں۔ ورقاء نے ابن ابی نجیح کے واسطہ سے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے بارے میں ناحق باتیں کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں کتاب اللہ کی جانب سے ان کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ وہ ائمہ جو حجت اور دلیل ہیں اور ان کی اتباع کی جاتی ہے ان کے لیے جائز ہے کہ وہ فاسق لوگوں سے اختلاط کرتے اور اپنے تقویٰ کی بنا پر ان کی آراء کو درست اور صحیح قرار دیتے رہیں۔

علامہ طبری نے ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم جھگڑا کرنے والوں کی مجالست اختیار نہ کرو،

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 731

کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحثیں کرتے ہیں (1)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ اہل کبائر کی مجالست اختیار کرنا حلال نہیں ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث کرے اس کی مجالست چھوڑ دی جائے اور اسے بھی چھوڑ دیا جائے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔ فرمایا: اور اسی طرح ہمارے اصحاب نے دشمن کی سرزمین میں داخل ہونے اور ان کے چرچ اور عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے منع کیا ہے اور کفار اور اہل بدعت کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ کہ ان کی محبت و مودت کا اعتقاد نہ رکھا جائے اور نہ ان کا کلام سنا جائے اور نہ ان کے ساتھ مناظرہ کیا جائے۔

اہل بدعت میں سے کسی نے ابو عمران نخعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہا: مجھ سے ایک کلمہ سنو، تو آپ نے اس سے اعراض کر لیا اور فرمایا: نصف کلمہ بھی نہیں۔ اور اسی کی مثل ایوب سختیانی سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت فضیل بن عیاض نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو اکارت اور ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام نکال دے گا۔ اور جس نے اپنی بیٹی کی شادی کسی مبتدع سے کر دی تو اس نے اس کا تعلق منقطع کر دیا اور جس نے کسی بدعتی کے ساتھ مجالست اختیار کی اسے حکمت عطا نہیں کی جائے گی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کے بارے میں جان لے کہ وہ بدعتی کو مبغوض جانتا ہے تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا۔

ابو عبداللہ حاکم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وقر صاحب بدعة فقد أعان علی هدم الأسلام جس نے کسی بدعتی کی عزت و توقیر کی تحقیق اس نے اسلام کو گرانے میں (کمزور کرنے میں) معاونت کی۔

مذکورہ تمام روایات و اقوال سے اس کا قول باطل ہو گیا جس نے یہ گمان کیا کہ ان (اہل بدعت) کی مجالست جائز ہے جب کہ وہ ان کا کلام سننے سے محفوظ رہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ اس میں اِمَّا شرطیہ ہے، اسے نون ثقیلہ اغلباً لازم ہوتا ہے اور بعد اوقات لازم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اما یصبك عدوٌ فی مناواة یوماً فقد كنتَ تستعلی وتنتصرُ

(اما یصبك میں نون ثقیلہ موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس اور ابن عامر رضی اللہ عنہم نے معنی تکثیر کی بنا پر ینسینك سین کو مشدد پڑھا ہے: کہا جاتا ہے: نسی اور أنسی دونوں کا ایک معنی ہے اور یہ دو لغتیں ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 314

قالت سليمي أتسري اليوم أم تقل　　وقد ينسيك بعض الحاجة الكسل

اور امراُالقیس کا قول ہے:

لَنسّینی إذا قُمت سِربالی

آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر شیطان آپ کو ان کے پاس سے اٹھنا بھلا دے اور آپ اس نہی کے بعد ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى تو جب آپ کو یاد آئے تو پھر نہ بیٹھیں۔ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی مشرک قوم کے ساتھ اور ذکری تذکیر کا اسم ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ انہوں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نسیان (بھول) سے مبرا ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص ہے اور آپ کے لیے نسیان جائز ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر ہم اپنے اصحاب کو ان کے اس قول میں معذور قرار دیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر: 65) میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم کے ساتھ خطاب امت کو ہے اس لیے کہ آپ کی طرف شرک کی نسبت محال ہے، تو اس بارے میں ان کا کوئی عذر نہیں کیونکہ نسیان کی نسبت آپ کی طرف جائز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نَسِيَ آدمُ فَنَسِيَتْ ذريتُهُ (حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی اولاد کو بھی نسیان لاحق ہو گیا) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: إنما أنا بشر مثلكم أنسى كما تنسون فإذا نسيت فذكروني (بلاشبہ میں تمہاری مثل انسان ہوں میں بھی بھول جاتا ہوں جیسا کہ تم بھولتے ہو پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو) اسے بھی آپ نے صحیح میں روایت کیا۔ پس اس میں آپ نے نسیان کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اور فرمایا: آپ نے ایک آدمی کی قرأت سنی۔ تحقیق اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی ہے میں انہیں بھول چکا تھا۔

آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز ہونے کے بعد علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ طریقہ تبلیغ سے متعلقہ افعال اور احکام شرع میں بھی لاحق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں جو کچھ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اس کے مطابق عام علماء اور محققین ائمہ کرام نے پہلے موقف کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ ظاہر قرآن و احادیث اس پر شاہد ہے۔ البتہ ائمہ کرام نے یہ شرط عائد کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو اس پر متنبہ کر دیتا ہے اور اس (حالت نسیان) پر برقرار نہیں رکھتا۔ پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اس تنبیہ کا واقعہ کے فوراً بعد متصل ہونا شرط ہے؟ یہ مذہب قاضی ابوبکر اور اکثر علماء کا ہے۔ یا واقعہ سے تنبیہ کا مؤخر ہونا بھی جائز ہے جب تک کہ نبی علیہ السلام کی عمر اختتام پذیر نہ ہو اور سلسلہ وعظ و تبلیغ منقطع ہو جائے۔ ابو المعالی نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت نے وعظ و ارشاد اور عبادات شرعیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو اور بھول کا انکار کیا ہے، جیسا کہ

انہوں نے بالاتفاق وعظ وارشاد سے متعلقہ اقوال میں اس (بھول) کا انکار کیا ہے اور اس بارے میں وارد ہونے والے ظاہر دلائل سے عذر بیان کیا ہے۔

اسی کو الاستاذ ابو اسحاق نے اختیار کیا ہے۔ باطنیہ اور ارباب علم قلوب کی ایک جماعت نے اسے شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے: آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز نہیں ہے، بلاشبہ آپ قصداً اور ارادۃً بھولتے ہیں اور صورۃً نسیان کا قصد کرتے ہیں تا کہ سنت قائم ہو جائے۔ ائمہ تحقیق میں سے ایک عظیم امام اس طرف گئے ہیں اور وہ ابو المظفر الاسفرائینی ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''الاوسط'' میں یہ کہا ہے۔ اور یہ میلان صحیح اور پختہ نہیں ہے اور ضد کا ضد کے ساتھ جمع ہونا بہت زیادہ محال ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۶۹

''اور نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے ان کافروں کے حساب سے کچھ بوجھ البتہ پرہیزگاروں پر نصیحت کرنا فرض ہے شاید وہ باز آجائیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب یہ حکم نازل ہوا کہ آپ مشرکین کے ساتھ نہ بیٹھیں اور ارشاد باری تعالیٰ: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ سے یہی مراد ہے تو مسلمانوں نے کہا: ہمارے لیے مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا ممکن نہ رہے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی: وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى یعنی اگر مومنین ان کے پاس بیٹھیں تو پھر چاہیے کہ وہ انہیں نصیحت کریں۔ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اسے ترک کرنے کے بارے ڈرتے رہیں جس میں وہ واقع ہوئے ہیں (1)۔

پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم اس ارشاد ربانی کے ساتھ منسوخ ہے: وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ (النساء:140) ''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جا رہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (کفر واستہزا کرنے والوں) کے ساتھ کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں''۔(2)

یہ فتح (مکہ) سے پہلے رخصت تھی اور وہ وقت احتیاط وتحفظ کا وقت تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا ہے: وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ تا قولہ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: اظہر یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور معنی یہ ہے: مشرکین کے حساب میں سے کوئی شی تم پر واجب نہیں ہے، پس تم پر انہیں نصیحت کرنا لازم ہے اور انہیں زجر وتنبیہ کرنا لازم ہے، پھر اگر وہ انکار کر دیں تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ذکری مصدر ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو۔

ای ولکن الذی یفعلونہ ذکری، ای ولکن علیھم ذکری اور کسائی نے کہا ہے: معنی یہ ہے ولکن ھذہ ذکری (البتہ یہ نصیحت ہے)

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ

1۔ المحرر الوجیز　2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 315

نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

''اور چھوڑ دے جنہوں نے بنالیا ہے اپنا دین کھیل اور دل لگی اور دھوکہ میں ڈال دیا ہے انہیں دنیوی زندگی نے اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے، نہیں ہے اس کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارشی اور اگر وہ معاوضہ میں دے ہر بدلہ تو نہ قبول کیا جائے گا اس سے، یہی وہ لوگ ہیں جو ہلاک کیے گئے ہیں بوجہ اپنے کرتوتوں کے ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے بوجہ اس کفر کے جو وہ کرتے رہے تھے''۔

یعنی آپ ان کے ساتھ قلبی تعلق قائم نہ کیجئے، کیونکہ وہ خطا اور لغزش کو تلاش کرنے والے لوگ ہیں اگرچہ آپ ان کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنے پر مامور ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ** (توبہ:5) ہے۔

اور **لَعِبًا وَّ لَهْوًا** کا معنی ہے اس دین کے ساتھ استہزا کرنا جس کی طرف آپ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس دین کے ساتھ استہزا کیا جس پر وہ تھے، پس انہوں نے اس کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اور استہزاء دین میں جائز نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **لَعِبًا وَّ لَهْوًا** کا معنی باطلاً و فرحاً ہے (یعنی باطل قرار دینا اور پھر خوش ہونا) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور لعب کا لفظ چار مقامات پر مقدم آیا ہے، اور اسے اس طرح نظم کیا گیا ہے:

اذا أتی لعبٌ و لهوٌ　　وکم من موضعٍ هو فی القرآنِ

فحرفٌ فی الحدید وفی القتال　　وفی الأنعام منها موضعان

''جب لعب ولہو مذکور ہو اور قرآن کریم میں یہ کتنے مقامات پر ہے پس ایک بار (سورہ) الحدید میں اور ایک بار القتال میں اور دو مقامات پر سورۃ الانعام میں ہے''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں دین سے مراد عید ہے۔ کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے عید بنائی ہے جس کی وہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور اس دن اللہ تعالیٰ کی عبادت وریاضت کرتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنی عید کو لعب ولہو بنادیا ہے سوائے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے، کیونکہ انہوں نے اسے نماز، ذکر اور صدقہ وغیرہ دینے کا دن بنایا ہے، مثلاً جمعہ کا دن، عید الفطر کا دن اور قربانی کا دن۔

قولہ تعالیٰ: **وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا** یعنی وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

قولہ تعالیٰ: **وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ** آپ انہیں نصیحت کیجئے قرآن کے ساتھ یا (یوم) حساب کے ساتھ۔

اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ یعنی نفس کو گروی رکھ دیا جائے اور ہلاکت کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ معنی حضرت مجاہد،

قتادہ، حسن، عکرمہ اور سدی سے مروی ہے۔ اور ابسال کا معنی ہے: آدمی کو ہلاکت کے لیے پیش کرنا۔ لغت میں یہی معنی معروف ہے۔ أبسلت ولدی میں نے اپنے بچے کو رہن رکھا۔ عوف بن اُحوص ابن جعفر نے کہا ہے:

و أبسالی بنی بغیر جرم　بعوناہ ولا بدم مراقِ

بعوناہ یہ لفظ عین مہملہ کے ساتھ ہے اس کا معنی جنینا (ہم نے اسے مجرم قرار دیا)

اور البعو کا معنی الجنایۃ (جرم) ہے۔ بنی قشیر کے غنی نے بحیفہ کے دو بیٹوں کے خون کا ذمہ اٹھایا تو انہوں نے کہا: ہم تجھ سے راضی نہ ہوں گے، تو اس نے صلح کے مطالبہ میں اپنے بیٹوں کو ان کے پاس رہن رکھ دیا، اور نابغہ جعدی نے شعر کہا:

ونحن رهناً بالأفاقة عامراً　بما كان في الدرداء رهنا فأبسلا

الدرداء ان کا ایک دستہ تھا۔ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا الآیۃ عدل کا معنی فدیہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حَمِيْمٍ کا معنی گرم پانی ہے اور قرآن کریم میں ہے۔ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ الآیہ (الحج) ''انڈیلا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی''۔

يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ (الرحمن) ''وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جواز حد گرم ہوگا''۔ اور یہ آیت بھی آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ارشاد گرامی وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا (الحجر: 3) اور اس کا معنی ہے: آپ ان پر غمزدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ پر تبلیغ کرنا اور نفوس کی ہلاکت کے بارے نصیحت کرنا لازم ہے، پس جس نے (اپنے نفس کو) ہلاک کر دیا تحقیق اس نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور گروی رکھ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا اصل معنی حرام کرنا ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: هذا بسل عليك اى حرام (یہ تجھ پر حرام ہے) گویا وہ جنت سے محروم کر دیئے گئے اور جنت ان پر حرام کر دی گئی۔ شاعر نے کہا:

أجارتكم بسل علينا محرم　وجارتُنا حلٌ لكم وحليلها

أبسال بمعنی تحریم ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِی الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ڛ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

''آپ فرمائیے کیا ہم پوجیں الله تعالیٰ کے سوا اس کو جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے ہمیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور (کیا) ہم پھر جائیں الٹے پاؤں اس کے بعد کہ ہدایت دی ہے ہمیں الله نے؟ مثل اس شخص کے کہ بھٹکا دیا ہو اسے جنوں نے زمین میں اور وہ حیران و پریشان ہو، اس کے ساتھی ہوں جو اسے بلا رہے ہوں ہدایت کی طرف کہ ہمارے پاس آجا، آپ فرمائیے الله کی رہنمائی ہی حقیقی رہنمائی ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں سارے جہانوں کے رب کے سامنے۔ اور یہ کہ صحیح صحیح ادا کرو نماز اور ڈرو اس سے اور وہی ہے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور جس روز وہ کہے گا کہ تو ہو جا تو بس وہ ہو جائے گا۔ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی جس دن پھونکا جائے گا صور، جاننے والا ہے ہر چھپی خبر کا اور ہر ظاہر چیز کا اور وہی ہے حکمت والا سب کچھ جاننے والا''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا یعنی وہ جو ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے پوجیں۔ وَلَا يَضُرُّنَا اور وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے چھوڑ دیں۔ اس سے مراد بت (اصنام) ہیں۔ وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یعنی ہم ہدایت کے بعد ضلالت و گمراہی کی جانب لوٹ جائیں۔

اعقاب کا واحد عقب ہے اور یہ مؤنث ہے، اور اس کی تصغیر عقیبۃ ہے۔ جب کوئی الٹے پاؤں واپس لوٹے تو کہا جاتا ہے: رجع فلان علی عقبیہ ابو عبیدہ نے کہا ہے: جو کوئی اپنی حاجت اور ضرورت سے واپس لوٹ آئے اور وہ اس کے ساتھ کامیاب نہ ہو تو کہا جاتا ہے: قد رد علی عقبیہ۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تعقب بالشر بعد الخیر (وہ خیر اور بھلائی کے بعد شر کی طرف واپس لوٹا)۔ یہ اصل میں العاقبۃ اور العقبیٰ سے ماخوذ ہے اور یہ دونوں اس شی کے لیے (بولے جاتے) ہیں جو کسی شی کے پیچھے ہو اور واجب ہے کہ وہ اس کی اتباع اور پیروی میں ہو۔ اور اسی سے والعاقبۃ للمتقین ہے اور اسی معنی میں عقب الرجل (پاؤں کی ایڑی) بھی ہے اور اسی سے العقوبۃ ہے، کیونکہ وہ (سزا) گناہ کے پیچھے ہوتی ہے اور گناہ کے سبب ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: كَالَّذِي اس میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ یعنی جنوں نے اسے گمراہ کر دیا اور انہوں نے اس کی خواہش کو آراستہ اور مزین کیا اور اسے اس کی طرف دعوت دی۔ کہا جاتا ہے: ھوی یھوی الی الشیء کسی شے کی طرف انتہائی تیزی سے بڑھنا۔ اور زجاج نے کہا ہے: ھوی یھوی سے ماخوذ ہے اور یہ ھوی النفس سے ماخوذ ہے۔

یعنی شیطان نے اس کے لیے اس کی خواہش کو آراستہ کیا اور جماعت کی قرأت استھوتہ ہے یعنی ھوت بہ (جنات نے اسے بھٹکا دیا) یہ قرأت جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر ہے۔ اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر استھواہ الشیاطین

پڑھا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے استھواہ الشیطان مروی ہے اور حسن سے بھی مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابی کی قرأت میں ہے اور ائْتِنَا کا معنی تابعنا (تو ہماری پیروی کر) ہے۔

اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں بھی یدعونہ الی الھدی بَیِّنا ہے اور حسن سے بھی استھوتہ الشیاطون مروی ہے۔ حیران حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث حیریٰ ہے جیسا کہ سکران کی مونث سکریٰ اور غضبان کی مونث غضبیٰ ہے۔ اور حیران وہ ہوتا ہے جو اپنے معاملے کی جہت کی رہنمائی نہیں پا سکتا۔ اور حاریحار حیرا و حیرۃ و حیرورۃ کا معنی ہے تردد (مضطرب اور متردد ہونا) اور اسی وجہ سے وہ پانی جو متغیر ہو کر زرد رنگ ہو جائے اور اس کے باہر نکلنے کا راستہ (سوراخ) نہ ہو اس کا نام حائر رکھا گیا ہے اور اس کی جمع حوران ہے۔ اور الحائر وہ جگہ جس میں پانی متغیر اور متردد ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تخطو علی بردیتین غذاھما　　غدق بساحۃ حائر یعبوب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بت کی پوجا کرنے والے کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جسے کوئی جن بلاتا ہے اور وہ اس کی پیروی میں چل پڑتا ہے اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ اس نے اسے انتہائی گمراہ کن اور ہلاکت والی جگہ میں پھینک دیا ہوتا ہے، اور پھر وہ اسی کی مصیبت اور تکلیف میں سرگرداں رہتا ہے(1)۔ اور ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت حضرت عبدالرحمن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنے والدین کو کفر کی دعوت دیتے تھے اور ان کے والدین اور مسلمان انہیں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى کا یہی معنی ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے تھے۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: ان کی والدہ ام رومان بنت حارث بن غنم کنانیہ تھی اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حالت کفر میں اپنی قوم کے ہمراہ بدر واحد (کے میدان) میں حاضر ہوئے اور دعوت مبارزت دی اور ان کے مقابلے کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ان کے والد محترم (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) ان کی طرف بڑھے اور یہ ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: متعنی بنفسك (مجھے اپنی ذات سے فائدہ پہنچاؤ) پھر وہ (عبدالرحمن) اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا اور وہ صلح حدیبیہ کے وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں تھے۔ یہ اہل سیر کا قول ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ان کا نام عبدالکعبہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بدل کر عبدالرحمن رکھ دیا اور وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔

اور کہا جاتا ہے کہ نسل در نسل چار افراد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پایا، یعنی باپ ہو اور اس کے بیٹے ہوں سوائے حضرت ابو قحافہ، ان کے صاحبزادے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر اور ان کے بیٹے ابو عتیق محمد بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہم کے۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 329

قولہ تعالیٰ: وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ، لِنُسْلِمَ پر لام، لام کی ہے، یعنی اُمِرْنَا کی نسلم و بأن اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (ہمیں حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم گردن جھکا دیں اور اس کے بارے میں کہ نماز صحیح صحیح ادا کرو) کیونکہ حروف اضافت میں سے بعض کو بعض پر عطف کیا جاتا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أمرنا بأن نسلم (ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں) کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمرتك لتذهب، وبأن تذهب دونوں کا معنی ایک ہے (1) (میں نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو چلا جا)

نحاس نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن بن کیسان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ لام جارہ ہے۔ اور کل لام تین قسم کے ہیں: لام خفض (لام جارہ) لام امر اور لام توکید، کوئی لام ان تین قسموں سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام کا معنی اخلاص ہے (یعنی مخلص ہونا)۔

اور اقامۃ الصلوٰۃ کا معنی ہے نماز ادا کرنا اور اس پر دوام اختیار کرنا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ کا معنی پر عطف ہو، یعنی یدعونه الى الهدى ويدعونه أن اقيموا الصلاة (وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں ہدایت کی طرف اور وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں کہ صحیح صحیح نماز ادا کرو) کیونکہ ائْتِنَا کا معنی ہے أن ائتنا۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور اسی طرح وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بھی ہے یعنی وہی وہ ذات ہے جس کے لیے واجب ہے کہ اس کی عبادت کی جائے نہ کہ بت اور بِالْحَقِّ کا معنی بکلمة الحق ہے (یعنی کلمہ حق کے ساتھ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا) اور اس سے مراد اس کا قول کن ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ اور یاد کرو اس دن کو جس دن وہ کہے گا: تو ہو جا یا تم اس دن سے ڈرو جس دن وہ كُنْ کہے گا یا اس دن کا اندازہ کرو جس دن وہ كُنْ کہے گا۔ (یعنی اس یوم سے پہلے اذکر یا اتقوا یا قدر فعل محذوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عطف وَ اتَّقُوْهُ کی ہاء پر ہے۔ فراء نے کہا ہے: كُنْ فَیَكُوْنُ کہا جاتا ہے یہ صور کے لیے خاص ہے۔ یعنی ويوم يقول للصور كن فيكون (جس دن وہ صور کو کہے گا تو ہو جا تو وہ ہو جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ لوگوں میں سے جن کی موت کا اور جن کی حیات کا ارادہ فرمائے وہ سب ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں تاویلوں کی بنا پر قَوْلُهُ الْحَقُّ مبتدا اور خبر ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قول باری قَوْلُهُ الْحَقُّ کے سبب مرفوع ہے، یعنی وہ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں وہ حکم دیتا ہے اور الْحَقُّ اس کی نعت ہے اور اس بناء پر مکمل معنی اس طرح ہوگا: فَیَكُوْنُ قَوْلُهُ الْحَقُّ۔

اور ابن عامر نے فَیَكُوْنُ نصب کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ حساب اور بعث بعد الموت کی سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے اور سورۃ البقرہ میں اس پر مکمل بحث گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ یعنی اس کی بادشاہی ہوگی جس دن صور میں پھونکا جائے گا یا اس کا حق ہوگا جس دن صور

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 339

میں پھونکا جائے گا (یعنی تقدیر عبارت یہ ہے ولہ الملك یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ اور ولہ الحق یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ (یوم) یوم یقول سے بدل ہے (1)۔ اور صور نور کا ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ فنا کے لیے ہوگا اور دوسرا اٹھانے اور زندہ کرنے کے لیے (2) اور یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے گمان کیا ہے، یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) میں پھونکا جائے گا جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے ''...... پھر صور میں پھونکا جائے گا اور اسے کوئی بھی نہیں سنے گا مگر وہ گردن کو جھکائے گا اور گردن کو اٹھالے گا ...... فرمایا ...... اور پہلے پہلے جو آدمی اسے سنے گا وہ اپنے اونٹ کے حوض کو مٹی کا لیپ کر رہا ہوگا ...... فرمایا ...... پس وہ مر جائے گا اور لوگ بھی مر جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ بھیجے گا ...... یا فرمایا اللہ تعالیٰ نازل فرمائے گا ...... بارش جو شبنم کی طرح ہوگی اور اس سے لوگوں کے جسم اگ پڑیں گے پھر صور میں دوسری بار پھونکا جائے گا تب وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے'' (3) آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور قرآن کریم میں بھی اسی طرح ہے ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی (الزمر: 68) یہاں فیھا نہیں فرمایا، تو اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے اور تمام امتوں کا اس پر اجماع ہے کہ صور میں حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ ابوالہیثم نے کہا ہے: جو کوئی صور کے سینگ ہونے کا انکار کرے تو وہ اس کی طرح ہے جو عرش، میزان اور پل صراط کا انکار کرتا ہے اور ان کی تاویلات تلاش کرتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: وہ صور جس کا ذکر حدیث طیبہ میں ہے وہ سینگ کی مانند ہے اسی میں پھونکا جائے گا، اور صور صورۃ کی جمع ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: صور سینگ ہے۔ راجز کا قول ہے:

لقد نطحناهم غداة الجمعين　نطحا شديدا لا كنطح الصورين

اور اسی معنی میں یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (النمل: 87)

کلبی نے کہا ہے: میں نہیں جانتا وہ صور کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ صورۃ کی جمع ہے جیسا کہ بسرۃ اور بسر ہے۔ یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) اور ارواح میں پھونکا جائے گا۔ اور حسن نے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوَرِ پڑھا ہے، اور صور میں ایک لغت صاد کے کسرہ کے ساتھ صِور بھی ہے یہ صورۃ کی جمع ہے اور اس کی جمع صوار ہے، اور اس میں ایک لغت صیار یا کے ساتھ بھی ہے۔ اور عمرو بن عبید نے کہا ہے: عیاض نے پڑھا ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوَرِ اور اس سے مراد خلق ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس نے کہا ہے اس آیت میں صور سے مراد صورۃ کی جمع ہے وہ ابو عبیدہ ہے۔ اگرچہ اس کا احتمال ہے لیکن یہ کتاب و سنت کے ساتھ مردود ہے اور یہ بھی کہ دوبارہ زندہ کرنے کے لیے صور میں دو بار نہیں پھونکا جائے گا، بلکہ اس میں ایک بار پھونکا جائے گا، پس حضرت اسرافیل علیہ السلام اس صور میں ایک بار پھونکیں گے جو کہ سینگ ہے اور اللہ تعالیٰ جسموں کو زندہ فرما دے گا۔

اور قرآن کریم میں ہے: فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم: 12)

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 57　2۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الزمر، حدیث نمبر 3167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6555

قولہ تعالیٰ: عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اس میں عالم، الَّذِیْ کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے وہ عالم الغیب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (عالم الغیب) اپنے سے پہلے مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر مرفوع ہو۔ اور بعض سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے ینفخ پڑھا ہے تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ اس کا فاعل عٰلِمُ الْغَیْبِ ہو، کیونکہ جب اس میں پھونک اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھی ماری جائے گی تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ عالم معنی پر محمول کرتے ہوئے مرفوع ہو جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لیبك یزید ضارع لخصومة

حسن اور اعمش نے عالم کو لہ کی ہا سے بدل بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

''اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے: کیا تم بناتے ہو بتوں کو خدا، بے شک میں دیکھتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اس بارے میں علماء نے کافی کلام کیا ہے، پس ابوبکر محمد ابن محمد بن حسن جوینی شافعی اشعری نے ''النکت'' میں اس کی تفسیر میں کہا ہے: لوگوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح ہے۔ اور جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا نام آزر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک آزر ان کی لغت میں عیب اور برائی ہے گویا کہ یہ فرمایا: اور یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: یا مخطی (اے خطا کرنے والے) اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو) اور جب معنی اس طرح ہو تو اسے مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آزر بت کا نام ہے اور جب معنی یہ ہو تو یہ محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے فعل مضمر ہوگا، گویا کہ اس طرح کہا: واذ قال ابراهیمُ لأبیه أتتخذُ آزرَ اِلٰها، أتتخذُ أصناما آلهة (جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: کیا تم آزر کو الٰہ بنا رہے ہو)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس اتفاق کا دعویٰ کیا ہے اس پر اجماع نہیں ہے۔ پس محمد بن اسحاق، کلبی اور ضحاک نے کہا ہے: بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر ہے اور وہی تارح ہے، جیسا کہ اسرائیل اور یعقوب ہیں۔ (میں کہتا ہوں) پس یہ دونوں نام اسی کے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: آزر لقب ہے اور تارح نام ہے اور اسے ثعلبی نے ابن اسحاق قشیری سے بیان کیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ حسن نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر تھا۔ اور سلیمان التیمی نے کہا ہے: یہ گالی اور عیب ہے اور ان کے کلام میں اس کا معنی ہے وہ جو ٹیڑھا ہو (یعنی بداخلاق ہو)۔

معتمر بن سلمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ کلمہ انتہائی عیب اور بد خلقی پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہ شدید ترین کلمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے کہا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: آزر کا معنی ہے انتہائی پیر فرتوت (بہت بوڑھا)۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ ان کی لغت میں صفت ذم ہے، گویا کہ آپ نے کہا: اے خطا کرنے والے (یعنی یا مخطئ) یہ اس کے مرفوع ہونے کے مطابق ہے اور جنہوں نے اسے مجرور پڑھا ہے اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہوگی: واذ قال ابراهيم لِأَبيه المُخطِئ (اور جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خطا کرنے والے باپ کو کہا)۔ اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ أفعل کے وزن پر ہے۔

نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: آزر عجمی اسم ہے، اور یہ آزَرَ فلان فلانا سے مشتق ہے اس کا معنی ہے إذا عاونه (جب کوئی دوسرے کی مدد کرے) اور وہ بتوں کی عبادت پر اپنی قوم کی مدد اور معاونت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ القوۃ سے مشتق ہے۔ اور الأزْر کا معنی قوت ہے۔ یہ ابن فارس سے منقول ہے۔ اور مجاہد اور یمان نے کہا ہے: آزر بت کا نام ہے اور یہ اس تاویل میں محل نصب میں ہے، تقدیر کلام ہوگی: أَتَتَّخِذُ آزَرَ اِلٰهًا (کیا آپ بت کو الٰہ بنا رہے ہیں) أَتَتَّخِذُ أصناما اور یہ قول بھی ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیر کلام ہے: اتتخذ آزَرَ اصناما۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر آزر اسم جنس ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ثعلبی نے کتاب ''العرائس'' میں کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ باپ جس کا نام اس کے باپ نے تارح رکھا تھا، جب وہ نمرود کے ساتھ اس کے بت کدے کا با اختیار متولی بن گیا تو اس نے اس کا نام آزر رکھ دیا۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: بلاشبہ آزر آپ علیہ السلام کے باپ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو بت کا نام ہے اور آپ کا نسب اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بن تارح بن ناخور بن ساروع ابن اَرغو بن فالغ بن عامر بن شالخ بن اَرفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (1)۔

اور آزر میں کئی قرائتیں ہیں: أأزرا یہ دو ہمزوں کے ساتھ ہے اس میں پہلا مفتوح اور دوسرا مکسور ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور آپ ہی سے أأزرا دو مفتوح ہمزوں کے ساتھ بھی مروی ہے اور اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ آپ کی پہلی دونوں قرأتوں کے مطابق تَتَّخِذُ بغیر ہمزہ کے ہے۔

مہدی نے کہا ہے: أإزرا؟ تو کہا گیا: بلاشبہ یہ بت کا نام ہے اور یہ أَتَتَّخِذُ إِزْرا کی تقدیر پر منصوب ہے اور اسی طرح أأزرا بھی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ أأزرا بنایا جائے اس بنا پر کہ یہ الأزْر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے پیٹھ، پس یہ مفعول من أجلہ ہو جائے گا۔ گویا کہ یہ کہا: أَلِلْقُوَةِ تَتَّخِذُ أصناما (کیا قوت کا سبب تم بتوں کو بناتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ ازر بمعنی وزر (بوجھ) ہو، اور واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہو۔

قشیری نے کہا ہے: مشرکین پر حجت قائم کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بتوں کی عبادت کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 344

آپ کا اپنے باپ کا رد کرنے کا واقعہ ذکر کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرنے کے قریب تر لوگ عرب تھے، کیونکہ وہ آپ کی ذریت اور اولاد تھے (اور آیت میں اذ کہ فعل محذوف ہے) تقدیر کلام ہے: واذ کُرۡ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِیۡمُ (اور یاد کرو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) یا پھر ذکر محذوف ہے جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں مذکور ہے: ذَكِّرۡ بِهٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ (اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے) اور تقدیر کلام ہوگی: وَذَكِّرۡهُمۡ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِیۡمُ (اور یاد دلائیے جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) اور آزرُ بھی پڑھا گیا ہے یعنی یا آزر، یہ منادی مفرد ہونے کی بنا پر ہے اور یہ حضرت ابی اور یعقوب وغیرہما کی قرأت ہے۔ اور یہ قرأت اس کے قول کو تقویت دیتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ہے: اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً اس میں تَتَّخِذُ فعل کے دو مفعول ہیں اور فعل میں استفہام برائے انکار ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ ۝

''اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یعنی مَلَكُوۡتَ بمعنی ملك (بادشاہی) ہے اور معنی صفت میں اظہار مبالغہ کے لیے واؤ اور تا کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اسی کی مثل رغبوت، رہبوت اور جبروت ہیں (1)۔ اور ابو السمال العدوی نے لام ساکن کے ساتھ مَلۡكوت پڑھا ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک فتحہ کو خفیف ہونے کی بنا پر حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ اور شاید یہ اس میں ایک لغت ہے اور نُرِی بمعنی اُرِینا ہے، پس یہ ماضی کے معنی میں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آسمانوں میں ملائکہ کی عبادت اور دیگر عجائب قدرت (کا دکھانا) ہے اور زمین میں اولاد آدم کی عصیاں شعاری (دکھانا) ہے، پس آپ جسے گناہ اور نافرمانی کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کے لیے بددعا کرتے تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے ابراہیم! میرے بندوں سے رک جا، (یعنی ان کی ہلاکت کی دعا نہ کیا کر) کیا تم جانتے نہیں کہ میرے اسماء میں سے الصبور (بہت زیادہ صبر کرنے والا) بھی ہے؟ اسی کے ہم معنی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آسمانوں اور زمین کو ظاہر فرما دیا یہاں تک کہ عرش اور سب سے نیچے والی زمین کو بھی۔ اور ابن جریج نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: آپ علیہ السلام کے لیے ساتوں آسمان کھول دیئے گئے تو آپ نے ان کی طرف دیکھا یہاں تک کہ آپ کی نظر عرش تک پہنچ گئی اور آپ علیہ السلام کے لیے زمینوں کو کھول دیا گیا اور آپ نے ان کی طرف دیکھ لیا (3) اور آپ نے جنت میں اپنا محل بھی ملاحظہ فرمایا۔

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 265
2۔ تفسیر الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 24
3۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 449۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 349

پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا (العنکبوت: 27) (اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جانثاری) کا اجر اس دنیا میں) یہ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان کی بادشاہی میں سے وہ دکھائی جو کچھ اس نے ستاروں کے بارے بیان کیا ہے اور زمین کی بادشاہی میں سے سمندر، پہاڑ اور درخت دکھائے اور اسی طرح کی چیزوں کے بارے استدلال کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے اور فرمایا: جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کو تہہ خانہ میں رکھا گیا اور آپ کا رزق آپ کی انگلیوں کی اطراف (پوروں) میں رکھ دیا گیا پس آپ انہیں چوستے رہتے تھے، نمرود لعین نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ اس کی بادشاہی اس بچے کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی جو ابھی پیدا ہوگا، تو اس نے مردوں کو عورتوں سے الگ رہنے کا حکم دے دیا۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اس نے پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ آزر نمرود کے مقربین میں سے تھا اس نے اسے ایک دن اپنے کسی کام کے لیے بھیجا تو اس دوران اس نے اپنی بیوی سے مجامعت کر لی اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حاملہ ہوگئی۔

اور یہ قول بھی ہے: بلکہ اس نے بت خانہ میں اس کے ساتھ مجامعت کی اور وہ حاملہ ہوگئی اور اسی وقت اس کے سامنے بت گر گئے، پس اس نے اسے ایک قبیلے میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنم دیا، اور آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے زمین میں ایک تہہ خانہ کھودا اور اس کے دروازے پر ایک چٹان رکھ دی تا کہ درندے اسے پھاڑ نہ دیں۔ آپ کی ماں آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور دودھ پلا دیتی تھی اور وہ انہیں اپنی انگلیاں چوستے ہوئے پاتی تھیں، ان میں ایک میں شہد تھا، ایک میں پانی تھا اور ایک میں دودھ آتا تھا، اور آپ نشوونما پاتے گئے، پس آپ ایک سال کی عمر میں تین سال کے لگتے تھے۔ پس جب اس نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا تو لوگوں کو اس سے وہم ہوا کہ یہ تو دو سال قبل پیدا ہوئے، تو آپ نے اپنی ماں سے پوچھا: میرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: میں۔ پھر آپ نے پوچھا: تیرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تیرا باپ۔ آپ نے پھر سوال کیا: اس کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا: نمرود۔ آپ نے پھر کہا: اور اس کا رب کون ہے؟ تو اس نے آپ کو تھپڑ دے مارا اور وہ جان گئی کہ یہی وہ بچہ ہے جس کے ہاتھوں ان کی بادشاہی ختم ہو جائے گی۔

امام کسائی کی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں یہ مکمل قصہ موجود ہے اور قصص میں اسی کتاب کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ کا مولد حران ہے لیکن آپ کے باپ نے آپ کو سرزمین بابل کی طرف منتقل کر دیا۔ اور اسلاف میں سے عام اہل علم نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بن کنعان بن سنحاریب بن کوش بن سام بن نوح کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ طوفان نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے درمیان ایک ہزار دو سو تریسٹھ برس کا فاصلہ تھا۔ اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے تین ہزار تین سو تئیس برس بعد تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ہم نے انہیں ملکوت دکھائے تا کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ﴿۷۶﴾

''پس جب چھا گئی ان پر رات (تو) دیکھا انہوں نے ایک ستارا بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا (تو) بولے میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ یعنی جب رات نے اسے اپنی تاریکی کے ساتھ ڈھانپ لیا، الجَنّة، الجِنة، الجُنة، الجنین، المِجَن اور الجن تمام الفاظ بمعنی ستر (ڈھانپنا) ہیں اور جنان اللیل کا معنی رات کا سخت تاریک ہونا اور اس کا ڈھانپ لینا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

دلولا جنانُ اللیل أدرك رکضنا بذی الرمث والأرطی عیاض بن ناشب

اور کہا جاتا ہے: جنون اللیل بھی اسی معنی میں ہے۔ اور کہا جاتا ہے: جنة اللیل واجنه اللیل (رات نے اسے ڈھانپ لیا) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔(1)

رَاٰ كَوْكَبًا یہ دوسرا قصہ ہے اور یہ آپ پر ملکوت پیش کرنے کے قصہ کے سوا ہے۔ کہا گیا ہے: آپ نے اس چٹان کو شق ہوتے دیکھا جو آپ کے تہہ خانہ کے منہ پر رکھی ہوئی تھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ جب آپ کے باپ نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا وہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا تو آپ نے اونٹ، گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور فرمایا: ان کے لیے رب کا ہونا ضروری ہے اور آپ نے مشتری یا زہرہ کو دیکھا، پھر چاند کو دیکھا اور سورج کو اور یہ سب مہینے کے آخر میں ہوا۔ اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس تھی اور سترہ برس عمر ہونے کا قول بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نمرود پر غالب آئے اس وقت آپ کی عمر سترہ برس تھی۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هٰذَا رَبِّيْ اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں اور کہا گیا ہے: آپ کا یہ قول نظر وفکر کی مہلت، عہد طفولیت میں اور حجت قائم ہونے سے پہلے کی حالت میں تھا۔ اور اس حال میں نہ کفر ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان (2)۔ یہ قول کرنے والوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کی سند سے مروی ہے۔ فرمایا: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ تو آپ نے اس کی پوجا کی یہاں تک کہ وہ آپ سے غائب ہو گیا۔

اور اسی طرح سورج اور چاند کا واقعہ بھی ہے، پس جب آپ کی نظر وفکر مکمل ہو گئی تو آپ نے کہا: اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ بلاشبہ میں تو اس سے بری ہوں جسے تم شریک ٹھہراتے ہو۔ اور آپ نے اس کے غروب اور متغیر ہونے سے استدلال کیا، کیونکہ یہ حدوث پر انتہائی ظاہر اور واضح علامت ونشانی ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول ہو اس پر اوقات میں سے کوئی ایسا وقت آئے مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنے والا اور اسے پہچاننے والا ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکر یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا وہم اس کے بارے کیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اس سے بچا لیا ہے اور اس سے پہلے ہی اس کی ہدایت اور رہنمائی فرما دی ہے اور اسے اپنی بادشاہی دکھا دی ہے تاکہ وہ کامل

1۔ صحاح مادہ جنن
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 360

یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے (1)۔ یہ جائز نہیں ہے کہ اسے معرفت سے خالی تصور کیا جائے بلکہ اس نے پہلی نظر میں رب کریم کا عرفان حاصل کر لیا۔

زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ جواب غلط ہے اور جس نے یہ کہا ہے اس نے غلطی کی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا: وَّاجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ (ابراہیم) (اور بچا لے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی) اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۴﴾ (الصافات) (جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہیں کیا۔

زجاج نے کہا: میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ انہوں نے کہا: (کیا) تمہارے قول کے مطابق یہ میرا رب ہے؟ کیونکہ وہ بتوں، سورج اور چاند کی عبادت کرتے تھے۔ اور اسی قول کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَیْنَ شُرَكَآءِیَ (القصص:62) (میرے شرکاء کہاں ہیں) حالانکہ وہ تو وحدہ لاشریک ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے: تمہارے قول کے مطابق جو میرے شریک ہیں وہ کہاں ہیں؟ این شرکائی علی قولکم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تہہ خانے سے نکلے تو آپ نے ستارے کی روشنی دیکھی اور آپ اپنے رب کے طالب تھے، تو آپ کو گمان ہوا کہ یہ نور اور روشنی اسی کی ہے، تب آپ نے یہ کہا: هٰذَا رَبِّیْ یعنی وہ مجھے اپنا نور دکھا رہا ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے جان لیا کہ یہ ان کا رب نہیں ہے۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر جب آپ نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا اور اس کی روشنی پر آپ کی نظر پڑی۔

قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ (تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی گمراہ قوم سے) پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ اور یہ شرک نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ نے اس روشنی اور نور کی نسبت اپنے رب کی طرف کی ہے، لیکن جب آپ نے اسے زائل ہوتے ہوئے دیکھا تو علم نے آپ کی رہنمائی کی کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، تو آپ نے اپنے دل سے اس کی نفی کر دی اور یہ یقین کر لیا کہ یہ مربوب ہے رب نہیں ہے۔

اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ آپ نے هٰذَا رَبِّیْ کے الفاظ اپنی قوم پر حجت پختہ کرنے کے لیے کہے، پس (پہلے) آپ نے ان کے ساتھ موافقت ظاہر کی، لیکن جب ستارہ ڈوب گیا تو حجت مکمل اور پختہ ہو گئی اور فرمایا: جو شی متغیر ہو جائے وہ رب نہیں بن سکتی۔ اور وہ لوگ ستاروں کی تعظیم بجالاتے تھے، ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کے ساتھ حکم لگاتے تھے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں حسین ترین قول وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح مروی ہے۔ انہوں نے قول باری تعالیٰ: نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (النور:35) کے بارے کہا ہے: اسی طرح بندہ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 359

اور اس پر اپنے دل سے استدلال کرتا ہے اور جب وہ اسے پہچان لیتا ہے تو وہ نور پر نور کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور اس پر اپنے دلائل سے استدلال کیا، تو آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ کا رب اور خالق ہے، پھر جب اللہ عزوجل نے اپنی ذات کے بارے میں آپ کو عرفان عطا فرمایا تو معرفت میں اور اضافہ ہو گیا، تب آپ نے فرمایا: اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ (کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دے دی ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول ان کے فعل اور عمل کا انکار کرتے ہوئے استفہام اور زجر و توبیخ کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے: أَهَذَا رَبِّي کیا یہ میرا رب ہے یا کیا اس کی مثل رب ہو سکتا ہے؟ پھر ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۝ (الانبیاء: 34) یعنی أفهم الخالدون۔ اور ہذلی نے کہا ہے:

رَفَوْنِي وقالوا يَا خُوَيلد لَا تُرَعْ فقلتُ وأنكرتُ الوجوهَ هُم هُم

ایک دوسرے نے کہا ہے:

لعمرُك ما أدري وإنْ كنتَ دَارِيًا بسبعٍ رمين الجمر امر بثمان

(دونوں شعروں میں ہمزہ استفہام محذوف ہے)

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: هٰذَا رَبِّيْ عَلٰى زَعْمِكُمْ (تمہارے گمان کے مطابق یہ میرا رب ہے)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۝ (القصص) (کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے۔) اور مزید فرمایا: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ۝ (الدخان) ای عِنْدَ نَفْسِكَ (یعنی اپنے نفس کا ذائقہ چکھ) (لو چکھو، تم بڑے معزز و مکرم ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور تم کہتے ہو یہ میرا رب ہے۔ اس میں قول کو مضمر کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں قول کا اضمار کثیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ هٰذَا رَبِّیْ میں یہ معنی ہے ای هذا دليلٌ عَلٰى رَبِّي (یہ میرے رب پر دلیل ہے)

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ۝

"پھر جب دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی اس گمراہ قوم سے"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا۔ کہا جاتا ہے: بَزَغَ القمرُ جب چاند طلوع ہونا شروع ہو اور البزغ کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے، گویا چاند اپنے نور کے ساتھ تاریکی اور اندھیرے کو پھاڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے ہے بَزَغَ البَيْطار الدابة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب سالوتری جانور کا خون بہا دے۔

لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ یعنی اگر وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم نہ رکھتا۔ حالانکہ آپ ہدایت یافتہ تھے۔ تو یہ نظر و فکر کی مہلت

میں جاری ہوسکتا ہے یا آپ نے جواز عقلی کے امکان کے سبب ثابت قدمی کا سوال کیا، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا ہے: وَمَا يَكُونُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (اعراف: 89) (اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ۔)

اور قرآن کریم میں ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

"پھر جب دیکھا سورج کو جگمگاتے ہوئے (تو) بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ یہ تو ان سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا (تو) آپ نے فرمایا: اے میری قوم! میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً، بَازِغَةً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کیونکہ یہ آنکھ کی رؤیت ہے(1)۔ بَزَغَ يَبْزُغُ بزوغاً کا معنی ہے جب وہ طلوع ہوا۔ اور أفَلَ يأفِلُ أفولاً کا معنی یہ ہے جب وہ غروب ہوا۔

اور فرمایا: هٰذَا اور الشَّمْسَ مونث ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَفَلَتْ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ شمس کی تانیث اس کی تفخیم اور اس کی عظمت کے سبب ہے۔ اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: رجل نسابة و علامة اور کہا: هٰذَا رَبِّيْ اس کا معنی ہے: هذا الطالع ربّی (کیا یہ طلوع ہونے والا میرا رب ہے)۔ کسائی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: هذا الضوء (کیا یہ روشنی میرا رب ہے)۔ ابوالحسن علی بن سلیمان نے کہا ہے: ای هذا الشخص (کیا یہ شخص میرا رب ہے)، جیسا کہ اعشیٰ نے کہا:

قامت تبکیه علی قبره　مَن لِیَ مِنْ بعدِك یا عامرُ

ترکتَنِی فی الدار ذا غُرْبَةٍ　قد ذلّ من لیس له ناصرُ

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"بے شک میں نے پھیر لیا ہے اپنا رخ اس ذات کی طرف جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو یکسو ہو کر اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ یعنی میں نے اپنی عبادت اور توحید سے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کا قصد کیا۔

آیت میں الوجہ کا ذکر کیا کیونکہ چہرہ ان اعضاء میں سے زیادہ ظاہر ہے جن سے انسان پہچانا جاتا ہے۔ حَنِيْفًا اس کا معنی ہے حق کی طرف مائل ہوتے ہوئے۔ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ ما کا اسم اور خبر ہے۔ اور جب تو وقف کرے تو کہے: أناتو تو نے بیان حرکت کے لیے الف کا اضافہ کر دیا اور یہی صحیح لغت ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں:

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 77

أن۔ اور کسائی نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: أنه یہ تین لغات ہیں۔

اور حالت وصل میں تین لغات ہیں کہ درج کلام میں الف کو حذف کر دیا جائے، کیونکہ یہ حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے زائد کیا گیا ہے۔ اور عربوں میں سے بعض حالت وصل میں الف کو ثابت رکھتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

أَنَا سَيفُ العشِيرَةِ فَأعرِفُونِي

اور یہی بعض بنی قیس اور ربیعہ کی لغت ہے۔ یہ فراء سے منقول ہے اور بعض عرب حالت وصل میں کہتے ہیں: آن فعلت، مثلاً عان فعلت، اسے کسائی نے بعض قضاعہ سے بیان کیا ہے۔

وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

"اور جھگڑنے لگی ان سے ان کی قوم، آپ نے کہا: کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے ہدایت دے دی ہے مجھے۔ اور نہیں ڈرتا میں ان سے جنہیں تم شریک بناتے ہو اس کا، مگر یہ کہ چاہے میرا ہی پروردگار کوئی تکلیف پہنچانا، گھیرے ہوئے ہے میرا رب ہر چیز کو (اپنے) علم سے تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ یہ جھگڑنے اور جدال کرنے پر دلیل ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں آپ سے جھگڑا کیا۔ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ نافع نے نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے نون کو مشدد پڑھا ہے۔ اور اس میں ابن عامر سے ہشام کی روایت مختلف ہے۔ جس نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہے: اس میں اصل دو نون ہیں۔ پہلی علامت رفع ہے اور دوسری فعل اور یا کے درمیان بطور فاصلہ ہے، پس جب فعل میں دو ہم مثل حرف جمع ہو گئے اور وہ ثقیل ہو گئے تو ایک نون کو دوسری میں ادغام کر دیا گیا چنانچہ تشدید واقع ہو گئی اور واؤ کو مد کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے تاکہ التقائے ساکنین نہ ہو، ایک واؤ اور دوسرا مشدد حروف میں سے پہلا۔

پس یہ مد دو ساکنوں کے درمیان فاصلہ ہو گئی۔ اور جنہوں نے تخفیف کی ہے انہوں نے اجتماع مثلین کو خفیف سمجھتے ہوئے دوسرے نون کو حذف کر دیا ہے اور پہلی کو حذف نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ رفع کی علامت ہے۔ اور اگر اسے حذف کر دیا جائے تو مرفوع، مجزوم اور منصوب کے ساتھ مشتبہ ہو جائے گا۔ اور ابو عمرو ابن العلاء سے بیان کیا گیا ہے کہ قرأت غلط ہے۔ اور سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: انہوں نے تضعیف (مضاعف) کو ثقیل سمجھا ہے۔ اور شعر بھی کہا ہے:

تراه كالثَّغَامِ يُعَلُّ مِسْكًا　يَسوء الفالياتِ إذا فَلَيْنِي

قولہ تعالیٰ: وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ یعنی کیونکہ وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

اور انہوں نے آپ کو اپنے الٰہوں کی کثرت کے سبب خوفزدہ کیا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دے اور اسے قدرت دے دے تو اس وقت اسے اس کے ضرر اور نقصان کا خوف ہو گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا کا یہی معنی ہے۔ یعنی مگر یہ کہ میرا رب ہے کہ وہ مجھے گناہ کے بدلے کوئی

تکلیف دہ شے اور مصیبت لاحق کرے، جس کے مطابق میں نے عمل کیا تو اس کی مشیت مکمل ہوگئی۔ یہ استثنا ہے یہ پہلے کلام میں سے نہیں ہے۔ اور بہ میں ہا ضمیر میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ معبود کے لیے ہو اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا کہ میں ان سے خوفزدہ ہوں، پھر فرمایا: وَسِعَ رَبِّیۡ کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا یعنی اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ کَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ وَ لَا تَخَافُوۡنَ اَنَّکُمۡ اَشۡرَکۡتُمۡ بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ وَ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

''اور کیسے ڈروں میں (ان سے) جنہیں تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے حالانکہ تم نہیں ڈرتے (اس سے) کہ تم نے شریک بنایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسے کہ نہیں اتاری اللہ نے اس کے متعلق تم پر کوئی دلیل تو (تم ہی بتاؤ) دونوں فریقوں سے کون زیادہ حق دار ہے امن (وسلامتی کا) اگر تم (کچھ) جانتے ہو؟ وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لیے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ کَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ یہاں کَیۡفَ میں انکار کا معنی ہے۔ یہ ان پر اس بات کا انکار ہے کہ وہ اسے بتوں سے ڈرا سکتے ہیں، حالانکہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، یعنی میں کیسے ڈروں ان سے جو مردہ ہیں، حالانکہ تم اس اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جو ہر شے پر قادر ہے۔

مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا اس میں سلطان کا معنی حجت اور دلیل ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ یعنی دونوں فریقوں میں سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن وسلامتی کا کون زیادہ حق دار ہے؟ کیا موحد یا مشرک۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اس میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت سلمان اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول میں سے ہے، جیسا کہ عالم سوال کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا قول ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے ساتھ جواب دیا جو ان پر حجت اور دلیل ہے۔ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔

اور صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر یہ خاصی شاق گزری، وہ کہنے لگے: ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟ تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایسا نہیں جس طرح تم گمان کر رہے ہو بلکہ یہ تو اس طرح ہے جیسے لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) (اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ

بنانا، یقیناً شرک ظلم عظیم ہے) وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ اور وہی دنیا میں ہدایت یافتہ ہیں۔(1)

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں۔ ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ اس میں تلک آپ کے تمام دلائل کی طرف اشارہ ہے، یہاں تک کہ آپ نے ان کے ساتھ جھگڑا کیا اور آپ دلیل کے ساتھ ان پر غالب رہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا یہ قول ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آپ کی ان کے خلاف وہ دلیل ہے کہ جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا آپ ڈرتے نہیں اس سے کہ ہمارے الٰہ آپ کو ہلاک کر دیں گے اس لیے کہ آپ انہیں سب وشتم کرتے ہیں؟ تو آپ نے ان کو جواب دیا: کیا تم ان سے ڈرتے نہیں جب کہ تم عبادت اور تعظیم میں چھوٹے اور بڑے کو مساوی قرار دیتے ہو، کہ بڑا غضب ناک ہو جائے گا اور وہ تمہیں ہلاک کر دے گا؟

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ یعنی ہم علم، فہم و فراست، امامت اور بادشاہی عطا فرما کر جس کے چاہتے ہیں درجات بلند فرما دیتے ہیں۔ قراء کوفہ نے درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل سورۂ یوسف میں بھی ہے انہوں نے فعل کو مَنْ پر واقع کیا ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے: ونَرْفَعُ مَنْ نَشَاءُ اِلٰی دَرَجَاتٍ پھر الی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اہل حرمین اور ابو عمرو نے اضافت کی بنا پر بغیر تنوین کے پڑھا ہے، اس میں فعل درجات پر واقع ہے، اور جب درجات بلند کیے گئے تو صاحب درجہ کو بلند کر دیا گیا۔ اس قرأت کو الله تعالیٰ کا یہ ارشاد رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ (غافر: 15) تقویت دیتا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَهٗ (اے الله! اس کا درجہ بلند فرما) اس کے لیے باعث تقویت ہے، پس بلندی کی نسبت درجات کی طرف فرمائی۔ اور وہی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے (وہی) اپنے شرف و فضل میں رفیع اور بلند ہے۔ پس دونوں قرأتیں باہم متقارب ہیں، کیونکہ جس کے درجات بلند کر دیئے گئے تحقیق اسے بلند کر دیا گیا، اور جسے بلند کر دیا گیا تحقیق اس کے درجات بلند کر دیئے گئے۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ ہر شی کو اس کے محل میں رکھتا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ لقمان، باب لا تشرک بالله، حدیث نمبر 4403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ تفسیر طبری

اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ۭ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے عطا فرمائے انہیں اسحاق اور یعقوب ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی تھی ان سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (راہ راست دکھائی) اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ اور (ہم نے ہدایت دی) زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔ اور (ہدایت دی) اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ان سب کو ہم نے فضیلت دی سارے جہان والوں پر''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ یعنی ہم نے انہیں دین کے بارے میں استدلال کرنے (غلبہ پانے) اور دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کی جزا کے طور پر اسحاق اور یعقوب علیہما السلام عطا فرمائے۔

كُلًّا هَدَيْنَا یعنی ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ ہے۔ اور (ترکیب کلام میں) كُلًّا، هَدَيْنَا کی وجہ سے منصوب ہے اور نُوْحًا دوسرے هَدَيْنَا کے سبب منصوب ہے۔ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے اور طبری اور کئی دیگر مفسرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے مثلاً قشیری اور ابن عطیہ وغیرہ نے۔

اور پہلا قول زجاج نے کیا ہے، اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس ذریت میں حضرت یونس اور حضرت لوط علیہما السلام کو بھی شمار کیا گیا ہے اور وہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں حضرت لوط علیہ السلام آپ کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بھانجے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ تمام کے تمام انبیاء علیہم السلام ذریت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اگرچہ ان میں وہ بھی ہیں جو باپ اور ماں کی جہت سے ولادت کے اعتبار سے آپ کے ساتھ نہیں ملتے، کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے اور عرب چچا کو اب (باپ) ہی شمار کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے بارے خبر دی کہ انہوں نے کہا: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ (البقرہ:133) (ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم واسماعیل اور اسحاق کے خدا کی)

اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ آپ ان کی بیٹی کے بیٹے (نواسے) تھے۔ اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اولاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد ہے اور اسی سے انہوں نے استدلال کیا ہے جن کی یہ رائے ہے کہ بیٹیوں کی اولاد اسم الولد (مراد لفظ الولد) میں داخل ہوتی ہے(1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 317

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جس نے ولدہ و ولد ولدہ پر کچھ وقف کیا تو اس میں بیٹوں کی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد بھی نسل میں داخل ہوگی۔ اور اسی طرح جب کسی نے اپنے قرابت داروں کے لیے وصیت کی تو اس میں بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرابت سے مراد ہر ذی رحم محرم ہے۔ اور آپ کے نزدیک چچا کا بیٹا، پھوپھی کا بیٹا، ماموں کا بیٹا، خالہ کا بیٹا یہ بھی اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ محرم نہیں ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قرابت کا اطلاق ہر ذی رحم محرم اور دوسروں پر ہے۔ پس آپ کے نزدیک نہ ابن العم ساقط ہوا اور نہ کوئی اور۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہ ہوگی۔ اور اس کا قول: لقرابتی و عقبی۔ اس کے قول لولدی و ولد ولدی کی طرح ہے۔ اس میں بیٹوں کی اولاد داخل ہوتی ہے اور اس کی جو باپ کے عصبہ اور صلب کی طرف راجع ہوتا ہے، اور اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں ہوتی۔ اس طرح کا بیان حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ (النساء: 11) (حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں) اور مسلمانوں نے ظاہر آیت سے صرف صلبی اولاد اور خاص کر بیٹوں کی اولاد ہی سمجھا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی (الانفال: 41) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرابت داروں کو عطا فرمایا، ان میں سے آپ کے چچا ہیں نہ کہ آپ کے ماموؤں کی اولاد۔ پس اسی طرح بیٹیوں کی اولاد بھی نسب کے اعتبار سے آپ کی طرف منسوب نہیں ہوتی، اور نہ وہ لفظ اب میں آپ کے ساتھ ملیں گے۔ ابن القصار نے کہا ہے: جنہوں نے بیٹیوں کو اقارب میں داخل کیا ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے فرمایا: اِنَّ ابنِي هَذَا سَيِّد (بلاشبہ یہ میرا بیٹا سردار ہے) اور ہم کسی کو نہیں جانتے جو بیٹیوں کی اولاد کے بارے یہ کہنے سے روکتا ہو کہ وہ ان کی ماں کے باپ کی اولاد ہے۔ اور معنی اسی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ ولد، تولد سے مشتق ہے۔ اور وہ بالیقین ان کی ماں کے باپ سے متولد ہیں۔ اور ماں کی جہت سے متولد ہونا باپ کی جہت سے متولد ہونے کی طرح ہے۔ اور اس پر قرآن کریم بھی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۙ﴿۸۴﴾ وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰی وَ عِیْسٰی وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۙ﴿۸۵﴾ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آپ کی ذریت میں سے بنایا گیا ہے، حالانکہ وہ آپ کی بیٹی کے بیٹے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ ان اسماء میں سے جو غیر منصرف ہیں ان کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے اور داؤد منصرف نہیں، کیونکہ عجمی اسم ہے، اور جب یہ فاعول کے وزن پر ہو تو اس میں الف لام لگانا اچھا نہیں ہوتا لہٰذا یہ منصرف نہیں۔ اور الیاس بھی عجمی اسم ہے۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اور قلبی نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے نواسے تھے۔

اعرج، حسن، اور قتادہ نے وَ اِلْیَاسَ کو الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور اہل حرمین، ابوعمرو اور عاصم نے وَ الْیَسَعَ کو لام مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا کوفیوں نے والَلَّیسع پڑھا ہے۔ اور اسی طرح کسائی نے بھی قرأت کی

ہے اور اس کی قرأت کا رد کیا ہے جس نے وَالَيَسَعَ پڑھا ہے۔ کہا: کیونکہ الیفعل نہیں کہا جا سکتا جیسا الیحیی نہیں کہا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: الیعمل اور الیحمد اور اگر یحیٰ کو نکرہ قرار دیا جائے تو پھر یقیناً تو الیحیی کہے گا۔ اور ابو حاتم نے اس کا رد کیا ہے جس نے اللَّيسع پڑھا ہے اور کہا ہے: لَيسع نہیں پایا جاتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ کلام عرب میں حیدر اور زینب موجود ہے۔ اس میں حق بات یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے، اور عجمہ قیاس کے ذریعہ نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ سماعاً لیا جاتا ہے اور عرب کثرت سے تغیر و تبدل کرتے ہیں۔ اور ایک اسم کا دو لغتوں میں آنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: جس نے دو لاموں کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی اصل لَيسع ہے، پھر اس پر الف لام تعریف کا داخل کر دیا گیا۔ اور اگر اس کی اصل یسع ہوتی تو پھر اس پر الف لام داخل نہ ہوتا، کیونکہ یہ (الف لام) یزید اور یشکر پر داخل نہیں ہوتا۔ یہ دونوں دو آدمیوں کے نام ہیں، کیونکہ یہ دونوں معرفہ اور علم ہیں۔ اور رہا لَيسع تو یہ نکرہ ہے تو اس پر الف لام تعریف کے لیے داخل ہو سکتا ہے، اور ایک لام کے ساتھ قرأت کرنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اکثر قرأت اسی کے مطابق ہے۔ اور مہدوی نے کہا ہے: جس نے ایک لام کے ساتھ الیسع پڑھا ہے تو اس میں اسم یسع ہے، اور اس پر الف لام زائدہ داخل کر دیا گیا ہے جیسا کہ الخمسة عشر میں الف لام زائدہ ہے اور اسی طرح اس قول میں بھی ہے:

وجدنا اليَزِيدَ بنَ الوليد مباركاً شَديداً بأعباء الخلافة كاهِلهُ

اس میں الیزید پر الف لام زائدہ ہے۔

اور انہوں نے فعل مضارع پر بھی الف لازم زائدہ داخل کیا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

فيستخرج اليَرْبُوعَ من نافِقَائه ومن بيته بالشِّيخة اليَتَقَصَّعُ

اس میں مراد الذی يَتَقَصَّعُ ہے۔

قشیری نے کہا ہے: اسے لام کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور معنی ایک ہے، کیونکہ یہ ایک مشہور و معروف نبی علیہ السلام کا اسم گرامی ہے، جیسا کہ اسماعیل اور ابراہیم علیہما السلام، لیکن یہ ان اسماء سے خارج ہے جو الف لام داخل کرنے کے سبب اسماء عجمیہ ہیں۔ اور ایک قوم کو وہم ہوا ہے کہ الیسع الیاس علیہ السلام ہیں، حالانکہ اس طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے۔ اور وہب نے کہا ہے، الیسع صاحب الیاس تھے، اور یہ دونوں حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الیاس ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے دادا تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ الیاس ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نہیں، بلکہ حضرت الیسع حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

اور ''لوط'' عجمی اسم ہے اور اپنے خفیف ہونے کی بنا پر منصرف ہے۔ اس کا مادہ اشتقاق عنقریب سورۂ اعراف میں آئے گا۔

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

''اور ہدایت دی ان کے کچھ باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کو اور ہم نے چن لیا ان (سب) کو

اور ہدایت دی ان (سب) کو راہ راست کی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اس میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ہم نے ان کے باپ دادوں، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو ہدایت دی۔

وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں خالص کر دیا، اور یہ اہل لغت کے نزدیک بمعنی اِختَرنَاھم (ہم نے انہیں چن لیا) ہے۔ یہ جَبَیْتُ الماءَ فی الحوض سے مشتق ہے یعنی میں نے پانی حوض میں جمع کر لیا۔ اور اجتباء کا معنی وہ شی ہے جسے تو چن رہا ہے اسے اپنے خواص کے ساتھ ملا رہا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: جَبَیْتُ الماءَ فی الحوض جبیا یہ مقصود ہے (یعنی میں نے پانی کو حوض میں بند کر دیا) اور الجابیہ کا معنی حوض ہے، جیسے کسی نے کہا:

کجابیۃ الشیخ العراقی تفهق

اور اصطفاء اور ھدایۃ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

''یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ جس کی چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتا ان سے وہ (عمل) جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا یعنی اگر وہ میرے سوا کسی کی عبادت کرتے تو یقیناً ان کے اعمال ضائع ہو جاتے، لیکن میں نے انہیں محفوظ رکھا، بچا لیا۔ حبوط کا معنی بطلان (باطل ہونا) ہے۔ اس کا بیان سورہ البقرہ میں گزر چکا ہے (1)۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَ كَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ۝

''یہ وہ لوگ تھے ہم نے عطا کی تھی جنہیں کتاب اور حکمت اور نبوت تو اگر انکار کریں اس کا یہ (مکہ والے) تو ہم نے مقرر کر دیئے ہیں اس کو ماننے کے لیے ایسے لوگ جو اس کے ساتھ سفر کرنے والے نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ترکیب کلام میں یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور حکم کا معنی علم اور فقاہت ہے۔ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا تو اگر وہ ہماری آیات کا انکار کریں۔ هٰۤؤُلَآءِ آپ کے زمانے کے کفار اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ فَقَدْ وَ كَّلْنَا یہ جواب شرط ہے۔ یعنی تو ہم نے اس کے ساتھ ایمان لانے کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ مراد اہل مدینہ میں سے انصار ہیں اور اہل مکہ میں سے مہاجرین ہیں۔

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 455

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے بعد فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

ابو رجاء نے کہا ہے: مراد ملائکہ ہیں(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ جن و انس اور ملائکہ میں سے ہر مومن کے لیے عام ہے۔ اور بِكٰفِرِيْنَ میں با زائدہ ہے اور برائے تاکید ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہدات دی تھی اللہ نے تو انہیں کے طریقے کی پیروی کرو۔ آپ فرمایئے: میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ قرآن) پر کوئی اجرت، نہیں ہے وہ (قرآن) مگر نصیحت سارے جہانوں کے لیے''

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اقتدہ! کا معنی ہے: طلبُ موافقةِ الغیرِ فی فِعلِہ کسی غیر کے فعل میں اس کی موافقت اور پیروی کرنا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اِصْبِرْ كَمَا صَبَرُوْا تم صبر کرو جیسے انہوں نے صبر کیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کا معنی ہے تم توحید اور احکام شرعیہ میں ان کی پیروی کرو، حالانکہ وہ احکام مختلف ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت سے ان انبیاء علیہم السلام کی شرائع کی پیروی اور اتباع واجب ہونے پر استدلال کیا ہے ان امور میں جن میں نص موجود نہیں۔

جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک آدمی کو زخمی کر دیا تو ان کا جھگڑا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قصاص لازم ہے، قصاص لازم ہے''۔ تو ام الربیع نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فلانہ سے قصاص لیا جائے گا؟ قسم بخدا اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ اے ام الربیع! قصاص تو کتاب اللہ کا حکم ہے''۔ اس نے عرض کی: قسم بخدا! اس سے کبھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔

راوی نے بیان کیا: پس وہ اپنے (موقف پر) قائم رہی یہاں تک کہ انہوں نے دیت کو قبول کر لیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنّ من عبادِ اللہ مَنْ لَو اَقْسَمَ عَلَى اللہِ لَاَبَرَّهٗ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھالیں تو وہ اسے یقیناً پوری فرما دیتا ہے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس قول باری تعالیٰ پر موقوف کر دیا۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الآیہ (المائدہ: 45) (اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لیے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان)۔

اور کتاب اللہ میں اس آیت کے سوا کہیں بھی دانت کے قصاص کے بارے کوئی نص موجود نہیں، اور یہ تورات کے حکم کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 389

بارے خبر ہے اور اس کے باوجود آپ نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اور اس پر اسے موقوف کر دیا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے بڑے بڑے اصحاب نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اور یہ کہ جو کچھ اس میں پایا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ ابن بکیر نے کہا ہے: یہی وہ ہے جس کا تقاضا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کرتے ہیں اور اس میں بہت سے اصحاب مالک، اصحاب شافعی اور معتزلہ نے اختلاف کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ تقیید کا احتمال رکھتی ہے، سوائے ان امور کے جن کی اخبار تم پر بیان کی گئیں اور ان کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود نہیں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے سورۂ ص کے سجدہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ ''ص'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو یہ پڑھتا ہے وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اور حضرت داؤد علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم تمہارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ حمزہ اور کسائی نے اقْتَدِهْ ۭ قُلْ وصل کلام میں بغیر ہا کے پڑھا ہے اور ابن عامر نے اقتدھی قل قرأت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ ہا حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے ہوتی ہے اور ہا کے ساتھ اور نہ اس کے بعد کوئی واؤ یا یا مضمر ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ اور جس نے غلطی سے اجتناب کیا ہے اور سواد اعظم کی اتباع اور پیروی کی ہے تو اس نے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ پڑھا ہے۔ پس اس نے وقف کیا ہے اور وصل نہیں کیا، کیونکہ اگر وہ ہا کے ساتھ وصل کرے تو یہ غلطی ہے اور اگر اسے حذف کرے تو یہ سواد اعظم کی مخالفت ہے اور جمہور نے حالت وصل میں نیت وقف سے نہ نیت ادراج کی بنا پر رسم الخط میں اس کے ثابت ہونے کی اتباع کرتے ہوئے اسے ہا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن عیاش اور ہشام نے اقْتَدِهِ قُلْ ہا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ غلط ہے عربی میں جائز نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا یعنی میں تم سے اس (تبلیغ) قرآن پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ اِنْ هُوَ یعنی یہ قرآن نہیں ہے۔ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ مگر یہ مخلوق کے لیے نصیحت ہے۔ اور ہدایت کی نسبت ان کی طرف کی اور فرمایا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ان کے سبب ہدایت واقع ہونے کی وجہ سے (انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو) اور فرمایا: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، کیونکہ وہی ہدایت کا خالق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ص، حدیث نمبر 4433، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3388

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

''اور نہ قدر پہچانی انہوں نے الله کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا، جب کہا انہوں نے کہ نہیں اتاری الله نے کسی آدمی پر کوئی چیز (یعنی وحی)، آپ پوچھیے: کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے لے آئے تھے موسیٰ (جو سراسر) نور تھی اور (سراپا) ہدایت تھی لوگوں کے لیے تم نے بنالیا ہے اسے الگ الگ کاغذ ظاہر کرتے ہو اسے اور چھپا لیتے ہو (اس کا) بہت سا (حصہ) اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا۔ آپ فرمادیجئے! پھر چھوڑ دیجئے انہیں (تاکہ) وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ یعنی اس حق کے بارے میں جو اس کے لیے واجب (ثابت) ہے اور جو اس کے لیے محال ہے اور جو جائز ہے (یعنی انہوں نے الله تعالیٰ کے بارے میں واجب، محال اور جائز کی پہچان ہی نہیں کی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اس پر ایمان ہی نہیں لائے کہ وہ ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی عظمت کا حق تھا۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: لِفُلَانٍ قَدْرٌ (فلاں کی قدر اور عظمت ہے) اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انہوں نے کہا: **مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ** تو انہوں نے الله تعالیٰ کی نسبت اس طرف کر دی کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی حجت قائم نہیں کرتا، اور نہ وہ انہیں ایسے امور کے بارے حکم دیتا ہے جن میں ان کی اصلاح اور فائدہ ہو۔ تو اس طرح انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی تعظیم کا حق تھا اور نہ انہوں نے اس طرح الله تعالیٰ کو پہچانا جس طرح اسے پہچاننے کا حق تھا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا: یعنی انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا۔ ما عرفوا اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِه نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین معنی ہے، کیونکہ قدرت الشیٔ و قدرته کا معنی ہے میں نے اس کی مقدار کو پہچان لیا۔ اور اس پر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: **اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ** یعنی انہوں نے اس کی معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا، جب انہوں نے کوئی رسول بھیجے جانے کا انکار کیا۔ دونوں معنی باہم قریب ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے الله تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی جس طرح ان کی قدر کرنے کا حق تھا۔ ابو حیوۃ نے **وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدَرِهٖۤ** دال کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ (1)

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 82

اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: (کہ یہ قول کہنے والے) مشرکین قریش ہیں۔ اور حسن اور سعید بن جبیر نے کہا ہے جس نے یہ قول کیا تھا وہ ایک یہودی تھا۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ سدی نے کہا ہے: اس کا نام فنحاص تھا (1)۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے بھی مروی ہے انہوں نے کہا: وہ مالک بن صیف تھا، وہ آیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنے لگا تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسے فرمایا: "میں تجھے اس کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔ کیا تو تورات میں نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ انتہائی موٹے اور بھاری عالم کو مبغوض جانتا ہے"؟۔ وہ خوب موٹا عالم تھا، تو وہ غضب میں آگیا اور کہنے لگا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ تو اس کے ساتھ موجود ساتھیوں نے اسے کہا: تیری ہلاکت اور بربادی ہو! کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نہیں؟ تو اس نے پھر کہا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نازل نہیں کی (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس کے قول کو توڑنے اور اس کے رد کے لیے فرمایا: قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ یعنی تم نے اسے الگ الگ کاغذ میں کر دیا ہے۔ (بمعنی فی قراطیس۔ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا یہ ان یہودیوں کے بارے ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور دیگر احکام کو چھپایا۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى یہ مشرکین کو خطاب ہے اور قولہ: تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ یہ یہودیوں کو خطاب ہے اور قول باری تعالیٰ: وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ اس کی قرأت کے مطابق صحیح ہو سکتا ہے جس نے یَجْعَلُوْنَه قَرَاطِیْسَ یُبْدُوْنَهَا وَ یُخْفُوْنَ تمام کو یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تا کی قرأت کی بنا پر یہ تمام آیت یہود کے لیے ہوگی اور وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا کا معنی ہوگا۔ وعلمتم مالم تکونوا تعلمونہ انتم ولا اباؤکم (اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا) یہ معنی تورات نازل کرنے کے ساتھ ان پر احسان جتلانے کی بنا پر ہے۔ اور تورات کو صحف بنا دیا گیا اسی لیے ارشاد فرمایا: قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا یعنی تم کاغذات کو ظاہر کرتے ہو۔ اور یہ ان کی مذمت ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے قرآن کریم کو اجزاء میں لکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے وہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور یہ کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے۔ یا قل اللہ عَلَّمَكُمُ الکتاب یعنی آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتاب کا علم دیا ہے۔ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ یَلْعَبُوْنَ بمعنی لاعبین ہے۔ یعنی پھر تم اسے چھوڑ دو اس حال میں کہ وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں۔ اور اگر یہ جواب امر ہوتا تو پھر یلعبوا کہا جاتا۔ اور کلام کے معنی میں جھڑک اور تہدید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یجعلونہ۔

قول باری تعالیٰ: نُوْرًا وَّ هُدًى کے لیے محل صفت میں ہے اور پھر یہ صلہ میں ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مستانفہ ہو، اور تقدیر کلام ہوگی: یجعلونہ ذا قراطیس اور قول باری تعالیٰ: تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد، صفحہ 394　　2۔ ایضاً

قراطیس کی صفت ہو، کیونکہ نکرہ کی صفت جملہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور اس کے جملہ مستانفہ ہونے کا احتمال بھی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹۲

''اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اس کو بابرکت ہے، تصدیق کرنے والی ہے اس (وحی) کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) اور اس لیے تاکہ ڈرائیں آپ مکہ (والوں) کو اور جو اس کے اردگرد ہیں۔ اور جو ایمان لائے ہیں آخرت کے ساتھ وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر (بھی) اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَهٰذَا كِتٰبٌ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَنْزَلْنٰهُ یہ صفت ہے مُبٰرَكٌ یعنی اس میں برکت رکھی گئی ہے اور برکت کا معنی زیادتی اور اضافہ ہے۔ اور غیر قرآن میں حال ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اسی طرح مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ہے۔ یعنی وہ کتب جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ (قرآن کریم) شرک کی نفی کرنے اور توحید کے اثبات میں ان کی موافقت کرتا ہے۔

وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہاں مراد اس کے باسی اور رہنے والے ہیں۔ پس اس میں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی ہم نے قرآن کریم برکت اور ڈرانے کے لیے نازل فرمایا۔ وَ مَنْ حَوْلَهَا مراد جمیع آفاق ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ان سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ اور اس کا ایمان تو معتبر اور کافی نہیں جو آخرت کے ساتھ تو ایمان لائے لیکن حضور نبی کریم ﷺ پر اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا کہے کہ وحی کی گئی ہے میری طرف حالانکہ نہیں وحی کی گئی اس کی طرف کچھ بھی اور (کون زیادہ ظالم ہے اس سے) جو کہے کہ میں (بھی) نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے نازل کیا ہے اللہ نے۔ کاش! تم دیکھو جب ظالم موت کی سختیوں میں (گرفتار) ہوں اور فرشتے بڑھا رہے ہوں (ان کی طرف) اپنے ہاتھ (اور انہیں کہیں کہ) نکالو اپنی جان کو۔ آج تمہیں دیا جائے گا ذلت کا عذاب اس وجہ سے کہ تم بہتان لگاتے تھے اللہ تعالیٰ پر ناحق اور تم اس کی آیتوں (کے ماننے) سے تکبر کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ اَظْلَمُ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کوئی اس سے بڑھ کر ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰى اس سے جس نے جھوٹ گھڑا۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ پس اس نے گمان کیا کہ وہ نبی ہے۔ وَ لَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (حالانکہ اس کی طرف کوئی شی وحی نہیں کی گئی)

یہ آیت رحمان الیمامہ، اسود عنسی اور مسیلمہ کی بیوی سجاح کے بارے نازل ہوئی، ان تمام نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور ہر ایک نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی ہے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل فرمائی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طریقہ سے جس نے فقہ، سنت اور اس طریقہ سے جس پر اسلاف عمل پیرا رہے، اعراض کر لیا تو وہ کہنے لگتا ہے: میرے دل میں اس طرح واقع ہوا ہے، یا میرے دل نے مجھے اس طرح خبر دی ہے، پس وہ اسی کے مطابق فیصلے کرنے لگتے ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں واقع ہوتا ہے اور ان کے احساسات میں جو ان پر غالب آ جاتا ہے، اور وہ یہ مان کرنے لگتے ہیں کہ یہ ان کے دلوں کی کدورتوں سے صاف ہونے اور اغیار کے تصور سے ان کے خالی ہونے کے سبب ہے، پس ان کے لیے علوم الٰہیہ اور حقائق ربانیہ ظاہر ہو رہے ہیں، اور وہ کلیات کے اسرار پر واقفیت رکھتے ہیں اور جزئیات کے احکام جانتے ہیں پس وہ اس کے سبب تمام شریعتوں کے احکام سے مستغنی ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ احکام شرعیہ عام ہیں، ان کے ساتھ کند ذہنوں اور عام لوگوں پر حکم لگایا جاتا ہے، اور رہے اولیاء اور خواص لوگ تو وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہوتے۔ تحقیق اس میں آیا ہے جو وہ نقل کرتے ہیں کہ اپنے دل سے فتویٰ لو اگرچہ تجھے لوگوں نے فتویٰ دے رکھا ہو اور وہ اس پر حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ان علوم کے سبب جو ان پر ظاہر ہوئے اس سے مستغنی ہو گئے جو ان کا مفہوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھا۔ یہ قول زندقہ اور کفر ہے، اس کے قائل کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اور اس کے ساتھ سوال و جواب کی ضرورت اور حاجت نہ ہوگی، کیونکہ اس سے احکام کو گرانا (باطل کرنا) اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کو ثابت کرنا لازم آتا ہے۔ اس معنی کا مزید بیان عنقریب سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس میں مَنْ محل جر میں ہے۔ یعنی عبارت اس طرح ہے وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ قَالَ سَاُنْزِلُ (اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے کہا میں بھی نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے اللہ نے نازل کیا ہے) اور اس سے مراد وہ عبداللہ بن ابی سرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا، پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ اور اس کا سبب جو مفسرین نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب سورۃ المومنون کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے یہ آیت املا کرائی۔ جب آپ آخر میں اس قول تک پہنچے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (المومنون: 14) (پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا)

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 406

تو عبداللہ نے انسان کی تخلیق کی تفصیل میں بڑا تعجب کیا اور یہ کہنے لگا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۞ (المومنون) (بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے)۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ھکذا انزلت علی مجھ پر اسی طرح نازل کی گئی ہے۔ تو اس وقت عبداللہ کو شک لاحق ہو گیا اور اس نے کہا: اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو تحقیق میری طرف اسی طرح وحی کی گئی ہے جیسے ان کی طرف وحی کی گئی ہے، اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو تحقیق میں نے اسی طرح کہا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے۔ پس وہ اسلام سے مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ تو اسی کے بارے یہ قول ہے: وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اسے کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے(1)۔ اور اسے محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے شرحبیل نے بیان کیا ہے کہ آیت وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی وہ اسلام سے مرتد ہو گیا، اور جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور عبداللہ بن خطل اور مقیس بن صبابہ کو قتل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اگرچہ یہ لوگ غلاف کعبہ کے نیچے پائے جائیں، تو عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھاگ گیا۔ آپ اس کے رضاعی بھائی تھے۔ اس کی ماں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا تھا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے چھپائے رکھا یہاں تک کہ اہل مکہ کے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور اس کے لیے امان طلب کی، تو رسول اللہ ﷺ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر فرمایا نعم (ہاں)۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ما صمتُ إلّا لیقومَ إلیه بعضُكم فیَضرِبُ عُنقَه (میں خاموش نہیں رہا مگر صرف اس لیے کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن کاٹ دے (یعنی اسے قتل کر دے)۔ تو انصار میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ تو کیوں آپ نے میری طرف اشارہ نہیں کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: إنَّ النَّبِيَّ لَا يَنْبَغِي أن تكونَ له خائنةُ الأعين (بلاشبہ نبی کے لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ اس کی آنکھ خیانت کرے)(2)

ابو عمر نے بیان کیا ہے: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ایام فتح میں اسلام لایا اور خوب اچھی طرح اسلام لایا، اور اس کے بعد اس سے کوئی ایسا فعل ظاہر نہیں ہوا جو ناپسندیدہ اور منکر ہو۔ وہ قریش کے نجباء، صاحب عقل اور کریم اور سخی لوگوں میں سے ایک تھا، اور بنی عامر بن لوئی کے شہسواروں میں شمار تھا، پھر اس کے بعد 25ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مصر کا والی مقرر فرمایا اور 27ھ میں اس کے ہاتھ پر افریقہ فتح ہوا اور وہاں سے اس نے 31ھ میں سرزمین نوبہ سے اساود کی جنگ لڑی، اور اس نے اس کے ساتھ ایسی صلح کی جو صلح آج دن تک باقی ہے۔ اور 34ھ میں ارض روم سے صواری کی جنگ لڑی اور جب یہ اپنے وفدوں کے ساتھ واپس لوٹا تو ابن ابی حذیفہ نے اسے فسطاط میں داخل ہونے سے روک دیا، پس وہ عسقلان کی طرف چلا گیا اور وہیں مقیم ہو گیا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ رملہ میں مقیم رہا یہاں تک کہ فتنہ سے بھاگتے ہوئے فوت ہو گیا۔ اور اس نے اپنے رب کریم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 407 2۔ سنن ابی داؤد کتاب الجہاد، باب قتل الاسیر، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اس طرح دعا مانگی: اے اللہ! میرا آخری عمل صبح کی نماز کو بنادے۔ چنانچہ اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی اور پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ العادیات تلاوت کی، اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت پڑھی پھر اس نے اپنی دائیں طرف سلام پھیرا، پھر اپنی بائیں طرف سلام پھیرنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرلی۔

یہ سب یزید بن ابی حبیب وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور اس نے حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اس کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں کے اجتماع سے پہلے ہو چکی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ افریقہ میں فوت ہوئے۔ اور صحیح قول یہ ہے کہ ان کا وصال 36ھ یا 37ھ میں عسقلان میں ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ 36ھ میں فوت ہوئے۔ حفص بن عمر نے حکم بن ابان سے اور انہوں نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قرآن کریم کا معارض لایا اور اس نے کہا: والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا، فالخابزات خبزا، فاللاقمات لقما۔ (1)

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ، غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد سکرات الموت اور اس کی سختیاں ہیں۔ اور الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے۔ اور اس کی اصل وہ شی ہے جو چیزوں کو ڈھانک لیتی ہے اور انہیں چھپا لیتی ہے۔ اور اسی سے غَمَرَ الماءُ ہے (پانی نے اسے چھپالیا) پھر یہ لفظ شدائد اور تکالیف کے معنی میں وضع کیا گیا۔ اور اسی لیے غمرات الحرب ہے (یعنی جنگ کی سختیاں)

جوہری نے کہا ہے: الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے اس کی جمع غُمَر ہے جیسا کہ نَوبۃ کی جمع نُوَب ہے۔ قطامی نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وحَانَ لِتالِكَ الغُمَرِ انحِسَارُ

اور غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد موت کی تکالیف اور سختیاں ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ بَاسِطُوْۤا اصل میں باسطون تھا۔ کہا گیا ہے کہ فرشتے عذاب اور لوہے کے گرزوں کے ساتھ ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔

یہ حسن اور ضحاک سے مروی ہے اور یہ قول بھی ہے: ان کی ارواح قبض کرنے کے لیے (فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (الانفال: 50) (اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر) یہ آیت دونوں قولوں کو جمع کیے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے: بَسَطَ إليهِ يَدَهُ بِالمَكْرُوهِ (اس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ شدت اور سختی کے ساتھ آگے کیا)۔

اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنی جانوں کو عذاب سے خلاصی دلاؤ اگر تمہارے لیے ممکن ہو۔ اور یہ زجر و توبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم انہیں سختی کے ساتھ نکالو، کیونکہ بندۂ مومن کی روح اپنے رب کی ملاقات کے لیے بہت تیزی اور فرحت کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 459

ساتھ نکلتی ہے، اور کافر کی روح کو انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچ کر نکالا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے: اے خبیث نفس! تو نکل آ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی رسوائی کی طرف اس حال میں کہ تو بھی ناراض ہے اور وہ تجھ سے ناراض ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے(1)۔ اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قائل کے اس کے لیے اس قول کی مانند ہے جسے وہ عذاب دے رہا ہو: لَاُذِیْقَنَّكَ الْعَذَابَ وَلَاُخْرِجَنَّ نَفْسَكَ (میں یقیناً تجھے عذاب چکھاؤں گا اور تیری جان کو نکالوں گا) اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ وہ خود اپنی جانوں کو نہیں نکالتے بلکہ حضرت ملک الموت علیہ السلام اور ان کے ساتھی اسے قبض کرتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ کفار کو کہا جائے گا اس حال میں کہ وہ آگ میں ہوں گے اور امر کے عظیم ہونے کی وجہ سے جواب امر محذوف ہے، یعنی اگر تو ظالموں کو اس حال میں دیکھے تو یقیناً تو نے بہت بڑے عذاب کو دیکھا ہے۔ الْهُوْنِ اور الھوان معنی میں دونوں برابر ہیں (رسوائی) اور تَسْتَكْبِرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کو قبول کرنے سے تکبر اور نفرت کرتے ہو۔

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

''اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ اور تم چھوڑ آئے ہو جو ہم نے عطا فرمایا تھا تمہیں اپنے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں۔ بے شک ٹوٹ گئے تمہارے سارے رشتے اور کھو گئے تم سے جو تم دعویٰ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى یہ حشر سے عبارت ہے اور فُرَادٰى حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث کا ہے۔ ابوحیوہ نے فراداً تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے، اور وہ محل رفع میں فرادٌ نہیں کہتے۔ احمد بن یحییٰ نے فرادَ بغیر تنوین کے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: یہ ثلاث اور رباع کی مثل ہے۔ اور فرادی، فردان کی جمع ہے جیسا کہ سکاری، سکران کی جمع ہے اور کسالی، کسلان کی جمع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا واحد فرد ہے۔

اس میں را مجزوم ہے اور فرد را کے کسرہ کے ساتھ۔ اور فرد را کے فتحہ کے ساتھ اور فرید ہے۔ اور معنی یہ ہے: تم ہمارے پاس آ گئے ہو اکیلے اکیلے، تم میں سے ہر ایک منفرد ہے گھر والوں، مال اور اولاد میں سے کوئی ساتھ نہیں، اور نہ ہی ان میں سے کوئی مددگار ہے جو گمراہی میں تمہارے مصاحب تھے، اور انہوں نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا تم عبادت کرتے رہے۔ اعرج نے فردی بغیر الف کے پڑھا ہے جیسا کہ سکری اور کسلی ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ، حدیث نمبر 4251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی جس طرح تم پہلی بار اکیلے اکیلے پیدا کیے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ننگے بدن جیسا کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکلے، ننگے پاؤں، غیر مختون، ایک رنگ (بے عیب) ان کے ساتھ کوئی شے نہ ہوگی۔ اور علماء نے کہا ہے: بندے کو کل (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اور اس کے وہ تمام اعضاء ہوں گے جو اس کی ولادت کے دن تھے۔ پس جس کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا قیامت کے دن وہ اس پر لوٹا دیا جائے گا۔ یہی معنی ہے آپ کے قول غُرْلًا کا یعنی غیر مختون، یعنی ختنہ کے وقت جو حصہ کاٹ دیا گیا تھا وہ ان پر واپس لوٹا دیا جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں عطا کیا اور ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ اور خول کا معنی ہے: وہ غلام اور دیگر نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ یعنی تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا۔

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کی تم پرستش کرتے رہے اور جنہیں تم نے میرا شریک بنایا۔ مراد بت ہیں، اور مشرک کہتے تھے: بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اور اس کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ نافع، کسائی اور حفص نے ظرف ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھا ہے یعنی بَيْنَكُمْ، معنی یہ ہے تحقیق تمہارے درمیان تمہارے رشتے ٹوٹ گئے۔

لقد تقطع وصلكم بينكم اور وصل کے حذف پر یہ قول دلیل ہے وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ پس یہ ان کے درمیان اور ان کے شرکاء کے درمیان تعلق منقطع ہونے اور ایک دوسرے کو چھوڑنے پر دلیل ہے، جب کہ انہوں نے ان سے برأت اختیار کرلی اور وہ ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ اور ان کے لیے ان کا مقاطعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان سے اپنا رشتہ اور تعلق چھوڑ دیا۔ پس تقطع کے بعد الوصل کو مضمر کرنا اچھا ہے، کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ما نصب پر دلالت کرتا ہے یعنی لقد تقطع ما بينكم اور اس میں سوائے نصب کے کوئی اور جائز نہیں۔ کیونکہ تم نے جسے قطع کیا ہے اس کو ذکر کر دیا ہے اور وہ ما ہے گویا کہ یہ کہا: لقد تقطع الوصل بينكم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے لقد تقطع الامر بينكم (معاملہ تمہارے درمیان کٹ گیا)۔ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔ اور باقیوں نے بينكم رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے یہ اسم ظرف نہیں، پس فعل کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے لہٰذا اسے رفع دیا گیا۔ اور بین کے اسم ہونے کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اس پر حرف جر داخل ہے: وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (فصلت: 5) اور هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ (الکہف: 78) اور یہ بھی جائز ہے کہ نصب کی قرأت رفع کے معنی پر ہو، اور اسے نصب اس لیے دی گئی کیونکہ اس کا اکثر استعمال ظرف منصوب کی بنا پر ہے، حالانکہ یہ محل رفع میں ہے اور یہی اخفش کا مذہب ہے۔ پس اس اعتبار سے دونوں قرأتیں ہم معنی ہیں، لہٰذا جس طرح چاہے قرأت کرو وَضَلَّ عَنْكُمْ اور تم سے کھو گئے۔ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (وہ سب) جن کے ساتھ تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔

روایت ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو عرض کی: یا رسول اللہ!

صلی اللہ علیہ وسلم کتنا برا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھ رہے ہوں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس دن ان میں سے ہر آدمی اپنی فکر میں ہوگا جو اسے مستغنی کر دے گی نہ مرد عورتوں کی طرف دیکھیں گے اور نہ عورتیں مردوں کی طرف دیکھیں گی، وہ ایک دوسرے سے مشغول (غافل) ہوں گے''۔ یہ حدیث صحیح میں ثابت ہے اور اسی کی ہم معنی روایت مسلم نے نقل کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی پھاڑنے والا ہے دانے اور گٹھلی کو، نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، یہ ہے اللہ پس کدھر تم بہکے چلے جارہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ اللہ تعالیٰ کی صنعت و کاریگری کے عجائب کو شمار کیا گیا ہے جن میں سے ادنیٰ شی سے بھی ان کے الٰہ عاجز ہیں۔ الفلق کا معنی شق کرنا (پھاڑنا) ہے۔ یعنی وہ مردہ گٹھلی کو پھاڑتا ہے اور اس سے سبز پتے نکالتا ہے، اور اسی طرح دانہ بھی ہے اور وہ سبز پتوں سے مردہ گٹھلی اور دانے نکالتا ہے۔ اور یہی معنی ہے کہ وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ حسن اور قتادہ سے یہی منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَالِقُ کا معنی خالق ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فلق سے مراد وہ شق اور چیر ہے جو دانے اور گٹھلی میں ہوتا ہے اور النوی، نواۃ کی جمع ہے، اور یہ ہر اس شی میں جاری ہو سکتا ہے جس میں گٹھلی ہو مثلاً کشمش اور اخروٹ۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ وہ زندہ انسان کو مردہ نطفہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ نطفہ زندہ انسانوں سے نکالتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: والذی فلق الحبة وبرأ النسمة إنه لعهد النبی الأمی صلی اللہ علیہ وسلم إلی أن لا یحبنی إلا مؤمن ولا یبغضنی إلا منافق (1) (قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور آدمی کو پیدا فرمایا! بلاشبہ اس نے میرے بارے میں حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا کہ مجھ سے سوائے مومن کے کوئی محبت نہیں کرے گا اور مجھ سے سوائے منافق کے کوئی بغض نہ رکھے گا)۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ یہ ترکیب کلام میں مبتدا اور خبر ہیں۔ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ پس تم حق سے کہاں پھرے جارہے ہو اس کے باوجود کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت ملاحظہ کر رہے ہو؟۔

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ، الفصل الاول

الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾

''وہ نکالنے والا ہے صبح کو (رات کی تاریکی) سے اور بنایا ہے اس نے رات کو آرام کے لیے اور (بنایا ہے) سورج اور چاند کو حساب کے لیے یہ اندازہ ہے (مقرر کیا ہوا) سب سے زبردست سب کچھ جاننے والے کا''۔

قولہ تعالیٰ: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی نعت (اور صفت) ہے، یعنی ذالکم اللہ ربکم فالق الاصباح۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے إن اللہ فالقُ الإصباح (بے شک اللہ تعالیٰ صبح کو نکالنے والا ہے) الصبح اور الصباح سے مراد اول النہار (دن کا پہلا حصہ) ہے، اور اسی طرح الْاِصْبَاحِ بھی ہے۔ یعنی وہ ہر دن صبح کو نکالنے والا ہے، مراد فجر ہے۔ اور الْاِصْبَاحِ، أصبح کا مصدر ہے۔ اور معنی ہے: وہ تاریکیوں سے روشنی کو پھاڑ کر نکالنے والا اور اسے ظاہر کرنے والا ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کا معنی ہے خالقُ النهارِ (دن کو پیدا کرنے والا) یہ معرفہ ہے نحویوں میں سے کسی کے نزدیک اس میں تنوین جائز نہیں ہے۔

حسن اور عیسیٰ بن عمر نے فالقُ الاصباح ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہ صبح کی جمع ہے۔ اعمش نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فلقَ الأصباحِ فعل کے وزن پر پڑھا ہے ہمزہ مسور ہے اور حا منصوب ہے۔ حسن عیسیٰ بن عمر، حمزہ اور کسائی نے وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور دونوں مقامات میں فَالِقُ کے معنی پر محمول کرتے ہوئے الَّيْلَ کو نصب دی ہے، کیونکہ وہ بمعنی فلق ہے، کیونکہ وہ امر ہے جو ہو چکا پس اسے معنی پر محمول کیا گیا۔

اور یہ بھی کہ اس کے افعال ماضیہ ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ، اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً پس اول کلام کو آخر پر محمول کیا گیا ہے۔ فعل کو مضمر کرنے کی بنا پر الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کو نصب دینے پر ان کا اجماع اسے تقویت دیتا ہے۔ انہوں نے اسے فاعل پر محمول نہیں کیا کہ وہ اسے خبر دیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے اور نحاس نے کہا ہے: تحقیق یزید بن قطیب سکونی نے لفظ پر عطف کرتے ہوئے جر کے ساتھ اس طرح قرأت کی ہے وجاعلُ اللّيلِ سكنًا والشمسَ والقمرَ حُسْبَانًا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مکی اور مہدوی وغیرہما قراء سبع کا اجماع مراد لیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور یعقوب نے اس سے رویس کی روایت میں وجاعلُ اللّيلِ ساكنا پڑھا ہے اور اہل مدینہ نے سکون کے محل کی وجہ سے وجاعلُ اللّيلِ سكنا پڑھا ہے۔ اور موطا میں یحییٰ بن سعید سے یہ روایت ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے تھے اور کہتے تھے: اللهم فالقُ الإصباحِ وجاعلُ اللّيلِ سكنًا والشمس والقمر حسبانا إقضِ عَنِّي الدينَ وأغْنِنِي من الفقرِ وأمتعني بسَمْعِي وبَصَرِي وقُوَّتِي في سبيلك (اے اللہ! صبح کو نکالنے والے (رات کی تاریکی سے) اور رات کو بنانے والے آرام کے لیے اور سورج اور چاند کو بنانے والے حساب کے لیے! مجھ سے قرض ادا فرما دے اور مجھے فقر و افلاس سے غنی کر دے اور مجھے اپنے راستے میں میرے کانوں، میری آنکھوں اور میری قوت و طاقت کے ساتھ ہمیشہ فائدہ پہنچا)

اور اگر کہا جائے: کیسے یہ فرمایا: وأمتعني بسَمْعِي و بَصَرِي اور نسائی اور ترمذی وغیرہما کی کتاب میں ہے واجعَلْهُ الوارِثَ مِنِّي (اور اسے میرا وارث بنا دے) اور وہ تو بدن کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے؟ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ کلام

میں مجاز ہے اور معنی یہ ہے: اللھم لَا تَعۡدِمۡهُ قَبۡلِي (اے الله! اسے مجھ سے پہلے معدوم نہ کرنا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں سمع اور بصر سے مراد حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، کیونکہ ان دونوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ھما السمعُ والبصرُ(1) (یہ دونوں کان اور آنکھ ہیں) یہ تاویل حقیقت سے بہت دور ہے، بلاشبہ ان دونوں سے مراد دو اعضاء ہیں (یعنی کان اور آنکھ) اور حُسۡبَانًا کا معنی ہے یعنی ایسے حساب کے لیے جس کے ساتھ بندوں کے مصالح اور فوائد متعلق ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَّالشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا کے تحت کہا ہے ای الحساب یعنی حساب لگانے کے لیے۔ اور اخفش نے کہا ہے: حسبان، حساب کی جمع ہے، جیسا کہ شہاب اور شہبان ہیں۔ اور یعقوب نے کہا ہے: حسبان مصدر ہے حسبتُ الشیٔ کا أحسبه حسبانا و حسبانا و حسبة اور الحساب اسم ہے۔ اور ان کے سوا دوسرے نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے سورج اور چاند کی چال کو حساب کے مطابق رکھا ہے اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔

تو اس کے ساتھ الله تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وحدانیت پر دلیل بیان فرمائی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حُسۡبَانًا کا معنی ضیا (روشنی) ہے اور الحسبان کا لغت میں معنی آگ ہے۔ تحقیق الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ يُرۡسِلَ عَلَيۡهَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ (الکہف: 40) (اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حُسۡبَانًا کا معنی نار (آگ) ہے۔ اور الحسبانة کا معنی ہے: چھوٹا تکیہ۔

وَ هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا بِهَا فِيۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞

''اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے ستاروں کو تاکہ سیدھی راہ معلوم کر سکو ان سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں، بے شک ہم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں دلائل ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوۡمَ الله تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کو بیان فرمایا ہے اور ستاروں میں بہت زیادہ منافع اور فوائد ہیں۔ اس آیت میں ان کے بعض منافع ذکر فرمائے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی معرفت اور پہچان شرعاً مستحب ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَ حِفۡظًا مِّنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ مَّارِدٍ ۞ (الصافات) (اور اسے محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے) وَ جَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ (الملک: 5) (اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ) یہاں جَعَلَ بمعنی خلق ہے قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ یعنی ہم نے مفصل دلائل بیان کر دیئے ہیں تاکہ اعتبار میں یہ انتہائی بلیغ ہو جائیں۔ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ اہل علم کو اس لیے خاص فرمایا، کیونکہ یہی لوگ ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّفۡقَهُوۡنَ ۞

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما الفصل الثانی

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے پھر (تمہارے لیے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی، بے شک ہم نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) سمجھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: **وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ** اس میں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ سورت کی ابتدا میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ **فَمُسْتَقَرٌّ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر، حضرت حسن، حضرت ابو عمرو، حضرت عیسیٰ، اعرج، شیبہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے، مگر جنہوں نے کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک تقدیر عبارت فمنها مستقر ہے اور جنہوں نے فتحہ دیا ہے ان کے نزدیک لها مستقر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس اس کے لیے ٹھہرنے کی جگہ ہے، رحم میں اور امانت رکھے جانے کی جگہ اس زمین میں ہے جس میں وہ مرے گا۔ یہ تفسیر قاف کے فتحہ پر دلالت کرتی ہے، اور حسن نے کہا ہے: پس ٹھہرنے کی جگہ قبر میں ہے۔ اور اکثر مفسرین کہتے ہیں: مستقر وہ جگہ ہے جو رحم میں تھی اور مستودع وہ ہے جو صلب میں تھی۔ اسے حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے مستقرٌ فی الأرض، و مستودعٌ فی الأصلاب (ٹھہرنے کی جگہ زمین میں ہے اور امانت رکھے جانے کی جگہ اصلاب میں ہے)(1)

حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے پوچھا کیا تو نے شادی کی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ تیری پشت سے انہیں نکالے گا جنہیں اس میں بطور ودیعت رکھا ہوا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مستقر وہ ہے جسے پیدا کیا جائے اور مستودع وہ ہے جسے پیدا نہ کیا گیا ہو۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: مستودع عند الله (اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھے جانے کی جگہ ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور قرآن کریم میں ہے **وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ** (توبہ) (اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقرر تک) استیداع کا اشارہ ان کے قبر میں ہونے کی طرف یہاں تک کہ انہیں حساب کے لیے وہاں سے اٹھا لیا جائے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں پہلے ہو چکا ہے۔ **قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ** حضرت قتادہ نے فرمایا: فَصَّلْنَا کا معنی ہے ہم نے بیان کر دیا (اور ہم نے پختہ کر دیا یعنی بمعنی بینا و قدرنا، والله اعلم)۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 435

''اور وہی ہے جس نے اتارا بادل سے پانی، تو ہم نے نکالی اس کے ذریعے سے اگنے والی ہر چیز پھر ہم نے نکال لیں اس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں، اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اس کے گابھے اور گچھے نیچے جھکے ہوئے اور (ہم نے پیدا کیے) باغات انگور اور زیتون اور انار کے بعض (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ دیکھو ہر درخت کے پھل کی طرف جب وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اس کے پکنے کو، بے شک ان میں نشانیاں ہیں (اس کی قدرت کاملہ کی) اس قوم کے لیے جو ایمان دار ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور وہی ہے جس نے بادل سے بارش نازل فرمائی۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اس کے ذریعے ہم نے اگنے والی چیزوں کی ہر قسم ہم نے نکالی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر حیوان کا رزق ہم نے نکالا۔ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا اخفش نے کہا ہے: یعنی اخضر (یعنی پھر ہم نے اس سے سبزہ نکالا) جیسا کہ عرب کہتے ہیں: أرِنيها نمرة أرِكها مطِرة (مجھے سفید دھبوں والا بادل دکھاؤ، میں تجھے بارش دکھاؤں گا۔ یعنی کالے اور سفید دھبوں والے بادل بارش ضرور برساتے ہیں) اور الخضر سے مراد سبزیوں کی ہریالی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس سے مراد گندم، جو، سفید جو، مکئی، چاول اور عام قسم کے دانے تھے۔

نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا یعنی ان میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوتے ہیں جیسے سٹہ ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ فراء نے غیر قرآن میں ماقبل پر عطف کرتے ہوئے قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ پڑھنا جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: قُنوان۔ فراء نے کہا ہے: یہ بنی قیس کی لغت ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: قِنوان اور بنی تمیم کہتے ہیں: قنیان پھر واحد میں ان تمام کا اتفاق ہے۔ اور وہ کہتے ہیں: قِنْوٌ اور قَنْوٌ کھجور کا گابھا شگوفہ پھوٹنے سے پہلے بند ہوتا ہے۔ اور اغریض (شگوفہ) کو بھی طلع (گابھا) کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور طلع وہ ہے جو کھجور کا خوشہ دکھائی دیتا ہے۔ قنوان، قنو کی جمع ہے اور اس کا تثنیہ قنوان ہے جیسے صنو اور صنوان ہے (یہ نون کے کسرہ کے ساتھ ہے)۔ اور اس کی جمع بھی تثنیہ کے وزن پر آئی ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: تثنیہ صنوانِ ہے اور جمع صنوانٌ ہے (یعنی اس میں نون مرفوع ہے) اور القنو کا معنی ہے خوشہ۔ اور اس کی جمع القنوان اور الاقناء ہے، جیسے اس قول میں ہے: طويلةُ الأقناء والأثاكل کسی اور نے کہا ہے: أقناء جمع قلت ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: ابن ہرمز نے قنوان قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے قاف کا ضمہ بھی مروی ہے اور فتحہ کی صورت میں یہ جمع غیر مکسر کا اسم ہے، یہ قائم مقام رکب کے ہے سیبویہ کے نزدیک، اور قائم مقام باقر اور حامل کے ہے۔ کیونکہ فعلان جمع کی امثلہ میں سے نہیں ہے اور قاف کو ضمہ اس بنا پر دیا گیا ہے کہ یہ قنو کی جمع ہے اور اس کا معنی خوشہ ہے یعنی العذق عین کے کسرہ کے ساتھ اور یہی کباسہ ہوتا ہے اور یہی عنقود النخلہ (کھجوروں کا گچھا) ہے اور العَذق عین کے فتحہ کے ساتھ نفس کھجور کو کہتے ہیں (مراد کھجور کا پھل دار درخت ہے)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قنوان کا معنی کھجور کے درخت کا گوند بھی ہے۔ دَانِيَةٌ یعنی قریب۔ جنہیں کھڑے ہونے والا اور بیٹھنے والا سبھی حاصل کر سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم وغیرہما سے یہ مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ان میں سے کچھ قریب ہیں اور کچھ بعید ہیں۔ اور اسے کلام سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اسی کی مثل سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ (النحل:81) بھی ہے۔

اور خاص طور پر قریب کا ذکر کیا ہے، کیونکہ آیت میں مقصود اپنی قدرت کا ذکر اور نعمت کے ساتھ احسان جتلانا ہے اور احسان اسی میں ہوتا ہے جو قریب ہو اور اکثر اسے حاصل کیا جا سکتا ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ یعنی ہم نے باغات پیدا کیے۔ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم نے وَّ جَنّٰتٍ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں سے صحیح یہی ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے اس قرأت کا انکار کیا ہے، حتیٰ کہ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ محال ہے، کیونکہ کھجوروں کے باغات نہیں ہوتے۔ نحاس نے کہا: قرأت جائز ہے اور تاویل اس طور پر نہیں ہے، بلکہ مبتدا ہونے کی بنا پر اسے رفع دیا گیا ہے اور خبر محذوف ہے (تقدیر عبارت ہے) ولهم جنات (اور ان کے لیے باغات ہیں) جیسا کہ قراء کی ایک جماعت نے وَ حُوْرٌ عِیْنٌ ﴿۲۲﴾ (الواقعہ) پڑھا ہے۔ اور اس کی مثل کو سیبویہ، کسائی اور فراء نے جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور اسی بنا پر وحوراً عیناً بھی ہے اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

جئني بمثلِ بني بَدْرٍ لقومهم　　أو مثلَ أُسْرَةِ مَنْظُورِ بن سيارِ

اور کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ، اخرجناها (یعنی انگور کے باغات ہم نے پیدا کیے) یہ اسی طرح ہے جیسے تمہارا یہ قول ہے: أكرمتُ عبدَالله وأخوه، ای و أخوه اكرمتُ أيضا (یعنی میں نے عبداللہ کی تکریم کی اور اس کے بھائی کی بھی ہم نے تکریم کی) اور رہے زیتون اور رمان کے الفاظ تو ان میں بالاجماع نصب کے سوا کوئی اعراب جائز نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَّ جَنّٰتٍ رفع کے ساتھ قنوان پر لفظاً معطوف ہے، اگرچہ معنی میں یہ اس کی جنس میں سے نہیں ہے۔

وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ یعنی وہ پتوں میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، یعنی زیتون کے پتے تمام ٹہنی پر ہونے اور اپنے حجم کے اعتبار سے انار کے پتوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں لیکن ذائقے میں وہ ان جیسے نہیں ہیں۔ حضرت قتادہ وغیرہ سے یہ مروی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ دیکھنے میں ایک جیسے ہیں اور ذائقے میں ایک جیسے نہیں ہیں، جیسا کہ دو انار اپنے رنگ میں ایک جیسے ہوتے ہیں اور اپنے ذائقے میں مختلف ہوتے ہیں۔ انار اور زیتون کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں ان (عربوں) کے قریب تھے اور یہ دونوں ان کے نزدیک ذی قدر تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ (الغاشیہ) اس میں انہیں اونٹ کی طرف دیکھنے کی دعوت دی کیونکہ یہ ایسا جانور ہے جس کی پہچان وہ سب سے زیادہ رکھتے تھے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ یعنی تم عبرت کی نظر سے دیکھو نہ کہ ایسی نظر سے جو غور و فکر سے خالی ہو۔ اور ثمر لغت میں درخت چننے کو کہتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ثُمُرِهٖ ثا اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں میں فتحہ پڑھا ہے اور یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ بقرۃ اور بقر، شجرۃ اور شجر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ثمر سے مراد مال کی مختلف اقسام ہیں۔ اور ثمر سے مراد کھجور کا پھل ہے گویا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق معنی یہ ہوگا۔ دیکھو ان مالوں کی طرف جن سے پھل حاصل ہوتا ہے۔ ثمر ثا اور م دونوں کے ضمہ کے ساتھ ثمار کی جمع ہے اور اس سے مراد پھل دار مال ہے۔ اور اعمش سے ثُمْرہ ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمْر ثَمَرۃ کی جمع ہو جیسا کہ بَدَنۃ اور بُدْن ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمُر جمع الجمع ہو، پس آپ کہیں گے: ثمرۃ و ثمار و ثمر جیسا کہ حمار اور حمر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ ثمرۃ کی جمع ہو جیسا کہ خشبۃ کی جمع خشب ہے نہ کہ جمع الجمع ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَنْعِهٖ محمد بن سمیقع نے ویانعہ پڑھا ہے اور ابن محیصن اور ابن ابی اسحاق نے ویُنْعِه یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض اہل نجد کی لغت ہے کہا جاتا ہے: یَنَعَ الثمر (پھل پک گیا) یَیْنَعُ اور الثمر یانع۔ أینع یونع (والثمر مُونِع)۔ اس کا معنی ہے پھل کا پک جانا۔ ینع اور أینع تب کہا جاتا ہے جب پھل پک جائے اور اسے پالیا جائے۔ حجاج نے اپنے خطبہ میں کہا تھا: أری رؤسا قد أینَعَتْ وحان قِطافها (میں بعض سروں کو دیکھ رہا ہوں وہ پک چکے ہیں اور انہیں توڑنے کا وقت آپہنچا ہے)۔

ابن الانباری نے کہا ہے: الینع یانع کی جمع ہے، جیسا کہ راکب اور رکب، اور تاجر و تجر ہیں۔ مراد بہت زیادہ پکنے والا پھل ہے اور فراء نے کہا ہے: أینع، ینع کی نسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہے احمر (سرخ) اور اسی سے وہ بھی ہے جو حدیث ملاعنہ میں مروی ہے: إنْ ولدته أحمر مثل الیَنَعة (اگر اس نے بچے کو پکے ہوئے پھل کی مانند سرخ جنا) اور یہی خرزہ حمراء (سرخ پتھر) ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ عقیق ہے یا اس کی کوئی قسم ہے۔

پس یہ آیت اس کے لیے دلیل ہے جس نے تدبر کیا اور قلب و نظر کے ساتھ دیکھا اور خوب نظر و فکر کرتے ہوئے دیکھا کہ تبدیلیوں کے لیے کسی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضرور ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ پس تم اسے دیکھتے ہو کہ یہ پہلے طلع (گابھا) ہے پھر جب گابھا پھٹ گیا تو یہ اغریض (شگوفہ) ہو گیا۔ اور اغریض کو ضحک کا نام بھی دیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد بلح پھر سیاب، پھر جدال جب کہ یہ سبز ہو اور گول ہو اس سے پہلے کہ یہ سخت ہو، پھر جب یہ بڑھ جائے تو بسر، پھر جب سرخ ہو جائے تو زہو کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: أزهی یُزهی، پھر جب اس میں پکنے کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو یہ مُوَکت کہلاتی۔ اور اگر یہ آثار ذنب (پیچھے) کی جانب سے ظاہر ہوں تو یہ مُذَنِّب کہلاتی ہے اور یہی تَذْنُوب ہے پھر جب یہ نرم ہو جائے تو یہ ثَعْدۃ کہلاتی ہے اور جب یہ نصف پک جائے تو اس کا نام مُجَزِّعَة ہے اور جب دو تہائی تک پک جائے تو یہ حُلْقانہ کہلاتی ہے اور جب یہ ساری پک جائے تو یہ مُنْسِبة کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: رطب مُنْسَبِت، پھر جب یہ

خشک ہو جاتی ہے تو تمر بن جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کر کے، اس میں تغیر اور تبدیلی لا کر اور عدم سے اسے وجود عطا کر کے اپنی وحدانیت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کیا ہے اور یہ کہ اسے بنانے والا قادر اور عالم ہے۔ اور یہ دوبارہ اٹھائے جانے کے جواز پر دلیل ہے۔ اس طرح کہ وہ نباتات کو خشک ہونے کے بعد پھر وجود اور تازگی عطا فرماتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: يَنَعَ الثمرُ يَيْنَعُ وَيَيْنِعُ يَنْعًا وَيُنْعًا وَيُنُوعًا اس کا معنی ہے پھل پک گیا۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھی طرح پکنا وہ ہوتا ہے جو بغیر فساد کے ہو اور اس میں نقش (کانٹوں کے ساتھ سوراخ کرنا) نہ ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقش یہ ہے کہ اہل بصرہ پھل میں سوراخ کرتے تھے تا کہ اسے پکایا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پھل میں اس طرح سوراخ کر دیا جائے کہ اس میں ہوا تیزی سے داخل ہونے لگے پس اس طرح وہ جلدی پک جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس طرح پکنا مراد نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مراد ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کو مربوط کیا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسا پکنا ہے جو بالذات ہو اور بغیر کسی حیلہ کے ہو۔ اور انجیر والے بعض شہروں میں جو (آب و ہوا کے اعتبار سے) ٹھنڈے ہیں، ان میں وہ پکتا نہیں یہاں تک کہ ان کے منہ میں ایک لکڑی سی داخل کی جاتی ہے درآنحالیکہ اسے تیل لگایا ہوتا ہے، پس جب وہ پک جاتا ہے تو اس کی بیع حلال ہوتی ہے، کیونکہ ایسا ہوا کی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے اور اہل شہر کی یہ عادت اور رواج ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ بروقت اچھے طریقہ سے پک کر تیار نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ ایسا پکنا ہے جس پر کھجوروں کی بیع کا جائز ہونا موقوف ہوتا ہے اور اسی کے سبب وہ کھانے کے قابل ہوتی ہیں اور وہ آفت کے سبب ضائع ہونے سے محفوظ ہوتی ہیں اور یہ ثریا (ستارہ) کے طلوع کے وقت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک عادت جاریہ قرار دیا ہے اور اسے اپنے علم و قدرت کے ساتھ محکم کر دیا ہے۔ معلّٰی بن اسد نے وہیب سے، انہوں نے عسل بن سفیان سے، انہوں نے حضرت عطا سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب صبح کے وقت ثریا طلوع ہوتا ہے تو اہل علاقہ سے آفت کو اٹھا لیا جاتا ہے''۔ اور ثریا ستارہ ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا طلوع مئی کے مہینے کی گیارہ راتیں گزرنے کے بعد صبح کے وقت ہوتا ہے۔ اور بخاری میں ہے اور مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنی زمین کا پھل نہیں بیچتے تھے یہاں تک کہ ثریا طلوع ہو جاتا اور زردی سرخی سے واضح اور ظاہر ہو جاتی۔

مسئلہ نمبر 7۔ جنہوں نے پھلوں میں آفات کو ساقط کیا ہے انہوں نے ان آثار سے اور ان کی مثل ارشادات نبویہ سے استدلال کیا ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے۔ اور پھلوں کی بیع کرنے سے آپ نے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان سے آفت اور ہلاکت کے آثار ختم ہو جائیں۔ عثمان بن سراقہ نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ایسا کب ہوتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب ثریا طلوع ہوتا ہے (1)۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 5012

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کے وضع اور ساقط کرنے کا حکم دیا ہو اور اگر میرے نزدیک ثابت ہوتا تو میں اسے نہ چھوڑتا، وہ اصل اور بنیاد جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ جس کسی نے کوئی ایسی شی خریدی جس کی بیع اور اس پر قبضہ جائز ہوتا ہے تو اس کی آفت اور بیماری اسی کے لیے ہوگی، فرمایا: اگر میں آفات کو ساقط کرنے کا قائل ہوتا تو میں اسے قلیل وکثیر مقدار میں ساقط کر دیتا۔ اور یہی قول امام ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔

امام مالک اور اکثر اہل مدینہ نے اس کی وضع کا موقف اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کی وضع کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے۔ اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اصحاب حدیث کا قول ہے۔ اور اہل ظاہر نے عموم حدیث کی بنا پر خریدی ہوئی شی سے اسے ساقط کیا ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے تب اس کا اعتبار کیا ہے جب آفت پھل کی تہائی یا اس سے زیادہ مقدار کو پہنچ جائے اور جو آفت تہائی سے کم مقدار میں ہو اسے انہوں نے لغو قرار دیا ہے اور اسے تابع قرار دیا ہے، کیونکہ کوئی پھل اپنی خوبی میں قلیل عذر سے خالی نہیں ہوتا اور اپنی تھوڑی مقدار میں فساد اور عیب پڑنے سے محفوظ نہیں ہوتا۔ اصبغ اور اشہب پھل کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ قیمت کی طرف دیکھتے تھے۔ جب قیمت تہائی یا زیادہ مقدار کو پہنچ جاتی تو وہ اس سے ساقط کر دیتے۔ اور ابن قاسم کے نزدیک تو آفت کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر یہ ہے کہ سرقہ (چوری) آفت نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں ہے اور کتاب میں یہ بھی ہے کہ وہ آفت ہے اور یہ ابن القاسم سے مروی ہے اور ان کے اصحاب اور لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور مطرف اور ابن الماجشون نے کہا ہے: آسمان سے پھلوں کو زیادہ تری (بارش) یا سردی یا خشکی یا گرمی یا آدمی کے اختیار اور عمل کے بغیر درختوں کا ٹوٹنا (یعنی آندھی اور طوفان کے سبب) لاحق ہوتا ہے وہ آفت ہے، البتہ خشکی کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور ابن القاسم کی روایت میں ہے کہ وہ بھی آفت ہے۔ اور سبزیوں کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی پھلوں کی طرح ہیں (اور ان میں بھی آفت کا اعتبار ہوتا ہے)۔ جس کسی نے پھل کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اسے بیچ دیا اس شرط پر کہ وہ اسے باقی رہنے دے گا تو اس کی بیع فسخ کر دی جائے گی اور مردود ہوگی، کیونکہ اس سے منع کیا گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانے کے مترادف ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تیرا کیا خیال ہے اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک لے تو کیونکر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا مال بغیر حق کے لے سکتا ہے؟''۔ یہ جمہور کا قول ہے، اسے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے صحیح قرار دیا ہے اور نہی کو کراہیت پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور نے پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع کو اس شرط پر جائز قرار دیا ہے کہ اسے توڑ لیا جائے۔ اور امام ثوری اور ابن ابی لیلیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں موجود نہی سے استدلال کیا ہے اور جمہور نے اسے قیاس جلی کے ساتھ خاص کیا ہے، کیونکہ اس میں مبیع معلوم ہے اور حالت عقد میں اس پر قبضہ صحیح ہوتا ہے پس اس کی بیع بھی دیگر تمام بیچی جانے والی چیزوں کی طرح صحیح ہوگی۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ

تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

"اور بنایا انہوں نے اللہ کا شریک جنوں کو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے انہیں اور گھڑ لیے ہیں انہوں نے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں محض جہالت سے۔ پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ یہ ان کی جہالت کی دوسری نوع کا ذکر ہے، یعنی ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جنات میں سے شرکاء کا اعتقاد رکھ لیا ہے (یعنی انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا ہے)۔ نحاس نے کہا ہے: ترکیب کلام میں الْجِنَّ مفعول اوّل ہے اور شُرَكَآءَ مفعول ثانی ہے، جیسا کہ ان ارشادات میں ہے: وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ:20)، وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ (المدثر) اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: وَجَعَلُوا لِلّٰهِ الْجِنَّ شُرَكَاءَ اور یہ بھی جائز ہے کہ الجنّ شرکاء سے بدل ہو اور مفعول ثانی لِلّٰهِ ہو۔ اور کسائی نے الجِن پر رفع بھی جائز قرار دیا ہے تو پھر کلام اس طرح ہوگی هُمُ الجِنُّ وَخَلَقَهُمْ اسی طرح جمہور کی قرآت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنانے والوں کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ خَلَقَ الجَاعِلِينَ لَهُ شُرَكَاءَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خَلَقَ الجن الشُرَكَاء اور اسی نے شریک جنوں کو پیدا کیا ہے (یہ دراصل ضمیر کے مرجع کی طرف اشارہ ہے)۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ھو کی زیادتی کے ساتھ وھو خَلَقَهُمْ قرأت کی ہے، اور یحییٰ بن یعمر نے وَخَلْقَهُمْ لام کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، اور کہا: ای وجعلوا خلقهم لله شركاء (اور انہوں نے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا) کیونکہ وہ چیزوں کو بناتے تھے پھر ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ یہ آیت مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور ان کے جنوں کو شریک ٹھہرانے کا معنی یہ ہے کہ وہ ان کی اطاعت و پیروی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن وغیرہ سے مروی ہے۔

حضرت قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ وہی ہیں جنہوں نے کہا ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت زنادقہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ کہتے: اللہ تعالیٰ اور ابلیس دونوں بھائی ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) پس اللہ تعالیٰ انسانوں اور جانوروں کا خالق ہے، اور ابلیس جنوں، درندوں اور بچھوؤں وغیرہ کا خالق ہے۔ اور اسی کے قریب قریب مجوسیوں کا قول بھی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: عالم کے دو صانع ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا شیطان ہے جو الٰہ قدیم کی فکر سے پیدا ہونے والا ہے۔ (یعنی وہ حادث ہے)۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ شر اور برائی کا صانع حادث ہے۔ اور معتزلہ میں سے حائطیہ جو کہ احمد بن حائط کے اصحاب ہیں نے بھی اسی طرح کہا ہے، ان کا گمان بھی یہ ہے کہ کائنات کو بنانے والے دو ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا محدث ہے، اسے پہلے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے پھر تدبیر عالم کا فریضہ اس کے سپرد کر دیا ہے اور یہ وہی ہے جو آخرت میں مخلوق کا محاسبہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند اور عظیم ہے جو کچھ ظالم اور انکار کرنے والے لوگ اس کے بارے کہتے ہیں۔

وَ خَرَقُوْا نافع نے تکثیر کی بنا پر اسے تشدید کے ساتھ (خَرَّقُوا) پڑھا ہے، کیونکہ مشرکین نے دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی

بیٹیاں ہیں اور وہ ملائکہ ہیں اور انہوں نے انہیں چھپے جانے کے سبب جن کا نام دیا۔ اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور یہودیوں نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، پس اس طرح ان کا کفر کثیر ہو گیا۔ پس معنی کی مطابقت کی وجہ سے فعل کو مشدد لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے برتر اور بلند ہے جو وہ کہتے ہیں۔ باقیوں نے تقلیل کی بنا پر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے وَخَرَقُوْا لَهٗ کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ اور وخَرَقُوا بالتخفیف، عربی کلمہ ہے، آدمی جب اپنی پکار اور دعویٰ میں جھوٹ بولے تو کہا جاتا ہے: خرقها ورب الکعبہ (اس نے اسے گھڑ لیا رب کعبہ کی قسم)

اور اہل لغت نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے اِخْتَلَقُوا وافْتَعَلُوا (انہوں نے اختلاف کیا اور فعل کیا) اور وخرقوا تکثیر پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے انہوں نے جھوٹ بولا۔ اور کہا جاتا ہے: بےشک خَرَقَ، اِخْتَرَقَ اور اِخْتَلَقَ کا معنی ایک ہی ہے، یعنی أَحْدَثَ (اس نے گھڑ لیا، اس نے جھوٹ بولا)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾

''موجد ہے آسمانوں اور زمین کا، کیوں کر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی وہ ان دونوں کو بنانے والا ہے، تو پھر کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ اور بَدِيْعُ مبتدا مضمر کی خبر ہے یعنی هُوَ بَدِيْعٌ۔ کسائی نے اللہ کی صفت ہونے کی بنا پر اس پر کسرہ بھی جائز قرار دیا ہے اور بمعنی بدیعا السموات والأرض اس پر نصب بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک یہ خطا ہے، کیونکہ یہ ماضی کے معنی کے لیے ہے (کیونکہ بصریوں کے نزدیک اسم فاعل جب آل کا صلہ نہ ہو تو عمل کے لیے دو شرطیں ہیں یا وہ بمعنی حال ہو یا بمعنی استقبال ہو۔ اور امام کسائی نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے جب یہ ماضی کے لیے بھی ہو)

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ یعنی کہاں سے اس کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور ہر شے کا بیٹا اس کے مشابہ ہوتا ہے، اور اس کی تو کوئی شبیہ نہیں ہے؟ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ عبارت عام ہے اور اس میں معنی خاص ہیں، یعنی اس نے عالم (کائنات) کو پیدا کیا ہے اس میں اس کا کلام داخل نہیں اور نہ اس میں اس کی ذاتی صفات داخل ہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف: 156) اس (رحمت) کی وسعت نہ ابلیس کو شامل ہے اور نہ ہی اسے جس کی موت حالت کفر پر ہو۔ اور اس کی مثل تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف: 25) بھی ہے (وہ ہر شی کو برباد کر دے گا) حالانکہ اس نے آسمانوں اور زمین کو برباد نہیں کیا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

وَّ كِيْلٌ ۝

”یہ اللہ ہے (جو) تمہارا پروردگار ہے نہیں کوئی خدا سوائے اس کے پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا پس عبادت کرو اس کی اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے“۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ ذٰلِكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور اللّٰهُ رَبُّكُمْ بدل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَبُّكُمْ خبر ہو اور خَالِقُ دوسری خبر ہو، یا پھر اس کا مبتدا مضمر ہو، یعنی هُوَ خَالِقُ۔ کسائی اور فراء نے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝

”نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو اور وہ بڑا باریک بین (اور) پوری طرح باخبر ہے“۔

قولہ تعالیٰ: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ حدوث کی علامات سے منزہ اور پاک ہے، اور انہیں میں سے ایک ادراک ہے اس کا معنی احاطہ کرنا اور حدود قائم کرنا ہے، جیسا کہ تمام مخلوقات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، اور رؤیت ثابت ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کی حقیقت کی کنہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدرکتُ کذا او کذا (میں نے فلاں فلاں کی حقیقت کو پہچان لیا) کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن رؤیت کے بارے میں صحیح احادیث ثابت ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ نظریں دنیا میں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور آخرت میں مومنین اس کا دیدار کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اپنے اس ارشاد میں خبر دی ہے: وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (قیامہ) (کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)

اور سدی نے یہی کہا ہے اور یہی احسن ہے جو کہا گیا ہے، کیونکہ اس پر قرآن کریم بھی دال ہے اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے بارے اخبار بھی وارد ہیں۔ اس کا بیان عنقریب سورۂ یونس میں آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، حالانکہ وہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دلوں کی آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، یعنی عقلیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں کہ وہ اس کے بارے وہم میں مبتلا ہو جائیں۔ کیونکہ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) (اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آنکھیں جو دنیا میں پیدا کی گئی ہیں وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن وہ جس کے لیے شرف و کرامت کا ارادہ فرماتا ہے اس کے لیے وہ نظر اور ادراک پیدا فرما دیتا ہے جس کے ساتھ وہ اسے دیکھ لیتا ہے جیسا کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں عقلاً جائز ہے، کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رؤیت کے بارے عرض کرنا امر محال ہوگا اور یہ محال ہے کہ نبی علیہ السلام اس سے ناواقف اور بے علم ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے

بارے میں کون سی چیز جائز ہے اور کون سی جائز نہیں ہے، بلکہ وہ تو عرض ہی نہ کرتے (تو ان کے عرض کرنے سے ثابت ہوا) کہ رؤیت جائز ہے محال نہیں ہے۔

ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے رب کی رؤیت کے بارے میں سلف نے اختلاف کیا ہے، پس صحیح مسلم میں حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تکیہ لگائے بیٹھا تھا، تو انہوں نے کہا: اے ابا عائشہ! (ابو عائشہ امام مسروق کی کنیت ہے) تین چیزیں ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں جس نے گفتگو کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟ انہوں نے کہا: جس نے یہ گمان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ مسروق نے کہا: میں تکیہ لگائے ہوئے تھا پھر میں سیدھا بیٹھ گیا اور میں نے کہا: اے ام المومنین! تم نظر و فکر کر لیجئے اور اتنی جلدی نہ کیجئے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾ (التکویر) (اور بلاشبہ اس نے اسے دیکھا ہے روشن کنارے پر) وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ (النجم) (اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا) تو انہوں نے فرمایا: میں اس امت میں سے پہلی ہوں جس نے اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ جبریل امین ہیں میں نے انہیں دوبار کے سوا اس صورت اور شکل میں نہیں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق فرمایا ہے، میں نے انہیں آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا کہ وہ اپنی خلقت کے عظیم ہونے کی وجہ سے زمین و آسمان کے مابین کو بھرے ہوئے تھے''۔ تو انہوں نے فرمایا: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۰۳﴾ یا تو نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾ (الشوریٰ) (اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے)''۔

انہوں نے فرمایا: جس نے یہ خیال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ میں کسی شی کو چھپا کر رکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) اور مزید انہوں نے فرمایا: اور جس نے یہ خیال کیا کہ وہ آئندہ کل ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے)

عدم رؤیت اور جبرائیل امین کو دیکھنے کے جس نظریہ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اختیار کیا ہے وہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین کو دیکھا، اور ان دونوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اور محدثین، فقہاء اور متکلمین کی ایک جماعت نے اس کے اور امتناع رؤیت کے انکار کا قول

کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اِنَّه رَاٰه بعینيه کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے رب کا دیدار کیا۔ آپ سے یہ روایت مشہور ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۞ (النجم) (نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ) نے)۔

اور عبداللہ بن حارث نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اکٹھے ہوئے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم بنی ہاشم کہتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار اپنے پروردگار کو دیکھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم تعجب کر رہے ہو کہ خلت حضرات ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہے، کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے، اور رؤیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ فرمایا: پس حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا یہاں تک کہ پہاڑوں نے بھی اس کا جواب دیا، پھر فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت اور کلام کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی نصیب ہوا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف دیدار عطا ہوا۔ (1)

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ حسن اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتے تھے: تحقیق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ اور اسے ابو عمر طلمنکی نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، اور بعض متکلمین نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور ان سے پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور نقاش نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق کہتا ہوں: بِعَینِه رأه رأه! حَتّٰى اِنْقَطَعَ نفسه۔ یعنی نفس احمد، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے (آپ مسلسل یہ کہتے رہے) یہاں تک کہ آپ کی سانس کٹ گئی یعنی حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سانس (اکھڑ گئی)۔

اور یہی موقف شیخ ابو الحسن اشعری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نظر کے ساتھ اور اپنے سر کی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اِن محمدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى اللهَ بِبَصَرِهٖ وَعَيْنَىْ رَاْسِه اور حضرت انس، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت عکرمہ، حضرت ربیع اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت حسن قسم کھایا کرتے تھے بِاللّٰهِ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَقَدْ رَاٰى مُحَمَّدٌ صَلَّى الله عليه وَسَلَّمَ رَبَّهٗ (قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں یقیناً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے)

اور ایک جماعت نے کہا ہے ان میں سے ابو العالیہ، قرظی اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہم ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل (کی آنکھوں) کے ساتھ اپنے پروردگار کو دیکھا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہ بیان کیا گیا ہے اور ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ والنجم، حدیث نمبر 3200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دل کے ساتھ اسے دیکھا ہے، اور یہ دنیا میں آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے قول سے پیچھے ہٹ گئے (کمزور پڑ گئے) اور حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: دنیا میں اسے نہیں دیکھا گیا، کیونکہ وہ باقی رہنے والی ذات ہے اور باقی کو فانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب وہ آخرت میں ہوں گے اور انہیں باقی رہنے والی نظریں عطا کی جائیں گی تو پھر وہ باقی کو باقی کے ساتھ دیکھ لیں گے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کلام بہت خوب اور اچھا ہے، اور اس میں رؤیت کے محال ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے مگر صرف اس حیثیت سے کہ قدرت ضعیف اور کمزور ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے قوت عطا فرما دے اور رؤیت کے بوجھ کو اٹھانے پر اسے قادر کر دے تو اس کے حق میں رؤیت ممتنع نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اس بارے کچھ بیان عنقریب سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ یعنی اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اسے جانتا ہے، اور تجنیس کلام کے لیے ابصار کو خاص کیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کلام میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق آنکھوں کا ادراک نہیں کر سکتی، یعنی وہ بصر کی حقیقت کی کیفیت نہیں پہچان سکتے، اور وہ شے جس کے سبب انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے وہ دیکھنے کی شے ان دو کے سوا اس کے تمام اعضائے بدن میں نہیں ہے۔ پھر فرمایا: وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ یعنی وہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ کہا جاتا ہے: لَطُف فلانٌ بفلانٍ يَلْطُفُ یعنی اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا (مہربانی کی) اور اللُّطْفُ فِي الفِعْلِ کا معنی ہے کام میں نرمی کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف کا مفہوم توفیق بخشنا اور بچانا ہے۔ اور ألطفه بِكَذا، یعنی اس نے اس کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کیا اور اس کا اسم اللَّطف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاءتْنا من فلانٍ لَطفة یعنی فلاں کی جانب سے ہمارے پاس ہدیہ آیا۔ اور ملاطفۃ کا معنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور مہربانی برتنا ہے۔

جوہری اور ابن فارس سے یہ منقول ہے، ابو العالیہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے وہ چیزوں کو نکالنے میں بڑا باریک بین اور ان کی جگہ سے باخبر ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لطیف وہ ہے جس نے تیرے دل کو ہدایت سے منور کر دیا، اور تیرے جسم کی غذا کے ساتھ تربیت اور نشوونما کی، اور اس نے تجھے مصیبت اور آزمائش میں ولایت عطا فرمائی، اور وہ تیری حفاظت کرتا ہے حالانکہ تو آگ (جہنم) میں گرتا ہے اور وہ تجھے جنۃ الماویٰ میں داخل کر دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے معنی بیان کیے گئے ہیں جو افق اور دوسرے معنی کی طرف راجع ہیں۔ عنقریب سورۃ الشوریٰ میں اس کے بارے علماء کے اقوال آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴

''بے شک آئیں تمہارے پاس آنکھیں کھولنے والی دلیلیں اپنے رب کی طرف سے تو جس نے آنکھوں سے

دیکھا تو اس نے اپنا فائدہ کیا اور جو اندھا بنا رہا تو اس نے اپنا نقصان کیا اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان''۔

قولہ تعالیٰ: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی ایسی علامات اور دلائل جن کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ بَصَآىِٕرُ، بصیرۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی دلالت اور رہنمائی ہے، جیسا کہ شاعر کا قول بھی ہے:

جاؤا بصائرُھم علی اکتافھم وبصیرتی یَعْدُو بھا عَتَدٌ وآی

بصیرۃ سے مراد حجت بینہ اور ظاہرہ ہے۔ اور دلیل کو تعظیم شان کے لیے مجیٔ (آنے) کی صفت کے ساتھ متصف کیا گیا، جب کہ یہ اس غائب کے قائم مقام ہے جس کا حاضر ہونا نفس کے لیے متوقع ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے: جاءتُ العافیۃُ وقد انصرفَ المرضُ (عافیت آئی اس حال میں کہ مرض چلا گیا) اور اَقبلَ السعُودُ وأدبرَ النَحوسُ (سعادت آ گئی اور نحوست چلی گئی۔)

فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ، الْاَبْصَارَ اس کا معنی ہے ھوالإ دراکُ بِحاسۃِ البصرِ (آنکھ کے ساتھ کسی چیز کو دیکھنا، اس کا ادراک کرنا) پس جس کسی نے استدلال کر لیا اور پہچان لیا تو اس نے اپنے آپ کو نفع پہنچایا۔

وَ مَنْ عَمِيَ اور جس نے رہنمائی حاصل نہ کی تو وہ اندھے کے قائم مقام ہو گیا، تو اس اندھا بننے کا نقصان اور ضرر اس کی اپنی ذات کو ہوگا۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی میں نے اس پر تمہاری حفاظت اور نگہبانی کا حکم نہیں دیا کہ تم اپنے آپ کو ہلاک کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے عذاب سے میں تمہاری محافظت اور نگہبانی نہیں کروں گا۔ اور یہ قول بھی ہے: بِحَفِيْظٍ اس کا معنی برقیب (تاکنے والا) ہے۔ میں تم پر تمہارے اعمال کو شمار کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پیغامبر (رسول) ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، اور وہ تم پر نگہبان ہے اس پر تمہارے افعال و اعمال میں سے کوئی شے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ آیت فرضیت قتال سے پہلے نازل ہوئی، پھر آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں تلوار کی قوت کے ساتھ بتوں کی عبادت سے روکیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور اسی طرح ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید) کی دلیلوں کو اور تا کہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے اور تا کہ ہم واضح کر دیں اس کو اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ، كَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے۔ یعنی نُصَرِّفُ الآیاتِ مثلَ ماتَلَونا عَلَیْكَ (یعنی ہم دلائل طرح طرح سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے آپ پر انہیں تلاوت فرمایا ہے) یعنی جیسا کہ ہم نے اس سورت میں وعدہ، وعید، وعظ اور تنبیہ کے بارے مختلف دلائل بیان کیے ہیں اسی طرح ہم انہیں دوسری سورتوں میں بھی بیان کریں گے۔ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ اس میں واؤ فعل مضمر پر عطف کے لیے ہے تقدیر کلام یہ ہے: ای نُصَرِّفُ الآیاتِ لِتَقُومَ الحجۃُ ولیقولوا دَرَسْتَ (ہم دلائل بیان کرتے ہیں تا کہ حجت قائم ہو جائے اور تا کہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ، صَرَّفْنَاهَا (تا کہ وہ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے ہم نے انہیں بیان کیا) تو اس صورت میں لام صیرورت کے لیے ہوگا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اسی طرح ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں: كَتَبَ فلانٌ هَذَا الكِتَابَ لِحَتْفِهِ (فلاں نے یہ تحریر اپنی موت کے وقت لکھی) یعنی اس کا حکم اس کی طرف لوٹ آیا۔ اور اسی طرح جب دلائل بیان کر دیے گئے تو ان کا امر اس طرف لوٹ آیا کہ وہ کہیں: آپ نے خود پڑھ سنایا ہے اور آپ نے جبر و یسار سے خوب سیکھا ہے، اور یہ دونوں مکہ مکرمہ میں نصرانی غلام تھے، تو اہل مکہ نے کہا: بلاشبہ یہ ان دونوں سے پڑھتے ہیں (تعلیم حاصل کرتے ہیں)۔ نحاس نے کہا ہے: اس معنی میں دوسرا قول اچھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ نُصَرِّفُ الْآيٰتِ کا معنی ہو کہ ہم اس کے بارے یکے بعد دیگرے دلائل بیان کرتے ہیں تا کہ وہ کہہ اٹھیں: آپ نے ہمیں خوب پڑھ سنایا ہے۔ نَأْتِي بِهَا آيَةً بَعْدَ آيَةٍ لِيَقُولُوا دَرَسْتَ عَلَيْنَا پس وہ اوّل کو آخر کے ساتھ ملا کر ذکر کرتے ہیں اور یہی حقیقت ہے اور جو کچھ ابو اسحاق نے بیان کیا ہے وہ مجاز ہے۔

اور دَرَسْتَ میں سات قراتیں ہیں۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے دارست دال اور را کے درمیان الف کے ساتھ قرات کی ہے، جیسا کہ فاعلت اور یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم اور اہل مکہ کی قرات ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دارست کا معنی ہے تالیت (آپ نے خوب موافقت اور تابعداری کی ہے، پڑھ کر سنانے میں)۔ ابن عامر نے درست پڑھا ہے یعنی سین کے فتحہ اور تا کے سکون کے ساتھ بغیر الف کے جیسا کہ خرجت۔ اور یہ حسن کی قرات ہے اور باقیوں نے درست پڑھا ہے، جیسا کہ خرجت۔ پس پہلی قرات کے مطابق معنی ہوگا: دارست اهل الكتاب و دارسوك یعنی آپ نے ان (اہل کتاب) کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور اس معنی پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ (الفرقان: 4) یعنی یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن پر معاونت کی اور انہوں نے اس بارے میں آپ سے مذاکرات کیے اور یہ سب مشرکین کا قول ہے اور اس کی مثال ان کا یہ قول ہے: وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ (الفرقان) (اور کفار نے کہا: یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے اس شخص نے لکھوالیا ہے انہیں، پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تا کہ از بر ہو جائیں)۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ (النحل) (اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے؟ کہتے ہیں: (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دارستنا تو پھر اس کا معنی درست کے معنی کی طرح ہو جائے گا، نحاس نے اسے ذکر کیا ہے اور اسے ہی پسند کیا ہے، اور پہلا معنی مکی نے ذکر کیا ہے۔ اور نحاس نے گمان کیا ہے کہ وہ مجاز ہے، جیسا کہ کسی نے یہ کہا ہے:

لِلْمَوتِ مَا تَلِدُ الوالِدَہ

اور جنہوں نے درست پڑھا ہے تو اس قرآت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اچھا یہ ہے کہ معنی یہ ہو: ولِئَلَّا يَقُولُوا انقطعتْ وامحت (تاکہ وہ کہہ اٹھیں: کٹ گیا اور مٹ گیا، اور محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں لائیں گے(1)۔

اور حضرت قتادہ نے دُرست پڑھا ہے بمعنی قرئت (پڑھا گیا): سفیان ابن عیینہ نے عمرو بن عبید سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے دارست پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ قرأت جائز نہیں۔ انہوں نے کہا: کیونکہ آیات تکرار اور مذاکرہ نہیں کرتیں۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس طرح قرأت جائز ہے، اور معنی وہ نہیں ہے جو ابو حاتم نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کا معنی ہے دارسٹ امتك، ای دارستك اُمّتك (آپ کی امت نے آپ کے ساتھ تکرار اور مذاکرہ کیا) اگرچہ اس کا ذکر پہلے نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ (ص) (پھر انہیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے) اور اخفش نے بیان کیا ہے وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسَتْ اور یہ بمعنی درستَ ہے مگر یہ زیادہ بلیغ ہے۔

اور ابوالعباس نے بیان کیا ہے کہ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسَتَ امر کی بنا پر لام کو ساکن پڑھا گیا ہے اور اس میں تہدید (جھڑک) کا معنی ہے، یعنی چاہیے کہ وہ جو چاہیں کہیں کیونکہ حق تو بین اور واضح ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (توبہ:82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ)۔

اور جنہوں نے لام کو کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک یہ لام کی ہے۔ ان تمام قرأتوں کا اشتقاق تو ایک شی کی طرف ہی راجع ہے، یعنی تلیین اور تذلیل کی طرف۔ اور درست، درس یدرس دراسۃ سے ہے، اور اس کا معنی ہے کسی غیر پر پڑھنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: درسته یعنی ذللته بكثرة القرأة (میں نے اسے کثرت قرأت کے سبب پامال کردیا) اور اس کی اصل درس الطعام ہے یعنی گندم گہنا۔ اور دیاس کا معنی لغت شام کے مطابق دراس ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل درست الثوب أدرسه درسا سے ہے یعنی میں نے کپڑے کو پرانا کردیا۔ اور دَرس الثوبُ درسا کا معنی ہے أخلق یعنی کپڑا پرانا ہوگیا۔ اور یہ معنی بھی تذلل کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: حضرت ادریس علیہ السلام کو کتاب اللہ کثرت کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے ادریس کا نام دیا گیا۔ اور دارست الكتب و تدارستها اور إدارستها یہ سب درستها کے معنی میں ہیں۔ اور درست الكتاب درسا و دراسة (میں نے کتاب خوب اچھی طرح پڑھی) اور درست المرأة درسا ای حاضت (عورت حائضہ ہوگئی) اور کہا جاتا ہے کہ عورت کی شرمگاہ کو کنایۃ ابا ادراس کہا جاتا ہے۔ اور یہ بمعنی حیض ہے۔ اور الدرس خفیہ راستے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور اصمعی نے بیان کیا ہے: بعیرلم يدرس یعنی اونٹ پر سوار نہیں ہوا گیا، اور درست، درس المنزل سے ماخوذ ہے جب منزل کا نشان مٹ جائے۔ اور حضرت ابن مسعود اور آپ کے اصحاب نے، حضرت ابی، حضرت طلحہ، حضرت اعمش نے ولِيَقُوْلُوا درس قرأت کی ہے۔ یعنی درس محمد الآيات (حضرت محمد ﷺ نے آیات پڑھیں) وَلِنُبَيِّنَهٗ یعنی تاکہ ہم قول اور تصریف کو واضح کردیں، یا تاکہ ہم قرآن کو واضح کردیں۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 89

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

''پیروی کیجئے آپ اس کی جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اور منہ پھیر لو مشرکوں کی طرف سے''۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ یعنی قرآن کی اتباع کیجئے، یعنی اپنے دل اور طبیعت کو ان کے ساتھ مشغول نہ رکھیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رکھیے۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہیں آپ ان کے ذمہ دار''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا یہ اس پر نص ہے کہ شرک اس کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ مذہب قدریہ کا بطلان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کی حفاظت اور نگہبانی کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔

وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ یعنی آپ ان کے امور اور معاملات کو ان کے دین یا ان کی دنیا کے مصالح اور منافع میں مضبوط اور پختہ کیجئے، یہاں تک کہ ان کے لیے اسے پانا آسان ہو جائے جو ان کے لیے واجب اور ضروری ہے۔ پس اس بارے میں نہ آپ نگہبان ہیں اور نہ ہی ذمہ دار ہیں، بلاشبہ آپ تو صرف مبلغ (اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں) اور یہ جنگ و قتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

''اور نہ تم برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔ یونہی آراستہ کر دیا ہے ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل، پھر اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور انہوں نے پھر وہ انہیں بتائے گا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ یہ نہی ہے۔ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ یہ جواب نہی ہے۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو اس سے منع کیا ہے کہ وہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب وہ انہیں برا بھلا کہیں گے تو کفار نفرت کریں گے اور وہ اپنے کفر میں اور بڑھ جائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کفار قریش نے حضرت ابو طالب کو کہا: یا تو آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو ہمارے الہٰوں کو برا بھلا کہنے اور ان سے نفرت کرنے سے منع کریں اور یا پھر ہم بھی اس کے الٰہ کو برا بھلا کہیں گے اور اس کی ہجو کریں گے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے بیان کیا ہے: اس کا حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے پس جب کافروں کو اس سے منع کیا گیا ہے اور خوفزدہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کو یا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ تعالیٰ عزوجل کو برا بھلا کہیں، تو پھر مسلمانوں کے لیے بھی حلال نہیں ہے کہ وہ ان کی صلیب، ان کے دین اور ان کے گرجا گھروں کو برا بھلا کہیں، اور نہ ہی وہ اس طرح کا تعرض کریں جو انہیں اس حالت تک پہنچا دے، کیونکہ یہ معصیت پر ابھارنے کے قائم مقام ہے۔ اور انہیں اصنام سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ان کے بارے عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتے جو کفار ان کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں بھی صلح کی ایک قسم کا بیان ہے، اور سد ذرائع کے حکم کے واجب ہونے پر دلیل ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے سورۃ البقرہ میں۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ کبھی حق دار اپنے حق سے رک جاتا ہے جب وہ اسے ایسے ضرر اور نقصان تک پہنچا دے جو دین میں ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں وہ روایت ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم قطع تعلقی کے ڈر سے قرابت داروں کے درمیان فیصلہ نافذ نہ کرو۔ ابن عربی نے کہا ہے۔ اگر حق واجب ہو تو وہ اسے ہر حال میں لے گا اور اگر وہ جائز ہو تو اس میں یہ قول ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: عَدْوًا یعنی جہالت کے سبب اور زیادتی کرتے ہوئے۔ اور اہل مکہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے عُدُوًّا عین اور دال کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حسن، ابورجا اور حضرت قتادہ کی قرأت ہے اور یہ پہلی قرأت کی طرف ہی راجع ہے، اور مجموعی طور پر یہ دونوں بمعنی ظلم ہیں۔ اور اہل مکہ نے عَدُوًا عین کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ بمعنی عدو (عداوت دشمنی) کے پڑھا ہے اور یہ واحد ہے لیکن جمع کی طرف سے ذکر ہو رہا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۝ (الشعراء) (پس وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمُ الْعَدُوُّ (المنافقون: 4) یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ جس طرح ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل کو آراستہ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ ہم نے اہل طاعت کے لیے طاعت کو، اور اہل کفر کے لیے کفر کو آراستہ کر دیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (فاطر: 8) اس میں قدریہ کا رد ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝

"اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی پوری کوشش سے کہ اگر آ گئی ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور ایمان لائیں گے اس کے ساتھ۔ آپ فرمائیے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ جب یہ نشانی آ جائے گی تو (تب بھی) یہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں۔ اور جھدُ الیمین کا معنی ہے قسم کو مضبوط اور پختہ کرنا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا ہے۔ اور قولہ: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان کی قسموں کی وہ انتہائی کوشش جس تک ان کا علم پہنچا ہے، اور جہاں تک ان کی قدرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی الٰہ اعظم ہے اور یہ الٰہ جن کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کا گمان ہے کہ یہ انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ان کے بارے خبر دی گئی ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: 3) (ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں)

وہ اپنے آبا کی، بتوں کی اور علاوہ ازیں دوسری چیزوں کی قسمیں کھاتے رہتے تھے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم بھی کھاتے تھے اور وہ اسے جھد الیمین کا نام دیتے تھے جب قسم اللہ کی کھاتے۔ اور جھد کا لفظ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل اَقْسَمُوْا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے معنی میں ہے (1) اور الجھد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے مشقت اٹھانا (انتہائی کوشش کرنا)۔ کہا جاتا ہے: فعلتُ ذالِكَ بجَهْدِ (میں نے وہ کام مشقت اور کوشش کے ساتھ کیا) اور الجُھد (جیم کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے: هذا جُهدُ (یہ میری طاقت ہے) اور بعض ان دونوں کو ایک ہی معنی میں رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں: وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (توبہ: 79) (اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے) اور اسے جھدھم بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ ابن قتیبہ سے منقول ہے۔ اور آیت کا سبب نزول جو کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے، ان میں قرظی اور کلبی وغیرہ ہیں، وہ یہ ہے کہ قریش نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ہمیں خبر دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر اپنا عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور یہ کہ قوم ثمود کے لیے ایک اونٹنی تھی، پس آپ بھی ہمارے سامنے ایسے معجزات میں سے کوئی لائیں تا کہ ہم آپ کی تصدیق کر سکیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کون سی شی تم پسند کرتے ہو؟''۔ انہوں نے عرض کی: آپ ہمارے لیے صفا (پہاڑ) کو سونا بنا دیجئے۔ تو قسم بخدا! اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ہم تمام کے تمام یقیناً آپ کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا مانگنے کے لیے اٹھے، تو حضرت جبریل امین علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ''اگر آپ چاہیں تو صفا (پہاڑ) سونا ہو جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ ظاہر فرما دیا اور انہوں نے اسے دیکھ کر تصدیق نہ کی تو وہ یقیناً انہیں عذاب دے گا اس لیے آپ انہیں چھوڑ دیں یہاں تک کہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے''۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بل یتوبُ تائبھم (2) (بلکہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے) تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اللہ رب العزت نے واضح فرما دیا کہ جس کے بارے وہ اپنے علم ازلی کے ساتھ جانتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، وہ ایمان نہیں لائے گا اگرچہ وہ قسم بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 333	2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 485۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 218

کھائے کہ وہ یقیناً ایمان لائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے (کہ وہ ایسی قسم کھاتے ہیں) جوان کے نزدیک انتہائی شدید اور اغلظ ہے۔ یہاں احکام میں سے بہت بڑا مسئلہ پیش آتا ہے اور وہ آدمی کا یہ قول ہے: الأیمان تلزمہ إن کان کذا او کذا (اس پر قسم لازم ہوگی اگر اس طرح ہوا)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ قسم ابتداء اسلام میں اس صورت کے بغیر معروف و مشہور تھی، وہ کہتے تھے: علیّ أشد ما أخذہ أحدٌ علی أحدٍ (مجھ پر اسے لینا انتہائی لازم اور ضروری ہے جو ایک کا دوسرے پر ہے)

تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی عورتیں آزاد (مطلقہ) ہو جائیں گی پھر صورتیں بہت زیادہ ہو گئیں یہاں تک کہ وہ لوگوں کے درمیان اس صورت کی طرف لوٹ آئیں جو ان کی اصل ہے۔ ہمارے شیخ الفہری طرسوسی کہا کرتے تھے: جب وہ اس میں حانث ہوگا تو اس پر تیس مسکینوں کو کھانا کھلانا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا قول الأیمان، یمین کی جمع ہے، اور اگر اس نے علیٰ یمین کہا اور حانث ہو گیا تو ہم اس پر ایک کفارہ لازم کریں گے۔ اور اگر اس نے کہا: علیّ یمینان تو حانث ہونے کی صورت میں اس پر دو کفارے لازم ہوں گے اور أیمان یمین کی جمع ہے لہٰذا اس میں اس پر تین کفارے لازم ہوں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احمد بن محمد بن مغیث نے اپنے وثائق میں ذکر کیا ہے کہ قیروان کے شیوخ نے اس میں اختلاف کیا ہے اور ابو محمد بن ابی زید نے کہا ہے: اس پر اپنی بیوی کے بارے میں تین طلاقیں لازم ہو سکتی ہیں، مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چلنا، اپنے مال کا تہائی حصہ صدقہ کرنے، قسم کا کفارہ اور غلام کو آزاد کرنا لازم ہو سکتا ہے۔

ابن مغیث نے کہا ہے: اور اسی طرح ان کے سردار ابن ارفع اور فقہاء طُلَیْطُلہ میں سے ابن بدر نے کہا ہے۔ اور شیخ ابو عمران فاسی، ابو الحسن قابسی، اور ابو بکر بن عبد الرحمن قروی نے کہا ہے: اس پر ایک طلاق لازم ہو جائے گی جب اس کی نیت نہ ہوئی۔ اور اس بارے میں ان کی حجت ابن حسن کی روایت ہے جو انہوں نے اس قول کے بارے میں ابن وہب سے سنی ہے: أشدّ ما أخذہ أحد علی أحد أن علیہ فی ذالك کفارۃ یمین۔

ابن مغیث نے کہا ہے: جن کا ہم نے نام لیا ہے انہوں نے الأیمان تلزمہ کہنے والے پر ایک طلاق لازم کی ہے، کیونکہ اس کے اس قول سے بڑھ کر برا حال کوئی نہیں ہوتا: أشدّ ما أخذہ أحد علی أحد أن علیہ کفارۃ یمین۔ (انہوں نے کہا) اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ فرمایا: پہلے گروہ نے ابن القاسم کے قول سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے اس کے بارے کہا جس نے یہ کہا: علیّ عھد اللہ وغلیظ میثاقہ و کفالتہ وأشدّ ما أخذہ أحدٌ علی أحد علی أمر ألا یفعلہ ثم فعلہ یعنی وہ کسی کام کے بارے مذکور لفظ کہہ کر قسم کھاتا ہے کہ وہ اسے نہیں کرے گا پھر وہ اسے کر گزرتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس نے طلاق اور عتاق کا ارادہ نہیں کیا اور اس نے ان دونوں کو اس سے جدا اور علیحدہ رکھا تو چاہیے کہ اس پر تین کفارے لازم ہوں۔ اور اگر قسم کھاتے وقت اس کی کوئی نیت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اس قول میں دو کفارے ادا کرے: علیّ عھد اللہ وغلیظ میثاقہ اور وہ غلام آزاد کرے گا اور اس کی عورتیں چھوٹ جائیں گی، اور مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چل کر جائے گا اور

اپنے مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرے گا جب اس نے یہ کہا: أشد ما أخذہ أحد علی أحد۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا طریقہ استدلال تو وہ یہ ہے کہ الأیمان میں الف لام جنسی ہوگا یا عہدی ہوگا پس اگر الف لام عہدی ہو تو پھر معہود تیرا قول باللہ ہوگا تو اس صورت میں وہ لازم ہوگا جو فہری نے کہا ہے اور اگر الف لام جنسی ہو تو پھر طلاق جنس ہے اور اس پر یہ داخل ہو رہا ہے اور پھر اس کا عدد پورا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں ہر جنس میں ایک معنی داخل ہونا کافی ہوتا ہے، کیونکہ اگر جنس میں کل معنی داخل ہو تو پھر اس کے لیے تمام مال صدقہ کرنا لازم ہو، کیونکہ کبھی مال کا صدقہ کرنا قسم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم (1)

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمایئے: ان نشانیوں اور معجزات کے لانے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اور وہ جب چاہے گا انہیں لے آئے گا۔

وَمَا یُشْعِرُكُمْ، ای وما یدریکم أیمانکم اور تمہیں اپنی قسموں کے بارے میں کیا خبر مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اس میں إن مکسور ہے، اور یہ قرأت حضرت مجاہد، ابو عمرو اور ابن کثیر کی ہے، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اسی کی شہادت دیتی ہے۔ وَمَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اور حضرت مجاہد اور ابن زید نے کہا ہے: اس کا مخاطب مشرکین ہیں، اور کلام مکمل ہو گیا۔ ان پر حکم یہ لگایا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور تحقیق اس کے بعد آیت میں (اللہ تعالیٰ نے) ہمیں بتایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ تاویل اس کی قرأت سے مشابہت رکھتی ہے جس نے تُؤمِنون تا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور فراء وغیرہ نے کہا ہے: خطاب مومنین کے لیے ہے، کیونکہ مومنوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آیت نازل ہوئی تو شاید وہ ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا یُشْعِرُكُمْ یعنی تمہیں کیا خبر اور تمہیں کون بتائے اے مومنین! اَنَّهَاۤ یعنی ہمزہ مفتوح ہے، اور یہ اہل مدینہ، اعمش اور حمزہ کی قرأت ہے یعنی لعلها إذا جاءت لا یؤمنون (شاید جب وہ نشانی آجائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے) خلیل نے کہا ہے: اَنَّهَاۤ بمعنی لعلها ہے، اسے ان سے سیبویہ نے بیان کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ۝ (عبس) یعنی انه یزکی (اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جائے) اور عربوں سے حکایت ہے: ایت السوق أنك تشتری لنا شیئا، ای لعلك (تو بازار آ شاید تو ہمارے لیے کوئی شی خریدے)

اور ابوالنجم نے کہا ہے:

قلت لشَیْبَان اُدْنُ من لقائه　　أنْ تُغَدِّی القومَ من شِوَائِه

اور عدی بن زید نے کہا ہے:

أعاذِلَ ما یُدریك أنَّ منیتی　　إلی ساعةٍ فی الیوم أوفی ضُحَی الغَدِ

1۔ احکام القرآن لابن عربی، جلد 2، صفحہ 737

تو ان میں أنَّ بمعنی لعل مذکور ہے۔

اور درید بن صمہ نے کہا ہے:

أرِينِي جوادًا ماتَ هَزْلًا لأنَّنِي　　أرى ما تَرَيْنَ أو بخيلا مُخَلَّدَا

تو اس میں بھی لأنّني، لعلّني کے معنی میں ہے۔ اور کلام عرب میں أنّ بمعنی لعل کا استعمال کثیر ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ مصحف حضرت ابی بن کعب میں اسی طرح ہے: وما أدراکم لعلها اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: کہ لا زائدہ ہے، اور معنی ہے: وما یشعرکم أنها یعنی الآیات۔ تمہیں کیا خبر کہ نشانیاں جب مشرکین کے پاس آ جائیں تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس اس میں لا زائد کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں لا زائد کیا گیا ہے: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝ (الانبیاء) کیونکہ اس کا معنی ہے: وحرام علی قریة مهلكة رجوعهم (ہلاک شدہ گاؤں پر ان کا رجوع حرام ہے)

اور اس قول باری تعالیٰ میں مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (الاعراف: 12) اس کا معنی ہے: مَا منعكَ أن تسجُدَ (تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا ہے) اور زجاج اور نحاس وغیر ہما نے لا کے زائدہ ہونے کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ غلط اور خطا ہے، کیونکہ اسے ایسی عبارت میں زائد کیا جاتا ہے جس میں یہ اشکال پیدا نہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: وما یُشعرکم أنها إذا جاءتْ لا یُؤمنونَ أو یُؤمنونَ (تمہیں کیا خبر ہے کہ جب وہ نشانی آ جائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے یا ایمان لائیں گے) پھر سامع کو اس کا علم ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ نحاس وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝۱۱۰

"اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں"۔

یہ آیت مشکل ہے، اور بالخصوص وہ (اشکال) اس میں ہے وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو قیامت کے دن آگ کے شعلوں اور انگاروں کی حرارت کی طرف پھیر دیں گے، جس طرح کہ وہ دنیا میں ایمان نہیں لائے۔

وَّنَذَرُهُمْ اور ہم انہیں دنیا میں چھوڑ دیں گے یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے اور ہم انہیں سزا نہیں دیں گے، پس آیت کا کچھ حصہ آخرت کے بارے میں ہے اور کچھ دنیا کے بارے میں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ۝ (الغاشیہ) یہ آخرت میں ہوگا اور عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ۝ (الغاشیہ) یہ دنیا میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم دنیا میں پھیر دیں گے، یعنی ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان حائل ہو جائیں گے اگر وہ نشانی ان کے پاس آ بھی جائے، جیسا کہ ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان پہلی بار حائل ہوئے، جب آپ نے انہیں دعوت دی اور ان پر اپنا معجزہ ظاہر فرمایا۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (الانفال: 24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم)

حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان) اور معنی یہ ہے: چاہیے یہ تھا کہ وہ ایمان لاتے جب ان کے پاس نشانی آ گئی اور انہوں نے اسے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا اور اسے اپنے دلوں کے ساتھ پہچان لیا، پس جب وہ ایمان نہیں لائے تو ایسا اللہ تعالیٰ کے ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھرنے کے سبب ہوا۔

كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور کاف محذوف پر داخل کیا گیا ہے، ای فلا یؤمنون کما لم یؤمنوا به أول مرة (پس وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے) یعنی پہلی مرتبہ ان کے پاس ایسی نشانیاں اور معجزات آئے جن کا معارض (اور مقابل) لانے سے وہ عاجز آ گئے مثلاً قرآن کریم وغیرہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم ان کے دلوں کو پھیر دیں گے تا کہ وہ ایمان نہ لائیں جس طرح کہ گزشتہ امتوں کے کفار ایمان نہیں لائے جب انہوں نے ان نشانیوں کو دیکھا جن کی انہوں نے خواہش کی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے: یعنی أنها اذا جاءت لا یؤمنون کما لم یؤمنوا أول مرة و نقلب أفئدتهم و أبصارهم (یہ کہ جب وہ نشانی آ جائے وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے) وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں ہی چکر کاٹتے رہیں۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ، لیکن اکثر ان میں سے (بالکل) جاہل ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور وہ انہیں عیاں دیکھ لیتے۔ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى اور مردے ان سے باتیں کرنے لگتے ہمارے انہیں زندہ کرنے کے ساتھ۔ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ نشانیوں میں سے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا (وہ ہر شی ہم ان کے لیے جمع کر دیتے) قُبُلًا ان کے سامنے۔ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ نافع اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے معاینہ ان کے روبرو، تو وہ ایمان نہ لاتے۔

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: قِبَلًا بمعنی ناحية (طرف) ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: لی قِبَلَ فلان مالٌ (میرا فلاں کی طرف مال ہے) پس قِبَلًا، طرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور باقیوں نے قبلا پڑھا ہے یعنی قاف اور با کے ضمہ کے ساتھ، اور اس کا معنی ہے ضمناء پس یہ قبیل کی جمع ہوگی بمعنی کفیل، جیسا کہ رغیف اور رغف ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ (الاسراء) یعنی وہ اس کے ضامن ہوں گے۔ یہ فراء سے منقول ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ معنی قبیل قبیل ہے۔ یعنی جماعت در جماعت۔

اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ دونوں قولوں کے مطابق حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے قبلاً بمعنی مقابلہ ہے (یعنی سامنے) اور اسی معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (یوسف:26) (اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے) اور اسی سے قُبُل الرجلِ و دُبُرہ ہے اور یہ اس چیز کے لیے ہے جو آدمی کے سامنے ہو اور اس کے پیچھے ہو۔ اور اس سے قُبُل الحیض بھی ہے۔

ابوزید نے بیان کیا ہے: لقیت فلانا قُبُلا و مقابلة و قَبَلا و قُبُلا ان تمام کا معنی ہے میں آدمی کو بالمشافہ (روبرو) ملا۔ پس معنی میں ضمہ، کسرہ کی طرح ہی ہے اور دونوں قرائتیں مساوی اور برابر ہیں۔ مکی نے یہ کہا ہے اور حسن نے قُبْلا پڑھا ہے اس میں با سے ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور فراء کے قول کے مطابق اس میں ایسی شے کا بولنا مراد ہے جو بولتی نہیں اور اس چیز کی کفالت میں جو عقل و فہم نہیں رکھتی ان کے لیے بہت بڑی علامت اور نشانی ہے۔ اور اخفش کے قول کے مطابق اس میں ان اجناس کا جمع ہونا ہے جو معبود نہیں۔ اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں اَنْ استثنا کے محل میں ہے پہلے کلام سے نہیں ہے۔ یعنی لٰکن اِنْ شاء الله لھم (لیکن اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے چاہتا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ استثنا ان اہل سعادت کے لیے ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اور اس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ لیکن ان میں سے اکثر حق سے جاہل ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اس چیز سے غافل اور جاہل ہیں کہ ایک نشانی اور معجزہ دیکھ لینے کے بعد مزید نشانیوں اور معجزات کی خواہش کرنا جائز نہیں ہوتا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لیے، اور اگر چاہتا آپ کا رب تو وہ یہ نہ کرتے سو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حوصلہ اور تسلی دے رہا ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ کو اس قوم کے ساتھ آزمائش میں ڈالا ہے اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے بھی ہر نبی کے لیے دشمن بنائے تھے۔ عَدُوًّا یعنی دشمن۔ پھر ان کی صفت بیان کی اور فرمایا: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ (1) سیبویہ نے بیان کیا ہے کہ جعل بمعنی وصف ہے۔ عَدُوًّا مفعول اوّل ہے۔ لِكُلِّ نَبِيٍّ یہ مفعول ثانی کے محل میں ہے۔ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یہ عدو سے بدل ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ شیاطین مفعول اوّل ہو اور عدو مفعول ثانی ہو۔ گویا کہ اس طرح کہا گیا: جعلنا شیاطینَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 124

الانس والجنّ عدوًّا اور اعمش نے شیاطین الجنّ والانس پڑھا ہے یعنی الجن کو مقدم کیا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے۔(1)

یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا یہ اس شے سے عبارت ہے جو جنوں میں سے شیطان انسانوں کے شیطانوں کی طرف وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ اور اسے وحی کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ یہ خفیہ ہوتی ہے، اور ان کی ملمع سازی کو زخرف کہا ہے، کیونکہ وہ اسے خوب آراستہ کر کے بیان کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سونے کو زخرف کا نام دیا گیا ہے۔ اور ہر وہ شے جو حسین ہو اور اس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو تو وہ زخرف ہے۔ اور المزخرف کا معنی ہے المزین (وہ شے جس کو آراستہ کیا جائے، خوشنما بنایا جائے) اور زخارف الماء کا معنی پانی کے راستے ہیں۔ اور غُرُوْرًا کو مصدر کی بنا پر نصب دی گئی ہے، کیونکہ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کا معنی ہے وہ انہیں اس کے ساتھ بہت دھوکہ دیتے ہیں۔ یغرونهم بذالك غرورا تو اس صورت میں غُرُوْرًا مفعول مطلق ہوگا)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ حال کے محل میں ہو۔

اور غُرُوْرًا کا معنی باطل ہونا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف اسناد کے ساتھ یہ مروی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ: یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کے بارے میں کہا ہے کہ ہر جن کے ساتھ ایک شیطان ہے اور ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے، پس ان میں سے ایک دوسرے کو ملتا ہے اور یہ کہتا ہے: میں نے اپنے صاحب کو اس طرح گمراہ کیا ہے پس تو بھی اپنے صاحب کو اسی طرح گمراہ کر دے۔ اور دوسرا بھی اسے اسی طرح کہتا ہے۔ پس یہی ان میں سے بعض کی بعض کی طرف وحی ہے اور حضرت عکرمہ اور ضحاک، سدی اور کلبی نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: پہلا قول اسی پر دلالت کرتا ہے وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ (الانعام: 121) پس یہ اسی معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر صحیح سنت بھی دلالت کرتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر جنوں میں سے ایک ساتھی اس پر مسلط کیا گیا ہے''۔ عرض کی گئی: کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے اور اس نے اسلام قبول کر لیا ہے (یعنی وہ مطیع ہو چکا ہے) اور وہ مجھے خیر اور نیکی کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا''۔ اس میں فاسلم کا لفظ میم کے رفع اور نصب دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ پس رفع اس معنی پر ہے کہ میں اس کے شر سے محفوظ ہوں۔ اور نصب اس معنی کی بنا پر ہے کہ وہ اسلام لا چکا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما منکم من احد اور یہ نہیں کہا ولا من الشیاطین (اور نہ شیطانوں میں سے) مگر یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس میں دو جنسوں میں سے ایک کو دوسری کے بارے متنبہ اور آگاہ کرنا ہو۔ پس یہ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) کے باب سے ہوگا۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 476

اباذر! کیا تو نے انسانوں اور جنات کے شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے؟''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا انسانوں کے شیاطین بھی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ جنوں کے شیاطین سے زیادہ شریر ہیں''(1)۔ اور مالک بن دینار نے کہا ہے: بلاشبہ انسانوں کا شیطان مجھ پر جنوں کے شیطان سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اس لیے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کروں تو جنوں کا شیطان مجھ سے دور ہو جاتا ہے اور انسانوں کا شیطان میرے پاس آ جاتا ہے اور وہ مجھے واضح طور پر معاصی اور گناہوں کی طرف کھینچتا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

إن النساء رَياحين خُلقِن لكم وكُلُكم يشتهِي شمّ الرياحين

''بے شک عورتیں خوشبودار پودے ہیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں اور تم تمام ریاحین کی خوشبو پسند کرتے ہو''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس طرح جواب دیا:

إن النسآء شياطين خُلقِن لنا نعوذ بالله من شر الشياطين

''بلاشبہ عورتیں شیاطین ہیں جو ہمارے لیے پیدا کی گئی ہیں ہم شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ دھوکہ دہی کے قول کی وسوسہ اندازی نہ کرتے۔

فَذَرْهُمْ یہ امر ہے اور اس میں تہدید (ڈرانے) کا معنی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: نہیں کہا جائے گا: وذر اور نہ ہی ودع، ترک کے سبب وہ ان دونوں سے مستغنی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے اکثر استعمال کی بنا پر ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَذَرِ الَّذِيْنَ اور ذَرْهُمْ اور مَا وَدَّعَكَ اور حدیث طیبہ میں ہے: لينتهين أقوام عن وَدْعِهم الجُمُعات (2) (تو میں اپنے جمعوں کو چھوڑنے سے باز آ جائیں گی) اور اس کا قول اذا فعلوا سے مراد معاصی اور گناہ ہیں۔ فقد تُوُدِّعَ منهم تحقیق وہ ان سے چھڑا دیا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: واؤ ثقیل ہے، پس جب ترک ہے اس میں واؤ نہیں ہے اور یہ اس کے معنی میں ہے جس میں واؤ ہے تو پھر اسے چھوڑ دیا گیا جس میں واؤ ہے اور یہ اس کے قول کا معنی ہے یہ نص نہیں ہے۔

وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۝

''اور (چھوڑیئے) تا کہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان کے دل جو نہیں ایمان لائے آخرت پر اور تا کہ پسند کریں اسے اور کرتے رہیں جو گناہ وہ اب کر رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ، تصغی بمعنی تميل (مائل ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: صغوت أصغو صَغْوًا و صُغُوًّا، وصَغَيت أصغي، وصَغِيت یہ غین کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے: صغِي يَصْغَى صغًى وصُغِيًّا، وأصغيت

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 499

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2132

إلیه إصغاء تمام ہم معنی ہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

تَرَى السَّفِیْهَ به عن کلّ مُحْکَمَة زَیْغٌ و فیه الی التشبیه إصغاء

اور کہا جاتا ہے: أصغیت الإناء (اور یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو برتن کو جھکا دے تاکہ جو کچھ اس میں ہے وہ جمع اور اکٹھا ہو جائے۔ اور اس کی اصل المیل الی الشئ لغرض من الاغراض ہے یعنی کسی غرض اور مقصد کے لیے کسی چیز کی طرف مائل ہونا (جھکنا) اور اسی سے ہے صَغَت النجوم ستارے غروب ہونے کی طرف مائل ہوئے۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) (اور تمہارے دل بھی توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں) ابو زید نے کہا ہے: (کہا جاتا ہے) صَغوہ معك و صِغوہ معك، صَغاہ معك، ای میله (اس کا میلان تیرے ساتھ ہے) اور حدیث میں ہے: فأصْغَی لها الإناء (1) یعنی اس نے بلی کے لیے برتن جھکا دیا۔ اور أکرموا فلانا فی صاغیته یعنی تم فلاں کی تکریم کرو اس کی اس قرابت کے سبب جس کی طرف وہ مائل ہوتے ہیں اور جو اس کے پاس ہے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور أصغت الناقة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب ناقہ اپنا سر آدمی کی طرف جھکائے گویا کہ وہ اس سے کچھ سن رہی ہے جب وہ اس پر کجاوہ باندھتا ہے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تُصْغِی إذا شدّها بالکُورِ جانحةً حتی إذا ما استوَی فی غَرْزِها تَثِبُ

اور وَ لِتَصْغَى میں لام لام کی ہے، اور اس میں عامل یُوْحِیْ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ إِلٰی بَعْضٍ لِیَغُرُّوهم ولِتَصْغَی (ان میں سے بعض بعض کی طرف القاء کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں دھوکہ دیں تاکہ (دل ان کی طرف) مائل ہوں)۔ اور بعض نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ لام امر ہے، اور یہ غلط ہے، کیونکہ اس میں ولِتصغَ إلیه الف کو حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ لام کی ہی ہے۔

اور اسی طرح ولِیَرْضَوْہُ ولِیَقْتَرِفُوا میں بھی ہے۔ مگر حسن نے وَلْيَرْضَوْهُ وَلْيَقْتَرِفُوا لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے لام امر قرار دیا ہے اور اس میں تہدید کا معنی موجود ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے: إفعل ماشئتَ (جو تیری مرضی وہ کر، تو اس میں امر تہدید کے لیے ہے) اور وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ کا معنی ہے ولیکتسبوا (چاہیے کہ وہ کرتے رہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے یہی مروی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرج یقترفُ أهله ای یکتسب لهم (وہ نکل گیا جو اپنے اہل کے لیے کرتا ہے) اور قارَفَ فلانٌ هذا الأمر جب وہ اس کام میں خود واقع ہو اور اسے عملاً کرے۔ اور قرفتنی بما إدّعیت علیّ ای رمیتنی بالریبة (تو نے مجھے شک میں ڈال دیا) اور قرَفَ القُرحة (تب کہا جاتا ہے) جب وہ زخم کو چھیل دے اور اقترف کَذِبًا (اس نے جھوٹ گھڑ لیا)۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاستبراء، باب سور الهرة، حدیث 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارت، باب الوضوء بسور الهرة، حدیث 380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رؤبہ نے کہا ہے:

أعیا اقتراف الکذب المقروف　　تقوی التقی وعفۃ العفیف

اور اس کا اصل معنی ہے کسی شی سے کوئی ٹکڑا کاٹنا۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾

''(آپ ان سے پوچھیے) کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور منصف حالانکہ وہی ہے جس نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب مفصل۔ اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ (اچھی طرح) جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) اتارا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ، تو (اے سننے والے!) ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا اس میں غیر کو اَبْتَغِیْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔ اور حَكَمًا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر چاہے تو حال بنا لے۔ اور معنی یہ ہے: کیا میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم تلاش کروں حالانکہ وہ وہ ہے جو تمہیں آیات کے بارے سوال کی مشقت اور بوجھ کے وقت کافی ہوا (کہ) اس نے تمہاری طرف کتاب مفصل نازل فرما دی، اس میں مفصل بمعنی مبین (وضاحت کرنے والی) ہے۔ پھر کہا گیا ہے: حکم، حاکم سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ حکم نام رکھنے کا کوئی مستحق نہیں ہے مگر وہی جو حق کے ساتھ فیصلے کرتا ہے، کیونکہ یہ مدح میں بہت عظیم صفت ہے اور حاکم ایسی صفت ہے جو فعل پر جاری ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ اس کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے جو بغیر حق کے فیصلے کرتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اس میں مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: (وہ مراد ہیں) جو ان میں سے اسلام لے آئے مثلاً حضرت سلمان، حضرت صہیب اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم۔ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ یعنی وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ یعنی وہ سب جو قرآن کریم میں وعدہ وعید میں سے ہے وہ سب برحق ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ یعنی آپ اس بارے میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں کہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کے رؤساء (سردار) ہیں اور وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۱۵﴾

''اور مکمل ہو گئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اہل کوفہ کی قرأت کلمہ واحد کے ساتھ ہے اور باقیوں کی جمع کے ساتھ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مواعیدُ ربك (تیرے رب کے وعدے) پس انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور کلمات، عبارات یا متعلقات کی طرف راجع ہے اور متعلقات سے مراد وعدہ اور وعید وغیرہ ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا: الکلمات سے مراد

قرآن کریم ہے اسے کوئی بدلنے والا نہیں، جھوٹ گھڑنے والے نہ اس میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کمی کر سکتے ہیں۔

صِدْقًا وَّ عَدْلًا یعنی اس میں جو وعدہ اور حکم ہے (اس کی سچائی اور عدل سے) اس کے فیصلے کو کوئی رد کرنے والا نہیں اور نہ کوئی اس کے وعدہ کے خلاف ہونا ممکن ہے اور رمانی نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: جس بارے میں وہ اس کے ساتھ فیصلہ فرمائے اسے کوئی تبدیل کرنے والا نہیں، یعنی بلا شبہ اگر وہ اس کے لیے الفاظ میں تغیر و تبدل ممکن بنا دے جیسا کہ اہل کتاب نے تورات وانجیل میں تبدیلی کر لی تو پھر یہ قابل اعتماد اور قابل اعتبار نہیں رہتا۔ اور یہ آیت قرآن کریم کی دلالات کے واجب الاتباع ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ایسا حق ہے جسے ایسی شی کے ساتھ تبدیل کرنا ممکن نہیں جو اس کی مناقض ہو، کیونکہ یہ ایسے حکیم کی جانب سے ہے جس پر تمام امور میں سے کوئی شی مخفی نہیں ہے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝۱۱۶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝۱۱۷

''اور (اے سننے والے!) اگر تو اطاعت کرے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے، وہ نہیں پیروی کرتے سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ مگر محض تخمینے لگاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی اگر تو اطاعت کرے کفار کی۔ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو وہ تجھے بہکا دیں گے اس راستے سے جو اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ اس میں اِنْ بمعنی ما ہے، اور اسی طرح وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ہے یعنی نہیں ہیں وہ مگر تخمینے لگاتے ہیں اور اندازے لگاتے ہیں، اور اسی سے الخرص ہے، اور اس کا اصل معنی کاٹنا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

تری قِصَد المُرّان فینا کأنه تَذَرُّع خِرصان بأیدی الشواطِبِ

یعنی وہ ٹہنی جو طولاً کاٹی جاتی ہے اور اس سے (سہارا کے لیے) کھونڈی بنائی جاتی ہے۔ اور یہ خرصان خرص کی جمع ہے۔ اور اس سے خَرَص یَخْرُص النخل خَرْصا ہے جب وہ اس کا اندازہ لگائے تا کہ وہ اس سے خراج وصول کرے۔ اور خارص وہ ہوتا ہے جو ایسی شی کے ساتھ کاٹتا ہے جس کے ساتھ کاٹنا جائز نہیں ہوتا، جب کہ اس کے ساتھ اسے یقین نہ ہو۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ ذاریات میں آئے گا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بعض لوگوں نے کہا ہے: یہاں اَعْلَمُ بمعنی یعلم ہے۔ اور اس کی تائید میں حاتم طائی کا قول بیان کرتے ہیں۔

تحالفتْ طیئٌ من دوننا حلفاً واللہ أعلم ما کنا لھم خُذُلا

اور خنساء کا قول ہے:

الله　أعلم　أن　جفنته　تغدو　غداة　الريح　أو تسری

(ان دونوں میں أعلم بمعنی یعلم ہے)

اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ کے مطابق نہیں ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے اصل پر مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ اس میں من بمعنی أی ہے۔ اور یہ محل رفع میں ہے اور اسے رفع دینے والا عامل یَضِلُّ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أعلم کے سبب محل نصب میں ہے، یعنی إن ربك أعلم أی الناس یَضِلّ عن سبیله (بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے لوگوں میں سے کون ہے جو اس کی راہ سے بہک رہا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حرف جر کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے یعنی بمن یَضِل بعض بصریوں نے یہ کہا ہے۔ یہ اچھا اور حسین ہے، الله تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور سورہ نحل کے آخر میں الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور یضل بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مفعول کو حذف کرنے کی بنا پر ہے، اور پہلا قول احسن ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ اور اگر یہ اضلال سے ہوتا تو وہ فرماتا: وهو أعلم بالهادین۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾

''تو کھاؤ اس میں سے لیا گیا ہے نام خدا جس پر اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ یہ آیت کچھ لوگوں کے سبب نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ ہم اسے تو کھاتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے الله تعالیٰ مار دے؟ تب یہ آیات نازل ہوئی: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ اسے ترمذی وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت اس بات کا حکم ہے کہ کوئی مشروب پیتے وقت، ذبح کے وقت اور ہر قسم کی کھائی جانے والی شی کھاتے وقت الله تعالیٰ کا اسم گرامی (یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) پڑھنا چاہیے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ یعنی اگر تم اس کے احکام اور اوامر کو لینے والے (پکڑنے والے) ہو، کیونکہ ایمان انہیں متضمن ہوتا ہے اور انہیں پکڑنے اور ان کی پیروی کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اهل الکتاب، حدیث 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور کیا ہوا تمہیں کہ نہیں کھاتے ہو تم اس جانور کو لیا گیا ہے الله کا نام جس پر حالانکہ الله تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لیے جو اس نے حرام کیا تم پر مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف، اور بے شک بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشوں سے بے علمی کے باعث، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اس کا معنی ہے تمہارے لیے کون سی شی مانع ہے اس کو کھانے سے جس پر تم نے اپنے رب کا نام لیا ہے اگرچہ تم نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔

وَ قَدْ فَصَّلَ یعنی الله تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال اور حرام کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور تم سے التباس اور شک کو زائل کر دیا گیا ہے اور ما استفہامیہ تقریر کو متضمن ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: وأیّ شیئٍ لَکُمْ فی اَلَّا تَاْكُلُوْا (اور اس میں تمہارے لیے کون سی شی ہے کہ تم اسے نہیں کھاتے) اور أن بتقدیر حرف جر محل جر میں ہے۔ اور اس بنا پر محل نصب میں ہونا بھی صحیح ہے کہ حرف جر مقدر نہ ہو اور نصب دینے والا عامل اس فعل کا معنی ہو جو مالکم میں ہے اور اس کی تقدیر ہے ما یمنعکم (کونسی شی تمہیں روکتی ہے) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ اس میں مراد وہ سب ہیں جو الله تعالیٰ نے حرام کیے ہیں مثلاً مردار وغیرہ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے۔ اور نافع اور یعقوب نے وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ دونوں فعلوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، ابن عامر اور ابن کثیر نے دونوں میں ضمہ پڑھا ہے۔ (یعنی فصل اور حرم) اور کوفیوں نے فصل کو فتحہ کے ساتھ اور حرم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور عطیہ العوفی نے فصل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے جدا کرنا اور ظاہر کرنا، جیسا کہ اس آیت میں پڑھا گیا ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ہود: 1) ای إستبانَتْ (یعنی ظاہر کر دیں)۔ ابو عبیدہ نے اہل مدینہ کی قرأت کو اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فصل کا معنی بین (بیان کرنا، واضح کرنا) ہے اور یہ وہی ہے جو سورۃ المائدہ میں اس ارشاد کے تحت مذکور ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ الآیہ (المائدہ: 3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ سورۃ الانعام مکی ہے اور سورۃ المائدہ مدنی سورت ہے تو یہ کیسے اس کا بیان بن سکتی ہے جو ابھی تک نازل ہی نہیں ہوئی؟ سوائے اس صورت کے کہ فصل بمعنی یفصل ہو۔ والله اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ اور قراء کوفہ نے اسے یضلون، أضل سے پڑھا ہے۔

بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی مشرکین نے جب کہا: جسے الله تعالیٰ نے اپنی چھری کے ساتھ ذبح کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جنہیں تم اپنی چھریوں کے ساتھ ذبح کرتے ہو۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی بغیر علم کے جو وہ ذبح کے معاملہ میں جانتے ہیں، کیونکہ اس میں حکمت اس خون کو نکالنا ہے جسے الله تعالیٰ نے ہم پر حرام قرار دیا ہے بخلاف اس جانور کے جو دم گھٹنے سے مر جائے۔ اسی لیے محل مخصوص سے ذبح کو مشروع کیا گیا ہے تاکہ اس میں ذبح جانور سے تمام خون کے نکلنے کا سبب بن جائے بخلاف کسی اور عضو

کے (کیونکہ وہاں سے سارے خون کا نکلنا ممکن نہیں ہوتا) واللہ اعلم۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ۝۱۲۰

''اور ترک کر دو ظاہر گناہ کو اور چھپے ہوئے کو، بے شک وہ لوگ جو کماتے ہیں گناہ (تو) جلدی ہی سزا دی جائے گی انہیں (اس گناہ کی) جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اس بارے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ اور ان کا نتیجہ اور حاصل جس کی طرف وہ راجع ہیں وہ یہ ہے کہ ظاہر وہ ہے جو بدن کا ایسا عمل ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو اور باطن وہ عمل ہے جس کا دل سے اعتقاد رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، چاہے حکم امر کی صورت میں ہو یا نہی کی صورت میں۔ اس مرتبہ پر وہی پہنچ سکتا ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور نیکی کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا (المائدہ: 93) (پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور (جو اترا) اس پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں) اور یہ اس اعتبار سے تیسرا مرتبہ ہے جن کا بیان پہلے سورۃ المائدہ میں ہو چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں تھے کہ ظاہراً زنا کرتے اور باطناً انہیں بیویاں بناتے تھے۔ اور جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے وہ ہر گناہ کو جامع ہے (اور ہر امر کا موجب ہے)۔

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ۠۝۱۲۱

''اور مت کھاؤ اس جانور سے کہ نہیں لیا گیا اللہ کا نام اس پر اور اس کا کھانا نافرمانی ہے اور بے شک شیطان ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے دلوں میں (اعتراضات) تا کہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم مشرک ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ابو داؤد نے روایت بیان کی ہے کہ یہودی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہم اسے تو کھا لیتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ مار دے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ، الی آخر الآیۃ (1)۔ اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ انہوں نے بیان فرمایا: مشرکین نے ان سے جھگڑا کر دیا اور انہوں نے کہا: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے تو اسے تم نہیں کھاتے اور جسے تم خود ذبح کرتے ہو اسے تم کھا لیتے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اہل الکتاب، حدیث نمبر 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہو۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے لیے ارشاد فرمایا: لَا تَاْكُلُوْا تم نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا ہے۔ اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور وہ یہ ہے کہ جو لفظ سبب کی بنا پر وارد ہو کیا اسے اسی پر محصور کیا جائے گا یا نہیں؟ تو ہمارے علماء نے بیان کیا ہے: اس میں دعویٰ عموم کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں جسے شارع نے ابتداءً ہی الفاظ عموم کے ساتھ ذکر کیا ہو، البتہ وہ جسے کسی سوال کے جواب میں ذکر کیا ہو تو اس میں تفصیل ہے، جو اصول فقہ میں معروف ہے۔ مگر یہ کہ اگر اسے بغیر سوال کے لفظ مستقل کے ساتھ ذکر کیا جائے تو پھر وہ تعمیم کے ارادہ کے صحیح ہونے کی صورت میں اوّل (کلام) کے ساتھ لاحق ہوگا، پس قول باری تعالیٰ: لَا تَاْكُلُوْا مردار کو شامل ہونے میں ظاہر ہے۔ اور اس میں وہ بھی داخل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا کیونکہ یہ الفاظ عام ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی اور کے ذکر کی زیادتی وہ ہے جس کی تحریم کا تقاضا بطور نص اس ارشاد سے ہوتا ہے: وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ (البقرہ: 173) (اور وہ جانور بلند کیا گیا جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام) کیا اس میں وہ جانور بھی داخل ہوگا جس پر ذبح کے وقت یا شکار پر چھوڑتے وقت کسی مسلمان نے تسمیہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں پانچ قول ہیں۔ اور یہی وہ مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ پہلا قول: اگر اس نے تسمیہ سہواً (بھول کر) چھوڑ دیا تو دونوں جانور کھائے جائیں گے یہی اسحاق کا قول ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور اگر اس نے عمداً (جان بوجھ کر) چھوڑ دیا تو دونوں نہ کھائے جائیں گے۔ امام مالک اور ابن القاسم نے اپنی کتاب میں یہی کہا ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے اصحاب، امام ثوری، حسن بن حی، عیسیٰ اور اصبغ نے کہا ہے اور سعید بن جبیر اور عطا نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے پسند کیا ہے اور کہا ہے: یہ احسن ہے، کیونکہ اسے فاسق کا نام نہیں دیا جا سکتا جب وہ بھول گیا۔

دوسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا سہواً چھوڑ دیا تو وہ دونوں کو کھالے گا۔ اور امام شافعی اور حسن رحمہما اللہ کا قول ہے اور حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عطا، حضرت سعید بن مسیب، حضرت جابر بن زید، حضرت عکرمہ، حضرت ابو عیاض، حضرت ابورافع، حضرت طاؤس، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ اور زہراوی نے امام مالک بن انس سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ ذبیحہ کھایا جائے گا جس پر عمداً یا بھول کر تسمیہ چھوڑ دیا گیا۔ اور حضرت ربیعہ سے بھی یہی مروی ہے۔ عبدالوہاب نے کہا ہے: تسمیہ سنت ہے، پس جب ذبح کرنے والے نے اسے بھول کر چھوڑ دیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے قول کے مطابق وہ ذبیحہ کھایا جائے گا۔

تیسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا بھول کر چھوڑ دیا تو اس کا کھانا حرام ہے۔ محمد بن سیرین، عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن عمر، نافع، عبداللہ بن زید خطمی اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے: اور اسی طرح ابوثور اور داؤد بن علی نے کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں یہی ہے۔

چوتھا قول: اگر اس نے عمداً تسمیہ چھوڑ دیا تو اسے کھانا مکروہ ہے۔ ہمارے علماء میں سے قاضی ابوالحسن اور شیخ ابوبکر نے

یہی کہا ہے۔

پانچواں قول: اشہب نے کہا ہے کہ عمداً تسمیہ چھوڑنے والے کا ذبیحہ کھایا جائے گا(1) مگر یہ کہ وہ حقیر اور ناپسند کرتا ہو اور اسی طرح علامہ طبری نے کہا ہے (دلائل یہ ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور دوسرا ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں صورتیں بیان فرما دیں اور دونوں کا حکم واضح فرما دیا۔ اس کا قول لَا تَاْكُلُوْا نہی ہے جو تحریم پر دلالت کرتی ہے اسے کراہت پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اپنے بعض ایسے مقتضیات کو شامل ہے جو حرام محض ہے اور اس میں تبعض جائز نہیں، یعنی اس سے تحریم اور کراہت ایک ساتھ مراد لیے جائیں۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس اصول ہے۔ اور رہا بھولنے والا تو اس کی طرف خطاب متوجہ ہی نہیں، کیونکہ اسے خطاب کرنا محال ہے، پس شرط اس پر واجب نہیں ہے۔

اور رہا وہ جو تسمیہ کو جان بوجھ کر ترک کرنے والا ہے تو وہ تین احوال سے خالی نہیں ہوگا یا تو وہ اس وقت تسمیہ ترک کرے گا جب ذبیحہ کو لٹائے گا اور کہے گا: میرا دل اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی توحید سے بھرا ہوا ہے لہٰذا میں اپنی زبان کے ساتھ ذکر کرنے کا محتاج نہیں ہوں۔

پس اسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا ذکر کیا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ یا وہ کہتا ہے: بلاشبہ یہ صریح تسمیہ کا محل نہیں ہے، کیونکہ یہ قربت نہیں ہے، تو اسے بھی وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ یا وہ کہتا ہے: میں تسمیہ نہیں پڑھوں گا، اور تسمیہ کی کون سی قدر و منزلت ہے، تو یہ حقیر جاننے والا فاسق ہے اس کا ذبیحہ نہیں کھائے جائے گا۔

علامہ ابن عربی(2) نے کہا ہے: مجھے رأس المحققین، امام الحرمین پر بڑا تعجب ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بلاشبہ قرب کی حالت میں مشروع ہے اور ذبح حالت قربت نہیں ہے۔ یہ نظریہ قرآن و سنت سے معارض آتا ہے۔ آپ ﷺ نے حدیث صحیح میں فرمایا ہے: ''وہ جانور جس کا خون بہایا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا تو اسے کھاؤ''۔ پھر اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے سے مراد دل میں نام لینا ہے، کیونکہ ذکر نسیان کی ضد ہے اور نسیان کا محل دل ہے پس ذکر کا محل بھی دل ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت بیان فرمائی: ''اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے وہ تسمیہ پڑھے یا نہ پڑھے''(3)۔ تو ہم کہیں گے: ذکر باللسان بھی ہے اور ذکر بالقلب بھی۔ اور وہ عمل جو عرب کرتے تھے وہ زبان سے بتوں کا نام لیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام زبان کے ساتھ لینے کے ذریعہ اسے ختم کیا اور شریعت میں یہی مشہور ہے یہاں تک کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے گا جب وضو کرے(4)، تو آپ نے فرمایا: کیا وہ ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور رہی وہ حدیث جس کے ساتھ انہوں نے تعلق قائم کیا ہے ''کہ اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے''(5)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 749　　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 750

4۔ ایضاً　　5۔ صحیح بخاری، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 828

تحقیق اہل علم کی ایک جماعت نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ذبیحہ پر تسمیہ پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کو فرمایا جنہوں نے آپ سے سوال کیا اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قوم ہمارے پاس گوشت لے کر آتی ہے اور ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے یا نہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لے لو اور اسے کھالو'' (1)۔

اسے دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے مرسل روایت کیا ہے اور اسے مرسل بیان کرنے میں آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اور اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ نے اس کے آخر میں کہا: و ذالك فی اول الإسلام (کہ وہ ابتداء اسلام میں ہوا) مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ ضعیف ہے اور فی نفسہ حدیث میں وہ موجود ہے جو اس کا رد کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس میں کھانے پر تسمیہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ آیت آپ پر نازل ہو چکی تھی۔ اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کو صحیح ہونے پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث مدینہ طیبہ کی ہے اور علماء کا اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ سورۃ الانعام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔

اور وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کا معنی ہے کہ یہ معصیت اور گناہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور لَفِسْقٌ کا معنی الخروج (نکلنا) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ یعنی وہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے کی باتیں ڈالتے ہیں۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے (یعنی ماردے) تو اس کو تم نہ کھاؤ اور جسے تم خود ذبح کرو تو اسے کھالو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: اس آیت میں شیاطین سے مراد فارس کے مجوسیوں میں سے سرکش انسان ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: بلکہ شیاطین سے مراد جن ہیں اور جنوں میں سے کافر قریش کے اولیاء (دوست) ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ مختار کہتا ہے: میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے، بلاشبہ شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے رہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول: لِيُجَادِلُوْكُمْ مراد ان کا یہ قول ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ماردے تم اسے نہ کھاؤ اور جسے تم مارو تم اسے کھالو۔ اور مجادلہ کا معنی ہے قوت کے ساتھ حجت کے طریقہ پر قول کا دفاع کرنا۔ یہ أجدل سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے طاقتور پرندہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدالہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد زمین ہے۔ تو گویا وہ اس پر غلبہ پاتا ہے دلیل کے ساتھ اور وہ

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2446۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 162　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340

اسے اس طرح مغلوب کر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ قبضہ کی ہوئی زمین کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدال سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے بٹائی کا مضبوط ہونا، گویا ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حجت اور دلیل کو بل دیتا ہے یہاں تک کہ اسے کاٹ دیتا ہے اور وہ حق کی نصرت اور معاونت میں حق ہوتی ہے اور باطل کی نصرت اور مدد میں باطل ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ یعنی مردار کو حلال قرار دینے میں اگر تم نے ان کی بات مانی۔ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (تو تم مشرک ہو جاؤ گے) پس آیت اس پر دلیل ہے کہ جس نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو حلال قرار دیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ اس کے سبب مشرک ہو جائے گا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام قرار دیا ہے اور یہ نص سے ثابت ہے۔ اور جب کسی نے کسی غیر کی حلال کردہ چیز کو قبول کر لیا تحقیق اس نے بھی شرک کیا۔ علامہ ابن عربی (2) نے کہا: بلاشبہ مومن مشرک کی اطاعت کرنے سے مشرک ہو جاتا ہے جب وہ اعتقاد میں اس کی اطاعت و پیروی کرے۔ اور جب وہ فعل اور عمل میں اس کی پیروی کرے اور اس کا عقیدہ صحیح سالم ہو اور توحید و تصدیق پر قائم اور جاری ہو تو گنہگار ہوگا۔ پس تم اسے سمجھ لو اور یہ سورۂ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لیے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو، نہیں نکلنے والا ان سے، یونہی آراستہ کر دیئے گئے کافروں کے لیے وہ اعمال جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ جمہور نے واؤ کو مفتوح پڑھا ہے، اور اس پر ہمزہ استفہام داخل کیا گیا ہے۔ مسیمی نے نافع بن ابی نعیم سے اَوْ مَنْ كَانَ واؤ ساکن کے ساتھ روایت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کا معنی پر محمول ہونا بھی جائز ہے، یعنی تم دیکھو اور تدبر کرو کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی منصف تلاش کروں؟ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ مردہ تھا جس وقت وہ نطفہ تھا، پھر ہم نے اس میں روح پھونک کر اسے زندہ کیا، اسے ابن البحر نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: کیا وہ جو پہلے کافر تھا اور ہم نے اسے ہدایت عطا فرمائی؟

یہ آیت حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل کے بارے نازل ہوئی۔ اور زید بن اسلم اور سدی نے کہا ہے: فَاَحْيَيْنٰهُ سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں (یعنی ہم نے انہیں ہدایت عطا فرما کر زندگی بخش دی)۔ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ مراد ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ ہے (یعنی وہ کفر کے سبب اندھیروں میں پڑا رہا) اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ہر مومن اور کافر کے بارے میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جہالت کے سبب مردہ تھا تو ہم نے اسے علم کے ساتھ زندہ کر دیا۔ بعض اہل علم نے شعراء بصرہ میں سے کسی کے یہ اشعار بھی بیان کیے ہیں جو اس تاویل کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 752

وفی الجھل قبل الموت موتٌ لأھلہ فأجسامھم قبل القبور قبورُ

''جہالت میں موت سے قبل ہی جاہلوں کے لیے موت ہے اور ان کے اجسام قبروں میں جانے سے پہلے ہی قبریں ہیں''۔

وإنّ أمرا لم یَحْیَ بالعلم میّتٌ فلیس لہ حتی النشور نشورُ

''اور بلاشبہ آدمی جو علم کے ساتھ زندہ نہیں ہوا وہ مردہ ہے اور اس کے لیے نشور (مرنے کے بعد زندہ کیا جانا) بھی نشور نہیں ہے''۔

اور نور سے مراد ہدایت اور ایمان ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد حکمت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہی نور ہے جس کا ذکر ان ارشادات میں ہے: یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ (الحدید:12) (کہ ضوفشانی کر رہا ہوگا ان کا نور ان کے آگے بھی اور ان کے دائیں جانب بھی) اور انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید:13) (ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کریں تمہارے نور سے) یَمْشِیْ بِهٖ اس نور کی روشنی میں وہ چلتا ہے۔ فِی النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لوگوں کے درمیان وہ اس کی مثل ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو۔ ای کمن ھو تو اس میں مثل زائدہ ہے۔ آپ کہتے ہیں: أنا أکرم مثلك، ای أکرمك (میں تیری عزت وتکریم کرتا ہوں۔ اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (المائدہ:95) (تو اس کی جزا یہ ہے کہ اسی قسم کا جانور دے جو اس نے قتل کیا ہے)

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ:11) (نہیں اس کی مانند کوئی چیز) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَنْ مَّثَلُهٗ کا معنی ہے مثل من ھو فی الظلمات (اس کی مثل جو تاریکیوں میں ہے) اور المثل اور المثل دونوں کا معنی ایک ہے۔ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلْكٰفِرِیْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ شیطان نے ان کے لیے بتوں کی عبادت کو آراستہ کر دیا اور انہیں یہ وہم دلایا کہ وہ مسلمانوں سے افضل ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا ؕ وَ مَا یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر بستی میں اس کے بڑے لوگوں کو وہاں کے مجرم تاکہ وہ مکروفریب کیا کریں اس میں اور نہیں فریب دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا اس کا معنی ہے: جس طرح ہم نے کافروں کے لیے ان اعمال کو آراستہ کیا جو وہ کیا کرتے تھے اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بنایا۔ مُجْرِمِیْهَا یہ جعل کا مفعول اوّل ہے۔ اَكٰبِرَ یہ مفعول ثانی ہے اور ان میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اور جعل بمعنی صیر ہے۔ اور الأکابر، الأکبر کی جمع ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد عظماء (بڑے لوگ) ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکابر سے مراد رؤساء اور عظماء ہیں۔ اور انہیں خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ فساد برپا کرنے پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور مکر کا معنی استقامت کی مخالفت میں حیلہ کرنا ہے۔ اور اس کا اصل معنی الفتل (بٹنا) ہے۔ پس مکروفریب کرنے والا استقامت سے پھر جاتا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ہر گھاٹی پر چار چار بیٹھتے تھے اور لوگوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی سے نفرت دلاتے تھے جیسا کہ ان سے پہلے امم ماضیہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا۔

وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی ان کے مکر وفریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دردناک عذاب کے ساتھ مکر کی جزا اور بدلہ ہے۔ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ اپنی فرط جہالت کی وجہ سے فی الحال اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ان کے فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹے گا۔

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝

''اور جب آئے ان کے پاس کوئی نشانی کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے جیسے دیا گیا اللہ کے رسولوں کو، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو، عنقریب پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت، بوجہ ان مکروں کے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ اس میں ان کی جہالت کی ایک دوسری چیز بیان فرمائی اور وہ یہ کہ وہ کہنے لگے: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ہم انبیاء ہو جائیں اور ہمیں انہیں نشانیوں کی طرح عطا کی جائیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ اور اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں)۔

اور جَآءَتْهُمْ میں ضمیر ان اکابر کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ ولید بن مغیرہ (1) نے کہا: اگر نبوت حق ہے تو پھر میں اس کے لیے تم سے زیادہ اہل اور بہتر ہوں، یا کیونکہ میں عمر کے اعتبار سے تم سے بڑا ہوں اور میرا مال تم سے زیادہ ہے۔

اور ابو جہل نے کہا: قسم بخدا! ہم اس کے ساتھ راضی ہوں گے اور نہ کبھی اس کی اتباع کریں گے، مگر اس صورت میں کہ ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی آئے جیسے ان کے پاس آتی ہے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے نبوت کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے کہا: ہم تمہاری تصدیق نہ کریں گے یہاں تک کہ ہمارے پاس حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اور دیگر ملائکہ آئیں اور وہ ہمیں آپ کی صداقت کے بارے خبر دیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ یعنی اس کے بارے جسے اس پر امین بنایا گیا ہے اور جو اس کا محل ہے۔

اور حَيْثُ یہاں ظرف نہیں ہے، بلکہ یہ اسم ہے اس میں وسعت ہونے کی بنا پر مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے اسے نصب دی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ رسالت کے اہل کو خوب جانتا ہے اور یہ اصل عبارت اس طرح ہے اللہ أعلم بمواضع رسالته اللہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 414　　2۔ ایضاً

تعالیٰ اپنی رسالت کی جگہوں کو خوب جانتا ہے، پھر حرف کو حذف کر دیا گیا اور یہ جائز نہیں ہے کہ أعلم، حیث میں عمل کرے اور وہ ظرف ہو، کیونکہ اس پر معنی یہ ہوگا اللہ أعلم فی هذا الموضع (اللہ تعالیٰ اس محل میں خوب جانتا ہے) اور یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ متصف کیا جائے، بلاشبہ اس کا محل اس فعل مضمر کے ساتھ نصب ہے جس پر ''أعلم'' دلالت کرتا ہے اور یہ اسم ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

اور الصغار کا معنی ظلم، ذلت اور حقارت ہے، اور اسی طرح الصُغر (بالضم) بھی ہے۔ اور مصدر الصغر ہے۔ اور اس کی اصل الصغر ہے جو کبر کا مقابل ہے۔ گویا ذلت آدمی کی ذات کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الصغر ہے اور اس کا معنی ہے ذلت کے ساتھ راضی ہونا۔

اسی سے کہا جاتا ہے: صَغَرَ یَصْغُرُ ماضی میں غین مفتوح ہے اور مضارع میں مضموم ہے۔ اور صَغِرَ، یَصْغَرُ ماضی میں غین مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں، صِغرًا و صِغارًا اور اسم فاعل صَاغِرٌ اور صغیر ہوگا۔ اور صاغر کا معنی ہے ظلم کے ساتھ راضی ہونے والا۔ اور المصغوراء کا معنی الصغار (حقیر) ہے اور ارض مصغرۃ کا معنی ہے ایسی زمین جس کی فصل نہ بڑھے۔ یہ ابن السکیت سے منقول ہے۔

عِنْدَ اللّٰهِ، ای من عند اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اور پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، (اصل عبارت ہے) سیصیب الذین أجرموا عند اللہ صغارٌ اور فراء نے کہا ہے: سَیُصِیبُ الَّذِیْنَ أجرمُوا صغار مِنَ اللہ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے سَیُصِیبُ الذین أجرموا صغارٌ ثابتٌ عند اللہ عنقریب انہیں پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثابت ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے احسن ہے، کیونکہ اس میں عند اپنے محل میں واقع ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''اور جس (خوش نصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کشادہ کر دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس (بدنصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے تو بنا دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ، بہت تنگ، گویا وہ زبردستی چڑھ رہا ہے آسمان کی طرف، اسی طرح ڈال دیتا ہے اللہ تعالیٰ ناپاکی ان پر جو ایمان نہیں لاتے''۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ یعنی وہ اسلام کے لیے اس کا سینہ وسیع کر دیتا ہے اور اسے توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اس کے نزدیک اس کا اجر و ثواب مزین اور آراستہ کر دیتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: شرح کا معنی شق کرنا ہے، اور اس کی اصل التوسعۃ (وسعت کرنا) ہے۔ اور شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ (الزمر:22) کا معنی ہے اس نے اس کا

سینہ اس کی وضاحت و بیان کے ساتھ وسیع کر دیا اور شرحتُ الأمر کا معنی ہے میں نے اس کو بیان کر دیا اور اسے خوب واضح کر دیا۔ اور قریش عورتوں کے لیے خوب وسعت رکھتے تھے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کانت قریش تشرح النساء شرحا یہ توسعۃ اور البسط سے ماخوذ ہے اور یہ عورت کو گدی کے بل چت لٹا کر اس سے وطی کرنا ہے۔ اور الشرح کا معنی الکشف (ظاہر کرنا اور ننگا کرنا) ہے۔ آپ کہتے ہیں: شرحتُ الغامِضَ میں نے ڈھانپی ہوئی چیز کو ظاہر کر دیا، ننگا کر دیا۔ اور اسی سے تشریح اللحم (گوشت کو لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹنا) بھی ہے۔ راجز نے کہا ہے:

كَمْ قَدْ أَكلتُ كَبِدًا وَ إِنْفَحَةً　　ثم ادخرتُ أَلْيَةً مُشَرَّحَةً

''اور گوشت کا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے۔ اور گوشت کا ہر موٹا اور لمبا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے''۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ اور جس کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے۔ **يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا** (تو اس کے سینہ کو بہت تنگ بنا دیتا ہے) یہ قدریہ کا رد ہے۔ اس آیت کی نظیر سنت میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من یُرِدِ اللهُ به خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فی الدین (1) (جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی فقاہت اور سمجھ عطا فرما دیتا ہے)۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جب سینہ وسیع اور نور سے منور ہو۔ اور دین سے مراد عبادات ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) (بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) اور اس کے خطاب کی دلیل یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ نہیں فرماتا اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے، اس کی فہم کو (معانی سے) دور کر دیتا ہے اور اسے فقاہت عطا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم

اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا سینہ کھل جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم یدخل القلب نورٌ (ہاں دل میں نور داخل ہو جاتا ہے) تو انہوں نے عرض کی: کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التَّجافِي عن دار الغُرورِ والإنابةُ إلى دار الخلود والإستعدادُ للموت قبل نزول الموت (2) (دار الغرور (دنیا) سے دوری اختیار کرنا اور دار الخلود (آخرت) کی طرف میلان رکھنا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا)۔

اور ابن کثیر نے ضَيْقًا تخفیف کے ساتھ قرأت کی ہے، مثلاً هين اور لين یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور نافع اور ابو بکر نے حَرِجًا کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے: (تنگی) معنی کو مکرر لایا گیا ہے اور یہ لفظ مختلف ہونے کے سبب اچھا اور خوبصورت ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ حرجا قرأت کی ہے، یہ حرجۃ کی جمع ہے۔ اور اس کا معنی بھی بہت زیادہ تنگی کا ہونا ہے اور الحرجۃ اس کا معنی الغیضۃ (گھنے درختوں والی جگہ، جنگل) ہے اور اس کی جمع حرج اور حرجات ہے۔ اور اسی سے ہے فلان یتحرج یعنی وہ اپنے نفس پر گناہوں کے لیے اپنی خواہش کو ترک کرنے پر تنگی محسوس کرتا ہے۔ یہ ہروی نے کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: الحرج کا معنی گھنے درختوں والی جگہ (جنگل) ہے۔ تو گویا کافر کے دل تک حکمت نہیں پہنچ سکتی جیسا کہ کوئی چرنے والا جانور اس جگہ تک نہیں پہنچ سکتا جہاں درخت گھنے ہوں (آپس میں جڑے ہوئے ہوں)

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 1087
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 542-543

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ معنی مروی ہے اسے مکی اور ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ہر تنگی کو حَرِج اور حَرَج کہلاتا ہے۔
علامہ جوہری نے کہا ہے: مکان حَرَج و حرِج یعنی وہ تنگ جگہ جہاں درخت کثیر ہوں اور اس تک چرنے والا جانور نہ پہنچ سکتا ہو۔ اور اس طرح بھی قرأت کی گئی ہے: یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا و حَرِجًا اور یہ قائم مقام ہے الوَحَد اور الوَحِد اور الفَرَد اور الفَرِد اور الدنَف اور الدنِف کے (یعنی) دونوں قرأتوں کے مطابق ایک معنی ہے اور اسے کسی اور نے فراء سے بیان کیا ہے اور قد حرِج صدرہ یَحْرَج حرجا (اس کا سینہ تنگ ہوگیا)۔
اور الحَرَج کا معنی اثم (گناہ) ہے اور الحرج کا معنی الناقۃ الضامرۃ (کمزور اور نحیف اونٹنی) بھی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الطویلۃ علی وجہ الأرض (سطح زمین پر پھیلنے اور لمبا ہونے والی) یہ ابوزید سے مروی ہے، اور یہ لفظ مشترک ہے اور الحرج کا معنی وہ لکڑیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں اور ان میں مردے کو اٹھایا جاتا ہے، یہ اصمعی سے منقول ہے اور یہی امرء القیس کا قول بھی ہے:

فإمّا ترینی لی رِحالۃ جابرٍ　علی حَرَجٍ کالقَرِّ تَخْفِق أکفانی

''اور بسا اوقات انہیں عورتوں کی میت پر رکھا جاتا ہے۔
ظلیم کا وصف بیان کرتے ہوئے عنترہ نے کہا ہے۔

یَتْبَعْنَ قُلَّۃَ رأسِہ وکأنّہ　حَرَجٌ علی نَعْش لهنّ مُخَیَّم

اور زجاج نے کہا ہے: الحرج کا معنی ہے بہت زیادہ تنگ ہونا۔ پس جب کہا جائے: فلان حرج الصدر، تو اس کا معنی ہوگا اپنے سینے میں بہت زیادہ تنگی محسوس کرنے والا (یعنی ذو حرج فی صدرہ) اور جب کہا جائے: حِرج تو یہ اسم فاعل ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: حرِج اسم فاعل ہے اور حرج مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل عَدْلٌ و رِضًا۔
قولہ تعالیٰ: کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ اسے ابن کثیر نے صاد کے سکون کے ساتھ مخفف پڑھا ہے، یہ الصعود سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے اوپر چڑھنا۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ایمان سے بھاگنے اور اسے اپنے اوپر ثقیل سمجھنے کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جسے ایسے کام کا مکلف بنایا جائے جسے کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، جیسا کہ آسمان پر چڑھنے کی طاقت نہیں رکھی جا سکتی۔ اور اسی طرح یُصَاعِدُ کا لفظ بھی ہے اور اس کی اصل یَتَصَاعَدُ ہے، تا کو صاد میں ادغام کر دیا گیا ہے اور یہ ابوبکر اور نخعی کی قرأت ہے، مگر اس میں ایک کام کرنے کے بعد فوراً دوسرا کام کرنے کا معنی ہے اور ایسا فعل کام کرنے والے پر انتہائی ثقیل اور بھاری ہوتا ہے۔
اور باقیوں نے اسے الف کے بغیر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اسی کی طرح ہے جو اس سے پہلے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ یکے بعد دیگرے ایسا کام کرنے کا پابند اور مکلف ہوتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا، اسی طرح تیرا یہ قول ہے: یَتَجَرَّعُ اور یَتَفَوَّقُ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پڑھا کَاَنَّمَا یَتَصَعَّدُ نحاس نے کہا ہے: اس قرأت کا معنی اور

اس کی قرأت جس نے یَصَّعَدُ اور یُصَاعِدُ پڑھا ہے کا معنی ایک ہے۔ اور دونوں میں معنی یہ ہے کہ کافر وہ ہے جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے تنگ کر دیا ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے، حالانکہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا، تو گویا وہ اس کی استدعا کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے قریب ہے اس کا دل اسلام سے دور بھاگتے ہوئے آسمان کی طرف چڑھ جائے۔

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پر ناپاکی ڈال دیتا ہے، جیسا کہ اس نے ان کے جسموں میں سینہ تنگ کر دیا۔ اور رجس کا لغوی معنی بدبو (النتن) ہے۔ ابن زید (1) نے کہا ہے: یہ عذاب ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رجس سے مراد شیطان ہے (2)، یعنی اللہ تعالیٰ اسے ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رجس سے مراد وہ شی ہے جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور اسی طرح اہل لغت کے نزدیک الرجس سے مراد بدبو ہے، پس آیت کا معنی یہ ہے واللہ اعلم: وہ دنیا میں ان پر لعنت ڈالتا ہے اور آخرت میں عذاب (میں مبتلا کرے گا)۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝

"اور یہ ہے راستہ آپ کے رب کا (بالکل) سیدھا، ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا یعنی یہ وہ ہے جس پر اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور مومنین ہیں۔ آپ کے رب کا دین ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ یعنی ہم نے دلائل کو بیان کر دیا ہے۔ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں)

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

"ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے ہاں اور وہی ان کا دوست ہے بسبب ان نیک اعمال کے جو وہ کیا کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ یعنی نصیحت قبول کرنے والے کے لیے۔ دَارُ السَّلٰمِ جنت ہے، پس جنت اللہ کا گھر ہے، جس طرح کہ کہا جاتا ہے: الکعبۃُ بیتُ اللہ (کعبۃ معظمہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی دار السلامہ ہو، یعنی وہ گھر جس میں آدمی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور عِنْدَ رَبِّهِمْ کا معنی ہے اس کے ہاں ان کے لیے یہ ضمانت دی گئی ہے کہ وہ انہیں اپنے فضل سے اس تک پہنچائے گا۔ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ اور وہی ان کا مددگار اور معاون ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 144　　2۔ ایضاً

لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

''اور جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ ان سب کو (اور فرمائے گا) اے جنوں کے گروہ! بہت گمراہ کیا تم نے انسانوں کو، کہیں گے ان کے دوست انسانوں میں سے اے ہمارے رب! فائدہ اٹھایا ہم نے ایک دوسرے سے اور پہنچ گئے ہم اپنی اس معیاد کو جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آگ تمہارا ٹھکانا ہے ہمیشہ رہو گے اس میں مگر جسے اللہ تعالیٰ (نجات دینا) چاہے بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے یعنی وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ يَقُوْلُ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مراد قیامت کے دن تمام مخلوق کو میدان حشر میں جمع کرنا ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ اس میں منادی مضاف ہے۔ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (انہیں بہت گمراہ کیا) اس میں وہ مصدر جو مفعول کی طرف مضاف ہے اسے حذف کر دیا گیا اور حرف جر با کو حذف کر دیا (یعنی من الاستمتاع بالانس)

اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ اور یہ اس کے قول کو رد کرتا ہے جس نے کہا: بیشک جن وہ ہیں جنہوں نے انسانوں سے فائدہ اٹھایا، کیونکہ انسانوں نے انہیں قبول کیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے والا ہے۔ اور عربی میں تقدیر کلام یہ ہوگی: اِسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بَعْضًا (ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا) پس جنوں نے انسانوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ انہوں نے اس میں لذت محسوس کی کہ انسانوں نے ان کی اطاعت و پیروی کی ہے۔ اور انسان جنات کو قبول کر کے لطف اندوز ہوتے رہے یہاں تک کہ جنوں کے انہیں بہکانے کے سبب انہوں نے زنا کیا اور شراب پیتے رہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے سفر کے دوران جب کسی وادی سے گزرتا اور اسے اپنے اوپر خوف محسوس ہوتا تو وہ کہتا: اعوذ برب ھذا الوادی من جمیع ما أحذر (میں اس وادی کے سردار کی پناہ مانگتا ہوں ان تمام چیزوں سے جن سے میں ڈرتا ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾ (الجن) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے غرور کو)

پس یہی انسانوں کا جنوں سے استمتاع اور فائدہ تھا۔ اور رہا جنوں کا انسانوں سے فائدہ تو وہ یہ کہ وہ انہیں جھوٹی خبریں، کہانت اور سحر القا کرتے رہتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنوں کا انسانوں سے استمتاع یہ تھا کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ جن اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ ان سے وہ تمام چیزیں دور کر دیں جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ اور آیت کا معنی گمراہ ہونے والوں اور گمراہ کرنے والوں کو آخرت میں عالمین کی آنکھوں کے سامنے ڈانٹنا اور جھڑکنا ہے۔

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا اس میں مقررہ مدت سے مراد موت اور قبر ہے اور ہم انتہائی نادم ہو کر آئے ہیں۔ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ یعنی آگ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 128

مثوی کا معنی ٹھکانا، ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ استثناء اوّل کلام میں سے نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ استثنا یوم قیامت کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی تم ہمیشہ آگ میں رہو گے مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے ان کے قبروں سے نکل کر ان کے جمع ہونے کی مقدار اور ان کی مدت حساب کی مقدار میں سے۔ تو اس صورت میں استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا آگ کی طرف راجع ہے، یعنی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تمہیں بعض اوقات میں بغیر آگ کے عذاب دے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: استثناء اہل ایمان کی ہے۔ تو اس بناء پر ما بمعنی من ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ آیت اس کے بارے وقف کو ثابت کر رہی ہے جو ابھی نہیں مرا، جب کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ کہ وہ دنیا میں بغیر عذاب کے رہیں۔ اس آیت کا معنی اس آیت کے معنی کی طرح ہے جو سورۂ ہود میں ہے۔

اور وہ یہ ارشاد ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ (ہود: 106) وہاں اس کا کامل بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ یعنی انہیں سزا دینے میں اور اپنے جمیع افعال میں (آپ کا رب بڑا دانا ہے)۔ عَلِیْمٌ اور انہیں سزا دینے کی مسدار کے بارے سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''اور یونہی ہم مسلط کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو وہ کرتے رہتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًۢا اس کا معنی ہے جس طرح ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے ان کاموں کے متعلق جو میں نے تمہارے لیے بیان کیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے فائدہ اور حظ اٹھاتے ہیں (اسی طرح) میں بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتا ہوں، پھر کل وہ ایک دوسرے سے برأت اختیار کر لیں گے۔ اس تفسیر پر نُوَلِّیْ کا معنی ہے نجعل ولیًا (ہم دوست بنا دیتے ہیں)

ابن زید نے کہا ہے: ہم ظالم جنوں کو ظالم انسانوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور وہ انہیں ہلاک اور ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔ یہ ظالموں کے لیے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دے گا۔ اور اس آیت میں وہ تمام داخل ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یا رعیت پر ظلم کرتے ہیں یا ایسا تاجر جو اپنی تجارت میں لوگوں پر ظلم کرتا ہے یا چور وغیرہ۔

اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب تو کسی ظالم کو دیکھے کہ وہ دوسرے ظالم سے انتقام لے رہا ہے تو ٹھہر جا اور اس میں تعجب کرتے ہوئے غور و فکر کر۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے راضی ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات کا والی ان کے نیک لوگوں کو بناتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات پر ان کے شریر لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ (جس نے ظالم کی معاونت کی اللہ تعالیٰ اسے اس پر مسلط کر دے گا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے بعض کو بعض کے سپرد کر دیتے ہیں ان اعمال میں جنہیں وہ کفر میں سے ناپسند کرتے ہیں، جیسا کہ ہم انہیں کل روساء کے حوالے کر دیں گے جو انہیں عذاب سے نجات دلانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ یعنی ہم اسی طرح ان کے ساتھ آخرت میں کریں گے جس طرح ہم ان کے ساتھ دنیا میں کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (النساء: 115) کے تحت کہا گیا ہے: کہ ہم اسے اس کے حوالے کر دیں گے جس کے حوالے اس نے اپنے آپ کو کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے بارے شر کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ ان کے معاملات ان کے شریر لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ: 30) (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے)

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَ یُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ۝۱۳۰

"اے گروہ جنوں اور انسانوں کے! کیا نہیں آئے تمہارے پاس رسول تم ہی میں سے سناتے تھے تمہیں ہماری آیتیں اور ڈراتے تھے تمہیں تمہاری اس دن کی ملاقات سے، کہیں گے: ہم گواہی دیتے ہیں اپنے خلاف اور دھوکہ میں مبتلا کیا تھا انہیں دنیوی زندگی نے اور گواہی دیں گے اپنے خلاف کہ وہ کفر کرتے رہے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ یعنی جس دن ہم انہیں جمع کریں گے تو ہم ان کو کہیں گے۔ لھم کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے؟ پھر اسے کلام سے حذف کر دیا گیا، تو وہ اس بارے میں اعتراف کریں گے جس میں ان کی رسوائی ہوگی اور مِّنْكُمْ کا معنی ہے فی الخلق والتکلیف والمخاطبۃ (یعنی تخلیق میں، احکام کا مکلف ہونے میں اور مخاطب ہونے میں وہ تم میں سے تھے) اور جب جن ان میں سے ہیں جنہیں خطاب کیا جا رہا ہے اور وہ عقل اور سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں تو فرمایا: مِّنْكُمْ اگرچہ رسول انسانوں میں سے تھے اور خطاب میں انسانوں کو اسی طرح غلبہ دیا گیا ہے جس طرح مذکر مونث پر (یعنی مردوں کو عورتوں پر) غلبہ دیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے فرمایا: جنوں کے رسول وہ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے پاس وہ آیات پہنچائیں جو انہوں نے وحی سے سنی تھیں، جیسا کہ فرمایا: وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۝ (الاحقاف) (تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے)

حضرت مقاتل اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما (2) نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے اسی طرح رسول بنائے جس طرح اس نے انسانوں میں سے رسول بنائے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: رسول انسانوں میں سے ہیں اور ڈرانے والے جنوں میں سے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۝ (الاحقاف) اور یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ احقاف میں آئے گا۔ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: حضور نبی رحمت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 170　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 44

محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے انسانوں اور جنوں تمام کی طرف رسول بھیجے جاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أعطيتُ خمسًالم يُعطهنّ نبيٌّ قبلي كان كلّ نبيّ يُبعث إلى قومه خاصّة و بعثتُ إلى كلّ أحمرو أسودَ، الحديث(1) مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا رہا اور مجھے ہر سرخ وسیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: كانتِ الرّسلُ تُبعَثُ إلى الإنس وأنّ محمداً ﷺ بُعِثَ إلى الجنّ والإنسِ(2) (پہلے انبیاء ورسل علیہم السلام انسانوں کی طرف مبعوث کیے جاتے رہے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جن وانس کی طرف (نبی بنا کر) بھیجے گئے)

اسے ابوالليث سمرقندی نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنوں میں سے ایک قوم نے انبیاء علیہم السلام کا کلام سنا پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر گئے اور انہیں اس کے بارے آگاہ کیا، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ تو انہیں کو رسل اللہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ انہیں رسول بنائے جانے پر نص موجود نہیں۔

اور قرآن کریم میں ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ (الرحمٰن) ای من احدھما (یعنی ان میں سے ایک سے نکلتے ہیں) اور بلاشبہ وہ ملح (نمکین) سے نکلتے ہیں نہ کہ عذب (میٹھے) سے، پس اسی طرح انسانوں میں سے رسول ہیں نہ کہ جنوں میں سے، پس منکم کا معنی ہے من أحدکم (تم میں سے ایک سے)

اور یہ جائز ہے، کیونکہ دونوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ کے محل میں رسل کو تمام میں سے قرار دیا ہے، کیونکہ قیامت کا عرصہ جن وانس دونوں کو شامل ہوگا اور ان پر حساب ہوگا نہ کہ اور مخلوق پر، تو جب اس عرصہ میں ثواب وعقاب کے اعتبار سے ایک حساب میں ہو گئے تو اس دن انہیں ایک خطاب کے ساتھ خطاب کیا جائے گا، گویا کہ وہ ایک جماعت ہیں، کیونکہ ان کی خلقت کی ابتداء عبودیت کے لیے ہے اور ثواب وعقاب عبودیت (بندگی) پر ہوگا، اور اس لیے بھی کہ جنوں کی اصل آگ کے شعلوں سے ہے اور ہماری اصل مٹی سے ہے اور ان کی تخلیق کا انداز ہماری خلقت کے سوا ہے، پس ان میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر۔ اور ہمارا دشمن ابلیس ان کا بھی دشمن ہے۔ وہ ان کے مومنوں سے عداوت رکھتا ہے اور ان کے کافروں سے دوستی رکھتا ہے۔ اور ان میں خواہش پرست بھی ہیں، مثلاً شیعہ، قدریہ اور مرجئہ جو ہماری کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجن میں ان کے بارے بیان کیا ہے فرمان خداوندی ہے: وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ (الجن: 14) (اور بے شک ہم سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم)

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ (الجن) (اور ہم میں سے بعض نیک بھی ہیں اور بعض اور طرح کے ہم بھی تو کئی راستوں پر گامزن ہیں) اس کا بیان وہاں آئے گا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199

2۔ زادالمسیر لابن الجوزی، جلد 3، صفحہ 125

یَقُصُّوْنَ یہ محل رفع میں ہے اور رسل کی صفت ہے۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا یعنی ہم ان کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے پیغام پہنچایا۔ وَ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو خطاب ہے، یعنی وہ ہیں جنہیں دنیوی زندگی نے دھوکہ دیا ہے یعنی اس نے انہیں دھوکہ دیا اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ہمیشہ رہے گی اور انہیں یہ خوف ہوا کہ اگر وہ ایمان لائے تو وہ ان سے ختم ہو جائے گی (چھن جائے گی)۔ وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی انہوں نے اپنے کفر کا اعتراف کر لیا۔ حضرت مقاتل(1) نے کہا ہے: یہ اس وقت ہوگا جب اعضاء بدن ان کے خلاف شرک کی گواہی دیں گے۔ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور ان کرتوتوں کے بارے جو وہ کرتے تھے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝

''یہ اس لیے کہ نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو ظلم سے اس حال میں کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ یہ سیبویہ کے نزدیک محل رفع میں ہے: یعنی الامرُ ذالك اور ان مخففہ من الثقیلہ ہے۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ یہ کیا کیونکہ میں بستیوں کو ان کے ظلم کے سبب ہلاک کرنے والا نہیں ہوں، یعنی ان کے شرک کے سبب اس سے پہلے کہ ان کی طرف رسل علیہم السلام بھیجے جائیں کہ وہ یہ کہیں: ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا آیا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ڈرانے والا آیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں نہیں ہوں کہ بستی کے رہنے والوں میں سے کسی ایک کے شرک کرنے کے سبب پوری بستی کو ہلاک کر دوں، تو یہ اس ارشاد کی مثل ہے وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام:164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ)

اور اگر وہ رسل علیہم السلام کی بعثت سے پہلے انہیں ہلاک کر دے تو اس کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ:118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ذٰلِكَ محل نصب میں ہو اور معنی یہ ہو: فَعَلَ ذَالِكَ بِهِمْ (اس نے یہ ان کے ساتھ کیا) کیونکہ وہ بستیوں کو ظلم کے سبب ہلاک نہیں کرتا۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝

''اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے مطابق، اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا یعنی جن و انس میں سے ہر ایک کے لیے درجے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 94

كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ (الاحقاف) (یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے)

پھر فرمایا: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (الاحقاف) (اور ہر ایک کے لیے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ جنوں میں سے مطیع و فرمانبردار جنت میں ہوں گے اور گنہگار جہنم میں ہوں گے۔ اسی طرح انسان بھی ہیں اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہی زیادہ صحیح ہے پس اسے جان لو۔

اور وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ کا معنی یہ ہے کہ طاعت اور نیکی کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے ثواب و جزا میں درجے ہیں۔ اور معصیت و گناہ کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے عقاب اور سزا میں درجے ہیں۔

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ یعنی نہ وہ غافل ہے اور نہ وہ بھولنے والا ہے۔ اور غفلت کا معنی یہ ہے أن یذھبَ الشئ عنك لاشتِغَالِكَ بغیرہ کہ کسی غیر میں پڑے مشغول ہونے کی وجہ سے کوئی شی تجھ سے چلی جائے (ضائع ہو جائے) عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ابن عامر نے اسے تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یا کے ساتھ۔

وَ رَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۝۱۳۳

''اور آپ کا پروردگار غنی ہے رحمت والا ہے اگر چاہے تو لے جائے (تباہ کر دے) تمہیں اور تمہاری جگہ لے آئے تمہارے بعد جسے چاہے جیسے پیدا کیا تمہیں دوسری قوم کی اولاد سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَبُّكَ الْغَنِیُّ یعنی آپ کا پروردگار اپنی مخلوق سے اور ان کے اعمال سے غنی ہے (اسے ان کی کوئی حاجت اور پرواہ نہیں ہے) ذُو الرَّحْمَةِ وہ اپنے دوستوں اور اہل طاعت کے ساتھ رحمت کا سلوک کرنے والا ہے۔ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اگر وہ چاہے تو تمہیں موت دے کر اور عذاب کے ساتھ تباہ کر کے ختم کر دے۔

وَ یَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ یعنی وہ تمہاری جگہ ایک دوسری مخلوق لے آئے جو تم سے زیادہ فضیلت والی اور زیادہ اطاعت شعار ہو۔ كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے، یعنی یَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ استخلافا مثل ما انشاکم (تمہارے بعد تمہاری جگہ لے آئے جسے لانا چاہے اسی کی مثل جیسے اس نے تمہیں پیدا کیا دوسری قوم کی اولاد سے) اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہیں: اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ (النساء: 133) (اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو)

اور وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (محمد: 38) (اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گا) پس معنی یہ ہے کہ تمہاری جگہ دوسروں کو بدل دے، جیسا کہ تو کہتا ہے: أعطیتك من دینارِكَ ثوبًا (میں نے تجھے تیرے دینار کے بدلے کپڑا دیا)

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾

''بے شک جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور آنے والا ہے اور نہیں ہو تم (اللہ کو) عاجز کرنے والے''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ أوعدت فی الشہاء سے ہو (تجھے شر کے بارے میں وعید سنائی گئی) اور اس کا مصدر الإیعاد ہو اور مراد آخرت کا عذاب ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وعدت سے ہو یعنی وہ ساعت جس کے آنے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کے آنے میں خیر اور شر دونوں ہیں پس خیر کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس کا یہ معنی حسن سے مروی ہے۔ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ کہا جاتا ہے: أعجزنی فلانٌ (فلاں نے مجھے عاجز کر دیا ہے) یعنی فاتنی وغلبنی (فلاں میری طرف آگے بڑھا اور مجھ پر غالب آ گیا)

قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿١٣٥﴾

''آپ فرمایئے: اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرنے والا ہوں، تو تم جان لو گے کہ کس لیے ہوتا ہے اچھا انجام اس دنیا کے گھر کا بے شک فلاح نہیں پاتے ظلم کرنے والے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ابو بکر نے جمع کے ساتھ مکاناتکم پڑھا ہے۔ اور مکانۃ کا معنی طریقہ ہے اور آیت کا معنی یہ ہے: تم اس طریقہ پر ثابت (قائم) رہو جس پر تم ہو اور میں اس پر ثابت ہوں جس پر میں ہوں۔ اور اگر کہا جائے: کیسے یہ جائز ہے کہ انہیں اس پر ثابت رہنے کا حکم دیا جائے جس پر وہ ہیں، حالانکہ وہ کفار ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا (التوبہ: 82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ) اور اس پر دلیل فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ہے، یعنی اچھا انجام وہ ہے جس پر اس کے صاحب کی تعریف کی جاتی ہے، یعنی جس کے لیے دار الاسلام میں مدد و نصرت ہو اور جس کے لیے زمین کی وراثت ہو اور جس کے لیے دار آخرت یعنی جنت ہو۔

زجاج (1) نے کہا ہے: مَكَانَتِكُمْ کا مفہوم ہے دنیا میں تمہارا مضبوط اور جے ہوئے قدموں والا ہونا۔ (تمکنکم فی الدنیا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت نخعی نے کہا ہے اس کا معنی ہے: علی ناحیتکم (اپنی جہت پر) اور قتبی نے کہا ہے: علی موضعکم (اپنی جگہ پر) إِنِّي عَامِلٌ میں کام کرنے والا ہوں اپنی جگہ پر علی مکانتی پھر دلالت حال کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ اور من، مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ میں محل نصب میں ہے اور یہ بمعنی الذی ہے، کیونکہ علم کا واقع ہونا اسی پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، کیونکہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا پس فعل معلق ہو جائے گا، یعنی تعلمون أیُّنا تکون لہ عاقبۃ الدار (تم جانتے ہو ہم میں سے کون ہے جس کے لیے دنیا کے گھر کا انجام اچھا ہو گا) یہ اس قول کی طرح ہے: لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ (الکہف: 12) (تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 173

سکتا ہے) حمزہ اور کسائی نے مَن یکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝

''اور انہوں نے بنا رکھا ہے الله کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ اور کہتے ہیں یہ الله تعالیٰ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے۔ تو وہ (حصہ) جو ہو ان کے شریکوں کے لیے تو وہ نہیں پہنچتا الله تعالیٰ کو اور جو (حصہ) ہو الله تعالیٰ کے لیے تو وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا اس میں ایک مسئلہ ہے:

اور کہا جاتا ہے: ذَرَأَ یَذْرَأُ ذَرْأً، ای خَلَقَ (اس نے پیدا کیا) اور کلام میں حذف اور اختصار ہے اور وہ یہ ہے وجعلوا لأصنامھم نصیبا (اور انہوں نے اپنے بتوں کے لیے حصہ مقرر کیا) اور اس پر دلیل مابعد کلام ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جسے شیطان نے ان کے لیے آراستہ کیا اور انہیں گمراہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مال کا ایک مقررہ حصہ اپنے گمان کے مطابق الله تعالیٰ کی طرف پھیر دیا اور ایک حصہ اپنے بتوں کی طرف۔ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے اور معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ وہ ایک جز الله کے لیے اور ایک جز اپنے شرکاء کے لیے مقرر کر دیتے اور جب ان کے شریکوں کا حصہ ان پر خرچ کرنے کی وجہ سے اور انہیں غلاف وغیرہ پہنانے کی وجہ سے ختم ہو جاتا تو وہ اس کا عوض ادا کرنے کے لیے اس حصے سے لے لیتے جو الله تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا اور جب وہ حصہ جو الله تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا وہ مہمانوں اور مساکین پر خرچ کرنے کے سبب ختم ہو جاتا تو وہ اس سے بطور عوض اور بدلہ کوئی شے نہ لیتے اور کہتے: الله تعالیٰ اس سے مستغنی ہے اور ہمارے شریک فقراء اور محتاج ہیں۔ اور یہ ان کی جہالت اور ان کے کذب میں سے تھا۔ اور زعم کا معنی کذب ہے۔

قاضی شریح نے کہا ہے: بلاشبہ ہر شے کے لیے کنیت ہے اور جھوٹ کی کنیت زعموا ہے اور وہ ان چیزوں میں جھوٹ بولتے تھے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی شرعی حکم نازل نہیں ہوا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو عرب کی جہالت کو جاننا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ سورۃ الانعام کی ایک سو تیس سے اوپر والی آیات پڑھے اس قول تک قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: 140)

ابن عربی (2) نے کہا ہے: یہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے صحیح کلام ہے، کیونکہ انہوں نے معرفت اور عدل کے بغیر اپنی عاجز عقلوں کے ساتھ حلال و حرام کی تقسیم میں بیوقوفانہ تصرف کیا، اور جہالت کے سبب انہوں نے جو تصرف کیا اس میں بتوں کو الله

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 500 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 252

بنانا سب سے بڑی جہالت اور سب سے بڑا جرم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر زیادتی کرنا مخلوق پر زیادتی کرنے کی نسبت بہت بڑا جرم ہے۔ اور اس بارے میں دلیل کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے، اپنی صفات میں یکتا ہے اور اپنی مخلوقات میں واحد ہے اس دلیل سے زیادہ بین اور واضح ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (1) سے کہا: بلاشبہ تمہاری عقلیں کامل تھیں اور تم وافر ذہانت اور دانائی رکھتے تھے، پھر تم پتھروں کی پوجا کرتے رہے تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ عقلیں ہیں قریب ہے کہ انہیں کوئی پیدا کرنے والا ہو۔ پس عربوں کی عقلی کمزوری اور ان کی جہالت میں سے یہ وہ امر ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی اور اسلام نے آ کر اسے مٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اسے باطل کر دیا۔ پس ہمارے لیے ظاہر یہ ہے کہ ہم اسے مار دیں یہاں تک کہ وہ ظاہر نہ ہو، اور ہم اسے بھول جائیں یہاں تک کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے، مگر ہمارے رب کریم نے تو اس کا ذکر اپنی نص کے ساتھ کیا ہے اور اسے اپنی شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جس طرح کہ اس نے اپنے ساتھ کفر کرنے والوں کے کفر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس میں حکمت ہے۔ واللہ اعلم

اس کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا ہے، اور اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے کہ کفر اور باہم میل جول (آمیزش) دونوں قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ اور یحییٰ بن وثاب، سلمی، اعمش اور کسائی نے بزعمھم زا کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ، ای إلی المساکین یعنی وہ حصہ جو ان کے شریکوں کے لیے ہے وہ مساکین تک نہیں پہنچ سکتا۔ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ یعنی ان کا فیصلہ کتنا برا فیصلہ ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: جب وہ ایسے جانور کو ذبح کرتے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہوتا تو وہ اس پر بتوں کا نام لیتے، اور جب اسے ذبح کرتے جو ان کے بتوں کے لیے مختص ہوتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتے، تو ارشاد: فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ کا یہی معنی ہے، پس ان کا ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنا مذموم تھا اور یہ ان جانوروں میں داخل ہے جنہیں اس بنا پر کھانے سے منع کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳۷

''اور یونہی خوشنما بنا دیا ہے بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو ان کے شریکوں نے تا کہ ہلاک کر دیں انہیں اور مشتبہ کر دیں ان پر ان کا دین اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ایسا نہ کرتے، تو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 255

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اس کا معنی ہے جس طرح انہوں نے ان کے لیے اسے خوشنما بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک حصہ مقرر کردیں اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لیے مقرر کردیں اسی طرح ان کے شریکوں نے بہت سے مشرکین کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو خوشنما بنا دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے لیے فقر و فاقہ کے خوف سے بیٹیوں کے قتل کو خوشنما بنا دیا گیا۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے: یہاں ان کے شریکوں سے مراد وہ ہیں جو بتوں کی خدمت میں رہا کرتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے (2) کہ مراد لوگوں میں گمراہ اور خواہش پرست لوگ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد شیاطین ہیں۔

اور اس سے اشارہ الوأد کی طرف ہے اور وہ فقر و فاقہ کے خوف سے اور اس مدد و نصرت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس سے انہیں محروم رکھا گیا بیٹی کو زندہ درگور کرنا ہے۔ اور شیاطین کو شرکاء کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ان کی اطاعت و پیروی کی ہے تو انہوں نے انہیں طاقت و فرمانبرداری کے وجوب میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا تھا کہ اگر اس کے اتنے بچے پیدا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک قربانی دے گا، جیسا کہ حضرت عبدالمطلب (3) نے ایسا کیا جب انہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو ذبح کرنے کی نذر مانی۔ پھر کہا گیا ہے: آیت میں چار قراءتیں ہیں، ان میں سے اصح جمہور کی قراءت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اور یہ اہل حرمین، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ شُرَكَآؤُهُمْ، زَيَّنَ کی وجہ سے مرفوع ہے، کیونکہ انہوں نے خوشنما بنایا اور انہوں نے قتل نہ کیا اور قَتْلَ، زَيَّنَ کے سبب منصوب ہے۔ اور اَوْلَادِهِمْ مفعول کی طرف مضاف ہے (☆)۔

اور مصدر میں اصل یہ ہے کہ اسے فاعل کی طرف مضاف کیا جائے، کیونکہ اسی نے اسے بنایا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے مستغنی نہیں اور وہ مفعول سے مستغنی ہوتا ہے۔ اور وہ یہاں لفظاً مفعول کی طرف مضاف ہے لیکن معناً فاعل کی طرف مضاف ہے، کیونکہ تقدیر کلام ہے: زین لکثیر من المشرکین قتلهم اولادهم شرکاءهم (بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکاء نے یہ خوشنما بنا دیا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ پھر مضاف کو حذف کردیا گیا اور وہ فاعل ہے جس طرح اس قول باری تعالیٰ سے حذف کیا گیا ہے۔ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ (فصلت: 49) یعنی یہ من دعائہ الخیر ہے۔ اس میں ہا ضمیر دعا کا فاعل ہے، یعنی انسان خیر اور بھلائی کی دعا مانگنے سے نہیں اکتاتا۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ مکی نے کہا ہے: یہ قراءت ہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اس میں اعراب صحیح ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر جمہور کا عمل ہے۔

اور دوسری قراءت زُيِّنَ فعل مجہول کے ساتھ ہے۔ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلُ یہ رفع کے ساتھ ہے۔ اَوْلَادِهِمْ جر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 754

☆ متن میں عبارت اسی طرح ہے جب کہ مراد یہ ہے لفظ قتل اپنے مفعول ''اولادھم'' کی طرف مضاف ہے۔

کے ساتھ ہے۔ اور شُرَكَآؤُهُمْ رفع کے ساتھ ہے۔ یہ حسن کی قرأت ہے اور ابن عامر اور اہل شام نے زُین زا مضموم کے ساتھ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلُ اَوْلَادِهِمْ، قَتْلُ کو رفع کے ساتھ اور اَوْلَادَهُمْ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ شُرَكَآئِهِمْ اس میں مجرور ہے جو ابو عبید نے بیان کیا ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور نے اہل شام سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلُ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (یعنی اس میں زا مضموم، قتل مضموم اور اولادھم اور شرکائھم دونوں مکسور ہیں) پس دوسری قراءت (یعنی) حسن کی قراءت جائز ہے اس میں قتل نائب الفاعل ہوگا، اور شرکاؤھم اس فعل مضمر کے سبب مرفوع ہوگا جس پر زیّن دلالت کرتا ہے یعنی زینہ شرکاؤھم اور اسی وجہ سے ضرب زید عمرو پڑھنا جائز ہوتا ہے، بمعنی ضربہ عمرو اور سیبویہ نے بیان کیا ہے۔

لِيُبْكَ يَزِيْدُ ضَارِعٌ لِخُصُومَةٍ یعنی یبکیہ ضارع (1)

ابن عامر اور عامر نے ابوبکر کی روایت سے اس طرح قراءت کی ہے: يُسَبَّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ (النور) تقدیر کلام ہے یسبحہ رجال اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے پڑھا ہے: قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ﴿۵﴾ (البروج) بمعنی قتلھم النار۔ نحاس نے کہا ہے: اور وہ جو ابو عبید نے ابن عامر اور اہل شام سے بیان کیا ہے وہ نہ کلام میں جائز ہے اور نہ ہی شعر میں، البتہ نحویوں نے ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے ساتھ تفریق کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح فاصلہ نہیں ہوتا، اور رہے ظروف کے علاوہ دوسرے اسماء تو ان کے ساتھ فرق کرنا غلطی ہے۔ مکی نے کہا ہے: اس قراءت میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق کی وجہ سے ضعف اور کمزوری ہے، کیونکہ شعر میں اس قسم کی تفریق ظرفوں کے ساتھ جائز ہوتی ہے کیونکہ ان میں اتنی وسعت پائی جاتی ہے اور وہ مفعول بہ میں شعر میں بھی بعید ہے۔ لہٰذا قراءت میں اس کو جائز قرار دینا اس سے بھی بعید تیر ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: ابن عامر کی یہ قراءت مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق ہونے کی بنا پر ہے، اور اس کی مثل شاعر کا قول ہے:

فزججتُها　　بِمزجة　　زَجَّ القَلوصَ أبي مَزادة (2)

اس میں مراد زج أبی مزادۃ القَلوصَ ہے۔

اور دوسرا شعر ہے:

تَمُرّ على ما تستمر و قد شفت　　غلائلَ عبدُ القيس منها صُدُورِها

اس میں مراد شفت عبدُ القیس غلائل صدورھا ہے۔

(پہلے شعر میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان مفعول بہ کا اور دوسرے میں فاعل کا فاصلہ ہے)

ابو غانم احمد بن حمدان نحوی نے کہا ہے: ابن عامر کی قراءت عربی لغت میں جائز نہیں ہے اور یہ ایک عالم کی پھسلاہٹ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 349　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 350

ہے، اور جب ایک عالم (راہ راست سے) پھسل جائے تو اس کی اتباع اور پیروی جائز نہیں ہوتی، اور اس کے قول کو اجماع کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور اسی طرح واجب ہوتا ہے کہ اسے بھی اجماع کی طرف لوٹا دیا جائے جو ان میں پھسل جائے یا بھول جائے اور یہ غیر صحیح پر اصرار کرنے سے اولیٰ اور بہتر ہوتا ہے، البتہ انہوں نے شاعر کو ضرورت۔ کے تحت اجازت دی ہے کہ وہ ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کرے کیونکہ یہ فاصلہ شمار نہیں ہوتا۔ جیسے کسی نے کہا:

کماخُطّ الکتاب بکفِ یوما یھودِیّ یُقارِبُ أو یُزیلُ(1)

اور دوسرے نے کہا:

کأن أصواتَ مِن إیغالِھن بنا أواخِرِ المَیْسِ أصواتُ الفَرارِیج

اور ایک اور شاعر نے کہا:

لَمّا رأت سَاتِیدَما استعبَرَتْ لِلّٰہِ دَرُّ الیومَ مَنْ لَامَھا

(مذکورہ تینوں اشعار میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے)

اور علامہ قشیری نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے یہ قبیح ہے اور یہ محال ہے، کیونکہ جب ایک قراءت تواتر کے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ فصیح ہوتی ہے نہ کہ قبیح۔ اور کلام عرب میں یہ موجود ہے اور مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں شرکائھم یاء کے ساتھ موجود ہے (2) اور یہ ابن عامر کی قراءت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قراءت میں قتل کی اضافت شرکاء کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ شرکاء وہی ہیں جنہوں نے اسے خوشنما بنایا اور اس کی دعوت دی، پس فعل اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے اور اصل میں یہی واجب ہوتا ہے لیکن انہوں نے مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کر دیا ہے اور مفعول کو مقدم کیا ہے اور اسے اپنے حال پر منصوب چھوڑ دیا ہے، جب کہ معنی میں وہ متاخر ہے، اور مضاف الیہ کو موخر کیا ہے اور اسے اپنے حال پر مجرور چھوڑ دیا ہے، جب کہ وہ متقدم اور قتل کے بعد تھا اور تقدیر عبارت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ یعنی ان قتل شرکاؤھم اولادھم (یعنی ان کے شریکوں نے ان کی اولاد کو قتل کیا)

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ ابو عبید کے سوا نے بیان کیا ہے وہ چوتھی قراءت ہے اور وہ جائز ہے اس بنا پر کہ ان کے شرکاء ان کی اولاد کا بدل ہو گئے، کیونکہ وہ نسب اور میراث میں ان کے شریک تھے۔ لِيُرْدُوْهُمْ اس میں لام کی ہے اور ارداء کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ اور وہ ان پر مشتبہ کریں ان کا وہ دین جو ان کے لیے پسندیدہ ہے، یعنی وہ انہیں باطل کا حکم دیتے ہیں اور انہیں اپنے دین کے بارے میں شک میں ڈالتے ہیں۔

اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اور اس میں اولاد کا قتل نہیں تھا، پس حق پر پردہ ڈال دیا جائے گا تو اس کے سبب وہ شک اور التباس میں واقع ہو جائیں گے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے۔ اور یہ قدریہ کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 350 2۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 357۔ تفسیر الرازی، جلد 13، صفحہ 206

رد ہے۔ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ اس افترا اور بہتان سے مراد ان کا یہ قول ہے اِنَّ لِلّٰهِ شُرَكَاءَ (کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں)

وَ قَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور بولے یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کوئی نہیں کھا سکتا انہیں سوائے اس کے جسے ہم چاہیں (یہ بات) اپنے گمان سے (کہتے ہیں) اور بعض مویشی ہیں حرام ہیں جن کی پشتیں (سواری کے لیے) اور بعض مویشی ہیں کہ نہیں ذکر کرتے نام خدا ان (کی ذبح) پر (یہ سب محض) افترا ہے اللہ پر عنقریب سزا دے گا انہیں جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت کی ایک دوسری قسم بیان کی ہے۔ ابان بن عثمان نے حُجُرٌ حا اور جیم کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور حسن اور قتادہ نے حا کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ حَجْرٌ پڑھا ہے۔ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور حسن سے حا کے ضمہ کے ساتھ حُجْرٌ بھی منقول ہے۔

ابو عبید نے ہارون سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سارے قرآن کریم میں حِجْرٌ کے لفظ کو حسن حا کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں سوائے اس قول کے: بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ (الفرقان) اس مقام پر وہ کسرہ پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے وَحَرْثٌ حِرْجٌ اس میں راجیم سے پہلے ہے۔ اسی طرح مصحف ابی میں ہے اور اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ جبذ اور جذب کی مثل ہے۔ اور دوسرا قول، اور وہی اصح ہے۔ کہ یہ الحرج سے ہے، کیونکہ حرج (بکسر حاء) لغت حرج (بفتح الحاء) ہی ہے اور اس کا معنی تنگی اور گناہ ہے۔ پس اس کا معنی ہوگا حرام۔ اور اسی سے ہے فلاں یتحرج یعنی فلاں ایسے کام میں داخل ہونے سے اپنے اوپر تنگی محسوس کرتا ہے جو حرام میں سے اس پر مشتبہ ہو۔

اور الحجر لفظ مشترک ہے اور یہاں اس کا معنی حرام ہے، اور اس کا اصل معنی روکنا ہے اور عقل کو حجر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ فلان فی حجر القاضی یعنی وہ قاضی کی حفاظت (نگہداشت) میں ہے۔ حجرت علی الصبی حجرا میں نے بچے پر پابندی عائد کر دی) اور الحجر کا معنی عقل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ (الفجر) (یقیناً اس میں قسم ہے عقل مند کے لیے) حجر کا معنی مونث گھوڑا بھی ہے اور حجر کا معنی قرابت بھی ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

يُرِيدُونَ أن يُقْصُوهُ عَنِّي وَإنَّهُ لَذُو حَسَبٍ دَانٍ إلَيَّ وَذُو حِجْرٍ

اور حجر الإنسان و حجرۃ (آدمی کے قرابت دار) اس میں دونوں لغتیں ہیں اور فتحہ اکثر ہے، یعنی انہوں نے جانور اور کھیتی حرام قرار دی اور اسے بتوں کے لیے خاص کر دیا اور انہوں نے کہا: لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ اور ان سے مراد بتوں کے خدام ہیں، پھر بیان فرمایا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کے بارے شریعت نے کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ اسی لیے فرمایا: بِزَعْمِهِمْ۔

وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا ان سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں وہ اپنے الہوں کے لیے روک کر رکھتے تھے جیسا کہ حصہ والی بات پہلے گزر چکی ہے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان سے مراد بحیرہ، وصیلہ، اور حام ہیں۔ وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا یعنی وہ جانور جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے۔ اور ابو وائل (1) نے کہا ہے: ان پر وہ حج نہیں کرتے تھے۔

افْتِرَآءً یعنی (اللہ تعالیٰ پر) افترا اور بہتان لگانے کے لیے علی اللہ کیونکہ وہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اور یہ (افتراء) مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی یفترون افتراء، تو اس صورت مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔

وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۳۹﴾

''اور بولے جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ نرا ہمارے مردوں کے لیے ہے اور حرام ہے ہماری بیویوں پر اور اگر وہ مرا ہوا (پیدا) ہو تو پھر وہ سب (مرد و زن) اس میں حصہ دار ہیں۔ اللہ جلدی بدلہ دے گا انہیں ان کے اس بیان کا بے شک وہ حکمت والا علم والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا یہ ان کی جہالت کی ایک اور نوع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ دودھ ہے۔ اسے انہوں نے مردوں کے لیے حلال قرار دیا اور عورتوں پر حرام قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ان کے پیٹوں میں موجود بچے ہیں۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ ہم مردوں کے لیے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی مر گیا تو اسے مرد اور عورتیں سبھی کھا سکیں گے۔ اور خَالِصَةٌ میں ھا خلوص میں اظہار مبالغہ کے لیے (یعنی وہ خالصۃ مردوں کے لیے ہیں)۔ اور اسی کی مثل رجل علامۃ و نسابۃ ہے (2) (یعنی ان کے آخر میں تا مبالغہ کے لیے ہے) یہ کسائی اور اخفش سے مروی ہے۔ اور خَالِصَةٌ مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور وہ ما ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اس خَالِصَةٌ کی تانیث الانعام کے مونث ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور ایک قوم کے نزدیک یہ قول غلط ہے، کیونکہ جو کچھ ان کے شکموں میں ہے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ اور یہ اس قول سے مشابہت نہیں رکھتا: یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ (یوسف:10) کیونکہ اس میں سیارہ کا بعض بھی سیارہ ہی ہے اور یہ لازم نہیں آتا۔

فراء نے کہا ہے: چونکہ جو جانوروں کے شکموں میں ہیں وہ بھی انہیں کی مثل جانور ہیں، لہٰذا ان جانوروں (لفظ الانعام) کے مونث ہونے کی وجہ سے انہیں بھی مونث قرار دیا گیا ہے، یعنی الأنعام التی فی بطون الأنعام خالصۃ لذکورنا (وہ چوپائے جو ان چوپاؤں کے شکموں میں ہیں نرے ہمارے مردوں کے لیے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ جماعت جو شکموں میں ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: بلاشبہ ما سے مراد دودھ اور جنین دونوں ہو سکتے ہیں، لہٰذا تانیث معنی کے اعتبار سے اور تذکیر (مذکر لانا) لفظ کی بنا پر ہے۔ اور اسی لیے کہا ہے: مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا یعنی لفظ کی بنا پر اسے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اگر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174

2۔ ایضاً

معنی کی رعایت کرتے تو کہتے و محرمۃ اور اعمش کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے اور وہ خالص بغیر ہا کے ہے۔ کسائی نے کہا ہے: خالص اور خالصۃ دونوں کا معنی ایک ہے، مگر ہا مبالغہ کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رجل داھیۃ و علامۃ جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے خَالِصَةٌ منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اس ظرف کی ضمیر سے حال ہے جو مَا کا صلہ ہے اور مبتدا کی خبر محذوف ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: الذی فی الدار قائما زید یہ بصریوں کا مذہب ہے اور فراء کے نزدیک بالیقین منصوب ہے۔ اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر کی قراءت میں خالصا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خالصہ علی الاضافت پڑھا ہے پس یہ مبتدا ثانی ہوگا اور خبر لذکورنا ہوگی اور پھر جملہ ما کی خبر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خالصہ، ما سے بدل ہو۔ پس اس میں یہ پانچ قرائتیں ہیں۔

وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا یعنی ہماری بیٹیوں پر وہ حرام ہیں۔ یہ ابن زید سے منقول ہے اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے: مراد ان کی عورتیں ہیں۔ وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، یعنی اور اگر وہ مردہ ہوا جوان چوپاؤں کے شکموں میں ہے۔

فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ تو مرد اور عورتیں بھی اس میں شریک ہوں گے اور فرمایا فیہ اس لیے کہ میتۃ سے مراد حیوان ہے اور یا کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے، (اسی وجہ سے) فیھا نہیں کہا۔ میتۃ رفع کے ساتھ بمعنی تقع یا تحدث ہے (اگر مردہ پیدا ہوگا) میتۃ نصب کے ساتھ ہو (عبارت ہوگی) وان تکن النسمۃ میتۃ (اور اگر پیدا ہونے والا جانور مردہ ہوا)

سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جلدی ہی ان کے کذب اور بہتان کا بدلہ دے گا، یعنی انہیں اس پر عذاب دے گا۔ اور وَصْفَهُمْ حرف جار محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ای بوصفھم اور آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عالم کے لیے چاہیے کہ وہ اپنے مخالف کے قول کو پڑھے اور سمجھے اگرچہ اس پر عمل نہ کرے تاکہ وہ اس کے قول کے فاسد ہونے کو جان لے اور یہ جان لے کہ اس پر کیسے رد کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ان کے اقوال کا علم دیا اہل زمانہ میں سے جنہوں نے ان کی مخالفت کی، تاکہ وہ ان کے قول کے فساد کو جان لیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۴۰﴾

”یقیناً نقصان اٹھایا جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر جانے اور حرام کر دیا جو رزق دیا تھا انہیں اللہ نے بہتان باندھ کر اللہ تعالیٰ پر بے شک وہ گمراہ ہو گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے“۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور اپنی عقلوں کے ساتھ بحیرہ وغیرہ کو حرام قرار دینے کے سبب ان کے نقصان اور خسارہ اٹھانے کی خبر دی ہے، پس انہوں نے اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے حماقت سے قتل کیا۔ اور اپنے مالوں میں اپنے اوپر پابندیاں لگائیں اور وہ فقر و افلاس سے نہ ڈرے، تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے

تناقض اور تضاد کو ظاہر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بے شک عربوں میں سے کچھ تھے جو اپنی اولاد کو فقر و افلاس کے ڈر سے قتل کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر اسے بیان کیا ہے اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جو محض حماقت سے بغیر کسی حجت اور دلیل کے انہیں قتل کر دیتے تھے۔ اور وہ ربیعہ اور مضر کے قبائل تھے، یہ حمیت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اور ان میں سے بعض کہتے تھے: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور انہوں نے اپنی بیٹیوں کو اللہ کی بیٹیوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہمیشہ غمزدہ رہا کرتا تھا، تو (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تجھے کیا ہے تو مغموم رہتا ہے"؟ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنے عہد جاہلیت میں ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اللہ تعالیٰ میرے لیے اسے معاف نہیں فرمائے گا اگرچہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "مجھے اپنے گناہ کے بارے بتاؤ"۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے، پس میرے ہاں بچی پیدا ہوئی تو میری بیوی نے مجھ سے سفارش کی کہ میں اسے چھوڑ دوں چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی اور احکام سمجھنے کی عمر کو پہنچ گئی (یعنی بالغ ہو گئی) اور حسین وجمیل عورتوں میں سے ہو گئی اور لوگ اس کے لیے پیغام نکاح دینے لگے، تو میرے اندر حمیت داخل ہو گئی اور میرا دل برداشت نہ کر سکا کہ میں اس کی شادی کروں یا اسے گھر میں بغیر شادی کے چھوڑ دوں، تو میں نے بیوی کو کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنے رشتہ داروں کی ملاقات کے لیے فلاں فلاں قبیلہ میں جاؤں پس تو اسے میرے ساتھ بھیج دے، وہ اس پر بہت خوش ہوئی اور اس نے اسے کپڑوں اور زیور کے ساتھ خوب آراستہ کیا (یعنی اس کا بناؤ سنگھار کیا) اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس سے خیانت نہ کروں گا، چنانچہ میں اسے ایک کنوئیں کے کنارے لے گیا اور میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو بچی سمجھ گئی کہ میں اسے کنوئیں میں پھینکنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تو وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور رونے لگی: اے ابا جان! کیوں تم میرے ساتھ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تو مجھے اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں نے کنوئیں میں دیکھا اور مجھ میں حمیت بھڑک اٹھی پھر وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور کہنے لگی: اے ابا! میری ای کی امانت ضائع نہ کر۔ تو میں ایک بار کنوئیں میں دیکھتا اور ایک بار اس کی طرف اور میں اس پر رحم کرتا رہا، یہاں تک کہ شیطان مجھ پر غالب آ گیا اور میں نے اسے پکڑا اور اسے اوندھا کر کے کنوئیں میں پھینک دیا، اور وہ کنویں میں بھی پکارتی رہی۔ اے ابا! تو نے مجھے قتل کیا ہے، اور میں وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز ختم ہو گئی تو میں واپس آ گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی رونے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو أُمِرتُ أن أعاقب أحد أبما فعل فی الجاهلية لَعَاقَبتُكَ (اگر مجھے حکم دیا جاتا کہ میں کسی کو اس فعل پر سزا دوں جو اس نے عہد جاہلیت میں کیا تو میں تجھے ضرور سزا دیتا)(1)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 1، صفحہ 517

وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۡ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کیے باغات کچھ چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور کچھ بغیر اس کے اور کھجور اور کھیتی الگ الگ ہیں کھانے کی چیزیں ان کی اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک جیسے اور (ذائقہ میں) مختلف، کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل دار ہو اور ادا کرو اس کا حق جس دن وہ کٹے۔ اور فضول خرچی نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو''۔

اس میں تیئس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَنْشَاَ یعنی اس نے پیدا کیا۔ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ ایسے باغات کو جو زمین پر بچھے اور چھپروں پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ اور ایسے جو چھپروں پر نہیں چڑھائے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو زمین پر پھیل جائیں ان میں سے جو بچھ جاتے ہیں مثلاً انگور کی بیلیں، کھیتیاں اور تربوز کی بیل وغیرہ۔ اور غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو اپنے تنے پر کھڑے ہوں مثلاً کھجور کے درخت اور دیگر تمام درخت۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معروشات وہ زمین جن کے درخت بلند ہو جائیں اور تعریش کا اصل معنی الرفع (بلند ہونا) ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ معروشات وہ ہیں جنہیں لوگ لگاتے ہیں اور انہیں اوپر چڑھاتے ہیں اور غیر معروشات وہ ہیں جو پھلوں سے جنگلوں اور پہاڑوں میں خود نکلتے ہیں (1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غین اور سین کے ساتھ قراءت اس پر دلالت کرتی ہے۔ مغروسات و غیر مغروسات۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ ان دونوں کا علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ یہ دونوں جنات، باغات میں داخل ہیں اس لیے کہ ان دونوں میں فضیلت ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ الآیہ (البقرہ: 98) کے تحت اس کا بیان گزر چکا ہے۔

مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ یعنی اس کا ذائقہ مختلف ہے ان میں سے کچھ جید (عمدہ) ہیں اور کچھ ردی اور گھٹیا۔ اور اس کا نام اکل رکھا کیونکہ وہ کھائے جاتے ہیں۔ اور اُكُلُهٗ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور مُخْتَلِفًا اس کی نعت اور صفت ہے۔ لیکن جب یہ اس پر مقدم ہوا اور منصوب کے قریب ہوا تو اسے نصب دی گئی، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: عندی طباخا غلام اور شاعر نے کہا ہے:

الشرُّ منتشرٌ يلقاك عن عرضٍ والصالحاتُ عليها مغلقًا بابُ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُخْتَلِفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یہ مسئلہ علم نحو کے مشکل مسائل میں سے ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: قد أنشأها ولم يختلف أكلها وهو ثمرها (تحقیق اس نے اسے پیدا کیا اور اس کے پھل مختلف نہیں) تو جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اپنے اس قول کے ساتھ: خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178

(الانعام: 102) تو جان لیجئے کہ اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس کے پھل مختلف ہیں، یعنی انہ أنشأها مقدرا فیہ الاختلافُ (اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس میں اختلاف مقدر ہے) اسے سیبویہ نے اپنے اس قول کے ساتھ بیان کیا ہے: مررتُ برجل معہ صقرٌ صائدا بہ غدا یہ حال کی بنا پر ہے۔ (یعنی میں ایک آدمی کے پاس سے گزرا اس کے ساتھ باز تھا درآنحالیکہ وہ اس سے کل شکار کرے گا) اسی طرح آپ کہتے ہیں: لتدخلُنَّ الدار آکلینَ شاربینَ، ای مقدرینَ ذالك (تم گھر میں داخل ہوتے ہو کھاتے پیتے ہوئے (یعنی حال یہ ہے کہ تم کھا، پی رہے ہو) تیسرا جواب یہ ہے: یعنی لما أنشاءہ کان مختلفا اُکُلُہ (جب اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تو اس کے پھل مختلف تھے۔ یہ اس معنی کی بنا پر ہے لو کان لہ اُکُلٌ لکانَ مختلفا اُکُلُہ (یعنی اگر اس کے پھل ہوتے تو اس کا ذائقہ مختلف ہوتا)

اور اکلهما نہیں کہا، کیونکہ اس نے اعادہ کے ذکر کے وقت ان دو میں سے ایک پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11)، ای الیهما اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ (ان کا ایک دوسرے پر) عطف کیا گیا ہے۔

مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ اور اس میں تین دلیلیں ہیں (۱) جس پر سب سے پہلے دلیل قائم ہوتی ہے وہ یہ کہ متغیرات یعنی تبدیلیوں کے لیے مغیر یعنی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضروری ہے (۲) دوسری دلیل اس پر کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہم پر احسان ہے، پس اگر وہ چاہتا تو جب اس نے ہمیں پیدا کیا تو وہ ہمارے لیے غذا پیدا نہ کرتا اور جب اس نے اسے پیدا کر دیا تو وہ دیکھنے میں حسین اور ذائقے میں عمدہ اور طیب نہ ہوتی، اور جب اس نے اسے اس طرح پیدا فرما دیا تو اسے چننا آسان نہ ہوتا۔ پس اس پر ابتداء ایسا کرنا لازم نہیں تھا، کیونکہ اس پر کوئی شی واجب نہیں۔ (۳) اور تیسری دلیل قدرت پر ہے کہ وہ پانی جس کی شان یہ ہے کہ وہ زمین میں نیچے اتر جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک علام الغیوب کی قدرت سے درخت کی جڑوں سے اس کی شاخوں کی جانب اوپر چڑھ آتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے آخر تک پہنچتا ہے تو اس میں پتے اگتے ہیں جو اس کی جنس سے نہیں۔ اور پھل اپنے خاص وصف کے ساتھ وافر مقدار میں نکلتا ہے اور اس کا رنگ صاف اور حسین ہوتا ہے، اسے چننا آسان ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ لذیذ ہوتا ہے، تو طبائع اور ان کی اجناس کہاں گئیں؟ فلاسفہ اور ان کے لوگ کہاں گئے؟ کیا یہ طبیعت کی قدرت میں ہے کہ وہ اس طرح کی پختگی لا سکے، یا یہ عجیب وغریب ترتیب مرتب کر سکے؟ ہرگز نہیں۔ عقلی اعتبار سے اسے کوئی مکمل نہیں کر سکتا مگر وہی جو حی (زندہ) ہو، عالم (جاننے والا) ہو، قدیر (قدرت والا) ہو اور مرید (ارادہ کرنے والا) ہو، پس پاک ہے وہ ذات جس کے لیے ہر شی میں کوئی نشانی اور دلیل ہے۔

اور اس آیت کو ماقبل کے ساتھ متصل لانے کی وجہ یہ ہے کہ جب کفار نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان باندھے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور کئی چیزوں کو حلال وحرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر انہیں دلیل دی کہ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے، اور یہ کہ اس نے ان چیزوں کو ان کے لیے رزق بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ یہ دو بنائیں اور اصلیں ہیں اور دونوں اِفعل (امر) کے صیغہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک مباح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ (الجمعہ: 10) اور دوسری واجب ہے۔ اور شریعت میں مباح اور واجب کا ملنا ممتنع نہیں ہے۔ اور حق ادا کرنے کے امر سے پہلے کھانے کی نعمت کے ذکر سے آغاز کیا تا کہ وہ واضح کر دے کہ نعمت کے ساتھ ابتدا، حکم کی پابندی سے پہلے یہ اس کا فضل (اور احسان) ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ حق کی تفسیر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ تو حضرت انس بن مالک، حضرت ابن عباس، حضرت طاؤس، حضرت حسن، حضرت ابن زید، حضرت ابن الحنفیہ، حضرت ضحاک اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے کہ حق سے مراد وہ زکوٰۃ ہے(1) جو فرض کی گئی ہے، عشر اور نصف عشر ہے۔ اور اسے ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔

اور حضرت علی بن حسین، حضرت عطا، حضرت حکم، حضرت حماد، حضرت سعید بن جبیر (2) اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد وہ حق ہے جو زکوٰۃ کے سوا مال میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے ندباً حکم فرمایا ہے۔ اور حضرت ابن عمر اور محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا گیا ہے، اور اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب تو فصل کی کٹائی کرے اور تیرے پاس مساکین حاضر ہوں تو ان کے لیے کچھ بالیں (سٹے) چھوڑ دے، اور جب تو (انگور یا کھجوریں وغیرہ) توڑے تو ان کے لیے کچھ خوشے پھینک دے، اور جب تو اپنی کھیتی کو صاف کرے اور اس سے دانے نکال لے تو اس سے ان کے لیے کچھ حصہ چھوڑ دے، اور جب تو اس کا کیل (مقدار) معلوم کر لے تو اس کی زکوٰۃ (عشر) ادا کر۔ اور تیسرا قول زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے، کیونکہ یہ سورت مکیہ ہے اور آیت زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ: 103) (اے حبیب! وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ) اور وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 43) (اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ)

یہ حضرت ابن عباس، ابن الحنفیہ، حسن، عطیہ العوفی نخعی اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے سدی سے اس آیت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: عشر اور نصف عشر کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے، تو میں نے کہا: یہ کس سے منقول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: علماء سے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے سبب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی عمومیت کے سبب کہ ''وہ زمین جسے بارش سیراب کرے (3) اس کی پیداوار میں عشر ہے اور جسے بڑے یا چھوٹے ڈولوں کے ساتھ سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے''۔ ہر اس پیداوار میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے جسے زمین اگاتی ہے چاہے وہ اناج ہو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 757 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178 3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

یا کوئی اور۔ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے بیان کیا ہے: سوائے ایندھن کی لکڑی، گھاس، وہ درخت جس کی شاخوں سے کمانیں بنائی جاتی ہیں۔

القصب، انجیر (☆)، غاف کے درخت کا چھلکا (غاف ایک انتہائی میٹھے پھل والا درخت ہے) قصب الذریرہ (خاص قسم کی خوشبو کے پودے) اور قصب السکر (گنا) کے۔ اور جمہور نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور وہ تاویل یہ کرتے ہیں کہ حدیث طیبہ کا مقصود اس زمین کو بیان کرنا ہے جس سے عشر لیا جائے گا اور جس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس بارے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے جسے تو جانتا ہے کہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے سوا میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسے حضرت حسن، ابن سیرین اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم سے روایت کیا گیا ہے۔ اور کوفیوں میں سے ابن ابی لیلیٰ، ثوری، حسن ابن صالح، ابن مبارک اور یحییٰ بن آدم رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور اسی طرف ابو عبید بھی گئے ہیں۔ اور اسے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور یہی حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے، کیونکہ وہ زکوٰۃ نہیں لیتے تھے مگر گندم، جو، کھجور اور کشمش سے۔ اور اسے وکیع نے طلحہ بن یحییٰ عن ابی بردہ عن ابیہ کی سند سے بیان کیا ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر وہ خوراک جو ذخیرہ کی جا سکتی ہو اس میں زکوٰۃ (عشر) واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: زکوٰۃ ان چیزوں میں واجب ہوتی ہے جو خشک ہو جائے اور اسے ذخیرہ کیا جا سکتا ہو اور اسے بطور خوراک کھایا جا سکتا ہو۔ اور زیتون میں کوئی شی نہیں ہے کیونکہ وہ ادام (سالن) ہے۔ اور اسی کی مثل ابو ثور نے بھی کہا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کئی اقوال کہے ہیں ان میں سے اظہر قول یہ ہے کہ زکوٰۃ ان تمام چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے جب کہ ان کے وسق بنائے جا سکتے ہوں۔ اور انہوں نے اسے بادام میں واجب کیا ہے کیونکہ یہ کیلی چیز ہے لیکن اخروٹ میں نہیں کیونکہ ان کا شمار عددی چیزوں میں ہے (یعنی یہ گن کر بیچے جاتے ہیں نہ کہ وزن و کیل کے ساتھ) اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لیس فیما دون خمسة أوسق من تمر أو حب صدقة (1) (پانچ سے کم وسق کھجوروں یا دانوں میں کوئی صدقہ (زکوٰۃ و عشر) نہیں ہے) انہوں نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرما دی ہے کہ واجب کا محل وسق ہے، اور آپ نے اس مقدار کو بیان کر دیا ہے جس سے حق (زکوٰۃ) نکالنا واجب ہوتا ہے۔ اور امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ زکوٰۃ ہر اس پیداوار میں واجب ہے جسے زمین اگائے، یہاں تک کہ سبزی کی دس گانٹھوں میں سے ایک گانٹھ (بطور زکوٰۃ) واجب ہوگی اور ان سے اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے، اور یہی حضرت عمر بن العزیز کا قول ہے کیونکہ انہوں نے لکھا کہ عشر ہر اس پیداوار سے لیا جائے جسے زمین اگاتی ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔

اسے عبد الرزاق نے معمر سے اور انہوں نے سماک بن فضل سے ذکر کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر نے لکھا .... پھر آگے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 314

☆ بعض نسخوں میں تین ہے۔

اسے ذکر کیا۔ اور یہی قول حماد بن ابی سلیمان اور آپ کے شاگرد رشید حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور ابن عربی کا میلان بھی احکام میں اسی طرف ہے (1) پس فرمایا ہے: اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا آئینہ بنایا اور حق کو دیکھ لیا، اور اسے پکڑا جو مذہب حنفی کو قوت اور طاقت دیتا ہے۔ اور انہوں نے کتاب القبس بما علیہ الإمام مالك بن انس میں کہا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اور لوگوں نے ان تمام میں یا بعض میں زکوٰۃ واجب ہونے میں اختلاف کیا ہے جنہیں آیت متضمن ہے، تحقیق ہم نے اس کا خلاصہ ''الاحکام'' میں بیان کردیا ہے کہ زکوٰۃ ان چیزوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جنہیں غذا بنایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کردیا ہے نہ کہ سبزیوں وغیرہ کے ساتھ۔ اور انار، فرسك (اخروٹ یا اس قسم کی کوئی اور شی) اور اترج (لیموں کا درخت) طائف میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس پر کوئی اعتراض کیا اور نہ اس کا ذکر کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اگرچہ احکام میں اس کا ذکر نہیں اور یہی صحیح مسئلہ ہے کہ سبزیوں میں کوئی شی نہیں ہے۔ اور رہی آیت تو اس میں اختلاف ہے، کیا یہ محکم ہے یا منسوخ ہے یا ندب پر محمول ہے؟ اور ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے جو اس کے محتملات میں سے ایک کو بیان کرے، بلکہ جو قاطع معلوم ہے وہ وہ ہے جسے ابن بکیر نے اپنی ''احکام'' میں ذکر کیا ہے کہ کوفہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مدینہ طیبہ میں احکام مضبوط اور پختہ ہونے کے بعد فتح ہوا، تو کیا یہ جائز ہے کہ کوئی وہم میں پڑنے والا وہم میں پڑ جائے یا جسے ادنیٰ سی بصیرت ہو کہ شریعت اس کی مثل ہو تو وہ معطل کردی گئی ہے اور اس کے مطابق دارالہجرۃ اور محبط وحی میں عمل نہیں کیا گیا اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں، یہاں تک کہ اس کے مطابق کوفہ کے باسیوں نے عمل کیا؟ بلاشبہ یہ اس کے بارے میں درست ہے جس نے یہ گمان کیا اور اس طرح کہا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم کے معنی میں سے اس پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۗ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) (اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام) کیا آپ یہ گمان کرسکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز چھپا کر رکھی ہوگی جس کی تبلیغ اور بیان کا آپ کو حکم دیا گیا؟ حاشا وکلا (ایسا ہرگز ممکن نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے مکمل کردیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کردی ہے تم پر اپنی نعمت)

اور دین کے کامل ہونے میں سے یہ ہے کہ آپ نے سبزیوں میں سے کوئی شی نہیں لی۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ (2) رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں کہا ہے جسے دارقطنی نے بیان کیا ہے: بے شک ہمارے پاس کھیرے، ککڑیاں، پیدا ہونے کی جگہوں میں سے وہ دس ہزار تک نکالے جاتے تھے اور ان میں کوئی شے (زکوٰۃ) نہ ہوتی تھی۔ اور زہری اور حسن نے کہا ہے: سبزی جب بیچ دی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کی زکوٰۃ دی جائے گی جب اس کے ثمن (قیمت) دوسو درہم تک پہنچ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 759　　2۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100

جائیں۔ اور پھلوں کے ثمن کے بارے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ ان دونوں کے قول میں اس کے لیے کوئی حجت نہیں ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور ترمذی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لکھا اور سبزیوں کے بارے (زکوٰۃ) کا حکم دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس فیہاشی (1) ان میں کوئی شی نہیں ہے اور اسی معنی کی روایت حضرت جابر، حضرت انس، حضرت علی، حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ان کی احادیث دار قطنی نے ذکر کی ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اصحاب نے صالح بن موسیٰ عن منصور عن ابراہیم عن الاسود عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سبزیوں میں سے جو زمین اگائے اس میں زکوٰۃ ہے''۔ فیما أنبتتِ الأرضُ من الخضر زکاۃ (2) ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کو منصور کے ثقہ اصحاب میں سے کسی نے اس طرح روایت نہیں کیا، بلکہ یہ ابراہیم کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب سنت کی جہت سے اسانید ضعیف ہونے کے سبب استدلال ساقط ہو گیا تو پھر کچھ باقی نہ رہا مگر وہی جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آیت کے عموم میں تخصیص مراد ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فیما سقت السماءُ العشرَ (3) کے عموم کے بارے میں جو ہم نے ذکر کیا ہے (وہ ثابت ہو گیا)

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: سبزیوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے سوائے ان کے جن کا پھل باقی رہنے والا ہے اور سوائے زعفران وغیرہ کے کہ اس کا شمار وزنی چیزوں میں ہوتا ہے اور اس میں زکوٰۃ ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ عصفر (زرد رنگ) اور کتان (السی) میں بیج کا اعتبار کرتے ہیں، پس جب ان دونوں کا بیج قرطم (کڑ کے بیج) اور کتان (السی) میں سے پانچ وسق تک پہنچ جائے تو عصفر اور کتان بیج کے تابع ہوں گے، اور اس سے عشر یا نصف عشر لیا جائے گا۔ اور رہی روئی تو اس میں ان کے نزدیک پانچ سے کم گانٹھوں میں کوئی شی نہیں ہے اور ایک گانٹھ تین سو سیر عراقی کی ہوگی۔ اور ورس (ایک قسم کی گھاس جو رنگائی کے کام آتی ہے) اور زعفران جب پانچ سیر سے کم ہوں تو ان میں کوئی شی (زکوٰۃ) نہ ہوگی۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک پانچ سیر تک پہنچ جائے تو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) ہوگا، چاہے وہ عشر ہو یا نصف عشر۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اسی طرح (حکم) اس گنے کا ہے جس سے شکر (اور چینی) بنتی ہے، اور وہ عشری زمین میں ہو نہ کہ خراجی زمین میں، تو اس میں وہی حکم ہے جو زعفران میں ہے۔

عبدالملک بن ماجشون نے پھلوں کی جڑوں میں زکوٰۃ واجب کی ہے نہ کہ سبزیوں میں۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو موقف امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے، ان کے نزدیک کوئی زکوٰۃ نہیں نہ بادام میں، نہ اخروٹ میں اور نہ ہی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 81　　2۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 195
3۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

بندق میں اور جو بھی ان کی مثل ہے، اگرچہ انہیں ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ان کے نزدیک ناشپاتی، سیب اور امرود میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ ہی ان چیزوں میں جو ان کی مثل ہیں نہ خشک ہوتی ہے اور نہ ذخیرہ کی جا سکتی ہے، البتہ انجیر میں اختلاف ہے۔ اور اہل مغرب میں سے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے ہیں ان کے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ انجیر میں زکوٰۃ نہیں ہے، مگر عبد الملک بن حبیب یہ رائے رکھتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس میں زکوٰۃ ہے۔ وہ اسے کھجور اور کشمش پر قیاس کرتے ہیں اور بغداد کے مالکی مذہب رکھنے والے اہل علم کی ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے، ان میں اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے: وہ سنت جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں، اور وہ جو میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ ہر قسم کے پھلوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، انار، خرسک اور انجیر اور جو ان کے مشابہ ہیں۔ اور جو ان کے مشابہ نہیں بشرطیکہ وہ فواکہ (پھلوں) میں سے ہوں۔

ابو عمر نے کہا ہے: پس آپ نے انجیر کو اس باب میں داخل کیا ہے اور میرا گمان ہے (واللہ اعلم) آپ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ اسے خشک کیا جاتا ہے اور ذخیرہ کیا جاتا ہے اور اسے خوراک بنایا جاتا ہے، اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ اسے اس باب میں داخل نہ کرتے، کیونکہ یہ انار سے بڑھ کر کھجور اور کشمش کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور مجھے علامہ ابہری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت سے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ اس میں زکوٰۃ کے وجوب کا فتویٰ دیتے ہیں، اور وہ اپنے نزدیک اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے اصول پر دیکھتے ہیں۔

اور انجیر کیلی شی ہے اس میں پانچ وسقوں کی رعایت کی جائے گی اور وہ شے جو وزن کے اعتبار سے ان کی مثل ہو اور ان کے نزدیک انجیر میں کھجور اور کشمش کا حکم لگایا جائے گا جن پر تمام کا اجماع ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: کھجور اور انگور کے سوا پھلوں میں سے کسی شی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے زکوٰۃ وصول کی ہے اور یہ دونوں اہل حجاز کی خوراک تھی جسے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے فرمایا: کبھی اخروٹ اور بادام کو بھی ذخیرہ کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں میں زکوٰۃ نہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں حجاز میں خوراک نہیں بنیں، جتنا مجھے علم ہے، بلاشبہ یہ دونوں پھل ہیں۔ اور زیتون میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ پس اسے رمان (انار) کے ساتھ ملایا ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ انجیر غذا اور خوراک میں اس سے زیادہ نفع بخش ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ ہے انہوں نے یہ عراق میں کہا اور پہلا قول مصر میں کہا: پس زیتون کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مضطرب ہو گیا، اور اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف نہیں، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ ان دونوں کے نزدیک آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور دونوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ انار میں زکوٰۃ نہیں ہے اور اس میں زکوٰۃ کو واجب کرنا دونوں کو الزام دینا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اگر انار اس اتفاق سے نکل چکا ہے تو اس سے یہ معنی ظاہر ہوا کہ آیت اپنے عموم پر نہیں ہے اور ضمیر عائد مذکور چیزوں میں سے بعض کی

طرف راجع ہے اور بعض کی طرف نہیں۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے سبزیوں میں عشر واجب کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ اور اس سے پہلے زیتون اور انار کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کا ذکر جملہ کے بعد ہو وہ بلا اختلاف اخیر کی طرف پھر جاتا ہے۔ الکیاطبری نے یہ کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے کبھی بھی انار کو پیوند نہیں لگایا مگر باغ کے پانی میں سے ایک قطرہ کے ساتھ۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب تم انار کو کھاؤ تو تم اسے دانوں کے باریک چھلکے سمیت کھاؤ، کیونکہ وہ معدے کو صاف کرتا ہے۔ اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم انار کو اس کے سرے سے نہ توڑو کیونکہ اس میں ایک کیڑا ہوتا ہے جس سے جذام کی بیماری لگ جاتی ہے۔ زیتون کے تیل کے فوائد عنقریب سورۃ المومنون میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ واجب ہے ان میں سے زہری، اوزاعی، لیث، ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ زہری، اوزاعی اور لیث نے کہا ہے: زیتون کا تخمینہ لگایا جائے گا اور اس سے صاف تیل لے لیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اندازہ نہیں لگایا جائے گا، البتہ اس کا تیل نکالے جانے کے بعد اس سے عشر لیا جائے گا، جب کہ اس کا ماپ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما علیہ نے کہا ہے: اس کے دانوں سے عشر لیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: یَوْمَ حَصَادِهٖ ابوعمرو، ابن عمر اور عاصم نے حصادہ حا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے، اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ، اور یہ دونوں لغتیں مشہور ہیں۔ اور اسی کی مثل الصَرام اور الصِرام، الجَذاذ اور الجِذاذ، القَطاب اور القِطاب ہیں۔ زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت کے بارے میں علماء کے تین مختلف قول ہیں:

(۱) زکوٰۃ واجب ہونے کا وقت فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ محمد بن مسلمہ نے یہی کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ حَصَادِهٖ۔(1)

(۲) اس کا وقت پکنے کے ایام ہیں، کیونکہ (کھیتی) پکنے سے پہلے پہلے نہ چارہ ہوتی ہے، نہ غذا اور نہ ہی طعام اور جب وہ پک جائے اور وہ اس کھانے کے وقت کو پہنچ جائے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے تو پھر وہ حق واجب ہو جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کیونکہ نعمت مکمل ہو جانے کے ساتھ اس نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اس کی ادائیگی کٹائی کے وقت ہوگی جب کہ وہ واجب پکنے کے وقت ہو جاتا ہے(2)۔

(۳) حق کا وجوب اندازہ مکمل کرنے کے بعد ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت اس میں واجب زکوٰۃ ثابت ہو جاتی ہے اور یہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شرط ہے۔ اس کی اصل زکوٰۃ وصول کرنے والے کا ریوڑ میں آنا ہے(3)، یعنی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 762　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 763

کہا ہے۔ نص قرآنی کے مطابق پہلا قول صحیح ہے۔ اور مذہب ثانی مشہور ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی فصل پکنے کے بعد فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کی ملکیت سے ادا کی جائے گی یا وہ اندازہ لگانے سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کے وارثوں پر ہوگی۔ اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: پھل کے مالکوں کو وسعت دینے کے لیے اندازہ لگانے کو مقدم کیا گیا ہے اور اگر کسی آدمی نے اندازہ لگانے کے بعد اپنی زکوٰۃ کو مقدم کیا اور کاٹنے سے پہلے پہلے ادا کر دی تو وہ اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی، کیونکہ اس نے اسے واجب ہونے سے پہلے نکال دیا ہے۔ اور اندازہ لگانے کے بارے علماء کے مختلف قول ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ ثوری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دی ہے، اور انہوں نے فرمایا: اندازہ لگانا مستعمل نہیں۔ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ باغ کے مالک پر لازم ہے کہ وہ اس کا عشر مساکین کو ادا کرے جو اس کے قبضے میں ہو جب وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: موجودہ دور میں اندازہ لگانا بدعت ہے۔ اور جمہور اس کے خلاف ہیں، پھر ان کا اختلاف ہوا ہے اور اس کے جواز پر سب سے بڑی دلیل کھجور اور انگور کے بارے میں ہے کہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ (1) کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھیجا اور حکم فرمایا کہ وہ اسی طرح انگوروں کا اندازہ لگالیں جس طرح کھجوروں کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش لے لی جائے جس طرح کھجوروں کی زکوٰۃ میں تمر (پکی کھجوریں) لے لی جاتی ہیں۔ اسے ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔ اور داؤد بن علی نے کہا ہے: زکوٰۃ کے لیے کھجوروں میں اندازہ لگانا جائز ہے اور انگور میں جائز نہیں ہے اور حضرت عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے اور صحیح سند سے متصل نہیں ہے ابو محمد عبدالحق نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اندازہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو کھجور کے درخت پر تر کھجوریں ہیں اور ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو ان میں ناقص ہوں اگر وہ پک کر تیار ہوتیں پھر نقصان کے بعد جو باقی ہیں انہیں شمار کیا جائے اور ان بعض کو بعض کے ساتھ ملایا جائے گا یہاں تک کہ باغ مکمل ہو جائے، اور اسی طرح انگور کا بھی اندازہ لگایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اندازہ لگانے کے لیے ایک آدمی ہی کافی ہوتا ہے جیسا کہ حاکم۔ اور جب پکی ہوئی کھجوریں اس کے اندازہ سے بڑھ جائیں تو پھر باغ کے مالک پر ان میں سے (مزید زکوٰۃ) نکالنا لازم نہیں، کیونکہ اب فیصلہ نافذ ہو چکا ہے، عبدالوہاب نے یہی کہا ہے اور اسی طرح جب مقدار کم ہو جائے تو پھر زکوٰۃ کم نہیں ہوگی۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں پر اندازہ لگایا جاتا تھا اور پھر اسی اندازہ کے مطابق ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔

مسئلہ نمبر 11۔ اگر باغ کا مالک اندازے میں کثرت اور زیادتی کا مطالبہ کرے تو اندازہ لگانے والا اسے اس بارے میں اختیار دے دے کہ وہ اسے اس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے جتنا اس نے اندازہ لگایا ہے اور وہ اس کے اندازہ کے مطابق لے لے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ ہمیں ابن جریج نے حضرت ابوالزبیر رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار وسق کا اندازہ لگایا اور یہ گمان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کو جب آپ نے اختیار دے دیا تو انہوں نے کھجوریں لے لیں اور انہیں بیس ہزار وسق دے دیئے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو میں نے حضرت عطا کو کہا: تو (کیا) اندازہ لگانے والے پر لازم ہے کہ جب مال کا مالک اندازے میں زیادتی اور کثرت کا مطالبہ کرے تو وہ اسے اختیار دے دے جیسا کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کو اختیار دیا؟ تو انہوں نے فرمایا: مجھے میری عمر کی قسم! کون سی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بہتر اور افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ اور اندازہ نہیں ہوتا مگر پکنے کے بعد، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی طرف بھیجتے تھے (1) اور وہ ان پر کھجوروں کا تخمینہ لگاتے تھے جس وقت پہلی کھجوریں پک جاتیں اس سے پہلے کہ ان میں سے کچھ کھائی جائیں۔ پھر آپ یہودیوں کو اختیار دیتے تھے کہ چاہے تو وہ انہیں اس اندازے کے مطابق لے لیں یا وہ انہیں آپ کو دے دیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگانے کا حکم دیا تا کہ زکوٰۃ شمار کر لی جائے اس سے پہلے کہ پھل کھایا جائے اور اسے تقسیم کیا جائے۔ اسے دارقطنی نے ابن جریج عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ فرمایا: اور صالح بن ابی الاخضر نے اسے زہری عن ابن مسیب کی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور مالک، معمر اور عقیل نے اسے زہری عن سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ جب تخمینہ لگانے والا تخمینہ لگالے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے اندازہ میں سے کچھ مقدار ساقط کر دی جائے، کیونکہ ابو داؤد، ترمذی اور بستی نے اپنی صحیح میں حضرت سہل بن ابی حثمہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو لے لو اور تیسرا حصہ چھوڑ دو اور اگر تم تیسرا حصہ نہ چھوڑو تو چوتھا حصہ چھوڑ دو'' (2)۔ یہ ترمذی کے الفاظ ہیں۔ ابو داؤد نے کہا ہے: اندازہ لگانے والا تیسرا حصہ خرفہ (چنا ہوا میوہ) کے لیے چھوڑ دے گا۔ اور اسی طرح یحییٰ القطان نے کہا ہے۔ اور ابو حاتم البستی نے کہا ہے: اس خبر کی دو صفتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عشر میں سے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دے اور دوسری یہ ہے کہ وہ عشر لگانے سے پہلے کل کھجوروں میں سے اتنی مقدار چھوڑ دے، جب کہ وہ بہت بڑا باغ ہو اس کا احتمال رکھتا ہو۔

الخرفة خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی کھجوروں میں سے وہ جو چنی جاتی ہیں جس وقت وہ اپنے پھل کو پاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: التمر خرفة الصائم (کھجور روزے دار کا چنا ہوا پھل ہے) یہ جوہری اور ہروی سے منقول ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اندازہ لگانے والا اپنا اندازہ لگانے کے وقت کھجوروں اور انگوروں میں سے کوئی شی نہیں چھوڑے گا مگر وہی جو اس نے اندازہ لگایا۔ اور مدینہ طیبہ کے بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ اندازے میں تخفیف کرے گا اور وہ محتاجوں کے لیے صلہ رحمی وغیرہ کے لیے کچھ چھوڑ دے گا (یعنی غرباء و مساکین کو دینے کے لیے اور رشتہ داروں اور دوست احباب کو

1۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 134 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

دینے کے لیے)

مسئلہ نمبر 14۔ اگر اندازہ لگائے جانے کے بعد اور انہیں توڑنے سے پہلے پھل پر کوئی آفت آجائے (اور وہ خراب ہو جائے) تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اس پر اہل علم کا اجماع ہے، مگر اس صورت میں کہ اس میں سے پانچ وسق یا اس سے زیادہ مقدار باقی رہ جائے (تو اس کے مطابق اس پر زکوٰۃ ہو گی)۔

مسئلہ نمبر 15۔ اور پانچ وسقوں سے کم مقدار میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر مروی ہے۔ اور یہ کتاب اللہ میں مجمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ: 267) (اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لیے زمین سے)

اور مزید ارشاد فرمایا: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ پھر عشر اور نصف عشر کے ساتھ اس اجمال کا بیان واقع ہوا، پھر جب وہ مقدار کہ جب مال اس تک پہنچ جائے تو اس سے حق (زکوٰۃ) لیا جائے گا، وہ مجمل تھی تو اس کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور فرمایا: لیس فیما دون خمسة أوسق من تمر او حب صدقة (1) (کہ کھجور یا دانوں (اناج) کی وہ مقدار جو پانچ اوسق سے کم ہو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے)۔ اور یہ ارشاد سبزیوں میں زکوٰۃ کی نفی کرتا ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جن کے وسق بنائے جاتے ہیں۔ پس جسے اپنے حصہ میں کھجوروں یا اناج میں سے پانچ وسق حاصل ہو جائیں اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی طرح حکم کشمش کا ہے۔ اور یہی علماء کے نزدیک نصاب کے نام کے ساتھ موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے: وَسق و وِسق (یعنی واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی) اس کی مقدار ساٹھ صاع ہے، اور ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اور ایک مد میں ایک رطل بغدادی اور اس کا تہائی حصہ۔ اور مجموعی طور پر پانچ اوسق کی مقدار مد کے اعتبار سے ایک ہزار دو سو مد ہے اور یہ وزن کے اعتبار سے ایک ہزار چھ سو رطل ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ اور جسے کھجور اور کشمش کے مجموعی طو پر پانچ وسق حاصل ہوں اس پر بالا جماع زکوٰۃ لازم نہیں، کیونکہ یہ دو مختلف جنسیں ہیں اور اسی طرح علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کو گندم کے ساتھ اور گندم کو کشمش کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا اور نہ ہی اونٹ کو گائے کے ساتھ اور نہ گائے کو بکری کے ساتھ ملایا جائے گا، البتہ بکریوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا اس پر اجماع ہے اور گندم کو جو اور بغیر چھلکے والے جو کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 17۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ان تین میں اس کی اجازت دی ہے، کیونکہ یہ ایک قسم (جنس) کے معنی میں ہیں اس لیے کہ ان کی منفعت اور فوائد ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں اور یہ اگنے اور کٹائی میں بھی آپس میں جمع ہیں۔ اور ان میں افتراق نام کے اعتبار سے ہے اور یہ حکم میں ان کے الگ الگ ہونے کو ثابت نہیں کرتا جیسا بھینسیں اور گائیں، بھیڑیں اور بکریاں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: انہیں جمع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ مختلف اقسام ہیں، ان کی صفات جدا جدا ہیں،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 316

ان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ہیں اوران کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ اور یہی ان کے افتراق کو ثابت کرتا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دالیں تمام کی تمام ایک نوع ہیں، ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایسے دانے جن کے نام کی دوسرے سے الگ پہچان ہو اسے نہیں ملایا جائے گا، کیونکہ وہ خلقت (بناوٹ) اور ذائقے وغیرہ میں دوسرے سے جدا اور مختلف ہوتا ہے اور ہر قسم کو آپس میں ملا دیا جائے گا، یعنی اس کی ردی قسم کو جید کے ساتھ، جیسا کہ کھجور اور اس کی انواع، کشمش سیاہ رنگ کی اور سرخ رنگ کی، گندم اور اس کی اقسام گندمی وغیرہ۔

اور یہی ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ، آپ کے صاحبین امام یوسف اور امام محمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ کا قول ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: تمام دانوں کو آپس میں ملا دیا جائے گا یعنی دالیں وغیرہ انہیں زکوٰۃ میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے گا۔ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملانے سے اور دانوں میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملانے سے ہچکچاتے تھے، پھر اپنے حکم کے آخر میں کہا کرتے تھے، وہ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کہہ رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 18۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: (کھیتی کی) وہ مقدار جسے اس کے مالک نے اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے کے بعد یا اس کے بعد کہ اسے ہاتھ میں مل کر دانے نکال کر کھایا جا سکے، ضائع کر دیا تو اس کا حساب اس پر ڈالا جائے گا اور اس کی وہ مقدار جو اس کے مالک نے اسے کاٹنے اور اسے توڑنے کے دوران کسی کو دی اور زیتون میں سے اسے چننے کی حالت میں کسی کو دی، اسے تلاش کر کے اس پر حساب ڈالا جائے گا۔ اور اکثر فقہاء اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ زکوٰۃ واجب نہیں کرتے مگر صرف اسی مقدار پر جو گاہنے کے بعد اس کے قبضے میں موجود ہو۔

حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے دانوں کی زکوٰۃ کے بارے کہا ہے: نفقہ (خرچہ) سے پہلے اس (زکوٰۃ) سے آغاز کیا جائے گا اور چھلکوں سے نکلے ہوئے دانے اس نے اور اس کے گھر والوں نے کھا لیے تو (ان کا) اس پر حساب نہیں لگایا جائے گا، یہ ان تازہ پکی کھجوروں کے قائم مقام ہیں جو باغ کے مالک کے اہل کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں وہ اسے کھاتے ہیں اور ان پر ان کا تخمینہ نہیں لگایا جاتا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تخمینہ لگانے والا باغ کے مالک کے لیے اتنی کھجوروں کی مقدار چھوڑ دے گا جسے وہ خود اور اس کے گھر والے کھائیں گے اور وہ اس کا تخمینہ ان پر نہیں لگائے گا۔ اور تازہ پکی کھجوروں کی جو مقدار اس نے خود کھا لی اس کا حساب اس پر نہیں ڈالا جائے گا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی موافقت کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ** اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ اس آیت کے مطابق کٹائی سے پہلے کھائی جانے والی مقدار کا حساب نہیں لگایا جائے گا۔ اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو تہائی چھوڑ دو اور اگر تم تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی چھوڑ دو'' (1)۔ اور جتنی مقدار چوپاؤں اور بیلوں نے گاہنے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

کے وقت کھالی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک اس میں سے کسی شی کا حساب اس کے مالک پر نہیں ڈالا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 19۔ لوبیا، چنے اور مٹر میں سے سبز حالت میں جو بیچ دیئے گئے، خشک حالت میں اس کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے اور دانوں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اسی طرح پھل میں سے جو سبز حالت میں بیچ دیا گیا تو اس کی چھان بین کی جائے اور اس کی (تلاش کا) قصد کیا جائے اور خشک حالت میں اس کا اندازہ لگایا جائے اور پھر اس اندازے کے مطابق کشمش اور پکی کھجوروں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے ثمن (قیمت) سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 20۔ اور کھجور کے پھل میں سے جو پکی کھجور نہ بنے اور انگور میں سے جو کشمش نہ بنے جیسا کہ مصر کا انگور اور وہاں کے ڈوکے (کچی کھجور) اور اسی طرح وہاں کا زیتون جس سے تیل نہیں نکالا جاتا، تو اس کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے ثمن سے نکالی جائے گی اور اس کے سوا اس کے مالک کو کسی شی کا مکلف اور پابند نہیں بنایا جائے گا، اور نہ ہی اس میں اس کے ثمن کے بیس مثقال یا دوسو درہم تک پہنچنے کی رعایت کی جائے گی، بلکہ اس میں صرف اتنا دیکھا جائے گا کہ اس کی مقدار پانچ اوسق اور اس سے زیادہ تک پہنچ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان سے پکی کھجوروں کی صورت میں اس کا عشر یا نصف عشر نکالا جائے گا، جب اس کے گھر والوں نے انہیں تازہ حالت میں کھایا یا وہ کسی کو کھلائیں۔

مسئلہ نمبر 21۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ زمین جسے بارش، دریاؤں اور چشموں کے پانی سے سیراب کیا جائے یا وہ بارانی زمین ہو تو اس کی پیداوار میں عشر ہوگا اور جسے اونٹنیوں یا اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا جائے تو اس میں نصف عشر ہوگا اور اسی طرح اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو تو اس میں عشر ہوگا'' (1)۔ اور سیح سے مراد وہ پانی ہے جو سطح زمین پر جاری ہو۔ ابن السکیت نے یہی کہا ہے۔ اور سیح کا لفظ حدیث میں مذکور ہے، اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو لیکن زمین کا مالک پانی کا مالک نہ ہو بلکہ وہ اس کے لیے اس کا کرایہ دیتا ہو تو وہ آسمان کے پانی (بارش) کی طرح ہے۔

مشہور مذہب یہی ہے۔ اور ابوالحسن لخمی نے کہا ہے کہ وہ نضح (اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے) کے حکم میں ہے، پس اگر ایک بار اسے آسمان کے پانی کے ساتھ سیراب کیا گیا اور ایک بار ڈول (راہٹ) کے ساتھ۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس کی طرف دیکھا جائے گا جس کے ساتھ کھیتی مکمل ہوئی ہے اور وہ بڑھتی اور نشوونما پاتی رہی ہے اور حکم اسی پر معلق ہوگا۔ یہ ابن القاسم کی ان سے روایت ہے۔ اور ابن وہب نے ان سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب نصف سال چشموں کے ساتھ سیراب کیا گیا پھر وہ پانی منقطع ہو گیا اور بقیہ سال اسے اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا گیا تو بلاشبہ اس پر اس کی نصف زکوٰۃ عشر ہوگی اور نصف آخر نصف عشر ہوگی۔ اور ایک بار کہا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے مطابق ہوگی جس کے ساتھ اس کی حیات مکمل ہوئی۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی اس کے حساب سے زکوٰۃ دے گا۔ اس کی مثال یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 225

ہے کہ وہ دو مہینے اونٹ کے ساتھ پانی پلائے اور چار مہینے آسمان کا پانی، تو اس میں آسمان کے پانی کی وجہ سے عشر کے دو ثلث ہوں گے اور اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے کی وجہ سے عشر کا چھٹا حصہ ہوگا۔ اور اسی کے مطابق بکار بن قتیبہ فتویٰ دیتے تھے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اغلب کی طرف دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق زکوٰۃ دی جائے گی اور ماسویٰ کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر اس نے اسے ایک دن یا دو دن بارش کے پانی کے ساتھ سیراب کیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی حصہ نہیں رکھا جائے گا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اعتبار اغلب کا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام کے تمام اس آیت کے احکام میں سے ہیں، شاید ہمارے سوا کوئی اور اس سے زیادہ بھی بیان کرے گا جتنا اللہ تعالیٰ اس کے لیے منکشف فرمائے گا۔ اس آیت کے تمام معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 22۔ اور رہا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: لیس فی حب ولا تمر صدقۃ (1) (دانوں اور کھجوروں میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے) اور اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔ تو حمزہ کنانی نے کہا ہے: اس حدیث میں فی حب کے الفاظ اسماعیل بن امیہ کے بغیر کسی نے ذکر نہیں کیے اور وہ ثقہ اور قریشی ہے اور سعید بن العاص کی اولاد میں سے ہے۔ فرمایا: اس حدیث کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اصحاب میں سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ایسے ہی ہے جیسے حمزہ نے کہا ہے اور یہ بہت بڑی اور عظیم سنت ہے جس کو تمام نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے، اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے ثابت اور محفوظ سند کے ساتھ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کیا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل روایت بیان کی ہے، لیکن وہ غریب ہے اور ہم نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسناد حسن کے ساتھ پایا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ قولہ تعالیٰ: **وَ لَا تُسْرِفُوْا** اسراف کا لغوی معنی خطا (غلطی) کرنا ہے۔ ایک اعرابی نے ایک قوم کے ارادہ سے کہا: طلبتُکم فسرفتُکم یعنی میں نے تمہاری جگہ (پانے میں) غلطی کھائی۔ اور شاعر نے کہا:

وقال قائلُهم والخیل تخبِطُهم أسرفتم فأجبنا أننا سَرَف

اور نفقہ اور خرچہ میں اسراف کرنے کا معنی ہوتا ہے فضول خرچی کرنا۔ اور مسرف لقب ہے مسلم بن عقبہ مری کا جو کہ واقعہ حرہ میں قائد تھا، کیونکہ اس نے اس میں انتہائی اسراف (فضول خرچی) کی۔ علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے:

هُمْ منعوا ذِمارِی یوم جاءت کتائبُ مُسْرِفٍ و بنِي اللَّكِيعهْ

اور آیت میں معنی مقصود یہ ہے کہ تم کسی شی کو بغیر حق کے نہ لو کہ پھر تم اسے ایسی جگہ رکھو جو اس کا حق نہیں۔ اصبغ بن فرج نے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح ایاس بن معاویہ کا قول ہے: جس شی کے ساتھ بھی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرے تو وہی سرف اور اسراف ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: یہ والیوں کے لیے خطاب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم اپنے حق سے زیادہ کوئی شی نہ لو

1۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 5، صفحہ 39

اور نہ وہ شے جو لوگوں پر واجب اور لازم نہیں ہوتی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے:
المعتدی فی الصدقۃ کمانعھا(1) (صدقہ میں زیادتی کرنے والا اسے روکنے والے کی طرح ہے)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر ابوقبیس (پہاڑ) کسی آدمی کے لیے سونا ہو جائے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں خرچ کر ڈالے تو وہ اسراف (فضول خرچی) کرنے والا نہیں ہوگا اور اگر اس نے ایک درہم یا ایک مد اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کیا تو وہ مسرف ہو گیا۔ اور اسی معنی میں حاتم کو کہا گیا: لا خیر فی السرف فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہے تو اس نے جواب دیا: لا سرف فی الخیر (خیر اور نیکی میں کوئی فضول خرچی نہیں ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول ضعیف ہے اور اسے وہ حدیث رد کرتی ہے جسے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ نے پانچ سو کھجور کے درختوں کا قصد کیا اور انہیں توڑا پھر انہیں ایک دن میں تقسیم کر دیا اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی شی نہ چھوڑی، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی تم سارے کا سارا مال نہ دو۔

اور عبدالرزاق نے ابن جریج سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کھجور کا ایک درخت توڑا اور اسے صدقہ کرتے رہے یہاں تک کہ اس سے کوئی شی باقی نہ رہی، تو یہ حکم نازل ہوا: وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم اسراف نہ کرو)۔ حضرت سدی نے کہا ہے: وَلَا تُسْرِفُوْا کا معنی ہے: تم اپنے مال اس طرح (دوسروں کو) نہ دو کہ تم خود فقیر ہو کر بیٹھ رہو۔ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: الاسراف ما قصرت عن حق اللہ تعالیٰ (کہ اسرف وہ ہے جو تو نے اللہ تعالیٰ کے حق سے کوتاہی اور غفلت کی)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو تمام مال صدقہ کرنا اور مسکینوں کا حق نکالنے سے روکنا دونوں سرف کے حکم میں داخل ہیں اور عدل اس کے خلاف ہے کہ وہ صدقہ بھی کرے اور باقی بھی رکھے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی(2) (بہترین صدقہ وہ ہے جو حاجات سے فالتو مال سے ہو) مگر یہ کہ اس کا نفس قوی ہو، غنی ہو، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا ہو اور منفرد ہو اس کے اہل و عیال نہ ہوں، تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے۔ اور اسی طرح وہ مال میں سے وہ حق نکالے جو اس پر واجب ہو مثلاً زکوٰۃ وغیرہ اور بعض احوال میں جو اسے مال میں متعینہ حقوق میں سے پیش آتے رہتے ہیں (انہیں وہ ادا کرے)۔ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: اسراف وہ ہے جسے وہ صلاح اور درستگی کی طرف لوٹانے پر قادر نہ ہو۔ اور سرف وہ ہے جسے وہ صلاح کی طرف لوٹانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: اسراف کا معنی فضول خرچی کرنا اور زیادتی کرنا ہے اور سرف کا معنی غفلت اور جہالت ہے (آدمی اس کام سے غافل اور جاہل ہوتا ہے اس لیے وہ اس پر خرچ کر ڈالتا ہے) جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

أعطوا ھنیدۃ یحدوھا ثمانیۃ ما فی عطائھم منّ ولا سرف

ای اغفال (یعنی ان کی عطا میں نہ احسان جتلانا ہے اور نہ اس سے غافل رہنا ہے)

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 192

اور رجلٌ ہرِفُ الفؤاد، یعنی اس کا دل خطا کرنے والا اور غافل ہے۔ طرفہ نے کہا ہے:

إنّ امرأً ہرِفَ الفؤاد یری عَسَلاً بماء سحابة شَتْمِی

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

''اور (پیدا فرمائے) بعض مویشی بوجھ اٹھانے والے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے۔ کھاؤ اس میں سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا اس کا ماقبل پر عطف ہے، یعنی و أنشاء حمولة و فرشًا من الأنعام (یعنی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے مویشیوں میں سے بعض بوجھ اٹھانے کے لیے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے) اور الانعام کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) انعام سے مراد صرف اونٹ ہیں، عنقریب اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

(۲) کہ انعام کا اطلاق اکیلے اونٹ پر ہے اور جب اس کے ساتھ گائیں اور بکریاں ہوں تو بھی وہ انعام ہی ہیں۔

(۳) اور یہی زیادہ صحیح ہے اور یہ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انعام حیوانوں میں سے ہر وہ حیوان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس قول کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (المائدہ:1) (حلال کیے گئے ہیں تمہارے لیے بے زبان جانور سوائے ان کے جن کا حکم پڑھ کر سنایا جائے گا تمہیں) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حمولۃ وہ جانور ہے جو بوجھ اٹھانے اور کلام کرنے کی طاقت رکھتا ہو، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یہ لفظ اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر وہ جانور جو اپنے اوپر زندہ کو اٹھا لے چاہے وہ جانور گدھا ہو یا خچر ہو یا اونٹ ہو۔ یہ ابوزید سے منقول ہے، چاہے اس پر کوئی بوجھ ہو یا نہ ہو، جیسا کہ عنترہ نے کہا ہے:

ما رَاعَنِي إلا حمولةُ أهلِها وسط الدّيارِ تَسُفُّ حَبَّ الخِمْخِمِ

اور فعولۃ فا کے فتحہ کے ساتھ جب فاعل کے معنی میں ہو تو اس میں مذکر اور مونث دونوں برابر ہوتے ہیں، جیسے تیرا یہ قول: رجلٌ فروقة و امرأة فروقة یہ بزدل اور خوفزدہ آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

اور رجل صَرورة و امرأة صرورة جب وہ حج نہ کریں۔ اور اس کی جمع نہیں آتی اور جب یہ مفعول کے معنی میں ہو تو پھر ہا کے ساتھ مذکر و مؤنث کے درمیان فرق کیا جائے گا، جیسے الحلوبة و الرکوبة اور الحمولة (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بوجھ ہیں۔ اور رہا الحمول (ضمہ کے ساتھ بغیر ہا کے) تو اس سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر ہودج رکھے ہوئے ہوں، چاہے ان میں عورتیں ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ابوزید سے مروی ہے۔ وَّ فَرْشًا حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حمولۃ اونٹوں، گائیوں میں سے ہوتا ہے۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول کرنے والے نے اس ارشاد سے استشہاد کیا

ہے۔ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ فرمایا: ثمانیة، حمولة و فرشا سے بدل ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: حمولة سے مراد اونٹ ہیں اور الفرش سے مراد بکریاں ہیں۔

اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حمولة سے مراد ہر وہ جانور جو بوجھ اٹھائے چاہے وہ اونٹ ہو یا گائے ہو یا گھوڑا یا خچر ہو یا گدھے ہوں۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: حمولہ وہ جانور جس پر سوار ہوا جاتا ہے اور فرش وہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور دودھ پیا جاتا ہے، جیسا کہ بکریاں، اونٹوں کے بچے اور گائیوں کے بچھڑے وغیرہ۔ ان کے اجسام کی لطافت اور ان کے فرش کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کا نام فرش رکھا گیا ہے اور فرش سے مراد ایسی ہموار زمین ہے جس پر لوگ آسانی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ راجز نے کہا ہے:

أورثنی　حَمولة　و　فَرْشا　أَمُشُّها فی کل یومٍ مَشّا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَحَوَيْنَا الفَرْش من أنعامکم　والحَمُولات ورَبَّاتِ الحَجَل(2)

اصمعی نے کہا ہے: میں نے اس کی جمع نہیں سنی ہے۔ مزید کہا: اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر ہو اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہو۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فرشها الله فرشا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے بچھا دیا (پھیلا دیا)۔ اور الفرش سے مراد گھر کا وہ ساز و سامان ہے جو بکھیر دیا گیا ہو۔ اور فرش سے مراد وہ کھیتی بھی ہے جب وہ پھیل جائے اور فرش کا معنی وسیع فضا بھی ہے۔ اور الفرش فی رجل البعیر اس کا معنی ہے، اونٹ کے پاؤں میں تھوڑی سی وسعت، اور یہ محمود اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اور افترش الشئ کا معنی ہے شی کا پھیل جانا، بچھ جانا۔ اور یہ لفظ مشترک ہے اور کبھی قول باری تعالیٰ: وَّ فَرْشًا اس معنی کی طرف بھی راجع ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ان دونوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن یہ ہے کہ حمولہ سے مراد وہ جانور ہے جسے بوجھ اٹھانے کے لیے مسخر کر لیا گیا ہو اور فرش وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی جلد (کھال) اور اون کے ساتھ پیدا فرمایا ہے جس پر بیٹھا جا سکتا ہے اور اسے بچھایا جا سکتا ہے۔ اور باقی آیت پہلے گزر چکی ہے۔

ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 179　　2۔ ایضاً

"(پیدا فرمائے) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں یا جسے لیے ہوتے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم بتاؤ مجھے علم کے ساتھ اگر ہو تم سچے؟ اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا جسے لیے ہوئے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم کیا تم تھے موجود جب وصیت کی تمہیں اللہ نے اس بات کی؟ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو بہتان باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا تا کہ گمراہ کرے لوگوں کو اپنی جہالت سے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو ظالم ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ اس میں ثَمٰنِيَةَ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے اور وہ فعل أنشأ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے آٹھ جوڑے پیدا فرمائے) یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور اخفش سعید نے کہا ہے: یہ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور اخفش علی بن سلیمان نے بیان کیا ہے: اس کی نصب (فعل) کلوا کے سبب ہے، یعنی کلوا لحم ثمانیة أزواج (تم آٹھ جوڑوں کا گوشت کھاؤ)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما سے محل کے اعتبار سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس معنی میں منصوب ہو۔ معنی ہو کلوا المباح ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ (تم مباح کھاؤ (یعنی) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو) یہ آیت مالک بن عوف اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے کہا: وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو اس آیت کے سبب ان (جانوروں) پر آگاہ فرمایا جنہیں اس نے ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، تا کہ یہ ان کی طرح نہ ہو جائیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

زوج فرد کے خلاف ہے: کہا جاتا ہے: زوج (جوڑا) اور فرد (ایک) جیسا کہ کہا جاتا ہے: خسا (رذیل، گھٹیا) اور زکا (پاکیزہ، اعلیٰ) شفع (جفت) اور وتر (طاق)۔ اور ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ سے مراد آٹھ افراد ہیں۔

اور اہل عرب کے نزدیک ہر فرد دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اسے زوج کا نام دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے للذکر زوج (مذکر کے لیے زوج ہے یعنی دوسرا ہے) اور للأنثی زوج (اور مونث کے لیے زوج یعنی دوسرا ہے) اور لفظ زوج واحد اور تثنیہ (دو) کے لیے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: هما زوجان، وهما زوج جیسے کہا جاتا ہے: هما سيان وهما سواء (وہ دونوں برابر ہیں) اور آپ کہتے ہیں: اشتریتُ زوجَی حمام (میں نے کبوتر کا جوڑا خریدا) اور انت، تعنی ذکرا و انثی (اور تو اس سے مراد مذکر اور مونث لیتا ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ یعنی بھیڑ میں سے دو مذکر (نر) اور مونث (مادہ) اور الضَّاْنِ سے مراد ریوڑ میں سے اون والی ہیں یعنی بھیڑیں اور یہ ضائن کی جمع ہے۔ اس کی مونث ضائنة ہے اور جمع ضوائن آتی ہے۔ اور یہ بھی

کہا گیا ہے: یہ ایسی جمع ہے جس کی واحد نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی جمع ضئین ہے، جیسا کہ عبد کی جمع عبید ہے۔ اور اس میں ضِئین بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ شعیر میں شِعیر کہا جاتا ہے اور ضاد کو اتباعاً کسرہ دیا گیا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ لغت بصریوں کے نزدیک مسموع ہے اور کوفیوں کے نزدیک ہر اس لفظ میں جاری ہوتی ہے جس میں دوسرا حرف حرف حلقی ہو۔ اور اسی طرح معز میں بھی فتحہ اور سکون ہے۔ اور ابان بن عثمان نے من الضأن اثنان و من المعز اثنان پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں و من المعز اثنان ہے اور یہی اکثر کی قراءت ہے اور ابن عامر اور ابوعمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: کلام عرب میں اکثر المعز و الضأن بالسکون ہیں اور اس پر جمع کے بارے میں ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: معیز اور یہ معز کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عبد و عبید اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

و يَمْنَحُها بنو شَمَجَى بن جَرْم　　مَعِيزَ هُمُ حنَانَك ذا الحنَانِ(1)

اور اسی کی مثل ضأن اور ضئین ہیں۔ معز ریوڑ میں سے ضان کے خلاف ہے اور یہ بالوں اور چھوٹی دُموں والی بکریاں ہوتی ہیں اور یہ اسم جنس ہے اور اسی طرح المَعَز و المَعِیزُ و الأمعوز و المِعزی ہیں اور مَعَز کی واحد ماعز ہے، جیسے صاحب اور صَحْب، تاجر اور تجر ہیں اور مونث ماعزۃ ہے اور یہ عنز (بکری) ہے اور اس کی جمع مواعز آتی ہے۔ اور أمعز القوم کا معنی ہے ان کی بکریاں زیادہ ہو گئیں۔ اور المعاز بکریاں رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ ابومحمد فقعسی نے کہا ہے وہ دودھ کی زیادتی کی وجہ سے اونٹوں کی تعریف کرتا ہے اور زمانے کی شدت اور سختی کے حالات میں بکریوں کی فضیلت بیان کرتا ہے:

يَكِلْنَ كَيْلاً ليس بالمَمْحُوقِ　　إذْ رَضِيَ المعاز باللعُوقِ

اور معز کا معنی زمین کی صلابت اور سختی بھی ہے اور امعز ایسی سخت جگہ جہاں سنگریزے زیادہ ہوں۔ اس کا مونث معزاء ہے۔ اور استمعز الرجل فی أمرہ کا معنی ہے آدمی نے اپنے کام میں خوب محنت اور کوشش کی۔ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ یہ حرّم کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ یہ اس پر معطوف ہے اور اسی طرح اَمَّا اشْتَمَلَتْ بھی ہے اور ہمزہ وصل کے ساتھ مد کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ استفہام اور خبر میں فرق ہو جائے۔ اور ہمزہ کو حذف کرنا بھی جائز ہے کیونکہ ام استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا:

تَرُوحُ من الحَيِّ أم تَبْتَكِر

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے کہا ہے: یہ آیت مشرکین کے خلاف حجت ہے بحیرہ اور جو اس کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں ان کے بارے میں۔ اور ان کے اس قول کے بارے میں: مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا اور یہ علم میں مناظرہ کرنے کے اثبات پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ان

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 106

کے ساتھ مناظرہ کریں اور ان کے سامنے ان کے قول کا فاسد ہونا بیان فرمائیں۔ اور اس میں نظر و فکر اور قیاس کے ساتھ گفتگو کرنے کا اثبات ہے۔ اور اس میں دلیل موجود ہے کہ جب قیاس کے مقابلے میں نص آجائے تو پھر قیاس کے ساتھ بات کرنا باطل ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ "جب اس پر کوئی اعتراض (نقض) وارد ہو"۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قیاس صحیح کے ساتھ بات کرنے کا حکم دیا ہے اور انہیں ان کی علت جاری کرنے کا حکم دیا۔ اور معنی یہ ہے: آپ ان سے کہیں اگر وہ مذکر (نر) کو حرام کرتا تو پھر ہر مذکر (نر) حرام ہوتا اور اگر وہ مونث (مادہ) کو حرام کرتا تو ہر مونث (مادہ) حرام ہوتی۔ اور اگر وہ اسے حرام کرتا جو بھیڑ اور بکریوں کے رحموں کے اندر ہے، تو پھر ہر پیدا ہونے والا ان کا بچہ حرام ہوتا چاہے وہ مذکر ہو یا مونث اور وہ تمام کے تمام پیدا کیے گئے ہیں اور جب تمام کے تمام علت پائے جانے کی وجہ سے حرام ہیں، تو اس سے ان کی علت کا انتقاض اور ان کے قول کا فاسد ہونا ظاہر ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اس بارے میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب اس پر جھوٹا بہتان ہے۔

نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ مجھے علم کے ساتھ آگاہ کرو اگر تمہارے پاس ہے کہ یہ تحریم جسے تم نے اپنا رکھا ہے کہاں سے آگئی؟ اور ان کے پاس کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ کتابیں پڑھتے ہی نہیں۔

اور **وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ** اور اس کے مابعد میں گفتگو اسی طرح ہے جیسے پہلے گزر چکی ہے۔ **اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ** یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر تھے جب اس نے اسے حرام قرار دیا؟ اور جب حجت اور دلیل ان پر لازم ہوئی تو وہ بہتان تراشی میں لگ گئے اور کہنے لگے: اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ** واضح فرما دیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے، جب انہوں نے کہا: اس پر دلیل موجود نہیں۔

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾

"آپ فرمائیے: میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا (رگوں کا) بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت، کیونکہ وہ سخت گندہ ہے یا جو نافرمانی کا باعث ہو (یعنی) وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بلند کیا جائے غیر خدا کا نام پھر جو شخص لاچار ہو جائے نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو (حد ضرورت سے) تو بے شک آپ کا رب بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا** اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان چیزوں کے بارے میں بتایا ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ اور معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے جو (کتاب) میری طرف وحی کی گئی ہے میں اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے ان چیزوں کے، نہ کہ وہ جنہیں تم اپنی مرضی سے حرام قرار دیتے ہو۔ یہ

آیت مکی ہے۔ اس وقت شریعت میں سوائے ان چیزوں کے کوئی چیز حرام نہ تھی، پھر مدینہ طیبہ میں سورہ المائدہ نازل ہوئی۔ اور محرمات میں اضافہ کیا گیا جیسا کہ الْمُنْخَنِقَةُ (گلا گھونٹنے سے مرا ہوا جانور) الْمَوْقُوْذَةُ (چوٹ سے مرا ہوا جانور) الْمُتَرَدِّيَةُ (اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا جانور) النَّطِيْحَةُ (سینگ لگنے سے مرا ہوا جانور) اور شراب وغیرہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں درندوں میں سے ہر ذی ناب کو اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے سے شکار کرنے والا) کے کھانے کو حرام قرار دیا(1)۔

اس آیت کے حکم اور اس کی تاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) ایک وہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آیت مکیہ ہے اور ہر وہ حرام شے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے یا جو کتاب میں حکم آیا ہے اسے اس (آیت) کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، تو یہ حکم کی زیادتی اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس کی وساطت سے ہے۔ اہل نظر و فکر میں سے اکثر علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اکثر فقہاء اور اہل اثر نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی نظیر عورت کا اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنا ہے اس کے باوجود کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) اور اسی طرح قسم اور ایک شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ (البقرہ:282) (اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے: اکل کل ذی ناب من السباع حرام (2) (درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور کوئی شی حرام قرار نہیں دی جائے گی مگر وہی جس کا ذکر اس میں ہے۔ اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور ان سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کوئی حرام بین اور واضح نہیں مگر وہی جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت حیوانوں میں سے ہر شی کو حلال قرار دیتی ہے سوائے ان کے جن کی آیت میں استثنیٰ ہے مثلاً مردار، بہنے والا خون اور خنزیر کا گوشت، اسی لیے ہم نے کہا ہے: انسان اور خنزیر کے سوا درندوں اور تمام حیوانوں کا گوشت مباح ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: اور اسی پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام جانوروں کو حلال قرار دینے کی بناء کی ہے جن کے بارے سکوت اختیار کیا گیا ہے، سوائے ان کے جن پر کوئی دلیل دلالت کرے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس آدمی کا جواب ہے جس نے معین شی کے بارے پوچھا تو مخصوص اس کے جواب میں یہ آیت واقع ہوئی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ تحقیق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس آیت میں جو چیزیں ہیں ان کے بارے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 245
2۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 492

جواب میں انہیں ان چیزوں کے حرام ہونے کے بارے بتایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَآ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ آپ نے یہ اس حال میں کہا جو وحی کی حالت تھی اور اس کے نازل ہونے کا وقت تھا، پھر اس کے بعد دوسری چیزوں کو حرام قرار دینے کے بارے وحی کا نازل ہونا ممتنع نہیں تھا۔

اور ابن عربی نے گمان کیا ہے(1) کہ یہ آیت مدنیہ ہے حالانکہ یہ اکثر کے قول کے مطابق مکیہ ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ پر یہ اس دن نازل ہوئی جس دن آپ پر اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ (مائدہ:3) نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی ناسخ آیت نازل نہیں ہوئی لہٰذا یہ آیت محکم ہے۔ نتیجتاً انہیں ہی حرام قرار دیا جائے گا جن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اور اسی کی طرف میں بھی مائل ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ میری رائے ہے اور اسے کئی دوسروں نے بھی بیان کیا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے کہ سورۃ الانعام مکی ہے سوائے اس قول کے تین آیات تک قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ (الانعام:151) اور اس کے بعد بہت سا قرآن کریم نازل ہوا اور بہت سی احادیث بیان ہوئیں۔ اور شراب کی حرمت کا حکم مدینہ منورہ میں سورۃ المائدہ میں نازل ہوا۔ اور اس پر تمام نے اجماع کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے درندوں (2) میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے وہ مدینہ منورہ میں فرمایا۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم مدینہ منورہ میں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہوا: لَآ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علماء کے درمیان اختلاف کا سبب یہی ہے پس ایک جماعت نے ان احادیث کے ظاہر سے عدول کیا ہے جو درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کے بارے وارد ہیں، کیونکہ وہ اس آیت سے متاخر ہیں اور اس میں حصر ظاہر ہے پس اس کے مطابق عمل کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ یا تو یہ اپنے متقدم کے لیے ناسخ ہیں یا پھر یہ آیت ان احادیث پر راجح ہے۔ اور رہے وہ جو تحریم کے قائل ہیں تو ان کے لیے یہ بات ظاہر ہے اور ان کے نزدیک ثابت ہے کہ سورۃ الانعام مکی سورت ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور بلاشبہ اس آیت کے ساتھ جاہلیت کے اس نظریہ کو رد کرنے کا قصد کیا گیا ہے جس کے تحت وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام جانوروں کو حرام قرار دیتے تھے، پھر اس کے بعد بہت سے امور کو حرام قرار دیا گیا جیسا کہ پالتو گدھے اور خچروں کا گوشت وغیرہ اور درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے: جن چیزوں کا ذکر اس آیت میں ہے ان کے سوا کوئی شی حرام نہیں ہے ان کے اس قول پر یہ لازم آتا ہے کہ اسے بھی حرام قرار نہ دیا جائے جس جانور پر ذبح کے وقت عمداً اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اور اس شراب کو حلال سمجھا جائے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور انگور کی شراب کے حرام ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہونے میں اس پر واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتاب میں ایسی چیزیں پائی ہیں جن کے حرام ہونے کے بارے آپ کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 764　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراھیہ کل ذی ناب وذی مخلب، حدیث نمبر 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرف وحی کی گئی ہے اور وہ ان کے سوا ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ اور یہ ان میں سے ہیں جن کے بارے اس کے بعد قرآن نازل ہوا ہے۔ اور درندوں، گدھوں، اور خچروں کے گوشت کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں۔

پس آپ نے ایک بار کہا: یہ حرام ہیں، کیونکہ اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی موجود ہے، اور یہی آپ کا قول صحیح ہے جو کہ مؤطا میں ہے۔ اور ایک بار فرمایا: یہ مکروہ ہے اور "مدونہ" میں ظاہر قول یہی ہے، کیونکہ آیت ظاہر ہے اور اس لیے بھی کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے ان تمام کی اباحت مروی ہے اور یہی امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن دینار (1) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: ہمارے ہاں بصرہ میں حکم بن عمرو غفاری یہ کہتا رہا ہے، لیکن بحر ابن عباس نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی ہے: لَاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے درندوں کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تو آپ کو کہا گیا: ابو ثعلبہ خشنی کی حدیث ہے تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جو ہمارا رب ہے ہم اس کی کتاب کو ایسے اعرابی کی حدیث کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے جو اپنی پنڈلیوں پر پیشاب کرتا ہے۔ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ہاتھی اور شیر کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اور قاسم نے کہا ہے: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں جب انہوں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ درندوں میں سے ہر ذی ناب حرام ہے: وہ حلال ہے، اور آپ یہ آیت تلاوت فرماتیں: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا انہوں نے فرمایا کہ اگر ہنڈیا کا پانی خون کی وجہ سے زرد بھی ہو جاتا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھتے تو آپ اسے حرام قرار نہ دیتے۔ اور اس باب میں صحیح وہی ہے جو ہم نے شروع میں ذکر کر دیا ہے اور آیت کے بعد محرمات کے بارے جو کچھ بیان ہوا ہے جو سب اسی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسی پر معطوف ہے۔

اور قاضی ابو بکر بن عربی نے قبس میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے خلاف ہے جو انہوں نے احکام میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ اور ہمارے اصحاب میں سے اہل بغداد نے کہا ہے کہ جو کچھ اس کے سوا ہے وہ سب حلال ہے، لیکن درندوں کو کھانا مکروہ ہوتا ہے اور فقہاء امصار کے نزدیک ان میں سے امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور عبد الملک رحمۃ اللہ علیہم علیہ ہیں درندوں میں ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے اور یہ ممتنع نہیں ہے کہ اس قول باری تعالیٰ: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کے بعد کوئی ایسی زیادتی واقع ہو جس میں دلیل بیان ہو رہی ہو، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث (2) (کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک چیز کے ساتھ) اور آپ نے کفر، زنا اور قتل کا ذکر کیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 830 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 185

پھر ہمارے علماء نے فرمایا: بلاشبہ قتل کے اسباب دس ہیں جو دلائل سے ثابت ہیں، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بارے خبر دیتے ہیں جو آپ ﷺ تک اللہ تعالیٰ کے علم سے پہنچا اور وہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور ثابت رکھتا ہے (اور جسے چاہتا ہے) منسوخ کر دیتا ہے اور مقدر کر دیتا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(1)۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلم نے معن سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے ''کہ پرندوں میں ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا گیا ہے''(2)۔ اور پہلی روایت اصح ہے اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کو حرام قرار دینا ہی صریح مذہب ہے اور اسی کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ''الموطا'' میں عنوان بنایا جس وقت آپ نے یہ کہا: تحریم أکل کلّ ذی ناب من السباع پھر حدیث ذکر کی اور اس کے بعد آپ نے فرمایا: وھو الأمر عندنا (اور یہ حکم ہمارے نزدیک ہے) پس آپ نے یہ خبر دی کہ اثر کے ساتھ عمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ''کہ یہ آیت آپ ﷺ پر آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے'' ہمیں یہ کہنے سے نہیں روکتا کہ ان اشیاء میں سے بعض کی تحریم اس آیت کے بعد ثابت ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر کے سال منع فرمایا(3)۔ اس تاویل کے صحیح ہونے پر گندگی، بول، گندگی کے کیڑے اور گدھوں کی تحریم پر اجماع دلالت کرتا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو اس آیت میں مذکور نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **مُحَرَّمًا** ابن عطیہ نے کہا ہے: تحریم کا لفظ جب حضور نبی کرم ﷺ کی زبان اقدس پر وارد ہو تو وہ اس (معنی) کی صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ مذکور شے سے مکمل طور پر کلیۃً رک جائیں اور لغت کے اعتبار سے بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ کراہت اور اس طرح کے محل میں حد درجہ توقف کریں (رکے رہیں) اور جب اس کے ساتھ تاویل کرنے والے (مجتہدین) صحابہ کرام کی جانب سے تسلیم کا کوئی قرینہ مقترن نہیں اور ان تمام کا اجماع ہے اور احادیث کے الفاظ میں کوئی اضطراب بھی نہیں تو پھر شرعاً واجب ہے کہ اس کی تحریم حظر و منع کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور یہ خنزیر، مردار، خون کے ساتھ مل جائے اور یہی حال شراب کی تحریم کا ہے۔ اور (اگر) اس کے ساتھ احادیث کے الفاظ مضطرب ہونے کا قرینہ مقترن ہو اور ائمہ کا احادیث کا علم رکھنے کے باوجود اس میں اختلاف ہو جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(4)۔ تحقیق درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے رسول اللہ ﷺ کی نہی وارد ہے، پھر صحابہ کرام اور جو ان کے بعد ہیں ان کے درمیان ان کی تحریم میں اختلاف ہوا ہے، تو جو نظر و فکر کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198
4۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

صلاحیت رکھتا ہے اس کے لیے ان وجوہ کی بنا پر جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو اس منع پر محمول کرے جس کے تحت کراہت وغیرہ ہیں۔ اور جس کے ساتھ تاویل کا قرینہ مقترن ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھریلو گدھوں کا گوشت کو حرام قرار دینا، تو بعض صحابہ کرام جو اس وقت حاضر تھے انہوں نے یہ تاویل کی (کہ یہ حکم اس لیے دیا گیا) کیونکہ یہ نجس ہیں اور ان میں سے بعض نے یہ تاویل کی (کہ یہ اس لیے ہوا) تا کہ لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے جانور ختم نہ ہو جائیں اور بعض نے تحریم محض کی تاویل کی۔ اور امت میں ان کے گوشت کی تحریم میں اختلاف ثابت ہو گیا، تو علماء میں سے جو نظر و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو کراہت وغیرہ کے معنی پر محمول کریں اپنے اجتہاد اور قیاس کے اعتبار سے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں اور اختلاف کے سبب میں یہ حسین عقیدہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک گدھا نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ اس کا جوہر خبیث اس وقت ظاہر ہوا جب یہ مذکر گدھے پر چڑھ دوڑا اور اس سے لواطت کی، تو اس کو رجس کا نام دیا گیا ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا ہے: چوپاؤں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی جانور قوم لوط کے عمل کی مثل عمل نہیں کرتا۔ اسے ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ عمرو بن دینار نے ابو الشعثاء (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ کئی چیزیں کھاتے تھے اور کئی چیزیں چھوڑ دیتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنی حلال چیزوں کو حلال قرار دیا اور اپنی حرام چیزوں کو حرام قرار دیا، پس جس کو اس نے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام کر دیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے وہ خاموش ہے وہ عفو (معاف) ہے اور انہوں نے یہ آیت تلاوت کی قُلْ لَّاۤ اَجِدُ الآیہ یعنی وہ چیز جس کی تحریم بین اور واضح نہ ہو تو وہ اس آیت کے ظاہر کے مطابق مباح ہے۔

اور زہری نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا اور فرمایا: بلاشبہ مردار کو کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس سے جو شے نہیں کھائی جائے گی وہ گوشت ہے۔ اور رہی اس کی جلد، ہڈی، اون اور بال تو یہ سب حلال ہیں۔ اور ابو داؤد نے ملقام بن تلب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہا اور میں نے حشرات الارض (2) کی تحریم کے بارے آپ سے نہیں سنا۔ الحشرۃ کا معنی ہے زمین پر رینگ کر چلنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے مثلاً یرابیع (چوہے کی مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں کوتاہ اور پچھلی بڑی اور دم دراز ہوتی ہے) گوہ اور سیہہ اور انہیں کی طرح کے اور جانور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أكلنا الرُّبَى يا أُمَّ عمرو ومن يَكُنْ ۔۔۔ غريبا لَدَيْكُم يأكُلِ الحشرات

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 183۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، حدیث نمبر 3306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 174

یعنی جو رینگتے ہیں اور چلتے ہیں اور الدُّبی دبیۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے چوہیا۔ خطابی نے کہا ہے: ان کے اس قول لم اسمع لھا تحریما میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ مباح ہیں، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی اور نے اسے سنا ہو۔ تحقیق لوگوں نے یربوع (جنگلی چوہا) اور وبر (بلی سے چھوٹا ایک جانور ہے) اس کی جمع دبار ہے اور ان کی طرح کے حشرات کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور یربوع کے بارے میں حضرات عروہ، عطا، امام شافعی اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ نے رخصت دی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وبر میں کوئی حرج نہیں اور ابن سیرین، حکم، حماد اور اصحاب رائے نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور اصحاب رائے نے قنفذ (سیہہ) کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔

اور اس کے بارے مالک بن انس سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا۔ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے: اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سیہہ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ابوثور بھی اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور انہوں نے اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ اور اس کے بارے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الایہ تو ان کے پاس موجود ایک شخص نے کہا: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خبیثۃ من الخبائث (1) (یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے) یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے تو پھر اسی طرح ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گوہ، یربوع اور ورل (گوہ کی طرح کا ایک جانور ہے مگر اس سے بڑا ہوتا ہے) کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور آپ کے نزدیک سانپ کھانے بھی جائز ہیں بشرطیکہ انہیں ذبح کیا جائے۔ اور یہی قول ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعی کا ہے۔ اور اسی طرح اژدھا، بچھو، چوہے، غنظایہ (چھپکلی کی طرح ایک جانور) سیہہ اور مینڈک کے بارے بھی ان کا قول ہے۔

اور ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ قول کے میں زمین کے چھوٹے پرندے (یا کیڑے مکوڑے) بچھو اور کیڑے کھانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: پانی میں (ان میں سے) کسی کا مرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شہد کی مکھیوں کے بچے اور پنیر اور کھجور کے کیڑے اور انہیں کی طرح کی اور چیزیں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان کی دلیل ملقام بن تلب کی حدیث ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا ہے تو وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے۔ اور چوہیا کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے: وہ حرام نہیں ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا اور مدینہ طیبہ کے علماء کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے اور دیگر موذی جانوروں میں سے کسی شی کے کھانے کی اجازت نہیں دیتے مثلاً سانپ، چھپکلیاں، چوہے اور انہیں کے مشابہ دیگر جانور۔ اور ہر وہ شے جسے مارنا جائز ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 177

ہے اس کے نزدیک اسے کھانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ان کے نزدیک ذبح کا عمل ہو سکتا ہے۔ اور یہی قول ابن شہاب، عروہ، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک تمام وحشی درندوں میں سے کوئی شی نہ کھائی جائے گی اور نہ ہی گھریلو بلی کھائی جائے گی اور نہ ہی جنگلی کیونکہ وہ بھی درندہ ہے۔

اور فرمایا: نہ بجو کھایا جائے گا اور نہ ہی لومڑ اور چیر پھاڑ کرنے والے پرندوں کو کھانے میں کوئی حرج نہیں مثلاً گدھیں، چیلیں اور عقاب وغیرہ، وہ بھی جس نے کوئی مردار کھایا اور وہ بھی جس نے نہ کھایا۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام کے تمام پرندے حلال ہیں، مگر وہ گدھوں کو ناپسند کرتے ہیں (اور مکروہ جانتے ہیں) اور امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا جو چیر پھاڑ کرنے والے پرندے کھانا مکروہ جانتا ہو اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا انکار کیا ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا ہے'' (1)۔

اور اشہب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہاتھی کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ اسے ذبح کیا جائے۔ اور یہی امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور اس سے امام شافعی نے منع فرمایا ہے۔ اور حضرت نعمان (امام اعظم ابو حنیفہ) رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے بجو اور لومڑ کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت دی ہے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بجو کھاتے رہتے تھے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ عام نہی ہیں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے درندوں میں سے کسی درندے کو خاص نہیں کیا۔ اور بجو کو کھانے کی اباحت کے بارے میں وہ حدیث جسے امام نسائی نے روایت کیا ہے وہ ان احادیث میں سے نہیں ہے جو نہی والی حدیث کے معارض آسکتی ہو (2)، کیونکہ اس حدیث کو بیان کرنے میں عبدالرحمن بن ابی عمار منفرد ہیں اور وہ نقل علم کے ساتھ مشہور نہیں اور نہ وہ راوی ان میں سے ہے جسے حجت بنایا جاسکتا ہو جب کہ اس کے خلاف وہ ہے جو اس سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کی حدیث اسناد متواترہ سے مروی ہے۔ اور ثقہ اور انتہائی مضبوط ائمہ کرام کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے اور یہ محال ہے کہ ان کے معارض ابن ابی عمار کی حدیث کی مثل لائی جائے۔ ابو عمر نے کہا ہے: مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ بندر کھانا جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ فرمایا: اور میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اسے کھانے کی رخصت دی ہو مگر وہ روایت جسے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے ایوب سے ذکر کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بندر کھانے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ بھیمۃ الانعام میں سے نہیں ہے (یعنی وہ چوپائے جن کا گوشت کھایا جاسکتا ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے حضرت عطا سے روایت کیا ہے کہ ان سے بندر کے بارے پوچھا گیا جسے حرم پاک میں مار دیا جاتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے بارے دو عادل آدمیوں کا فیصلہ ہوگا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198

فرمایا: پس حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس کا گوشت کھانا جائز ہے، کیونکہ جزا اس پر واجب نہیں ہوتی جو شکار کے علاوہ کسی (جانور) کو قتل کردے۔

اور رویانی کی (بحر المذہب) میں ہے جو کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر ہے اور امام شافعی نے کہا ہے بندروں کی بیع کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سکھلایا جاتا ہے اور ان سے مال کی حفاظت کا نفع اٹھایا جاتا ہے اور کشفی نے ابن شریح سے بیان کیا ہے کہ اس کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تو ان سے پوچھا گیا اس سے نفع کی صورت کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ان کے ساتھ بچے خوش ہوجاتے ہیں۔

ابوعمر نے کہا ہے: کتا، ہاتھی اور تمام کے تمام ناب والے جانور میرے نزدیک بندر کی مثل ہیں اور حجت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول میں ہے نہ کہ کسی اور کے قول میں۔ تحقیق لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ عرب میں ایسا کوئی نہیں ہے جو کتے کا گوشت کھاتا ہو سوائے فقعس کی قوم کے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا جانور کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے جو غلاظت اور گندگی کھاتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹوں میں جلالہ سے مراد یہ ہے کہ اس پر سوار ہوا جاتا یا اس کا دودھ پیا جاتا ہو۔ حلیمی ابوعبداللہ نے کہا ہے: جلالہ وہ ہوتا ہے جو گندگی اور غلاظت کھاتا ہو چاہے وہ چوپایا ہو یا آزاد پھرنے والی مرغی (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

اور علماء نے کہا ہے: ہر وہ جانور جس کے گوشت میں غلاظت کی بو ظاہر ہوجائے یا اس کا ذائقہ اس میں ظاہر ہوجائے تو وہ حرام ہے اور اگر وہ ظاہر نہ ہو تو فھو حلال تو وہ حلال ہوگا۔ اور علامہ خطابی نے کہا ہے: یونہی یہ نہی تنزیہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ غلاظت کی غذا کھائے اور اس کی بو اس کے گوشت میں پائی جائے اور یہ تب ہوگا جب اس کا غالب چارہ اس میں سے ہو اور اگر وہ گھاس چرے اور وہ دانے کھائے اور اس کے ساتھ وہ گندگی میں سے بھی کوئی شی کھالیتا ہو تو وہ جلالہ نہیں ہوگا، بلاشبہ یہ آزاد پھرنے والی مرغی کی طرح ہے۔ اور اسی طرح وہ حیوان جو کبھی کبھار گندگی میں سے کوئی شی پائے لیکن اس کی غالب غذا اور چارہ اس کے سوا ہو تو اس کا گوشت کھانا مکروہ نہیں ہوگا۔

اور اصحاب الرائے، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ علیہما نے کہا ہے: اسے نہیں کھایا جائے گا یہاں تک کہ اسے کچھ دنوں تک روک کر رکھا جائے اور وہ گندگی کے علاوہ صاف چارہ کھائے، پس جب اس کا گوشت صاف اور پاک ہوجائے تو پھر اسے کھا لیا جائے۔ تحقیق حدیث میں مروی ہے کہ "گائے، بیل کو چالیس دن تک چارہ کھلایا جائے گا پھر اس کا گوشت کھایا جائے گا"۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مرغ کو تین دن تک روکتے تھے اور پھر اسے ذبح کرتے تھے۔ اور اسحاق نے کہا ہے: اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اس کے بعد کہ اس کے گوشت کو اچھی طرح دھو ڈالا جائے۔ اور حسن جلالہ کے گوشت کو کھانے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور اسی طرح امام مالک بن انس کا بھی نظریہ ہے اور اس باب میں سے یہ بھی ہے کہ زمین میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 446۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 175

گندگی پھینکنے سے منع کیا گیا ہے۔ بعض سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کی زمین کرائے پر دیتے تھے اور اس پر شرط عائد کرتے تھے جو اسے کرائے پر لیتا تھا کہ وہ اس میں گندگی نہ پھینکے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنی زمین کرائے پر دیتے تھے اور یہ شرط لگاتے تھے کہ اس میں گندگی اور غلاظت کے ساتھ کھاد نہیں ڈالی جائے گی۔

اور یہ روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی زمین میں غلاظت ڈال کر اسے کاشت کرتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو وہ ہے جو لوگوں کو وہی کھلاتا ہے جو ان سے نکلتا ہے۔

گھوڑے کا گوشت کھانے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مباح قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جہاں تک خچر کا تعلق ہے تو وہ گھوڑے اور گدھے کے درمیان سے پیدا ہوا ہے اور ان میں سے ایک کھایا جاتا ہے یا مکروہ ہے اور وہ گھوڑا ہے اور دوسرا حرام ہے اور وہ گدھا ہے پس تحریم کا حکم غالب رہے گا، کیونکہ جب حلت اور حرمت کا حکم ایک معین چیز میں جمع ہو جائے تو اس میں تحریم کے حکم کو غالب قرار دیا جائے گا۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل عنقریب سورۃ النحل میں آئے گی۔ اور مکڑی کا حکم سورۃ الاعراف میں آئے گا۔

جمہور اسلاف و اخلاف کا موقف ہے کہ خرگوش کھانا جائز ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اس کی تحریم کو بیان کیا ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ سے اس کے مکروہ ہونے کا حکم منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس اسے (خرگوش کو) لایا گیا اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے نہ کھایا اور نہ اسے کھانے سے منع فرمایا۔ اور گمان یہ ہے کہ اسے حیض آ رہا تھا۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی نے موسیٰ بن طلحہ سے مرسل روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس خرگوش لایا گیا، اسے ایک آدمی نے بھونا تھا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کا خون دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا اور اسے نہ کھایا۔ اور وہ جس کے پاس تھا اسے فرمایا: ''تم کھاؤ کیونکہ اگر میں اسے چاہتا (اور پسند کرتا) تو میں اسے کھا لیتا'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں ایسی کوئی شی نہیں ہے جو اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہو اور بلاشبہ یہ آپ ﷺ کے اس قول کی طرح ہے: ''بے شک یہ میری قوم کی زمین میں نہیں ہے کہ میں بذات خود پاؤں اور اسے عفو قرار دوں'' (2)۔

مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم مرالظہران کے مقام سے گزرے پس ہم نے ایک خرگوش کو بھگایا اور وہ سب اس کے پیچھے دوڑ پڑے تو انہوں اس پر غلبہ پا لیا (یعنی اسے پکڑ لیا) فرمایا: پس میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا یہاں تک کہ میں نے اسے پا لیا اور اسے ابوطلحہ کے پاس لے آیا اور انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی سرین اور اس کی ران رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیج دیں اور میں اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آیا تو آپ نے اسے قبول فرما لیا (3)۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198
2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 831
3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 152

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ یعنی کھانے والے پر جو اسے کھاتا ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے أُوْحی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے يَطَّعمه طا کو مشدد پڑھا ہے۔ انہوں نے يتطعمه کا ارادہ کیا اور پھر ادغام کر دیا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور محمد بن حنفیہ نے اسے فعل ماضی کے ساتھ علی طاعم طعمه پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی إلا أن تكون العين أو الجثة أو النفس ميتة (یعنی ضمیر مستتر کا مرجع ان تینوں میں سے کوئی شی ہوسکتی ہے اور یکون یا کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور میتة کو مرفوع، یعنی معنی یہ ہوگا تقع و تحدث ميتة (مردار واقع ہوگا) اور مسفوح سے مراد وہ جاری ہے جو بہہ رہا ہو اور یہ حرام کیا گیا ہے۔ اور جو اس کے سوا ہے معفو عنہ ہے۔

ماوردی نے بیان کیا ہے(1) کہ ایسا خون جو دم مسفوح (بہنے والا خون) نہ ہو اگر وہ رگوں والا ہو اور ان پر جما ہوا ہو جیسا کہ جگر اور تلی تو وہ حلال ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردے اور دو خون حلال کیے گئے ہیں''(2)۔ الحدیث۔

اور اگر وہ رگوں والا نہ ہو کہ وہ ان پر جامد ہو اور وہ گوشت کے ساتھ ہو تو اس کی تحریم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک قول ہے کہ وہ حرام ہے، کیونکہ وہ نہ تو سارا دم مسفوح ہے اور نہ بعض۔ اور بلاشبہ جگر اور تلی کی استثنا کے لیے مسفوح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ حرام نہیں ہے، اس لیے کہ تحریم مسفوح کے ساتھ مختص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے عمران بن جریر نے کہا ہے: میں نے ابومجلز سے اس گوشت کے بارے پوچھا جو خون کے ساتھ لتھڑا پڑا ہو اور ہانڈی میں خون کی سرخی اس پر غالب آ رہی ہو تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دم مسفوح (بہنے والے خون) کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے کہا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: اگر یہ آیت نہ ہوتی تو مسلمان ان رگوں کی اتباع کرتے جن کا یہودی اتباع کر رہے ہیں۔ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عرق (رگ) دماغ میں خون ہونے کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا اور مضطر (مجبور) کا حکم سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری سے ہم نے حرام کی ان پر دونوں (گائے اور بکری) کی چربی مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 181
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 182

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ جب اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر حرام فرمائیں تو اس سے پیچھے ان کا ذکر کیا جو اس نے یہودیوں پر حرام کیں، کیونکہ اس میں ان کے اس قول کی تکذیب مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی شی حرام نہیں کی، بلکہ ہم نے بذات خود اپنے اوپر ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں بنی اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ اور هَادُوْا کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ تحریم ان پر تھی جو یہودی بنے تھے بلاشبہ یہ پابندی ان پر بطور آزمائش اور سزا تھی پس ان پر جو چیزیں حرام کی گئیں ان میں سے پہلی چیز جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر ناخن والا جانور۔ حسن نے ظفر فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوالسمال نے ظِفْرٍ ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور ابوحاتم نے ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کا انکار کیا ہے اور یہ قراءت ذکر نہیں کی حالانکہ یہ ایک لغت ہے۔ ظِفِرٍ ظا اور فا دونوں کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور اس کی جمع أظفار، أظفور اور أظافیر ہے۔

علامہ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نحاس نے فراء سے یہ زیادتی بیان کی ہے أظافیر و أظافرۃ۔ ابن السکیت نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل أظفر بین الظفر جب اس کے ناخن طویل اور لمبے ہوں، جیسے کہا جاتا ہے: رجل أشعر یہ لمبے بالوں والے آدمی کو کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ چوپاؤں اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں کھلی نہ ہوں، جیسے اونٹ، شترمرغ، مرغابی اور بطخ۔ اور ابن زید نے کہا ہے: صرف اونٹ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ سے مراد اونٹ اور شتر مرغ ہے، کیونکہ شتر مرغ اونٹ کی طرح ناخن والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے والا) اور چوپاؤں میں سے ہر کھر والا جانور ہے۔ اور حافر (کھر) کو مجازاً ظفر کا نام دیا جاتا ہے۔

اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: کھر بھی ناخن ہے اور پنجہ (مخلب) بھی ناخن ہے، مگر یہ اپنی مقدار کے مطابق ہیں اور وہ اپنی مقدار پر ہے یہاں کوئی استعارہ اور مجاز نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ انہی دونوں کو ان دونوں میں سے کاٹا اور لیا جاتا ہے اور دونوں کی جنس ایک ہے، یعنی یہ نرم و ملائم ہڈی ہے۔ یہ دراصل غذا اسے بڑھتی ہے اور انسان کے ناخنوں کی مثل اسے کاٹا جاتا ہے اور اسے حافر کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ زمین پر لگنے کے وقت اسے کھودتے ہیں۔ اور اس کا نام مخلب رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی ان سوئیوں کے سروں کے ساتھ دوسرے پرندے کو زخمی کر دیتا ہے۔ اور اسے ظفر اسے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اشیاء کو اپنے ناخنوں کے ساتھ پکڑتا ہے، یعنی آدمی اور پرندہ ان کے ساتھ غلبہ پاتا اور کامیاب ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد ثرب اور گردوں کی چربی ہے۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور ثروب، ثرب کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ باریک چربی ہے جو اوجھ پر ہوتی ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر چربی حرام کر دی سوائے اس کے جو ہڈی کے ساتھ یا ہڈی پر ملی ہوئی ہو اور ان کے لیے پہلو اور چکی (لاٹ) کی چربی حلال قرار دی، کیونکہ وہ دم کی ہڈی پر ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَاۤ اس میں استثنا کی بنا پر ما محل نصب میں ہے اور ظُهُوۡرُهُمَاۤ، حَمَلَتۡ کا فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَوِ الۡحَوَايَاۤ ظهور پر عطف ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی او حملت حوایاھما اور اس پر الف لام اضافت کا بدل ہے۔ اور اس بنا پر الحوایا (آنتیں) من جملہ ان میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا۔

اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ اس میں مَا حَمَلَتۡ پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس بارے میں جو کہا گیا ہے اس میں سے یہی اصح ہے۔ اور یہی قول کسائی، فراء اور احمد بن یحییٰ کا ہے۔ اور نظر وفکر یہ ثابت کرتی ہے کہ شی کا عطف اس پر کیا جائے جو اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ورنہ اس کا معنی صحیح نہ ہوگا یا دلیل اس معنی کے سوا کسی اور پر دلالت کرے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک استثنا تحلیل میں ہے یعنی صرف وہ چربی جسے ہڈیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔ اور قولہ الۡحَوَايَاۤ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ محرم (حرام کی ہوئی شی) پر معطوف ہے۔ اور معنی یہ ہے: ان پر حرام کی گئی ہے ان دونوں کی چربی یا آنتیں یا وہ جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، سوائے اس کے جسے پشتیں اٹھائے ہوئے ہوں، کیونکہ وہ حرام نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ چربی نہیں کھائے گا تو وہ پشت کی چربی کھانے سے حانث ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے من جملہ چربی سے اس کی استثنا کی ہے جو ان کی پشت پر ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَوِ الۡحَوَايَاۤ، الۡحَوَايَاۤ: اس سے مراد مباعر (مینگنیاں نکلنے کی جگہ یعنی انتڑیاں) ہے (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔ اور مباعر، مبعر کی جمع ہے، اور ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں مینگنیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور بعر سے مراد زبل (کھاد، گوبر اور لید) ہے اور الۡحَوَايَاۤ کا واحد حاویاء ہے، جیسا کہ قاصعاء اور قواصع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حاویۃ کی جمع ہے جیسا کہ ضاربۃ اور ضوارب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حویۃ کی جمع ہے جیسا کہ سفینۃ اور سفائن ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے: الحوایا (انتڑیاں) وہ ہیں جو پیٹ میں گول گھومی ہوئی ہیں (2) اور یہ گھومنے والی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا سے مراد دودھ کے خزائن (آنتیں) ہیں اور یہ مباعر (گوبر کی انتڑیوں) کے ساتھ ملی ہوتی ہیں اور یہ مصارین (آنتیں) ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا وہ آنتیں ہیں جن پر چربی ہوتی ہے اور اس مقام کے سوا الحوایا سے مراد وہ کپڑا (یا کمبل) ہے جو اونٹ کی کوہان کے اردگرد ڈالا جاتا ہے جیسے امرؤالقیس نے کہا ہے:

جعلنَ حَوَایَا و اقۡتَعَدۡنَ قعائدا　　وحففن من حَوۡكِ العِراق المُنَمَّق

پس اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے (3) کہ اس نے ان پر یہ تحریم تورات میں لازم کی ہے یہ ان کی کذب بیانی کے رد کے لیے کہا ہے، اور اس بارے میں اس کی نص ہے: حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وکل دابۃ لیست مشقوقۃ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 110
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769

الحاضر و کل حوت لیس فیہ سفاسق، ای بیاض (تم پر حرام کر دیئے گئے ہیں مردار، خون، خنزیر کا گوشت، ہر وہ جانور جس کے کھر سامنے سے کھلے نہ ہوں اور ہر وہ مچھلی جس میں سفیدی نہ ہو) پھر اللہ تعالیٰ نے اس تمام کو حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور ان کے لیے مباح قرار دیئے وہ جو ان پر حیوانوں میں سے حرام تھے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے اس تکلیف اور مشقت کو زائل فرما دیا اور حل و حرمت اور امر و نہی کے اعتبار سے دین اسلام کے احکام لازم کر دیئے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر وہ اپنے چوپاؤں کو ذبح کریں اور انہیں کھائیں (1) جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تورات میں حلال قرار دیا ہے اور انہیں چھوڑ دیں جنہیں ان پر حرام کیا ہے تو کیا وہ (جانور) ہمارے لیے حلال ہوگا؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ حرام ہے اور سماع المبسوط میں کہا ہے: وہ حلال ہے اور یہی ابن نافع نے کہا ہے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: میں اسے مکروہ قرار دیتا ہوں۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ذبح کے وقت وہ اس کا قصد (اور نیت) نہیں کرتے، لہٰذا وہ خون کی طرح حرام ہے۔ اور دوسرے قول کی وجہ یہ ہے اور وہی صحیح ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کے ساتھ ان کی تحریم کا حکم اٹھا لیا ہے اور اب اس میں ان کا اعتقاد موثر نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ اعتقاد فاسد ہے۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے صحیح ہونے پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے صحیحین نے حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم قصر خیبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، تو کسی آدمی نے چمڑے کا ایک برتن جس میں چربی تھی پھینکا تو میں اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف اچھلا پس جب میں (دوسری طرف) متوجہ ہوا تو وہاں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے تو مجھے آپ سے حیا آگئی (2)۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم کے الفاظ ہیں: حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے خیبر کے دن چربی سے بھرا ہوا چمڑے کا ایک برتن پایا تو میں اس سے چمٹ گیا اور میں نے کہا: آج میں اس میں سے کسی کو کوئی شی نہ دوں گا، وہ فرماتے ہیں: پھر میں دوسری جانب متوجہ ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبسم فرما رہے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبسم فرمانے کا سبب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چمڑے کا برتن اٹھانے کے لیے ابن مغفل کی شدید حرص کو اور اس کے بارے شدید بخل کو دیکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نہ وہ برتن پھینک دینے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی اور عام علماء رحمہم اللہ علیہم کا مذہب یہی ہے کہ اسے کھانا جائز ہے، مگر امام مالک نے اس میں اختلاف کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

ابن منذر نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا حرام ہونا بھی بیان کیا ہے اور امام مالک کے کبار اصحاب اسی کی طرف گئے ہیں اور ان کا استدلال وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ پس اگر انہوں نے ہر ناخن والا جانور ذبح کیا تو اصبغ نے کہا ہے: کتاب اللہ میں ان کے ذبائح میں سے جو حرام ہے اسے کھانا حلال نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی تحریم کا اعتقاد

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770　2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 606

رکھتے ہیں۔ اور اشہب اور ابن القاسم نے بھی یہی کہا ہے اور ابن وہب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: جو ان پر حرام ہے، اور ہم اس کے بارے اپنی کتاب سے جانتے ہیں تو ہمارے لیے ان کے ان ذبائح کو کھانا حلال نہیں ہوگا اور جس کی تحریم کو ہم نہیں جانتے مگر ان کے اقوال اور ان کے اجتہاد سے تو ان کے ذبائح میں سے وہ ہم پر حرام نہیں ہوگا (1)۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ، ای ذالك التحریم (وہ تحریم) پس ذٰلِكَ محل رفع میں ہوا، یعنی الأمر ذالك جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ یہ ہم نے انہیں سزا دی ان کے ظلم کے بدلے، یہ ان کے لیے سزا ہے ان کے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کی وجہ سے اور انہیں الله تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے اور ان کے سود لینے اور لوگوں کے مالوں کو باطل طریقے سے حلال سمجھنے کی وجہ سے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ تحریم بلاشبہ گناہ کے سبب ہوئی، کیونکہ یہ تنگی ہے اور خوشحالی اور وسعت سے اس کی طرف مؤاخذہ کے وقت ہی پھیرا جا سکتا ہے۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بلاشبہ ہم یہود کے بارے اپنی اس خبر دینے میں سچے ہیں کہ ہم نے ان پر گوشت اور چربی حرام کر دی۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"پھر اگر وہ جھٹلائیں آپ کو تو آپ فرمائیے: تمہارا پروردگار کشادہ رحمت والا ہے اور نہیں ٹالا جا سکتا اس کا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہو"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ یہ شرط ہے اور جواب شرط یہ ارشاد گرامی ہے: فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ یعنی اس نے اپنی رحمت کے وسیع ہونے کے سبب تم سے درگزر فرمائی اور تمہیں دنیا میں کوئی سزا نہ دی۔ پھر الله تعالیٰ نے اس عذاب کے بارے خبر دی جو اس نے ان کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے اور فرمایا: وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (اور اس کا عذاب جرائم پیشہ قوم سے نہیں ٹالا جا سکتا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب الله تعالیٰ دنیا میں عذاب نازل کرنے کا ارادہ فرمالے تو پھر جرائم پیشہ قوم سے اس عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

"اب کہیں گے جنہوں نے شرک کیا اگر چاہتا الله تعالیٰ تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے کسی چیز کو۔ ایسا ہی جھٹلایا تھا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ چکھا انہوں نے ہمارا عذاب۔ آپ فرمائیے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اسے ہمارے لیے؟ تم نہیں پیروی کرتے مگر نرے گمان کی اور نہیں ہو تم مگر اٹکلیں مارتے ہو"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770

قولہ تعالیٰ: سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں۔ انہوں نے کہا: لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ سے مراد بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علم غیب کے ساتھ اس بارے میں خبر دی ہے جو وہ عنقریب کہیں گے اور انہوں نے گمان کیا کہ یہی ان کے لیے سہارا اور تھامنے کی شے ہے جب انہیں حجت نے لازم پکڑ لیا اور انہیں اس نظریہ کے باطل ہونے کا یقین ہو گیا جس پر وہ تھے۔ اور معنی یہ ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہمارے باپ دادا کی طرف رسول بھیج دیتا اور وہ انہیں شرک سے اور ان چیزوں کو حرام کرنے سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال کیا ہے، منع کرتا تو وہ اس سے باز آ جاتے، رک جاتے اور ہم بھی اس طریقہ پر ان کی اتباع و پیروی کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا رد کیا اور فرمایا: هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا یعنی کیا تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل ہے کہ یہ اسی طرح ہے؟

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ یعنی تم اس قول میں محض ظن کی پیروی کر رہے ہو۔ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (اور تم نری اٹکلیں مارتے ہو) تاکہ تم اپنے ضعیف اور کمزور لوگوں کو وہم میں مبتلا کر سکو کہ تمہارے پاس یہ حجت اور دلیل ہے۔

اور قولہ: وَلَا آبَاؤُنَا کا أَشْرَكْنَا میں نون پر عطف کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا: نحن ولا آباونا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول: وَلَا تو کید مضمر کے قائم مقام ہے، اسی لیے یہ کہنا اچھا ہے: ما قمت ولا زید

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾

"آپ فرمایئے۔ اللہ ہی کے لیے کامل دلیل ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت فرماتا تم سب کو"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ یعنی ایسی کامل دلیل جو محجوج (جس کے خلاف حجت لائی گئی) کے عذر کو ختم کر دیتی ہے اور اس سے شک کو دور کر دیتی ہے جس نے اس میں غور و فکر کی۔ پس اس کی کامل حجت اس پر ہے کہ یہ بین اور واضح ہے کہ وہ واحد اور یکتا ہے اور اس نے انبیاء اور رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا ہے، پس اس نے مخلوقات میں نظر و فکر کے ذریعے توحید کو بیان فرمایا اور معجزات کے ذریعے رسولوں کی تائید فرمائی اور اپنا امر (حکم) ہر مکلف پر لازم کیا۔ اور رہا اس کا علم، اس کا ارادہ اور اس کی کلام تو یہ غیب ہے جس پر کوئی بندہ مطلع نہیں ہو سکتا، سوائے ان رسولوں کے جنہیں وہ چن لے (پسند فرمالے) اور مکلف بنانے کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے کہ بندہ اس حیثیت میں ہو کہ اگر وہ اس کام کو کرنے کا ارادہ کر لے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا ہے تو وہ اس کے لیے ممکن اور آسان ہو۔

اور معتزلہ نے اس قول کے سبب التباس پیدا کیا ہے: لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا انہوں نے کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جنہوں نے اس کی مشیت سے شرک کیا۔ اور ان کا اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مذمت بیان کی ہے کہ انہوں نے حق کی طلب میں اپنا اجتہاد اور کوشش کر دی۔ اور بلاشبہ انہوں نے مزاح اور لہو و لعب کے اعتبار سے کیا۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ (الزخرف:20) (اور کفار کہتے ہیں کہ اگر چاہتا (خداوند) رحمٰن تو ہم انہیں نہ پوجتے) اگر وہ یہ قول تعظیم و تکریم اور اس کی معرفت کی بنا پر کہتے تو یہ

ان کے لیے عیب نہ ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا (الانعام: 107) (اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے) اور مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام: 111) (تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا) اور فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور مومن یہ کہتے ہیں: یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے بارے جانتا ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ هُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۧ

"آپ فرمائیے: لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اسے۔ پھر اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو آپ نہ گواہی دیجئے ان کے ساتھ اور نہ تم پیروی کرنا ان کی خواہشوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور جو نہیں ایمان لاتے آخرت پر اور وہ اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ یعنی آپ فرمائیے ان مشرکین کو۔ تم اس پر اپنے گواہ لاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے جسے تم نے حرام کیا ہے۔ اور هَلُمَّ یہ کسی شی کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا کلمہ ہے۔ اور اس میں اہل حجاز کے نزدیک واحد، جمع اور مذکر اور مؤنث سبھی برابر ہوتے ہیں۔ (یعنی تمام کے لیے هلم ہی استعمال ہوتا ہے) مگر نجد کی لغت میں ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: هلما، هلموا، هلمی وہ اس طرح اس کے ساتھ (تثنیہ) جمع وغیرہ کی) علامت لاتے ہیں جیسے وہ تمام افعال میں ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم اہل حجاز کی لغت پر نازل ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا (الاحزاب: 18) وہ فرماتا ہے: هلم یعنی حاضر کرو یا قریب ہو۔ اور هلم الطعام اس کا معنی ہے کھانا لاؤ۔ اور یہاں آیت میں معنی ہے: هاتوا شهدآکم (تم اپنے گواہ لاؤ) اور میم کو فتحہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے دیا گیا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں رُدَّ یا هذا، تو اس میں (دال پر) ضمہ اور کسرہ جائز نہیں۔ اور خلیل کے نزدیک دراصل ها ہے اور اس کے ساتھ لم ملا دیا گیا ہے، پھر کثرت استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس کی اصل هل ہے اور اس پر لم کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اپنے الفاظ پر ہے اور هات کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خلیل کی "کتاب العین" میں ہے: اس کی اصل هل أدم ہے یعنی هل أقصدك (کیا میں تیرا قصد کر سکتا ہوں) پھر انہوں نے اسے کثرت سے استعمال کیا یہاں تک کہ اس قول کا مقصود یہ رہ گیا (احضر) حاضر کرو) جیسا کہ تعال اس کا اصل معنی تو ہے کہ اوپر والا نیچے والے کو کہے: اور پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ اس معنی میں ہو گیا کہ نیچے والا اوپر والے کو کہتا ہے تعال۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ شَهِدُوْا یعنی اگر ان میں سے بعض بعض کی شہادت دے دیں۔ فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ تو تم ادا شہادت کی

تصدیق نہ کرو سوائے کتاب اللہ کے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے اور ان کے پاس ان میں سے کوئی شی نہیں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے: آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو کچھ حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر (وہ یہ) کہ نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی (کے خوف) سے ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا ہے اللہ نے سوائے حق کے یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے جن کا تا کہ تم (حقیقت کو) سمجھو۔ اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور پورا کرو ناپ اور تول انصاف کے ساتھ ہم نہیں تکلیف دیتے کسی کو مگر اس کی طاقت کے برابر اور جب بھی بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ ہو (معاملہ) رشتہ دار کا اور اللہ تعالیٰ سے کیے وعدہ کو پورا کرو، یہ ہیں وہ باتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔ اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا، سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کر دیں گے تمہیں اللہ کے راستہ سے، یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں جن کا تا کہ تم متقی بن جاؤ''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ آؤ اور پڑھو جو یقیناً حق ہے جیسا کہ میرے رب نے میری طرف وحی فرمایا ہے، نہ یہ ظن ہے اور نہ ہی کذب جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، پھر اسے بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: تعال یعنی آگے آؤ اور عورت کے لیے تعالی تثنیہ مذکر و مؤنث کے لیے تعالیا اور جمع مذکر کے لیے تعالوا اور جمع مونث کے لیے تعالین کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب: 28) (تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں) اور انہوں نے تقدم کو تعالیٰ اور ارتفاع (بلند ہونا اور چڑھنا) کی ایک قسم قرار دیا ہے، کیونکہ

مامور بالتقدم فی الاصل اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہے گویا کہ وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسے کہا گیا: تعال، ای إرفع شخصك بالقیام و تقدم (یعنی اٹھ اور آگے آ) اور انہوں نے اس میں وسعت رکھ دی ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے ٹھہرنے والے کے لیے استعمال کیا ہے، یہ ابن الشجری نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مَا حَرَّمَ اس میں مَا خبر یہ ہے اور اَتْلُ کے سبب محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہے: آؤ میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ پس اگر عَلَيْكُمْ، حَرَّمَ کے ساتھ معلق ہو تو پھر وجہ یہ ہے، کیونکہ یہ قریب ترین ہے اور یہ بصریوں کی پسند ہے۔ اور اگر تم اسے اَتْلُ کے ساتھ معلق کرو تو یہ جید اور عمدہ ہے، کیونکہ وہ اسبق اور پہلے ہے۔ اور اسے ہی کوفیوں نے اختیار کیا ہے۔

اور اس قول میں تقدیر عبارت یہ ہے أتل علیکم الذی حرم ربکم، ألا تشرکوا یہ محل نصب میں ہے اور اس میں پہلے لفظ اوّل کے ساتھ فعل مقدر ہے، یعنی أتل علیکم ألا تشرکوا یعنی میں تم پر تلاوت کرتا ہوں کہ شرک کرنا حرام ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اس فعل اغرا کے سبب منصوب ہو جو عَلَيْكُمْ میں ہے اور عَلَيْكُمْ اپنے ماقبل سے منقطع ہو، یعنی علیکم ترك الاشراك، وعلیکم إحسانا بالوالدین (تم پر شرک کو ترک کرنا لازم ہے اور تم پر والدین کے ساتھ احسان کرنا لازم ہے) اور یہ کہ تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو اور یہ کہ تم بے حیائی کے نزدیک نہ جاؤ، جیسا کہ تم کہتے ہو: علیك شأنك، ای إلزم شأنك (اپنے کام کو لازم پکڑ)

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدہ: 105) (تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کو دیکھو) یہ سب ابن شجری نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ ان محل نصب میں ہو اور وہ ما سے بدل ہو۔ یعنی أتل علیکم تحریم الاشراك (میں تم پر شرک کی تحریم کا حکم تلاوت کرتا ہوں) اور فراء نے اختیار کیا ہے کہ لا نہی کے لیے ہے، کیونکہ اس کے بعد ولا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ تمام مخلوق کو ان چیزوں کے بارے تلاوت سننے کی دعوت دیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔ اور اسی طرح آپ کے بعد علماء پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو تبلیغ کریں اور ان کے لیے وہ چیزیں بیان کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں میں سے حرام قرار دیں ہیں جو اس نے حلال فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران: 187) (کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو)۔ اور ابن المبارک نے ذکر کیا ہے: ہمیں عیسیٰ بن عمر بن عمرو بن مرہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے انہیں بتایا اور کہا کہ ان کے ہمنشین ربیع بن خثیم نے کہا: کیا تجھے یہ بات خوش کرے گی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحیفہ لایا جائے جس کی مہر نہیں توڑی گئی؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس یہ پڑھو قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ، پس انہوں نے تین آیات کے آخر تک پڑھا۔ اور حضرت کعب الاحبار نے کہا ہے: یہ آیت تو تورات کا آغاز ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ الآیہ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ وہ محکم آیات

ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں کیا ہے اور ان پر تمام مخلوق کے ادیان کا اجماع ہے اور وہ کسی دین میں بھی منسوخ نہیں ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیے گئے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا والدین کے ساتھ احسان کرنے کا مفہوم ہے ان کے ساتھ نیکی کرنا، ان کی حفاظت کرنا، انہیں (تکلیف اور رنج والم سے) بچانا، ان کے حکم کی تعمیل کرنا، ان سے غلامی کو زائل کرنا اور ان پر رعب داب اور غلبہ نہ پانا۔ اور اِحْسَانًا مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اس کا ناصب اس کا ہم لفظ فعل مضمر ہے۔ تقدیر کلام ہے وأحسنوا بالوالدين إحسانا۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ املاق کا معنی فقر و افلاس ہے یعنی تم فقر و افلاس کے خوف سے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہ کرو، کیونکہ میں تمہارا اور ان کا رازق ہوں۔ تحقیق ان میں ایسے ہی تھے جو فقر و افلاس کے ڈر سے بچیوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے تھے، جیسا کہ ظاہر آیت دلالت کرتی ہے۔ أملق بمعنی إفتقر (فقیر ہونا) ہے اور املقه بمعنی افقره (اس نے اسے مفلس کر دیا) یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ نقاش نے مورج سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: املاق کا معنی لغت لخم کے مطابق بھوک ہے۔

اور منذر بن سعید نے ذکر کیا ہے کہ املاق کا معنی انفاق (خرچ کرنا) ہے کہا جاتا ہے: أملق ماله بمعنی أنفقه (یعنی اس نے اپنا مال خرچ کیا) اور یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو فرمایا: أملقي من مالك ما شئت (اپنے مال میں سے تو جو چاہے خرچ کر) اور رجل ملق وہ آدمی جو اپنی زبان سے وہ کچھ دیتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ پس الملق لفظ مشترک ہے اس کا بیان اپنے محل میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں جو عزل سے روکتے ہیں، کیونکہ زندہ درگور کرنا موجود فرد اور نسل کو اٹھانا اور ختم کرنا ہوتا ہے اور عزل اصل نسل کا انکار ہوتا ہے لہٰذا یہ اس کے مشابہ ہو گیا، مگر ایک نفس کو قتل کرنا (مارنا) بہت بڑا گناہ اور انتہائی قبیح اور برا فعل ہے۔ اسی لیے ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: بے شک عزل کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ذالك الوأد الخفي (1) وہ (عزل کرنا) وأد خفی ہے یعنی یہ خفیہ زندہ درگور کرنا ہی ہے) تو یہ کراہت ہے نہ کہ تحریم اور صحابہ کرام کی ایک جماعت اور دوسروں نے بھی یہ کہا ہے۔ اور عزل کی اباحت کے بارے میں بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت، تابعین اور فقہاء کا قول ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا عليكم ألا تفعلوا فانما هو القدر (2) یعنی تم پر کوئی حرج نہیں اس بارے میں کہ تم نہ کرو (بلاشبہ یہ تقدیر ہے) تحقیق اس سے حسن اور محمد بن مثنی نے یہ سمجھا ہے کہ یہ عزل کے بارے میں نہی اور زجر و توبیخ ہے۔ اور پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وإذا اراد الله خلق شئ لم يمنعه شئ (3) (اور جب اللہ تعالیٰ کسی شی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمالے تو کوئی شی اسے نہیں روک سکتی) امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: آزاد عورت کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل جائز نہیں ہوتا، گویا انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 466　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 464　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 465

انزال کو عورت کی لذت کی تکمیل دیکھا ہے اور اسے بچے کے بارے میں عورت کے حق میں سے قرار دیا ہے اور اگر موطوءہ لونڈی ہو تو اس کے بارے ان کا یہ خیال نہیں، کیونکہ آدمی اس کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل کر سکتا ہے، کیونکہ اس کا ذکر کردہ چیزوں میں سے کسی شی میں کوئی حق نہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے۔ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ (الانعام:120) (اور ترک کر دو ظاہری گناہ کو اور چھپے ہوئے کو) پس اس کا قول مَا ظَهَرَ گناہوں اور معاصی کی تمام انواع سے نہی اور روکنا ہے۔ اور وَ مَا بَطَنَ سے مراد مخالفت کا وہ نظریہ اور اعتقاد جو دل میں پختہ ہو جائے۔ اور ظہر وبطن دو حالتیں ہیں جو مکمل طور پر اشیاء کی ان تمام اقسام کو محیط ہیں جو اس کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اور مَا ظَهَرَ، الْفَوَاحِشَ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور وَ مَا بَطَنَ اس پر معطوف ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، النَّفْسَ میں الف لام تعریف جنس کے لیے ہے، جیسا کہ ان کے اس قول میں ہے: أهلك الناسَ حُبُّ الدرهم والدينار اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (المعارج:19) (ان مثالوں میں الناس اور الْاِنْسَانَ پر الف لام تعریف جنس کے لیے ہے) کیا آپ دیکھتے نہیں کہ رب کریم کا ارشاد ہے: اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ (المعارج) (سوائے نمازیوں کے) اور اسی طرح ارشاد گرامی ہے: وَ الْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (العصر) (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) کیونکہ آگے فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (العصر:3) (سوائے ان کے جو ایمان لائے) تو یہ آیت اس نفس کو قتل کرنے کے بارے میں نہی ہے جسے حرام کیا گیا ہے، چاہے وہ مومن ہو یا ان کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہو مگر اس حق کے ساتھ جو اس کے قتل کو واجب کرتا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پس جس نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے'' (1)۔

اور اس حق میں کئی امور ہیں: ان میں سے زکوٰۃ کا انکار کرنا اور نماز کو ترک کرنا بھی ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کیا۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ (التوبہ:5) (پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ولا يحلُّ دمُ امرئٍ مسلمٍ إلا بإحدى ثلاث الثيب الزاني والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة (2) (مسلم آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے ثیبہ عورت جو زنا کرے، نفس کو نفس کے بدلے (ایک آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے گا) اور جماعت سے الگ ہو کر اپنے

1۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 89
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3621

دین کو ترک کرنے والا (یعنی مرتد ہونے کے سبب وہ واجب القتل ہو جائے گا)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منھما (1) (جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ (2) (جسے تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کا عمل کرتا ہے تو تم فاعل اور مفعول بہ کو قتل کر دو) عنقریب اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا الآیہ (المائدہ: 32) (بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے کہ انہیں (چن چن کر) قتل کیا جائے)۔

اور مزید فرمایا: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا الآیہ (الحجرات: 9) (اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو) اور اسی طرح وہ آدمی جس نے مسلمانوں کا عصا توڑا اور ان میں سے کسی جماعت کے امام کی مخالفت کی اور ان کے کلمہ (قول) کو متفرق کر دیا اور اہل و مال کو اچک کر زمین میں فساد برپا کر دیا اور حاکم وقت کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا، پس رب کریم کے ارشاد اِلَّا بِالْحَقِّ کا یہی معنی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: المؤمنون تتکافأ دماؤھم ویسعی بذمتھم ادناھم لا یقتل مسلم بکافر ولا ذو عھد فی عھدہ ولا یتوارث اھل ملتین (3) (مومنین کے خون کا بدلہ لیا جائے گا اور ان کے ادنیٰ اپنی ذمہ داری کے لیے کوشش کریں گے کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی ذمی کو اس کے عہد کے دوران قتل کیا جائے گا اور علیحدہ علیحدہ دو دین رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے)۔ ابوداؤد اور نسائی نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: من قَتَلَ معاھدا فی غیر کُنْھِهٖ حَرَّمَ اللہ علیہ الجنۃ (جس نے کسی ذمی کو بلاوجہ قتل کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی۔

اور ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے فرمایا: من قَتَلَ رجلاً من أھل الذمۃ لم یجد ریح الجنۃ وان ریحھا لیوجد من مسیرۃ سبعین عاما (4) (جس نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کیا وہ جنت کی ہوا نہیں پائے گا اور بلاشبہ اس کی ہوا ستر برس کی مسافت سے پائی جائے گی)

اور بخاری شریف میں اس حدیث میں ہے: ''بے شک اس کی ہوا (خوشبو) چالیس برس کی مسافت سے پائی جائے گی'' (5)۔ آپ نے اسے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 128
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، کتاب الفرائض، حدیث 2523۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6745
5۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1021

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِکُمْ یہ ان محرمات کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں کاف اور میم خطاب کے لیے ہیں اور ان دونوں کا اعراب میں کوئی حصہ نہیں۔ وَصّٰىكُمْ بِهٖ وصیت سے مراد وہ امر (حکم) ہے جو مؤکد اور مقرر ہو۔ اور کاف اور میم محل نصب میں ہیں، کیونکہ یہ ضمیر ہے جو مخاطب کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اور وحی میں ضمیر فاعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مطر الوراق نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں پر اوپر سے جھانک کر دیکھا اور فرمایا: تم کس بنا پر مجھے قتل کرتے ہو؟ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے وہ آدمی جس نے محصن ہونے کے بعد زنا کیا تو اس پر رجم کی سزا ہے یا جس نے عمداً کسی کو قتل کیا تو اس پر قصاص ہے یا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تو اس پر قتل کی سزا ہے'' (1)۔ تو قسم بخدا! نہ میں نے زنا کیا ہے زمانہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں اور میں نے کسی کو قتل نہیں کیا کہ اس کے بدلے میری جان لی جائے (یعنی مجھے قصاصاً قتل کیا جائے) اور نہ میں مرتد ہوا ہوں جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، بلاشبہ میں شہادت دیتا ہوں لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله، یہ جو میں نے تمہارے لیے ذکر کیا ہے اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم (حقیقت کو) سمجھو (2)۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جس میں اس کا فائدہ ہو اور یہ اس کے اصل مال کی حفاظت کرنا اور اس کے فروع میں اضافہ کرنا ہے۔ اور اس میں یہی سب سے اچھا قول ہے، کیونکہ یہ جامع قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی اس میں تجارت کرنے کے ساتھ اور نہ تو اس سے خریدے اور نہ قرض لے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ یعنی یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور یہ کبھی بدن میں ہوتی ہے اور کبھی معرفت و پہچان میں تجربہ کے ساتھ اور دونوں وجہوں کا حصول ضروری ہے، کیونکہ یہاں اَشُدّ کا لفظ مطلق واقع ہوا ہے، حالانکہ سورۃ النساء میں یتیم کے حال کا بیان مقید آیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی)۔

پس یہ قوت بدن اور وہ بلوغ النکاح ہے اور قوت معرفت اور وہ ایناس الرشد ہے دونوں کو جامع ہے اور اگر یتیم کو اپنے مال پر معرفت حاصل ہونے سے پہلے اور قوت بدنیہ حاصل ہونے کے بعد قدرت اور اختیار دے دیا جائے تو وہ یقیناً اسے اپنی شہوات میں ضائع کر دے اور پھر وہ ایسا نادار اور مفلس باقی رہ جائے جس کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا۔ اور اس شرط کے ساتھ یتیم کو خاص اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں اور آباء اپنے بیٹوں کے پاس موجود نہیں ہوتے پس باپ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 485

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب الاما یامر بالعفوفی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ۔ کتاب الحدود باب لایحل دم امرئ مسلم الا فی ثلاث۔ حدیث نمبر 2523، ایضاً

کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا (اور جھوٹ بولنا) بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ اور جوانی کی عمر تک پہنچنا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو بغیر احسن طریقہ کے اس کے مال کے قریب جانے کو مباح قرار دیتا ہو یا کیونکہ بالغ کے حق میں حرمت ثابت ہے۔ اور یتیم کو خاص طور پر ذکر اس لیے کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے جھگڑا کیا ہے (اور وہ غالب ہے) اور معنی یہ ہے کہ تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو ہمیشہ کے لیے بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور کلام میں حذف ہے: فإذا بلغ أشُدَّہٗ و أونس منه الرُّشدُ فادْفعُوا إليه ماله (یعنی جب وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اور اس سے دانائی مانوس ہو جائے تو تم اسے اس کا مال دے دو)۔

اور علماء نے یتیم کے جوانی کی عمر کو پہنچنے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس ابن زید نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا مراد ہے۔ اور اہل مدینہ نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا اور اس کا رشد و ہدایت سے مانوس ہونا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے مراد اس کا پچیس برس کی عمر کو پہنچنا ہے۔

ابن عربی نے کہا (1) ہے: تعجب ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ پر کہ وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مقدارات قیاسی اور نظری طور پر ثابت نہیں ہوتیں بلکہ یہ نقلی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ اور آپ انہیں احادیث ضعیف سے ثابت کرتے ہیں، لیکن وہ دار الضرب (بغداد) میں سکونت پذیر ہیں پس ان کے پاس مدلس راوی کثیر ہیں اور اگر وہ معدن (مدینہ منورہ) میں سکونت پذیر ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقدر بنایا تو پھر ان سے دین کے خالص مسائل کے سوا کچھ صادر نہ ہوتا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ادھیڑ عمر کی انتہا، اس میں یہ کہ اس میں جوانی کی قوتیں جمع ہو چکی ہوں، جیسا کہ سحیم بن وثیل نے کہا ہے:

أخُو خمسين مُجْتَمِعٌ أشُدِّی ونَجَّذَنِی مُدَاوَرَةُ الشُّئُونِ

اس میں نجذنی دال اور ذال دونوں کے ساتھ مروی ہے اور الأشدّ واحد ہے اس کی جمع نہیں۔ لہٰذا یہ الآنک کے قائم مقام ہے۔ جس کا معنی سیسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا واحد شد ہے، جیسا کہ فلس اور افلس ہے اور اس کی اصل شدّ النہار یعنی دن چڑھ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أتيتُه شد النهار و مد النهار (میں اس کے پاس آیا اس حال میں کہ دن چڑھ چکا تھا اور پھیل گیا تھا۔ اور محمد بن محمد الضبی عنترہ کا شعر کہتا ہے:

عَهْدِی به شدَّ النهار كأنما خُضِبَ اللَّبانُ ورأسهُ بالعِظْلِمِ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تُطيف به شَدَّ النهار ظَعِينةٌ طويلةُ أنقاءِ اليدَيْن سَحُوق

اور سیبویہ کہتے ہیں: اس کا واحد شِدّۃ ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور معنی میں یہی اچھا اور حسین ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: بلغ الغلام شِدّته (بچہ اپنی جوانی کو پہنچ گیا) لیکن فِعْلہ کی جمع أفْعُل کے وزن پر نہیں آتی اور رہا انعم تو یہ نُعم کی جمع ہے۔ یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 271

2۔ یہ ابن عربی کی جانب سے امام ابوحنیفہ پر تشدید ہے حالانکہ ادلہ کو پیش نظر رکھا جائے تو امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ائمہ کے نقطہ نظر پر فائق ہوتا ہے۔

ان کے اس قول سے ہے: یوم بؤس (تکلیف دہ اور تنگ دن) اور یوم نُعْم (خوشحال دن) اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا ہے کہ اس کی واحد شدّ ہے، جیسا کہ کلب اور اکلب ہے اور اس کی واحد شدّ ہے مثل ذئب اور اذئب تو بلاشبہ یہی قیاس ہے، جیسا کہ وہ ابابیل کی واحد میں کہتے ہیں: أبول یہ عجول پر قیاس ہے اور یہ کوئی ایسی شی نہیں ہے جو عربوں سے سنی گئی ہو۔ ابوزید نے کہا ہے: اصابتنی شُدّٰی یہ فعلی کے وزن پر ہے، ای شِدّۃ (مجھے تکلیف آپہنچی ہے اور فعلی کے وزن پر ہے اور اشد الرجل (تب کہا جاتا ہے) جب اس کے پاس طاقتور سواری کا جانور ہو۔

مسئلہ نمبر 12 ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ یعنی بیع وشراء کرتے وقت لینے دینے میں عدل کے ساتھ ناپ اور تول پورا پورا کرو۔ اور القسط کا معنی عدل ہے۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اور ہم ناپ تول پورا کرنے میں کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ اوامر بلاشبہ انہی چیزوں میں ہیں جو حفاظت اور پرہیز کے اعتبار سے انسان کی قدرت واختیار کے تحت واقع ہیں۔ اور ایسا تفاوت اور فرق جو دو ناپوں کے درمیان اس طرح ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو اور نہ وہ آدمی کی قدرت اور اختیار کے تحت داخل ہو تو وہ معاف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کیل بمعنی مکیال (یعنی پیمانہ جس کے ساتھ ماپ کیا جاتا) ہے۔

کہا جاتا ہے: ھذا کذا و کذا كَيْلًا یہ ناپ کے اعتبار سے اتنا اتنا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر میزان کا عطف کیا گیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے بارے میں یہ جان لیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ اس بات سے تنگ دل ہیں کہ وہ خوشی کے ساتھ کسی کو وہ شی بھی دیں جو دنیا میں ان پر لازم اور ضروری نہیں تو اس نے دینے والے کو یہ حکم فرمایا کہ وہ صاحب حق کا وہ حق پورا پورا ادا کرے جو اس کا بنتا ہے اور اسے زیادہ دینے کا پابند نہیں فرماتا، کیونکہ زیادتی اس پر گراں گزرے گی اور اس کا دل تنگ ہوگا۔ اور صاحب حق کو حکم فرمایا کہ وہ اپنا پورا پورا حق وصول کرلے اور اسے اپنے حق سے کم مقدار پر راضی ہونے کا پابند نہیں کیا، کیونکہ اس نقصان اور کمی میں اس کا دل تنگ ہوگا۔

اور موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی قوم میں کبھی خیانت ظاہر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے اور کسی قوم میں زنا عام نہیں ہوتا مگر اس میں موت بڑھ جاتی ہے اور کوئی قوم ناپ تول میں کمی نہیں کرتی مگر ان سے رزق کاٹ لیا جاتا ہے (یعنی ان کا رزق کم کردیا جاتا ہے) اور کوئی قوم بغیر حق کے (بے انصافی کے ساتھ) فیصلے نہیں کرتی مگر ان میں قتل وغارت عام ہوجاتی ہے اور کوئی قوم وعدہ خلافی نہیں کرتی مگر ان پر دشمن کو مسلط کردیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ تم عجمیوں کے گروہ ہو تمہیں ایسے دو امروں کا والی اور پابند بنایا گیا ہے جن کے سبب تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوگئے اور وہ ناپ اور تول ہیں۔

مسئلہ نمبر 13 ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا یہ ارشاد احکام اور شہادات تمام کو متضمن ہے۔ وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اگرچہ وہ حق تمہارے کسی قرابت دار پر ہو، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا یہ ان تمام وعدوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لے رکھے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عقد ہوں جو دو آدمیوں کے

درمیان طے پاتے ہیں۔ اور اس عہد کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت اور اسے وفا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (تا کہ تم نصیحت حاصل کرو)

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ یہ بہت عظیم آیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ماقبل پر عطف کیا ہے، کیونکہ جب اس نے پہلے نہی اور امر بیان کیا تو یہاں اپنے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع و پیروی کرنے سے ڈرایا اور اس میں اپنے راستے کی اتباع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، جیسا کہ ہم اسے احادیث صحیحہ اور اقوال سلف کے ساتھ بیان کریں گے۔

وَ اَنَّ یہ محل نصب میں ہے ای واتل أنّ هٰذَا صِرَاطِیْ (اور میں تلاوت کرتا ہوں کہ یہ میرا راستہ ہے) اور فراء اور کسائی سے منقول ہے۔ امام فراء نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو یعنی وَصّٰىكُمْ بِهٖ وبأنّ هٰذَا صِرَاطِیْ (اس نے تمہیں حکم دیا ہے اس کے بارے اور اس کے بارے کہ یہ میرا راستہ ہے) اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے: ولأنّ هٰذَا صِرَاطِیْ (کیونکہ یہ میرا راستہ ہے) جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (الجن: 18) (یعنی ولأنّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہ)۔

اور اعمش، حمزہ اور کسائی نے وإنّ هذا ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی ان آیات میں جو ذکر کیا گیا ہے وہی میرا سیدھا راستہ ہے۔

ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے وانْ هذا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور ان مخففہ مشددہ کی مثل ہی ہے۔ مگر یہ کہ اس میں ضمیر قصہ اور شان ہے۔ ای وانه هذا اور یہ محل رفع میں ہے۔ اور محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ زائدہ ہو اور تاکید کے لیے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ (یوسف: 96) اور الصراط سے مراد وہ راستہ ہے جو دین اسلام ہے۔ مُسْتَقِیْمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا معنی ہے ہموار اور سیدھا جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اور اپنے اس راستے کی اتباع و پیروی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا جسے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر راستہ قرار دیا اور اسے شریعت بنایا اور اس کی انتہا جنت میں ہے۔ اور اس سے متفرق راستے نکلتے ہیں پس جو سیدھے راستے پر چلتا گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے ان راستوں کی طرف نکل گیا تو انہوں نے اسے جہنم تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (اور تم اور راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اس راستے سے ایک طرف کر دیں گے)۔ داری ابو محمد نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان، حماد بن زید اور عاصم بن بہدلہ نے خبر دی ہے حضرت ابو وائل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمارے لیے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر فرمایا هذا سبيلُ الله (یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے) پھر اس کی دائیں جانب بھی خطوط کھینچے اور اس کی بائیں جانب بھی۔ پھر فرمایا هذه سُبُلٌ على كل سبيل منها شيطان يدعو اليها (1) (یہ راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے اور وہ اس کی طرف بلاتا ہے)۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 91

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اور اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس تھے (1) تو آپ ﷺ نے ایک سیدھا خط کھینچا اور دو خط اس کی دائیں جانب اور دو خط اس کی بائیں کھینچے، پھر اپنا دست مبارک درمیان والے خط پر رکھا اور فرمایا: ھذا سبیلُ اللہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ اور یہ راستے یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، تمام اہل ادیان، اہل بدعت، خواہش اور نفس پرستوں کی جملہ گمراہیوں اور فروعات میں شذوذ اور علاوہ ازیں انتہائی گہرائی میں غواصی کرنے والوں کی جانب سے علم کلام میں جدل و مناظرہ وغیرہ سبھی کو شامل ہیں۔ یہ سب کے سب صراط مستقیم سے بھٹکنے کا ذریعہ ہیں اور سوء اعتقاد کا وہم پیدا کرنے والے ہیں۔ یہ ابن عطیہ نے کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے۔ علامہ طبری نے کتاب آداب النفوس میں ذکر کیا ہے: محمد بن عبدالاعلیٰ صنعانی نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے بتایا کہ ہمیں محمد بن ثور نے معمر سے اور انہوں ابان سے نقل کیا ہے کہ کسی آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: صراط مستقیم کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: حضور نبی رحمت محمد مصطفی ﷺ نے ہمیں اس کے قریب چھوڑا ہے اور اس کی ایک طرف جنت میں ہے اور اس کی دائیں جانب بھی راستے ہیں اور اس کی بائیں جانب بھی راستے ہیں اور وہاں لوگ ہیں جو اپنے پاس سے گزرنے والے کو بلاتے ہیں، پس جس نے ان راستوں میں سے کسی کو اختیار کر لیا تو وہ اسے جہنم تک پہنچا دے گا اور جو سیدھے راستے پر چلتا گیا تو وہ اس کے سبب جنت تک پہنچ جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الآیہ۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم علم سیکھ لو اس سے پہلے کہ اسے قبض کر لیا جائے اور اس کا قبض کرنا یہ ہے کہ اہل علم اٹھ جائیں (فوت ہو جائیں) خبردار! تم کلام میں غلو کرنے، اس کی انتہائی گہرائی تک پہنچنے (یا چرب زبانی سے باتیں کرنے) اور بدعت سے بچو، اور تم پر قدیم اوّل (ابتدائی پرانا دین) کو پکڑنا لازم ہے۔

اسے دارمی نے روایت کیا ہے: تعلموا العلم قبل أن یُقبض، وقبضه أن یذهب أهله، الا وإیاکم والتَّنَطُّعَ والتعمق والبدع وعلیکم بالعتیق اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد بدعتیں ہیں۔ ابن شہاب نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا، الآیہ (الانعام: 159) (بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ) پس بھاگو بھاگو اور نجات پاؤ نجات پاؤ اور صراط مستقیم اور مضبوط طریقے کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو یہ وہی ہے جس پر سلف صالحین چلے اور یہی نفع بخش تجارت ہے۔

ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما أمرتکم به فخذُوه وما نهیتُکم عنه فانتهوا (2) (میں جس چیز کے بارے تمہیں حکم دوں تم اسے لے لو اور جس سے میں تمہیں منع کروں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ، جلد 1، صفحہ 3
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التفسیر، جلد 1، صفحہ 2

اس سے رک جاؤ)۔ اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسا وعظ فرمایا کہ اس سے آنکھیں (آنسوؤں سے) بہہ پڑیں اور اس سے دل خوفزدہ ہو گئے، تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک یہ تو الوداع کہنے والے کا وعظ ہے، تو ہماری حفاظت کے لیے کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تمہیں ایک روشن اور واضح دین پر چھوڑا ہے اس کی رات اس کی دن کی مثل ہے۔ جو بھی میرے بعد اس میں بھٹک جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، تم میں سے جو زندہ رہا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا پس تم پر اسے اختیار کرنا لازم ہے جسے تم میری سنت سے اور میرے بعد خلفائے راشدین مہدیین کی سنت سے پہچانو اس پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ۔ اور ایسے امور سے بچو جو نئے اختراع کیے گئے ہوں، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور تم پر اطاعت لازم ہے اگرچہ (امیر) حبشی غلام ہی ہو، کیونکہ مومن نکیل ڈالے گئے اونٹ کی طرح ہے کہ اسے جہاں چلایا جائے وہ پیروی کرتا ہے'' (1)۔ اسے ترمذی نے اسی معنی کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

قد ترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها لا یزیغ عنها بعدی إلاهالك من یعش منکم فسیری إختلافا کثیرا فعلیکم بما عرفتم من سنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین بعدی عضوا علیها بالنواجذ وإیاکم والأمور المحدثات فإن کل بدعة ضلالة و علیکم بالطاعة وإن عبدا حبشیا فإنما المؤمن کالجمل الأنف حیثما قید انقاد۔ (2)

اور ابو داؤد نے روایت بیان کی ہے (3) کہ ابن کثیر نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابو سفیان نے خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ کسی آدمی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف خط لکھا اور تقدیر کے بارے آپ سے دریافت کیا، تو آپ نے اس کی طرف لکھا: أما بعد! فإنی أوصیك بتقوی الله والا قتصاد فی أمرہ واتباع سنة رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وترك ما أحدث المحدثون بعد ما جرت به سنته، و کفوا مؤونته فعلیك بلزوم الجماعة فإنها لك باذن الله عصمة الخ۔

(میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے معاملہ میں میانہ روی کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنے کی نصیحت کرتا ہوں، اور انہیں ترک کرنے کی جو مبتدع لوگوں نے ایجاد کی ہیں اس کے بعد کہ ان کے بارے سنت موجود ہے اور اس کی مشقت (اور معاونت) سے باز رہو، پس تجھ پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہے کیونکہ وہ تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے حفاظت اور بچاؤ ہے۔ پھر تو جان لے کہ لوگوں نے کسی بدعت کو ایجاد نہیں کیا مگر اس سے پہلے کوئی ایسی شی گزر چکی ہو جو اس پر دلیل ہو یا اس میں اس کا قیاس ہو، کیونکہ سنت کو سنت اس نے قرار دیا ہے جو اس کے خلاف خطا اور غلطی، بے وقوفی (یعنی کم عقلی) اور تعمق (گہرائی) تو جانتا اور اس سے واقف ہے، پس تو اپنے آپ کے لیے اس پر راضی اور خوش رہ جس سے قوم نے اپنے نفسوں کو راضی رکھا، کیونکہ وہ علم کی بنا پر اس سے واقف ہوئے اور کھلی نگاہ کے ساتھ دیکھ کر اس سے باز رہے، بلاشبہ وہ کشف امور پر زیادہ قوت اور قدرت رکھتے تھے اور جس فضل و مہربانی کے ساتھ وہ اس مقام میں ہے وہ اولیٰ اور افضل ہے، پس اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم ہو تو پھر تم اس کی طرف ان پر سبقت لے گئے ہو اور اگر تم کہو کہ یہ (بدعت) ان کے بعد

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 453　　2۔ ایضاً　　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنہ، جلد 2، صفحہ 279

ظاہر ہوئی ہے تو اسے ایجاد نہیں کیا مگر اس نے جس نے ان کے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع اور پیروی کی ہے اور اس نے اپنے آپ کو ان سے دور کر لیا ہے، بلاشبہ سابقون تو وہی ہیں۔ تحقیق انہوں نے اس بارے میں ایسی گفتگو کی ہے جو کافی ہے اور انہوں نے وہ وصف بیان کیا ہے جو شفایاب کرتا ہے (یعنی باعث اطمینان ہے) پس جو ان سے کم ہے وہ کوتاہی کرنے والے کی طرف سے ہے اور جو ان سے اوپر (اور زیادہ) ہے وہ جسارت کرنے والے کی طرف سے ہے۔ تحقیق ایک قوم نے ان کے جو درجہ میں ان سے کم ہے اس نے کوتاہی کی پس انہوں نے جفا کی (ظلم کیا) اور ان میں سے کئی قوموں نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے غلو کیا اور بلاشبہ وہ اس کے باوجود ہدایت مستقیم پر ہیں۔ اور حدیث ذکر کی (1)۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: تم پر اثر و سنت کی اقتدا کرنا لازم ہے، کیونکہ ڈر ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب کوئی انسان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام احوال میں آپ کی اقتدا اور پیروی کرنے کا ذکر کرے گا تو لوگ اس کی مذمت کریں گے اور اس سے نفرت کریں گے اور اس سے برأت اختیار کر لیں گے اور وہ اسے ذلیل و رسوا کریں گے۔ حضرت سہل نے کہا: بے شک اہل سنت کے ہاتھ پر بدعت ظاہر ہوئی، کیونکہ انہوں نے ان کی معاونت کی اور انہوں نے اس کے ساتھ بحث مباحثہ کیا اور ان کے جھوٹے دعوے ظاہر ہوئے اور عام لوگوں میں پھیل گئے اور اس نے بھی اسے سن لیا جس نے نہیں سنا ہوا تھا، اگر وہ انہیں چھوڑ دیتے اور ان سے گفتگو نہ کرتے تو ان میں سے ہر ایک اس کے ساتھ مر جاتا جو اس کے سینے میں تھا اور اس سے کوئی شی ظاہر نہ ہوتی اور وہ اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ اور حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: تم میں سے کوئی کسی بدعت کا آغاز نہیں کرتا یہاں تک کہ ابلیس اس کے لیے کوئی عبادت ایجاد کرتا ہے اور وہ اس کے مطابق عبادت کرنے لگتا ہے پھر وہ اس کے لیے بدعت کو ایجاد کر دیتا ہے اور جب وہ بدعت کے بارے بولنے لگتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ اس سے اس خدمت (اور بوجھ) کو الگ کر لیتا ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں کوئی حدیث نہیں جانتا جو مبتدع کے لیے اس حدیث سے زیادہ سخت ہو۔ حجب الله الجنة عن صاحب البدعة (اللہ تعالیٰ نے جنت کو بدعتی سے چھپا لیا ہے) فرمایا: پس یہودی اور نصرانی اس کی نسبت زیادہ امیدوار ہیں۔ حضرت سہل نے کہا: جو چاہے کہ اپنے دین کی عزت و تکریم کرے تو وہ سلطان وقت کے پاس داخل نہ ہو، عورتوں کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور ہوس پرستوں کے ساتھ مخاصمت اور جھگڑا نہ کرے۔ اور یہ بھی فرمایا: تم اتباع و پیروی کرو اور نئی چیزیں (بدعت) ایجاد نہ کرو۔ تمہارے لیے وہ کافی ہوگی۔

اور مسند دارمی میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے ابو عبدالرحمن! بلاشبہ میں نے مسجد میں ابھی وہ شے دیکھی ہے جس کو میں نے ناپسند کیا ہے اور الحمدللہ میں نے خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا، انہوں نے پوچھا: تو وہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: اگر آپ زندہ رہے تو عنقریب آپ اسے دیکھ لیں گے۔ میں نے مسجد میں ایک قوم کو مختلف حلقوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقے میں ایک آدمی ہے اور ان کے

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاتھوں میں سنگریزے ہیں اور وہ انہیں کہہ رہا ہے: سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔ چنانچہ وہ سو مرتبہ سبحانہ اللہ پڑھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو پھر تم نے انہیں کیا کہا؟ انہوں نے بتایا: میں نے انہیں کچھ نہیں کہا۔ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کیا۔ انہوں نے فرمایا: کیا تم نے انہیں حکم نہیں دیا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور میں ان کے لیے ضامن ہوں کہ یہ عمل ان کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی ان کی معیت میں چلے یہاں تک کہ وہ ان حلقوں میں سے ایک حلقے میں آئے اور ان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ اور فرمایا: یہ کیا ہے جو میں تمہیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ابو عبدالرحمن! یہ سنگریزے ہیں ہم ان کے ساتھ تکبیر و تہلیل (اور تسبیح) کو شمار کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: سو تم اپنے گناہوں کو شمار کرو اور میں تمہارے لیے ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کوئی شی ضائع نہیں ہوگی، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! تم پر افسوس ہے تمہاری ہلاکت کتنی تیزی سے آپہنچی ہے، کیا ضلالت و گمراہی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اے ابو عبدالرحمن! قسم بخدا ہم نے سوائے نیکی کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا: کتنے ہی خیر اور نیکی کا ارادہ کرنے والے ہیں ہرگز اسے نہیں پہنچ سکیں گے (☆)۔

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے کہ ان سے کسی آدمی نے ہوس پرستوں اور اہل بدعت کی کسی شی کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا: تجھ پر لازم ہے کہ تو اعراب اور غلام کے دین کو لازم پکڑے جو کتاب کے بارے میں ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس سے علیحدگی اختیار کرلے۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم کون سی شے سے بنی آدم (انسان) کے پاس آتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہر شے سے۔ اس نے کہا: کیا تم استغفار سے پہلے بھی ان کے پاس آتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: دور ہو! وہ شے ہے جسے توحید کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا: میں یقیناً ان میں کوئی ایسی شے پھیلا دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار نہیں کریں گے۔

امام اوزاعی نے فرمایا: پس اس (ابلیس) نے لوگوں میں ہوس کو پھیلا دیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نہیں جانتا دو نعمتوں میں سے کون سی نعمت مجھ پر زیادہ عظیم ہے یہ کہ اس نے مجھے اسلام کی ہدایت اور رہنمائی عطا فرمائی یا یہ کہ اس نے مجھے اس ہوس سے عافیت اور چھٹکارا عطا فرمایا؟ اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہوس پرستوں کو اصحاب الاہواء کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ آتش جہنم میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب دارمی سے مروی ہے۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ سے معتزلہ کے پیچھے نماز پڑھنے اور ان سے نکاح، شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: نہیں، ان کی کوئی عزت و تکریم نہیں، وہ کفار ہیں، وہ کیسے مومن ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: قرآن کریم مخلوق ہے، نہ جنت پیدا کی گئی ہے اور نہ ہی جہنم اور نہ ہی اللہ کی کوئی پل صراط ہے، کوئی شفاعت نہیں، مومنین میں سے کوئی جہنم میں داخل نہیں ہوگا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے گنہگاروں میں سے کوئی جہنم سے نہیں نکلے گا، نہ کوئی عذاب قبر ہے اور نہ ہی منکر و نکیر ہیں۔ اور آخرت میں نہ ہمارے رب کا دیدار ہے اور نہ ہی زیادہ (کا کوئی تصور ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم مخلوق ہے، نہ وہ

☆ ذکر اذکار کے بارے یہ تشدید کا پہلو ہے انسان خلوص نیت سے حضور قلب کے ساتھ ذکر کرے یہی تو مقصود ہے۔

سلطان کو جانتے ہیں اور نہ ہی جمعہ کو اور وہ اسے کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام کو نکال دے گا آپ کے کلام میں سے یہ اور زیادہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ابوسفیان ثوری نے کہا ہے: بدعت ابلیس کے نزدیک معصیت (گناہ) سے زیادہ پسندیدہ ہے، (کیونکہ) معصیت سے توبہ کی جا سکتی ہے اور بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل السنۃ میں سے ایسے آدمی کی طرف دیکھنا عبادت ہے جو سنت کی طرف دعوت دیتا ہو اور بدعت سے منع کرتا ہو۔ اور ابوالعالیہ نے کہا: تم پر اس پہلے امر کو مضبوطی سے تھامنا لازم ہے جس پر تم تفرقہ سے پہلے تھے۔ عاصم الاحوال نے کہا ہے: میں نے اس کے بارے حسن سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے تجھے نصیحت کی ہے قسم بخدا! اور تجھے سچ کہا ہے۔

تحقیق سورۂ آل عمران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی گزر چکے ہیں کہ ''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ امت عنقریب تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی''۔ الحدیث، بعض اہل معرفت علماء نے کہا ہے: یہ فرقہ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے فرقوں میں زائد ہوا ہے وہ قوم ہے جو علماء سے عداوت رکھتے ہیں اور فقہاء سے بغض رکھتے ہیں اور گزشتہ امتوں میں سے یہ فرقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں ایک قوم ہوگی جو اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم سے کفر کریں گے درآنحالیکہ انہیں احساس اور شعور بھی نہ ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کفر کیا۔ فرمایا: تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیسے لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بعض کا اقرار کریں گے اور بعض کا انکار کریں گے''۔ پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیا کہیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ابلیس کو اللہ تعالیٰ کے برابر اور مساوی قرار دیں گے اس کی صفت خلق میں، قوت میں اور رزق میں۔ اور کہیں گے خیر اور بھلائی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر ابلیس کی جانب سے''۔ فرمایا: پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں فرمایا: ''میری امت ان سے عداوت، بغض اور جھگڑا فساد نہیں کرے گی وہی اس امت کے زنادقہ ہیں''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور سورۃ النساء میں اور اس سورت میں اہل بدعت اور ہوس پرستوں کی مجالست اور ہمنشینی اختیار کرنے سے نہی کا بیان گزر چکا ہے۔ اور بلاشبہ جو ان کے ساتھ مجالست کرے گا اس کا حکم ان کے حکم کی مثل ہی ہوگا۔ پس فرمایا: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا الآیہ (الانعام:68) (اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بے ہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں)، پھر سورۃ النساء میں ان لوگوں کی سزا بیان فرمائی جنہوں نے ایسا کیا اور اس کی مخالفت کی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا۔ پس فرمایا: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ الآیہ (النساء:140) اور سورۃ النساء مدنی سورت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے ساتھ ملا دیا جس نے ان کی مجلس اختیار کی۔ اور اس امت کے ائمہ میں ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور اہل بدعت کی مجلس اختیار کرنے والے پر معاشرت اور مخالطت کی بنا پر ان آیات کے تقاضا کے مطابق حکم صادر کیا، ان

میں سے امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم ہیں، کیونکہ انہوں نے اہل بدعت کی مجالست اختیار کرنے والے آدمی کے بارے میں کہا ہے: اسے ان کی مجالست اختیار کرنے سے روکا جائے گا، اگر وہ رک جائے تو فبہا ورنہ اسے ان کے ساتھ جلا دیا جائے گا، ان کی مراد یہ ہے کہ حکم میں (اسے ان کی مثل قرار دیا جائے گا)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شراب پینے والوں کی مجلس اختیار کرنے والے پر حد کا حکم لگایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (النساء: 140) (ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گے) آپ کو عرض کی گئی: وہ کہتا ہے میں ان کی مجلس اپناتا ہوں تاکہ میں ان پر اسے واضح کروں اور ان کی باتوں کا رد کروں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسے ان کی مجالست سے روکا جائے گا اور اگر وہ باز نہ آئے تو اسے ان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

''پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب تاکہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی اور (یہ کتاب) باعث ہدایت و رحمت ہے تاکہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے پر ایمان لائیں۔ اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے، بابرکت ہے سو پیروی کرو اس کی اور ڈرو (اللہ سے) تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اس میں مُوْسَى اور الْكِتٰبَ دونوں مفعول ہیں۔ تَمَامًا یہ مفعول من أجلہ ہے یا یہ مصدر ہے (یعنی مفعول مطلق) عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ، اَحْسَنَ کو نصب اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے رفع دیا، تو وہ قراءت یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق کی ہے۔ اور وہ اس تقدیر پر ہے: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ۔ مہدوی نے کہا ہے: اس میں بُعد ہے، کیونکہ اس میں مبتدا محذوف ہے جو کہ الَّذِيْۤ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے (یعنی ھو)۔ اور سیبویہ نے خلیل سے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ سنا ہے: ما أنا بالذی قائلٌ لك شیئا اور جنہوں نے نصب دی ہے تو وہ اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کسائی اور فراء نے اس کی اجازت دی ہے کہ یہ اسم ھو جو کہ الذی کی صفت واقع ہو رہا ہو۔ اور ان دونوں نے اس جملے کو جائز قرار دیا ہے۔ مررتُ بالذی أخیك دونوں معرفہ اور جو اس کے قریب ہے اس کے ساتھ الذی کی صفت لگاتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بصریوں کے نزدیک محال ہے، کیونکہ یہ صفت ہے اسم کی اسے مکمل کیے جانے سے پہلے اور ان کے نزدیک معنی ہے: علی المحسن (نیک عمل کرنے والے پر) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تماما علی المحسن المومن (تاکہ پوری کر دیں نعمت نیک عمل کرنے والے مومن پر)

اور قولہ باری تعالیٰ: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ کے معنی میں حسن نے کہا ہے: ان میں محسن اور غیر محسن دونوں طرح کے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ نیک عمل کرنے والوں پر نعمت مکمل کر دے۔ فانزل اللہ الکتاب تماما

علی المحسنین اور اس قول کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی: تماماً علی الذین أحسنو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی ان احسانات میں زیادتی کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر فرمائے ان میں سے جن کا علم ان پر تورات نازل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔

محمد بن یزید نے کہا ہے: پس معنی ہے: تماماً علی الذی أحسنه الله عزوجل إلی موسیٰ علیه السلام من الرسالة وغیرها (مکمل کرتے ہوئے اس نعمت واحسان کو جو اس نے رسالت وغیرہ میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرمایا)۔ اور عبداللہ بن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے علی إحسان الله إلی انبیائه علیهم السلام من الرسالة وغیرها (1) (مکمل کرتے ہوئے اس احسان کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر رسالت وغیرہ میں فرمایا)

اور ربیع بن انس نے کہا ہے: تماماً علی إحسان موسٰی من طاعته للهِ عزّو جلّ (2) (مکمل کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس نیکی کو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی صورت میں وہ کرتے ہیں) اور فراء نے بھی یہ کہا ہے، پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور انہیں کتاب کا عطا کیا جانا اس سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بمعنی واو ہے۔ یعنی وأتینا موسیٰ الکتاب (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) کیونکہ یہ دونوں حرف عطف ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: تقدیر کلام ہے ثمّ کنّا قد آتینا موسی الکتاب قبلَ إنزالنا القرآن علی محمد ﷺ (پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر قرآن نازل کرنے سے پہلے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ، ثم أتل ما آتینا موسٰی تماماً (فرمایئے آؤ میں تلاوت کرتا ہوں وہ جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، پھر میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نعمت مکمل کرتے ہوئے عطا فرمایا)۔ وَ تَفْصِيْلًا اس کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور اسی طرح هُدًى وَّ رَحْمَةً بھی معطوف ہے۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ اس میں مبارک صفت ہے یعنی جس میں بہت زیادہ خیرات وبرکات ہیں۔ اور قرآن کریم کے علاوہ حال ہونے کی بنا پر اسے مبارکاً پڑھنا بھی جائز ہے۔ فَاتَّبِعُوْهُ یعنی تم اس کے مطابق عمل کرو جو کچھ اس میں ہے۔ وَاتَّقُوْا یعنی اس کی تحریف سے بچو۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ تم رحمت کے امیدوار بن جاؤ پس تم عذاب نہیں دیئے جاؤ گے۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 189　2۔ ایضاً

عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

''(ہم نے اسے اتارا ہے) تاکہ یہ نہ کہو کہ اتاری گئی تھی کتاب تو صرف دوگروہوں پر ہم سے پہلے اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ اگر اتاری گئی ہوتی ہم پر کتاب تو ہوتے ہم زیادہ ہدایت پانے والے ان سے، بے شک آ گئی ہے تمہارے پاس روشن دلیل اپنے رب کی طرف سے اور سراسر ہدایت اور رحمت تو کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور منہ پھیرا ان سے؟ عنقریب ہم سزا دیں گے انہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ تَقُوْلُوْٓا یہ محل نصب میں ہے۔ کوفیوں نے کہا ہے: لِئَلَّا تقولوا (تاکہ تم یہ نہ کہو) اور بصریوں نے کہا ہے: أنزلناہ کراھیۃَ أن تقولوا (ہم نے اسے نازل کیا یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ تم کہو)۔ اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فاتقوا أنْ تقولوا یا أھل مکۃ (اے اہل مکہ تم یہ کہنے سے بچو)، اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ کہ تورات اور انجیل نازل کی گئی۔ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ہم سے پہلے دوگروہوں پر یعنی یہود و نصاریٰ پر اور ہم پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔

وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اور ہم تو ان کی کتابوں اور ان کی لغات سے بالکل ناواقف اور غافل تھے۔ اور یہاں عن دراستھما نہیں فرمایا، اس لیے کہ ہر گروہ ایک جماعت ہے۔ او تقولوا اس کا عطف أن تقولوا پر ہے۔ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے ساتھ عذر زائل ہو گیا۔ اور البینۃ اور البیان دونوں ہم معنی ہیں۔ اور اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بینہ کا نام دیا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ اور یہ سراسر ہدایت اور رحمت ہے اس کے لیے جس نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ پھر فرمایا: فَمَنْ اَظْلَمُ یعنی اگر تم نے جھٹلایا تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ فإن کذّبتم فلا أحدَ أظلم منکم۔ صدف اس کا معنی اعراض جس نے اعراض کیا اور يَصْدِفُوْنَ وہ اعراض کرتے تھے، منہ پھیرا کرتے تھے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

''کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا خود آئے آپ کا رب یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی (لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی۔ آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اس کا معنی ہے میں نے ان پر حجت قائم کر دی اور ان پر کتاب نازل کی لیکن وہ ایمان نہ لائے،

پس وہ کس کی انتظار کر رہے ہیں؟ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ موت کے وقت ان کی ارواح کو قبض کرنے کے لیے فرشتے ان کے پاس آئیں۔

اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس کا مفہوم ہے: امر ربك یا ان کے بارے میں قتل وغیرہ سے متعلقہ تیرے رب کا حکم آجائے، کبھی مضاف الیہ کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس سے مراد مضاف ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) مراد اهل القریة ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ: 93) اس میں مراد حب العجل ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے یأتی أمر ربك، یعنی عقوبةَ رِبّك اور عذاب ربك (تیرے رب کی سزا اور تیرے رب کا عذاب آجائے گا)۔ اور کہا جاتا ہے: یہ ان متشابہ آیات میں سے ہے جن کی تاویل سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور اسی کی مثل میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کہا گیا ہے: اٰيٰتِ رَبِّكَ سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ اس کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہیں دنیا میں مہلت دی جائے گی اور جب ساعت (قیامت) ظاہر ہو جائے گی تو پھر کوئی مہلت نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے آنے سے مراد قیامت کے دن میدان حشر میں اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے آنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (الفجر) (اور جب آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے)

اللہ تعالیٰ کے آنے میں کسی نوع کی کوئی حرکت، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور زوال وغیرہ نہیں ہے، کیونکہ یہ چیزیں تب ہوتی ہیں جب آنے والا جسم یا جوہر ہو اور جس نظریہ پر جمہور ائمہ اہل السنۃ ہیں وہ کہتے ہیں: وہ آتا ہے، نزول فرماتا ہے، لیکن وہ اسے کسی کیفیت کے ساتھ مکیف نہیں کرتے، کیونکہ اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے۔

ارشاد گرامی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (الشوریٰ) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے)

اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین چیزیں جب ظاہر ہو جائیں گی تو پھر کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا یا اس نے اپنے ایمان کی حالت میں کوئی عمل خیر نہیں کیا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا نکلنا اور دابۃ الارض کا ظاہر ہونا''۔ اور صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک مغرب میں توبہ کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی مسافت ستر برس کی ہے اسے بند نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج اس کی طرف سے طلوع ہو جائے'' (1)۔ اسے دار قطنی، دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: هذا حديث حسن صحيح۔ اور سفیان نے بیان کیا ہے:

1۔ سنن ابن ماجہ کتاب الفتن، باب طلوع الشمس من مغربها، حدیث نمبر 4059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ شام کی طرف ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس دن تخلیق فرمایا جس دن زمین و آسمان پیدا فرمائے۔ مفتوحا یعنی توبہ کے لیے کھولا گیا ہے اور بند نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔ فرمایا: حدیث حسن صحیح (یہ حدیث حسن صحیح ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سب کو خوارج اور معتزلہ نے جھٹلایا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا کہ انہوں نے کہا: اے لوگو! بلاشبہ رجم حق ہے اس کے بارے تم کسی دھوکے میں نہ آنا اور بے شک اس کی نشانی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رجم کیا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رجم کیا ہے اور بلاشبہ ہم نے ان دونوں کے بعد رجم کیا ہے۔ اور عنقریب اس امت سے ایک قوم ہوگی وہ رجم کو جھٹلائیں گے، دجال کی تکذیب کریں گے، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا انکار کریں گے، عذاب قبر کو نہیں مانیں گے، شفاعت کا انکار کریں گے اور اس قوم کو جھٹلائیں گے جو آگ (جہنم) سے نکالیں جائیں گے اس میں جلنے کے بعد۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے(1)۔

اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور وہ اسی کے ہم معنی ہے کہ ''سورج کو لوگوں سے روک لیا جائے گا جس وقت زمین میں گناہ زیادہ ہو جائیں گے اور نیکی ختم ہو جائے گی اور کوئی اس کا حکم نہیں دے گا اور گناہ پھیل جائے گا اور اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ ایک رات کی مقدار عرش کے نیچے، جب بھی وہ سجدہ ریز ہوگا اور اپنے رب سے اجازت طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو اسے کوئی جواب نہیں ملے گا یہاں تک کہ چاند اس کے ساتھ برابر ہو جائے گا اور وہ بھی اس کے ساتھ سجدہ ریز ہوگا اور اذن طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو ان دونوں کو کوئی جواب نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ سورج کو تین راتوں کی مقدار اور چاند کو دو راتوں کی مقدار روک لیا جائے گا اور زمین میں تہجد گزاروں کے سوا اس رات کی طوالت کو کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اس وقت مسلمانوں کے شہروں میں سے ہر شہر میں ان کی ایک قلیل سی جماعت ہوگی، پس جب دونوں کے لیے تین راتوں کی مقدار مکمل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ فرمائیں گے: '' بے شک رب کریم سبحانہ وتعالیٰ تم دونوں کو حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنے مغارب کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے طلوع ہو جاؤ اور یہ کہ تم دونوں کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی اور نور نہیں ہے''۔ پس وہ دونوں سیاہ حالت میں اپنے مغارب سے طلوع ہوں گے، نہ سورج کی روشنی ہوگی اور نہ چاند کا نور ہوگا، اس سے پہلے ان کے گرہن میں ان کی مثال موجود ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ (القیامہ) (اور (بے نوری میں) سورج اور چاند یکساں ہو جائیں گے)

اور ارشاد گرامی ہے: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿۱﴾ (التکویر) (یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) پس یہ دونوں بلند ہوں گے اس طرح جیسے دو جوڑے گئے اونٹ۔ اور جب سورج اور چاند آسمان کے نصف تک پہنچ جائیں گے تو ان کے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئیں گے اور وہ انہیں سینگوں سے پکڑ لیں گے اور انہیں مغرب کی طرف واپس لوٹا دیں گے اور وہ اپنے مغارب میں غروب نہیں ہوں گے بلکہ وہ دونوں باب التوبۃ میں غروب ہوں گے پھر وہ دونوں کو اڑ دواپس لوٹائے جائیں گے،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 156

پھر ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ جڑ جائے گا اور وہ دونوں اس طرح مل جائیں گے گویا ان کے درمیان کبھی کوئی شگاف (اور دراڑ) تھی ہی نہیں۔ اور جب توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا تو اس کے بعد کسی بندے کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کے بعد اسے نیکی نفع نہیں دے گی جسے وہ کرے گا، مگر وہ آدمی جو اس سے پہلے نیکوکار ہو تو وہ اس پر عمل کرتا رہے گا جس پر وہ اس دن سے پہلے عمل پیرا تھا، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (انعام: 158) ((لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی)

پھر اس کے بعد سورج اور چاند کو روشنی اور نور عطا کر دیا جائے گا، پھر وہ لوگوں پر اسی طرح طلوع و غروب ہوتے رہیں گے جیسے وہ اس سے قبل طلوع و غروب ہوتے تھے۔ علماء نے بیان کیا ہے: سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد کسی نفس کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا، کیونکہ وہ ان کے دلوں میں اس خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے خالص ہوا ہے جس کے ساتھ نفس کی تمام شہوات کو ٹھنڈا کر دیا گیا ہے اور قوائے بدنیہ میں سے ہر قوت سست اور مانند پڑ گئی ہے، پس تمام لوگ قیامت قریب آنے کے یقین کی وجہ سے اس آدمی کی طرح ہو گئے ہیں جس پر موت حاضر ہو (کیونکہ اس کی طرح) اس سے بھی گناہوں کی تمام انواع کی طرف دعوت دینے والے جذبات منقطع ہو چکے ہیں اور اب ان کے ابدان سے ان کا صدور باطل ہے، پس جس نے اس قسم کی حالت میں توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، جیسا کہ قریب المرگ آدمی کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ الله يَقْبَلُ توبةَ العبدِ مالم يُغرغر(1) (بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول نہیں فرماتا جب تک وہ (موت کے وقت) غرغر کی آواز نہ نکالے) یعنی اس کی روح راس الحلق تک پہنچ جائے اور وہ وقت اس معاینہ اور مشاہدہ کا ہے جس میں وہ دیکھ لیتا ہے کہ اس کا ٹھکانا جنت میں ہے یا جہنم میں، پس سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا مشاہدہ بھی اس کی مثل ہے۔

اور اس پر چاہیے کہ جس نے اس کا مشاہدہ کیا جب تک وہ زندہ رہے اس کی توبہ مردود ہو اور جو اس وقت موجود ہو اس کا حکم بھی مشاہدہ کرنے والے کی طرح ہو، کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بارے میں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور اس کے وعدہ کے بارے میں ضروری اور بدیہی ہو گیا ہے۔ اور اگر ایام دنیا اتنے عرصہ تک پھیل جائیں کہ لوگ اس عظیم واقعہ کو بھول جائیں جیسے وقوع پذیر ہوا اور اس کے بارے میں وہ بہت تذکرہ کریں اور اس کے بارے خبر خاص ہو جائے اور اس سے تواتر ختم ہو جائے (یعنی اب وہ خبر متواتر نہ رہے) تو اس وقت جس نے اسلام قبول کیا یا توبہ کی تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث یاد کی ہے اور اس کے بعد میں اسے نہیں بھولا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک (قیامت کے) ظاہر ہونے کے اعتبار سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور لوگوں پر چاشت کے وقت دابۃ کا نکلنا ہے ان میں سے جو بھی دوسری سے پہلے ظاہر ہوگی تو اس کے قریب ہی دوسری علامت ظاہر ہو جائے گی''(2)۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 324　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 404

اور اس بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرہ میں تشریف فرما تھے اور اس سے نیچے ہم تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم کس کے بارے ذکر کر رہے ہو؟'' ہم نے عرض کی: قیامت کے بارے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دس علامات ظاہر ہو جائیں۔ ایک خسف (زمین کا دھنسنا) مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرہ عرب میں، دخان (دھواں) کا ظاہر ہونا، دجال کا نکلنا، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور ایک آگ جو کہ قعر عدن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانک کر لے جائے گی'' (1)۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: مجھے عبدالعزیز بن رفیع نے ابوالطفیل سے اور انہوں نے ابوسریحہ سے اسی طرح بیان کیا ہے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کرتے۔ اور ان دو میں سے ایک نے دسویں علامت کے طور پر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ اور دوسرے نے کہا ہے: اور ایک ہوا ظاہر ہوگی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامات کی ترتیب میں یہ حدیث متفق (انتہائی قابل اعتماد) ہے۔ ان میں سے بعض واقع ہو چکی ہیں اور وہ تینوں خسف ہیں جیسا کہ ابوالفرج علامہ جوزی نے عراق، عجم اور مغرب میں ان کے واقع ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کے سبب خلق کثیر ہلاک ہوئی۔ انہوں نے کتاب ''فہوم الآثار'' وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور دابہ کا ذکر سورۃ النمل میں آئے گا اور یاجوج ماجوج کا سورۃ الکہف میں آئے گا۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک یہ علامات تسلسل کے ساتھ سال بسال دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی مثل ظاہر ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورج کو مغرب سے طلوع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو کہا تھا: فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (البقرہ: 258) (کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے)

اور ان کے بعد آنے والے ملاحدہ اور نجومی اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ (کام) ہونے والا نہیں (یعنی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو سکتا) تو اللہ تعالیٰ ایک دن اسے مغرب سے طلوع فرمائے گا تاکہ وہ منکرین کو اپنی قدرت دکھائے کہ سورج اس کی بادشاہی اور سلطنت میں ہے، اگر وہ چاہے تو وہ اسے مشرق سے طلوع کرے اور اگر چاہے تو وہ اسے مغرب سے طلوع کرے۔ اور اس پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ توبہ اور ایمان کاروان کے لیے ہے جو منکرین میں سے ایمان لائے اور توبہ کی، کیونکہ وہ سورج کے طلوع ہونے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کو جھٹلانے والے ہیں۔ اور رہے اس کی تصدیق کرنے والے تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس سے پہلے کا ان کا ایمان ان کے لیے نفع بخش ہوگا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی کافر کا نہ کوئی عمل قبول کیا جائے گا اور نہ ہی توبہ جب کہ وہ اس وقت اسلام لایا جب اس نے اسے دیکھا، مگر وہ جوان دونوں صغیر (نابالغ) ہو اگر وہ اس کے بعد اسلام لے آیا تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا اور جو گنہگار مومن تھا پس اس نے گناہ سے توبہ کر لی تو اس سے قبول کر لی جائے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 393

اور عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: سورج طلوع ہونے کے وقت اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس وقت ایسی چیخ ہوگی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہو جائیں گے، پس جو اس وقت اسلام لایا یا اس نے توبہ کی اور ہلاک ہو گیا تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور جس نے اس کے بعد توبہ کی تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ اسے ابو اللیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال باقی رہیں گے یہاں تک کہ وہ کھجور کے درخت لگائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے غیب کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے یوم تاتی تا کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً تلتقطه بعضُ السیارۃ ہے اور ذھبت بعض أصابعه ہے۔ اور جریر نے کہا ہے:

لَمّا أتی خبرُ الزّبیر تواضَعتْ　سُورُ المدینة والجبالُ الخُشّعُ

مبرد نے کہا ہے: تانیث مؤنث کی مجاورت کی بنا پر ہے نہ کہ اصل کی بنیاد پر۔ اور ابن سیرین نے لا تنفع کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: وہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ ابن سیرین کی غلطی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس میں نحو کا باریک سا قانون ہے اسے سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور نفس میں سے ہر ایک دوسرے پر مشتمل ہے پس ایمان کو مونث لایا گیا، کیونکہ وہ نفس میں سے ہے اور اس کے ساتھ ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

مَشَیْنَ کما اهتزّتْ رماحٌ تَسفّهتْ　أعالیهَا مَرُّ الریاحِ النَّواسِمِ

مہدوی نے کہا ہے: بہت سے ائمہ مضاف مذکر کے فعل کو مؤنث لاتے ہیں جب اس کی اضافت مونث کی طرف ہو اور مضاف مضاف الیہ کا بعض ہو یا اس سے ہو یا اس کے ساتھ ہو۔ اور اسی پر ذی الرمہ کا قول ہے: مشین ...... البیت۔

پس مرّ (کے لیے فعل) مونث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ الریاح کی طرف مضاف ہے اور وہ مونث ہے جب کہ المرّ من الریاح ہے۔ اور نحاس نے کہا: اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے وہ یہ کہ ایمان کو مونث لایا گیا ہے، کیونکہ وہ مصدر ہے جیسا کہ مصدر مونث کے لیے مذکر فعل لایا جاتا ہے، مثلاً فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (البقرہ: 275) اور جیسا کہ شاعر نے کہا:

فقد عذرتنا فی صحابته العذر

اور ایک قول میں عذر کو مؤنث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ بمعنی المعذرۃ ہے۔ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی (تمہارے عذاب کا) انتظار کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

”بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ (اے محبوب!) نہیں ہے آپ کا ان سے کوئی علاقہ، ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ اسے حمزہ اور کسائی نے فارقوا الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی قراءت ہے، یہ المفارقۃ اور الفراق سے ماخوذ ہے۔ یہ اس معنی پر ہے کہ انہوں نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس سے نکل گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: واللہ مافرقوہ ولکن فارقوہ (قسم بخدا! انہوں نے دین میں تفرقہ نہیں ڈالا بلکہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا)۔ اور باقیوں نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، سوائے نخعی کے، کیونکہ انہوں نے اسے فرقوا مخفف پڑھا ہے، یعنی وہ بعض احکام کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ انہوں نے کفر کیا۔ حضرت مجاہد، قتادہ، سدی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مراد یہودی ونصاریٰ ہیں۔ اور وہ تفرقہ کی صفت کے ساتھ متصف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ۝ (البینۃ) (اور نہیں بٹے فرقوں میں اہل کتاب مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان کے پاس روشن دلیل)

اور مزید فرمایا: وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (النساء: 150) (اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان)۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ مراد مشرکین ہیں، ان میں سے بعض نے بتوں کی پوجا کی اور بعض نے فرشتوں کی پرستش کی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت عام ہے اور کفار کو شامل ہے۔ اور ہر وہ جس نے بدعت کا ارتکاب کیا اور ایسا عمل پیش کیا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا تو اس نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (1) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ یہ اہل بدعت، شبہات میں مبتلا کرنے والے اور اس امت کے گمراہ لوگ ہیں۔ اور بقیہ بن ولید نے بیان کیا ہے کہ ہمیں شعبہ بن حجاج، مجالد نے شعبی سے انہوں نے شریح کے واسطہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا بلاشبہ یہ اس امت میں سے اصحاب بدعت، ہوس پرست اور اصحاب ضلالت وگمراہی ہیں (2)۔ اے عائشہ! بے شک ہر گنہگار کے لیے توبہ ہے سوائے بدعت کا ارتکاب کرنے والوں اور ہوس پرستوں کے، ان کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے اور میں ان سے بری ہوں اور وہ ہم سے بری نہیں۔

اور لیث بن ابی سلیم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ قراءت کی۔ اور شِیَعًا کا معنی ہے متفرق گروہ اور جماعتیں۔ اور ہر قوم جن کا نظریہ (اگر) ایک ہو ان میں سے بعض بعض کی رائے کی اتباع اور پیروی کرتے ہوں تو وہی شیع ہے۔ لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اپنی برأت ثابت کر دی۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے: من غشنا فلیس منا یعنی ہم اس سے بری ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

إذا حاولتَ لی أَسَدٍ فُجورًا فإنی لستُ منك ولستَ منّی

ای أنا ابرأ منک (یعنی میں تجھ سے بری ہوں گا)۔ اور فی شیء محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ خبریں موجود ضمیر سے حال ہے،

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 92 2۔ ایضاً

یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس میں مضاف محذوف ہے اور معنی ہے لست من عقابهم فی شئ (ان کی سزا سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں) بلاشبہ آپ پر فقط ڈرانا ہے۔ اِنَّمَآ اَمۡرُهُمۡ اِلَى اللّٰهِ (ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے) یہ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی ہے۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ۝

''جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لیے دس ہوں گی اس کی مانند۔ اور جو کوئی کرے گا ایک برائی تو نہ بدلہ دیا جائے گا اسے مگر اس (ایک برائی) کے برابر اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ اس میں مَنۡ مبتدا اور وہی شرط ہے اور جواب شرط فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ہے یعنی اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیاں ہوں گی، اس میں حسنات کو حذف کر دیا گیا ہے اور امثال کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے جو اس کی صفت ہے (یعنی حسنات أمثالها) اور أمثال، مثل کی جمع ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: عندی عشرۃ نسابات، ای عندی عشرۃ رجال نسابات (میرے پاس دس صاحب نسب آدمی ہیں تو اس میں رجال کو حذف کر کے اس کا قائم مقام نسابات جو کہ صفت ہے، کو رکھ دیا گیا ہے)

اور ابوعلی نے کہا ہے: عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا میں تانیث اچھی ہے، کیونکہ اُمثال مونث کی طرف مضاف ہے اور مؤنث کی طرف اضافت جب معنی میں بھی ہو تو اس میں تانیث اچھی اور حسین ہوتی ہے، جیسے يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ (یوسف: 10) اور ذهبت بعض أصابعه۔

حسن، سعید بن جبیر اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم نے فَلَهٗ عَشۡرٌ اَمۡثَالُهَا پڑھا ہے اور تقدیر عبارت ہوگی: فله حسناتٌ أمثالها یعنی اس کے لیے اس جزا میں سے دس گناہ ہوگی جو اس کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کے لیے ایک مثل ہو اور پھر اس مثل کو کئی گناہ کیا جاتا ہو اور وہ پس وہ دس ہو جاتی ہو۔ اور یہاں الحسنة سے مراد ایمان ہے، یعنی جس نے یہ شہادت دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے دنیا میں جو بھی نیکی اور خیر کا عمل کیا اس کے ہر عمل کے بدلے ثواب دس گنا ہوگا۔

وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ یہاں سیئة سے مراد شرک ہے۔

فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا (تو اسے بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اس ایک برائی کے برابر) اور وہ بدلہ ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے، کیونکہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور آتش جہنم میں سب سے بڑی سزا ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ (النباء) یعنی ایسی جزا جو عمل کے موافق ہوگی۔ اور رہی نیکی تو وہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نص موجود ہے اور حدیث میں ہے: الحسنة بعشر أمثالها وأزيد والسيئة واحدةٌ وأغفر فالويل لمن غلبت أحاده أعشاره (ایک نیکی کا بدلہ دس گنا اور اس سے بھی زائد ہے اور برائی (گناہ) ایک ہے اور اس کی مغفرت فرما دیتا ہوں لیکن ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لیے جس کی ایک برائی ان دس پر غالب آگئی)۔

اور اعمش نے ابوصالح سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حسنہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور سیئہ سے مراد شرک ہے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی ان کے اعمال کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا۔ تحقیق اس آیت کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہ انفاق فی سبیل اللہ سے مختلف ہے اور اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے: دس گنا تمام نیکیوں کے لیے ہے۔ اور سات سو گنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے اور اس میں خاص اور عام برابر ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: عوام کے لیے دس گنا (بدلہ) ہوتا ہے اور خواص کے لیے سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ جو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ امر توقیف کا محتاج ہوتا ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ خریم بن فاتک کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے اس میں ہے: اما حسنة بعشر فمن عمل حسنة فله عشر أمثالها وأما حسنة بسبعمائة فالنفقة في سبيل الله (ایک نیکی دس کے برابر ہے پس جس نے ایک نیک عمل کیا تو اس کے لیے اس کی مثل دس ہوں گی اور رہی وہ نیکی جو سات سو کے برابر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے)۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

"آپ فرمایئے بے شک مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے۔ آپ فرمایئے بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔ نہیں کوئی شریک اس کا اور مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ کفار نے تفرقہ ڈالا (تو ساتھ ہی) بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح دین تک پہنچا دیا اور وہ دین ابراہیمی ہے۔ دِيْنًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یہ قطرب سے منقول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کی نصب هَدٰىنِيْ فعل کی وجہ سے ہے یہ اخفش کا قول ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور نے کہا ہے: معنی پر محمول ہونے کی وجہ سے یہ منصوب ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے هدانی عرفنی دینا (اس نے مجھے سیدھے راستے تک پہنچایا اور دین کی مجھے پہچان کرا دی) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صِرَاطٍ سے بدل ہو یعنی هدانی صراطا مستقیما دیناً۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے، گویا کہ یہ کہا: اتبعوا دیناً، واعرفوا دیناً (یعنی تم دین کی اتباع کرو اور دین کی معرفت حاصل کرو)

قِيَمًا کوفیوں اور ابن عامر نے اسے قاف کے کسرہ اور تخفیف اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے جیسا کہ شبع اور اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور باقیوں نے قاف کے فتحہ یا کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَيِّمًا۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور یا اصل میں واؤ ہے قيوم پھر واؤ کو یاء سے بدل کر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا ہے جیسے میت میں ہوا

ہے۔ اور اس کا معنی سیدھا (صحیح) دین جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ یہ بدل ہے۔ حَنِيْفًا زجاج نے کہا ہے: یہ ابراہیم سے حال ہے اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ منصوب ہے اور اس سے پہلے أعنی فعل مضمر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ لفظ صلوٰۃ کا مادہ اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مرادرات کی نماز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عید کی نماز مراد ہے۔ اور النسك، نسيكة کی جمع ہے اور اس کا معنی ذبیحہ (ذبح شدہ جانور یعنی قربانی) اور حضرت مجاہد، ضحاک اور سعید بن جبیر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور معنی یہ ہے: حج اور عمرہ میں میری قربانی۔ اور حسن نے کہا ہے: نُسُكِيْ سے مراد ہے میرا دین۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری عبادت۔ اور اسی سے ناسك وہ کہلاتا ہے جو عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس آیت میں نسك سے مراد نیکی اور طاعت کے جمیع اعمال ہیں۔ اور یہ معنی تیرے اس قول سے لیا گیا ہے: نسك فلان فهوناسك جب کوئی عبادت گزار ہو۔

وَ مَحْيَايَ یعنی جو عمل میں اپنی زندگی میں کروں گا۔ وَ مَمَاتِيْ یعنی وہ اعمال جن کے بارے میں اپنی وفات کے بعد کرنے کی وصیت کروں گا۔ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ان کے ذریعے خالصۃ اسی کے قرب کا ارادہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ یعنی میرا جینا اور میرا مرنا اسی کے لیے ہے۔ اور حسن نے نسکی سین کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اہل مدینہ نے و محیای درج کلام میں یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عام نے یا کو مفتوح پڑھا ہے، کیونکہ اس میں دو ساکن (الف اور یا) جمع ہو جاتے ہیں،

اور اس میں الف مدہ ہے یہ حرکت کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور یونس نے اِضربان زیدا کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ اس میں اجتماع ساکنین ہے اور دوسرے میں ادغام بھی نہیں ہے اور جنہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے مطابق پڑھا ہے اور غلطی سے بچنا چاہا ہے تو انہوں نے محیای پر وقف کیا ہے تو اس صورت میں وہ جملہ نحویوں کے نزدیک غلطی کا مرتکب نہیں ہے۔ اور ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمر اور عاصم جعدری نے و محیی دوسری یاء کو شد کے ساتھ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور یہ علیا مضر کی لغت ہے وہ کہتے ہیں: قفی اور عصی اور اہل لغت نے کہا ہے:

سَبَقُوا هَوَيَّ وأَعْنَقُوا الهواهم (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نماز کا آغاز اس ذکر سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرنے کا ارادہ فرماتے تو یہ کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ (انعام) إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾ تا قولہ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے (1) کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ (انعام) إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾ اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے اور میں اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہوں تو میرے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دے بلاشبہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا اور میری اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی فرما اور تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا اور مجھ سے برے اخلاق کو پھیر دے (دور کر دے) اور تیرے سوا مجھ سے کوئی انہیں دور نہیں کر سکتا میں حاضر ہوں جملہ سعادتیں تیرے پاس ہیں اور تمام تر بھلائیاں تیرے قبضے میں ہیں اور تیری طرف شر کو کوئی راہ نہیں۔ تو سراپا برکت ہے اور بلند مرتبہ اور غالب ہے۔ أستغفرك وأتوب إليك (میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں)'' الحدیث۔

اور اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ہمیں نضر بن شمیل کی طرف سے خبر پہنچی ہے اور یہ لغت اور دیگر علوم کے علماء میں سے تھا اس نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد والشر لیس الیك کا معنی یہ ہے کہ شر ان چیزوں میں سے نہیں جن کے ساتھ تیرا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نماز میں توجیہ (یعنی وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي...... الآیہ پڑھنا لوگوں پر واجب نہیں، بلکہ ان پر تکبیر اور پھر قرأت واجب ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں دیکھا جو قراءت سے پہلے لوگ کہتے ہیں: (یعنی) سبحانك اللهم وبحمدك اور اختصار میں وہ ہے جو المختصر میں مذکور نہیں۔ کہ امام مالک یہ خالصۃً اپنے بارے میں کہتے تھے، کیونکہ اس کے بارے حدیث صحیح ہے اور آپ اس خوف سے لوگوں کو اس کے بارے نہیں کہتے تھے کہ وہ اس کے واجب ہونے کا اعتقاد رکھ لیں گے۔ علامہ ابوالفرج جوزی نے کہا ہے کہ میں اپنے بچپنے میں اپنے شیخ ابوبکر الدینوری کے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔ تو انہوں نے مجھے ایک مرتبہ ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے بیٹے! بے شک فقہاء نے قراءت فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے، اور ان کے اس بارے کوئی اختلاف نہیں کہ افتتاح (ثنا پڑھنا) سنت ہے، پس تو واجب میں مشغول ہو اور سنن کو چھوڑ دے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل اس اعرابی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جسے آپ نے نماز سکھائی: ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ اور پھر قراءت کر''۔ اور آپ نے اسے یہ نہیں فرمایا: سبح (کہ تو تسبیح یعنی سبحانك اللهم وبحمدك پڑھ)

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، جلد 1، صفحہ 263

جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور نہ یہ فرمایا کہ تو کہہ: وجھت وجھی جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تو کیسے پڑھتا ہے جب نماز شروع کرتا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی: میں کہتا ہوں (1) اللہ اکبر، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (فاتحہ) پس انہوں نے نہ تو توجیہ (یعنی انی وجھت وجھی) اور نہ ہی تسبیح (یعنی سبحانك اللھم) کا ذکر کیا۔ اور اگر کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کہا کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے: یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تکبیر سے پہلے کہتے ہوں اور بعد ازاں اللہ اکبر کہتے ہوں اور یہی ہمارے نزدیک حسن ہے۔

اور کہا جائے کہ نسائی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ الحدیث، تو ہم کہیں گے: ہم اسے رات کی نفل نماز پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ نسائی کی کتاب میں حضرت ابو سعید سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کے وقت نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: سبحانك اللھم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا إله غيرك یا مطلق نفل نماز میں آپ اس طرح پڑھتے تھے، کیونکہ نفل نماز فرض نماز سے اخف ہے، کیونکہ نفل نماز کھڑے، بیٹھے اور سوار ہونے کی حالت میں پڑھنا جائز ہوتی ہے اور سفر میں منہ قبلہ شریف کی طرف ہو یا کسی اور طرف، پس اس کا معاملہ آسان ہے۔

اور نسائی نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نفل نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (انعام) اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اللھم أنت الملك لا إله إلا انت سبحانك وبحمدك پھر قراءت کرتے تھے۔

یہ نفلوں میں ہونے پر نص ہے نہ کہ واجب میں۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ فرض نماز میں تکبیر کے بعد تھا، تو پھر اسے جواز اور استحباب پر محمول کیا جائے گا اور رہا امر مسنون تو وہ تکبیر کے بعد قراءت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔ پھر جب آپ نے یہ کہا تو یہ نہیں کہا: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اور اس کی وضاحت یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ان میں سے کوئی بھی اول نہیں۔ پس اگر کہا جائے: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام آپ سے پہلے نہیں ہیں؟ تو ہم کہیں گے: اس کے تین جواب ہیں۔

(۱) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معنوی طور پر تمام مخلوق میں سے اول ہیں، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: نحن الآخرون الأولون یوم القیامة ونحن اول من یدخل الجنة (3) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن اوّل ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے) اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: نحن الآخرون من اهل الدنیا والأولون یوم القیامة المقضی لهم قبل الخلائق (ہم اہل دنیا میں سے آخر ہیں اور قیامت کے دن اوّل ہوں گے مخلوقات سے پہلے ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 653　2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 159　3۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 282

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ہیں، کیونکہ آپ خلق میں ان پر مقدم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كنت اول الأنبياء في الخلق و آخرهم في البعث (1) (میں خلقت میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اوّل ہوں اور بعث میں اس سے آخر میں ہوں) پس یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام وغیرہ سے پہلے آیا ہے۔

(۳) اوّل المسلمینَ من اهل ملته (کہ میں اہل دین میں سے پہلا مسلمان ہوں) یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔ اور اوّل کے بارے روایات مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض میں ان کا ثبوت ہے اور بعض میں نہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (2) يا فاطمة قومي فأشهدي أضحيتكِ فإنه يغفر لك في اوّل قطرة من دمها كلّ ذنب عملتيه ثم قولي: اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (اے فاطمہ! اٹھ اور اپنی قربانی کے پاس حاضر ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے خون کے پہلے قطرہ کے ساتھ ہی تیرے ہر اس گناہ کو بخش دے گا جو تو نے کیا اور پھر یہ کہہ: اِنَّ صَلَاتِیْ الخ) عمران نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (اعزاز) صرف آپ کے لیے اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہے یا مسلمانوں کے لیے عام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے''۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور رب حالانکہ وہ رب ہے ہر چیز کا۔ اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، پھر اپنے رب کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے تو وہ بتائے گا تمہیں جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ یعنی (آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں) حالانکہ وہ ہر شی کا مالک ہے۔ روایت ہے کہ کفار نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ اور ہمارے الٰہوں کی عبادت کرو اور جس دین پر تم ہو اسے ترک کر دو، تو ہم تمہارے لیے ہر اس تاوان کے ضامن ہوں گے (3) جس میں آپ اپنی دنیا اور آخرت میں واقع ہوں گے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ استفہام ہے جو تقریر اور زجر و توبیخ کا تقاضا کرتا ہے اور غیر، ابغی فعل کے سبب منصوب ہے اور ربا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 282 2۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 101 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا یعنی تمہارا اس حال پر ہونا مجھے اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کرنے کی صورت میں مجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا، کیونکہ کوئی شخص (کوئی چیز) نہیں کماتا مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے، یعنی جو معصیت اور گناہ اس نے کیا اور جو خطا اس سے صادر ہوئی اس کا مؤاخذہ اس کے سوا کسی اور سے نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ مخالفین میں سے بعض علماء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ فضولی کی بیع صحیح نہیں ہوتی اور یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت سے مراد یہ ہے کہ اسے ثواب و عقاب پر محمول کیا جائے گا (1) نہ کہ احکام دنیا پر۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی جیسا کہ اس کا بیان آئے گا۔ اور فضولی کی بیع ہمارے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، اگر وہ اس کی اجازت دے دے تو وہ جائز ہو جاتی ہے۔ عروہ البارقی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خرید و فروخت کی اور آپ کے حکم کے بغیر تصرف کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت عطا فرما دی۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

بخاری اور دار قطنی نے عروہ بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ مال (بکریاں) لائی گئیں تو آپ نے مجھے ایک دینار عطا فرمایا اور فرمایا: ''اے عروہ! مال کے پاس جاؤ اور ہمارے لیے اس دینار کے عوض ایک بکری خرید لو''۔ پس میں اس مال کے پاس آیا اور میں نے سودا کیا اور میں نے ایک دینار کے بدلے دو بکریاں خریدیں اور میں ان دونوں کو ہانک کر لے آیا تو راستے میں ایک آدمی مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے سودا کیا تو میں نے اسے ایک بکری ایک دینار کے عوض بیچ دی اور میں دوسری بکری اور ایک دینار لے کر آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ بکری ہے اور یہ آپ کا دینار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''تم نے یہ کیسے کیا''؟ تو میں نے آپ کو ساری بات عرض کی۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم بارك له فی صفقة یمینه (اے اللہ! اس کے لیے اس کے کاروبار میں برکت رکھ دے) پھر میں نے دیکھا کہ میں کوفہ کے محلہ کناسہ میں ٹھہرا ہوا ہوں اور میں نے چالیس ہزار کا نفع کمایا اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچوں۔ یہ دار قطنی کے الفاظ ہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ حدیث جید ہے اور اس میں دو بکریوں کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہونا صحیح ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے وہ دینار نہ لیتے اور نہ اپنے لیے بیع کو نافذ کرتے۔ اور اس میں وکالت کے جائز ہونے پر دلیل ہے اور اس میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب کوئی مؤکل اپنے وکیل کو کہے: تو اس طرح خرید۔ تو اس نے اس سے زیادہ کے عوض خریدا جس کے ساتھ اسے وکیل بنایا گیا تھا، تو کیا وہ امر لازم آئے گا یا نہیں؟ جیسا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہے: تو اس درہم کے عوض ایک رطل کا گوشت خرید لا، جس کا وصف (کوالٹی) یہ ہو۔ پس اس نے اس کے لیے اسی وصف کا چار رطل گوشت اس ایک درہم کے عوض خریدا۔ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 772

تمام کا تمام مؤکل کے لیے لینا لازم ہوگا بشرطیکہ صفت اور جنس میں موافقت ہو، کیونکہ وہ محسن (نیکی اور احسان کرنے والا) ہے۔ اور یہی قول امام یوسف اور امام محمد بن حسن کا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ زیادتی مشتری کے لیے ہوگی۔ اور یہ حدیث آپ کے خلاف حجت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، یعنی کسی شخص سے دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر نفس کا مواخذہ اس کے اپنے جرم کے سبب ہوگا اور اپنے گناہ کے سبب اسے سزا دی جائے گی۔ الوزر کا اصلی معنی ثقل (بوجھ) ہے اور اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ (الم نشرح) (اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اتار دیا) اور یہاں اس کا معنی ذنب (گناہ) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (انعام: 31) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: وَزَرَ يَوْزَرُ اور وُزِرَ يُوزَرُ اور وَزِرَ يَوْزَرُ، وَزْرًا اور اِزْرًا بھی جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: إسادۃ (کہ یہ اصل میں وسادۃ تھا) اور یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ کہتا تھا: تم میرے راستے کی اتباع اور پیروی کرو میں تمہارے بوجھ اٹھا لوں گا۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اس نظریہ کے رد کے لیے نازل ہوئی کہ آدمی سے اس کے باپ اور بیٹے کے بدلے اور اس کے حلیف کے گناہ کے بدلے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے مراد آخرت میں ہو اور اسی طرح اس آیت سے بھی جو اس سے پہلے ہے اور رہی دنیا تو اس میں بعض سے بعض کے جرم کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے، بالخصوص جب نیک اور اطاعت شعار لوگ گنہگاروں کو نہ روکیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدہ: 104) کے ضمن میں حدیث ابی بکر ہمیں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال: 25) (اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: 11) (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے)

اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک اور صالح لوگ ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں جب زنا بڑھ جائے گا" (1)۔ علماء نے بیان کیا ہے: (کہ اس کا معنی ہے) زنا کی اولاد (جب زیادہ ہو جائے گی) اور الخبث با کے فتحہ کے ساتھ یہ زنا کا اسم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس کے ذریعہ دیت خطا عاقلہ پر واجب کی ہے یہاں خون کی تعظیم کی خاطر کسی آزاد مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے اور اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 1056

نہیں ہے اور اس پر دلیل وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم اس دنیا میں ہو کہ عمرو کے فعل کا مؤاخذہ زید سے نہیں لیا جائے گا کہ جو جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کا انجام اسی پر ہوگا۔ اور ابوداؤد نے ابورمثہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں اپنے باپ کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے باپ کو فرمایا: ''کیا یہ تیرا بیٹا ہے''؟ تو باپ نے جواباً عرض کیا: ہاں رب کعبہ کی قسم۔ مزید کہا: حقا (یہ حق ہے) مزید کہا: اشھد بہ (میں اس کے بارے شہادت دیتا ہوں)۔ ابورمثہ کہتے ہیں: میرے باپ کے ساتھ میری مشابہت ثابت ہونے اور میرے باپ کے مجھ پر قسم کھانے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوب کھل کر مسکرائے۔ پھر ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ وہ تجھ پر کوئی گناہ نہیں ڈالے گا اور تو اس پر کوئی گناہ نہ ڈال سکے گا'' اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور یہ اس کے معارض نہیں ہے جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت:13) (اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ) کیونکہ اسے دوسری روایت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے: لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل:25) (تاکہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہے ہیں (جہالت سے) پس جو ضلالت و گمراہی میں امام بنا اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت دی اور اس پر عمل پیرا رہا تو اس پر ان کا بوجھ بھی ڈالا جائے گا جنہیں اس نے گمراہ کیا لیکن اس سے گمراہ ہونے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

''اور وہی ہے جس نے بنایا تمہیں (اپنا) خلیفہ زمین میں اور بلند کیا ہے تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں تاکہ آزمائے تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا فرمائی ہے، بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ، خَلٰٓئِفَ خلیفہ کی جمع ہے، جیسے کرائم، کریمۃ کی جمع ہے اور ہر وہ جو گزر جانے والے کے بعد آئے وہی خلیفہ ہوتا ہے(1)، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں گزشتہ امتوں اور قرون سابقہ کا خلیفہ بنایا ہے۔ شماخ نے کہا ہے:

تصیبُهُم و تخطِئنِي المنايا　　وأخلُف في رُبوعٍ عن رُبوعِ

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ یعنی خلقت، رزق، قوت، طاقت اور فضل و علم میں، بعض کو بعض پر اس نے بلند کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 147

دَرَجٰتٍ حرف جر کے حذف کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، یعنی الی درجات لِّيَبْلُوَكُمْ اسے لام کی کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور ابتلاء کا معنی اختبار (آزمائش) ہے یعنی تا کہ وہ تم میں سے اسے ظاہر کرے جو اس کا انجام ہوگا ثواب یا عقاب۔ اور وہ اپنے علم کے ساتھ ہمیشہ مستغنی ہے۔ پس اس نے خوشحال اور دولت مند کو دولت اور غنا کے ساتھ آزمایا اور اس سے شکر کا مطالبہ کیا اور اس نے تنگ دست کو فقر و افلاس کے ساتھ آزمایا اور اس سے صبر کا مطالبہ کیا۔ اور کہا جاتا ہے: لِّيَبْلُوَكُمْ یعنی تا کہ تم میں سے بعض بعض کو آزمائیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (الفرقان:20) (اور ہم نے بنا دیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش) اس کا بیان آگے آئے گا۔

پھر انہیں خوفزدہ کیا اور فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ بے شک آپ کا رب اسے جلد سزا دینے والا ہے جو اس کی نافرمانی اور گناہ کرے۔ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اور بے شک وہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اس کے لیے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے)

اور فرمایا: سَرِيْعُ الْعِقَابِ اس کے باوجود کہ اس کا وصف امہال (مہلت دینا) ہے اور اس کے باوجود کہ آگ کا عذاب جو آخرت میں ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ ہر آنے والی شی قریب ہوتی ہے، پس وہ اس بنا پر جلد سزا دینے والا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (النحل:77) (اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد) اور مزید فرمایا يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ (المعارج) (کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے لیکن ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) اور وہ اس کے لیے بھی سَرِيْعُ الْعِقَابِ ہو سکتا ہے جو دار دنیا میں اس کا مستحق ہو جائے، پس یہ اس جہت پر خطائیں اور گناہ واقع ہونے کی جگہوں اور مقامات کے لیے تحذیر اور ڈراوا ہے (1)۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۃ الانعام کا ترجمہ آج مورخہ 16 اگست 2007 بروز جمعرات بوقت 12 بج کر 45 منٹ پر اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ علی ذالك والصلوٰۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 1، صفحہ 529

سورۃ الاعراف

آیاتہا ۲۰۶ ۷ سورۃ الاعراف مکیۃ ۳۹ رکوعاتہا ۲۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یہ مکی سورت ہے، سوائے آٹھ آیتوں کے اور وہ یہ ہیں رب کریم کے ارشاد: وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ سے لے کر قولہ تعالیٰ: وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ تک (1)۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف پڑھی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کیا (2)۔ اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے۔

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲﴾

"الف، لام، میم، صاد۔ یہ کتاب ہے نازل کی گئی ہے آپ کی طرف پس چاہیے کہ نہ ہو آپ کے سینہ میں کچھ تنگی اس (کی تبلیغ) سے (یہ نازل کی گئی ہے) تاکہ آپ ڈرائیں اس سے اور یہ نصیحت ہے مومنوں کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓصٓ سورۃ البقرہ کے شروع میں ان حروف کی بحث گزر چکی ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور كِتٰبٌ اس کی خبر ہے، گویا کہ یہ فرمایا: الٓمّٓصٓ حروف كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ (یہ حروف ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے) اور کسائی نے کہا ہے: ای ھذا کتاب (یہ کتاب ہے) (اس میں کتاب خبر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ھذا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حَرَجٌ، ای ضیق (تنگی) یعنی آپ کا سینہ تبلیغ کے سبب تنگ نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: إنّی أخاف أن یثلغوا رأسی فیدعوہ خُبزۃ (3) (مجھے خوف ہے کہ وہ میرا سر کچل دیں اور اسے نشیبی جگہ میں پھینک دیں) الحدیث۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر میں یہ کلام نہی ہے، لیکن اس کا معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی کی نفی کرنا ہے، یعنی لا یضیق صدرك ألا یؤمنوا بہ (آپ کا سینہ تنگ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایمان نہیں لائے) بلاشبہ آپ پر تبلیغ کرنا لازم ہے اور اس کے ساتھ ڈرانے کے سوا ان کے ایمان یا کفر میں سے کوئی شے آپ پر لازم نہیں، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ الآیہ (الکہف: 6) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو) اور مزید فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ

1۔ المحرر الوجیز
2۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح باب القراۃ فی المغرب بالمص، حدیث نمبر 980،
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، جلد 2، صفحہ 385

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء) ((اے جان عالم!) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے)۔ اور حضرت مجاہد اور قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ یہاں حرج کا معنی شک ہے (1)، لیکن یہ کفر کا شک نہیں بلکہ تنگی کا شک ہے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اور اس (قول میں) بہت بعد ہے۔ اور منہ میں ہا ضمیر قرآن کے لیے ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ انذار کے لیے ہے، یعنی أنزل إلیك الکتاب لتنذر بہ فلا یکن فی صدرك حرج منہ (آپ کی طرف کتاب نازل کی گئی تا کہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں پس آپ کے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو) پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس تکذیب کے لیے ہے جو آپ کو قوت کلام عطا کر رہی ہے یعنی فلا یکن فی صدرك ضیق من تکذیب المکذبین لہ (آپ کے سینے میں اسے جھٹلانے والوں کی تکذیب سے کوئی تنگی نہ ہو)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ ذِكْرٰى اس کے لیے جائز ہے کہ یہ محل رفع، محل نصب اور محل خفض (جر) میں ہو۔ پس رفع کی دو وجہیں ہیں۔ بصریوں نے کہا ہے: یہ مبتدا مضمر کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف كِتٰبٌ پر ہے (لہٰذا یہ مرفوع ہے) اور نصب کی بھی دو وجہیں ہیں: ایک مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر، یعنی ذکّر بہ ذکری یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف أنزلناہ کی ہا ضمیر ہے (لہٰذا یہ منصوب ہے) اور محل جر اس بنا پر ہے کہ اسے لِتُنْذِرَ بِهٖ کے محل پر محمول کیا جائے۔ اور انذار (ڈرانا) کافروں کے لیے ہے اور نصیحت مومنوں کے لیے ہے، کیونکہ یہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"(اے لوگو!) پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اور نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کی، بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) یعنی کتاب و سنت۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ امر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سبھی کو شامل ہے اور ظاہر کلام یہ ہے کہ یہ امر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام لوگوں کے لیے ہے، یعنی اتبعوا ملۃ الإسلام والقرآن (تم دین اسلام اور قرآن کی پیروی کرو اور اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 54

کے حلال کو حلال قرار دو اور اس کے حرام کو حرام قرار دو اور اس کے امر کی پیروی کرو اور اس کی نہی سے اجتناب کرو(1)۔ اور یہ آیت نص کی موجودگی میں آراء کی پیروی ترک کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ، مِنْ دُوْنِهٖٓ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے دوستوں کی پیروی نہ کرو) اس میں ہا ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی یہ ہے: تم اس کے ساتھ کسی غیر کی عبادت نہ کرو اور نہ اسے دوست بناؤ جو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیر دے اور ہر وہ جس نے کسی مذہب کو پسند کر لیا تو وہ مذہب رکھنے والے اس کے اولیاء اور دوست ہیں۔

اور حضرت مالک بن دینار سے روایت ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی: وَلَا تَبْتَغُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوست تلاش نہ کرو) اور اَوْلِيَآءَ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے (جو قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ضمیر اس ما کی طرف لوٹ رہی ہے جو اس قول میں ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم، قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۝ اس میں ما زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ما فعل کے ساتھ مصدر ہوتا ہے۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝

''اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ پس نہ تھی ان کی (چیخ و) پکار جب آیا ان پر ہمارا عذاب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا: بے شک ہم ہی ظالم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اس میں کَمْ تکثیر کے لیے ہے، جس طرح کہ رُبَّ تقلیل کے لیے ہوتا ہے۔ اور کم مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اَهْلَكْنٰهَا اس کی خبر ہے، یعنی بہت سی بستیاں تھیں۔ قری بہت سے لوگوں کے اکٹھا رہنے کی جگہوں کو کہتے ہیں۔ ہم نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ اور کم کو اس بنا پر محل نصب میں قرار دینا بھی جائز ہے کہ اس کے بعد فعل مضمر ہو اور اس سے پہلے فعل مقدر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ استفہام اپنے سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور پہلے قول کو یہ قول تقویت دیتا ہے: وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ (الاسراء: 17) (اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد) اگر اَهْلَكْنٰهَا ضمیر کے ساتھ مشغول نہ ہوتا تو اس کے ساتھ کم کا محل یقیناً منصوب ہوتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَهْلَكْنٰهَا، قَرْيَةٍ کی صفت اور کَمْ معنی میں ھی القریۃ ہو اور جب تو نے القریۃ کی صفت لگائی تو گویا تو نے کم کی صفت لگائی۔

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا (النجم: 26) (اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آ سکتی) پس ضمیر معنی کے اعتبار سے کَمْ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ معنی میں ملائکہ ہیں۔ پس اس تقدیر پر یہ صحیح نہیں ہے کہ کَمْ محل نصب میں ہو اس فعل کے سبب جو اس کے بعد مضمر ہو۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 766

فَجَآءَهَا بَأۡسُنَا اس میں اشکال ہے فا کے ساتھ عطف ہونے کی وجہ سے۔ پس فراء نے کہا ہے: فا بمعنی واؤ ہے، پس ترتیب لازم نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے: (کہ اصل عبارت ہے) وکم من قریۃ أردنا إھلا کھا فجاءھا باسُنا (اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے برباد کرنے کا ارادہ کیا پس ہمارا عذاب ان پر آیا) جیسے یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ﴿۹۸﴾ (النحل) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہلاکت اور بربادی بعض قوم پر واقع ہوئی، پس تقدیر کلام ہو گی: وکم من قریۃ أھلکنا بعضھا فجاءھا بأسُنا فأھلکنا الجمیع (اور کتنی بستیاں تھیں ان میں سے بعض کو ہم نے برباد کر دیا پھر ہمارا عذاب ان پر آیا تو ہم نے تمام کو ہلاک کر دیا)۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے اور کتنی بستیاں تھیں ہم نے انہیں اپنے حکم اور فیصلے میں برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے انہیں اپنی طرف سے ملائکہ عذاب ان کی طرف بھیج کر برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا اور بأس سے مراد تباہ و برباد کر دینا، جڑ سے اکھیڑ دینا ہے۔ اور البأس کا معنی آدمی پر آنے والا عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: أھلکنا ھا فکان إھلا کنا ایاھم فی وقت کذا، فمجیٔ البأس علی ھذا ھوالإھلاك (ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ہمارا انہیں ہلاک کرنا فلاں وقت میں تھا، پس اس بنا پر عذاب آنے کا معنی ہلاک و برباد کرنا ہے)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ باس (عذاب) إھلاك (ہلاک کرنا) کے علاوہ ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور فراء نے بھی بیان کیا ہے کہ جب دو فعلوں کا معنی ایک ہو یا ایک کی طرح ہو تو ان میں سے جسے چاہے پہلے ذکر کر دے، پس معنی یہ ہے وکم من قریۃ جاءھا باسنا فاھلکناھا، جیسے دَنَا فقرُب اور قرُب فدنا (دونوں کا معنی قریب ہونا ہے) اور شتمنی فأساء اور أساء فشتمنی، کیونکہ الإساۃ اور الشتم (برا بھلا کہنا) دونوں ایک شی ہیں۔(1)

اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ﴿۱﴾ (القمر: 1) اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور انشق القمر فاقتربت الساعۃ دونوں کا معنی ایک ہے (قیامت قریب ہوئی اور چاند پھٹ گیا) بَيَاتًا اس کا معنی ہے۔ لیلا (رات کے وقت) اور اسی سے البیت ہے، کیونکہ اس میں رات گزاری جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بات یبیت بیتا وبیاتا (رات گزارنا) أَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ یعنی یا اس حال میں کہ وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ أَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ پس انہوں نے ثقیل سمجھا تو انہوں نے واؤ کو حذف کر دیا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ جب ذکر دوبارہ ہو تو واؤ کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ کہتے ہیں: جاءنی زیدٌ راکبا أوھو ماش اس میں واؤ کی ضرورت نہیں (اور وھو ماش نہیں کہا جائے گا) مہدوی نے کہا: یہ نہیں کہا بیاتا أو وھم قائلون کیونکہ جملہ میں ایک ضمیر ہے جو اول کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ واؤ سے مستغنی ہے۔ اور یہ معنی میں زجاج کے قول کے ساتھ برابر ہے اور یہاں أَوۡ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ تفصیل کے لیے ہے، جیسے آپ کے اس قول میں: لأکرمنك منصفاأو ظالما (میں ضرور بضرور تیری عزت و تکریم کروں گا تو میرے ساتھ

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 371

انصاف کرے یا ظلم) اور نحویوں کے نزدیک اس واؤ کو واوالوقت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور قَآىِٕلُوْنَ یہ قائلۃ سے ہے اور اس کا معنی ہے قیلولہ کرنا۔ اور اس کا معنی ہے دوپہر کے وقت سونا۔ اور یہ بھی کہا ہے: الإستراحة نصف النهار إذا إشتد الحر وإن لم يكن معها نوم (دوپہر کے وقت آرام کرنا جب گرمی شدید ہو اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو) اور آیت کا معنی یہ ہوا: ہمارا عذاب ان پر آیا اس حال میں کہ وہ غافل تھے یا تورات کے وقت یا دن کے وقت۔ اور الدعویٰ اس کا معنی دعا (پکارنا) ہے اور اسی سے یہ قول ہے: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ (یونس: 10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی)

اور نحویوں نے بیان کیا ہے: اللهم أشركنا في صالح دعوى من دعاك (اے اللہ! ہمیں اس اچھی اور صالح دعا میں شریک کرنا جو کوئی تجھ سے مانگے) اور کبھی دعوی بمعنی ادعاء (دعویٰ کرنا) بھی ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ بربادی اور ہلاکت کے وقت اس اقرار میں مخلص تھے کہ وہ ظالم لوگ تھے۔ اور دَعْوٰىهُمْ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا اسم اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا ہے اور اس کی نظیر فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا (النمل: 56) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الدعوی محل رفع میں ہو اور اَنْ قَالُوْۤا محل نصب میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا (البقرہ: 177) اس میں البر رفع کے ساتھ ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا (الروم: 10) اس میں عاقبۃ رفع کے ساتھ ہے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ ۝

"سو ہم ضرور پوچھیں گے ان سے بھیجے گئے (رسول) جن کی طرف اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے۔ پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے اور نہ تھے ہم ان سے غائب"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار سے حساب لیا جائے گا۔ اور قرآن میں ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ) (پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے)۔

اور سورۃ القصص میں ہے: وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (القصص) (اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ) یعنی جب وہ عذاب میں قرار پکڑ جائیں گے۔ اور آخرت میں کئی وطن ہوں گے۔ ایک وطن ایسا ہوگا جس میں حساب وکتاب کے لیے پوچھ گچھ کی جائے گی اور ایک وطن ایسا ہوگا جس میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور ان سے سوال (عذاب کو) پختہ کرنے، زجر و توبیخ اور انہیں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ہوں گے۔ اور رسولوں سے سوال اپنے بارے میں گواہ لانے اور تفصیل بیان کرنے کے بارے ہوں گے یعنی انہیں ان کی قوم نے جو جوابات دیئے (ان کے بارے ان سے پوچھا جائے گا)

اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لِيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (الاحزاب: 8) (یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق) کا یہی معنی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ یعنی انبیاء علیہم السلام سے ہم پوچھیں گے۔ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ اور ہم ان ملائکہ سے پوچھیں گے جو ان کی طرف بھیجے گئے۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ میں لام قسمیہ ہے اور یہ حقیقۃً تاکید کے لیے ہے۔ اور اسی طرح فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ) ان پر (ان کے حالات) بیان کرے گا۔ وَّ مَا كُنَّا غَآىِٕبِیْنَ یعنی ہم ان کے اعمال کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اور آیت اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ جاننے والا ہے۔

وَ الْوَزْنُ یَوْمَىِٕذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ ۝۹

''اور (اعمال کا) تولنا اس دن برحق ہے پس جن کے بھاری ہوئے ترازو تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور جن کے ہلکے ہوئے ترازو تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو بوجہ اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الْوَزْنُ یَوْمَىِٕذِ ﹰالْحَقُّ یہ مبتدا اور خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ الْحَقُّ صفت ہو اور خبر یَوْمَىِٕذٍ ہو اور یہ بھی جائز ہے الْحَقُّ مصدر کی بنا پر منصوب ہو۔

اور وزن سے مراد میزان (ترازو) کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کرنا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بندوں کے صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا اور یہی صحیح ہے اور اسی کے بارے حدیث میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میزان سے مراد وہ کتاب ہے جس میں مخلوق کے اعمال درج ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میزان سے مراد نیکیوں اور گناہوں کا عیاں ہونا ہے۔ اور آپ سے حضرت ضحاک اور اعمش سے یہ بھی مروی ہے کہ وزن اور میزان عدل اور قضا (عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا) کے معنی میں ہیں اور وزن کا ذکر بطور ضرب المثل ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا الکلام فی وزن ھذا وفی وزانہ یعنی یہ کلام اس کے مساوی اور ہم پلہ ہے اگرچہ وہاں کوئی وزن نہیں۔ زجاج نے کہا ہے: لغت اور زبان کے اعتبار سے یہ جائز ہے اور اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اس کی اتباع اور پیروی کی جائے جو ان صحیح احادیث میں ہے جو میزان کے ذکر میں وارد ہیں۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: اس بارے میں انہوں نے جو کہا خوب کہا کہ اگر میزان کو اس (مذکورہ معنی) پر محمول کیا جائے تو پھر چاہیے کہ پل صراط کو دین حق (کے معنی) پر محمول کیا جائے، جنت اور دوزخ اس معنی پر جوارواح پر صادق آتا ہے نہ کہ اجسام پر اور شیاطین اور جنات کو اخلاق مذمومہ پر اور ملائکہ کو قوائے محمودہ کے معنی پر محمول کیا جائے، حالانکہ امت کا دور اوّل میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہ تمام الفاظ بغیر کسی تاویل کے اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ اور تاویل نہ ہونے پر اجماع ہے تو پھر ظاہر معنی مراد لینا واجب ہے اور یہ ظواہر ہی نصوص ہو گئے۔

ابن فورک نے کہا ہے: معتزلہ نے اس بنا پر میزان کا انکار کیا ہے کہ اعراض کا وزن کرنا محال ہے، کیونکہ وہ بالذات قائم ہی نہیں ہوتے۔ اور متکلمین میں سے بعض کہتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام میں بدل دے گا اور وہ قیامت کے دن ان

کا وزن کرے گا۔ اور یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ موازین ان کتابوں کے سبب بوجھل اور بھاری ہوں گے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں اور انہیں کے سبب خفیف اور ہلکے ہوں گے۔ اور حدیث طیبہ میں وہ مروی ہے جو اس کو ثابت کرتا ہے اور وہ اس طرح مروی ہے کہ بعض لوگوں کا میزان (ترازو) قریب ہے کہ نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے پھر اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے گا جس پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھا ہوگا تو وہ بھاری ہو جائے گا، تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ ان کتابوں کے وزن کی طرف راجع ہے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں نہ کہ نفس اعمال کی طرف اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میزان کو ہلکا کر دے گا جب چاہے گا اور بھاری کر دے گا جب ارادہ فرمائے گا اس شے کے ساتھ جو ان صحف میں سے اس کے پلڑوں میں رکھی جائے گی جن میں اعمال درج ہیں۔

اور صحیح مسلم میں صفوان بن محرز سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: آپ نے کیا سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نجویٰ (سرگوشی) کے بارے کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک مومن کو قیامت کے دن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا اور اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا: کیا تو (اسے) پہچانتا ہے۔ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں، تو رب کریم فرمائے گا: چونکہ میں نے اسے دنیا میں تجھ پر مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے اور میں اسے آج بھی تیرے لیے معاف فرماتا ہوں، پس اسے اس کی نیکیوں کا صحیفہ عطا کر دیا جائے گا۔ اور رہے کفار اور منافقین تو انہیں بھی مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا'' (1)۔ پس آپ کا قول: فيعطى صحيفة حسناته یہ اس پر دلیل ہے کہ اعمال صحف میں لکھا جاتے ہیں اور ان کا وزن کیا جائے گا۔

اور ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا اور اس پر ننانوے رجسٹر (دفتر) کھل جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نگاہ تک ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو اس میں سے کسی کا انکار کرتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا میرے کراماً کاتبین فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا تیرا کوئی عذر ہے، کیا تیری کوئی نیکی ہے؟ تو وہ آدمی ڈر جائے گا اور عرض کرے گا: نہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا: (کیوں نہیں) بلکہ ہمارے پاس تیری نیکیاں ہیں اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہوگا، پھر اس کے لیے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں یہ لکھا ہوگا أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدًا عبده ورسوله (میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں) تو وہ پوچھے گا: اے میرے رب! ان رجسٹروں کے ہوتے ہوئے اس کاغذ کے ٹکڑے کی کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: بلاشبہ تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا پس وہ کاپیاں (اور رجسٹر) ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو کاپیوں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہو جائے گا'' (2)۔ ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں:

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، جلد 2، صفحہ 360   2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 328

فلا یثقل مع اسم اللہ شئ (1) پس اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی شی بھاری نہیں ہو سکتی۔ اور فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس بارے مزید بیان سورۃ الکہف اور سورۃ الانبیاء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ مَوَازِينُهُ یہ میزان کی جمع ہے اور اس کی اصل موزان ہے، واؤ ماقبل مکسور کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ وہاں ایک عامل کے لیے کئی میزان ہوں اور ہر میزان کے ساتھ ایک نوع کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میزان ایک ہو اور اسے لفظ جمع کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہو، جیسے آپ کہتے ہیں: خرج فلان إلى مكة على البغال، اور خرج إلى البصرة في السفن۔ اور قرآن کریم میں ہے: كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء) اور كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء) اور بلاشبہ دو تاویلوں میں سے ایک کے مطابق وہ رسول ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الموازین، موزون کی جمع ہے، نہ کہ میزان کی اور موازین سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا وزن کیا جائے گا۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ اس کی تفسیر بھی مذکورہ تفسیر کی مثل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نیکیوں اور بدیوں کا وزن ایسے ترازو میں کیا جائے گا جس کی ایک لسان (یعنی وہ حصہ جو تولتے وقت ہاتھ میں رہتا ہے) اور دو پلڑے ہیں، پس جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اس کے عمل کو انتہائی حسین صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو اس کی نیکیاں اس کی بدیوں پر غالب آجائیں گی اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، اور کافر کے عمل کو انتہائی قبیح صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس کا وزن ہلکا ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ جہنم میں گر جائے گا۔ اور جس کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اشارہ کیا ہے وہ اس کے قریب ہے جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال میں سے ہر جز کا جوہر تخلیق فرمائے گا اور اسی جوہر کا وزن کیا جائے گا اور اسے ابن فورک وغیرہ نے رد کیا ہے۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''جب مومن کی نیکیاں کم ہوں گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کے پورے کی مثل کاغذ کا ٹکڑا نکالیں گے اور اسے میزان کے اس دائیں پلڑے میں ڈال دیں گے جس میں اس کی نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں بڑھ جائیں گی (یعنی یہ پلڑا بھاری ہو جائے گا) پس وہ بندہ مومن حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کرے گا: آپ پر میرے ماں باپ نثار! آپ کا چہرہ مبارک کتنا حسین ہے اور آپ کے اخلاق کتنے خوبصورت ہیں (یہ تو بتائیے) آپ کون ہیں؟ تو آپ فرمائیں گے: أنا محمد نبيك و هذه صلواتك التي كنت تصلي علي قد وفيتك أحوج ما تكون إليها (میں تیرا نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور یہ تیرا وہ درود پاک ہے جو مجھ پر تو پڑھتا تھا اور میں نے تیری وہ حاجت پوری کر دی جس کا تو زیادہ حاجت مند تھا۔ اسے قشیری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے (2) اور بیان کیا کہ یہ **بطاقہ** (با کے کسرہ کے ساتھ) کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جس میں سامان (متاع)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فیمن یموت وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ، حدیث نمبر 2563، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر کبیر، جلد 13، صفحہ 27

کی تفصیل لکھی جائے یہ اہل مصر کی لغت کے مطابق ہے۔

اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ محمد بن یحییٰ نے بیان کیا کہ بطاقہ لکھی ہوئی پرچی (رقعہ) کو کہتے ہیں (1) اور اہل مصر رقعۃ کو بطاقۃ کہتے ہیں۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن وزن کرنے والے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہوں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: یا جبریل زِنْ بینھم فردساً من بعض علی بعض (اے جبریل! ان کے درمیان وزن کراور بعض سے بعض کی طرف لوٹا دے) فرمایا: وہاں کوئی سونا اور چاندی نہ ہوگا۔ پس اگر ظالم کی نیکیاں ہوں گی تو اس کی نیکیاں لے کر مظلوم کی طرف لوٹا دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ لے کر ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پس وہ آدمی لوٹے گا اور اس پر پہاڑ کی مثل (بوجھ) ہوگا (2)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ''کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم! میزان کے پاس کرسی کی جانب جاؤ اور اپنی اولاد کے ان اعمال کی طرف دیکھو جو تمہاری طرف اٹھائیں جائیں گے پس جس کی نیکی شر پر رائی کے دانہ کے برابر بھی بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جنت ہے اور جس کا شر اس کی نیکی پر رائی کے دانہ کی مقدار بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جہنم ہے یہاں تک کہ تو جان لے گا کہ میں ظالم کے سوا کسی کو عذاب نہیں دوں گا''۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۟

''اور یقیناً ہم نے ہی آباد کیا تمہیں زمین میں اور مہیا کر دیئے تمہارے لیے اس میں زندہ رہنے کے اسباب بہت ہی کم تم شکر ادا کرتے ہو''۔

یعنی ہم نے زمین کو تمہارے لیے سکونت کی جگہ اور بچھونا بنا دیا اور ہم نے تمہارے لیے اس میں اسباب معیشت پیدا فرما دیئے۔ مَعَایِش معیشۃ کی جمع ہے، یعنی کھانے پینے میں سے وہ چیزیں جن کے لیے کوشش کی جاتی ہے اور جن کے ساتھ زندگی قائم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عاش یعیش عیشا و معاشا و معیشا و معیشۃ و عیشۃ۔ اور زجاج نے کہا ہے: معیشۃ سے مراد وہ سبب زندگی ہے جس کے ساتھ زندگی متصل ہوتی ہے۔ اخفش اور کثیر نحویوں کے نزدیک معیشۃ مفعلۃ کے وزن پر ہے (یعنی مصدر میمی)۔ اور اعرج نے معائش ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح خارجہ ابن مصعف نے نافع سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہمزہ غلطی ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ واحد معیشۃ ہے اور اس کی اصل مَعْیِشَۃ ہے، پھر الف وصل کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ اور یا دونوں ساکن ہیں، پس حرکت دینا ضروری ہے، کیونکہ حذف کا کوئی راستہ نہیں۔ اور الف کو حرکت نہیں دی جا سکتی پس یا کو وہ حرکت دی گئی جو اس کے لیے واحد میں ثابت ہے اور واؤ میں اس کی مثال منارۃ و مناور اور مقام و مقاوم ہے، جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

وانی لقوّام مقاوِمُ لم یکن جریر ولا مُوْلَی جریرٍ یقُومھا

اور اسی طرح مصیبۃ و مَصَاوِب ہے۔ یہ جید اور عمدہ ہے اور لغت شاذہ مصائب ہے۔ اخفش نے کہا ہے: بلاشبہ مصائب

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 69

جائز ہے، کیونکہ اس کا واحد معتل ہے (یعنی اس میں حرف علت موجود ہے)۔

زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس طرح ان پر مقائم کہنا لازم آئے گا، البتہ یہ قول ہے کہ یہ وسادۃ اور إسادۃ کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَعَایِشَ میں ہمزہ جائز نہیں، کیونکہ معیشۃ مفعلۃ کے وزن پر ہے، اس میں یا اصلیہ ہے اور ہمزہ تب ہوتا ہے جب یا زائدہ ہو جیسے مدینۃ و مدائن اور صحیفۃ و صحائف اور کریمۃ و کرائم اور وظیفۃ و وظائف اور ان کے مشابہ الفاظ میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖۗ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ۝۱۱

"اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل و صورت بنائی تمہاری پھر حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے نہ تھا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ جب الله تعالیٰ اپنی نعمت کا ذکر کر چکا تو اس نے اپنی تخلیق کی ابتدا کا ذکر فرمایا۔ اور خلق کا معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں نطفہ کی صورت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہاری خاص شکل و صورت بنائی پھر ہم تمہیں خبر دے رہے ہیں کہ ہم نے ملائکہ کو کہا: آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

اور حضرت ابن عباس اور ضحاک وغیرہما سے روایت ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا پھر ہم نے اس کی پشت میں تمہیں خاص شکل و صورت عطا فرمائی۔ اور اخفش نے کہا: ثُمَّ بمعنی واؤ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، بعد ازاں ہم نے ملائکہ کو کہا: تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، پھر ہم نے تمہیں خاص شکل و صورت عطا فرمائی۔ تو یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا کیا، تو ان کا ذکر لفظ جمع کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ آپ ابوالبشر ہیں۔ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یہ ضمیر بھی آپ ہی کی طرف راجع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: نحن قتلناکم یعنی قتلنا سیدکم (کہ ہم نے تمہارے سردار کو قتل کر دیا) پھر کہا: ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اور اس بنا پر تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ مراد حضرت آدم علیہ السلام اور مائی حوا علیہا السلام ہیں۔ پس حضرت آدم علیہ السلام خاک سے ہیں اور حضرت حواء علیہا السلام آپ کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، پھر اس کے بعد شکل و صورت بنی۔ سو معنی یہ ہوا: تحقیق ہم نے تمہارے والدین (حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حوا علیہا السلام) کو پیدا فرمایا پھر ہم نے ان دونوں کو خاص شکل و صورت عطا فرمائی۔ حسن نے یہی کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں اس وقت خاص شکل و صورت عطا کی جس

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 321

وقت ہم نے تم سے میثاق (وعدہ) لیا۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اسے آپ سے ابن جریج اور ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے اچھا قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اس طرف جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر انہیں اس وقت شکل وصورت عطا فرمائی جب ان سے میثاق لیا، پھر ملائکہ کو سجود کا حکم اس کے بعد ہوا۔ اور اسے یہ ارشاد تقویت دیتا ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الاعراف: 172) (اور اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو) اور یہ حدیث طیبہ بھی ''کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چیونٹیوں کی طرح نکالا اور ان سے میثاق لیا'' (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ اخبار کے لیے ہے، یعنی ہم نے تمہیں آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں ارحام میں شکل وصورت عطا فرمائی۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ صحیح قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان تمام اقوال کا احتمال ہوسکتا ہے، البتہ ان میں سے صحیح وہ ہے جس کی تائید قرآن کریم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

اس میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور مزید فرمایا: وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسا: 1) (اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا)

پھر فرمایا: جَعَلْنٰهُ یعنی ہم نے ان کی نسل اور اولاد کو بنایا۔ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ الآیہ (المومنون) (پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں) پس حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا گیا پھر شکل وصورت بنائی گئی اور انہیں سجود کی عزت وتکریم سے نوازا گیا اور ان کی نسل اور اولاد کی شکلیں اور صورتیں ماؤں کے رحموں میں بنائی گئیں رحموں میں اور باپوں کی صلبوں میں تخلیق کیے جانے کے بعد، حالانکہ سورۃ الانعام کی ابتدا میں گزر چکا ہے کہ ہر انسان کو نطفہ اور مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، پس اس میں غور کرلو۔ اور یہاں فرمایا: خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ۔

اور سورۃ الحشر کے آخر میں فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (وہ اللہ سب کا خالق، سب کو پیدا کرنے والا (سب کی مناسب) صورت بنانے والا ہے) تو اس میں تصویر (شکلیں بنانے) کا ذکر (برئ) جامہ خلقت پہنانے کے بعد ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے ارواح کو پہلے پیدا کیا پھر بعد میں جسموں کو شکل وصورت عطا کی۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ یہ استثنا من غیر جنسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے استثنا ہے تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا نہیں؟ جیسے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2455، روایت بالمعنی

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے، ابلیس نے کہا: (کیونکہ) میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا مجھے آگ سے اور تو نے پیدا کیا اسے کیچڑ سے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا مَنَعَكَ، مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، یعنی أیُّ شیٍٔ منعك؟ (کون سی شے ہے جس نے تجھے روکا ہے؟) یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اَلَّا تَسْجُدَ یہ محل نصب میں ہے، یعنی مِنْ أنْ تسجد (تجھے سجدہ کرنے سے) اور لا زائدہ ہے۔ اور سورہ ''ص'' آیت 75 میں ہے مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے) اور شاعر نے کہا ہے:

أبَی جُودُہ لا البخلَ فاستعجلت بہ نَعَمْ من فَتیً لا یمنع الجودَ نائلُہ (1)

اس میں مراد أبی جودہ البخل ہے، اس میں لا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لا زائدہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں منع قول اور دعا کی ایک طرف ہے، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ فرمایا: من قال لك ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے کہا کہ تو سجدہ نہ کرے؟) یا من دعاك إلی ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے اس طرف دعوت دی کہ تو سجدہ نہ کرے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قد قلت لك ألّا تفعل كذا (تحقیق میں نے تجھے کہا کہ تو اس طرح نہ کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت ہے: مَا مَنَعَكَ من الطاعةِ و أحوجك إلی ألّا تسجد (کون سی شی نے تجھے اطاعت سے روکا ہے اور تجھے اس کا محتاج بنا دیا ہے کہ تو سجدہ نہ کرے؟)

علماء نے کہا ہے: وہ شے جس نے اسے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا تھا وہ تکبر اور حسد تھا۔ اور اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا جب اسے اس کے بارے حکم دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۷۱﴾ (ص) (کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے)

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۷۲﴾ (ص) (پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھر پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے) تو گویا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۷۲﴾ کے قول سے اس میں امر عظیم (بہت بڑا اضطراب) داخل ہو گیا، کیونکہ اس سجدہ کرنے میں سجدہ کرنے والے کی ذلت و رسوائی اور جس کے لیے کیا گیا اس کی عزت و تکریم ہے پس اس نے اپنے دل میں یہ رکھ لیا کہ وہ سجدہ نہیں کرے گا جس وقت اسے اس کا حکم دیا گیا۔ پس جب حضرت آدم علیہ السلام میں روح پھونکی گئی تو ملائکہ سجدے میں گر گئے اور وہ ان کے درمیان کھڑا باقی رہا، پس اس نے اپنے قیام اور سجدہ ترک کرنے کے ساتھ اسے ظاہر کر دیا جو اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ یعنی میرے حکم کی پیروی سے تجھے کس نے روکا ہے؟ تو اس نے اپنے دل کا راز نکال دیا اور کہا: اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 378

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَمَرْتُكَ یہ اس پر دلیل ہے جو فقہاء کہتے ہیں کہ جب امر مطلق بغیر قرینہ کے ہو تو وہ وجوب کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اس میں مذمت اس امر مطلق کو ترک کرنے پر معلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (آدم کو سجدہ کرو) اور یہ بین اور واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ یعنی سجدہ کرنے سے مجھے میری اس فضیلت نے روکا ہے جو مجھے اس پر حاصل ہے۔ ابلیس کی طرف سے یہ جواب بالمعنی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لمن ھذہ الدار؟ یہ گھر کس کا ہے؟ تو مخاطب کہتا ہے: مالکھا زید (اس کا مالک زید ہے) تو یہ عین جواب نہیں ہے، بلکہ ایسا کلام ہے جو معنی جواب کی طرف راجع ہے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ پس اس نے گمان کیا کہ آگ مٹی سے اشرف و اعلیٰ ہے، اس لیے کہ یہ بلند مرتبہ ہے، بلندی کی طرف چڑھنے والی ہے اور تیز رفتار ہے اور اس لیے بھی کہ یہ ایک روشن جوہر ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور اس نے قیاس میں غلطی کی پس جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا اللہ تعالیٰ اسے ابلیس کے ساتھ ملا دے گا۔ ابن سیرین نے کہا: سورج و چاند کی عبادت صرف اور صرف قیاسوں کے مطابق کی گئی۔

اور حکماء نے کہا ہے: اللہ کے اس دشمن نے اس بارے میں خطا اور غلطی کی ہے کہ اس نے آگ کو مٹی پر فضیلت دی ہے، اگرچہ یہ دونوں جامد مخلوق ہونے کے اعتبار سے ایک درجہ میں ہیں، پھر بھی مٹی آگ سے چار وجہ سے افضل و برتر ہے۔

(۱) مٹی کے جوہر میں استحکام اور سکون ہے، وقار اور بردباری ہے، حلم، حیا اور صبر ہے اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کو مذکورہ سعادت و اعزاز کے بعد توبہ، تواضع اور عجز و انکساری کی طرف دعوت دینے والا ہے، پس اس نے آپ کو مغفرت، اجتباء اور ہدایت کا وارث بنا دیا۔ اور آگ کے جوہر میں خفت (ذلت) طیش، حرارت، بلندی اور اضطراب ہے اور یہ ابلیس کو مذکورہ شقاوت و بدبختی کے بعد تکبر اختیار کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی دعوت دینے والا ہے، پس اس نے اسے ہلاکت، عذاب، لعنت اور شقاوت کا وارث بنا دیا۔ یہ قفال نے کہا ہے۔ (۲) بے شک حدیث اس پر ناطق ہے کہ جنت کی مٹی انتہائی خوشبودار کستوری (کی مثل) ہے اور اس پر کوئی حدیث نہیں کہ جنت میں آگ ہے اور (نہ اس پر) کہ جہنم میں مٹی ہے۔ (۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ آگ عذاب کا سبب ہے اور یہ اللہ کا عذاب اس کے دشمنوں کے لیے ہے، لیکن مٹی عذاب کا سبب نہیں ہے۔

(۴) مٹی آگ کی محتاج نہیں اور آگ مکان کی محتاج ہے اور اس کا مکان مٹی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک پانچویں قول کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مٹی سجدہ کرنے کی جگہ اور پاک کرنے والی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔ اور آگ ڈرانے والی اور عذاب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (الزمر: 16)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابلیس کے لیے قیاس کی نسبت اطاعت و فرمانبرداری اولیٰ اور بہتر تھی لیکن اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور یہ وہ پہلا فرد ہے جس نے اپنی رائے کے مطابق قیاس کیا اور نص کی مخالفت میں قیاس مردود ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قیاس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ کچھ اس کے قائل ہیں اور کچھ اسے رد کرنے والے ہیں۔ پس جو اس کے قائل ہیں وہ صحابہ، تابعین، اور ان کے بعد آنے والے جمہور ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً جائز ہے اور شرعاً ایسا واقع ہوا ہے اور یہی صحیح ہے۔

شافعیہ میں سے قفال اور ابوالحسین بصری اس طرف گئے ہیں کہ اس کے مطابق عقلاً عمل کرنا واجب ہے اور نظام نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ اور بعض اہل ظواہر نے اس کا رد کیا ہے، لیکن پہلا (قول) صحیح ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ'' میں کہا ہے: اس کا معنی ہے لا عصمۃ لِأحد إلّا فی کتاب اللہ او سنۃ نبیہ اوفی إجماع العلماء اذا وجد فیھا الحکم فإن لم یوجد فالقیاس (کسی کے لیے عصمت اور بچاؤ نہیں ہے مگر کتاب میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں علماء کے اجماع میں جب کہ اس میں حکم پایا جائے اور اگر حکم نہ پایا جائے تو پھر قیاس ہے) اور اسی بنا پر انہوں نے عنوان باندھا باب من شبہ اصلا معلوما بأصل مبین قد بیّن اللہ حکمھا لیفھم السائل (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے کسی اصل معلوم کو اس اصل مبین کے ساتھ تشبیہ دی جس کے حکم کو اللہ نے بیان فرما دیا تا کہ سائل سمجھ جائے) اور اس کے بعد یہ عنوان ذکر کیا۔ باب الأحکام التی تعرف بالدلائل و کیف معنی الدلالۃ و تفسیرھا (یہ بات ان احکام کے بیان میں ہے جو دلائل سے پہچانے جاتے ہیں اور دلالۃ کا معنی اور اس کی تفسیر کیا ہے)۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: کتاب اللہ، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اجماع امت سے اجتہاد و استنباط کرنا ہی حق واجب ہے اور اہل علم کے لیے فرض لازم ہے اور اس بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے کئی احادیث و روایات مروی ہیں۔ اور ابوتمام مالکی نے کہا ہے: امت نے قیاس پر اجماع کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کا زکوٰۃ میں سونے اور چاندی کے قیاس پر اجماع ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: أقیلونی بیعتی (تم میری بیعت توڑ دو) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ لا نقیلك ولا نستقیلك، رضیك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا أفلا نرضاك لدنیانا؟ (1) (قسم بخدا! نہ ہم آپ کی بیعت توڑیں گے اور نہ توڑنے کا مطالبہ کریں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہمارے دین کے لیے پسند فرمایا ہے تو ہم کیوں نہ آپ کو اپنی دنیا کے لیے پسند کریں گے) تو اس میں آپ نے امامت کو نماز پر قیاس کیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا اور فرمایا: واللہ لا أفرق بین ما جمع اللہ (2) (قسم بخدا! میں ان کے درمیان تفریق نہیں کروں گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے جمع فرمایا ہے) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں شراب پینے والے کے بارے میں قیاس کی تصریح کر دی اور فرمایا: إنّہ إذا سکر ھَذَی، و اذا ھَذَی إفتری، فحدہ حد القاذف (بے شک جب وہ نشے میں ہوتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان کہتا ہے تو بہتان تراشی کرتا ہے پس اس کی حد تہمت لگانے والے کی حد کی مثل ہوگی) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف ایک خط لکھا اور اس میں فرمایا: الفَھْم الفَھْم فیما یختلِجُ فی صدرك فما لم یبلغك فی الکتاب والسنۃ، أعرف الأمثال والأشباہ،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 133، روایت بالمعنی
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 67

ثم قس الامور عند ذالك، فاعمد الى أحبها إلى الله تعالى وأشبهها بالحق فيما ترى، الحديث بطوله ذكره الدارقطني(1) (خوب سمجھو اور غور فکر کرو ایسے امر میں جس کے بارے میں تمہارے دل میں کوئی خلش اور شک پیدا ہو جائے اور اس کے بارے کتاب وسنت کا حکم تمہیں نہ پہنچے تو اس کی امثال واشباہ کو پہچانو، پھر ان امور میں سے کسی پر قیاس کر لو اور اس پر اعتماد کرو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو اور تمہاری رائے میں حق کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہو۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیث وباء میں کہا، جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام سرغ سے واپس لوٹے! نَفِرّ من قَدَر الله؟ (کیا ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نعم! نَفِرّ من قَدَر اللهِ إلى قَدَر الله (ہاں! ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: تمہاری کیا رائے ہے(2)...... پس آپ نے اسے ان مسائل پر قیاس کیا اور ان کے مطابق اس میں غور وفکر کی جو اس سے مشابہت رکھتے تھے اور یہ سب مہاجرین وانصار کی موجودگی میں ہوا اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور اس معنی میں جہاں تک آثار اور آیات قرآنیہ کا تعلق ہے تو وہ کثیر اور بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس اصول دین میں سے ایک اصل ہے۔

اور مسلمانوں کی حفاظت اور بچاؤ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور عمل کرنے والے علماء اس کی پناہ لیتے ہیں اور اس کے ساتھ احکام مستنبط کرتے ہیں اور یہ ان کی جماعت کا قول ہے جو حجت ہیں اور جو ان سے الگ ہو گیا اس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ اور رہی مذموم رائے اور ایسا قیاس جس میں منهی عنه (وہ شی جس سے منع کیا گیا ہو) کے بارے تکلف کیا گیا ہو تو وہ اس مذکورہ اصول پر نہیں، کیونکہ وہ ظن اور شیطان کی جانب سے دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء: 36) (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں) اور قیاس کی مذمت میں جتنی کمزور اور ضعیف اخبار واحادیث قیاس کے مخالف لاتے ہیں تو وہ قیاس مذموم کی اس نوع پر محمول ہیں، جس کی شریعت میں کوئی اصل معلوم نہیں۔ اس بارے مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اتر جا یہاں سے مناسب نہیں ہے تیرے لیے کہ تو غرور کرے یہاں رہتے ہوئے پس نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی فرمایا: تو آسمان سے اتر جا۔ فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا کیونکہ اس کے باسی تواضع اور انکساری کرنے والے فرشتے ہیں۔ فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ پس تو نکل جا بلاشبہ تو ذلیلوں میں سے ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے اپنے مولیٰ کی نافرمانی کی تو وہ ذلیل ہے۔

ابو روق اور بجلی نے کہا: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو اپنی اس صورت سے الگ ہو جا جس میں تو ہے، کیونکہ اس نے اس پر فخر کیا کہ

1۔ سنن دارقطنی، حدیث نمبر 4471　　2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1683 مختصر

وہ آگ سے ہے پس اس کی صورت تاریکیوں کے ساتھ اور اس کی چمک اور روشنی کے زوال کے ساتھ بدشکل ہوگئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف منتقل ہو جا، جیسے کہا جاتا ہے: ھبطنا ارض کذا یعنی ہم دوسری جگہ فلاں زمین کی طرف منتقل ہو گئے، تو گویا اسے زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف نکال دیا گیا اور اس کا غلبہ اور سلطنت انہیں میں ہے اور وہ زمین جس میں داخل نہیں ہو سکتا مگر چور کی حالت کی طرح وہ اس میں ڈرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس سے نکل جاتا ہے۔ پہلا قول اظہر اور واضح ہے اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾

''بولا مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے''۔

اس نے قبروں سے اٹھانے اور حساب کے دن تک باقی رہنے کی مہلت مانگی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ وہ نہ مرے، کیونکہ یوم البعث کے بعد پھر کوئی موت نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی وغیرہما رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے نفخہ اولیٰ تک مہلت دی کہ اس وقت تمام مخلوق مر جائے گی۔ اور اس کا مہلت کا مطالبہ نفخہ ثانیہ تک تھا جس وقت لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے اٹھیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار فرما دیا۔ اور فرمایا: اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اور جسے اٹھایا جائے گا اس کا ذکر پہلے نہیں کیا، کیونکہ یہ قصہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے بارے میں ہے، پس قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہی ہیں جنہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا۔

قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾

''کہنے لگا اس وجہ سے کہ تو نے مجھے (اپنی رحمت سے) مایوس کر دیا میں ضرور تاک میں بیٹھوں گا ان (کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستہ پر۔ پھر میں ضرور آؤں گا ان کے پاس (بہکانے کے لیے) ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو نہ پائے گا ان میں سے اکثر کو شکر گزار''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ اغواء کا معنی ہے ایقاع الغی فی القلب (دل میں گمراہی کو واقع کرنا) یعنی اس وجہ سے کہ تو نے میرے دل میں گمراہی، عناد اور تکبر ڈال دیا۔ اور یہ اس لیے (کہا) کیونکہ ابلیس کا کفر کفر جہالت نہیں، بلکہ وہ کفر عناد و تکبر ہے۔ اور اس کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی قسم ہے، یعنی تیرے مجھے گمراہ کرنے کی قسم میں ضرور بضرور ان کے لیے تیرے راستے

پر، یا تیرے راستے میں بیٹھوں گا، پس کلام میں حذف ہے فبا غوائك إیای لأ قعدن لهم علی صراطك أوفی صراطك اس قول کی دلیل اس کا وہ قول ہے جو سورہ ص میں ہے: فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (تیری عزت کی قسم! میں ضرور بضرور ان تمام کو گمراہ کروں گا) تو گویا ابلیس اللہ تعالیٰ کے اسے گمراہ کرنے کی مقدار سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں اسے بندوں پر تسلط اور غلبہ دینے کا ذکر ہے، پس اس نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی قدر کے عظیم ہونے پر قسم کھائی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی لام ہے، گویا اس نے یہ کہا: فلإ غوائك إیای (تیرے مجھے گمراہ کرنے کی وجہ سے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ با بمعنی مع ہے اور معنی ہے فمع اغوائك إیای (پس تیرے مجھے گمراہ کرنے کے ساتھ) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استفہام ہے، گویا اس نے پوچھا بأیِ شئ أغواہ؟ (کون سی شے کے سبب اللہ نے اسے گمراہ کیا ہے) اور اس بنا پر یہ ہونا چاہیے: فِبم أغویتنی؟ (کیونکر تو نے مجھے گمراہ کیا؟)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فبما اهلكتنی بلعنك إیای (کس سبب سے تو نے مجھے اپنی نعمت کا مستحق قرار دے کر ہلاک کیا)؟ تو اس کے مطابق اغواء بمعنی اهلاك (ہلاک کرنا) ہو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (مریم) ای هلاکا (وہ ہلاکت کو جا ملیں گے)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی فما أضللتنی (تو نے مجھے کس سبب سے گمراہ کیا؟) تو اس میں اغوا بمعنی اضلال (گمراہ کرنا) اور ابعاد (اپنی رحمت سے دور کرنا) ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: خیبتنی من رحمتك (تو نے مجھے اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے) اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وَمَنْ يَغْوَلَا يَعْدَمْ علی الغَيّ لائما

ای مَنْ یَخِب (جو محروم ہو جاتا ہے)

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: غوی الرجل (یغوی) غیا جب آدمی پر اس کا معاملہ فاسد ہو جائے یا اس کے دل میں وہ فاسد ہو جائے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ۝ (طٰہٰ) (اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا) کے معانی میں سے ایک ہے یعنی جنت میں اس کا رہنا فاسد ہو گیا۔

اور کہا جاتا ہے: غَوِی الفَصِیل (جب اونٹ کے بچے کو بدہضمی ہونا اور لاغری سے قریب بہ ہلاکت ہونا) جب وہ اپنی ماں کا دودھ نہ پی سکے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا اور اس میں کفر پیدا کر دیا، اسی وجہ سے اس ارشاد میں اغوا (گمراہ کرنے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور یہی حقیقت ہے اور موجود کوئی شے نہیں ہے مگر وہ اس کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہی سب صادر ہوتا ہے۔ قدریہ وغیرہ نے ابلیس کی مخالفت کی ہے جس کی اطاعت و مطاوعت انہوں نے ہر اس معاملے میں کی جسے اس نے ان کے لیے مزین اور آراستہ کیا، لیکن اس مسئلہ میں انہوں نے اس کی پیروی نہ کی اور وہ کہتے ہیں: ابلیس نے غلطی اور خطا کی ہے اور وہ خطا کا اہل تھا اسی وجہ سے اس نے گمراہی کی نسبت اپنے رب کی طرف کی، اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ تو انہیں کہا جائے گا: ابلیس اگر خطا کا اہل ہے تو تم نبی علیہ السلام کے

بارے میں کیا کرو گے جو مکرم اور معصوم ہے اور وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا: وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہود) (اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے وہ پروردگار ہے تمہارا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت طاؤس کے پاس مسجد حرام میں ایک آدمی آیا اور وہ قدریہ (فرقہ سے) متہم تھا اور وہ بڑے اور عظیم فقہاء میں سے تھا۔ پس وہ آپ کے پاس بیٹھ گیا تو حضرت طاؤس نے اسے کہا: تو اٹھے گا یا تجھے اٹھایا جائے گا؟ تو حضرت طاؤس کو عرض کی گئی: آپ یہ الفاظ ایک فقیہ آدمی کو کہہ رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: ابلیس افقه منه (ابلیس اس سے بڑھ کر فقیہ ہے) ابلیس کہتا ہے: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (الحجر: 39) (اے میرے رب! کس سبب سے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے) اور یہ کہتا ہے: أنا أغوی نفسی (میں اپنے آپ کو گمراہ کرتا ہوں)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی (میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور ان کی تاک میں بیٹھوں گا) اس سے اعراض کرنے کے ساتھ اور باطل کو مزین و آراستہ کرنے کے ساتھ یہاں تک کہ وہ اسی طرح ہلاک ہو جائیں جیسے وہ ہلاک ہوا یا وہ انہیں اسی طرح گمراہ کر دے جیسے وہ گمراہ ہوا یا وہ انہیں اسی طرح محروم کر دے جیسے اسے محروم کیا گیا، جیسا کہ یہ تینوں معانی اَغْوَيْتَنِيْ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ اور صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے۔ اور صِرَاطَكَ منصوب ہے اس بنا پر کہ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پہلے علی یا فی محذوف ہے، جیسے سیبویہ نے بیان کیا ہے ضرب زید الظهر و البطن اور یہ شعر بھی کہا:

لَدْنٌ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُه　　فيه كما عَسَلَ الطريقَ الثَّعْلَبُ(1)

(دونوں مثالوں میں الظهر و البطن اور الطریق سے پہلے حروف جار محذوف ہے)

اور اس قول: ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ کی تاویل میں جو احسن ترین قول کہا گیا ہے (وہ یہ ہے): میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا حق سے اور انہیں دنیا میں رغبت دلاؤں گا اور انہیں آخرت کے بارے میں شک میں مبتلا کروں گا اور گمراہی میں یہ انتہا ہے، جیسے اس نے کہا: وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ (النسا: 119) جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور سفیان نے منصور سے اور اس نے حکم بن عتیبہ سے روایت کیا ہے (2) کہ اس نے کہا: مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ یعنی ان کی دنیا کی جانب سے۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ ان کی آخرت کی جانب سے۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان کی نیکیوں کی جانب سے۔ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں اور برائیوں کے اعتبار سے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور اس کی شرح یہ ہے کہ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ کا معنی ہے میں ضرور ان کے پاس آؤں گا ان کی دنیا کی جانب سے، یہاں تک کہ وہ اس میں موجود آیات اور امم ماضیہ کی اخبار کو جھٹلانے لگیں وَمِنْ خَلْفِهِمْ اور ان کی آخرت کی جانب سے یہاں تک کہ وہ اس کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 380　　2۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 162

تکذیب کردیں۔ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ ان کی نیکیوں اور ان کے امور دینیہ کی جانب سے۔ اور اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿۲۸﴾ (الصافات) (کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کروفر سے)

وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں کی طرف سے، یعنی وہ شہوات کی اتباع و پیروی کریں گے، کیونکہ وہ شہوات کو ان کے لیے مزین و آراستہ کر دے گا۔ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ اور تو ان میں سے اکثر کو موحد، اطاعت کرنے والا فرمانبردار اور اظہار شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۸﴾

''فرمایا: نکل جا یہاں سے ذلیل (اور) راندہ ہوا جس کسی نے پیروی کی تیری ان سے تو یقیناً میں بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا فرمایا: تو جنت سے نکل جا۔ مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا، مذء وما بمعنی مذموما (مذمت کیا ہوا، ذلیل وخوار) ہے اور الذام میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عیب ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: مَذْءُوْمًا اور مذموما معنی کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذأمته و ذمته اور ذمته تمام کا معنی ایک ہے۔ اور اعمش نے مذوما پڑھا ہے۔ اور معنی ایک ہے، مگر انہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مذء وم کی نفی کی گئی ہے اور دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور مدحور کا معنی دور کیا ہوا، بھگایا ہوا ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے اور اس کا اصل معنی الدفع (دفع کرنا) ہے۔ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ اس میں لام، لام قسم ہے اور جواب قسم لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَمَنْ تَبِعَكَ میں لام تو کید ہے۔ اور لَاَمْلَئَنَّ میں لام قسم ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ غیر قراءت میں پہلی لام کو حذف کرنا جائز ہے اور دوسری کو حذف کرنا جائز نہیں ہوتا۔ کلام میں شرط اور جزا کا معنی ہے۔ بمعنی من تبعك عذبته (جس نے تیری اتباع کی میں اسے عذاب دوں گا) اور اگر تو کہے: من تبعك أعذبه تو یہ جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ تو ارادہ یہ کرے لأعذبه اور عاصم نے ابوبکر بن عیاش کی روایت سے لِمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ کو لام مسکور کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے من أجل من تبعك۔ واللہ اعلم۔

جیسے کہا جاتا ہے: أکرمت فلانا لك اور کبھی معنی ہوتا ہے: الدحر لمن تبعك (دفع کرنا اور بھگایا جانا اس کے لیے ہے جو تیری اتباع کرے گا) اور مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ کا معنی ہے یعنی تم میں سے اور اولاد آدم میں سے۔ کیونکہ اس کا ذکر ہی چل رہا ہے کیونکہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یہ اولاد آدم کو خطاب ہے۔

وَیٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾

''اور اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے''۔

ابلیس کو آسمان سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا: تم اور حواء دونوں جنت میں رہو۔ اور سورۃ البقرہ میں اسکان (سکونت اختیار کرنے کے لیے کہنا) کا معنی گزر چکا ہے اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کا معنی وہاں گزر چکا ہے۔ والحمدلله

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝

''پھر وسوسہ ڈالا ان کے (دلوں میں) شیطان نے تاکہ بے پردہ کر دے ان کے لیے جو ڈھانپا گیا تھا ان کی شرمگاہوں سے اور (انہیں) کہا کہ نہیں منع کیا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لیے کہ کہیں نہ بن جاؤ تم دونوں فرشتے یا کہیں نہ ہو جاؤ ہمیشہ زندہ رہنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ یعنی ان دونوں کی طرف شیطان نے وسوسہ اندازی کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جنت کے اندر سے کہ اس نے سانپ کی صورت میں اپنے آپ کو جنت میں داخل کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنت کے باہر سے، اس اختیار کے ساتھ جو اسے دیا گیا۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور وسوسہ کا معنی ہے: الصوت الخفی (1) (مخفی اور پوشیدہ آواز) اور وسوسۃ کا معنی ہے: حدیث النفس (اندر کی بات (دل میں اٹھنے والا خیال)۔ کہا جاتا ہے: وسوستُ إلیه نفسُه وسوسةً ووسواسًا (اس کے نفس نے اس میں یہ بات ڈال دی) اور وسواس (واؤ کے فتحہ کے ساتھ) اسم ہے، مثلاً زلزال اور شکار کرنے والے اور کتے کی آہٹ اور آہستہ آواز اور زیورات کی آواز کو وسواس کہا جاتا ہے۔ اعشیٰ نے کہا ہے:

تَسْمَعُ للحَلْيِ وَسْواسًا إذا انصرفَتْ كما استعانَ بريحٍ عِشْرِقٌ زَجِلُ

اور وسواس شیطان کا نام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝ (الناس)

لِيُبْدِيَ لَهُمَا تاکہ ان دونوں کے لیے ظاہر کر دے۔ اس میں لام لام عاقبۃ ہے، جیسے اس ارشاد میں ہے: لیکون لهم عدوا وحزنا (تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے۔ اور وُرِيَ کا معنی ہے ان سے جو چھپایا گیا ہے اور ڈھانپا گیا ہے۔ اور غیر قرآن میں اسے اوری پڑھنا بھی جائز ہے، جیسے اُقِتت۔ اور مِنْ سَوْاٰتِهِمَا کا معنی ہے ان کی شرمگاہوں سے (ای من عوراتهما) اور فرج (شرمگاہ) کو عورت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اسے ظاہر کرنا اس کے صاحب کو برا لگتا ہے۔ اور یہ شرمگاہ کو ننگا کرنے کے قبیح اور برا ہونے پر دلیل ہے، سو یہ کہا گیا کہ ان کی شرمگاہیں ان دونوں کے لیے ظاہر ہیں ان کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ ان دونوں پر پتے اور کلیاں ہیں جن کے سبب ان کی شرمگاہوں کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا پھر وہ کلیاں زائل ہو گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 137

ہے کہ ان پر کپڑا تھا اور پھر وہ ساقط ہو گیا (گر گیا) واللہ اعلم

اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اس میں اَنْ محل نصب میں ہے، بمعنی اِلَّاۤ ہے، اَنْ کو مکروہ قرار دیتے ہوئے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کوفی کہتے ہیں: لئلا تکونا (تاکہ تم دونوں نہ ہو جاؤ)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ای اِلَّا اَلَّا تکونا ملکین تعلمان الخیر والشر (مگر یہ کہ تم دونوں نہ ہو جاؤ فرشتے جو خیر و شر کو جانتے ہیں)۔ اور کہا گیا ہے: حضرت آدم علیہ السلام نے ہمیشہ رہنے کا طمع کیا، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ ملائکہ یوم قیامت تک نہیں مریں گے۔

نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر ساری مخلوق پر فرشتوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اور ایک یہ ہے وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام:50) (اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں) اور یہ بھی ہے: وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النسا:172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)۔ اور حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو شکل و صورت، پروں اور عزت و تکریم کے اعتبار سے فضیلت دی ہے(1)۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے طاعت اور ترک معصیت کی وجہ سے انہیں فضیلت دی، پس اس وجہ سے ہر شی میں فضیلت واقع ہوتی ہے۔

اور ابن فورک (2) نے کہا ہے: اس آیت میں یہ دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس معنی میں دو فرشتے مراد ہوں کہ ان دونوں کے لیے کھانے کی طلب نہیں ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، زجاج اور بہت سے علماء کی پسند یہ ہے کہ مومنین کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، سوائے فرشتوں کے ایک گروہ کے اور وہ ہیں حضرت جبریل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام اور حضرت ملک الموت علیہ السلام، کیونکہ یہ من جملہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔ اور ہر فریق نے شریعت کے ظاہر سے استدلال کیا ہے اور فضیلت اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لام کے کسرہ کے ساتھ مَلِکَین قراءت کی ہے اور یہی قراءت یحییٰ بن ابی کثیر اور ضحاک کی ہے۔

اور ابو عمرو بن علاء نے لام کے کسرہ کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کوئی ملک نہ تھا کہ دو ملک ہو جائیں۔

حضرت نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس قراءت کی بنا پر لام کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے، لیکن پہلی قراءت میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (3) نے فرمایا کہ یہ دونوں ملک کی جہت سے ملعون ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ (طٰہٰ) (کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو)۔ اور ابو عبید نے گمان کیا ہے کہ یحییٰ بن ابی کثیر کا استدلال اس قول کے ساتھ ہے۔ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى اور یہ حجۃ بینہ ہے، لیکن لوگوں نے اسے ترک کر دیا ہے اسی لیے ہم نے بھی اسے ترک کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 88　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 385　　3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 167

ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ شاذ قراءت ہے۔

ابو عبید کے اس کلام کا انکار کیا گیا ہے اور اسے فحش غلطی قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ وہم ہوا ہو کہ وہ جنت کی بادشاہی سے زیادہ تک پہنچ سکتے ہیں، حالانکہ جنت ہی طالبین کی انتہا اور غایت ہے۔ بلاشبہ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى کا معنی جنت کی بادشاہی میں قائم رہنا، اور اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

''اور قسم اٹھائی ان کے سامنے کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاسَمَهُمَآ یعنی ان دونوں کے لیے قسم اٹھائی، کہا جاتا ہے: أقسم إقساما! بمعنی حلف (اس نے قسم اٹھائی) شاعر نے کہا ہے:

وقاسمها بالله جهدا لأنتم ألذ من السلوى إذا ما نشورها(1)

اور اس میں ایک کی جانب سے باب مفاعلہ ذکر کیا ہے۔ اور اس سے اس کا رد ہوتا ہے جس نے کہا ہے کہ باب مفاعلہ دونوں (فاعل اور مفعول) کی جانب سے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ، لکما صلہ میں داخل نہیں ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: إني ناصح لكما لمن الناصحين (بلاشبہ میں تم دونوں کو نصیحت کر رہا ہوں، کیونکہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)

یہ ہشام نحوی نے کہا ہے۔ اور اس کی مثال سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور کلام کا معنی ہے: اتبعاني أرشد كما (تم دونوں میری اتباع کرو میں تمہاری رہنمائی کروں گا) اسے قتادہ نے ذکر کیا ہے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

''پس شیطان نے نیچے گرا دیا ان کو دھوکہ سے، پھر جب دونوں نے چکھ لیا درخت سے تو ظاہر ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور چپکانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے اور ندا دی انہیں ان کے رب نے، کیا نہیں منع کیا تھا میں نے تمہیں اس درخت سے اور کیا نہ فرمایا تھا تمہیں کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ دونوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لیے اور نہ رحم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 385

فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیچے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک''۔

قولہ تعالیٰ: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ یعنی شیطان نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے انہیں قسم کے ساتھ دھوکہ دیا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام یہ گمان رکھتے تھے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا، پس شیطان نے انہیں اپنی وسوسہ اندازی اور قسم کے ساتھ دھوکہ میں ڈال دیا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس نے ان دونوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائی یہاں تک کہ انہیں دھوکے میں ڈال دیا۔ اور مومن اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ کھا جاتا ہے(1)۔ بعض علماء کہتے ہیں: جس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ دیا ہم وہ دھوکہ کھا گئے (2)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: المؤمن غِرٌّ کریم والفاجر خَبٌّ لَئِیمٌ (3) (مومن ناتجربہ کار دھوکہ کھانے والا اور سخی ہے اور فاجر دغاباز اور لعین ہے) اور نفطویہ نے کہا ہے:

إنّ الکریم إذا تَشاءُ خَدَعتَه وتری اللئیمَ مُجرِبا لایُخدَعُ

بے شک کریم کو جب تو چاہے اسے دھوکے میں مبتلا کر دے اور تو لئیم کو تجربہ کار دیکھے گا اسے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا''۔

فَدَلّٰىهُمَا کہا جاتا ہے: أدلَی دلوہ اس نے اپنا ڈول نیچے لٹکایا۔ و دلاھا اور اسے نکالا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دلّاھما کا معنی ہے اس نے ان دونوں کو جرات دلائی۔ یہ الدالۃ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے جرأت کرنا یعنی اس نے انہیں معصیت پر جرأت دلائی تو وہ جنت سے نکل گئے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّ رَقِ الْجَنَّةِ

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ یعنی جب انہوں نے اس درخت سے کھایا۔ اور سورۃ البقرہ میں اس درخت کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کیسے کھایا۔

بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا پہلے حضرت مائی حوا علیہا السلام نے کھایا تو انہیں کوئی شے نہ پہنچی (یعنی کوئی تکلیف نہ پہنچی) پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کھایا تو سزا نافذ ہو گئی، کیونکہ اس کے قریب جانے کی نہی دونوں کے لیے تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کلیاں اور پتے جوان کا لباس تھے وہ اتر گئے اور ہاتھوں اور پاؤں میں ناخن آ گئے۔

مسئلہ نمبر 2۔ وَ طَفِقَا اس میں فا کو ساکن پڑھنا جائز ہے اور اخفش نے طَفَقَ یَطْفِقُ بیان کیا ہے، مثلاً ضرب یضرب کہا جاتا ہے: طفق یعنی وہ کام میں شروع ہوا۔ یَخْصِفٰنِ حسن نے اسے خا کے کسرہ اور صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اصل میں یختصفان تھا اس میں ادغام کیا گیا (تا کو صاد سے بدلنے کے بعد صاد کو صاد میں) اور التقاء ساکنین کی وجہ سے خا کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 459 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 959 3۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 110

کسرہ دیا گیا ہے۔ اور ابن بریدہ اور یعقوب نے خا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے تا کی حرکت اس کو دی ہے اور یُخَصِّفان کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یہ خَصَّفَ یُخَصِّفُ سے ماخوذ ہے۔

اور زہری نے یُخْصِفان پڑھا ہے یہ أخْصَفَ سے ہے۔ اور یہ دونوں ہمزہ یا تضعیف سے منقول ہے اور معنی یہ ہے: وہ دونوں پتے کاٹنے لگے اور انہیں چپکانے لگے تا کہ وہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ سکیں۔ اور اسی سے خَصَفَ النعل (اس نے جوتے کا چمڑا چپکایا) ہے۔ اور خصاف وہ ہوتا ہے جو جوتے سیتا ہے۔ اور مِخْصَف مِثْقَب (برما) کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد انجیر کے پتے ہیں (1)۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی شرمگاہ ننگی اور ظاہر ہوگئی تو وہ جنت کے درختوں کا چکر لگانے لگے تا کہ وہ ان سے پتے لیں اور ان کے ساتھ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکیں، تو جنت کے درختوں نے آپ کو روک دیا (ڈانٹ دیا) یہاں تک کہ انجیر کے درخت نے آپ پر رحم کیا اور پتا آپ کو عطا کیا، تو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حواء علیہما السلام جنت کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انجیر کو بدلا یہ دیا کہ حلاوت اور منفعت میں اس کے ظاہر اور باطن کو ایک جیسا کر دیا اور اسے ایک سال میں دو بار پھل عطا فرمایا۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت میں کشف عورۃ کے قبیح ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر اسے ڈھانپنا واجب کر دیا، اس لیے انہوں نے اسے ڈھانپنے میں جلدی اور تیزی کی، اور یہ اس کے مانع نہیں ہے کہ اس کے بارے انہیں یہ حکم جنت میں دیا گیا، جیسے انہیں یہ کہا گیا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (الاعراف: 19)

اور صاحب البیان نے امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ جو آدمی درخت کے پتوں کے سوا کوئی شی ایسی نہ پائے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکتا ہو، تو اس پر انہیں کے ساتھ ڈھانپنا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ یہ ظاہری پردہ ہے جس کے ساتھ پردہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو سکتا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں کیا۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا: کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا ربنا (اے ہمارے رب!) یہ ندا مضاف ہے۔ اصل میں یہ یا ربنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک "یا" کو حذف کرنے میں تعظیم کا معنی ہے، پس انہوں نے اپنی خطا کا اعتراف کیا اور توبہ کر لی۔ اس کی بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور قول باری تعالیٰ: قَالَ اهْبِطُوْا کا معنی آخر آیت تک پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

"(نیز) فرمایا: اسی زمین میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے تم اٹھائے جاؤ گے"۔

اس میں مذکورہ تمام ضمیریں الارض (زمین) کے لیے ہیں۔ اور قَالَ میں واؤ ذکر نہیں کی گئی۔ اور اگر وہ ذکر ہوتی تو بھی جائز ہوتا اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: قال زید لعمرو کذا قال لہ کذا (اس میں قال لہ کذا سے پہلے واؤ ذکر کر دی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 211

جائے تو وہ درست اور صحیح ہے)۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

''اے اولاد آدم بے شک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو اور باعث زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ بہت سے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ شرمگاہ کو ڈھانپنا واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اور ایک قوم (گروہ) نے کہا ہے کہ اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے، بلکہ اس میں فقط اس کے انعام ہونے پر دلیل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور من جملہ نعمتوں میں سے ایک شرمگاہ کو ڈھانپنا بھی ہے۔ پس یہ بیان کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی اولاد کے لیے وہ کچھ پیدا فرمایا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہوں کو ڈھانپ سکتے ہیں اور یہ پردے کے امر پر دلیل ہے۔ اور لوگوں کی نگاہوں سے ستر عورت کے واجب ہونے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ شرمگاہ کیا ہے؟ تو ابن ابی ذئب نے کہا ہے: یہ مرد میں سے صرف اس کی شرمگاہ ہے، یعنی قبل اور دبر اس کے سوا کوئی حصہ شرمگاہ نہیں۔ اور داؤد اہل ظاہر، ابن ابی مسلمہ اور طبری کا یہی قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ، بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا، لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا۔

اور بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1)۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی گلیوں میں اپنی سواری پر چل رہے تھے۔ اور اس میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اپنی رانوں سے اوپر چڑھالی یہاں تک میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کی سفیدی دیکھ لی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ناف شرمگاہ نہیں ہے اور آدمی کے لیے مکروہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے اپنی ران کھول دے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: گھٹنا شرمگاہ ہے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صحیح روایت کے مطابق ناف اور دونوں گھٹنے شرمگاہ میں سے نہیں ہیں۔

اور ابو حامد ترمذی نے بیان کیا ہے کہ ناف کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جو آپ نے جرہد کو فرمایا: (2) غط فخذك فإن الفخذ عورة (3) (اپنی ران کو ڈھانپ لے کیونکہ ران شرمگاہ ہے) اسے امام بخاری نے تعلیقاً بیان کیا ہے۔ اور فرمایا: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور حضرت جرہد کی حدیث میں زیادہ احتیاط ہے یہاں تک کہ وہ ان (علماء) کے اختلاف سے نکل جائے۔ اور جرہد کی یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53
2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستئذان والادب، جلد 2، صفحہ 103
3۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53

حدیث اس کے خلاف دلالت کرتی ہے جو کچھ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ناف پر بوسہ دیا اور کہا: میں تمہیں اسی جگہ بوسہ دے رہا ہوں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں بوسہ دیتے تھے (1)۔ پس اگر ناف شرمگاہ ہوتی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہاں بوسہ نہ دیتے اور نہ ہی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ انہیں اس کی اجازت دیتے۔ اور جہاں تک آزاد عورت کا تعلق ہے تو اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا اس کا سارا بدن شرمگاہ ہے اور یہی نظریہ اکثر اہل علم کا ہے۔

تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أراد أنْ يتزوج إمرأة فلينظر إلى وجهها و كفيها (2) (جو آدمی کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کو دیکھ لے) اور اس لیے بھی کہ احرام میں بھی چہرے کو ننگا کرنا واجب ہے۔ ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے: عورت کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور رہی ام ولد (ایسی کنیز جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) تو اس کے بارے اثرم نے کہا ہے: میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ان سے ام ولد کے بارے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ نماز کیسے پڑھے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ اپنا سر اور اپنے پاؤں ڈھانپ لے گی، کیونکہ اسے بیچا نہیں جا سکتا اور وہ اسی طرح نماز پڑھے گی جیسے آزاد عورت پڑھتی ہے۔ اور جہاں تک لونڈی کا تعلق ہے تو اس کا وہ سارا جسم شرمگاہ ہے جو پستانوں سے نیچے ہے اور اس کے لیے اپنے سر اور اپنی کلائیوں کو ننگا کرنا جائز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا حکم مرد کے حکم کی مثل ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لیے اپنے سر اور سینے کو ننگا کرنا مکروہ ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لونڈیوں کو اپنے سر ڈھانپنے پر سزا دیتے تھے اور فرماتے تھے: تم آزاد عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر اس کی ران ننگی ہوئی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے۔ اور ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے کہ لونڈی کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور یہ فقہاء کے اقوال سے خارج ہے، کیونکہ ان کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد عورت کے لیے جائز ہے کہ فرض نماز پڑھے اور اس کے دونوں ہاتھ اور چہرہ مکمل طور پر ننگے ہوں اور وہ ان کے ساتھ زمین کو مس کر رہی ہو۔ تو پھر لونڈی کے لیے بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہوگا اور ام ولد کی حالت لونڈی سے زیادہ گہری ہے۔ اور صغیر بچے کی شرمگاہ کی کوئی حرمت نہیں ہے۔ اور جب بچی اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے آنکھ کا اشارہ ہو سکتا ہو اور اسے شہوت دلائی جا سکتی ہو تو پھر وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔

اور ابوبکر بن عبدالرحمن کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (الاحزاب:59) (اے نبی مکرم! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو) اور حضرت

1۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 255 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 299

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کون سے کپڑوں میں عورت نماز پڑھ سکتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ قمیص اور ایسی اوڑھنی میں جو اس کے پاؤں کے ظاہر کو ڈھانپ سکتی ہو نماز پڑھ سکتی ہے(1)۔ اسے مرفوع روایت کیا گیا ہے اور جنہوں نے اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پر موقوف روایت کیا ہے وہ زیادہ ہیں اور زیادہ حافظ ہیں۔ ان میں مالک اور ابن اسحاق وغیرہ ہیں۔ ابو داؤد نے کہا ہے: عبدالرحمن بن عبداللہ بن دینار نے اسے محمد بن زید عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مرفوع روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ ابو عمر نے کہا ہے: ان کے نزدیک یہ عبدالرحمن ضعیف راوی ہے، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بعض احادیث کو روایت کیا ہے۔ اور اس باب میں اجماع خبر سے زیادہ قوی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا یعنی ہم نے تم پر وہ بارش برسائی جو روئی اور کتان (السی کا پودا جس سے کپڑے بنائے جاتے ہیں) اگاتی ہے اور ان جانوروں کو قائم رکھتی ہے جن سے اون اور بال وغیرہ حاصل ہوتے ہیں اور یہ مجازی مفہوم ہے اور اسی کی مثل یہ آیت ہے وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ (الزمر: 6) جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس انزال سے مراد لباس میں اس شے کو اتارنا ہے جو حضرت آدم اور حضرت مائی حواء علیہما السلام کے ساتھ تھی، تاکہ وہ اپنے غیر کے لیے مثال بن جائے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ یعنی ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ (الزمر: 6) اس میں بھی انزل بمعنی خلق ہے، جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے تمہیں اسے بنانے کی کیفیت کے بارے الہام کیا (یعنی تمہارے ذہنوں میں اسے بنانے کا طریقہ ڈال دیا)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ رِيۡشًا ابو عبدالرحمن، حسن اور عاصم نے مفضل ضبی کی روایت سے، ابو عمرو نے حسین بن علی جعفی کی روایت سے وریاشا پڑھا ہے اور ابو عبید نے اسے حسن کے سوا کسی سے بیان نہیں کیا اور اس کے معنی کی تفسیر بیان نہیں کی۔ یہ ریش کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ زینت ہے جو مال اور لباس کے سبب ہو۔ اور فراء(2) نے کہا ہے: ریش و ریاش جیسے کہا جاتا ہے: لبس و لباس اور ریش الطائر (پرندے کے پر) وہ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد زندگی کی فراخی اور خوشحالی ہے۔ اور وہ معنی جسے اکثر اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ ریش لباس یا معیشت میں سے وہ شی ہے جو ڈھانپ لے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فَرِيشِي منكم وهَوايَ معكم وإنْ كانت زيارَتكم لِمَاما(3)

اور ابو حاتم نے ابو عبیدہ سے بیان کیا ہے: وهبت له دابة بريشها اسے سواری لباس سمیت دی گئی، مراد وہ کپڑے ہیں جو اس پر ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيۡرٌ بیان فرمایا کہ تقویٰ بہترین اور اچھا لباس ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 94 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 139 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 214

إذا المرء لم يلبس ثياباً من التقیٰ　　تقلب عريانا وإن كان كاسيا

جب آدمی تقویٰ کا لباس نہیں پہنتا تو وہ ننگا ہی لگتا ہے اگر چہ لباس پہنے ہوئے ہو۔

وخيرُ لباسِ المرء طاعةُ ربه　　ولا خيرَ فيمن كان لله عاصيا

اور آدمی کا بہترین لباس اپنے رب کی اطاعت ہے اور اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

اور قاسم بن مالک نے عوف سے اور انہوں نے معبد جہنی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: لِبَاسُ التَّقْوٰى تقویٰ کا لباس حیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد عمل صالح ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد چہرے پر حسین خاموشی ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی اور اس کے بارے رہنمائی فرمائی۔ اور یہ قول بھی ہے: لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد اون اور کھدر کے کپڑے پہننے ہیں۔

یہ ان میں سے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع وانکساری کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کی عبادت کی جاتی ہے اور یہ دوسرے لباس سے بہتر ہے۔ اور زید بن علی نے کہا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد زرہ اور خود، دو کلائیاں اور دو پنڈلیاں ہیں، جن کے ساتھ جنگ میں اپنی حفاظت کی جاتی ہے(2)۔ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے خوف کا احساس کرنا ہے ان تمام امور میں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور جن سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے، اور اسی کی طرف حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہم کا قول راجع ہے۔ اور حضرت زید بن علی کا قول حسن اور اچھا ہے، کیونکہ انہوں نے جہاد پر ابھارا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد شرمگاہ کو ڈھانپنا ہے(4)۔ اور یہ اس میں تکرار ہے، کیونکہ پہلے ارشاد فرمایا: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد کھدر کا لباس پہننا ہے، کیونکہ یہ تواضع اور ترک رعونت کے زیادہ قریب ہے تو یہ ایک دعویٰ ہے، حالانکہ علماء میں سے فضلاء تقویٰ کے حصول کے ساتھ ساتھ انتہائی قیمتی اور اعلیٰ لباس پہنتے ہیں، جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اہل مدینہ اور کسائی نے لباس کو پہلے لباساً پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ یعنی وانزلنا لباس التقوی اور باقیوں نے مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور ذالك اس کی صفت ہے اور خیر مبتدا کی خبر ہے۔ اور اس کا معنی ہے: تقویٰ کا لباس جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ ہے جسے تم جانتے ہو، تمہارے لیے ان کپڑوں کے پہننے سے بہتر ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتے ہیں اور یہ وہ زینت ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل فرمائی، پس تم اسے پہن لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ھو ضمیر مضمر ہے، یعنی ھو لباسُ التقوی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 463

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389　　4۔ ایضاً

یعنی وہ ستر عورت ہے اور اسی کے مطابق ابن زید کا قول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے ولباس التقوی ھو خیر یعنی ذالك بمعنی ھو ہے اور پہلی ترکیب ہی زیادہ احسن ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اور اعمش نے ولباس التقوی خیرٌ پڑھا ہے۔ انہوں نے ذالك نہیں پڑھا۔ اور یہ مصحف کے خلاف ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ ان علامات اور نشانیوں میں سے ہے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کا خالق ہے اور ذالك صفت یا بدل یا عطف بیان ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَاۤ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

”اے اولاد آدم! نہ فتنہ میں مبتلا کر دے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے (اور) اتروا دیا ان سے ان کا لباس تاکہ دکھلا دے انہیں ان کے پردہ کی جگہیں۔ بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں۔ بلاشبہ ہم نے بنا دیا شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا یَفْتِنَنَّكُمُ یعنی شیطان تمہیں دین سے پھیر نہ دے، جیسے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال کر فتنہ میں مبتلا کیا۔ ابٌ مذکر کے لیے اور ابةٌ مونث کے لیے آتا ہے۔ پس اسی بنا پر ابوان کہا گیا ہے۔ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے اور مِّنَ الْجَنَّةِ پر وقف کیا جائے گا۔ لِیُرِیَهُمَا یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ، یراکم اصل میں یرء اکم تھا پھر ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ اور وقبیلہ اس کا عطف ضمیر پر ہے اور ھو برائے تاکید ہے تاکہ عطف احسن ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرہ:35) یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رأیتك و عمرو کہنا قبیح ہے، (یعنی ضمیر متصل پر عطف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ضمیر منفصل سے اس کی تائید لگائی جائے)۔ اور اس پر کہ مضمر، مظہر کی طرح ہوتا ہے۔ اور اس میں ستر عورت کے واجب ہونے پر بھی دلیل ہے۔ کیونکہ ارشاد گرامی ہے: یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا اور دوسروں نے کہا ہے: بلاشبہ اس میں زوال نعمت سے تحذیر اور ڈراوا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا۔ یہ تب ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت ہم پر لازم ہوتی ہے اور معاملہ اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ اس میں قَبِیْلُهٗ سے مراد شیطان کا لشکر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد جن اور شیاطین ہیں (1)۔ ابن زید نے کہا ہے: قَبِیْلُهٗ سے مراد اس کی نسل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی قوم مراد ہے۔ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ جن دیکھے نہیں جا سکتے (2)، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے ہو)۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 141

2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 98

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا دکھائی دینا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انہیں دکھانے کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کے جسموں سے پردہ ہٹا دیتا ہے یہاں تک کہ انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جن نہیں دکھائی دیتے مگر اس وقت کے نبی علیہ السلام کو (دکھائی دیتے ہیں) تاکہ یہ اس کی نبوت پر دلیل ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خلقت میں تخلیق فرمایا ہے جس میں وہ دکھائی نہیں دیتے، ہاں جب وہ اپنی اصلی صورتوں سے کسی اور شکل میں منتقل ہوتے ہیں تو پھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ ان معجزات میں سے ہے جو انبیاء وقت صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے سوا ظاہر نہیں ہو سکتا۔

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے عادت جاریہ بنادی ہے کہ آج (دنیا میں) اولاد آدم شیاطین کو نہیں دیکھ سکتی۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: إن الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1) (بے شک شیطان انسان کی رگ خون میں چلتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ (الناس) (جو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے لوگوں کے دلوں میں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن للملك لمة وللشیطان لمة (2) (بے شک (دل میں) ایک خیال فرشتے کی جانب سے آتا ہے اور ایک شیطان کی جانب سے) پس جہاں تک فرشتے کے خیال کا تعلق ہے تو خیر اور بھلائی کا وعدہ اور حق کی تصدیق ہوتا ہے اور جہاں تک شیطان کے خیال کا تعلق ہے تو وہ شر کا وعدہ اور حق کی تکذیب کے بارے ہوتا ہے) اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور شیاطین اور (جنات) کی رؤیت کے بارے میں اخبار صحیح موجود ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (3) کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد فرمائی اور آگے انہوں نے طویل قصہ بیان کیا اور اس میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اس جن کو پکڑ لیا جو کھجوریں اٹھاتا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ما فعل أسیرك البارحة (4) (گزشتہ رات تیرے قیدی نے کیا کیا) اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واللہ لولا دعوۃُ أخی سلیمان لأصبح موثقا یلعب به ولدان أهل المدینة (5) (قسم بخدا! اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو میں صبح کے وقت اسے بندھا ہوا چھوڑ دیتا یہاں تک کہ اہل مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیلتے) اور اس عفریت کے بارے میں جو آپ پر اچانک حاضر ہو جاتا تھا سورۃ ص میں اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ہم نے ان کی سزا میں اضافہ کرتے ہوئے شیاطین کو ان کا دوست بنا دیا اور ہم نے انہیں حق سے انحراف کرنے میں مساوی اور برابر قرار دیا۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 918 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 123
3۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310 4۔ ایضاً 5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 205

''اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں: پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔ آپ فرما دیجئے: بے شک اللہ حکم نہیں دیتا بے حیائیوں کا۔ کیا ایسی بات لگاتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے''۔

اکثر مفسرین کے قول کے مطابق یہاں فَاحِشَةً سے مراد ان کا ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرنا ہے (1)۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد شرک اور کفر ہے (2)۔ اور اس پر انہوں نے ان کی اپنے اسلاف کی تقلید کرنے سے استدلال کیا ہے اور اس سے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بارے حکم دیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (اور اللہ نے بھی ہمیں اس کا حکم دیا ہے) یہ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اس (نظریہ) کو ناپسند کرتا جس پر ہم ہیں تو ہم یقیناً اس سے منتقل ہو جاتے (3)۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ بیان فرمایا کہ وہ اپنی رائے اور مرضی سے فیصلہ دے رہے ہیں اور انہوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور تقلید کی مذمت اور ان کی بہت سی جہالتوں کی مذمت گزر چکی ہے۔ اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۗ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۗ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

''آپ فرمائیے حکم دیا ہے میرے رب نے عدل و انصاف کا، اور سیدھا کر دو اپنے چہرے (قبلہ کی طرف) ہر نماز کے وقت اور عبادت کرو اس کی اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لیے عبادت کو جس طرح اس نے پہلے پیدا کیا تھا تمہیں ویسے ہی تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دے دی اور ایک گروہ ہے کہ مقرر ہو گئی ان پر گمراہی، انہوں نے بنا لیا شیطانوں کو (اپنا) دوست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قسط کا معنی عدل ہے (5)، یعنی اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے پس تم اس کی اطاعت کرو اور کلام میں حذف ہے۔ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ اور ہر نماز میں تم اپنے چہروں کو قبلہ شریف کی طرف متوجہ کرو۔ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ جس مسجد میں بھی تم ہو۔ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ اس کی مثل یہ آیت ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 94) (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اور کاف محل نصب میں ہے، یعنی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 99 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 216 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 91
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 464 5۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 183

تعودون کما بدأکم یعنی جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ تمہیں لوٹائے گا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اپنے ماقبل کے متعلق ہے۔

یعنی و منہا تُخرجون کما بدأکم تعودُون (اس سے تم نکالے جاؤ گے جیسے اس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ فَرِیْقًا هَدٰی اس میں فَرِیْقًا، تعودون کی ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای تعودون فریقین تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم دو فریق ہو گے۔ ایک سعادت مند، خوش بخت لوگوں کا گروہ اور دوسرا اشقیا اور بد بخت لوگوں کا گروہ۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے: تعودون فریقین فریقا ھدی و فریقا حق علیھم الضلالۃ یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے اس قول باری تعالیٰ: فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ کے ضمن میں کہا ہے: جس کی تخلیق ابتداء اللہ تعالیٰ نے گمراہی و ضلالت کے لیے کی وہ اسے گمراہی کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے ہدایت یافتہ لوگوں کے اعمال جیسے اعمال کیے۔ اور جسے ابتداء اللہ تعالیٰ نے ہدایت پر تخلیق فرمایا تو اسے ہدایت کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے گمراہ لوگوں کے اعمال کی مثل عمل کیے۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ابتداءً ہی گمراہی پر پیدا کیا اور اس نے فرشتوں کے ساتھ مل کر سعادت و خوش بختی کے اعمال کیے، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اسی کی طرف لوٹا دیا جس پر اسے ابتداءً پیدا فرمایا تھا۔ اور فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (البقرہ) (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا) اس میں قدریہ اور ان کے متبعین کا واضح رد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَرِیْقًا، هَدٰی کے سبب منصوب ہے۔ اور دوسرا فریقا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے، یعنی و أضل فریقا (اور اس نے ایک گروہ کو گمراہ کر دیا) سیبویہ نے بھی کہا ہے:

أصبحتُ لا أحمل السّلاحَ ولا　أملِك رأسَ البعيرِ إن نَفَرا

والذِّئبُ أخشاه إن مررتُ به　وَحدِي وأخشَى الرياحَ والمطرا

فراء نے کہا ہے: اگر مرفوع ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور عیسیٰ ابن عمر نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ أنهم پڑھا ہے۔ یعنی لأنهم

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾

"اے آدم کی اولاد! پہن لیا کرو اپنا لباس ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ یہ خطاب سارے عالم کو ہے، اگرچہ اس سے مقصود عرب کے وہ لوگ ہیں جو ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے، کیونکہ یہ حکم ہر مسجد میں نماز کے لیے عام ہے، کیونکہ اعتبار عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب

کا۔ اور بعض علماء نے اس سے طواف مراد ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ طواف تو صرف اور صرف ایک مسجد میں ہوتا ہے اور وہ جو ہر مسجد کو شامل ہے وہ نماز ہے۔ یہ قول ان کا ہے جن پر مقاصد شریعت مخفی رہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک عورت بیت اللہ شریف کا طواف کر رہی تھی اس حال میں کہ وہ برہنہ تن تھی اور کہہ رہی تھی: کون ہے جو مجھے طواف کے کپڑے عاریۃً دے گا؟ (کہ) وہ اسے اپنی شرمگاہ پر رکھ لے گی۔ اور کہہ رہی تھی:

اليومَ يَبْدُو بعضه أو كلّه　　وما بَدَا منه فلا أحِلّه (1)

تب یہ آیت نازل ہوئی: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور یہ عورت ضباعہ بنت عامر بن قرط تھی۔ یہ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: عرب لوگ بیت اللہ شریف کا طواف ننگے بدن کرتے تھے سوائے حمس کے اور حمس سے مراد قریش اور ان کی اولاد ہے، وہ ننگے بدن طواف کرتے رہتے تھے مگر یہ کہ قریش انہیں کپڑے عطا کر دیں پس مرد مردوں کو دیتے تھے اور عورتیں عورتوں کو دیتی تھیں۔ اور قریش مزدلفہ سے نہیں نکلتے تھے اور سارے کے سارے لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ اور مسلم کے سوا کسی اور میں ہے: وہ کہتے تھے ہم اہل حرم ہیں، پس عربوں میں سے کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ہمارے کپڑوں کے بغیر طواف کرے اور جب وہ ہماری سرزمین میں داخل ہو جائے تو پھر وہ ہمارے کھانے کے سوا کھانا نہ کھائے، پس عرب میں سے جس کا مکہ مکرمہ میں کوئی دوست نہ ہوتا تو اسے کپڑا عاریۃً دیتا اور نہ کوئی ایسا خوشحال ہوتا جو اسے اس کے عوض اجرت پر رکھ لیتا تو اس کے لیے دو میں سے ایک امر ضروری ہوتا کہ یا تو وہ ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے یا وہ اپنے کپڑوں میں طواف کرے اور جب وہ اپنے طواف سے فارغ ہو تو اپنا لباس اتار کر پھینک دے اور پھر اسے کوئی بھی مس نہ کرے۔ اور اس کپڑے کو اللقی (پھینکا ہوا) کہا جاتا تھا۔ عرب کے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

كفَى حَزَنًا كَرِّي عليه كأنه　　لقًى بين أيدي الطائفين حَرِيمُ (2)

چنانچہ وہ اسی جہالت، بدعت اور گمراہی پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ کو مبعوث فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ، الآیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے یہ اعلان کیا: ألا لا يطوف بالبيت عُرْيان (خبردار! غور سے سنو! کوئی بھی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز ہے اور اس کی زینت جوتا ہے، کیونکہ کرز بن وبرہ نے اسے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے ایک دن فرمایا: خذوا زينة الصلوٰة (تم نماز کی زینت کو اختیار کرو) تو عرض کی گئی: نماز کی زینت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: البسوا نعالكم فصلّوا فيها (تم اپنے جوتے پہن لو اور ان میں نماز پڑھو)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ستر عورت واجب ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے اور جمہور اہل علم نے یہ موقف

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 777　　2۔ ایضاً

اختیار کیا ہے کہ یہ نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ اور ابہری نے کہا ہے: یہ بھی من جملہ ایک فرض ہے اور آدمی پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے رکھے چاہے وہ نماز میں ہو یا نہ ہو۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اپنے کپڑے کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے لے لو اور تم ننگے بدن نہ چلو" (1)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور اسماعیل قاضی نے یہ کہا ہے کہ ستر عورت نماز کی سنتوں میں سے ہے اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ستر عورت نماز میں فرض ہوتا تو ننگے آدمی کے لیے نماز پڑھنا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ہر وہ شے جو نماز میں فرض ہے اس پر قدرت ہوتے ہوئے اس پر عمل کرنے یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے بدل کو لانا واجب ہوتا ہے، یا پھر ساری کی ساری نماز ساقط ہو جائے گی، حالانکہ صورت حال اس طرح نہیں ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جب ہم نے کہا ہے کہ ستر عورت نماز میں فرض ہے اور امام کا تہبند گر جائے اور اس کی دبر ننگی ہو جائے اور وہ رکوع کی حالت میں ہو اور وہ اپنا سر اٹھائے اور اسے ڈھانپ لے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے، یہ ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور سحنون نے کہا ہے: مقتدیوں میں سے جس کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے۔ اور سحنون سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ (امام) بھی نماز کا اعادہ کرے گا اور مقتدی بھی اعادہ کریں گے، کیونکہ ستر عورت نماز کی شرائط میں سے ایک شرط ہے اور جب شرمگاہ ظاہر ہو جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس کی اصل طہارت (پاکیزگی) ہے۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے (2)؟ جنہوں نے کہا ہے کہ ان کی نماز باطل نہ ہوگی تو انہوں نے کسی شرط کو مفقود نہیں پایا۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ (اس کپڑے کو) اپنی جگہ باندھ لے اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کی نماز باطل ہوگی جس نے اس کی طرف دیکھ لیا تو یہ ایسی غلطی ہے جسے مٹانا واجب ہوتا ہے اور اس میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ اور بخاری اور نسائی میں حضرت عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب میری قوم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے واپس لوٹ کر آئی تو انہوں نے بتایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لیؤمکم اکثرکم قرأۃ للقرآن (3) (چاہیے کہ تم میں سے زیادہ قرآن کریم پڑھنے والا تمہاری امامت کرائے) اس نے بیان کیا: پس انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے رکوع و سجود کے بارے سکھایا۔ پس میں انہیں نماز پڑھاتا تھا اور مجھ پر پھٹی ہوئی چادر ہوتی تھی۔ اور وہ میرے باپ کو کہتے تھے: کیا تو اپنے بیٹے کی دبر ہم سے ڈھانپ نہیں سکتا۔ یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ اور حضرت سہل بن سعد سے ثابت ہے کہ انہوں نے کہا کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چادریں تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی گردنوں میں باندھے ہوتے تھے جیسے بچے کرتے ہیں۔ تو کسی کہنے والے نے کہا: اے عورتوں کے گروہ! تم اپنے سر (سجدوں سے) نہ اٹھاؤ یہاں تک کہ مرد (پہلے) اٹھا لیں (4)۔ اسے بخاری، نسائی اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب کوئی اپنی شرمگاہ کو دیکھے تو اس کے بارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 154
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 780
3۔ سنن نسائی، کتاب القبلہ، جلد 1، صفحہ 125
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 92

نے کہا: ہے جب کپڑا تنگ ہو تو وہ اسے بٹن لگا لے یا اسے کسی شے کے ساتھ سی لے تاکہ قمیص دور نہ ہٹے کہ گریبان سے شرمگاہ دکھائی دے، اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی شرمگاہ دیکھ لی وہ اپنی نماز کا اعادہ کرلے۔ اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام مالک نے حالت نماز میں قمیص کے بٹنوں کو کھلا رکھنے کی رخصت دی ہے اور وہ شلوار (پائجامہ) پہنے ہوئے ہو۔ اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ اور ابو ثور رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی قول ہے۔ اور حضرت سالم کھلے بٹنوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اور داؤد الطائی نے کہا ہے: جب ڈاڑھی بڑی ہو تو اس کے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اسی معنی کو اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ پس اگر وہ امام ہو تو وہ نماز نہیں پڑھائے گا مگر اپنی چادر اوڑھ کر، کیونکہ یہ زینت میں سے ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: زینت میں سے نماز جوتوں میں پڑھنا بھی ہے۔ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نماز کی زینت رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہر شے کے لیے زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت تکبیر اور رفع یدین ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ تم پر وسعت فرمائے تو بھی اپنے آپ کو وسعت دو (1)، آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے جمع کرے، نماز پڑھے ازار (تہبند) اور ردا (اوپر چڑھنے والی چادر) میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قبا (میں) شلوار اور ردا میں، شلوار اور قمیص میں، شلوار اور قبا میں۔ اور میں تو گمان کرتا ہوں کہ انہوں نے فرمایا: تبان (اتنا قلیل کپڑا جس سے صرف شرمگاہ ڈھانپی جاسکے) اور قمیص میں، تبان اور ردا میں، اور تبان اور قبا میں۔ بخاری اور دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہر اس شی کا کھانا پینا حلال قرار دیا ہے جب تک وہ فضول خرچی یا تکبر و نخوت ہو (2)۔ اور رہی وہ شی جس کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے وہ ہے جو بھوک کا ازالہ کردے، پیاس میں سکون عطا کردے، پس اسے عقلاً اور شرعاً کھانا مستحب ہے، کیونکہ اس میں جان کی حفاظت اور حواس کی نگہداشت ہے، اسی لیے شریعت نے صوم وصال سے منع کیا ہے، کیونکہ وہ جسم کو کمزور کردیتا ہے اور نفس کو مار دیتا ہے اور عبادت سے کمزور کردیتا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اس سے منع کرتی ہے اور عقل اس کا دفاع کرتی ہے، اور جس نے حاجت اور ضرورت کی مقدار سے بھی اپنے آپ کو روک کر رکھا تو اس کے لیے نہ کوئی نیکی میں سے حصہ اور نہ ہی زہد میں ہے، کیونکہ عجز اور ضعف کے سبب وہ طاعت و عبادت کے جس عمل سے محروم ہوا ہے وہ اجر و ثواب کے اعتبار سے زیادہ اور عظیم ہے۔ اور حاجت و ضرورت کی مقدار سے زائد کے بارے میں دو مختلف قول ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حرام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مکروہ ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی صحیح ہے (3)، کیونکہ سیر ہونے کی مقدار شہروں اور زمانوں کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح دانت اور اشتہاء طعام بھی اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ کم کھانے میں کثیر فوائد ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں کہ آدمی جسم کے اعتبار سے صحت مند ہوتا ہے، قوت حفظ کے اعتبار سے عمدہ و اعلیٰ اور فہم کے اعتبار سے انتہائی ذکی اور ذہین ہوتا ہے، نیند کم ہوتی ہے اور جان ہلکی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53	2۔ تفسیر ابن عباس، جلد 1، صفحہ 420	3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 781

پھلکی رہتی ہے اور زیادہ کھانے میں معدہ بوجھل اور بدہضمی کی بو ہوتی ہے اور اسی سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی نسبت زیادہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کم کھانے کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: اکبر الدواء تقدیر الغذاء (سب سے بڑھ کر دوا غذا کی ایک مقدار مقرر کرنا ہے)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معنی کو انتہائی شافی بیان کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور وہ اطباء کے کلام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما ملأ آدمیٌ وعاءً شرا من بطن بحسْب ابن آدم لقیمات یقِمنَ صُلْبَه فإن کان لا محالة فثلثٌ لطعامه وثلثٌ لشرابه وثلث لنفسه (1) (انسان ہونے کے اعتبار سے آدمی پیٹ کے برتن کو جس شی سے بھر سکتا ہے وہ چند لقمے ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھتے ہیں اور اگر ضروری بھی ہو تو پھر ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی مشروبات کے لیے اور ایک تہائی اس کے سانس کے لیے ہو)

ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے اسے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر بقراط یہ تقسیم سن لیتا تو بالیقین اسے اس حکمت پر تعجب ہوتا۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ رشید کے پاس ایک عیسائی ماہر حکیم تھا تو اس نے حضرت علی ابن الحسین رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہاری کتاب میں علم طب کی کوئی شی نہیں ہے اور علم دو طرح کا ہے: ایک علم الادیان اور ایک علم الابدان۔ تو حضرت علی نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ساری طب کو ہماری کتاب کی نصف آیت میں جمع کر دیا ہے۔ تو اس نے پوچھا: وہ کون سی ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا۔ پھر نصرانی نے کہا: تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علم طب کی کوئی شی مروی نہیں ہے۔ تو حضرت علی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑے الفاظ میں ساری طب کو جمع کر دیا ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: المعدة بیت الأدواء والحِمْیَة رأسُ کلّ دواء وأعط کل جسد ما عوّدته (معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز دوا کی اصل ہے اور تو ہر جسم کو وہ دے جس کا تو نے اسے عادی بنایا ہے) تو وہ نصرانی بولا: ما ترك کتابکم ولا نبیکم لجالینوس طباً (2) (تمہاری کتاب اور تمہارے نبی علیہ السلام نے جالینوس کی طب کی کوئی شے چھوڑی ہی نہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہا جاتا ہے بے شک مریض کا علاج دو حصوں میں منقسم ہے: نصف دوا ہے اور نصف پرہیز ہے۔ پس اگر یہ دونوں جمع ہوں تو مریض تندرست اور صحت یاب ہو جائے گا، ورنہ اس میں پرہیز اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ پرہیز ترک کرنے کے ساتھ دوا فائدہ نہیں دیتی، حالانکہ پرہیز دوا چھوڑ دینے کے باوجود فائدہ دیتی ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أصل کل دواء الحِمیة (ہر دوا کی اصل پرہیز ہے) اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے کہ پرہیز ہر دوا سے غنی کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم

اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہند کا بڑا علاج پرہیز ہے، مریض کھانے، پینے، کلام سے چند دن تک پرہیز کرتا ہے تو وہ تندرست اور صحت یاب ہو جاتا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60

2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 100

مسئلہ نمبر 5۔ مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے'' (1)۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دنیا میں سے انتہائی قلیل حاصل کرنے اور اس میں انتہائی زہد و قناعت اختیار کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور عرب کم کھانے کے سبب مدح و تعریف کرتے ہیں اور زیادہ کھانے کے سبب مذمت کرتے ہیں، جیسا کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

تکفیه فِلْذَة کِبْد إن أَلَمّ بها من الشِّواء ویُرْوِی شُرْبَهُ الغُمَرُ

اسے جگر کا ایک ٹکڑا کافی ہوتا ہے اگر وہ روسٹ شدہ میں سے اس پر اصرار کرے اور ایک چھوٹا سا پیالہ اس کی پیاس کو بجھا دیتا ہے۔

اور ام زرع نے ابن ابی زرع کے بارے کہا ہے: بھیڑ کے چار ماہ کے بچے کے بازو اسے سیر کرتے ہیں، اور حاتم طائی نے زیادہ کھانے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے:

فإنك إن أعطیتَ بطنك سؤْلَه وفرجَك نالا مُنتهی الذَّم أجمعا

اگر تو پیٹ اور فرج کو اس کی خواہش کے مطابق دیتا رہے گا تو وہ دونوں مذمت کی انتہا کو پالیں گے۔

اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المؤمن یأكل فی معیً واحد (2) کا معنی یہ ہے کہ پیٹ بھرنے سے کم کھاتا ہے اور وہ اپنے نفس پر دوسرے کو ترجیح دیتا ہے اور وہ اپنے کھانے میں دوسرے کے لیے باقی رکھتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کھالے اسی پر وہ قناعت کر لیتا ہے۔ پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد: والکافر یأكل فی سبعة أمعاء (3) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ کبھی مومن کی نسبت کافر کم کھانے والا پایا جاتا ہے اور کبھی کافر اسلام قبول کرتا ہے لیکن اس کا کھانا کم وبیش نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ ایک معین (فرد) کی طرف ہے۔ ایک کافر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مہمان ٹھہرا، کہا جاتا ہے کہ وہ جہجاہ غفاری تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثمامہ بن اثال تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نضلہ بن عمرو غفاری تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ بصرہ بن ابی بصرہ غفاری تھا۔ اس نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا، پھر صبح کے وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اس نے ایک بکری کا دودھ پیا اور اسے بھی مکمل طور پر نہ پی سکا۔ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا (4) گویا کہ آپ نے اس طرح فرمایا: ھذا الکافر (یہ کافر) واللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل جب نور توحید کے ساتھ منور ہو جاتا ہے تو وہ طاعت و عبادت کے لیے تقویٰ کی آنکھ سے کھانے کی طرف دیکھتا ہے اور اس سے بقدر حاجت لے لیتا ہے اور جب وہ کفر کے ساتھ تاریک تھا اس کا کھانا ایسا تھا جیسے چوپایہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، جلد 2، صفحہ 186 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ جامع ترمذی، باب ماجاء ان المومن یاکل فی معی واحد، حدیث نمبر 1741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چرتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پتلا پاخانہ کر دیتا ہے۔

اور ان آنتوں میں اختلاف ہے، کیا یہ حقیقی مراد ہیں یا نہیں؟ تو کہا گیا ہے کہ مراد حقیقی انتڑیاں ہیں اور طب و تشریح کے علماء کے نزدیک ان کے معروف نام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان سات اسباب میں سے کنایہ ہیں جن کے ساتھ پیٹو کھاتا ہے: وہ حاجت اور ضرورت کے لیے، کوئی خبر سننے کے لیے، چکھنے کے لیے، سونگھنے کے لیے، دیکھنے کے لیے، مس کرنے کے لیے کھاتا ہے اور فوائد و منافع میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ اس کے کھانے کی مثل کھاتا ہے جس کی سات انتڑیاں ہوں۔ اور مومن اپنے کم کھانے کے سبب اس کی مثل کھانا کھاتا ہے جس کی صرف ایک آنت ہوتی ہے، پس وہ کافر کے ساتھ اس کے کھانے کے اجزاء میں ایک جز کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور کافر اس پر سات گناہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور معی کا لفظ اس حدیث میں معدہ کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب یہ پختہ ہو گیا تو پھر جان لے کہ آدمی کے لیے کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھوں کو دھونا مستحب ہے، کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: الوضوء قبل الطعام و بعدہ برکۃ (1) (کھانے سے پہلے اور بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) باعث برکت ہے) اور اسی طرح تورات میں ہے۔ اسے زاذان نے سلمان سے روایت کیا ہے۔ اور امام مالک پاک صاف ہاتھوں کو دھونا مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن حدیث طیبہ کی اقتدا و پیروی کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور کوئی (آدمی) کھانا نہ کھائے یہاں تک کہ یہ جان لے کہ آیا وہ گرم ہے یا ٹھنڈا؟ کیونکہ اگر وہ گرم ہو گا تو اسے تکلیف اور اذیت ہو گی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ابردوا بالطعام فان الحار غیر ذی برکۃ (2) (کھانے کو ٹھنڈا کر لو کیونکہ گرم کھانا برکت والا نہیں ہوتا) یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکی ہے۔ اور کھانے کو سونگھے نہیں کیونکہ یہ چوپاؤں کا عمل ہے، بلکہ اگر اسے پسند ہو تو اسے کھا لے اور اگر پسند نہ ہو تو اسے چھوڑ دے۔ اور لقمہ چھوٹا بنائے اور اسے زیادہ دیر تک چبائے تاکہ پیٹو اور حریص شمار نہ ہو۔ اور شروع میں بسم اللہ شریف پڑھے اور آخر میں الحمد کہے۔ اور یہ مناسب نہیں کہ وہ الحمد للہ کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک تمام ساتھی کھانے سے فارغ ہو جائیں، کیونکہ آواز بلند کرنے میں انہیں کھانے سے روکنے کی طرف اشارہ ہے۔ کھانے کے آداب بہت زیادہ ہیں، یہ تمام انہیں میں سے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سورۂ ہود میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور پینے کے بھی معروف آداب ہیں۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا اکل احدکم فلیأکل بیمینہ واذا شرب فلیشرب بیمینہ فان الشیطان یأکل بشمالہ ویشرب بشمالہ (3) (جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے اور جب کوئی مشروب پیے تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 172
2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 249، حدیث نمبر 40802
3۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 172

سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے)

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُسْرِفُوْا یعنی کھانے کی کثرت میں (تم فضول خرچی نہ کرو) اور اس میں سے کثرت شرب بھی ہوسکتا ہے، اس لیے کہ (زیادہ کھانا یا پینا) معدے کو بوجھل کردیتا ہے اور یہ آدمی کو اپنے مالک کی خدمت سے روک لیتا ہے اور خیر اور نیکی کے اضافی کاموں میں حصہ لینے سے روک دیتا ہے۔ اور اگر اس نے اس حد سے انتہائی تجاوز کرلیا کہ فرض قیام سے اس نے روک دیا تو یہ اس پر حرام ہوجائے گا، حالانکہ اس نے اپنے کھانے اور پینے میں اسراف اور زیادتی کی ہے۔ اسد بن موسیٰ نے عون بن ابی جحیفہ عن أبیہ کی حدیث روایت کی ہے اس نے بیان کیا: میں نے موٹے گوشت کے ساتھ ثرید بنا کر کھایا، پھر میں حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میں (معدہ بھر جانے کے سبب) ڈکار لے رہا تھا، تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: ''ابا جحیفہ! اپنے ڈکار روک لے، کیونکہ دنیا میں اکثر لوگ پیٹ بھرے ہوتے ہیں قیامت کے دن ان کی بھوک طویل ہوجائے گی'' (1)۔ پس اس کے بعد ابو جحیفہ نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا یہاں تک کہ دنیا سے وصال فرماگئے، وہ جب صبح کا کھانا کھالیتے تھے تو شام کا نہ کھاتے تھے اور جب کبھی شام کا کھاتے تو پھر صبح کا کھانا نہ کھاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد: المؤمن یأکل فی مِعًی واحد (2) کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ایمان تام، کیونکہ آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے ایمان کا کمال یہ ہے کہ ابو جحیفہ کی طرح ایسے امور میں فکر کرتا ہے جو اسے موت اور اس کے بعد پیش آئیں گے اور ان احوال میں سے خوف اور ڈر سے اپنی شہوت کو پورا کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

اور ابن زید نے کہا ہے: وَ لَا تُسْرِفُوْا کا معنی ہے: تم حرام نہ کھاؤ (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ السرف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) کہ تو ہر وہ شی کھائے جس کی تجھ میں طلب اور چاہت پیدا ہو (4)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اسراف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) پیٹ بھرنے کے بعد مزید کھانا۔ اور یہ سب ممنوع ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا: اے بیٹے! (ایک بار) پیٹ بھرنے کے اوپر مزید پیٹ بھر کر نہ کھا، کیونکہ تیرا اسے کتے کے لیے ڈال دینا اس میں سے بہتر ہے کہ تو اسے کھائے۔ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا: اس نے کیا کیا؟ انہوں نے بتایا: اسے گزشتہ رات بدہضمی ہوگئی۔ آپ نے کہا: اسے بدہضمی ہوئی؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ اگر وہ مرجاتا تو میں اس پر نماز نہ پڑھتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے ایام حج میں چکنائی نہ [illegible] تے تھے اور کھانے کی قلیل مقدار پر اکتفا کرتے تھے اور ننگے بدن طواف کرتے تھے۔ تو ان کو فرمایا گیا: خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا یعنی تم اس شے کو حرام کرنے میں زیادتی اور اسراف نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام نہیں کیا۔

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 217، حدیث نمبر 6220
2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 186
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 218
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، جلد 1، صفحہ 248

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے، آپ فرمائیے: یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی (اور) صرف انہیں کے لیے ہیں قیامت کے روز، یونہی ہم مفصل بیان کرتے ہیں آیتوں کو ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) جانتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنی طرف سے ایسی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام نہیں کیا۔ یہاں زینت کا لفظ خوبصورت اور حسین لباس کے لیے ہے، جب اسے پہننے والا اس پر قادر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد تمام کپڑے ہیں، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: إذا وسع الله عليكم فأوسعوا (1) (جب اللہ تعالیٰ تمہیں وسعت اور خوشحالی عطا فرمائے تو تم بھی اپنے نفسوں کو راحت اور وسعت عطا کرو) یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن حسین ابن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ ان کے بارے روایت ہے کہ وہ ریشم اور ان سے بنا ہوا کپڑا پچاس دینار کے عوض خرید کر موسم سرما میں وہ لباس پہنتے تھے اور جب گرمیوں کا موسم آتا تو اسے صدقہ کر دیتے یا اسے بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دیتے اور موسم گرما میں وہ مصری کپڑوں میں سے سرخ مٹی سے رنگے ہوئے دو کپڑے پہنتے تھے اور یہ کہتے تھے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو یہ آیت قیمتی اور عمدہ لباس پہننے اور جمعہ اور عید کے دنوں میں لباس کے ساتھ حسن و جمال کا اظہار کرنے پر دلیل ہے، (اسی طرح) لوگوں سے ملاقات کرنے کے وقت اور بھائیوں کی زیارت و ملاقات کے وقت حسین لباس پہننے پر بھی دلیل ہے۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں تو وہ حسن و جمال کا اہتمام کریں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے (2) کہ انہوں نے ایک ریشمی حلہ دیکھا جو مسجد کے دروازے کے پاس بیچا جا رہا تھا، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اسے جمعہ کے دن پہننے کے لیے اور وفود سے ملاقات کے وقت پہننے کے لیے خرید لیں جب وہ (وفود) آپ سے ملاقات کے لیے آتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما يلبس هذا من لا خلاق له في الآخرة (3) (اسے وہ پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو) تو اس میں آپ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 52
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 189
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 122

نے تجمل وخوبصورتی کے سبب اس کا انکار نہیں کیا، بلکہ اس کے ریشمی ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کیا، حالانکہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درہم کے عوض ایک حلہ خریدا آپ اس میں نماز پڑھتے تھے۔

اور حضرت مالک بن دینار عدن کا بنا ہوا عمدہ کپڑا پہنتے تھے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا کپڑا تقریباً ایک دینار کے عوض خریدا جاتا تھا۔ یہ کہاں ان میں سے ہیں جن سے اعراض کیا جاتا ہے اور آپ کھدر کے لباس کو السی اور اون کے کپڑوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اور فرماتے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ غور کرو! جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کیا آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تقویٰ کا لباس ترک کر دیا؟ نہیں۔ قسم بخدا! بلکہ وہ تو اہل تقویٰ ہیں اور صاحب عقل وعرفان ہیں اور ان کے سوا صرف اہل دعویٰ ہیں، ان کے دل تقویٰ سے خالی نہیں۔ خالد بن شوذب نے کہا ہے: میں حسن کے پاس حاضر تھا اور ان کے پاس فرقد آیا اور حسن نے اسے اس کے کپڑوں سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور فرمایا: اے فریقد، اے ام فریقد کے بیٹے! بے شک نیکی اس لباس میں نہیں ہے، بلکہ نیکی وہ ہے جو سینے میں راسخ ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ اور میرے بھتیجے ابو محمد معروف بالکرخی ابوالحسن بن یسار کے پاس تشریف لے گئے اور وہ اون کا جبہ پہنے ہوئے تھے، تو ابوالحسن نے انہیں کہا: اے ابا محمد! تو نے اپنے دل کو صوفی بنایا ہے یا اپنے جسم کو؟ اپنے دل کو صوفی بنا اور اپنے بدن کو قہستانی کپڑا پہنا۔ ایک آدمی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا: آپ کے اصحاب (ساتھیوں) کی ایک جماعت آئی ہے اور وہ جامع میں ہیں، پس آپ چلے اور آپ نے ان پر پیوند لگے ہوئے کپڑے اور پٹیاں (چھوٹے چھوٹے رومال) دیکھیں تو آپ یہ کہنے لگے:

أمّا الخيام فإنها كخيامهم وأرى نساء الحيّ غير نسائه

"جہاں تک خیموں کا تعلق ہے تو یہ ان کے خیموں کی طرح ہیں اور میں محلے کی عورتوں کو اجنبی عورتیں دیکھ رہا ہوں"۔

ابوالفرج ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں چار وجہ سے پٹیاں اور پیوند لگے کپڑے پہننا ناپسند کرتا ہوں: ایک تو اس لیے کہ یہ اسلاف کا لباس نہیں ہے، بلاشبہ وہ اہم ضرورت کے وقت پیوند لگاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لباس فقر وافلاس کے دعویٰ کو متضمن ہوتا ہے، حالانکہ آدمی کو حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اثر کو ظاہر کرے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں زہد کا اظہار ہے، حالانکہ ہمیں اسے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے یہ ان لوگوں کے ساتھ مشابہت ہے جو شریعت سے دور ہٹنے والے ہیں۔ اور جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے وہ انہیں میں سے ہوتا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس نے خطا اور غلطی کی ہے جس نے بالوں اور اون کے لباس کو روئی اور کتان کے لباس پر ترجیح دی ہے، بشرطیکہ وہ اس کا لباس پہننے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور جس نے سبزی اور دال کھائی اور اسے گندم کی روٹی کی نسبت زیادہ پسند کیا۔ اور جس نے اس خوف سے گوشت کھانا چھوڑ دیا کہ اس سے اس میں عورتوں کی خواہش اور طلب پیدا ہوگی۔ حضرت بشر بن حارث سے اونی لباس کے بارے پوچھا گیا، تو ان پر یہ شاق گزرا اور ان کے چہرے میں کراہیت اور ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر فرمایا: شہروں میں میرے نزدیک خز (ریشم) اور معصفر پہننا اون پہننے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اور ابوالفرج نے کہا ہے: اسلاف متوسط لباس پہنتے تھے، نہ زیادہ اعلیٰ اور نہ زیادہ گھٹیا اور وہ جمعہ، عید اور بھائیوں سے

ملاقات کے لیے عمدہ اور خوبصورت لباس پسند کرتے تھے اور ان کے نزدیک عمدہ لباس پسند کرنا، قبیح نہیں تھا۔ اور رہا وہ لباس جو اپنے پہننے والے کے لیے عیب ہوتا ہے، چونکہ وہ اظہار زہد اور اظہار فقر کو متضمن ہوتا ہے، تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کی زبان ہے اور یہ پہننے والے کی حقارت اور ذلت کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہ سب مکروہ ہے اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور کوئی کہنے والا کہے: لباس کا عمدہ اور ارفع ہونا تو نفس کی خواہش ہے، حالانکہ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس میں (اعلیٰ اور قیمتی لباس میں) مخلوق کے لیے تزیین و آرائش ہے، حالانکہ ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہمارے افعال اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لیے ہوں نہ کہ مخلوق کے لیے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ ہر شی (یا عمل) جس کی خواہش نفس کرتا ہے وہ قابل مذمت نہیں ہوتی، لہٰذا لوگوں کے لیے جو بھی زیب و زینت کی جائے گی وہ مکروہ نہ ہوگی، البتہ اس سے ضرور روکا جائے گا جب شریعت نے اس سے منع کیا ہو یا دین کے معاملے میں ریا کی وجہ سے (اس سے منع کیا جائے گا) کیونکہ انسان کے لیے واجب ہے کہ وہ خوبصورت دکھائی دے۔ یہ نفس کا وہ حصہ ہے جو قابل ملامت نہیں، اسی وجہ سے وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور شیشے میں دیکھتا اور اپنی دستار کو درست کرتا ہے اور وہ ایسا لباس پہنتا ہے جس کا کپڑا اندر کی جانب سے کھردرا ہوتا ہے اور باہر کی جانب سے اس کا ظاہر انتہائی حسین اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو مکروہ ہو اور نہ ہی اس کی مذمت کی جاسکتی ہے۔

حضرت مکحول نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا ایک گروہ دروازے پر آپ کا انتظار کر رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ارادہ سے باہر تشریف لائے اور گھر میں ایک برتن تھا جس میں پانی تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں دیکھنے لگے اور اپنی ریش مبارک اور اپنے بال سیدھے اور درست فرمانے لگے۔ تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی یہ کر رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم إذا خرج الرجلُ إلی أخوانه فليهيئ من نفسه فإنّ الله جميل يحب الجمال (ہاں جب آدمی اپنے بھائیوں کے پاس جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو تیار کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر(1) (جنت میں وہ داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا) تو ایک آدمی نے عرض کی: بے شک آدمی تو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا حسین ہو اور اس کے جوتے حسین ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ الله جميل يحب الجمال الكِبْرُ بطرُ الحق وغمْطُ الناس (2) (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال (خوبصورتی) کو پسند کرتا ہے اور تکبر حق کو قبول کرنے سے انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے) اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، وہ تمام کی تمام نظافت اور حسن ہیئت پر دلالت کرتی ہے۔

محمد بن سعد نے بیان کیا ہے کہ فضل بن دکین نے ہمیں خبر دی، انہوں نے کہا ہمیں مندل نے ثور کے واسطہ سے خالد بن معدان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوران سفر کنگھی، شیشہ، تیل، مسواک اور سرمہ اپنے ساتھ رکھتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 65 2۔ ایضاً

تھے۔ اور ابن جریج سے مروی ہے: کنگھی ہاتھی دانت کی تھی اس کے ساتھ آپ کنگھی کرتے تھے۔ ابن سعد نے کہا ہے: ہمیں قبیصہ بن عقبہ نے بتایا ہے انہوں نے بیان کیا سفیان نے ربیع بن صبیح عن یزید رقاشی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے سر مبارک کو تیل لگاتے تھے اور اپنی ریش مبارک کو پانی کے ساتھ کنگھی کرتے تھے۔

یزید ابن ہارون نے ہمیں خبر دی ہے کہ عباد بن منصور نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرمہ دانی تھی جس سے آپ سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ ڈالتے تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، طیبات کا اسم ہر اس شی کے لیے عام ہے جو کمائی اور کھانے کے اعتبار سے پاکیزہ اور طیب ہو۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم (1) نے بیان کیا ہے: مراد رزق میں سے وہ پاکیزہ اور حلال چیزیں ہیں جنہیں اہل جاہلیت نے حرام قرار دیا مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ (یہ سبھی جانور ہیں جنہیں انہوں نے اپنے لیے حرام کر رکھا تھا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ سے مراد ہر لذیذ کھانا ہے، تحقیق طیبات کو ترک کرنے اور لذات سے اعراض برتنے میں اختلاف ہے، پس ایک قوم نے کہا ہے: اس کا تعلق قربات سے نہیں ہے اور مباحات میں عمل کرنا اور نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں فی ذاتہ کوئی قربت نہیں ہے، بلکہ یہ تو دنیا میں زہد اختیار کرنے، دنیا میں اپنی طویل امید کو کم کرنے اور اس کی وجہ سے تکلف ترک کرنے کا ایک ذریعہ اور راستہ ہے۔ اور یہ اس کے لیے مستحب امر ہے اور مستحب سبب قربت ہے۔ اور ایک اور فریق نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے: اگر ہم چاہتے تو ہم صلاء، صلائق اور صناب بناتے لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کو کئی اقوام کی مذمت کرتے ہوئے سنا ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں) اور صرائق را کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور صلائق اور صرائق دونوں کا معنی روٹی ہے۔ اور صلائق (لام کے ساتھ) سے مراد وہ ہے جو گوشت اور سبزی کے ساتھ لگائی جائے۔ اور صلاء (صاد کے کسرہ اور مد کے ساتھ) سے مراد بھنا ہوا گوشت ہے۔ اور صناب سے مراد رائی اور کشمش سے بنائی ہوئی چٹنی ہے۔ اور دوسروں نے ان تمام کی موجودگی میں کلفت اور غیر کلفت کے ساتھ فرق کیا ہے۔ ابو الحسن علی بن مفضل جو ہمارے اشیاخ کے شیخ ہیں انہوں نے فرمایا ہے: یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ

کیونکہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو محض اس کے عمدہ اور طیب ہونے کی وجہ سے اسے کھانے سے منع فرمایا ہو، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ، شہد، تربوز اور پکی کھجوریں تناول فرماتے تھے، البتہ ان کے لیے تکلف کرنا اس لیے مکروہ ہے کہ ان میں شہوات دنیا کے سبب امور آخرت سے غافل ہونا لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

میں (مفسر کہتا ہوں: بعض صوفیاء نے لذیذ کھانے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 194

طرح ہے تو پھر فواحش میں سے ظاہر زنا ہے۔ واللہ اعلم

وَالْاِثْمَ حسن نے کہا ہے: اس سے مراد خمر (شراب) ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

شربتُ الإثم حتی ضلّ عقلی کذاك الإثمُ تذهبُ العقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل جاتی رہی اسی طرح گناہ عقلوں کو ختم کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

نشرب الإثم بالصُّوَاع جِهارًا وتری المسك بیننا مُستعارا (1)

اس میں بھی اثم کا لفظ شراب کے معنی میں مذکور ہے۔

وَالْبَغْیَ اس کا معنی ظلم کرنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور ثعلب نے کہا ہے: البغی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی کے بارے میں کچھ دعویٰ کرتا ہے اور اس بارے میں گفتگو کرتا ہے اور وہ بغیر حق کے اس سے مطالبہ کرتا ہے، مگر یہ کہ وہ حق کے ساتھ اس پر غالب آ جائے۔ (یعنی اگر دوسرا حق کے ساتھ اس پر غالب نہ آئے تو یہ اس سے ناحق چیز لے لیتا ہے) اور اثم اور بغی کو فواحش سے الگ ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں بھی فواحش میں سے ہیں، تو یہ فحش میں ان کے انتہائی برا ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ پس ان دونوں کے امر کی تاکید کے لیے اور ان کے بارے زجر و توبیخ کا قصد کرتے ہوئے ان کے ذکر پر نص بیان فرمائی۔ اور اسی طرح وَ اَنْ تُشْرِكُوْا اور وَاَنْ تَقُوْلُوْا ہیں۔ یہ دونوں ماقبل پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہیں۔ اور ایک جماعت نے اثم بمعنی خمر ہونے کا انکار کیا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اثم سے مراد وہ گناہ ہے جو حد اور لوگوں پر لمبا ہونے (انتہائی شاق ہونے) سے کم ہو۔ نحاس نے کہا ہے: رہا یہ کہ اثم بمعنی خمر ہو تو یہ معروف نہیں۔ اور اثم کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ تمام گناہ اثم کہلاتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا ہے:

إنی وجدتُ الأمرَ أرشَدُہ تقوی الإلہ وشرُّہ الإثمُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عربی نے بھی اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: "شعر میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے"۔ کیونکہ اگر وہ کہتا: شربتُ الذنب یا شربتُ الوزر لکان کذالك (میں نے گناہ کیا یا میں نے بوجھ (گناہ کا) اٹھایا تو اس طرح ہوا) اس قوت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ذنب اور وزر دونوں شراب کے اسماء میں سے ہیں، اسی طرح لفظ اثم بھی ہے۔ اور جس نے اس قسم کی مثالوں کے ساتھ گفتگو اور تکلم کو ثابت کیا ہے جو لغت اور معانی میں طریقہ استدلال سے جہالت اور ناواقفی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے اسے حسن سے ذکر کیا ہے اور جوہری نے صحاح میں کہا ہے: کبھی خمر کو اثم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

شربتُ الإثم.........البیت (2)

اور ہروی نے اپنی غریب میں کہا ہے کہ خمر اثم (گناہ) ہے پس یہ بعید نہیں ہے کہ اثم کا لغوی اطلاق تمام گناہوں پر ہوتا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 146 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 220

ہے اور خمر پر بھی اور اس میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اور بغی کا معنی ظلم میں تجاوز کرنا (اور حد سے بڑھنا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فساد ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

''اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، سو جب آجائے ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ یعنی ہر امت کے لیے ایک وقت ہے جو مقرر کر دیا گیا ہے۔ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ یعنی جب ان کا وہ وقت آجائے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم اور معین ہے۔

ابن سیرین نے صیغہ جمع کے ساتھ جاء آجالهم پڑھا ہے۔ لَا يَسْتَأْخِرُونَ تو نہ وہ اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ ایک لمحہ سے کم، مگر یہ خاص طور پر ساعت کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اوقات کے اسماء میں سے اُقل اور کم یہی ہے اور یہ ظرف زمان ہے۔

وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں) تو یہ اس پر دلیل ہے کہ مقتول اپنا مقررہ وقت آنے پر ہی قتل کیا جاتا ہے۔ اور أجل الموت سے مراد موت کا مقررہ وقت ہے، جیسے اجل الدین قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت ہے۔ اور ہر وہ شی جس کے ساتھ کسی شی کو موقت کر دیا جائے تو وہی اس کے لیے اُجل ہوتی ہے۔ اور انسان کی اُجل سے مراد وہ خاص وقت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ لامحالہ اس وقت خاص میں زندہ آدمی مر جائے گا۔ اور یہ وہ وقت ہے جس سے اس کی موت کا موخر ہونا جائز نہیں ہوتا، اس حیثیت سے نہیں کہ اس کی تاخیر مقدر نہیں۔ اور بہت سے معتزلہ نے کہا ہے سوائے اس کے جس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی ہے: بے شک مقتول اپنے اس مقرر وقت سے پہلے مر جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور یہ کہ اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو وہ ابھی زندہ رہتا۔ یہ غلط ہے، کیونکہ مقتول اس وجہ سے نہیں مرا کہ دوسرے نے اسے قتل کیا ہے، بلکہ اس وجہ سے اسے موت آئی ہے) جو فعل اللہ تعالیٰ نے اس کی جان ختم کرنے کے بارے اس وقت کیا جب اسے ضرب لگی۔ پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر وہ اپنے مقررہ وقت پر مرا ہے تو پھر اس کے قاتل کو قتل کیوں کیا جاتا ہے اور اس سے قصاص کیوں لیا جاتا ہے؟ تو جواب یہ دیا جائے گا: ہم اسے اس لیے قتل کرتے ہیں کہ اس نے حد سے تجاوز کیا ہے اور اس نے ایسا تصرف کیا ہے جس میں اسے تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا، اس کا سبب مقتول کی موت اور اس کے جسم سے روح کا نکلنا نہیں، کیونکہ یہ اس (قاتل) کا فعل نہیں۔ اگر وہ لوگوں کو اور اس کی اس تعدی اور زیادتی کو بغیر قصاص کے چھوڑ دے تو بالیقین یہ فساد اور لوگوں کو ہلاکتوں تک پہنچا دے۔ یہ بالکل واضح اور بین ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

''اے اولاد آدم! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں سے جو بیان کریں تم پر میری آیتیں تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور غرور کیا ان سے وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یہ شرط ہے۔ ما کے دخول کی وجہ سے نون تاکید داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما صلہ ہے، یعنی أن یأتکم (اگر تمہارے پاس رسول آئیں) اس میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی طرف ان میں سے رسول بھیجے گا تاکہ ان کا قبول کرنا (آسان اور) اقرب ہو۔ اور قصص سے مراد لگاتار اور تسلسل کے ساتھ بات کرنا ہے۔

آیاتی یعنی میرے فرائض اور میرے احکام (وہ تم پر میرے فرائض اور میرے احکام بیان کریں)۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ یہ شرط ہے اور اس کا مابعد اس کا جواب ہے اور پھر یہ پہلی شرط کا جواب ہے، یعنی جس نے اصلاح کر لی اس کی جو میرے اور اس کے درمیان ہے۔ وأصلح منکم ما بینی وبینہ۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ اس پر دلیل ہے کہ قیامت کے دن مومنین نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ انہیں غم لاحق ہوگا اور نہ ان پر کوئی رعب اور ڈر طاری ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کے احوال اور خوف تو انہیں لاحق ہوگا لیکن ان کا انجام امن اور سکون ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ کا جواب وہ ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے، یعنی فأطیعوهم فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ (پس تم ان کی اطاعت کرو اور جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی (1)) پہلا قول زجاج کا ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو انہیں مل جائے گا ان کا حصہ جو ان کی قسمت میں لکھا ہے، یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے جو قبض کریں گے ان کی روحوں کو تو (ان سے) کہیں گے: کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا؟ کہیں گے: وہ گم ہو گئے ہم سے اور گواہی دیں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے''۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 102

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے سے اور اس کی آیات کو جھٹلانے سے زیادہ برا اور شنیع ظلم کون سا ہے۔ پھر فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ یعنی رزق، عمر اور عمل میں سے جو ان کے لیے لکھا جا چکا ہے وہ انہیں مل جائے گا۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ اور ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شقاوت وسعادت میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ حصہ انہیں مل جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خیر اور شر میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے (وہ انہیں مل جائے گا) حسن اور ابو صالح نے کہا ہے: ان کے کفر کی مقدار کے برابر عذاب انہیں مل جائے گا۔ اور علامہ طبری کی پسند یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: ما کُتِبَ لهم، ای ما قُدِّرَ لهم من خیرٍ و شرٍ و رزقٍ و عملٍ و أجلٍ (1) (جو ان کے لیے لکھا گیا ہے یعنی خیر اور شر، رزق، عمل اور اجل (عمر) میں سے جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سب انہیں مل جائے گا)، جیسا کہ ابن زید، حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال میں سے پہلے گزر چکے ہیں۔ فرمایا: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس کے پیچھے یہ ارشاد گرامی ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ یعنی یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے موت کے فرشتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ کفار کا عذاب اس میں مذکور ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ حسن بن علی حلوانی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے علی بن مدینی نے لکھوایا ہے اور کہا ہے، میں نے عبدالرحمن بن مہدی سے قدر کے بارے پوچھا، تو انہوں نے مجھے کہا: ہر شی تقدیر کے مطابق ہے، طاعت و معصیت بھی تقدیر کے ساتھ ہیں اور سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی یہ کہے: بے شک گناہ تقدیر کے ساتھ نہیں ہیں۔ علی نے بیان کیا اور عبدالرحمن بن مہدی نے مجھے کہا: علم، قدر اور کتاب بھی ہم معنی اور برابر ہیں۔ اور جب میں نے عبدالرحمن بن مہدی کا کلام یحییٰ بن سعید پر پیش کیا تو انہوں نے کہا: اس کے بعد قلیل وکثیر کوئی شی باقی نہیں رہی۔

اور یحییٰ بن معین نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں مروان فزاری نے بیان کیا کہ ہمیں اسماعیل بن سمیع نے بکیر الطویل سے، انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (2) سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ کے بارے کہا کہ یہ وہ قوم ہے جو ایسے اعمال کریں گے جو اعمال کرنا ان کے لیے لازم اور ضروری ہیں۔ اور حتی غایت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ان کے بارے ابتدائے خبر کے لیے ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: حتی، اِمّا اور اِلّا ان میں امالہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ حروف ہیں اور ان کے درمیان اور اسماء کے درمیان واضح فرق ہے، جیسے حبلی اور سکری۔ زجاج نے کہا ہے: حتیٰ کو یا کے ساتھ لکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ سکری کے مشابہ ہے اور اگر اِلّا کو یا کے ساتھ لکھا جائے تو یہ الی کے مشابہ ہو جائے گا۔ اور اما کو یا کے ساتھ نہیں لکھا گیا، کیونکہ یہ ان ہے اس کے ساتھ ما ملایا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور تَدْعُوْنَ کا معنی تعبدون ہے (تو کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرعبادت کرتے تھے) قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا کہیں گے: وہ ہم سے گم ہو گئے یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 203 2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 201

وہ باطل ہیں اور وہ چلے گئے ہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ (سب) آخرت میں ہوگا۔

وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ یعنی وہ اپنے بارے میں کفر کا اقرار کر لیں گے۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: داخل ہو جاؤ ان امتوں میں سے جو گزر چکی ہیں تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے (ان کے پاس) دوزخ میں (داخل ہو جاؤ) جب بھی داخل ہوگی کوئی امت تو وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر یہاں تک کہ جب جمع ہو جائیں گی اس میں سب امتیں، تو کہے گی آخری امت پہلی امتوں کے متعلق: اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس دے ان کو دگنا عذاب آگ سے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اور کہیں گی پہلی امتیں پچھلی امتوں سے کہ نہیں ہے تمہیں ہم پر کوئی فضیلت پس چکھو عذاب بوجہ اس کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ، ای مع اُمَمٍ یعنی تم داخل ہو جاؤ ان امتوں کے ساتھ۔ تو اس میں فی بمعنی مع ہے۔ اور یہ ممتنع نہیں ہے، کیونکہ تیرا قول: زید فی القوم بمعنی زید مع القوم ہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فی اپنے معنی میں ہی ہے(1)۔ أی أدخلوا فی جملتھم (تم بھی ان کے اجتماع میں داخل ہو جاؤ) اور قائل (کہنے والا) کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم داخل ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ داروغہ جہنم مالک ہے۔ (یعنی وہ انہیں کہے گا: تم داخل ہو جاؤ)۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا جب بھی کوئی امت داخل ہوگی تو وہ اس پر لعنت بھیجے گی جو اس سے پہلے جہنم کی طرف جا چکی ہے اور یہ دین اور ملت کے اعتبار سے اسی کی طرح ہے(2)۔ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا یہاں تک کہ جب سب امتیں اس میں جمع ہو جائیں گی۔ اعمش نے تدارکوا پڑھا ہے اور یہ اصل ہے، پھر اس میں ادغام ہوا اور اسے ہمزہ وصل کی ضرورت پڑی۔ اسے مہدوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔ حتی إذا أدرکوا یعنی جب بعض بعض کو پالیں گے۔ اور عصمہ نے ابو عمرو سے حتی إذا إدارکو نقل کیا ہے اس میں اجتماع ساکنین کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 398   2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 149

اور بیان کیا ہے کہ یہ دونوں قرائتیں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور اس کے لیے مال کا دو تہائی ہے۔ اور ابو عمرو سے یہ بھی منقول ہے: اِذَا ادَّارَكُوْا یعنی الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، تو گویا انہوں نے تذکر کے لیے اِذا پر سکوت کیا۔ اور جب ان کا سکوت طویل ہوا تو ہمزہ وصل قطعی ہو گیا جیسے اس سے ابتدا کی جائے۔ اور شعر میں الف وصل بطور قطع استعمال ہوا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

یا نفسُ صبراً کلُّ حیٍّ لاقِ　　وکلُّ إثنین إلی إفتراقِ

حضرت مجاہد اور حمید بن قیس سے حَتّٰی اِذَا ادّٰرَكُوْا مروی ہے (یعنی) اس میں التقاء ساکنین کی وجہ سے اذا کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے اور دال کے بعد والے الف کو بھی حذف کر دیا گیا ہے اور جَمِيْعًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ یعنی بعد میں داخل ہونے والی امت اور یہ اتباع کرنے والے ہیں پہلی امتوں کے بارے کہے گی۔ اور وہ قیادت کرنے والے والیاں ہیں۔ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۔ لِاُوْلٰىهُمْ میں لام لام اجل ہے، کیونکہ انہوں نے پہلی امتوں کو خطاب نہیں کیا، بلکہ انہوں نے پہلی امتوں کے حق میں کہا: رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا (اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا)

اور الضعف سے مراد ایک مقدار پر اسی کی مثل زائد مقدار چاہے ایک بار یا کئی بار۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہاں الضعف سے مراد اژدہا اور سانپ ہیں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ (الاحزاب) (اے ہمارے رب! ان کو دوگناہ عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت) اور وہاں ضعف کا ذکر اس سے کثیر معنی اور جو احکام اس پر مترتب ہو رہے ہیں ان کے لیے آرہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) تابع اور متبوع ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یہ ان کی قراءت ہے جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہر فریق اس (عذاب) کے بارے نہیں جانتا جو دوسرے فریق کے لیے ہے، کیونکہ اہل جہنم میں سے بعض جب یہ جان لیں کہ کسی اور کا عذاب اس کے عذاب سے زیادہ ہے تو یہ بھی اس کے لیے راحت اور تسلی کی ایک قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یعنی لیکن تم نہیں جانتے اے مخاطبین! جو عذاب وہ پا رہے ہیں۔ اور جائز ہے کہ معنی یہ ہو لیکن تم نہیں جانتے اے اہل دنیا! اس عذاب کی مقدار جس میں وہ مبتلا ہیں۔

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی پہلی امتیں پچھلی امتوں کو کہیں گی: تحقیق تم نے کفر کیا اور تم نے بھی کیا جو ہم نے کیا، پس تم عذاب میں کسی تخفیف کے مستحق نہیں ہو۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے نہ کھولے جائیں گے ان کے لیے آسمان کے

دروازے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں جرم کرنے والوں کو۔ ان کے لیے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی ان کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اسی لیے صحیح احادیث موجود ہیں جو ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں کافر کی روح قبض کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا: اس سے ایسی ہوا (بو) خارج ہوتی ہے جو سطح زمین پر پائے جانے والے مردار سے زیادہ بدبودار ہوتی ہے، پس وہ اسے لے کر اوپر کی جانب چڑھتے ہیں اور ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں: یہ خبیث روح کس کی ہے؟ تو یہ بتاتے ہیں: فلاں بن فلاں کی۔ اور یہ اس کا وہ قبیح ترین نام لیتے ہیں جس کے ساتھ اسے دنیا میں پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ آسمان دنیا تک پہنچ کر رک جاتے ہیں اور وہ اسے کھولنے کی درخواست کرتے ہیں لیکن اس کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جاتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے جب وہ دعا مانگیں گے۔ حضرت مجاہد اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے ان کے لیے جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، کیونکہ جنت آسمانوں میں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ اور اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہیں ہوسکتا پس وہ بھی بالیقین جنت میں داخل نہ ہوسکیں گے۔ اور یہ اس پر قطعی دلیل ہے کہ ان کے لیے عفو و درگزر جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان مسلمانوں کا اجماع ہے تو ان پر خطا کا اطلاق کرنا جائز نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کی۔

قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا ہے: اگر کوئی کہنے والا کہے اس امت کا یہ اجماع کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ متکلمین کی ایک جماعت نے یہ گمان کیا ہے کہ کافروں میں سے یہود و نصاریٰ اور دیگر کی تقلید کرنے والے دوزخ میں نہیں ہوں گے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جنہوں نے اپنے اندر پیدا ہونے والے شبہ کی بنا پر مقلد کے کافر ہونے کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ نظریہ ہی نہیں کہ مقلد کافر ہے اور اسی بنا پر کہا ہے کہ وہ جہنم میں نہیں ہوگا اور اس بارے علم کہ مقلد کافر ہے یا نہیں بطریق نظر حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس کا انحصار توقیف اور خبر پر ہے۔

حمزہ اور کسائی نے لا یُفتح یا مضمومہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر ہے اور باقیوں نے جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر تا کے ساتھ قراءت کی ہے جیسے فرمایا: مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ (ص) پس اسے مونث لایا گیا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کی ہے، اس معنی کی بنا پر کہ تخفیف قلیل و کثیر کے لیے ہوتی ہے اور تشدید تکثیر و

1۔ تفسیر طبری زیر آیت

تکریر کے لیے ہوتی ہے کسی اور کے لیے نہیں (اور تکریر کا معنی ہوتا ہے یکے بعد دیگرے بار بار کوئی کام کرنا) اور یہاں تشدید اولیٰ ہے، کیونکہ یہ کثیر پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور الجمل ابل (اونٹ) میں سے ہے۔ فراء نے کہا ہے: جمل زوج الناقة (1) (نر اونٹ کو کہتے ہیں)۔

اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا (2) جب ان سے اونٹ (جمل) کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ زوج الناقه ہے۔ گویا جس نے آپ سے اس کے بارے پوچھا اس نے ایسی چیز سے جہالت اور ناواقفی کا اظہار کیا جسے تمام لوگ جانتے ہیں۔ اور اس کی جمع جمال، اجمال، جمالات اور جمائل ہے۔ اور اسے جمل کا نام دیا جاتا ہے جب کہ یہ چوپایہ ہے۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: حتی یلج الجملُ الأصفر فی سم الخیاط اسے ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے، سند اس طرح ہے حدثنا ابی حدثنا نصر بن داؤد حدثنا ابوعبید حدثنا حجاج عن ابن جریج عن ابن کثیر عن مجاهد قال فی قرأة عبد الله ...... اور آگے ذکر کیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الجُمَّل جیم کو ضمہ کے ساتھ اور میم کو فتحہ اور شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد کشتی کی وہ رسی ہے جسے قلس کہا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ رسیاں ہیں جو اکٹھی ہوں، یہ جملة کی جمع ہے، یہ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ موٹی رسی ہے (3) جو قنب کی چھال سے بنائی گئی ہو۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ رسی جس کے ساتھ کھجور کے درخت پر چڑھا جاتا ہے وہ مراد ہے۔

اور ان سے بھی اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے: الجُمَل جیم کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ اور اس کا معنی بھی کشتی کی موٹی رسی اور مطلق رسی ہے، جیسے ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور ان سے الجُمُل جیم اور میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ یہ جمل کی جمع ہے، جیسے أسد اور أُسُد ہے۔ اور الجُمْل مثلاً أسْدٌ اور اُسُد ہے۔ اور ابوالسمال سے الجَمْل جیم کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ یہ جمل کی تخفیف ہے۔

اور سَمِّ الْخِيَاطِ کا معنی سوئی کا سوراخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور بدن میں ہر باریک سوراخ سَما اور سِما کہلاتا ہے۔ اور اس کی جمع سموم ہے۔ اور السم القاتل (قتل کرنے والا زہر) کی جمع سمام آتی ہے۔ اور ابن سیرین نے فی سُم سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الخیاط وہ سوئی جس کے ساتھ کپڑا سیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خِیاط و مِخْیَط جیسے إزَار و مِئْزر اور قِنَاع و مِقْنَع اور مِهَاد، فراش (بچھونا) کو کہتے ہیں۔ اور غواش، غاشیة کی جمع ہے، یعنی وہ آگ جو انہیں ڈھانپ لے گی۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ یعنی ہم کافروں کو اسی طرح کا بدلہ دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ٘ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم تکلیف نہیں دیتے کسی کو مگر جتنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 211 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 104 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 214

اس کی طاقت ہے، وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ یہ کلام معترضہ ہے، یعنی والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات اُولٰئك اصحاب الجنة هم فيها خالدون (اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ کا معنی یہ ہے کہ اس نے کسی کو بیویوں کے نفقہ کا مکلف نہیں بنایا مگر صرف اتنی مقدار کا جسے وہ پالے اور اس پر قدرت رکھتا ہو، نہ کہ اتنی مقدار کا جس تک اس کا ہاتھ پہنچ ہی نہ سکے۔ اور اس سے، فعل سے پہلے استطاعت ثابت کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن الطیب نے کہا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا (الطلاق: 7) (اور تکلیف نہیں دیتا اللہ تعالیٰ کسی کو مگر اس قدر جتنا اسے دیا ہے)

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور ہم نکال لیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہے رواں ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے تھے اگر نہ ہدایت دیتا ہمیں اللہ تعالیٰ، بے شک آئے ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ۔ اور ان (خوش نصیبوں) کو آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے وارث بنائے گئے ہو تم جس کے بوجہ ان عملوں کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں ذکر فرمایا ہے جن کے ساتھ وہ اہل جنت پر انعام فرمائے گا (اور وہ) ان کے سینوں سے کینہ کو نکال دینا ہے۔ اور النزع کا معنی الاستخراج (نکالنا) ہے اور الغل کا معنی وہ کینہ ہے جو سینے میں مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع غلال ہے، یعنی ہم جنت میں اس کینہ وغیرہ کو ختم کر دیں گے جو دنیا میں ان کے دلوں میں مخفی تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے دروازے پر کینہ بٹھائے ہوئے اونٹ کی طرح ہوگا تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے دلوں سے نکالا ہوگا''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم ان میں سے ہوں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنت میں کینہ نکالنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے ساتھ ان کی قرابت اور درجات کی فضیلت کے سبب حسد نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ جنت کی شراب کے سبب ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ (الدہر) یعنی وہ شراب سینوں سے تکلیف دہ چیزوں کو نکال کر انہیں پاک کر دے گی۔ اس کا بیان سورۃ الانسان اور زمر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 401

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا اور وہ کہیں گے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں راہ دکھائی اس ثواب (اور ٹھکانے) کی، اس طرح کہ اس نے ہماری رہنمائی فرمائی اور ہمارے لیے ہدایت کو تخلیق فرمایا (یعنی ہدایت کو ہمارا مقدر بنا دیا۔ اور یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَ مَا كُنَّا ابن عامر کی قرأت بغیر واؤ کے ہے۔ اور باقیوں کی قراءت واؤ کے ساتھ ہے(1)۔ لِنَهْتَدِیَ اس میں لام کی ہے۔

لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یہ محل رفع میں ہے۔ وَ نُوْدُوْۤا یہ اصل میں نودیوا ہے۔ ان یہ محل نصب میں مخففہ عن المثقلہ، یعنی بأنہ تلکم الجنۃ اور کبھی تفسیر اسی شے کی ہوتی ہے جس کے ساتھ ندا دی گئی، کیونکہ ندا تو قول ہے، پس اس کا کوئی محل نہ ہوگا یعنی انہیں کہا جائے گا: تِلْكُمُ الْجَنَّةُ (یہی وہ حقیقت ہے) کیونکہ اس کے بارے دنیا میں ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا، یعنی انہیں کہا جائے گا: ھذہ تلکم الجنۃ التی وعدتم بھا یہ وہی جنت ہے جس کے بارے تم سے وعدہ کیا گیا تھا یا انہیں یہ دخول سے پہلے کہا جائے گا جس وقت وہ اسے دور سے دیکھیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تلکم بمعنی ھذہ ہے(2)۔ اور اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کا معنی ہے۔ تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے محلات کے وارث بنا دیئے گئے ہو اور تمہارا اس میں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ساتھ ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ (النساء:70) (یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا) اور مزید فرمایا: فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ (النساء:175) تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ولا أنا إلا أن یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ و فضل (3) (مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و فضل کے ساتھ ڈھانپ لے)

اور صحیح کے علاوہ کسی اور میں ہے: کوئی کافر اور کوئی مومن نہیں (4) مگر اس کے لیے جنت اور جہنم میں ایک ٹھکانا ہے۔ جب اہل جنت جنت میں اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو اہل جہنم کے لیے جنت بلند کی جائے گی اور وہ اس میں اپنے ٹھکانوں کی طرف دیکھ لیں گے اور انہیں کہا جائے گا: یہ تمہارے ٹھکانے تھے اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کا عمل کرتے، پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! تم ان کے وارث بن جاؤ ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو، پس ان کے محلات اہل جنت کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں ہے: ''کوئی مسلمان آدمی نہیں مرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ جہنم میں ایک یہودی یا عیسائی کو داخل کرتا ہے'' (5)۔ پس یہ بھی میراث ہے۔ وہ جسے چاہے اپنے فضل کے ساتھ انعام عطا فرمائے اور جسے چاہے اپنے عدل کے ساتھ عذاب میں ڈال دے۔ الختصر یہ کہ جنت اور اس کے محلات اس کی رحمت کے بغیر نہیں پائے جا سکتے، پس

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 154 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، صفۃ المنافقین واحکامھم، جلد 2، صفحہ 377
4۔ تفسیر المراغی، جلد 3، صفحہ 304 5۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، جلد 2، صفحہ 360

جب وہ اپنے اعمال کے سبب اس میں داخل ہوں گے تو تحقیق وہ اس کی رحمت کے ساتھ اس کے وارث بنیں گے اور اس کی رحمت کے ساتھ ہی اس میں داخل ہوں گے"۔ کیونکہ ان کے اعمال بھی ان کے لیے اس کی جانب سے رحمت اور ان پر اس کا فضل و احسان ہے۔ اور بغیر ادغام کے اُورِثتموھا پڑھا گیا ہے اور تا کو ثا میں ادغام کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾

"اور آواز دیں گے جنتی دوزخیوں کو بے شک ہم نے پالیا جو وعدہ فرمایا تھا ہمارے ساتھ ہمارے رب نے سچا تو کیا تم نے بھی پایا جو وعدہ کیا تھا تمہارے رب نے سچا، وہ کہیں گے: ہاں۔ تو پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان یہ کہ لعنت ہو اللہ کی ظالموں پر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہ سوال مزید اضطراب میں ڈالنے کے لیے اور عار دلانے کے لیے ہے۔ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مثلاً أن تلكم الجنة (کہ یہی وہ جنت ہے یعنی ہم نے تو اسے پالیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نفس ندا ہے۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ یعنی پھر ایک پکارنے اور آواز دینے والا آواز دے گا اور وہ ملائکہ میں سے ہوگا۔ بَیْنَهُمْ یہ ظرف ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أعلم وسطهم (میں ان کے وسط کو جانتا ہوں)۔ اعمش اور کسائی نے نَعِم عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس لغت پر عین کو سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: جس نے عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ نعم پڑھا ہے تو اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ نعم جو کہ حرف جواب ہے اور نعم جو کہ اونٹ، گائے اور بکری کا اسم ہے کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے۔ اور حضرت عمر سے جواب میں نعم بفتح العین کا انکار بھی مروی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ نعم کا استعمال قلیل ہے۔ اور نَعَم اور نَعِم یہ دونوں لغتیں ہیں بمعنی وعدہ کرنا اور تصدیق کرنا، پس وعدہ کا معنی تب پایا جاتا ہے جب تو موجب کے بارے میں سوال کرے مثلاً تیرا یہ قول: أيقوم زيد؟ (کیا زید کھڑا ہے؟) تو وہ جواب میں کہے: نعم (ہاں) اور تصدیق کا معنی پایا جاتا ہے جب تو کسی وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کے بارے خبر دے، تو کہے: قد كان كذا وكذا (واقعہ اس اس طرح ہوا، تو وہ کہے: نعم (ہاں) اور جب تو منفی کے بارے میں سوال کرے تو پھر جواب میں بلیٰ ہوگا، جیسے تیرا یہ قول ألم أكرمك (کیا میں نے تیری عزت و تکریم نہیں کی؟) تو وہ کہے گا بلیٰ (کیوں نہیں) پس نعم، اس سوال کے جواب کے لیے ہے جو ایجاب پر داخل ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے۔ اور بلیٰ۔ اس استفہام کے جواب کے لیے ہے جو نفی پر داخل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی (اعراف: 172)

بزی، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔ اور باقیوں نے أن کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظ اللعنة کو مبتدا ہونے کی بنا پر رفع دیا ہے پس ان دونوں قراءتوں کے مطابق حرف جر کو ساقط کرنے کی بنا پر محل نصب

میں ہے۔ اور مخففہ میں جائز ہوتا ہے کہ اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو اور وہ مفسرہ ہو جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اعمش سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ اِنْ لَعْنَةُ اللّٰهِ پڑھا ہے۔ اور یہ قول کو مضمر ماننے کی بنا پر ہے جیسے کوفیوں نے قراءت کی ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ (آل عمران: 39) اور روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت طاؤس ہشام بن عبدالملک کے پاس تشریف لے گئے اور اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور یوم الاذان (کی شدت) سے بچ۔ تو اس نے کہا: یوم الأذان کون سا دن ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یہ سن کر ہشام بیہوش ہو گیا، اس پر حضرت طاؤس نے کہا: یہ ذلت و رسوائی تو فقط بیان کی ہے تو مشاہدہ اور معاینہ کی ذلت کیسی ہوگی۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝

"جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور چاہتے ہیں اسے کہ ٹیڑھا ہو جائے اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اس سے پہلے ھم یا اعنی مضمر ماننے کی بنا پر اس کا محل رفع اور نصب میں ہونا بھی جائز ہے، یعنی جو دنیا میں لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں۔ اور یہ الصد سے ماخوذ ہے جس کا معنی منع کرنا اور روکنا ہے یا جو ذاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے راستے سے اعراض کرتے ہیں۔ اور یہ الصدود سے ماخوذ ہے۔

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وہ اسے ٹیڑھا کرنے کی خواہش اور طلب رکھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں سو اس کے ساتھ ایمان نہیں لاتے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ، ای وکانوا بھا کافرین (اور وہ اس (آخرت) کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں) پس اسے کلام سے حذف کیا گیا ہے اور یہ کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝

"اور ان دونوں (جنت و دوزخ) کے درمیان پردہ ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو پہچانتے ہوں گے سب کو ان کی علامت سے اور وہ آواز دیں گے جنتیوں کو کہ سلامتی ہو تم پر (اور ابھی) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ یعنی جہنم اور جنت کے درمیان پردہ ہے، کیونکہ انہیں دو کا ذکر جاری ہے۔ حجاب کا معنی حاجز (رکاوٹ، پردہ) یعنی دیوار ہے اور یہ سور (دیوار) وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ (الحدید: 13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار)

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یعنی علی أعراف السور یعنی دیوار کی بلندیوں پر کچھ مرد ہوں گے۔ اور اسی سے عرف الفرس (گھوڑے کی گردن کے بال) اور عرف الدیك (مرغ کی کلغی) ہیں۔ عبداللہ بن ابی یزید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اعراف سے مراد بلند اور اونچی شے ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اعراف سے مراد دیوار ہے جس کی بلندی مرغ کی کلغی کی طرح ہوگی۔ اور لغت میں اعراف بلند جگہ کو کہتے ہیں اور یہ عرف کی جمع ہے۔ یحییٰ بن آدم نے کہا ہے: میں نے کسائی سے اعراف کی واحد کے بارے پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ تو میں نے کہا: ہمیں اسرائیل نے جابر سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الأعراف سور له عرف كعرف الديك(1) تب انہوں نے کہا: ہاں قسم بخدا! اس کی واحد یہی ہے اور جمع اعراف ہے، اے لڑکے کاغذ لاؤ، پھر آپ نے اسے لکھ لیا اور یہ کلام محل مدح میں بیان ہوا ہے، جیسے اس بارے میں فرمایا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37) (وہ (جوان) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید وفروخت یاد الٰہی سے)۔ اور اصحاب اعراف کے بارے میں علماء کے دس اقوال ہیں:

پس حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، حضرت شعبی، حضرت ضحاک اور حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ وہ جماعت ہے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر اور مساوی ہوں گی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور مسند خیثمہ بن سلیمان کے پندرھویں جز کے آخر میں ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا اور نیکیوں اور بدیوں کا وزن کیا جائے گا اور جس کی نیکیاں بدیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھی بھاری ہو جائیں گی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کے گناہ اس کی نیکیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھاری ہو جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا"۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہو گئیں؟ (وہ کہاں ہوگا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اصحاب اعراف ہیں وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور اس میں داخل ہونے کے خواہشمند ہوں گے"(2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اصحاب اعراف سے مراد صالحین فقہاء وعلماء کی جماعت ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہداء ہیں۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: اور یہ بھی قول ہے کہ مومنین میں سے فضلاء اور شہداء ہیں، جو اپنی ذاتوں میں مشغول ہونے سے فارغ ہوئے اور لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جب وہ اصحاب نار کو دیکھیں گے تو وہ جہنم کی طرف لوٹائے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور معلوم کا خلاف بھی مقدور ہوتا ہے اور جب وہ اہل جنت کو دیکھیں گے اور وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے اس کے بعد وہ اپنے لیے اس میں داخل ہونے کے امیدوار ہوں گے۔ اور شرحبیل ابن سعد نے کہا ہے: اصحاب اعراف سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ شہید ہونے والے لوگ ہیں جو اپنے آباء کی نافرمانی کرتے ہوئے نکلے تھے۔

طبرانی نے اس بارے میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ان کی نافرمانی اور ان کی شہادت کو برابر قرار دیا جائے گا۔ اور ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ وَعَلَى

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 244　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404　　3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 228

الْاَعْرَافِ رِجَالٌ کے بارے میں ذکر کیا ہے فرمایا: اعراف پل صراط پر بلند جگہ ہے، یہی نظریہ حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت جعفر ذوالجناحین رضی اللہ عنہم کا ہے، وہ اپنے محبت کرنے والوں کو چہروں کی سفیدی اور نور سے اور بغض رکھنے والوں کو چہروں کی سیاہی سے پہچان لیں گے۔ اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ قیامت کے دن وہ عدل کرنے والے لوگ ہیں جو لوگوں پر ان کے اعمال کے بارے شہادت دیں گے اور یہ ہر امت میں ہوں گے۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: جو کچھ اس بارے میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے اور یہ اس دیوار پر ہوں گے جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ گروہ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ قوم ہے جن کے صغیرہ گناہ تھے وہ ان سے دنیا میں مصائب و آلام کے ساتھ ختم نہیں ہوئے اور انہوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا پس انہیں جنت سے روک دیا جائے گا تا کہ اس کے سبب انہیں غم اور اضطراب لاحق ہو اور یہ ان کے صغیرہ گناہوں کے مقابلہ میں ہو جائے گا۔ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ اصحاب اعراف میں ہوں گے، کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ وہ گنہگار لوگ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد زنا سے پیدا ہونے والے لوگ ہیں۔ اسے قشیری (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصحاب اعراف سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو اس دیوار کے ساتھ مقرر ہوں گے، وہ کافروں کو مومنین سے انہیں جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے الگ کریں گے۔ اسے ابومجلز نے ذکر کیا ہے۔ تو ان کو کہا گیا: ملائکہ کو رجال نہیں کہا جاتا؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ مذکر ہیں مؤنث نہیں ہیں، لہٰذا ان پر لفظ رجال کا اطلاق کرنا بعید نہیں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اس کا اطلاق جنوں پر کیا گیا ہے: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی)

پس یہ ملائکہ مومنین کو ان کی علامات سے اور کفار کو ان کی علامات سے پہچان لیں گے۔ اور وہ مومنین کو ان کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے بشارت دیں گے درآنحالیکہ وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے لیکن وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے۔ اور جب وہ اہل جہنم کو دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کے لیے عذاب سے سلامتی کی دعا کریں گے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اعراف پر اہل جنت میں سے وہ لوگ ہوں گے جن کا جنت میں داخل ہونا مؤخر ہوگا اور ان کے لیے وہ وصف واقع ہو سکتا ہے جس کا اعتبار دونوں فریقوں میں کیا گیا ہے۔ اور يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ یعنی وہ سب کو ان کی علامات سے پہچانتے ہوں گے اور وہ اہل جنت میں چہروں کی سفیدی اور ان کا حسن ہے اور اہل جہنم میں چہروں کی سیاہی اور ان کا قبح ہے، علاوہ ازیں پہچان کے لیے ان کا اپنا محل ہوگا اور ان کا اپنا محل اور مکان ہوگا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تعیین کرنے سے توقف کیا گیا ہے، کیونکہ اثر اور تفصیل میں اضطراب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 157

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404

پھر یہ کہا گیا ہے کہ اعراف عرف کی جمع ہے اور اس سے مراد ہر بلند اور اونچا مقام ہے، کیونکہ وہ اپنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے پست جگہ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور اعرف ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اعراف سے مراد پل صراط کی بلندیاں ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبل احد ہے اسے وہاں رکھا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور زہراوی نے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں قیامت کے دن جنت اور دوزخ کے درمیان اس کی تمثیل بنائی جائے گی اس پر کچھ قوموں کو روک لیا جائے گا ان تمام کو ان کی علامات سے پہچان لیا جائے گا اور وہ ان شاء اللہ تعالیٰ اہل جنت میں سے ہوں گے''۔ اور دوسری حدیث حضرت صفوان بن سلیم سے ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد جنت کے ارکان میں سے ایک رکن پر ہے'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمر نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں بلاشبہ وہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے'' (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ یعنی اصحاب اعراف اصحاب جنت کو آواز دیں گے۔ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ یعنی وہ انہیں کہیں گے: تم پر سلام ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم سزا سے سلامت ہو۔ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ یعنی اصحاب اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے، یعنی ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے۔ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور لغت میں طمع بمعنی علم معروف ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے کہ مراد اصحاب اعراف ہی ہیں۔

اور ابو مجلز نے کہا ہے: وہ اہل جنت ہیں (3)، انہیں اصحاب اعراف کہیں گے: تم پر سلام ہو اور ابھی تک اہل جنت جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ ان مومنین کے لیے جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے جو اصحاب اعراف کے پاس سے گزریں گے۔ اور وقف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر ہے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ اور اس قول پر لَمْ یَدْخُلُوْهَا پھر ابتداوَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ سے ہوئی ہے۔ اس معنی پر کہ وهم یطمعون فی دخولها اور وہ جنت میں داخل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ حال ہو اور معنی یہ ہو: اصحاب اعراف کے پاس سے گزرنے والے مومنین جنت میں داخل نہیں ہوئے، حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں اور بلاشبہ وہ اس میں داخل ہوئے ہیں اس میں داخلے کی خواہش رکھے بغیر۔ تو اس طرح لَمْ یَدْخُلُوْهَا پر وقف نہیں کیا جائے گا۔

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 232
3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 233

''اور جب پھیری جائیں گی ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف (تو) کہیں گے: اے ہمارے رب! نہ کر تو ہمیں ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ اور جب ان کی نگاہیں اس جہت پھیری جائیں گی جس میں سامنے اہل جہنم ہوں گے۔ دو لفظوں کے بغیر تفعال کے وزن پر کوئی مصدر نہیں آیا اور وہ دو تلقاء اور تبیان ہیں اور باقی تمام فتحہ کے ساتھ آتے ہیں، مثلاً تسیار، تھمام اور تذکار۔ اور رہا اسم تو وہ اس میں کسرہ کے ساتھ کثیر آتا ہے، مثلاً تقصار اور تمثال۔ قَالُوْا یعنی اصحاب اعراف کہیں گے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ یعنی وہ الله تعالیٰ سے التجا کریں گے کہ وہ ان کے ساتھ (ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ) نہ کردے، حالانکہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ انہیں ان کے ساتھ نہیں کرے گا۔ تو یہ علی سبیل التذلل اور عجز کی بنا پر ہے، جیسے اہل جنت کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (التحریم: 8) (اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور مکمل فرما) اور کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یہ الله تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بنا پر کہیں گے اور ان کے لیے اس میں لذت ہوگی۔

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝

''اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی علامتوں سے (انہیں) کہیں گے نہ فائدہ پہنچایا تمہیں تمہارے جتھے نے اور (نہ اس ساز و سامان نے) جس کی وجہ سے تم غرور کیا کرتے تھے۔ (اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انہیں الله اپنی رحمت سے۔ (دیکھو! انہیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ یعنی اعراف والے اہل نار میں سے ان لوگوں کو کہیں گے جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے۔ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ وہ انہیں کہیں گے: تمہیں دنیا کے لیے جمع کیے گئے مال نے اور ایمان سے تمہارے غرور اور تکبر کرنے نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ یہ اشارہ مومنین فقراء کے گروہ کی طرف ہے، جیسے حضرت بلال، حضرت سلمان اور حضرت خباب وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اَقْسَمْتُمْ کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں قسمیں اٹھایا کرتے تھے؟ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ کہ آخرت میں الله تعالیٰ انہیں عطا نہیں فرمائے گا۔ بِرَحْمَةٍ اپنی رحمت میں سے۔ اس کے ساتھ وہ انہیں جھڑکیں گے۔ اور وہ ان کے غم اور حسرت میں یہ کہہ کر اضافہ کریں گے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (کہ انہیں حکم مل چکا ہے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور عکرمہ نے دخلوا الجنة قراءت کی ہے یعنی الف کے بغیر اور دال مفتوح کے ساتھ۔ (وہ جنت میں داخل ہو چکے ہیں) اور طلحہ بن مصرف نے خاء کے

کسرہ کے ساتھ اُدْخِلُوا الْجَنَّةَ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے (یعنی وہ جنت میں داخل کر دیئے گئے ہیں)
اور یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اصحاب اعراف ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام ہیں، کیونکہ ان کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہے۔ اور جنہوں نے اصحاب اعراف گنہگاروں کو بنایا ہے تو اصحاب نار کے لیے ان کے قول کا آخر وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ہے۔ اور اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ آخر آیت تک اہل جہنم کو اس پر زجر و توبیخ کے لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور پہلا حسن سے مروی ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان ملائکہ کے کلام میں سے ہے جو اصحاب اعراف کے ساتھ مقرر ہوں گے، کیونکہ اہل جہنم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اصحاب اعراف ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے تو ملائکہ اصحاب اعراف کو کہیں گے: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور آواز دیں گے دوزخی جنتیوں کو کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی یا جو کچھ دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے جنتی کہیں گے کہ اللہ نے حرام کر دی ہیں یہ دونوں چیزیں کافروں پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَنَادٰٓى کہا گیا ہے: جب اہل اعراف جنت تک پہنچ جائیں گے تو اہل جہنم خواہش کریں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک جنت میں ہمارے رشتہ دار اور قرابت دار ہیں پس ہمیں اجازت عطا فرمائی جائے کہ ہم انہیں دیکھیں اور ان سے بات کریں۔ اور اہل جنت ان کے چہرے سیاہ ہونے کی وجہ سے انہیں نہ پہچان سکیں گے، تو وہ (اہل جہنم) انہیں کہیں گے: اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے) تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ عذاب میں ہو۔ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تو اہل جنت کہیں گے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کا طعام و شراب دونوں کافروں پر حرام کر دیئے ہیں۔ الافاضۃ کا معنی التوسعۃ (وسعت دینا، کشادگی پیدا کرنا) کہا جاتا ہے: أفاض علیہ نعمہ (اس نے اس پر اپنی نعمتیں انڈیل دیں یعنی ان میں توسیع کر دی)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر بھی دلیل ہے کہ کسی کو پانی پلانا افضل ترین اعمال میں سے ہے۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: پانی، کیا تم اہل جہنم کی طرف دیکھتے نہیں کہ جس وقت وہ اہل جنت سے مدد طلب کریں گے تو وہ یہ کہیں گے: اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ ہم پر پانی انڈیلو یا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے)

اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: آپ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ صدقہ کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی۔ اور ایک روایت میں ہے: پس انہوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا: ھذہ لأم سعد (1) (یہ کنواں سعد کی ماں کے نام ہے)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم أن أم سعد کانت تحب الصدقۃ، أفینفعھا أن أتصدق عنھا؟ قال: نعم وعلیك بالماء (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک سعد کی ماں صدقہ پسند کرتی تھی کیا میرا اس کی طرف سے صدقہ دینا اسے نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور تجھ پر پانی صدقہ کرنا لازم ہے)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کی طرف سے (لوگوں کو) پانی پلائے۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی پلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ترین سبب قربت ہے۔ اور بعض تابعین نے کہا ہے: من کثرت ذنوبہ فعلیہ بسقی الماء (جس کے گناہ زیادہ ہو جائیں تو اس پر (لوگوں کو) پانی پلانا واجب ہے) اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادی جس نے کتے کو پانی پلایا، تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوگی جس نے ایک مومن موحد انسان کو پانی پلایا اور اسے زندگی بخش دی؟۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے(2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم میں سے ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا کہ اسے شدید پیاس نے آلیا چنانچہ وہ کنویں میں اترا اور اس سے پانی پی لیا پھر جب وہ باہر نکلا تو اچانک ایک کتے کو پیاس کی وجہ سے مٹی چاٹتے ہوئے دیکھا تو اس نے (دل میں) کہا اس کتے کو اسی طرح پیاس کے سبب (تکلیف) ہے جیسے مجھے پہنچی ہے چنانچہ اس نے اپنا خف (موزہ) پانی سے بھرا، اسے اپنے منہ (کے دانتوں) سے پکڑا، پھر اوپر چڑھا اور اس کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر افزائی فرمائی اور اس کی مغفرت فرما دی''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم (کیا) ہمارے لیے چوپایوں میں بھی اجر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر تر (زندہ) جگر رکھنے والی شے میں اجر ہے''(3)۔ اور اس کے برعکس وہ روایت ہے جسے مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک عورت (4) کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا اس نے اسے قید کر رکھا تھا یہاں تک کہ وہ مرگئی پس اس میں آگ داخل ہوگئی نہ اس نے اسے کچھ کھلایا اور نہ اسے پانی پلایا، کیونکہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ ہی اس نے اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی''۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کو ایک بار ایسی جگہ پانی پلایا جہاں پانی پایا جاتا ہو تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کر دیا (یعنی اسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب دیا جائے گا) اور جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ ایک بار پانی پلایا جہاں پانی نہ پایا جاتا ہو تو گویا اس نے اسے زندہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 236۔ ایضاً، حدیث 1431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، قتل الحیاۃ وغیرھا، جلد 2، صفحہ 237

3۔ صحیح بخاری، المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 333

4۔ صحیح مسلم، قتل الحیاۃ وغیرھا، جلد 2، صفحہ 236

کر دیا'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک حوض اور مشکیزے کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کے لیے اسے روکنا جائز ہے جو اس سے پانی لینا چاہے، کیونکہ اہل جنت کے اس قول: اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کا معنی ہے کہ تمہارے لیے اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک باب ذکر کیا ہے: باب من رأى أن صاحب الحوض والقربة أحق بمائه (یہ باب اس کے بیان میں ہے جس کی رائے ہے کہ حوض اور مشکیزے کا مالک اپنے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے) اور انہوں نے اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کچھ لوگوں کو اپنے حوض سے اس طرح دھتکار دوں گا جیسے اجنبی اونٹ کو حوض سے بھگا دیا جاتا ہے'' (2)۔ مہلب نے کہا ہے: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حوض کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: لأذودن رجالا عن حوضي (3)۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿51﴾

''جنہوں نے بنا لیا تھا اپنے دین کو کھیل اور تماشا اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا انہیں دنیا کی زندگی سو آج ہم فراموش کر دیں گے انہیں جیسے بھلا دیا تھا انہوں نے اس دن کی ملاقات کو اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے''۔

اس میں الَّذِيْنَ کافرین کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اضمار کے سبب محل رفع اور محل نصب میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اہل جنت کے قول میں سے ہے: فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ یعنی آج ہم انہیں جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا یعنی جیسے انہوں نے (اس دن کی ملاقات کے مطابق) عمل ترک کر دیا تھا اور اسے جھٹلا دیا تھا۔ اور اس میں ما مصدر یہ ہے یعنی ان کے بھلا دینے کی طرح۔ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ یہ اس پر معطوف ہے، یعنی وجحدهم ان کے ہماری آیتوں کا انکار کرنے کی طرح (آج ہم بھی انہیں فراموش کر دیں گے)

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾

''اور بے شک لے آئے ہم ان کے پاس ایک کتاب جسے ہم نے واضح کر دیا ہے (اپنے) علم (کامل) سے درآنحالیکہ وہ ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ اس میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ فَصَّلْنٰهُ ہم نے اسے واضح کر دیا ہے یہاں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الرہون، جلد 1، صفحہ 180
2۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318
3۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318

تک کہ جس نے اس میں تدبر اور غور و فکر کیا اس نے اسے پہچان لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَصَّلْنٰهُ کا معنی ہے ہم نے اسے متفرق طور پر نازل کیا۔ عَلٰی عِلْمٍ اپنی طرف سے علم کامل کے ساتھ، لہٰذا اس میں کوئی سہو اور غلطی واقع نہیں ہوئی۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً زجاج نے کہا ہے: یعنی هادياً و ذا رحمة (1) (درآنحالیکہ وہ ہدایت دینے والی اور سراپا رحمت ہے) انہوں نے اسے فَصَّلْنٰهُ کی ہا ضمیر سے حال بنایا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: هدىً و رحمةٌ پڑھنا بھی جائز ہے، بمعنی هو هدى و رحمة۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتاب سے بدل بناتے ہوئے جر کے ساتھ هدى و رحمةٍ پڑھنا بھی جائز ہے۔ امام کسائی اور فراء نے کہا ہے: کتاب کی صفت ہونے کی بنا پر هدى و رحمةٍ جر کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (الانعام: 155) کی مثل ہے۔ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ مومنین کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

''کافر کس چیز کے منتظر ہیں؟ یہ کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جس روز ظاہر ہوگا اس کا انجام تو کہیں گے جو بھلائے ہوئے تھے اسے اس سے پہلے کہ بے شک لائے تھے ہمارے رب کے رسول حق (پیغام) تو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں تو وہ سفارش کریں ہمارے لیے یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے تا کہ ہم عمل کریں اس کے برعکس جو ہم کیا کرتے تھے۔ بے شک انہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گیا ان سے جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ یہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور آل سے ماخوذ ہے اور اہل مدینہ ہمزے کی تخفیف کرتے ہیں۔ اور النظر کا معنی ہے انتظار کرنا، یعنی کیا وہ انتظار نہیں کر رہے مگر عقاب و حساب میں سے اس کے بارے جس کا قرآن کریم میں ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ يَنْظُرُوْنَ، النظر الى يوم القيامه (یوم قیامت کی طرف دیکھنے) سے ماخوذ ہے۔ اور تَاْوِيْلَهٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور عاقبة الكتاب (کتاب کا انجام) وہ بعث و حساب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی جزاؤه ہے یعنی ان کا کتاب کو جھٹلانے کا انجام اور جزا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی ہے عاقبت یعنی اس کا انجام، یہ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی قیامت کے دن اس کا انجام ظاہر ہوگا۔ اور یوم یقول کے سبب منصوب ہے، یعنی يقول الذين نسوه من قبل يوم ياتي تاويله۔ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ اس میں استفہام، تمنی اور آرزو

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 480

کے معنی میں ہے۔ فَيَشْفَعُوْا یہ جواب استفہام ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أوهل نرد(1) (یا کیا ہم لوٹا دیئے جائیں گے) فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ زجاج نے کہا ہے: نرد کا عطف معنی پر کیا گیا ہے، یعنی هل يشفع لنا أحد أونرد (کیا کوئی ہماری سفارش کرے گا یا ہم واپس لوٹائے جائیں گے) اور ابن اسحاق نے أونردَ فنعمل دونوں میں نصب پڑھی ہے اور معنی ہے إلا أن نرد (ورنہ ہمیں واپس لوٹا دیا جائے) جیسے کسی نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تَبْكِ عينُك إنما　　نحاول مُلْكًا أو نموتَ فنُعْذَرَا

(اس میں أو نموت، إلا أن نموت کے معنی میں ہے)

اور حسن نے أونردُ فنعملُ دونوں کو مرفوع پڑھا ہے۔ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یعنی انہوں نے اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا، اور ہر وہ جو اپنے آپ کو نفع نہ پہنچائے تحقیق انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے نعمتوں کو اور اپنے لطف و راحت کو نقصان پہنچایا۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی وہ باطل ہو گیا جو وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۫ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ڈھانکتا ہے رات سے دن کو درآنحالیکہ طلب کرتا ہے دن رات کو تیزی سے اور (پیدا فرمایا) سورج اور چاند اور ستاروں کو وہ سب پابند ہیں اس کے حکم کے، سن لو! اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔ بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ قدرت ایجاد میں منفرد اور یکتا ہے، پس وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

سِتَّةِ کی اصل سدسة ہے، پس انہوں نے دال کو سین میں ادغام کرنے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں تا کے مخرج کے قریب مل گئے لہٰذا تا ان دونوں پر غالب آ گئی۔ اور اگر چاہے تو کہے: دو سینوں میں سے ایک کو تا سے بدل دیا جائے اور پھر اسے دال میں ادغام کر دیا جائے، کیونکہ تو اس کی تصغیر میں کہتا ہے: سديسة اور اس کی جمع أسداس آتی ہے اور جمع اور تصغیر دونوں اسماء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: جاء فلان سادسا وسادتا وساتا پس جس نے ساد تا کہا ہے اس نے سین کو تاء سے بدل دیا ہے۔ اور الیوم سے مراد سورج کے طلوع ہونے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک ہے۔ پس اگر سورج نہ ہو تو پھر یوم بھی نہ ہو۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 240

اورفرمایا: فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ کا معنی ہے آخرت کے ایام میں سے چھ دنوں میں، ان میں سے ہر دن ہزار برس کا ہوگا۔ اور یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی تعظیم بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چھ دن ایام دنیا میں سے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ (1) نے کہا ہے: ان میں سے پہلا دن اتوار کا دن تھا اور آخر جمعہ کا دن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مدت ذکر فرمائی ہے اگر وہ ایک لحظہ میں ان کی تخلیق کرنا چاہتا تو یقیناً ایسا کر دیتا۔ کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے کہتا: کون (تو ہوجا) تو وہ ہوجاتا۔ لیکن اس نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ بندوں کو امور میں نرمی اور تثبت کی تعلیم دے اور تاکہ ملائکہ کے لیے یکے بعد دیگرے اس کی قدرت کا اظہار ہو۔

اور یہ ان کے نزدیک ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔ اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اس نے انہیں چھ دنوں میں پیدا فرمایا، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کی ایک مدت مقرر ہے۔ اور اس نے اس کے ذریعے گنہگاروں کو سزا دینے میں جلدی کرنے کو بھی بیان کیا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۞ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں، پس آپ صبر فرمائیے ان (کی دل دکھانے والی) باتوں پر)

اس کے بعد فرمایا: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا (ق:36) (اور قریش مکہ سے پہلے ہم نے برباد کر دیا بہت سی قوموں کو جو شوکت وقوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں)

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یہ استواء کا مسئلہ ہے، اس بارے میں علماء کا بہت سا کلام اور جرأت کا اظہار ہے۔ ہم نے اس بارے میں علماء کے اقوال الکتاب الأسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی و صفاتہ العلی میں بیان کر دیئے ہیں اور وہاں ہم نے چودہ اقوال ذکر کیے ہیں۔ اکثر متقدمین اور متاخرین کی جانب سے یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جہت اور تحیز سے منزہ اور پاک ہے تو پھر اس کی ضرورت اور اس کے لواحق لازم میں سے یہ بھی ہے کہ عام علماء متقدمین کے نزدیک اور متاخرین میں سے محققین اور قائدین کے نزدیک اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات جہت سے پاک اور منزہ ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے اوپر کوئی جہت نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اسے جہت کے ساتھ خاص کر دیا جائے تو پھر وہ کسی مکان اور حیز میں ہو اور مکان اور حیز تسلیم کرنے پر متحیز کے لیے حرکت، سکون، تغیر اور حدوث ماننا لازم آتا ہے (اور رب کریم کی ذات ان تمام سے مبرا اور منزہ ہے)

یہ متکلمین کا قول ہے اور دور اول کے اسلاف رضی اللہ عنہم جہت کی نفی کے بارے کوئی کلام نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے بارے وہ بولتے تھے، بلکہ انہوں نے یہی بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے اثبات میں وہی کافی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرما دیا ہے اور اس کے رسولوں نے خبر دی ہے اور سلف صالح میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے کہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 408

اپنے عرش پر حقیقتاً متمکن ہوا ہے اور اس نے عرش کو اس لیے خاص کیا ہے، کیونکہ وہ اس کی مخلوقات میں سے بہت عظیم ہے، لیکن وہ اس استوا اور تمکن کی کیفیت سے ناواقف ہیں، کیونکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: لغت میں استوا معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے، لہٰذا اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے۔ اور اتنی مقدار کافی ہے اور جو اس سے زیادہ کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ علماء کی کتب سے اس مقام کا مطالعہ کرے۔ اور کلام عرب میں استوا کا معنی بلندی اور استقرار ہے۔ جوہری نے کہا ہے: إستوی من إعوجاج (وہ ٹیڑھا ہونے سے بچ گیا، سیدھا ہوگیا) إستوی علی ظهر دابته (وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھ گیا) إستوی إلی السماء اس نے آسمان کا قصد کیا۔ اور إستوی بمعنی إستولی و ظهر (والی بننا اور غالب آنا) ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا:

قد إستوی بشرٌ علی العراق من غیر سیف ودمٍ مهراق(1)

تحقیق بشر نے عراق پر قبضہ جمالیا تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر۔

اور إستوی الرجل کا معنی ہے آدمی کی جوانی انتہا کو پہنچ گئی۔ إستوی الشئ کا معنی ہے شے معتدل اور سیدھی ہوگئی۔ ابوعمر بن عبد البر نے ابوعبیدہ سے قول باری تعالیٰ: اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ۝ (طٰہٰ) کے بارے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عرش پر بلند ہوا۔ اور شاعر نے کہا ہے:

فأوردتهم ماء بفَیۡفَاء قفرَةٍ وقد حَلَّق النجمُ الیمانِ فاستوَی

اس میں استوی بلند ہونے کے معنی میں ہے بمعنی علاؤ ارتفع۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اللہ تعالیٰ کی بلندی اور ارتفاع اس کی عظمت و بزرگی، اس کی صفات اور بادشاہی کی بلندی اور رفعت سے عبارت ہے، یعنی اس سے اوپر کوئی نہیں ہے جس کے لیے عظمت و جلال کے ان معانی میں سے کوئی ایک ثابت ہو اور نہ ہی کوئی اور اس کے ساتھ ہے کہ اس کے اور اس کے مابین یہ رفعت و بلندی مشترک ہو، بلکہ یہ عظمت و رفعت اور بلندی بالاطلاق اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذات کے لیے ہے (اور کوئی دوسرا کسی اعتبار سے اس کے ساتھ شریک نہیں ہے)۔

قولہ تعالیٰ: عَلَی الۡعَرۡشِ یہ لفظ مشترک ہے ایک سے زیادہ معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ علامہ جوہری وغیرہ نے کہا ہے: عرش کا معنی سریر الملك (بادشاہ کا تخت) ہے قرآن کریم میں ہے نَكِّرُوۡا لَهَا عَرۡشَهَا (النمل: 41) (شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی) وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ (یوسف: 100) (اور جب شاہی دربار میں پہنچے تو آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر) اور عرش کا معنی سقف البیت (مکان کی چھت) ہے۔ اور عرش القدم کا معنی ہے قدم کی پشت کا بلند حصہ اور اس میں انگلیاں بھی ہیں۔ عرش السماك: چار چھوٹے ستاروں جو عواء (چاند کی منازل میں سے ایک منزل ہے) کے نیچے ہیں، کہا جاتا ہے: إنها عجز الأسد (بے شک وہ اسد کی دم ہے) اور عرش البئر کا معنی ہے کنویں کو لکڑی کے ساتھ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 229

بنانا، اس کے بعد کہ اسے نیچے قد آدم کی مقدار پتھر سے بنالیا جائے تو وہ لکڑی جس سے اوپر کا حصہ بنایا جاتا ہے وہ عرش کہلاتی ہے، اس کی جمع عروش آتی ہے اور عرش مکہ مکرمہ کا نام بھی ہے اور عرش کا معنی ملک اور سلطنت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: ثُلّ عرش فلان جب اس کا ملک، سلطنت اور اس کی عزت جاتی رہے (چھن جائے)۔

زہیر نے کہا:

تداركتما عَبْسًا وقد ثُلَّ عَرْشُها وذُبْيَانُ إذ ذَلَّتْ بأقدامها النَّعْلُ

اور کبھی آیت میں عرش کی تاویل ملک کے معنی سے کی جاتی ہے، یعنی کوئی بادشاہی اور ملک مستحکم اور مضبوط نہیں مگر وہ جو اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعز اسمہ کی ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے اور اس میں بھی نظر ہے۔ ہم نے اس کے بارے جملہ اقوال اپنی کتاب میں بیان کر دیئے ہیں۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ یعنی وہ اسے (رات کو) پردے کی طرح بنا دیتا ہے، یعنی دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے (چلی جاتی ہے) تاکہ رات کے آنے سے دنیا میں زندگی کو قائم رکھنا مکمل ہو جائے، پس رات آرام اور سکون کے لیے ہے اور دن کاروبار حیات کے لیے۔ اور اسے يُغَشِّي تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس کی مثل سورۂ رعد میں ہے۔ اور یہ ابو بکر کی عاصم، حمزہ اور کسائی سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے تخفیف کی ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں أغشى اور غشى اور تمام نے فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى کے تشدد ہونے پر اجماع کیا ہے۔ اور فَاَغْشَيْنٰهُمْ (یٰسین: 9) پر بھی تمام کا اجماع ہے پس یہ دونوں قرائتیں مساوی ہیں اور تشدید میں تکریر اور تکثیر کا معنی پایا جاتا ہے اور تغشية اور إغشاء کا معنی ہے: ایک شے کا دوسری شے کو ڈھانپ دینا، چھپا دینا اور اس آیت میں رات پر دن کے داخل ہونے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دو میں سے ایک پر اکتفا کیا گیا ہے، جیسے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) (ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے) اور بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران: 26) (تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی) میں ہے۔

اور حمید بن قیس نے يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے بے شک دن رات کو ڈھانپ لیتا ہے۔ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا یعنی وہ اسے ہمیشہ طلب کرتا ہے بغیر کسی فتور اور سکون کے۔ اور يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے: استوى على العرش مغشيا الليل النهار (وہ عرش پر اپنی شان کے مطابق متمکن ہوا درآنحالیکہ وہ رات سے دن کو ڈھانکتا ہے) اور اسی طرح يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا بھی اللیل سے حال ہے، یعنی يغشى الليل النهار طالباله (رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے اسے تیزی سے طلب کرتے ہوئے)

اور یہ احتمال بھی ہے کہ جملہ مستانفہ ہو حال نہ ہو اور حَثِيْثًا طالب المقدر سے بدل ہو یا اس کی صفت ہو یا مصدر محذوف کی صفت ہو، یعنی يطلبه طلبا سريعا اور الحث کا معنی ہوتا ہے: بہت جلدی کرنا اور تیزی کرنا۔ اور ولى حثيثا اى برعا (یعنی وہ تیزی سے واپس بھاگا)۔

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اخفش نے کہا ہے: اس کا عطف السموات پر ہے، یعنی وخلق الشمس (اور اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو تخلیق فرمایا وہ سب اس کے حکم کے پابند ہیں) اور حضرت عبداللہ بن عامر (1) سے ان تمام میں رفع مروی ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ اپنی خبر میں سچا ہے، پس اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا، اس نے انہیں تخلیق فرمایا ہے اور انہیں اس کے بارے حکم دیا جو پسند فرمایا۔ اور یہ امر نہی کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عیینہ (2) نے کہا ہے: اس نے خلق اور امر کے درمیان فرق کیا ہے، پس جس نے ان دونوں کو جمع کیا تو اس نے کفر کیا، پس خلق مخلوق ہے اور امر اس کا وہ کلام ہے جو غیر مخلوق ہے اور وہ اس کا یہ قول ہے: کن (ہو جا)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۝ (یٰسین) (اس کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے) اور خلق اور امر کے الگ الگ اور متفرق ہونے میں اس کے قول کے فاسد ہونے پر بین دلیل موجود ہے جس نے کہا ہے کہ قرآن مخلوق ہے، کیونکہ اگر اس کا وہ کلام جو امر ہے مخلوق ہو تو تحقیق اس نے پھر یہ کہا: الا له الخلق والخلق اور یہ کلام سے عاجز آنا، ناپسندیدہ اور ایسا کلام ہے جس میں مدد کی حاجت اور ضرورت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسی کلام کرنے سے بلند و برتر ہے جس میں کوئی فائدہ اور نفع نہیں۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (الروم: 25) (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے)

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ پس اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ خبر دی ہے کہ مخلوقات اسی کے حکم کے ساتھ قائم ہیں، پس اگر امر بھی مخلوق ہو تو وہ یقیناً ایک دوسرے امر کا محتاج ہوگا جس کے ساتھ وہ قائم ہوگا اور پھر وہ امر کا ایک مزید امر محتاج ہوگا یہاں تک کہ اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور یہ محال ہے، تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا وہ امر جو اس کا کلام ہے وہ قدیم ازلی اور غیر مخلوق ہے، تاکہ اس کے ساتھ مخلوقات کا قیام صحیح ہو سکے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ (الحجر: 85) (اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان دونوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی قول کے ساتھ اور وہ اس کا وہ قول ہے جو اس نے چیزوں کے موجود ہونے کے لیے فرمایا ہے یعنی کن (تو ہو جا) پس اگر حق بھی مخلوق ہو تو پھر یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کے ساتھ مخلوقات کو پیدا کرے، کیونکہ خلق مخلوق کے ساتھ تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اور اس پر یہ ارشادات دلالت کرتے ہیں: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ۝ (الصافات) (اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے)

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 482　2۔ ایضاً

اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ۝ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) وَ لٰكِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّیۡ (السجدہ:13) (لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے، یہ سب قدیم میں قول کے مقدم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وجود میں ازل کو ثابت کرتا ہے اور ان کے رد کے لیے یہی ایک نکتہ کافی ہے۔

اور ان کے لیے یہ آیات ہیں جن سے انہوں نے اپنے مذہب پر استدلال کیا ہے مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ الآیہ (الانبیاء:2) (نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے)

اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ۝ (الاحزاب) اور مفعولاً اور وہ آیات جو ان کی مثل ہیں (اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے)

قاضی ابوبکر نے کہا ہے: مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ (الانبیاء:2) کا معنی ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو وعظ و نصیحت اور جو وعدہ وتخفیف انہیں ہوتا ہے۔ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَ هُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۝ (الانبیاء) (مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں (مگن) ہوتے ہیں، کیونکہ رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی نصیحت اور ان کا ڈرانا بھی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَذَكِّرۡ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ۝ (الغاشیہ) (پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے) اور کہا جاتا ہے: فلان فی مجلس الذکر (فلاں وعظ ونصیحت کی مجلس میں ہے) اور وَ كَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ۝ (الاحزاب) اور مفعولاً کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کافروں کے لیے اپنی سزا اور انتظام کا اور مومنین کے لیے اپنی مدد ونصرت کا اور جو اس کے بارے فیصلہ فرمایا ہے اور اپنے افعال میں سے جو اس کے لیے مقرر فرمائے ہیں ان کا ارادہ کیا ہے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا (ہود:40) (یہاں تک کہ جب آ گیا اس کا حکم)

اور اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِیۡدٍ ۝ (ہود) (اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا) یعنی اس کے مطابق اس کی شان، اس کے افعال اور اس کا طریقہ کار ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها أمرها حتى إذا تبوأت بأخفافها مرعى تبوأ مضجعا

مسئلہ نمبر 2۔ اور جب یہ ثابت اور پختہ ہو گیا تو پھر یہ جان لو کہ امر کسی شے کے ارادہ میں سے نہیں ہے۔ اور معتزلہ کہتے ہیں: امر نفس ارادہ ہی ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ کبھی ایسی شے کے بارے حکم دیتا ہے جس کا وہ ارادہ نہیں فرماتا اور اس سے منع فرما دیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا لیکن اس کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کے ساتھ مل کر پچاس نمازیں پڑھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں پانچ سے زیادہ کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور کبھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ارادہ فرمایا کہ وہ فرماتا ہے: وَ یَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ (آل عمران:140) اور کافروں کو آپ کو قتل کرنے سے منع فرما دیا اور انہیں اس بارے حکم نہیں دیا۔ اس باب میں یہی صحیح اور نفس ہے، پس اس میں غور کر لو۔

قولہ تعالیٰ: تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ، تَبٰرَكَ باب تفاعل ہے۔ یہ برکت سے ماخوذ ہے (1) اور اس کا معنی کثرت اور وسعت ہے۔ کہا جاتا ہے: بورك الشئ اور بورك فيه (شے میں کثرت اور وسعت رکھ دی گئی) یہ ابن عرفہ نے کہا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: تَبٰرَكَ کا معنی ہے تعالیٰ و تعاظم وارتفع (اور وہ بلند و بالا اور عظمت وشان والا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کے نام سے یمن و برکت حاصل کی جاتی ہے۔ اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

''دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ، بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یہ دعا اور اس میں عجز و انکساری کرنے کے بارے امر ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ساتھ ایسی صفات کو ملا دیا ہے جو اس کے ساتھ حسین لگتی ہیں اور وہ خشوع اور عجز و انکساری کا اظہار کرنا ہے۔ اور خُفْيَةً کا معنی ہے وہ راز اور چھپی ہوئی بات جو دل میں ہوتا کہ وہ ریاکاری سے دور اور محفوظ رہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کی تعریف کی ہے جب ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) (جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے)

اور اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خير الذكر الخفي و خير الرزق ما يكفي (2) (بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو (حاجات کے لیے) کافی ہو)۔ اور یہ پختہ شرعی حکم ہے کہ نیکی کے اعمال میں وہ سر اور راز جس میں کوئی عیب اور نقص نہ ہو اجر کے اعتبار سے جہر سے اعظم اور افضل ہے۔ اور یہ معنی پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: تحقیق ہم نے کئی اقوام کو پایا ہے کہ وہ زمین پر عمل کرنے پر قدرت رکھتے تھے لیکن ان کا وہ عمل ہمیشہ جہراً ہوتا تھا۔ اور مسلمان دعا میں انتہائی کوشش اور عجز و انکساری کرتے ہیں اور ان کی آواز تک نہیں سنی جاتی، بلاشبہ دعا ان کے درمیان اور ان کے رب کے درمیان ایک سرگوشی ہوتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً۔ اور عبد صالح کا ذکر کیا ہے، اس کے عمل کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ آمین کو آہستہ (اور مخفی) کہنا اسے جہراً کہنے سے اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ یہ بھی ایک دعا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کے بارے بحث گزر چکی ہے۔

اور مسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ہم سفر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور ایک روایت ہے ایک غزوہ میں تھے۔ پس لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی جب بھی کسی گھاٹی پر بلند ہوتا تو کہتا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! اپنے نفسوں پر نرمی کرو بے شک تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ اسے جو غائب ہے، بلاشبہ تم اس سے دعا مانگ رہے ہو جو سننے والا ہے، قریب ہے اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 164　　2۔ مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 180

وہ تمہارے ساتھ ہے''(1)۔ الحدیث

مسئلہ نمبر 2۔ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان میں سے حضرت جبیر بن مطعم، سعید بن مسیب اور حضرت سعید بن جبیر ہیں۔ اور حضرت شریح نے ایک آدمی کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کون انہیں پکڑے گا؟ تیری ماں تو ہے نہیں! اور حضرت مسروق نے ایک قوم کو کہا جنہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے: اللہ انہیں توڑ دے۔ اور انہوں نے یہ پسند کیا کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کے بارے دعا مانگے تو اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ اور وہ کہتے: یہی اخلاص ہے۔ اور حضرت قتادہ اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے۔ اور حضرت عطا، طاؤس اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے ہاتھ اٹھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔ اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اور آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی (2)۔ اور اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے اور کہا: ''اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو خالد نے کیا ہے''(3)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا: جب غزوہ بدر کا دن تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا، وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے صحابہ کرام تین سو سترہ افراد تھے، تو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے منہ قبلہ شریف کی طرف کیا اور اپنے رب سے گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور امام ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے: **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفع یدیہ لم یحطھما حتی یمسح بھما وجھہ** (5) (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ بلند کرتے تو پھر آپ انہیں نیچے نہ کرتے یہاں تک کہ انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔) امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ أن یرفع یدیہ إلیہ فیردھما صفرا** (6) **(او قال) خائبتین** (بے شک تمہارا رب بڑا حیادار اور سخی ہے وہ اپنے بندے سے حیا محسوس کرتا ہے جو اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ بلند کرے اور وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے (یا فرمایا) وہ انہیں ناکام واپس کر دے)

پہلے گروہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے مسلم نے عمارہ بن رویبہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو منبر پر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا برا کرے۔ تحقیق میں نے رسول اللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ، جلد 2، صفحہ 364
2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 938
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 622
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 93
5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 174
6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 284

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ کے ساتھ اسی طرح زائد کہتے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی مسبحہ انگلی کے ساتھ اشارہ کیا(1)۔ اور جو روایت سعید بن ابی عروبہ نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوائے بارش کی دعا کے کسی شے کے بارے دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے اور آپ بارش کی دعا کے وقت انہیں اتنا بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی (2)۔ پہلی حدیث سعید بن ابی عروبہ کی حدیث سے سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور زیادہ ثابت ہے، کیونکہ آخری عمر میں حضرت سعید کی عقل مختل ہوگئی تھی۔ تحقیق حضرت شعبہ نے جو روایت قتادہ عن انس بن مالک سے بیان کی ہے اس میں انہوں نے سعید کی مخالفت کی ہے اور اس میں کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی (3)۔ اور تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: جب مسلمانوں پر کوئی آفت اور مصیبت نازل ہو تو اس وقت ہاتھ اٹھانا انتہائی جمیل اور حسین ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب بارش کے وقت اور غزوہ بدر کے دن کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دعا مانگنا اچھا ہے جس حالت میں آسان اور میسر ہو، محل فقر کے اظہار کے لیے، رب کریم کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے کے لیے اور اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے اظہار کے لیے انسان سے یہی مطلوب ہے، پس اگر چاہے تو وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور اپنے ہاتھ بلند کرے تو یہ بہت اچھا ہے اور اگر چاہے تو ایسا نہ کرے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اور اس سے ہاتھ اٹھانے وغیرہ کی صفت اور حالت کا ارادہ نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا: الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا (آل عمران: 191) (وہ عقلمند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے) پس اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف بیان فرمائی ہے اور مذکورہ حالت کے سوا کسی حالت کی شرط نہیں لگائی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن اپنے خطبہ میں دعا فرمائی در آنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک قبلہ سمت نہ تھا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ مراد یہ ہے کہ دعا میں حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اگرچہ لفظ عام ہیں۔ (اسی طرف یہ اشارہ ہے) اور معتدی وہ ہوتا ہے جو حد سے تجاوز کرنے والا ہو اور ممنوع کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ اور کبھی وہ اس شی کے اعتبار سے فضیلت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس میں وہ حد سے تجاوز کرتا ہے (4)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیکون قوم یعتدون فی الدعاء (5) (عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے) اسے ابن ماجہ نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 287
2۔ صحیح مسلم، صلوۃ الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 293
3۔ سنن نسائی، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 244
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410
5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283

عفان، حماد بن سلمہ اور سعید الجریری نے ابو نعامہ سے ہمیں خبر دی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سے قصر ابیض کی التجا کرتا ہوں جب میں اس میں داخل ہوں۔ تو انہوں نے فرمایا: اے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کر اور جہنم سے پناہ مانگ، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے'' (1)۔

اور دعا میں حد سے بڑھنا کئی اعتبار سے ہے: ان میں سے ایک ہے بہت زیادہ بلند آواز سے اور چیخ کر دعا مانگنا (2)، جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ انسان اس بارے میں دعا مانگے کہ اس کے لیے نبی کا مقام و مرتبہ ہو یا کسی محال شے کے بارے دعا مانگے اور اسی طرح کی مبالغہ آمیز دعائیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ معصیت وغیرہ کی خواہش رکھتے ہوئے دعا مانگے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسی شے کے بارے دعا مانگے جو کتاب و سنت میں نہیں ہے۔ پس وہ انتہائی نفرت آمیز الفاظ چنتا ہے اور مسجع کلمات اختیار کرتا ہے درآنحالیکہ وہ انہیں رسالوں میں پاتا ہے ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اور نہ ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، پس وہ انہیں اپنا شعار اور عادت بنالیتا ہے اور وہ ان الفاظ کو چھوڑ دیتا ہے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی۔ یہ سب چیزیں دعا کی قبولیت کے مانع ہوتی ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''اور نہ فساد پھیلاؤ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور دعا مانگو اس سے ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے، بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکو کاروں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس میں ایک مسئلہ ہے:

وہ یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اصلاح کے بعد چاہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہر فساد سے منع فرمایا ہے چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر۔ صحیح اقوال کے مطابق یہ حکم عام ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم چشمے دار پانی بند نہ کرو اور نقصان پہنچانے کے لیے پھل دار درخت نہ کاٹو۔ اور یہ بھی وارد ہے: زمین میں فساد سے دنانیر ختم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین میں فساد سے حکام کی تجارت منقطع ہو گئی۔ اور علامہ قشیری نے کہا ہے: اس سے مراد ہے اور تم شرک نہ کرو، پس یہ شرک، خون بہانے اور زمین میں ہرج اور فساد برپا کرنے سے نہی ہے اور زمین میں اصلاح کے بعد احکام شریعہ کو لازم پکڑنے کا حکم ہے، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے رسول بھیج کر اس کی اصلاح فرما دی ہے، (پس یہ) شرائع کو پختہ کرنا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وضاحت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس قول کے قائل نے عظیم اصلاح کے بعد بہت بڑے فساد کا قصد کیا ہے پس اس نے اسے خاص طور پر ذکر کیا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے تو وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، بلاشبہ وہ تب ہے جب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 411

اس میں ضرر اور نقصان مومن کا ہو۔ اور اگر اس کا ضرر اور نقصان مشرکین کو پہنچے تو پھر وہ جائز ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے کنویں کا پانی بند کیا اور آپ نے کافروں کے درخت کاٹ دیئے۔ قطع الدنانیر کے بارے میں بحث سورۂ ہود میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا یہ اس بارے امر ہے (1) کہ انسان انتظار، خوف اور اللہ تعالیٰ سے امید کی حالت میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ امید اور خوف انسان کے لیے پرندے کے دو پروں کی مثل ہوتے ہیں جو اسے صراط مستقیم میں اٹھائے رکھتے ہیں اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک منفرد ہو جائے تو انسان ہلاک ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾ (الحجر) (بتادو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں اور (یہ بھی بتادو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے امید بھی دلائی اور خوف بھی دلایا۔ پس انسان دعا مانگے اس کی سزا سے ڈرتے ہوئے اور اس کے ثواب کی حرص اور طمع رکھتے ہوئے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (الانبیاء: 90) (اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے) اس بارے میں گفتگو آگے آئے گی۔

خوف کا معنی ہے: الانزعاج لما لا یؤمن من المضار (اس شے کے لیے بے قرار اور بے چین ہونا جس کے ضرر اور نقصان سے وہ محفوظ نہ ہو) اور طمع کا معنی ہے: توقع المحبوب (کسی محبوب اور پسندیدہ شی کی توقع رکھنا) یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: مناسب یہ ہے کہ طویل زندگی میں خوف امید پر غالب رہے (2) اور جب موت آجائے تو پھر امید غالب رہے۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لا یموتن أحد کم إلا وھو یحسن الظن باللہ (3) (تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ اس میں قریبۃ نہیں کیا، سو اس میں سات وجوہ ہیں: ان میں سے پہلی یہ ہے کہ رحمت اور رحم ایک ہی شے ہے اور یہ عفو اور غفران کے معنی میں ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: رحمت مصدر ہے اور مصدر کا حق یہ ہے کہ وہ مذکر ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ (البقرہ: 175) یہ قول زجاج کے قول کے قریب ہے، کیونکہ مَوْعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت سے احسان کا ارادہ کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جس کی تانیث حقیقی نہ ہو تو اسے مذکر لانا جائز ہوتا ہے، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہاں رحمت سے مراد بارش ہے۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔ اور کہا ہے: اسے مذکر لانا جائز ہے جیسے بعض مؤنث کو مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ شعر بھی کہا ہے:

فلا　مُزْنَةٌ　وَدَقَتْ　وَدْقَهَا　ولا　أرضَ　أبقَلَ　إبقَالَهَا

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: مکان کی تذکیر کی بنا پر قریب مذکر ذکر کیا گیا ہے، یعنی مکانا قریبا۔ علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 411　　2۔ ایضاً　　3۔ صحیح مسلم، الجنۃ وصفۃ نعیمہا، جلد 2، صفحہ 387

خطا ہے، اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا تو پھر قرآن کریم میں قریب منصوب ہوتا، جیسے آپ کہتے ہیں: ان زیدًا قریبا منك اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے نسبت کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ فرمایا: ان رحمة الله ذات قرب (بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت قرب والی ہے) جیسے آپ کہتے ہیں: امرأة طالق وحائض۔ اور فراء نے کہا ہے: جب قریب کا لفظ مسافت کے معنی میں ہو تو اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے اور اگر نسب کے معنی میں ہو تو پھر بلا اختلاف مونث لایا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: هذه المرأة قریبتی، ای ذات قرابتی اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ نے فراء سے ذکر کیا ہے: نسب میں کہا جائے گا قریبة فلان اور غیر نسب میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہیں۔ کہا جاتا ہے: دارك منا قریب (تیرا گھر ہمارے قریب ہے) وفلانة منا قریب (اور فلانہ ہمارے قریب ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا ﴿۶۳﴾ (الاحزاب) (اور (اے سائل)!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو) اور جس نے اس کا استدلال کیا ہے اس نے کہا ہے: اسی طرح کلام عرب بھی ہے، جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

له الوَیْلُ إن أمسَی ولا أمّ هاشم　　قَرِیبٌ ولا البَسْبَاسَةُ ابنةُ یَشْكُرا

زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے، کیونکہ مذکر اور مونث کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دونوں اپنے افعال پر جاری ہوں۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور وہی خدا ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری سناتے ہوئے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ اٹھا لاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف پھر ہم اتارتے ہیں اس سے پانی پھر پیدا کرتے ہیں اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم نصیحت قبول کرو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ کا عطف قول باری تعالیٰ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے ایک دوسری شے کا ذکر کیا ہے اور اپنی وحدانیت اور اپنے الٰہ ہونے کے ثبوت پر دلیل بیان کی ہے۔ اور ریح کے بارے سورۃ البقرہ میں کلام گزر چکی ہے۔ ریاح جمع کثرت ہے اور ارواح جمع قلت ہے۔

اور ریح کی اصل روح ہے اور جس نے جمع قلت میں ادیاح کہا ہے اس نے خطا کی ہے۔ بُشْرًا میں سات قرائتیں ہیں: اہل حرمین اور ابو عمرو نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ نُشُرًا پڑھا ہے اور یہ نسبت کے معنی کی بنا پر ناشر کی جمع ہے۔ یعنی ذات نشر (خوشخبری سنانے والی) پس یہ شاهد اور شهد کی مثل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ نشور کی جمع ہو جیسے رسول کی جمع رسل ہے۔ کہا جاتا ہے: ریح النشور جب ہوا ادھر ادھر سے آئے اور نشور بمعنی منشور ہے، جیسے رکوب بمعنی مرکوب ہے، یعنی وہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اس حال میں کہ وہ پھیلی ہوئی (اور بکھری ہوئی) ہوتی ہیں۔

حسن اور قتادہ نے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ نُشْرًا پڑھا ہے اور یہ نشرا سے مخفف کیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: کتب و رسل۔ اعمش اور حمزہ نے مصدر ہونے کی بنا پر نون کے فتحہ اور شین کے سکون کے ساتھ نَشْرًا پڑھا ہے۔ اس میں اس کے ماقبل کے معنی کا عمل کیا گیا ہے۔ گویا یہ فرمایا: وھو الذی ینشر الریاح نشرا (اور وہ وہی ہے جو ہواؤں کو اچھی طرح پھیلاتا ہے) نشرتُ الشئ فانتشر (میں نے شے کو پھیلایا پس وہ پھیل گئی)

گویا کہ وہ لپٹی ہوئی تھی تو اسے ہوا کے چلنے کے وقت پھیلا دیا گیا) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو اور الریاح سے حال کے محل میں ہو۔ گویا کہ فرمایا: یرسل الریاح منشرۃ ای محییۃ (وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے درآنحالیکہ وہ خوشخبری سنانے والی یعنی زندہ کرنے والی ہوتی ہے) اور یہ أنشر اللہ المیت فنشر (اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گیا) سے ماخوذ ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أتانا رکضا، ای راکضا (وہ ہمارے پاس دوڑتے ہوئے آیا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نشرا (فتحہ کے ساتھ) اس نشر سے ماخوذ ہے جو طی (لپیٹنا) کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، گویا کہ ہوا اپنے ساکن ہونے کی حالت میں لپٹی ہوئی شے کی مثل ہے پھر اسے اپنی حالت سے بھیجا جاتا ہے تو وہ کھلنے والی شے کی طرح ہو جاتی ہے اور ابوعبید نے متفرقۃ فی وجوھہا کے معنی کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے، (یعنی) معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ادھر ادھر پھیلا دیتا ہے۔

حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے با کے ساتھ شین کے سکون اور تنوین کے ساتھ بُشْرًا پڑھا ہے اور یہ بشیر کی جمع ہے، یعنی وہ ہوائیں جو بارش کی بشارت دیتی ہیں۔ اور اس پر شاہد رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ (الروم: 46) ہے (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے)

شین اصل میں مضموم ہے، لیکن اسے تخفیف کے لیے ساکن کیا گیا ہے جیسے رُسُل و رُسْل۔ اور آپ سے با کے فتحہ کے ساتھ بَشْرًا بھی مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بُشُرًا بھی پڑھا جاتا ہے اور بَشْرًا، بَشَرَہ یبشرہ بمعنی بشرہ کا مصدر ہے۔ یہ پانچ قرائتیں ہیں۔ محمد الیمانی نے حبلی کے وزن پر بشری پڑھا ہے اور ساتویں قراءت با اور شین کے ضمہ کے ساتھ بُشْرٰی ہے۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا السحاب مذکر اور مونث دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ جمع بھی ہے جس کے واحد اور اس کے درمیان ہا ہو۔ اس کی صفت واحد کے ساتھ لگانا جائز ہے پس آپ کہیں گے: سحاب ثقیل و ثقیلۃ اور معنی یہ ہے: حملت الریحُ سحاباً ثقالاً بالماء (یعنی ہوا نے پانی والے بھاری بادل کو اٹھایا) یعنی اسے اٹھانے کے سبب وہ بوجھل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے: أقل فلانٌ الشئ یعنی فلاں نے شے اٹھائی۔ سُقْنٰهُ یعنی ہم بادل کو لے جاتے ہیں۔ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ ایسے شہر کی طرف جس میں نباتات اور سبزہ وغیرہ نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے: سقتہ لبلد کذا والی بلد کذا (میں اسے فلاں فلاں شہر کی طرف لے گیا) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے: لاجل بلد میت (یعنی ہم اسے ویران شہر کے لیے چلاتے ہیں) یعنی یہ لام اجلیہ ہے۔ اور البلد سے مراد زمین کی ہر جگہ ہے چاہے وہ آباد ہو یا غیر آباد، وہ سکونت سے خالی ہو یا اس میں سکونت ہو۔ البلدۃ اور البلد، البلاد اور البلدان کی واحد

ہے۔ اور البلد کا معنی الاثر ہے اور اس کی جمع أبلاد ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

مِن بعدِ ما شَمِلَ البِلیٰ أبلادَھا

اور البلد سے مراد أدحِی النَّعام (ریت سے شتر مرغ کے انڈے دینے کی جگہ) بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: ھو أذلّ من بیضۃ البلد، یعنی وہ شتر مرغ کے انڈے سے بھی زیادہ ذلیل ہے جسے وہ چھوڑ دیتا ہے) اور البلدۃ سے مراد زمین ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذہ بلدتنا (یہ ہماری زمین ہے)۔

جیسے کہا جاتا ہے: بحرتنا اور البلدۃ چاند کی منازل میں سے ایک منزل بھی ہے اور وہ قوس کے چھ ستارے ہیں سال کے سب سے چھوٹے دن میں سورج اس میں اترتا ہے۔ اور البلدۃ کا معنی سینہ بھی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلان واسع البلدۃ یعنی فلاں وسیع سینے والا ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

أُنِیخَتْ فأَلقَتْ بَلْدَۃً فوقَ بلدۃٍ قلیلٍ بھا الأصواتُ إلّا بُغَامُھا

شاعر کہہ رہا ہے: اونٹنی بیٹھی تو اس نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا۔ اور البلدۃ (با کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ) کا معنی دو بھوؤں کے درمیان پایا جانا والا فاصلہ اور کشادگی بھی ہے۔ پس یہ دونوں الفاظ مشترکہ میں سے ہیں۔ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ پھر ہم اس شہر میں پانی اتارتے ہیں، (یعنی بہ کی ضمیر کا مرجع البلد ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پھر ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں (یعنی ضمیر کا مرجع السحاب ہے) کیونکہ سحاب (بادل) پانی برسانے کا آلہ اور ذریعہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو فأنزلنا منہ الماء (یعنی با بمعنی من ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (الدھر: 6) یعنی اس میں بِھَا بمعنی منھا ہے۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔ ای مثل ذالك الإخراج نحیی الموتی یعنی ان پھلوں کو نکالنے کی مثل ہم مردوں کو زندہ کریں گے۔ امام بیہقی وغیرہ نے ابو رزین العقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ کیسے اٹھائے گا؟ اور اس کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو اپنی قوم کی وادی سے اس حال میں نہیں گزرا کہ وہ خشک اور قحط زدہ تھی اور پھر تو اس کے پاس سے اس حال میں گزرا کہ وہ سبزے لہرا رہی ہو؟'' عرض کی: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتلك آیۃ اللہ فی خلقہ پس یہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ان کا اپنی قبروں میں احیاء اس بارش کے سبب ہوگا جسے اللہ تعالیٰ ان کی قبور پر برسائے گا تو ان کی قبریں شق ہو جائیں گی، پھر ان کی طرف ارواح لوٹ آئیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے جسے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''پھر اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا''۔ یا فرمایا ''اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا وہ شبنم کی طرح ہوگی اور اس کے سبب لوگوں کے جسم ظاہر ہو جائیں گے، پھر کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ۔ وہ وہاں ٹھہر جائیں گے اور اس سے باز پرس کی جائے گی''۔ آگے حدیث ذکر کی۔ اور ہم نے اسے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں مکمل ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔ پس یہ بعث و نشور پر

دلیل ہے(1) اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی امور لوٹائے جائیں گے۔

وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جو سرزمین عمدہ و زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا، اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو شکر گزار ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا اس میں الْبَلَدُ الطَّیِّبُ سے مراد عمدہ اور زرخیز سرزمین ہے۔ اور خبیث وہ زمین ہے جس کی مٹی میں پتھر یا کانٹے ہوں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد تشبیہ دینا ہے (یعنی) اللہ تعالیٰ نے تیز فہم کو عمدہ اور زرخیز سرزمین سے تشبیہ دی ہے اور کند ذہن (اور کمزور فہم) کو خبیث سے، یہ نحاس سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی مثال ہے، پس ایک دل وہ ہے جو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے (وہ طیب اور پاکیزہ ہے) اور ایک فاسق دل ہوتا ہے جو اسے قبول نہیں کرتا (وہ خبیث ہوتا ہے) یہ قول بھی حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مومن کی مثال ہے جو اخلاص اور اطاعت شعاری کے ساتھ عمل کرتا ہے اور منافق کی مثال ہے جس میں اخلاص نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان (2) ہے! اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو خوبصورت سینگ پائے گا تو وہ یقیناً عشاء میں حاضر ہو''۔ نَكِدًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس سے مراد وہ تنگی ہے جو خیر (خوشحالی) لانے سے مانع اور رکاوٹ ہو، اور یہ ایک تمثیل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اولاد آدم میں طیب بھی ہیں اور خبیث بھی۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اِلَّا نَكْدًا پڑھا ہے اور ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے۔ ابن القعقاع نے نَكَدًا کاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی ذَانكد مصدر ہے۔ جیسے کسی کا قول ہے:

فانما هي اقبال وادبار

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نکد اکا لفظ کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ایک ہی معنی میں ہے جیسا کہ دنِف اور دنَف اور یہ دو لغتیں ہیں۔ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ یعنی جیسا کہ ہم نے کئی طریقوں سے بیان کیا ہے اور یہی شرک کے بطلان میں حجج اور دلائل ہیں۔ اسی طرح ہم ہر اس شے میں علامات اور نشانیاں بیان کرتے ہیں جن کے لوگ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ یہاں شکر کرنے والے کی تخصیص فرمائی کیونکہ اس سے نفع وہی حاصل کرتے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، الفتن و اشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 403 2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 89

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

''بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اللہ کے سوا، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آ جائے''۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ جب یہ بیان کیا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) خالق بھی ہے اور کمال پر قادر بھی تو اس نے کئی امتوں کے قصص اور واقعات بیان کیے اور ان میں کفار کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے والی چیزوں کا ذکر کیا۔ لقد میں لام تاکید کے لیے ہے جو قسم پر متنبہ کرتی ہے۔ اور فا اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ دوسری (شے) اوّل کے بعد ہے۔

يٰقَوْمِ اس میں منادی مضاف ہے۔ اور اسے اپنے اصل پر رکھتے ہوئے یا قومی پڑھنا بھی جائز ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کی حرمت کا حکم لے کر زمین پر مبعوث ہوئے۔ نحاس نے کہا ہے: لفظ نوح منصرف ہے، کیونکہ اس میں حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے ناح ینوح سے مشتق مان لیا جائے۔ یہ معنی اس کے علاوہ دوسرا مفہوم سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: مورخین میں سے حسن نے یہ کہا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے۔ اسے وہم ہوا ہے اور اس کے وہم کی صحت پر دلیل صحیح حدیث ہے کہ جب شب معراج حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان الفاظ کے ساتھ استقبال کیا: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے) اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی) تو اگر حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے باپ ہوتے تو یقیناً اس طرح کہتے: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح مگر جب انہوں نے الاخ الصالح کہا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام میں جمع اور اکٹھے ہیں، صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ اور اس کے بعد کسی منصف کے کلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اس مقام پر آباء جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب سے جواب ان الفاظ میں آیا ہے: مرحباً بالابن الصالح اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: بالاخ الصالح جیسا کہ حضرات موسیٰ، عیسیٰ، یوسف، ہارون اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کی جانب سے ذکر کیا گیا ہے اور بالاتفاق ان میں سے کوئی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ نہیں ہے۔ اور مازری نے بیان کیا ہے: تحقیق مورخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے جد امجد تھے، پس اگر اس پر دلیل قائم بھی ہو جائے کہ حضرت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 785

ادریس علیہ السلام بھی مبعوث کیے گئے تو پھر بھی ان کا قول صحیح نہیں ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے ہونے کی طرف آپ کی نسبت کرتے ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کے اس قول کی خبر دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو مبعوث فرمائے گئے اور اگر دلیل قائم نہ ہو تو پھر وہ جائز ہے جو انہوں نے کہا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس معنی پر محمول کیا جائے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نبی غیر مرسل تھے۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تمام اہل زمین کے لیے مختص تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام کی نبوت فقط اپنی قوم کے لیے تھی جیسا کہ حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط وغیرہم علیہم الصلوات والتسلیمات کی تھی۔ اور بعض نے اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾ (الصافات) (اور بے شک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں (یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟)

اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اور اس طرح بھی پڑھا گیا ہے: سلام علی ادراسین حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالحسن بن بطال کو دیکھا ہے کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام رسول نہیں تھے کہ وہ اس اعتراض سے محفوظ رہیں۔

اور حضرت ابوذر الطویل کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام دونوں رسول ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: انہیں اس طرح اکٹھا اور جمع کیا جا سکتا ہے(1) کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت لوگوں کی اصلاح کے لیے مشہور ہے اور آپ نے انہیں عذاب اور ہلاکت کے خوف سے ایمان پر ابھارا اور برانگیختہ کیا، پس مراد یہ ہے کہ آپ وہ پہلے نبی ہیں جو اس صفت پر مبعوث کیے گئے۔ واللہ اعلم

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کے آٹھ سو برس بعد آپ کی بعثت ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: آپ ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو دعوت حق دیتے رہے، جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ پھر آپ طوفان کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ زیادہ ہو گئے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

وہب نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اس وقت آپ کی عمر پچاس برس تھی۔ عون بن شداد نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی اس وقت آپ کی عمر ساڑھے تین سو برس تھی۔ ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ اب تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ نقاش نے سلیمان بن ارقم سے اور انہوں نے زہری سے بیان کیا ہے کہ عرب، فارس، روم، اہل شام اور اہل یمن سام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ سندھ، ہند، زنج، حبشہ، زط، نوبہ اور سیاہ جلد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 416

والے تمام حام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ ترک، بربر، چین سے آگے کے لوگ، یاجوج ماجوج اور صقالیہ تمام کے تمام یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔ اس طرح تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے (1)۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، غَيْرُهٗ کی قراءت رفع کے ساتھ حضرت نافع، ابوعمرو، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی قراءت ہے یعنی مالکم الٰہٌ غیرہ یہ محلاً صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیرٌ بمعنی اِلّا ہے، یعنی مالکم من الٰہ اِلّا اللہ۔ ابوعمرو نے کہا ہے: میں نہ خبر کو پہچانتا ہوں اور نہ نصب کو۔ کسائی نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جر کے ساتھ پڑھا ہے اور استثنا کی بنا پر نصب بھی جائز ہے اور یہ زیادہ نہیں ہے، مگر امام کسائی اور فراء نے ہر اس جگہ میں جائز قرار دی ہے جس میں اِلّا اچھا اور حسین لگتا ہے چاہے کلام مکمل ہو یا مکمل نہ ہو، پس ان دونوں نے ماجاءنی غیرك کو جائز قرار دیا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض بنی اُسد اور قُضَاعَہ کی لغت ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

لم يَمْنَعِ الشُّرْبَ منها غيرَ أن هتفَتْ　　حمامةٌ فی سَحُوق ذاتِ أو قَال

امام کسائی نے کہا ہے: جاءنی غیرك حالت ایجاب میں کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں اِلّا واقع نہیں ہوسکتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک غیر پر نصب جائز نہیں ہوتی جب تک کلام مکمل نہ ہو۔ اور یہ ان کے نزدیک قبیح ترین غلطی ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: (اے نوح!) ہم دیکھتے ہیں تمہیں کھلی گمراہی میں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! نہیں ہے مجھ میں ذرا گمراہی، بلکہ میں تو رسول ہوں سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تمہیں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے"۔

الْمَلَاُ سے مراد قوم کے اشراف اور ان کے رؤساء ہیں۔ اس کا بیان پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور الضلال اور الضلالۃ کا معنی ہے راہ حق سے پھر جانا اور اس سے ہٹ جانا، یعنی بلاشبہ ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمیں ایک خدا کی طرف دعوت دینے میں راہ حق سے پھرے ہوئے ہو۔ اُبَلِّغُكُمْ یہ تشدید کے ساتھ ہو تو التبلیغ سے ماخوذ ہے۔ اور تخفیف کے ساتھ ہو تو الابلاغ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں اور دو لغتیں ہیں، جیسا کہ کرمه اور اکرمه ہیں۔ وانصح لکم یہ النصح سے ہے اور اس کا معنی ہے: معاملات میں نیت کا فساد کی آمیزش سے خالص اور پاک ہونا، بخلاف غش (ملاوٹ) کے۔

کہا جاتا ہے: نصحتُه و نصحتُ له نصیحةً و نصاحةً و نصحًا اور یہ لام کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْصَحُ لَكُمْ اس کا اسم النصیحة ہے۔ النصیح کا معنی ہے الناصح (نصیحت کرنے والا) اور قوم نصحاء (نصیحت

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الصافات، حدیث نمبر 3154، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ المحرر الوجیز

کرنے والی قوم) اور رجل ناصح الجیب اس کا معنی ہے صاف دل آدمی۔ اصمعی نے کہا ہے: الناصح کا معنی خالص چاہے شہد ہو یا کوئی اور شے ہو، جیسا کہ الناصع ہے اور ہر وہ شی جو خالص ہو وہ نصح ہے۔ اور انتصح فلان کا معنی ہے فلاں نصیحت کی طرف متوجہ ہوا (یعنی اس نے نصیحت قبول کی)۔ کہا جاتا ہے: انتصحنی أنّنی لك ناصح (تو میری نصیحت کی طرف توجہ کر بلاشبہ میں تجھے نصیحت کر رہا ہوں) اور الناصح، خیاط (درزی) کو بھی کہتے ہیں۔ اور النصاح سے مراد وہ دھاگہ ہے جس کے ساتھ سیا جاتا ہے۔ اور النصاحات سے مراد جلود (جلدیں اور چمڑے) بھی ہیں۔ اعشی نے کہا ہے:

فَتَرَى الشُّرْبَ نَشَاوَى كُلَّهُم　　مِثْلَ مَا مُدَّتْ نِصَاحَاتُ الرُّبَحْ

الرُّبَحُ لغوی طور پر الرُّبَع کے معنی میں ہے اور یہ اونٹ کا بچہ ہوتا ہے اور الرُّبَح پرندہ بھی ہے، اس کے مزید معنی سورۂ برأت میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

"کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعہ جو تم میں سے ہے تاکہ وہ ڈرائیں تمہیں (غضب الٰہی سے) اور تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے، پھر بھی انہوں نے جھٹلایا نوح کو تو ہم نے نجات دی ان کو اور جو آپ کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے غرق کر دیا ان (بدبختوں) کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، بے شک وہ لوگ دل کے اندھے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ عَجِبْتُمْ اس میں واؤ کو فتحہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ واؤ عاطفہ ہے (1)، اس پر الف استفہام تقریر کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ اور واؤ کا طریقہ یہ ہے کہ یہ حروف استفہام پر داخل ہوتی ہے سوائے الف کے اس کی قوت کے سبب (یعنی الف پر یہ داخل نہیں ہوسکتی) اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی۔ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ یعنی علی لسان رجل (ایک آدمی کی زبان پر) اور یہ بھی کہا گیا ہے: علی بمعنی مع ہے یعنی مع رجل (ایک آدمی کے ذریعہ) اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے تمہارے اس رب کی طرف سے نصیحت آئی جو تم میں سے ایک آدمی پر نازل کی گئی ہے، یعنی تم اس آدمی کے نسب کو جانتے ہو، یعنی ایسے آدمی پر جو تمہاری جنس میں ہے۔ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو بسا اوقات اختلاف جنس میں مزاجوں میں باہم منافرت اور تضاد ہوتا۔ اور الفلك واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی۔ سورۃ البقرہ میں اس کے بارے گزر چکا ہے۔ عَمِيْنَ یعنی وہ لوگ حق (کی پہچان) سے اندھے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کی پہچان اور معرفت سے اندھے ہیں، کہا جاتا ہے: رجلٌ عَمٍ بكذا یعنی آدمی اس سے جاہل ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 169

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا کیا تم نہیں ڈرتے؟ کہنے لگے وہ سردار جو کافر تھے آپ کی قوم سے کہ (اے ہود!) ہم تو خیال کرتے ہیں کہ تم بڑے نادان ہو اور ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ہود نے کہا: اے میری قوم! نہیں مجھ میں ذرا نادانی بلکہ میں تو رسول ہوں رب العالمین کی طرف سے، پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں تو تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جو دیانتدار ہو۔ کیا تم تعجب کرتے ہو کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ ڈرائے تمہیں؟ (عذاب الٰہی سے) اور یاد کرو جب اس نے بنادیا تمہیں جانشین قوم نوح کے بعد اور بڑھادیا تمہیں جسمانی لحاظ سے قدوقامت میں تو یاد کرو اللہ (تعالیٰ) کی نعمتوں کو شاید تم کامیاب ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ قبیلہ میں ان کے بھائی تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک بشر (اور انسان) تھے۔ اور مصنف ابی داؤد میں ہے کہ اَخَاهُمْ هُوْدًا کا معنی ہے ان کے ساتھ ہود علیہ السلام (کو ان کی طرف بھیجا) اور عاد سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ابن اسحاق نے نسب اس طرح بیان کیا ہے: وعاد هو ابن عوص بن ارم بن شالخ بن أرفخشد بن سام بن نوح علیه السلام (1) اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب اس طرح ہے: ہود بن عبد اللہ بن رباح بن الجلود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح (2)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عاد کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ آپ نسب کے اعتبار سے ان میں سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے ان سے افضل تھے۔

اور عاد کو جس نے منصرف نہیں بنایا اس نے اسے قبیلہ کا نام قرار دیا اور جس نے اسے منصرف قرار دیا ہے اس نے اسے محلے کا نام قرار دیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں ہے: عاد الاولی یہ بغیر الف

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 489 2۔ ایضاً

کے ہے۔ اور ہود عجمی لفظ ہے اور یہ اپنے خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ عربی ہو اور ھاد یھود سے مشتق ہو۔ اور اس پر نصب (زبر) بدل ہونے کی وجہ سے ہو۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان سات آباء کا فاصلہ تھا۔ اور روایت ہے کہ عاد کے تیرہ قبیلے تھے، وہ ٹیلوں پر اترتے تھے، ان میں سے ایک عالج کا ٹیلہ تھا۔ ان کے پاس باغات، کھیتیاں اور بڑی بڑی عمارتیں تھیں اور ان کے شہر بڑے سرسبز و شاداب تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہو گیا تو اس نے اس سرزمین کو جنگل بنا دیا اور یہ حضرموت کے نواح سے یمن تک تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو ہلاک کر دیا تو حضرت ہود علیہ السلام ان لوگوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے جو آپ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور پھر وہ وہیں رہے یہاں تک کہ وصال فرما گئے۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ یعنی بلاشبہ ہم آپ کو نادان اور کم عقل دیکھ رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

مَشَيْنَ كما اهتزتْ رِماحٌ تسفّهتْ أعالِيهَا مَرُّ الرِّياحِ النَّوَاسِمِ(1)

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں رؤیت سے مراد رؤیۃ البصر (آنکھ کی بصارت ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد وہ رائے ہے جو ظن غالب ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ اس میں خُلَفَآءَ مذکر اور معنی کی بنا پر خلیفہ کی جمع ہے اور لفظ کی بنا پر خلائف کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان یہ فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد انہیں زمین کا باسی بنا دیا۔ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً اور یہ بھی جائز ہے کہ بَصْطَةً صاد کے ساتھ ہو، کیونکہ اس کے بعد طاء ہے، یعنی قد و قامت کے اعتبار سے طویل اور جسم کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور عظیم الجثہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے (قدوں کی) زیادہ طوالت سو ذراع تھی (2)۔ اور ان میں سے جو چھوٹے قد کے تھے ان کی طوالت ساٹھ ذراع تھی۔ اور یہ زیادتی ان کے آبا کی تخلیق اور قد و قامت پر تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیادتی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے قد و قامت پر تھی۔ وہب نے کہا ہے: ان میں سے کسی ایک کا سر عظیم اور بڑے قبہ کی مثل تھا۔ اور آدمی کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں درندہ بچے دے سکتا تھا اور اسی طرح ان کی ناک کے نتھنے تھے (3)۔ شہر بن حوشب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قوم عاد کا ایک آدمی پتھر سے (دروازے کے) دو کواڑ بناتا تھا کہ اگر اس امت کے پچاس آدمی اس پر جمع ہو جائیں تو وہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی اپنے پاؤں کے ساتھ زمین کو زور سے دباتا تو وہ اس میں گھس جاتا۔

فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ آلاء کی واحد الی، إلی، إلْو اور أَلَى ہے، جیسا کہ آناء کی واحد إنًى، إنْی، إنْو اور أَنَى ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 417 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 170 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 491

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

''وہ کہنے لگے (اے ہود!) کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس کہ ہم عبادت کریں ایک اللہ کی اور چھوڑ دیں ان (معبودوں) کو جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ سو لے آؤ ہم پر وہ (عذاب) جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود (علیہ السلام) نے کہا: واجب ہو گیا تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب کیا تم جھگڑا کرتے ہو مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (حالانکہ) نہیں اتاری اللہ نے ان کے لیے کوئی سند، سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ پھر ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ان کے ہمراہ تھے اپنی خاص رحمت سے اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور نہ تھے وہ ایمان لانے والے''۔

تو آپ نے انہیں فرمایا: قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ تحقیق تم پر واجب ہو گیا، اس میں وَقَعَ بمعنی وجب ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع القول والحکم یعنی قول اور حکم واجب ہو گیا اور اسی کی مثل یہ آیت ہے: وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ (الاعراف: 134) یعنی جب ان پر عذاب نازل ہوا۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ (النمل: 82) (اس میں بھی وقع بمعنی وجب ہے) اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجس سے مراد وہ زنگ ہے جو کفر کی زیادتی کے سبب دل پر جم جاتا ہے۔ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ (الاعراف: 71) اس میں اسماء سے مراد وہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور ان کے نام مختلف تھے۔

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے بارے میں تمہارے لیے کوئی حجت اور دلیل نازل نہیں کی۔ یہاں اسم بمعنی مسمی ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ (یوسف: 40) اور یہ اسماء مثلاً عزیٰ یہ العز اور الاعز سے بنا ہے اور اللات وغیرہ ہیں۔ ان کے لیے عزت اور الوہیت میں سے کوئی شے نہیں۔ دابر اس سے مراد آخر (یعنی جڑ) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے یعنی ان کے لیے کوئی شے باقی نہ رہی۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ

تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا۔ بے شک آ چکی ہے تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ الله کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے الله کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب دردناک''۔

ثمود سے مراد ثمود بن عاد بن ارم بن سام بن نوح ہے۔ اور یہ جدیس کا بھائی تھا، معاشی طور پر یہ لوگ خوشحال تھے، لیکن انہوں نے الله تعالیٰ کے حکم کے خلاف عمل کیا اور غیر الله کی عبادت اور پوجا کی اور زمین میں فساد برپا کیا۔ تو الله تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا۔ اور آپ کا نسب اس طرح تھا صالح بن عبید بن آسف بن کاشح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔ اور یہ عرب قوم تھے، آپ ان میں نسب کے اعتبار سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے افضل تھے۔ پس آپ نے انہیں الله تعالیٰ کی طرف دعوت دی یہاں تک کہ آپ بوڑھے ہو گئے اور ان میں سے سوائے کمزور لوگوں کی قلیل تعداد کے انہوں نے آپ کی اتباع نہ کی۔ ثمود کا لفظ غیر منصرف ہے، کیونکہ اسے قبیلے کا نام بنایا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ عجمی اسم ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ یہ الثمد سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے قلیل پانی۔

تحقیق قراء نے اس طرح پڑھا: اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ (ہود: 68) کیونکہ یہ چھوٹے قبیلہ (یا محلہ) کا نام ہے۔ اور قوم ثمود کی رہائش گاہیں حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ کی جانب مقام حجر پر تھیں اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کا نام ثمود رکھا گیا۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً جب انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا تو آپ نے سخت پتھر سے ان کے لیے اونٹنی نکالی۔ تو ایک دن اس کے لیے تھا جس میں وہ وادی کا سارا پانی پی جاتی تھی اور انہیں اسی کی مثل دودھ دیتی تھی کہ اس سے زیادہ لذیذ اور شیریں دودھ کبھی بھی کسی نے نہیں پیا۔ اور وہ ان کی کثرت کے باوجود ان کی حاجت اور ضرورت کے مطابق ہوتا تھا۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الشعراء: 155) اس میں ناقۃ کی اضافت اور نسبت الله تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس بنا پر کہ خلق (مخلوق) کی نسبت خالق کی طرف ہے۔ اور اس میں تشریف اور تخصیص کا معنی پایا جاتا ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ یعنی تم پر نہ اس کا رزق (خوراک) ہے اور نہ اس کی کوئی مشقت اور بوجھ۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

''اور یاد کرو جب الله تعالیٰ نے بنایا تمہیں جانشین عاد کے بعد اور ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں تم بناتے ہو اس کے میدانی علاقوں میں عالی شان محل اور تراشتے ہو، پہاڑوں میں مکانات، سو یاد کرو الله تعالیٰ کی نعمتوں کو اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ اس میں کلام محذوف ہے، اصل عبارت ہے وبوأکم فی الأرض منازل (اور اس نے تمہیں زمین میں گھروں کا ٹھکانا دیا) تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا یعنی تم ہر جگہ عالیشان محل بناتے ہو۔ وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا انہوں نے پہاڑوں میں اپنی طویل اور لمبی عمروں کے لیے مکانات بنائے، کیونکہ چھت اور بنیادیں ان کی عمریں ختم ہونے سے پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حسن نے حا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے اور اس میں حروف حلقیہ میں سے ایک ہے، پس اسی لیے یہ باب فعل یفعل کے وزن پر آیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے عالی شان اور بلند و بالا محلات بنانے کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف: 32) (آپ فرمائیے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کیا اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے گھر تعمیر کیا اور اس پر مال کثیر خرچ کیا، جب اس کا ذکر حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ کوئی آدمی ایسا مکان بنائے جو اس کے لیے نفع بخش ہو۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا أنعم الله على عبد أحب أن يرى أثر النعمة عليه (1) (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر احسان و انعام فرمائے تو پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اس نعمت و احسان کا اثر دکھائی دے) اور نعمت و احسان کے آثار میں سے خوبصورت مکان اور اچھا لباس ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اگر کوئی مال کثیر کے عوض حسین و جمیل کنیز خریدے تو اس کے لیے جائز ہے، حالانکہ اس سے کمتر بھی اس کے لیے کافی ہو سکتی ہے، تو یہ مکان اور محل بھی اسی طرح ہیں۔ لیکن بعض دوسروں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ ان میں امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے استدلال کیا ہے: إذا أراد الله بعبد شرا أهلك ماله في الطين واللبن (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے شر کا ارادہ فرمائے تو وہ اپنا مال مٹی اور اینٹوں میں ضائع کر دیتا ہے) اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بنى فوق ما يكفيه جاء به يوم القيامة يحمله على عنقه (2) (جس نے اپنی حاجت اور ضرورت سے زیادہ عمارت بنائی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہو گا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے بارے اسی طرح میں کہتا ہوں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وما أنفق المؤمن من نفقة فإن خلفها على الله عز وجل إلا ما كان في بنيان أو معصية (3) (بندہ مومن جو مال بھی خرچ کرے تو اس کی جگہ اور عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہوتا ہے سوائے اس کے جو عمارت یا معصیت (برائی) میں خرچ ہو) اسے حضرت جابر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیئذان والادب، جلد 2، صفحہ 105۔ ایضاً، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مجمع الزوائد، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 121، حدیث نمبر 6281

3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 28

بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے اور دارقطنی نے اسے نقل کیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لیس لابن آدم حق فی سوی ھذہ الخصال بیت یسکنه و ثوب یواری عورته و جلف الخبز والماء، اخرجه الترمذی (1) (آدمی کا ان چیزوں کے سوا میں کوئی حق نہیں گھر جو اسے رہائش کے کافی ہو، کپڑا جو اس کے لیے ستر عورت کا کام دے، خشک روٹی اور پانی) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار بھی منعم علیہم ہیں۔ اس کے بارے بحث سورہ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ سورۃ البقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ اس میں العثی اور العثود لغتیں ہیں۔ اور اعمش نے تا کے کسرہ کے ساتھ تِعثوا پڑھا ہے انہوں نے اسے عثی یعثی سے لیا ہے نہ کہ عثا یعثو سے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

"کہا ان سرداروں نے جو تکبر کیا کرتے تھے ان کی قوم سے ان لوگوں کو جنہیں وہ کمزور و ذلیل سمجھتے تھے جو ان میں سے ایمان لائے تھے کیا تم یقین رکھتے ہو کہ صالح رسول ہے اپنے رب کی طرف سے۔ انہوں نے کہا: بے شک ہم اس پر جسے دے کر انہیں بھیجا گیا ہے ایمان لانے والے ہیں۔ کہنے لگے وہ لوگ جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو اس چیز کے جس پر تم ایمان لائے ہو منکر ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اس میں دوسرا پہلے سے بدل ہے، کیونکہ وہ مستضعفین (جنہیں وہ کمزور سمجھتے تھے) مومنین ہی تھے اور یہ بدل بعض من الکل ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝

"پس انہوں نے کونچیں کاٹ ڈالیں اس اونٹنی کی اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے اور کہا: اے صالح! لے آؤ ہم پر اس (عذاب) کو جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اگر تم اللہ کے رسولوں سے ہو۔ پھر آ لیا انہیں زلزلہ کے جھٹکوں نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ تو (صالح) نے منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور (بصد حسرت) کہا: اے میری قوم! بے شک پہنچا دیا میں نے تم کو پیغام اپنے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57

رب کا اور میں نے خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم تو پسند ہی نہیں کرتے (اپنے) خیر خواہوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَعَقَرُوا النَّاقَةَ، العقر کا معنی ہے زخمی کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عضو کو کاٹ دینا جو اس کی جان میں اثر انداز ہو۔ اور عقرتُ الفرس تب کہا جاتا ہے جب تو تلوار کے ساتھ اس کے پاؤں پر ضرب لگائے۔ وہ خیل عقری ہے۔ اور عقرت ظهر الدابة جب تو جانور کی پشت کو زخمی کر دے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

تقولُ وقدْ مالَ الغَبِيطُ بنا معاً عَقَرْتَ بعيري يا امرأ القيس فانْزِلِ

یعنی تو نے میرے اونٹ کو زخمی کر دیا۔

قشیری نے کہا ہے: عقر سے مراد اونٹ کی کونچ کو کھولنا یعنی کاٹنا ہے۔ پھر نحر کو عقر کہا گیا ہے، کیونکہ عقر اکثر نحر (جان سے مار دینا) کا سبب بن جاتا ہے۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ان میں صحیح ترین وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ کا ذکر بھی کیا اور اس کا بھی جس نے اس کی کونچیں کاٹی تھیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تب ان میں سے سب سے بدبخت انسان اٹھا ناقہ کی طرف وہ آدمی اٹھا جو اپنے گروہ میں غالب، انتہائی خبیث اور شریر اور سب سے زیادہ طاقتور تھا جیسے ابوزمعہ ہے" (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اس کے نام کے بارے کہا گیا ہے کہ قدار بن سالف ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی حکمرانی ایک عورت کے پاس تھی جسے ملکی کہا جاتا تھا، جب لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف مائل ہونے لگے تو اس کے دل میں آپ کے بارے حسد کی آگ بھڑک اٹھی، تو اس نے دو عورتوں کو بلا کر کہا۔ ان دونوں کے دو دوست تھے جو ان سے عشق کرتے تھے کہ تم دونوں ان کی بات تسلیم نہ کرو اور ان سے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بارے مطالبہ کرو، تو ان دونوں عورتوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ دونوں مرد نکلے اور انہوں نے اونٹنی کو ایک تنگ جگہ میں بند کر دیا اور ان میں سے ایک نے اسے تیر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ اور اس ناقہ کا بچہ سقب اس چٹان کی طرف آیا جس سے وہ نکلی تھی اور تین دفعہ ڈکارا (یعنی اپنی آواز نکالی) وہ چٹان پھٹ گئی اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔

کہا جاتا ہے: یہ وہی دابة (جانور) ہے جو آخری زمانہ میں لوگوں پر ظاہر ہو گا۔ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: جن لوگوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹی تھیں ان میں سے چار افراد نے سقب کا پیچھا کیا، ان میں سے ایک مصدع اور ایک اس کا بھائی ذؤاب تھا۔ تو مصدع نے اسے تیر مارا اور وہ اس کے دل میں پیوست ہو گیا پھر اسے ٹانگ سے کھینچ لیا اور اسے اپنی ماں کے ساتھ ملا دیا (یعنی مار ڈالا) اور انہوں نے اسے اس (ناقہ) کے ساتھ کھایا (2)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا: بلاشبہ تمہاری عمر سے تین دن باقی ہیں، اسی وجہ سے وہ تین بار ڈکارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ناقہ کی کونچیں کاٹنے والے نے ہی اسے مارا اور اس کے ساتھ آٹھ آدمی تھے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ (النمل: 48) (اور اس شہر میں نو شخص تھے) اس کا بیان سورۃ النمل

1۔ صحیح مسلم، الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 383 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 501

میں آئے گا۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا معنی ہے۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ (القمر) (پس ثمودیوں نے بلایا اپنے ایک ساتھی (قدار) کو پس اس نے وار کیا اور (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں)

وہ شراب پی رہے تھے تو پانی ان کے لیے کم ہو گیا کہ وہ اسے اپنی شراب میں ملا سکیں اور وہ ناقہ کے دودھ کا دن تھا، پس ان میں سے ایک اٹھا اور لوگوں کی نگرانی کرنے لگا اور اس نے کہا: میں ضرور اس سے لوگوں کو راحت پہنچاؤں گا۔ تو اس نے اسے مار ڈالا۔

قولہ تعالیٰ: وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے تکبر کیا۔ عَتَا یَعْتُو عُتُوًّا کا معنی ہے تکبر کرنا، سرکشی کرنا۔ اور جب کوئی اطاعت اور پیروی نہ کرے تو کہا جاتا ہے: تَعَتَّى فلان اور اللیل العاتی کا معنی ہے: سخت تاریک رات۔ خلیل نے یہی معنی بیان کیا ہے۔

وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اور انہوں نے کہا: اے صالح! لے آ وہ عذاب جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پس شدید زلزلے نے انہیں آلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ شدید چیخ تھی جس نے ان کے دلوں کو کاٹ دیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ثمود کے قصہ میں ہے۔ قصہ ثمود میں ہے کہ پھر چیخ نے انہیں آلیا۔

کہا جاتا ہے: رَجَفَ الشیئُ یَرْجُفُ رَجْفًا رَجَفَانًا (کسی شی کا کانپنا، لرزہ براندام ہونا) اور أرجفتِ الریحُ الشجرَ کا معنی ہے: ہوا نے درخت کو حرکت دی، ہلا دیا۔ اور اس میں اصل وہ حرکت ہے جس کے ساتھ آواز بھی ہو۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿٦﴾ (النازعات)

شاعر کا قول بھی ہے:

ولما رأيت الحج قد آنَ وَقتُه وظلت مطايا القوم بالقوم تَرْجُفُ

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ پس وہ اپنے گھروں میں ہو گئے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں لفظ دار جنس کے طور پر واحد لایا گیا ہے، حالانکہ یہ فی دورھم کے معنی میں ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا ہے: فِیْ دِیَارِهِمْ (ہود: 94) یعنی اپنے گھروں میں جٰثِمِیْنَ یعنی اپنے گھٹنوں اور مونہوں کے بل زمین کے ساتھ چپکنے والے (گرنے والے) جیسا کہ پرندہ چپک جاتا ہے، یعنی وہ عذاب کی شدت سے مر گئے۔ جثوم کا اصل لفظ خرگوش اور اس کی مثل جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چپکنے کی جگہ کو مجثم کہا جاتا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

بها العينُ والآرامُ يَمْشِين خِلْفَة وأطلاؤها يَنْهَضْنَ مِنْ كل مَجْثَمِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بجلی کی وہ کڑک کے ساتھ جل گئے اور ان تمام نے سوائے ایک آدمی کے صبح مردہ حالت میں کی وہ آدمی اللہ تعالیٰ کے حرم میں موجود تھا، پس جب وہ حرم پاک سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی آفت آئی جو اس کی قوم پر آئی (1)۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ پس آپ نے ان سے مایوس ہو کر ان سے چہرہ پھیر لیا۔

وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ قول ان کی موت سے

1۔ سنن ابی داود، کتاب الخراج والامارۃ والفیء الخ، حدیث نمبر 2684، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہلے کہا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی موت کے بعد آپ نے یہ کہا ہو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقتولین بدر کو یہ کہا: هل وجدتم ما وعد ربكم حقا(1) (کیا تم نے اسے سچا پالیا ہے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کیا آپ ان مردوں سے گفتگو فرما رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أنتم بأسمع منهم ولكنهم لا يقدرون على الجواب(2) (تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے) اس میں پہلا احتمال زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ اور اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ یعنی تم نے میری نصیحت قبول نہیں کی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب انہوں نے کہا اپنی قوم سے کہ کیا تم کیا کرتے ہو ایسی بے حیائی (کا فعل) جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا ساری دنیا میں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ امام فراء نے کہا ہے: لوط ان کے اس قول سے مشتق ہے: هذا أليطُ بقلبي، اى ألصق یعنی یہ میرے دل کے ساتھ چمٹ گیا۔ نحاس نے کہا ہے: زجاج نے کہا ہے: بعض نحویوں یعنی فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ جائز ہے کہ لوط لطت الحوض سے مشتق ہو اور یہ تب کہا جاتا ہے جب تو حوض کو مٹی کے ساتھ لیپ کرے۔ فرمایا: یہ غلط ہے کیونکہ عجمی اسماء مشتق نہیں ہوتے جیسے اسحاق وغیرہ، پس یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ سحق بمعنی بعد سے ہے۔ لوط کا لفظ خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں اور درمیان والا حرف ساکن ہے۔

نقاش نے کہا ہے: لوط عجمی اسماء میں سے ہے عربی میں سے نہیں ہے۔ اور رہا اس کا لطت الحوض سے اور هذا اليط بقلبي تو یہ صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود اسم عجمی ہے جیسا کہ ابراہیم اور اسحاق وغیرہ۔ سیبویہ نے کہا ہے: نوح اور لوط عجمی اسماء ہیں، مگر خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت کی طرف بھیجا جس کا نام سدوم تھا، اور آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور اس کے آخر میں نصب یا تو سابقہ اَرْسَلْنَا کی وجہ سے ہے اور یہ اس پر معطوف ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اور اس سے پہلے اذکر فعل محذوف ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ اس میں فاحشہ سے مراد مذکروں کے ساتھ فعل بد کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فاحشہ کے لفظ کے ساتھ کیا ہے تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ یہ زنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (الاسراء: 32) (تم زنا کے قریب نہ جاؤ بلاشبہ یہ بے حیائی ہے)

علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے جو اس پر واجب ہوگا جس نے اس فعل بد کا ارتکاب کیا اس کے بعد کہ اس کے حرام ہونے پر تمام کا اجماع ہے۔ پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اسے رجم (سنگسار) کیا جائے گا(3) چاہے محصن ہو یا غیر محصن (غیر شادی شدہ)۔ اور اسی طرح اسے بھی رجم کیا جائے گا جس کے ساتھ یہ فعل کیا گیا بشرطیکہ وہ بالغ ہو۔ اور آپ سے

1۔ صحیح مسلم، الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 387　2۔ ایضاً　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786

یہ بھی مروی ہے: اسے رجم کیا جائے گا اگر وہ محصن ہو اور اگر غیر محصن ہو تو اسے قید کیا جائے گا اور تادیبی سزا دی جائے گی۔ یہی مذہب حضرات عطا، ابراہیم نخعی اور ابن مسیب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ نے کہا ہے: محصن اور غیر محصن دونوں کو تعزیر لگائی جائے گی (1)۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زنا پر قیاس کرتے ہوئے اسے حد زنا لگائی جائے گی (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ (الحجر) (اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر) پس یہ ان کے لیے سزا اور ان کے فعل کا بدلہ ہے۔

اور اگر کہا جائے: اس میں دو وجہوں سے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، ایک تو یہ کہ قوم لوط کو دیگر تمام امتوں کی طرح کفر اور تکذیب پر سزا دی گئی اور دوسری یہ کہ ان کے صغیر اور بڑے سب ہی اس میں داخل ہیں۔ پس یہ باب الحدود سے اس کے خارج ہونے پر دلیل ہے۔ تو کہا جائے گا: جہاں تک پہلی وجہ ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے معاصی کا ارتکاب کیا پس ان کے بدلے اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا۔ ان معاصی میں سے یہ بھی ہے۔ اور رہی دوسری وجہ تو ان میں سے کچھ یہ فعل کرنے والے تھے اور ان میں سے کچھ راضی تھے، تو جمہور کے اس پر سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے تمام کو سزا دی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اپنے بندوں کے بارے میں سنت ہے۔ اور فاعلین پر سزا کا امر مسلسل باقی رہے گا۔ واللہ اعلم

ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور دارقطنی نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو'' (3)۔ یہ لفظ ابوداؤد اور ابن ماجہ کے ہیں۔

اور ترمذی میں ہے ''وہ دونوں محصن ہوں یا محصن نہ ہوں'' (4)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے غیر شادی شدہ جوان کے بارے روایت کیا ہے جو عمل لواطت کی حالت میں پایا جائے۔ آپ نے فرمایا: اسے رجم کیا جائے گا (5)۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو جلا دیا اس کا نام فجاءہ تھا، اس نے قوم لوط کا عمل کیا تھا اور یہی رائے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تھی، کیونکہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اس کے بارے لکھا تو آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا اور اس بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بلاشبہ یہ ایسا گناہ ہے جو سابقہ امتوں میں سے سوائے ایک امت کے کسی نے نہیں کیا اور اس کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے (بطور سزا معاملہ) کیا اس کے بارے تم جانتے ہو، میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے اسی پر متفق ہوئی کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ نتیجۃً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف اسے آگ کے ساتھ جلا دینے کا حکم بھیجا تو انہوں نے اسے جلا دیا۔ پھر ایسے لوگوں کو ابن زبیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3869، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 176۔ ایضاً، حدیث نمبر 2550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں جلایا۔ پھر ہشام بن ولید نے انہیں جلانے کی سزا دی۔ پھر خالد قشیری نے عراق میں انہیں جلایا۔

روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں سات افراد لواطت کے جرم میں پکڑے گئے۔ تو آپ نے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو آپ نے ان میں سے چار کو شادی شدہ پایا تو آپ نے ان کے بارے حکم صادر کیا پس انہیں حرم سے باہر نکال کر رجم کر دیا گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے اور تین کو حد جاری کر دی اور آپ کے پاس حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم تھے لیکن ان دونوں نے اس حکم پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور یہی موقف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ حضرت ابن عربی نے کہا ہے: وہ موقف جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے وہ حق کے زیادہ قریب ہے اور وہ سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور اعتماد کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔ اور جہاں تک احناف کا قول ہے تو انہوں نے کہا: زنا کی سزا تو معلوم ہے، تو یہ گناہ جب اس کے سوا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس کی حد میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اور وہ اس بارے میں اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ من وضع حدًّا فی غیر حدٍّ فقد تعدّی و ظلم (جس نے غیر حد کی جگہ حد لگائی تو اس نے زیادتی اور ظلم کیا) اور یہ بھی کہ اس نے ایسی فرج میں وطی کی ہے جس کے ساتھ نہ حلت کا تعلق ہے اور نہ ہی احصان کا، نہ مہر واجب ہوتا ہے اور نہ ہی نسب ثابت ہوتا ہے، پس اس کے ساتھ حد کا کوئی تعلق نہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر کسی نے چوپائے کے ساتھ بدکاری کی تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ نہ اس آدمی کو قتل کیا جائے گا اور نہ ہی چوپائے کو۔ اور یہ قول بھی ہے: دونوں کو مار ڈالا جائے گا۔ اسے ابن منذر نے ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے بیان کیا ہے۔ اور اس باب میں ایک اور حدیث ہے جسے ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی جانور کے ساتھ بدکاری کی تو تم اسے قتل کر دو اور اس کے ساتھ اس چوپائے کو بھی قتل کر دو'' (2)۔ تو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اس جانور کی حالت (اور حکم) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اس کے بارے جو رائے رکھتا ہوں وہ کہہ دیا، مگر یہ مکروہ ہے کہ جس جانور کے ساتھ یہ عمل کیا گیا ہے اس کا گوشت کھایا جائے (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: اگر یہ حدیث ثابت ہے تو پھر اس کے مطابق قول کرنا واجب ہے اور اگر ثابت نہیں تو پھر چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کثرت سے استغفار کرے جس نے اس طرح کا فعل کیا اور اگر حاکم اسے تعزیر لگائے تو یہ اچھا اور حسن ہے۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چوپائے کا قتل اس لیے ہے تاکہ وہ کسی بدشکل شے کو جنم نہ دے۔ پس اس کا قتل اس معنی کے لیے مصلحت ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ سنت سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جس نے کسی چوپائے سے بدکاری کی اس پر حد نہیں ہے۔ ابوداؤد نے کہا ہے: اسی طرح حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور حکم نے کہا ہے: میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے کوڑے لگائے جائیں، لیکن وہ حد کی مقدار کو نہ پہنچیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ زانی کے قائم مقام ہی ہے (4)۔ اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 787 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب فیمن اتی بهيمة، حدیث نمبر 3871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، حدیث نمبر 3872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زہری نے کہا ہے: اسے سو کوڑے مارے جائیں گے چاہے وہ محصن ہو یا محصن نہ ہو۔ امام مالک، ثوری، احمد رحمۃ اللہ علیہم اور اصحاب رائے نے کہا ہے: اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ یہ حضرت عطا، نخعی اور حکم رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس سے مختلف ہے۔ اور یہ اس باب میں آپ کے مذہب کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جابر بن زید نے کہا ہے: اس پر حد قائم کی جائے گی، مگر چوپایہ اس کا ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اس میں مِنْ استغراق جنس کے لیے ہے، یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے پہلے کسی امت میں کوئی لواطت کرنے والا نہ تھا اور ملحد گمان کرتے ہیں کہ وہ ان سے پہلے بھی تھے۔ لیکن سچ وہی ہے جو قرآن کریم میں آیا ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ ابلیس ان کے عمل کی اصل تھا اس طرح کہ اس نے انہیں اپنی طرف بلایا اللہ اس پر لعنت کرے۔ پس وہ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے نکاح کر دیتا تھا۔ حسن نے کہا ہے: وہ یہ عمل غرباء (اجنبیوں) سے کرتے تھے (1)، آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ جس کے بارے میں اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ قوم لوط کا عمل ہے" (2)۔ اور حضرت محمد بن سیرین نے کہا ہے: جانوروں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی نہیں ہے جو قوم لوط کے عمل کی مثل عمل کرتا ہو۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

"بے شک تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ تو حد سے گزرنے والے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمْ حضرت نافع اور حفص نے خبر کی بنا پر اسے ایک ہمزہ مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مذکور فاحشہ کی تفسیر ہے، پس اس پر حرف استفہام داخل کرنا اچھا نہیں، کیونکہ یہ اپنے مابعد کو اپنے ماقبل سے قطع کر دیتا ہے۔ لیکن باقیوں نے استفہام کی بنا پر اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ استفہام توبیخ (جھڑک) کے معنی میں ہے اور یہ حسین ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اور مابعد مستقل کلام ہے۔ ابو عبید اور کسائی وغیرہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ (الانبیاء) اس میں أفهم نہیں فرمایا۔ اور مزید فرمایا: اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران: 144) اس میں أانقلبتم نہیں فرمایا۔

اور یہ انتہائی قبیح غلطی ہے، کیونکہ ان دونوں نے دو چیزوں کو ایسی چیز کے ساتھ مشابہت دی ہے جس کے ساتھ وہ مشابہت نہیں رکھتیں، کیونکہ شرط اور جزا دونوں ایک شے کے قائم مقام ہیں جیسا کہ مبتدا اور خبر۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ ان دونوں میں استفہام ہو۔ پس یہ کہنا جائز نہیں: أفإن مِت أفهم جیسے یہ کہنا جائز نہیں أزید أمنطلق۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں دو جملے ہیں، پس آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ ان میں سے ہر ایک کے بارے سوال کریں (یعنی ہر ایک کے

1۔ تفسیر بصری، جلد 3، صفحہ 103　　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187۔ ایضاً، حدیث نمبر 2552، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ حرف استفہام لگائیں) یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے اور اسے نحاس اور مکی وغیر ہما نے اختیار کیا ہے۔ شھوۃ یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، ای تشتھونھم شھوتہ (یعنی تم ان سے شہوت پرستی کرتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں مصدر ہو۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (الشعراء) اس برائی کے سبب تم شرک کی طرف جمع ہونے میں حد سے بڑھنے والے ہو۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

''اور نہ تھا کوئی جواب ان کی قوم کے پاس سوائے اس کے کہ وہ بولے: باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ پس ہم نے نجات دے دی لوط کو اور ان کے گھر والوں کو بجز ان کی بیوی کے، وہ ہوگئی پیچھے رہ جانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ یعنی حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی اتباع کرنے والوں کو بستی سے باہر نکال دو۔ اور يَّتَطَهَّرُوْنَ کا معنی ہے یہ لوگ تو اس قسم کا کام کرنے سے بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تطھر الرجل یعنی وہ گناہ سے پاک رہا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! انہوں نے انہیں بغیر عیب کے عیب لگا دیا ہے (1)۔ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں باقی رہنے والے ہیں۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: غَبَرَ الشیٔ تب کہا جاتا ہے جب کوئی شے گزر جائے (ختم ہو جائے) اور جب کوئی شے باقی رہے تب بھی غبر کہا جاتا ہے۔ پس یہ الفاظ اضداد میں سے ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: گزرنے والے کے لیے عابرین کے ساتھ اور باقی رہنے والے کے لیے غابرین کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسے ابن فارس نے ''المجمل'' میں بیان کیا ہے۔ اور زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی وہ نجات سے غائب ہونے والوں میں سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عمر کے طویل ہونے کے سبب پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ اس طرف جاتے ہیں کہ اس کا معنی من المعمرین ہے یعنی وہ بوڑھی ہوگئی۔ اور لغت میں اکثر یہ ہے کہ غابر باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

فما وَنَى محمدٌ مذْ أنْ غَفَرْ　　له الإلهُ مامضى وما غَبَرْ

اس میں غبر باقی رہنے والا کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

''اور برسایا ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ تو دیکھو کیسا (عبرتناک) انجام ہوا مجرموں کا''۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کے وقت نکلے جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 425

(ہود: 81) پھر حضرت جبریل امین علیہ السلام کو حکم دیا گیا تو انہوں نے اپنا پر ان بستیوں کے نیچے داخل کیا اور ان تمام کو نیچے سے اکھیڑ ڈالا اور انہیں اوپر اٹھالیا یہاں تک کہ اہل آسمان نے مرغوں کی پکار اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، پھر ان کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا (یعنی الٹا کر کے زمین پر دے مارا) اور ان پر کنکر کی پتھریاں برسائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر جو ان میں سے غائب تھا۔ اور آپ نے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو پالیا، آپ کے پاس ایک پتھر تھا پس اسے قتل کر دیا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار بستیاں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ پانچ تھیں۔ اور ان میں چار لاکھ افراد تھے۔ اس کا بیان سورۃ ہود میں حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

''اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر، بے شک آ گئی تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے تو پورا کرو ناپ اور تول کو اور نہ گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ فساد برپا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور مت بیٹھا کرو راستوں پر کہ ڈراتے ہو تم (راہ گیروں کو) اور روک رہے ہو تم اللہ کی راہ سے جو ایمان لایا اللہ کے ساتھ اور تلاش کرتے ہو اس میں عیب اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھو! کیا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا۔ اور اگر ایک گروہ تم میں سے ایمان لا چکا ہے اس کے ساتھ جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہ لایا تو (ذرا) صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ ہمارے درمیان اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِلٰى مَدْيَنَ مدین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بلد اور قطر کا نام ہے (1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے جیسے بکر اور تمیم قبیلوں کے نام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی اولاد میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426

سے تھے۔ پس جن کی رائے ہے کہ مدین آدمی کا نام ہے ان کے نزدیک یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں معرفہ اور عجمہ پائے جاتے ہیں۔ اور جن کی رائے ہے کہ یہ قبیلہ یا زمین کا نام ہے تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ اسے منصرف قرار نہ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ روایت ہے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا بیٹا تھا۔ اور مکی نے کہا ہے: وہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا خاوند تھا (1)۔ اور اس کے نسب میں اختلاف ہے۔

حضرت عطا اور ابن اسحاق وغیرہما نے کہا ہے: شعیب ھو ابن میکیل بن یشجرا بن مدین بن ابراھیم علیہ السلام سریانی زبان میں ان کا نام بیروت تھا اور ان کی ماں میکائیل بنت لوط تھی (2)۔ اور شرقی بن قطامی نے یہ گمان کیا ہے کہ شعیب بن عیفاء بن یوبب بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام نسب ہے۔ اور ابن سمعان کا خیال ہے کہ شعیب بن جزی بن یشجر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم نسب ہے۔ اور شعیبٌ شَعْب یا شِعْب کی تصغیر ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ شعیب بن یوبب ہے اور یہ قول بھی ہے: شعیب بن صفوان بن عیفاء بن ثابت بن مدین بن ابراہیم نسب ہے۔ واللہ اعلم

آپ نابینا تھے، اسی لیے آپ کی قوم نے کہا: وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا (ہود: 91) (اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے) اور آپ کو اپنی قوم کی طرف حسن مراجعت کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔ اور آپ کی قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والی اور ناپ تول میں کمی کرنے والی تھی (3)۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بیان آ گیا اور اس سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کا رسول بن کر تشریف لانا ہے۔ اور آپ کے کسی معجزہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس بارے میں آپ کا معجزہ امام کسائی نے قصص الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ، البخس کا معنی ہے کمی کرنا، گھٹا کر دینا اور یہ سامان تجارت میں عیب لگانے اور اس میں رغبت کم ہونے کے سبب ہوتی ہے یا قیمت میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے سبب اور ماپ میں زیادتی اور کمی کرنے کا حیلہ کرنے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ سب مال کو باطل طریقے سے کھانا ہے، سابقہ اور گزشتہ تمام امتوں میں تمام رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی زبانوں سے اس سے منع کیا گیا ہے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس کا عطف وَ لَا تَبْخَسُوْا پر ہے یہ لفظ چھوٹے اور بڑے ہر فساد کو شامل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے حضرت شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث فرمانے سے پہلے اس زمین میں معاصی اور گناہوں کے اعمال کیے جا رہے تھے، محارم کو حلال سمجھا جا رہا تھا اور اس میں خون بہایا جا رہا تھا۔ فرمایا: پس یہی اس کا فساد ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو زمین کی اصلاح ہو گئی۔ اور ہر نبی جسے اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اس نے ان کی اصلاح کی، (اور فساد کو جڑ سے اکھیڑنے کی سر توڑ کوشش فرمائی)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 507　　3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ اللہ تعالیٰ نے انہیں راستوں پر بیٹھنے سے اور اس راستے کو بند کرنے سے منع فرمایا ہے جو راستہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف لے جانے والا ہے۔ وہ اس آدمی کو عذاب اور اذیت سے ڈراتے دھمکاتے تھے جو ایمان لے آتا۔ علماء نے راستوں پر بیٹھنے کے معنی میں اختلاف کیا ہے اور تین معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانے والے راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور جو بھی آپ کے پاس آنے کی کوشش اور ارادہ کرتا وہ اس کو خوفزدہ کرتے تھے اور روکتے تھے اور یہ کہتے تھے: وہ تو کذاب ہے تو اس کی طرف مت جا، جیسا کہ قریش مکہ حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ کرتے تھے (1)۔ یہی آیت کا ظاہر معنی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ڈاکہ ڈالنے اور مال چھیننے سے نہی ہے (2)۔ اور یہ فعل ان کے افعال میں سے تھا۔ حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے شب معراج راستے میں ایک لکڑی دیکھی جو کپڑا بھی اس کے پاس سے گزرتا وہ اسے پھاڑ دیتی اور اس نے ہر شی کو پھاڑ دیا، تو میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟، تو انہوں نے کہا: یہ آپ کی امت میں سے اس گروہ کی مثال ہے جو راستے پر بیٹھتے ہیں اور ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ الآیہ (3) اور چوروں اور حملہ آوروں کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے: وہ دسواں حصہ (عشرا) وصول کرتے تھے (4)۔ اور آج کے دور میں ان کی مثل وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے وہ مال قہر و جبر کے ساتھ وصول کرتے ہیں جو ان پر وظائف مالیہ میں سے شرعاً لازم ہوتا ہے۔ اور اس مال کا ضامن بنا دیتے ہیں جس کی ضمانت اصلاً جائز ہوتی ہے مثلاً زکوٰۃ، مال میراث اور ملاہی وغیرہ (کھیل کود کا سامان وغیرہ) اور وہ مختلف راستوں پر ڈیرہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا وجود کثرت سے ہے اور تمام شہروں میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اور یہ عظیم کبیرہ اور فحش ترین گناہوں میں سے ہے، کیونکہ یہ ظلم، غصب اور لوگوں پر بے جا زیادتی ہے اور یہ منکر کو پھیلانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اس پر دوام اختیار کرنا اور اسے مزید پختہ کرنا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریعت اور قضاء کے حکم کو اپنے ذمے میں شامل کرنا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اسلام میں سے سوائے رسم کے کچھ باقی نہ رہا اور دین میں سے سوائے نام کے کچھ نہیں رہا۔ اس تاویل کے لیے وہ نہی باعث تقویت ہے جو اس سے قبل مال کے ناپ تول اور اس میں کمی کرنے کے بارے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَنْ اٰمَنَ بِهٖ اس میں بہ کی ضمیر یہ احتمال بھی رکھتی ہے کہ اسم جلالت کی طرف لوٹ رہی ہو اور یہ بھی کہ شعیب کی طرف لوٹ رہی ہو۔ یہ ان کے قول کے مطابق ہے جن کی رائے یہ ہے کہ مراد راستہ بند کرنے کے لیے راستے پر بیٹھنا ہے اور یہ بھی کہ وہ السبیل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عِوَجًا ابو عبیدہ اور زجاج نے کہا ہے: یہ معانی میں عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور اجرام میں عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ یعنی اس نے تمہاری تعداد بڑھا دی یا فقر و افلاس کے بعد دولت و ثروت کے ساتھ تمہیں بڑھا دیا، یعنی تم فقراء تھے تو اس نے تمہیں دولت مند بنا دیا۔ فَاصْبِرُوْا یہ کفر پر قائم رہنے کا امر نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 427　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 280　4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 508

ہے بلکہ یہ وعید اور جھڑک ہے۔ اور فرمایا: وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ معنی کے اعتبار سے کَانَ مذکور ہے اگرچہ لفظ کا تقاضا تو یہ ہے کہ کانت ہوتا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾

''کہنے لگے وہ سردار جو غرور و تکبر کیا کرتے تھے ان (شعیب) کی قوم سے یا تو ہم نکال کر رہیں گے تمہیں اے شعیب! اور جو ایمان لائے تمہارے ساتھ اپنی بستی سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں، شعیب نے کہا: اگرچہ ہم اس (ارتداد) کو ناپسند بھی کرتے ہوں۔ پھر تو ہم نے ضرور بہتان باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اگر ہم لوٹ آئیں تمہارے دین میں اس کے بعد کہ جب نجات دے دی ہمیں اللہ نے اس سے اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ جو پروردگار ہے ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے، صرف اللہ پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، اے ہمارے رب! فیصلہ فرما دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا کا معنی ہے تم لوٹ آؤ گے ہماری ملت کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے متبعین آپ کے ساتھ ایمان لانے سے پہلے کفر پر تھے، یعنی تم ضرور ہماری طرف لوٹ آؤ گے جیسے تم پہلے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ عود بمعنی ابتدا ہو۔ کہا جاتا ہے: عاد الیّ من فلان مکروہ یعنی فلاں سے میری طرف آنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، اگرچہ اس سے پہلے اس کا آنا مکروہ نہیں، یعنی وہ اس سے میرے ساتھ مل گیا۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ یعنی اگر ہم ناپسند کریں تو تم ہمیں وطن سے نکلنے پر یا اپنی ملت کی طرف لوٹنے پر مجبور کرو گے، یعنی اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے بہت بڑا کام کر لیا۔

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا یہ ان کی ملت کی طرف لوٹنے سے مایوسی اور ناامیدی کا اظہار ہے۔ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یعنی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اس کی طرف لوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے(1)۔ فرمایا: یہ اہل السنت کا قول ہے۔ یعنی وما یقع

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 509

منا العود إلی الکفر إلّا أن یشاء الله ذالك (ہم سے کفر کی طرف لوٹنے کا وقوع نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے چاہے) پس یہ استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں استثنا اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنے کی جہت پر ہے جیسے یہ کہا: وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ (ہود: 88) اور اس پر دلیل اس کا مابعد وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: لا أكلمك حتى يبيض الغراب، وحتى يلج الجمل في سم الخياط (میں تیرے ساتھ کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ کوا سفید ہو جائے اور یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے) اور کوا کبھی سفید نہ ہوگا اور اونٹ سوئی کے ناکے میں کبھی داخل نہ ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ہمارا رب ما کان اور ما یکون کے علم کو گھیرے ہوئے ہے۔ عِلْمًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم بستی میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ تم نے ہمارے پڑوس کو ناپسند کیا ہے، بلکہ ہم تمہارے گاؤں سے کسی اور کی طرف ہجرت کر کے نکل جائیں گے۔ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ ہمیں اس کی طرف لوٹا دے۔ اور اس معنی میں بُعد ہے، کیونکہ عاد للقریۃ کہا جاتا ہے، عاد فی القریۃ نہیں کہا جاتا۔

قولہ تعالیٰ: عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ کئی مقام پر یہ پہلے گزر چکا ہے۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو امتوں کی طرف بھیجا ایک اہل مدین، اور دوسرے اصحاب الایکۃ (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے۔ پس جب طویل وقت گزر گیا آپ کی قوم اپنے کفر اور اپنی گمراہی میں سرکش ہوگئی اور آپ ان کی اصلاح سے مایوس ہو گئے تو ان کے لیے بددعا کی اور کہا: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور انہیں زلزلہ کے ساتھ ہلاک اور تباہ کر دیا۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۹۰ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝۹۱ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۛ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ ۝۹۲ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَیْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ۝۹۳

"اور کہا ان رئیسوں نے جو کافر تھے ان کی قوم سے کہ اگر تم پیروی کرنے لگو شعیب کی تو یقیناً تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ پھر پکڑ لیا انہیں زلزلہ نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ جن (بدبختوں) نے جھٹلایا شعیب کو (وہ یوں نابود کر دیے گئے) گویا کبھی بستے ہی نہ تھے ان مکانوں میں۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو ہو گئے وہی نقصان اٹھانے والے۔ تو منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور کہا: اے میری

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 511

قوم! بے شک میں نے پہنچا دیئے تھے تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں نے نصیحت کی تھی تمہیں۔ تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم (کے ہولناک انجام) پر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ یعنی انہوں نے اپنے سے کمتر اور کمزور لوگوں کو کہا: لَىٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرنے لگے تو یقیناً تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ رجفه کا معنی چیخ (کرخت آواز) ہے اور اصحاب الایکۃ شدید بادل کے سبب ہلاک کیے گئے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا جرجانی نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ نیا کلام ہے۔ یعنی جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہ اس طرح ہو گئے گویا وہ ہمیشہ سے مردہ تھے۔ اور یَغْنَوْا بمعنی یقیموا (مقیم ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: غَنِیتُ بالمکان جب تو کسی مکان میں مقیم ہو۔ اور غَنَی القوم فی دارهم یعنی ان کا اپنے گھروں میں قیام طویل عرصہ سے ہے اور مغنی بمعنی منزل (گھر) ہے اور اس کی جمع مغانی ہے۔ عبید نے کہا ہے:

و غَنِیتُ سبتًا قبلَ مَجْرَی دَاحِسٍ   لو كان للنفس اللَّجُوجِ خُلود

اور حاتم طی نے کہا:

غنِینا زمانا بالتَّصَعْلُك والغِنَی   كما الدهرُ فی أیامه العسرُ والیسرُ(1)

كسبنا صُروفَ الدَّهرِ لِینًا وغِلظة   وكُلًّا سقاناه بكأسِهما الدهرُ

فما زادنا بَغْیًا علی ذِی قرابة   غِنَانَا ولا أَزْرَی بأحسابنا الفَقْرُ

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ یہ ابتدائے خطاب ہے۔ اور یہ ذم و توبیخ میں مبالغہ ہے اور امر کی تعظیم و تفخیم کا اعادہ ہے۔ جب انہوں نے کہا: جس کسی نے حضرت شعیب علیہ السلام کی اتباع اور پیروی کی وہ خسارے میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خسارے اور نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم کے ہولناک انجام پر۔ أسیت علی الشیء (میں نے فلاں پر اظہار غم کیا) آسی (أسیٰ) (غم کرنا) وأنا آسٍ (اور میں غم کرنے والا ہوں)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝

"اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر یہ کہ (جب نبی جھٹلایا گیا) تو ہم نے مبتلا کر دیا وہاں کے باشندوں کو سختی اور تکلیف میں تا کہ وہ گڑگڑانے لگیں پھر ہم نے بدل دی تکلیف کی جگہ راحت حتیٰ کہ وہ پھلے پھولے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 430

کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت، تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اور اس کا انہیں خواب و خیال بھی نہ تھا"۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اس میں اضمار ہے اور وہ ہے فکذب أھلھا إلا أخذناھم (اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی اس کے رہنے والوں نے تکذیب کی) مگر ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا)۔ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ یعنی پھر ہم نے ان کی تکلیف اور خشک سالی کو خوشحالی اور راحت کے ساتھ بدل دیا۔ حَتّٰى عَفَوْا یہاں تک کہ وہ کثیر اور وافر ہو گئے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے مال و منال اور اولاد بڑھ گئی (2)۔ اور عفا کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ عفا کا معنی بڑھنا اور کثیر ہونا ہے۔ اور عفا کا معنی مٹ جانا اور ختم ہو جانا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ اس نے انہیں شدت و تکلیف اور راحت و خوشحالی میں مبتلا کیا پس نہ انہوں نے روکا اور منع کیا اور نہ ہی شکر ادا کیا۔ وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ (اور کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت) اور ہم بھی انہیں کی مثل ہیں۔ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا تاکہ یہ ان کے لیے بہت زیادہ باعث حسرت ہو جائے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی لیکن انہوں نے جھٹلایا (ہمارے رسولوں کو) تو پکڑ لیا ہم نے انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى مدینہ (شہر) کو قریہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں یہ قریت الماء سے ماخوذ ہے، یہ تب کہا جاتا ہے جب تو پانی جمع کرے۔ یہ مکمل طور پر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اٰمَنُوْا یعنی اگر بستیوں والے تصدیق کرتے۔ وَاتَّقَوْا اور وہ شرک سے بچتے۔ لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یعنی بارش اور نباتات (اناج وغیرہ) انہیں عطا فرماتے۔ اور یہ ان اقوام میں خاص طور پر ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ جب کبھی مومنین کو زندگی کی تنگی اور تلخیوں کے ساتھ آزمایا جاتا ہے تو وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی ہے جب کہ آپ نے اپنی قوم کو فرمایا: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ (نوح) (معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ برسائے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش)

اور حضرت ہود علیہ السلام کے بارے ہے: ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا (ہود: 52) (پھر (دل و

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 242 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 513

جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش) پس اللہ تعالیٰ نے ان سے خاص طور پر بارش اور شادابی کا وعدہ فرمایا۔ اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور مومنین نے ان کی تصدیق کی اور تکذیب نہ کی۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿97﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿98﴾

''تو کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اس حال میں کہ وہ سو رہے ہوں یا کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب چاشت کے وقت جب کہ وہ کھیل کود رہے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى یہ استفہام برائے انکار ہے۔ اور فا عاطفہ ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ (المائدہ:50) (تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں؟)

قریٰ سے مراد مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح کی بستیاں ہیں، کیونکہ انہوں نے ہی حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جھٹلایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ عام ہے اور تمام بستیوں کو شامل ہے۔ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا یعنی ان پر ہمارا عذاب آ جائے۔ بَيَاتًا رات کے وقت۔

وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ (درآنحالیکہ وہ سو رہے ہوں) اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا حرمیان اور ابن عامر نے واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ أو عاطفہ ہے اور اباحت کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿24﴾ (دہر) (اور نہ کہنا مانیے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا)۔ جالس الحسن او ابن سیرین (تو حسن یا ابن سیرین کی مجالست اختیار کر (یعنی ان دو میں سے ہر ایک کے ساتھ بیٹھنا مباح ہے) اور آیت میں معنی یہ ہے: یا وہ سزاؤں کی ان قسموں سے بے خوف اور امن میں ہو گئے ہیں، یعنی اگر تم ایک قسم سے بے خوف ہو چکے ہو تو دوسری سے بے خوف اور پر امن نہ ہو۔ اور او کا دو چیزوں میں سے ایک کے لیے ہونا جائز ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: ضربتُ زیدًا أو عمرًا (میں نے زید کو مارا یا عمر کو) اور باقیوں نے واؤ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے بعد ہے۔ اسے واؤ عطف قرار دیا ہے جس پر الف استفہام داخل ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا (البقرہ:100) (کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا)

اور ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ کا معنی ہے: اور وہ اس حالت میں ہوں جو انہیں کوئی نفع نہ دے سکے۔ ہر وہ آدمی جو ایسے کام میں لگا ہو جو اس کے لیے نقصان دہ تو ہو لیکن نفع بخش نہ ہو اسے لاعب کہا جاتا ہے اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور ''الصحاح'' میں ہے اللّعب معروف ہے اور اللّعْب اس کی مثل ہے اور لعِب یلعَب اور تَلَعَّبَ (لَعِبَ) کے بعد دیگرے کھیل کود میں مصروف رہنا اور رجل تِلْعَابَة بہت زیادہ کھیل کود میں مصروف رہنے والا آدمی۔ اور التلعاب فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ مصدر ہے اور

جاریة لعوبٌ (بہت زیادہ کھیلنے والی لڑکی)

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

''تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ہیں اللہ کی خفیہ تدبیر سے پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ یعنی کیا وہ اپنے مکر وفریب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے مکر سے مراد اس کی خفیہ تدبیر ہے جو اس نے نعمت وصحت عطا کرنے کی صورت میں اپنا رکھی ہے۔

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کیا یہ (حقیقت) واضح نہ ہوئی ان لوگوں پر جو وارث بنے زمین کے اس کے اصلی مالکوں (کی تباہی) کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو سزا دیں انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اور مہر لگا دیں ان کے دلوں پر تاکہ وہ کچھ سن ہی نہ سکیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ يَهْدِ کیا یہ واضح اور ظاہر نہیں ہوا؟ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مراد کفار مکہ اور ان کے اردگرد رہنے والے لوگ ہیں۔ اَصَبْنٰهُمْ یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں پکڑ لیں۔ بِذُنُوْبِهِمْ ان کے کفر اور ان کے جھٹلانے کے سبب۔ وَنَطْبَعُ، ای ونحن نطبع امور هم مہر لگا دیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أصبنا پر معطوف ہے، یعنی نُصیبهم ونطبع (ہم انہیں سزا دیں اور مہر لگا دیں) تو اس میں ماضی مستقبل کے محل میں واقع ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

''یہ بستیاں ہیں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی کچھ خبریں اور بے شک آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ اور نہ ہوا یہ کہ ایمان لاتے اس پر جس کو جھٹلا چکے تھے اس سے پہلے اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الْقُرٰى یعنی یہ وہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک اور تباہ و برباد کیا۔ اور وہ حضرت نوح، عاد، حضرت لوط، حضرت ہود اور حضرت شعیب علیہم السلام کی بستیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ نَقُصُّ ہم بیان کرتے ہیں۔ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا آپ سے ان کی کچھ خبریں۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے باعث تسلی واطمینان ہے۔

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا یعنی ایسا نہیں کہ وہ کفار اپنے ہلاک ہونے کے بعد ایمان لائیں اگر ہم انہیں زندہ کر دیں (1)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا (انعام: 28) (اور اگر انہیں واپس بھیجا جائے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 515

(جیسے ان کی خواہش ہے) تو پھر وہ بھی وہی کریں) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ربیع نے کہا ہے: اس دن سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جس دن اس نے میثاق لیا کہ وہ رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے (1)۔ بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ مراد یوم میثاق ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تو وہ مجبوراً ایمان لائے نہ کہ رضامندی کے ساتھ۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس دن وہ مجبوراً ایمان لائے جس دن اللہ تعالیٰ نے ان سے میثاق لیا پس یہ نہیں ہوسکتا کہ اب وہ حقیقتاً ایمان لائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے معجزات کا سوال کیا، پس جب انہوں نے معجزات دیکھ لیے تو پھر ایسا نہ ہوا کہ وہ اس پر ایمان لاتے جسے وہ معجزہ دیکھنے سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 110) (جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ کافروں کے دلوں پر مہر لگائی اسی طرح وہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا جو حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اور نہ پایا ہم نے ان کی اکثریت کو وعدہ کا پابند اور ضرور پایا ان میں سے بہتوں کو حکم عدولی کرنے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ اس میں من زائدہ ہے اور یہ معنی جنس پر دلالت کرتا ہے اور اگر من نہ ہوتا تو پھر یہ وہم جائز ہوتا کہ یہ معنوی اعتبار سے واحد ہے۔ (یعنی صرف ایک وعدہ مراد ہوتا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ان سے اس وقت لیا گیا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا گیا تھا اور جس نے عہد توڑ دیا اس کے لیے کہا گیا ہے اس کا کوئی عہد نہیں یعنی گویا اس نے وعدہ کیا ہی نہیں۔ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا (2) ہے: اس وعدہ سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان سے لیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ کفار منقسم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں نہ امانت ہے اور نہ ایفائے عہد ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے کفر کے باوجود امانتدار بھی ہیں اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ یہ ابوعبیدہ سے مروی ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے انکار کر دیا ان کا، سو دیکھو کیسا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے بھیجا حضرت نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے بعد۔ مُّوْسٰى حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو۔ بِاٰيٰتِنَاۤ اپنے معجزات اور نشانیوں کے ساتھ۔ فَظَلَمُوْا بِهَا تو انہوں نے انکار کر دیا اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 181
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 106

انہوں نے ان نشانیوں کی تصدیق نہ کی۔ اور آیت میں ظلم کا معنی ہے: وضعُ الشئ فی غیر موضعه (کسی شی کو وہاں رکھنا جو اس کا محل نہ ہو ظلم کہلاتا ہے)

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ سو دیکھو فساد برپا کرنے والوں کے معاملے کا انجام کیسا ہوا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

''اور کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے: اے فرعون! بلاشبہ میں رسول ہوں پروردگار عالم کا۔ واجب ہے مجھ پر کہ میں نہ کہوں اللہ پر سوائے سچی بات کے، میں آیا ہوں تمہارے پاس روشن دلیل لے کر تمہارے رب کی طرف سے پس بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ فرعون نے کہا: اگر تم لائے ہو کوئی نشانی تو پیش کرو اسے اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔ تو ڈال دیا موسیٰ نے اپنا عصا تو فوراً وہ صاف اژدہا بن گیا۔ اور نکالا اپنا ہاتھ (گریبان سے) تو فوراً وہ سفید (روشن) ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے۔ کہنے لگے قوم فرعون کے رئیس: واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے ملک سے، تو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ بولے: مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو اور بھیجو شہروں میں ہرکارے، تاکہ وہ لے آئیں تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو''۔

حَقِيْقٌ علیٰ یعنی مجھ پر واجب ہے۔ اور جنہوں نے علی ان لا پڑھا ہے تو معنی یہ ہوگا حریص علی الا اقول (وہ اس پر حریص ہے کہ میں نہ کہوں) اور حضرت عبداللہ کی قراءت میں حقیق الا اقول ہے یعنی اس میں علی موجود نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ علی بمعنی با ہے (1)، یعنی حقیق بالا اقول اور اسی طرح حضرت ابی اور اعمش کی قراءت میں بالا اقول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: رمیتُ بالقوس وعلی القوس۔ پس اس بنا پر حقیق بمعنی محقوق (ثابت شدہ) ہوگا۔ اور فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ کا معنی ہے تو انہیں چھوڑ دے۔ (کیونکہ) وہ انہیں انتہائی مشقت آمیز کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ۔ اسے اجسام اور معانی دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور الثعبان سے مراد اژدہا (بہت بڑا سانپ) ہے اور یہی تمام سانپوں سے بڑا اور شدید ہوتا ہے۔

مُّبِيْنٌ یعنی ایسا سانپ جس میں کوئی التباس اور ابہام نہ تھا۔ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ اور آپ نے اپنا دست مبارک نکالا اور اسے ظاہر

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 182

کیا۔ کہا گیا ہے کہ اپنے گریبان سے یا اپنے پہلو سے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (النمل: 12) یعنی بغیر برص (کی بیماری) کے وہ سفید اور روشن نکلے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت زیادہ گندمی رنگ کے تھے، پھر آپ نے اپنا ہاتھ دوبارہ اپنے گریبان میں داخل کیا تو وہ اپنی پہلی رنگت کی طرف واپس لوٹ آیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: آپ کے ہاتھ میں اتنا نور اور چمک تھی کہ اس کے ساتھ زمین و آسمان کے مابین ہر شی روشن ہو گئی اور چمکنے لگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کا ہاتھ اتنا سفید نکلتا تھا جیسے برف ظاہر ہوتی ہے اور جب آپ اسے واپس لوٹاتے تو وہ سارے بدن کی رنگت پر واپس لوٹ آتا۔ اور عَلِيْمٌ کا معنی ہے سحر اور جادو جاننے والا۔ مِّنْ اَرْضِكُمْ یعنی تمہارے ملک سے اے قبطیوں کے گروہ، کیونکہ اسے تم پر بنی اسرائیل مقدم ہیں۔

فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ یعنی فرعون نے کہا: اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان رئیسوں کا قول ہے(1)۔ یعنی انہوں نے اکیلے فرعون کو کہا: فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ جیسے جابر حکمرانوں اور رؤساء کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ما ترون فی کذا (تم اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہو)۔ اور یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ قول فرعون اور اس کے ساتھیوں کو کہا ہو۔ اس میں ما محل رفع میں ہے۔ اس بنا پر کہ ذا بمعنی الذی ہو اور اگر ذا اور ما ایک ہی شی ہوں تو پھر ما محل نصب میں ہوگا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ اہل مدینہ، عاصم اور کسائی نے بغیر ہمزہ کے قراءت کی ہے۔ مگر ورش اور کسائی نے ہا کے کسرہ میں اشباع کیا ہے۔ اور ابو عمرو نے ہمزہ کو ساکن اور ہا کو مضموم پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: أرجأته وأرجيته یعنی میں نے اسے مہلت دی۔ اسی طرح ابن کثیر، ابن محیصن اور ہشام نے بھی پڑھا ہے، مگر انہوں نے ہا کے ضمہ میں اشباع کیا ہے۔ اور تمام اہل کوفہ نے ارجہ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فراء نے کہا ہے: یہ عرب کی لغت ہے وہ وصل کلام میں ہا کنایہ پر وقف کرتے ہیں جب کہ اس کا ماقبل متحرک ہو، اسی طرح هذه طلحة قد أقبلت ہے۔ لیکن بصریوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اَرْجِهْ کا معنی ہے تم اسے روک دو(2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اسے مہلت دو(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَرْجِهْ یہ رجا یرجو سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسے لالچ دو اور اسے امید دلا کر چھوڑ دو۔ اسے نحاس نے محمد بن زید سے بیان کیا ہے اور ہا کا کسرہ ماقبل کی اتباع میں ہے اور اصل کی بنا پر اسے ضمہ دینا جائز ہے اور اسے سکون دینا غلطی ہے یہ جائز نہیں مگر شعر میں بطور شاذ ہو سکتا ہے۔ وَ اَخَاهُ اس کا عطف ہا پر ہے۔ حٰشِرِيْنَ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ يَاْتُوْكَ یہ حالت جزم میں ہے، کیونکہ یہ جواب امر ہے اسی لیے اس کے آخر سے نون اعرابی محذوف ہے۔ سوائے حضرت عاصم کے تمام اہل کوفہ نے بِكُلِّ سَحّٰرٍ قراءت کی ہے۔ اور باقی تمام لوگوں نے ساحر پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں باہم متقارب ہیں مگر فعال (سحار) میں مبالغہ زیادہ ہے۔

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 518 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 245 3۔ ایضاً

اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اور آ گئے جادوگر فرعون کے پاس، جادوگروں نے کہا: یقیناً (آج تو) ہمیں بڑا انعام ملنا چاہیے اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آ جائیں۔ فرعون نے کہا: بے شک اور (اس کے علاوہ) تم خاصان بارگاہ سے ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ اس میں بھیجنے کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ سامع کو اس کا علم ہے۔ ابن عبدالحکم نے کہا ہے: وہ بارہ نقیب تھے، ہر نقیب کے ساتھ بیس عریف تھے اور ہر عریف کے ماتحت ایک ہزار جادوگر تھے۔ اور مقاتل بن سلیمان کے قول کے مطابق ان کا سردار شمعون تھا۔ ابن جریج نے بیان کیا ہے: وہ نو سو افراد تھے (1) جو عریش، فیوم اور اسکندریہ سے تین تین سو تعلق رکھتے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے: وہ پندرہ ہزار جادوگر تھے (2)، اور وہب سے مروی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بارہ ہزار تھے (3)۔ ابن المنکدر نے اسی ہزار کہا ہے (4)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چودہ ہزار تھے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے: تین سو ہزار جادوگر ریف سے تعلق رکھتے تھے، تین سو ہزار جادوگر صعید سے تھے۔ اور تین سو ہزار جادوگر فیوم اور اس کے گردونوح سے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ستر آدمی تھے اور تہتر کا قول بھی بیان کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اور روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ رسیاں اور عصا تھے جو تین سو اونٹوں پر لدے ہوئے تھے پس وہ اژدہا ان تمام کو نگل گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب اس نے منہ کھولا تو اس کا جبڑا اسی ذراع ہو گیا وہ اپنے نیچے والے جبڑے کو زمین پر رکھے ہوئے تھا اور اوپر والے جبڑے کو محل کی فصیل پر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے منہ کی وسعت چالیس ذراع تھی۔ واللہ اعلم

پس اس نے فرعون کو نگلنے کا قصد کیا، تو وہ اپنے تخت سے اچھلا اور بھاگ نکلا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہنے لگا، پس جب آپ نے اسے پکڑا تو وہ پہلے کی طرح عصا تھا۔ حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس عصا کے خوف سے پندرہ ہزار افراد فوت ہوئے۔ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی انعام اور مال ہوگا۔ اس میں فقالوا فا کے ساتھ نہیں کہا، کیونکہ مراد یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: لما جاء وا قالوا اور خبر کی بنا پر اسے ان لنا بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ حضرت نافع اور ابن کثیر کی قراءت ہے (یعنی) انہوں نے فرعون پر لازم قرار دیا کہ وہ ان کے لیے مال مقرر کرے اگر وہ غالب آ جائیں، تو فرعون نے انہیں کہا: قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی بے شک (اس کے علاوہ) تم ہمارے نزدیک بلند رتبہ لوگوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پس اس نے ان کے لیے اس سے زیادہ کا اقرار کیا جس کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک انہوں نے اس سے اپنے لیے اپنے فیصلے کے بارے یقین حاصل کیا اگر وہ غالب آ گئے، یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے اجر واجب اور ضروری ہوگا اگر ہم غالب آ گئے۔ باقیوں نے استخبار کی جہت پر استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے فرعون سے اطلاع حاصل کی کیا وہ انہیں کوئی اجر دے گا اگر وہ غالب آ گئے یا نہیں تو پس انہیں اس بارے فرعون پر یقین نہ تھا، تو انہوں نے اس سے پوچھ لیا کیا وہ ایسا کرے گا؟ تو اس نے انہیں کہا ''جی ہاں'' تمہارے لیے اجر بھی ہو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 438 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

گا اور قرب بھی بشرطیکہ تم غالب آجاؤ۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا توتم (پہلے) ڈالو ورنہ ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم ہی ڈالو پس جب انہوں نے ڈالا تو جادو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور خوفزدہ کر دیا انہیں اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا۔ اور ہم نے وحی کی موسیٰ کو کہ ڈال دیجئے اپنا عصا تو فوراً وہ نگلنے لگا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا"۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ادب سے پیش آئے تو یہی ان کے ایمان کا سبب بن گیا اور أن کسائی اور فراء کے نزدیک محل نصب میں ہے، معنی یہ ہے إما أن تفعل الإلقاء (یا آپ ڈالیں) اور اسی کی مثل شاعر کا یہ قول بھی ہے:

قالوا الرکوب فقلنا تلك عادتنا

قَالَ اَلْقُوْا فراء نے کہا ہے: کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا بلاشبہ تم ہرگز اپنے رب پر غالب نہیں آسکو گے اور تم ہرگز اس کی آیات اور نشانیوں کو باطل نہیں کر سکو گے۔ اور یہ قرآن کریم کے اس معجزہ میں سے ہے کہ اس کی مثل لوگوں کا کلام نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اس پر قادر ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے تھوڑے الفاظ بہت زیادہ معانی کو متضمن ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تہدید اور ڈراوا ہے، یعنی تم پہلے ڈالو، پس تم اس ذلت اور رسوائی کو دیکھ لوگے جو تم پر طاری ہوگی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ انہیں جادو کا حکم دیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ حکم اس لیے دیا تا کہ ان کا جھوٹ اور ان کی ملمع سازی ظاہر ہو جائے گی۔ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا پس جب انہوں نے رسیاں اور عصا ڈالے۔ سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ یعنی انہوں نے انہیں وہم میں ڈال دیا اور آنکھوں کو صحیح ادراک کرنے سے بدل دیا، ایسی شے کے ساتھ جس سے ایسی ملمع سازی کا وہم دلایا جاتا ہے جو شعوذۃ اور خفة الید کے قائم مقام ہوتی ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور عظیم کا معنی ہے وہ ان کے نزدیک بڑا تھا، کیونکہ وہ کثیر تھا لیکن وہ فی الحقیقت بڑا نہ تھا۔ ابن زید نے کہا(1) ہے: اجتماع اسکندریہ میں تھا اور سانپ کی دم بحیرہ کے پر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اژدہا نے منہ کھولا اور وہ انہیں نگلنے لگا جو رسیاں اور عصا انہوں نے ڈالے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو رسیاں انہوں نے ڈالی تھیں وہ چمڑے کی تھیں اور ان میں پارہ بھرا ہوا تھا پس انہوں نے حرکت کی اور وہ کہنے لگے یہ سانپ ہیں۔ حفص نے تَلْقَفُ لام کے سکون اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے لَقِفَ يَلْقَفُ کا مضارع بنایا ہے۔ نحاس

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 521

نے کہا ہے: اس قراءت پر تِلْقُف بھی جائز ہے، کیونکہ یہ لَقِفَ سے ہے۔ اور باقیوں نے تشدید اور لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اسے تَلَقَّف کا مضارع بنایا ہے اور یہ (اصل میں) تَتَلَقَّفُ ہے۔ کہا جاتا ہے: لقِفت الشئ وتلقفته جب تو کسی شے کو پکڑ لے یا اسے نگل لے۔ تَلْقَف اور تَلْقَم اور تَلْهَم تمام کا ایک معنی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: مجھے بعض قراءتوں میں تَلَقَّمَ میم اور تشدید کے ساتھ کی خبر پہنچی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أنت عصا موسى التی لم تزلْ　تَلْقَمُ ما یأفِکه الساحرُ(1)

اور تَلْقُفُ بھی روایت کیا جاتا ہے۔ مَا یَأْفِكُوْنَ یعنی اسے جوان کا جھوٹ تھا، کیونکہ وہ رسیاں لے کر آئے اور انہوں نے ان میں پارہ بھر دیا یہاں تک کہ وہ حرکت کرنے لگیں۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"تو ثابت ہو گیا حق اور باطل ہو گیا جو (جادو) وہ کیا کرتے تھے وہ یوں فرعونی مغلوب ہو گئے وہاں (بھرے مجمع میں) اور پلٹے ذلیل و خوار ہو کر۔ اور گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے (اور) کہنے لگے: ہم تو ایمان لے آئے سارے جہانوں کے پروردگار پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا"۔

قولہ تعالیٰ: فَوَقَعَ الْحَقُّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تو حق غالب آ گیا(2)۔ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور اس سے فعل صَغِرَ یَصْغَرُ صَغَرًا و صِغَرًا و صَغَارًا ہے۔ یعنی فرعون کی قوم اور ان کے ساتھ فرعون بھی ذلیل و خوار اور مغلوب ہو کر واپس پلٹے اور رہے جادوگر تو وہ ایمان لے آئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"فرعون نے کہا: تم تو ایمان لائے ہوئے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں (اس کے مقابلہ کی) تمہیں اجازت دیتا، بے شک یہ ایک فریب ہے جو تم نے (مل کر) کیا ہے شہر میں تاکہ تم نکال دو یہاں سے اس کے اصلی باشندوں کو ابھی (اس کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں (پہلے) کٹوا دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مختلف طرفوں سے پھر تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا سب کے سب کو۔ وہ بولے: (پرواہ نہیں) ہم تو اپنے رب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 246　2۔ ایضاً

کی طرف جانے والے ہیں۔ اور تو کیا ناپسند کرتا ہے ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے رب کی آیتوں پر جب وہ آئیں ہمارے پاس، اے ہمارے رب! انڈیل دے ہم پر صبر اور وفات دے ہمیں اس حال میں کہ ہم مسلمان ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ یہ فرعون کی طرف سے ان کا انکار ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا یعنی تمہارے اور ان کے درمیان اس بارے میں اتفاق ہو چکا ہے کہ تم شہر کے والی اور حاکم بن جاؤ، یعنی تمہارے اس صحراء میں ظاہر ہونے سے پہلے یہ مصر کے شہر میں تم میں سے تھا۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ ان کے لیے دھمکی اور جھڑک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: سب سے پہلے فرعون نے سولی دی اور ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹے (1) (یعنی) دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ (یا) دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یہ حسن سے مروی ہے۔

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا حسن نے قاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی تَنْقَمُ) اخفش نے کہا ہے: یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: نَقِمت الأمر و نَقَمته یعنی میں نے اس کا انکار کر دیا۔ (آیت میں مراد یہ ہے) کہ تو ہماری کسی شے کو ناپسند نہیں کرتا سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئے اور وہ حق ہے۔ لَمَّا جَآءَتْنَا جب اس کی آیات اور اس کے دلائل ہمارے پاس آگئے۔ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا اس میں الافراغ کا معنی ہوتا ہے انڈیلنا، یعنی اے ہمارے رب! سولی پر چڑھائے جانے اور ہاتھ پاؤں کاٹے جانے کے وقت ہم پر صبر انڈیل دے۔ وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (اور ہمیں اس حال میں وفات دے کہ ہم مسلمان ہوں) پس کہا گیا ہے کہ فرعون نے جادوگروں کو پکڑا اور دریا کے کنارے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے۔ اور جادوگروں کے ایمان لانے کے وقت چھ لاکھ افراد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

"اور کہا قوم فرعون کے سرداروں نے: (اے فرعون!) کیا تو (یونہی) چھوڑے رکھے گا موسیٰ اور اس کی قوم کو تاکہ فساد برپا کرتے رہیں اس ملک میں اور چھوڑے رہے موسیٰ تجھے اور تیرے خداؤں کو۔ اس نے (برافروختہ ہو کر) کہا: (ہرگز نہیں بلکہ) ہم تہ تیغ کر دیں گے ان کے لڑکوں کو اور زندہ چھوڑ دیں گے ان کی عورتوں کو۔ اور ہم بے شک ان پر غالب ہیں۔ فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 440

استقامت سے کام لو۔ بلاشبہ زمین اللہ ہی کی ہے وارث بناتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے (مخصوص) ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی تا کہ وہ افتراق پیدا کر کے اور معاملات کو بکھیر کر (زمین میں فساد برپا کرتے رہیں)۔ وَيَذَرَكَ اس میں را منصوب ہے اور یہ جواب استفہام ہے اور واؤ فا کے قائم مقام ہے۔ وَاٰلِهَتَكَ حسن نے کہا ہے: فرعون بتوں کی عبادت کرتا تھا، پس وہ خود عبادت کرتا تھا اور اس کی عبادت کی جاتی تھی۔

سلیمان تیمی نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ فرعون گائے کی پوجا کرتا تھا۔ تیمی نے کہا ہے: میں نے حسن سے پوچھا کیا فرعون کسی شے کی عبادت کرتا تھا؟ تو انہوں نے کہا: ہاں، بلاشبہ وہ ایک شے کی عبادت کرتا تھا اور وہ اسے اپنی گردن میں ڈال لیتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَاٰلِهَتَكَ کا معنی ہے وطاعتک (اور وہ چھوڑ دے تجھے اور تیری اطاعت و پیروی کو) جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر)

بلاشبہ انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی بلکہ انہوں نے ان کی اطاعت کی۔ تو یہ تمثیل ہوگئی۔ اور نعیم بن میسرہ نے رفع کے ساتھ ویذرُك پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے وھو یذرُك۔ اور اشہب عقیلی نے وَیَذْرك مجزوم پڑھا ہے اور یذرك میں ضمہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کی گئی ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رفع اور نون کے ساتھ وَنذَرُك پڑھا ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ اس کی عبادت چھوڑ دیں گے اگر اس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ چھوڑا۔

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے والاھتك پڑھا ہے اور اس کا معنی عبادتك (تیری عبادت) ہے۔ اس قراءت کے مطابق اس کی عبادت کی جاتی تھی اور وہ کسی کی عبادت نہ کرتا تھا(1)، یعنی اور وہ تیرے لیے اپنی عبادت چھوڑ دے۔ ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس قراءت والوں کا مذہب یہ ہے کہ فرعون نے جب کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات) اور مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص: 38) تو اس میں اس کے لیے کسی اور رب اور الٰہ ہونے کی نفی ہے۔ تو اسے کہا گیا: ویذرك والاھتك اس کا معنی ہے وہ تجھے اور تیرے لیے لوگوں کی عبادت کو چھوڑ دے گا۔ اور عام قراءت وَاٰلِهَتَكَ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ اس معنی پر مبنی ہے کہ فرعون نے اپنے ظاہری حکم میں ربوبیت کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ خود جانتا تھا کہ وہ مربوب ہے اور اس کی دلیل حمام (موت) کی حاضری کے وقت اس کا یہ قول ہے اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ (یونس: 90) (میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل)

لیکن اس کا یہ قول قبول نہ کیا گیا، کیونکہ اس نے یہ اقرار توبہ کا دروازہ بند ہونے کے بعد کیا۔ اور اس حال سے پہلے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 441

الٰہ تھا جس کی وہ خفیہ عبادت کرتا تھا اور رب العالمین جل وعزا کے سوا تھا۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں الفاظ یہ ہیں۔ اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض وقد ترکوک ان یعبدوک اور یہ بھی کہا ہے کہ الفاظ والا ھتلک ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ گائے کی پرستش کرتا تھا، جب اس نے گائے کو حسین اور خوبصورت دیکھا تو اس نے اس کی عبادت کا حکم دے دیا اور کہا: انا ربکم و رب ھذہ (میں تمہارا اور اس کا رب ہوں) اور اسی لیے کہا: فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا (طٰہٰ:88) (پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کے چھوٹے چھوٹے بت تھے اس کی قوم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کی پرستش کرتی تھی تو اسی کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔ اور اسی لیے اس نے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات) اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: فرعون کا قول: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور شی کی عبادت کرتے تھے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت کے مطابق بالالاھۃ سے مراد وہ گائے ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے مراد سورج لیا ہے اور وہ اس کی عبادت کرتے تھے (1)۔ شاعر نے کہا ہے:

واعْجَلْنَا الإلاهةَ أَنْ تَؤُبَا

پھر اس نے اپنی قوم کے ساتھ اظہار انس کیا اور کہا: سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ نافع اور ابن کثیر نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لیے تشدید کے ساتھ سنقتل پڑھا ہے۔

وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (اور ہم ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیں گے) لہٰذا تم ان کی جانب سے خوفزدہ نہ ہو۔ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (اور بے شک ہم ان پر غالب ہیں) اس کلام کے ساتھ اس نے انہیں حوصلہ اور تسلی دی۔ اور اس نے یہ نہیں کہا سنقتل موسیٰ (کہ ہم موسیٰ کو قتل کر دیں گے) کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سخت مرعوب تھا، پس جب بھی وہ آپ کو دیکھتا تو وہ اس طرح پیشاب کرنے لگتا جیسے گدھا پیشاب کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تک فرعون کی یہ بات پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ یعنی آپ نے انہیں یہ حرص اور امید دلائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں سرزمین مصر کا وارث بنائے گا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ یعنی جنت اس کے لیے ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور عاقبۃ کل شی سے مراد ہر شے کا انجام اور آخر ہوتا ہے، لیکن جب یہ لفظ مطلق بولا جائے اور کہا جائے: العاقبۃ لفلان تو اس سے عرف میں خیر اور اچھائی سمجھی جاتی ہے۔ (یعنی خیر اور اچھائی فلاں کے لیے ہے)

قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۟

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 524

''قوم موسیٰ نے کہا: ہم تو ستائے گئے اس سے پہلے بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس اور اس کے بعد بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس، آپ نے کہا: عنقریب تمہارا رب ہلاک کر دے گا تمہارے دشمن کو اور (ان کا) جانشین بنا دے گا تمہیں زمین میں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْۤا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: ہم تو آپ کی ولادت کی ابتدا میں بیٹوں کو قتل اور عورتوں کو غلامی میں رکھنے کے ساتھ ستائے گئے۔ وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اور اب اسے ہم پر لوٹایا جا رہا ہے، ان کی مراد وہ دھمکی اور وعید ہے جو فرعون کی جانب سے تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے کی اذیت سے مراد یہ ہے(1) کہ وہ نصف دن تک بنی اسرائیل کو اپنے کاموں میں لگائے رکھتے تھے اور پھر بقیہ دن انہیں اپنی کمائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اور بعد کی اذیت یہ تھی کہ وہ سارا دن بغیر کچھ کھلائے پلائے انہیں اپنے کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ یہ جویبر نے کہا ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے: پہلے اور بعد کی اذیت ایک ہی تھی اور وہ ان سے جزیہ لیتا تھا۔

قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ، عَسٰی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بمعنی واجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نیا وعدہ کیا اور اسے ثابت کر دیا۔ تحقیق وہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں مصر میں خلیفہ بنائے گئے۔ اور انہوں نے یوشع بن نون کے ساتھ بیت المقدس کو فتح کیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے یہ اس وقت کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں نکالا اور فرعون نے ان کا تعاقب کیا پس وہ ان کے پیچھے تھا اور ان کے سامنے سمندر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس وعید کو پورا کر دیا کہ فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا اور انہیں نجات عطا فرما دی۔ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔ یعنی پھر وہ اس عمل کو دیکھے گا جس کے بدلے جزا واجب ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزا نہیں دے گا جو وہ ان کے بارے جانتا ہے، بلکہ اس پر جزا دے گا جو ان سے وقوع پذیر ہوگا۔

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝

''اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی سے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ سنین سے مراد قحط سالی ہے اور لغت میں یہ معنی معروف ہے۔ کہا جاتا ہے: أصابتهم سَنَة، أي جَدْب (انہیں قحط سالی آ پہنچی) اور تقدیر ہے جَدْبُ سنة اور حدیث مبارکہ میں ہے: اللّٰهُمَّ اجعلها عليهم سِنِين كسِنِي يوسف (2) (اے اللہ! ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے قحط کی طرح قحط مسلط کر دے) عربوں میں سے کچھ ہیں جو سنین کے نون کو اعراب دیتے ہیں۔ فراء نے شعر بیان کیا ہے:

أرَى مَرَّ السنينِ أخَذْنَ مِنّي   كما أخَذَ السِّرار من الهلال

نحاس نے کہا ہے: سیبویہ نے یہ شعر نون کے فتحہ کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن اس بارے میں وہ کہا ہے جو کسی اور کے نزدیک جائز نہیں ہے اور وہ یہ قول ہے:

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 188
2۔ صحیح بخاری، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136

وقد جَاوَزْتُ رأسَ الأربعینِ (یعنی اس اربعین کی نون کو کسرہ دیا ہے)

فراء نے بنی عامر سے بیان کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: أقمتُ عندہ سِنِینًا یا ھذا، اس میں سنین منصرف ہے۔ اور بنو تمیم اسے غیر منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: مضت لہ سنینُ یا ھذا اور سنین سنۃ کی جمع ہے اور یہاں سنۃ بمعنی قحط سالی ہے بمعنی حول (سال) نہیں۔ اور اسی سے أسْنَتَ القومُ ہے یعنی وہ قحط میں مبتلا ہو گئے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيدَ لقومه　　ورجالُ مكةَ مُسْنِتُون عِجَافُ

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور ان کے دل نرم ہو جائیں۔

فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ أَلَآ إِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٣١

''تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور تو) کہتے ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے، سن لو! ان کی بدفالی تو (مکافات عمل کے قانون کے مطابق) اللہ کے پاس سے ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ یعنی جب ان پر خوشحالی اور وسعت آئی۔ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ یعنی ہم اس کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیں عطا کی گئی ہے۔ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ اور اگر انہیں قحط اور کوئی بیماری آ پہنچتی۔ اور یہی دوسرا مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدفالی پکڑتے (1)، اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ (النساء: 78)

يَّطَّيَّرُوْا اصل میں یتطیروا ہے پھر تا کو طا میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے فعل ماضی کی بنا پر تطیروا پڑھا ہے۔ اس میں اصل تو الطیرۃ اور زجر الطیر (پرندے کو جھڑکنا) سے ہے۔ پھر ان کا استعمال زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ ہر بدفالی کو تطیر کہا گیا۔ عرب سانح سے برکت حاصل کرتے تھے اور سانح سے مراد وہ ہے جو دائیں طرف سے آتا ہے اور وہ بارح سے بدفالی پکڑتے تھے اور اس سے مراد وہ ہے جو بائیں طرف سے آتا ہے (2)۔ وہ کوے کی آواز سے بھی بدفالی پکڑتے تھے۔ اور وہ اس سے جدائی اور افتراق کی تاویل کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے اپنے اوقات مقررہ کے علاوہ آوازیں نکالنے سے بھی۔ اور اسی طرح ہرن سے جب کہ وہ دائیں یا بائیں گزرتا اور جب وہ بائیں گزرتا تو کہتے: میرے لیے بائیں طرف سے آنے والے کے بعد دائیں طرف سے آنے والا کون ہے؟ مگر جو چیز ان کے نزدیک زیادہ قوی تھی وہ تمام پرندوں میں واقع تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ان تمام کا نام تطیر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443　　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 190

رکھا۔ اور عجمی لوگ فال پکڑتے تھے جب وہ کسی بچے کو دیکھتے کہ اسے صبح کے وقت معلم کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ اور اس بچے کو دیکھ کر برکت حاصل کرتے تھے جو معلم کے پاس سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہا ہوتا۔ اور وہ اس پانی بھرنے والے (ماشکی) کو دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے جس کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا منہ بند مشکیزہ ہوتا اور اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے جس کا مشکیزہ فارغ اور اس کا منہ کھلا ہوتا۔ اور وہ اس قلی کو دیکھ کر جو بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا اور وہ جانور جس پر بوجھ لدا ہوتا اسے دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے اور جس قلی نے اپنا بوجھ اتار دیا ہوتا اور وہ جانور جس سے بوجھ اتار لیا جاتا اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے۔ پس دین اسلام آیا تو اس نے فال پکڑنے اور بدفالی سے منع کر دیا جو پرندے کی آواز سن کر پکڑی جاتی تھی چاہے وہ آواز جو بھی ہو اور جس حال میں ہو۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: أَقِرُّوا الطیرعلی مِکنَاتِها(1) (پرندے کو اپنے انڈوں پر بٹھائے رکھو) اور یہ اس لیے فرمایا کیونکہ بہت سے زمانہ جاہلیت کے لوگ تھے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتے تو وہ پرندے کے پاس اس کے گھونسلے میں آتے اور اسے وہاں اڑاتے۔ پس جب وہ اپنی اڑان میں دائیں سمت اختیار کرتا تو وہ اپنے کام کو چلے جاتے اور یہی ان کے نزدیک سانح (دائیں جانب سے آنے والا) ہے اور اگر وہ بائیں سمت اڑتا تو وہ واپس لوٹ جاتے اور یہی ان کے نزدیک بارح (بائیں جانب سے آنے والا) ہے چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرما دیا: أَقِرُّوا الطیرعلی مِکنَاتِها(2) حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور اہل عرب کہتے ہیں: وُکُناتِها امرؤالقیس نے کہا ہے:

وقد أغتَدِی والطَّیرُفی وُکناتِها

اور الوکنۃ ہر گھونسلے کا نام ہے اور الوکن سے مراد پرندے کی وہ جگہ ہے جہاں وہ انڈے دیتا ہے اور بچے جنتا ہے۔ اور وہ کسی دیوار اور درخت میں کوئی سوراخ یا بل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وَکَنَ الطائرُ یَکِنُ وُکُونًا جب پرندہ اپنے انڈوں کو سی رہا ہو۔ اور عربوں میں سے ایسے بھی تھے جو فال کو کچھ نہ جانتے تھے۔ اور اسے جھٹلانے والوں کی تعریف کرتے تھے۔ مرقش نے کہا ہے:

ولقد　غَدَوْتُ　وکنتُ　لا　أغدُوا　علی　وَاقٍ　و　حاتم

فإذا　الأشائِمُ　کالأیا　مِنِ　والأیامِنُ　کالأشائم

اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو ایک پرندہ چیختے چلاتے گزرا، تو قوم کے ایک آدمی نے کہا: خیر، خیر (بہت اچھا، بہت اچھا) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ماعند ھذا لا خیرٌ ولا شرٌّ (اس کے پاس نہ خیر ہے اور نہ شر)

ہمارے علماء نے کہا ہے: جہاں تک پرندوں کی گفتگو ہے تو اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا جس پر بطور دلالت اسے محمول کیا جاتا ہے اور ان کے پاس کسی شے کے ہونے کا علم ہے چہ جائیکہ وہ مستقبل میں ہونے والی کسی شے کی خبر دیں اور نہ ہی لوگوں میں کوئی ہے جو پرندوں کی بولی جانتا ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کے لیے خاص کیا،

1۔ مسند امام احمد، جلد 6، صفحہ 381　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب العقیقۃ، حدیث نمبر 2452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس فال پکڑنا مکمل طور پر باطل ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لیس مِنّا من تحلم او تکھن أو ردّہ عن سفرہ تطیر (وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے خواب کے بارے جھوٹا دعویٰ کیا یا کہانت اختیار کی (غیب کی بات بتانا) یا بدفالی نے اسے اپنے سفر سے واپس لوٹا دیا)

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فال پکڑنا شرک ہے، تین، اور وہ ہمیں پیش نہیں آتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے توکل کے سبب ختم کر دیتا ہے'' (1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: ''جسے بدفالی نے اپنے کام سے واپس لوٹا دیا تحقیق اس نے شرک کیا''۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ اس کا کفارہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: أن یقولَ أحدُهم اللّٰهُمَّ لا طیرَ إلا طیرك ولا خیرَ إلا خیرك ولا إلٰه غیرك ثم یمضی لحاجته (2) (کہ ان میں سے کوئی یہ کہے: اے اللہ! کوئی فال نہیں سوائے تیری فال کے اور کوئی خیر نہیں سوائے تیری خیر اور بھلائی کے اور تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں یہ کہہ کر پھر وہ اپنے کام کو چلا جائے)

اور ایک دوسری روایت میں ہے: جب تم میں سے کوئی ایسا وہم پائے تو اسے یہ کہنا چاہیے: اللّٰهُمَّ لا یأتی بالحسنات إلا أنت ولا یذهب بالسیئات إلا أنت لا حولَ ولا قوّةَ إلا بك (3) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی نیکیاں لانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی برائیوں کو مٹانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی طاقت اور قوت نہیں) پھر وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنے کام کو چلا جائے تو جو بھی وہ اپنے دل میں اس بارے پائے گا اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا اور جو شے اسے وہم ڈالے گی اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو گا۔ اور فال اور طیرہ میں فرق سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ حسن نے طَیْرُهم پڑھا ہے اور یہ طائر کی جمع ہے یعنی جو ان کے لیے اور ان کے خلاف مقدر کیا گیا ہے (اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے) وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی انہیں جو قحط سالی اور مصائب لاحق ہوئے ہیں وہ بلاشبہ ان کے گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی طرف سے نہیں۔

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور انہوں نے کہا: کیسی ہی تو لے آئے ہمارے پاس نشانی (معجزہ) تا کہ تو جادو کرے ہم پر اس سے ہرگز نہیں ہم تم پر ایمان لانے والے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ یعنی فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: مهما۔ خلیل نے کہا ہے: یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکہانۃ والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ ایضاً، حدیث نمبر 3411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ابن ماجہ، حدیث نمبر 3527، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مجمع الزوائد، کتاب الطب، جلد 5، صفحہ 180، حدیث نمبر 8412
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکہانۃ والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ حدیث نمبر 3418، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصل میں ما، ماہے(1)۔ پہلا ما شرطیہ ہے اور دوسرا زائدہ ہے جو جزا کے لیے بطور تاکید ہے، جیسا کہ تمام حروف میں زیادتی کی جاتی ہے، مثلاً أما، حیثما، أینما اور کیفما پس علمائے نحو نے ایسے دوحرفوں کو ناپسند کیا جن کا لفظ ایک ہے، تو انہوں نے پہلے کے الف کو ہا سے بدل دیا اور کہا: مهما۔

کسائی نے کہا ہے: اس کی اصل مہ معنی اکفف ہے، رک جا جو بھی تو ہمارے پاس نشانی لے آئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کلمہ مفردہ ہے۔ اس کے ساتھ جزا لائی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے مابعد کو بر تقدیر ان جزم دے۔ آیت میں جواب شرط فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ہے۔ لِّتَسْحَرَنَا تاکہ تو ہمیں اس نظریہ سے پھیر دے جس پر ہم ہیں۔ اس لفظ کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے سجدہ میں گرنے کے بعد بیس برس تک قبط میں رہے اور انہیں معجزات (نشانیاں) دکھاتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا، پس یہ ان کا قول تھا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۱۳۳

''پھر بھیجا ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون (یہ سب) واضح نشانیاں تھیں پھر بھی وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ (پیشہ ور) مجرم تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اسرائیل نے سماک کے واسطہ سے نوف شامی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آنے کے بعد آل فرعون میں چالیس برس تک ٹھہرے رہے۔ اور محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے منجاب سے بیس سال کا عرصہ روایت کیا ہے، آپ انہیں نشانیاں یعنی ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون کے معجزات دکھاتے رہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: الطُّوْفَانَ اس سے مراد شدید بارش ہے(2) یہاں تک کہ وہ اس میں تیرنے لگے۔ حضرت مجاہد اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ طوفان سے مراد موت ہے(3)۔ اخفش نے کہا ہے: اس کا واحد طوفانة ہے(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا کہ رجحان اور نقصان مصدر ہیں، پس اس کے لیے واحد کا کوئی مطالبہ نہیں۔

نحاس نے کہا ہے: لغت میں طوفان وہ ہے جو ہلاک کرنے والا ہو چاہے وہ صوت ہو یا سیلاب، یعنی وہ ان پر چکر لگاتا رہا اور انہیں ہلاک کرتا رہا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بنی اسرائیل کو اس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پہنچا، بلکہ وہ قبطیوں کے گھروں میں داخل ہوا یہاں تک کہ وہ اپنی ہنسلیوں تک پانی میں کھڑے رہے۔ اور وہ پانی مسلسل سات دن تک ان پر رہا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ چالیس دن تک رہا۔ تب انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرما دے تو ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس آپ نے رب کریم سے دعا کی تو اس نے ان سے طوفان کو اٹھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 444
3۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 40
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443

لیا لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سال ان کے لیے گھاس اور فصلوں میں وہ کچھ اگایا جو اس سے پہلے نہ اگا یا تھا، تو وہ کہنے لگے: وہ پانی تو نعمت تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈی کو بھیج دیا اور یہ ایک معروف حیوان ہے، جراد مذکر و مونث دونوں صورتوں میں جرادۃ کی جمع ہے پس اگر تو ان کے درمیان فرق کرنا چاہے تو پھر صفت لگانا پڑے گی اور تو یہ کہے گا رأیت جرادۃ ذکرا (میں نے نرٹڈی کو دیکھا) پس وہ ان کے پھلوں اور کھیتیوں سبھی کو کھا گئی یہاں تک کہ وہ چھتوں اور دروازوں کو کھانے لگی اور ان کے گھر گرنے لگے، لیکن بنی اسرائیل کے گھروں میں اس میں سے کوئی شے داخل نہ ہوئی۔

مسئلہ نمبر 3۔ ٹڈی کو مارنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جب وہ کسی زمین میں آئے اور اسے خراب کرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے: اسے نہیں مارا جائے گا۔ اور تمام علمائے فقہ نے کہا ہے: اسے مار دیا جائے گا۔ فریق اول کا استدلال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بہت بڑی مخلوق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتی ہے اور اس پر قلم نہیں چلتا۔

اور اس وجہ سے بھی کہ یہ روایت ہے ''تم ٹڈی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ الاعظم کا لشکر ہے'' (1)۔

اور جمہور نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اسے چھوڑنے میں اموال کا فساد ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو قتل کرنے کی رخصت دی ہے جب وہ کسی کا مال لینا چاہے، پس ٹڈی جب اموال کو برباد کرنے کا ارادہ کرے تو بدرجہ اولیٰ اسے قتل کرنا جائز ہوگا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ سانپ اور بچھو کو مارنا جائز ہے؟ کیونکہ وہ دونوں لوگوں کو اذیت دیتے ہیں پس اسی طرح ٹڈی بھی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ٹڈی کے خلاف دعا کرتے تو اس طرح کہتے: اَللّٰهُمَّ أهلك كبارہ وأقتل صغارہ وأفسد بيضه أقطع دابرہ وخذ بأفواهه عن معايشنا وأرزاقنا إنك سميع الدعاء (اے اللہ! اس کے بڑوں کو ہلاک کردے اور اس کے چھوٹوں کو قتل کردے اور اس کے انڈوں کو فاسد کردے اور اس کے پیچھے آنے والوں کو قطع کردے اور اس کے مونہوں سے ہماری معیشت اور ہمارے رزق لے لے بے شک تو دعا کو سننے والا ہے)

ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کے خلاف اس کی دم کٹ جانے کی دعا کیسے کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''بے شک ٹڈی سمندر میں ایک مچھلی کی چھینک (سے پیدا شدہ) ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم سات غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور ہم آپ کے ساتھ ٹڈی کھاتے رہے (3)۔ المختصر اس کے کھانے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ جب اسے کوئی زندہ پکڑ لے اور اس کا سر کاٹ دیا جائے تو یہ بالاتفاق حلال ہے۔ اور یہ اس کو ذبح کرنے کے قائم مقام ہو جاتا ہے، البتہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کیا آدمی اس کے سبب موت کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے جب اسے شکار کیا جائے یا نہیں؟۔

1۔ شعب الایمان فی محنۃ الجراد والصبر علیہا، جلد 7، صفحہ 232، حدیث نمبر 10127

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3211، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 152

تو عام رائے یہی ہے کہ سبب موت جاننے کی ضرورت نہیں، اسے کھایا جائے گا جیسے بھی یہ مرے۔ ان کے نزدیک اس کا حکم مچھلی کے حکم کی مثل ہے۔ یہ نظریہ ابن نافع اور مطرف کا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ سبب موت جاننا لازم اور ضروری ہے، مثلاً اس کے سر کا کٹنا یا پاؤں کا یا اس کے پروں کا کٹ جانا، جب کہ اس کی موت اس سبب سے ہو یا اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ آپ کے نزدیک وہ خشکی کا جانور ہے اور اس کا مردار حرام ہے۔ حضرت لیث مردہ ٹڈی کھانا مکروہ جانتے تھے، مگر جب کوئی اسے زندہ پکڑے پھر وہ مرجائے تو بے شک اسے پکڑنا ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ یہی نظریہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ (1) سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں مچھلی اور ٹڈی اور دو خون (حلال کیے گئے ہیں) جگر اور تلی''۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے: احمد بن منیع، سفیان بن عیینہ نے ابو سعید سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ٹڈی بڑی طشتری میں رکھ کر ایک دوسرے کو بطور ہدیہ دیتی تھیں (2)۔ اسے ابن منذر نے بھی ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ محمد بن منکدر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہزار امتیں پیدا فرمائی ہیں ان میں سے چھ سو سمندر میں ہیں اور چار سو خشکی میں ہیں۔ اور بلاشبہ ان امتوں میں سے سب سے پہلے ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے پس جب ٹڈی ہلاک ہوجائے گی تو باقی امتیں موتیوں کی لڑی کی مثل اس کے پیچھے آئیں گی جب وہ کٹ جائے''۔ اسے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا: بلاشبہ ان امتوں میں سب سے اول ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے، کیونکہ اسے اس مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے فالتو بچی تھی۔ پھر آدمیوں کے ہلاک ہونے کی وجہ سے وہ امتیں ہلاک ہوجائیں گی کیونکہ یہ ان کے لیے مسخر ہے۔

ہم قبط کے قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں پس انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معاہدہ کیا کہ اگر ان سے ٹڈی کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس آپ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اسے دور کر دیا گیا۔ اور ان کی کھیتیوں میں سے ابھی کچھ چیزیں باقی تھیں، تو وہ کہنے لگے: جو باقی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہوگا۔ اور وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جوئیں بھیج دیں۔ اور یہ چھوٹا سا کیڑا ہے۔ یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور الدبی سے مراد اڑنے سے پہلے کی ٹڈی ہے۔ اس کی واحد دباۃ ہے۔ جب کوئی کیڑا زمین کی نباتات کھا جائے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: أرض مدبیۃ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمل سے مراد وہ سوس (گھن) ہے جو گندم میں ہوتا ہے (3)۔ ابن زید نے کہا (4) ہے: اس سے مراد براغیث (مچھر)

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الصید والذبائح، جلد 4، صفحہ 272

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 444

4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 191

ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے کیڑے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد حمنان ہے اور یہ چچڑی کی ایک قسم ہے، اس کا واحد حمنانة ہے۔ پس یہ ان کے جانوروں اور ان کی کھیتیوں کو کھا گئی۔ اور ان کی جلد کے ساتھ چمٹ گئی، گویا کہ یہ ان پر چیچک ہے اور اس نے انہیں سونے اور قرار حاصل کرنے سے روک دیا۔ اور حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: قمل سے مراد جعلان ہے (یعنی سیاہ رنگ کا کیڑا) اور اہل لغت کے نزدیک قمل چچڑیوں کی ایک قسم ہے۔

ابوالحسن اعرابی عدوی نے کہا ہے: قمل چچڑی کی جنس سے ایک چھوٹا سا کیڑا ہے، لیکن یہ اس سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کی واحد قملة ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس کے خلاف نہیں ہے جو اہل تفسیر نے کہا ہے، کیونکہ یہ مراد لینا جائز ہے کہ یہ تمام اشیاء ان پر بھیجی گئی ہوں اور یہ تمام انہیں اذیت پہنچانے کے اعتبار سے جمع ہو سکتی ہیں۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ عین شمس (اس وقت مصر کا دارالخلافہ) میں ریت کا ایک ٹیلہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا عصا مارا تو وہ قمل (جوئیں) بن گیا۔ قمل کی واحد قملة ہے۔ عطا خراسانی نے کہا ہے: اسے قُمَّلُ اور قُمْلُ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

اور حسن کی قرات میں ہے والقَمْل یعنی قاف مفتوح اور میم ساکن ہے۔ پس وہ عجز و زاری کرنے لگے لیکن جب ان سے اسے دور کر دیا گیا تو وہ پھر ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈک مسلط کر دیئے۔ ضفادع، ضفدع کی جمع ہے۔ اور یہ وہ معروف جانور ہے جو پانی میں ہوتا ہے (اور اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے)

کہ انہیں مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے امام احمد بن حنبل سے، انہوں نے عبدالرزاق سے اور ابن ماجہ نے محمد بن یحییٰ نیشاپوری ذہلی سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرد (موٹے سر سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندہ کو شکار کرتا ہے۔ لٹورا) مینڈک، چیونٹی اور ہدہد کو مارنے سے منع فرمایا ہے (1)۔

نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ ایک حکیم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دوا میں مینڈک کا ذکر کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اس کے مارنے سے منع فرمایا (2)۔ اسے ابومحمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صرد پہلا پرندہ ہے جس نے روزہ رکھا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف بنانے کے لیے شام سے حرم پاک کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھ سکینہ (تیز رو ہوا) اور صرد تھے، پس صرد نے مخصوص جگہ کی طرف آپ کی رہنمائی کی اور سکینہ نے اس کی مقدار کی طرف، پس جب آپ اس خاص جگہ تک پہنچے تو سکینہ بیت اللہ شریف کی جگہ پر چلی اور پکار کر کہا: اے ابراہیم! میرے سائے کی مقدار پر (گھر) تعمیر کر دے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرد کو مارنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیت اللہ شریف پر راہنمائی کی اور مینڈک کو مارنے سے منع کیا، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی جانے والی آگ پر پانی ٹپکاتا تھا۔ اور جب یہ فرعون پر مسلط ہوئے تو یہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3213-3214، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، کتاب ابواب السلام، باب فی قتل الذر، حدیث نمبر 4583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 201۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب النوم، باب قتل الضفدع، حدیث 4585، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے اور تمام جگہوں پر چھا گئے۔ جب یہ تنور کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وہاں بھی ڈیرہ ڈال لیا حالانکہ ان میں آگ بھڑک رہی تھی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو تسبیح بنا دیا۔ کہا جاتا ہے: تمام جانوروں سے زیادہ یہ تسبیح کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تم مینڈک کو نہ مارو، کیونکہ اس کی وہ آواز جو تم سنتے ہو وہ تسبیح ہے۔

پس روایت ہے کہ اس (مینڈک) نے ان کے بستروں، برتنوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو بھر دیا تھا ایک آدمی اپنی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا اور جب وہ بات کرتا تو مینڈک اچھل کر اس کے منہ میں داخل ہو جاتا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا اور کہنے لگے: ہم توبہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انہیں دور کر دیا لیکن وہ دوبارہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر خون بھیجا تو ان پر نیل خون بن کر بہنے لگا۔ اسرائیل اس سے پانی کے چلو بھرتے تھے اور قبطی خون کے۔ اسرائیلی قبطی کے منہ میں پانی انڈیلتا تھا تو وہ خون ہو جاتا تھا۔ اور قبطی اسرائیلی کے منہ میں خون انڈیلتا تھا تو وہ میٹھا اور لذیذ پانی ہو جاتا تھا۔

اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ یعنی ظاہر اور بین علامات، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ، حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے ایک نشانی ظاہر کی تھی اور وہ ایک نشانی آٹھ دن تک رہی۔ بعض نے کہا ہے: چالیس دنوں تک رہی۔ اور بعض نے کہا ہے: ایک مہینہ تک رہی پس اسی لیے فرمایا: مُّفَصَّلٰتٍ، فَاسْتَكْبَرُوْا پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے سے تکبر کرتے رہے۔

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اور جب آجاتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے: اے موسیٰ! دعا کر ہمارے لیے اپنے رب سے اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم ہٹا دو گے ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کر دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ پھر جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب ایک مقررہ میعاد تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے تو فوراً انہوں نے (توبہ کا عہد) توڑ دیا۔ پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے اور غرق کر دیا انہیں سمندر میں کیونکہ انہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور وہ اس (آنے والے) عذاب سے بالکل غافل تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ اس میں رجز کا معنی عذاب ہے۔ اسے را کے ضمہ کے ساتھ رُجز بھی پڑھا گیا ہے، اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ عذاب طاعون تھا اس کے ساتھ ستر ہزار قبطی ایک دن میں

1۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 2، صفحہ 253

مرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجز سے مراد وہی آیات اور نشانیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اس میں ما معنی الذی ہے، یعنی اس کے سبب جس کا علم اس نے آپ کو ودیعت فرمایا یا اس کے سبب، جس کے ساتھ اس نے آپ کو مخلص فرمایا ہے اور آپ کو آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ قسم ہے، یعنی اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے مگر تم نے ہمارے لیے دعا نہیں کی، پس ماصلہ ہے۔ **لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ** یعنی اگر آپ اپنے اللہ سے دعا کریں یہاں تک کہ وہ ہم سے (عذاب کو) دور فرما دے۔

لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ تو ہم یقیناً اس دین کے بارے آپ کی تصدیق کریں گے جو لے کر آپ تشریف لائے۔ **وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ** (اور ہم ضرور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ روانہ کر دیں گے) وہ ان سے خدمت لیتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ یعنی ان کی وہ مدت جو ان کے لیے غرق کرنے کے بارے مقرر کی گئی تھی۔ **اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ** تو فوراً انہوں نے وہ عہد توڑ دیا جو انہوں نے اپنے بارے میں کیا تھا۔ **فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ** اس میں یم کا معنی سمندر ہے۔ **وَكَانُوْا عَنْهَا** اور اس عذاب سے غافل تھے (یعنی ہا ضمیر سے مراد النقمۃ عذاب ہے) اور اس پر **فَانْتَقَمْنَا** دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہا ضمیر سے مراد آیات ہیں یعنی انہوں نے ان کا اعتبار نہ کیا یہاں تک کہ وہ ان سے غافلوں کی طرح ہو گئے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنایا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور پورا ہو گیا آپ کے پروردگار کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے متعلق بوجہ اس کے کہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے برباد کر دیا جو کیا کرتا تھا فرعون اور اس کی قوم اور (برباد کر دیئے) جو بلند مکان وہ تعمیر کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: **وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ** اس میں قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ **الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ** جنہیں خدمت لینے کے سبب ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ **مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا** کسائی اور فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ اصل میں فی مشارق الارض و مغاربھا تھا پھر اس سے فی کو حذف کر دیا گیا اور انہیں نصب دے دی گئی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ سرزمین قبط کے وارث بنے اور یہ دونوں مفعول صریح کے طور پر منصوب ہیں۔ کہا جاتا ہے: ورثت المال (میں مال کا وارث بنا) واورثتہ المال (میں نے اسے مال کا وارث بنایا) پس یہ فعل ہمزہ کے ساتھ متعدی ہو گیا اور اس نے دو مفعولوں کو نصب دی۔ اور الارض سے مراد شام و مصر کی زمین ہے۔ اور مشارقھا و مغاربھا سے مراد اس کی شرق و غرب کی جہتیں ہیں۔ پس

اس میں الارض مخصوص ہے۔ یہ حسن اور قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ساری زمین ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہ دونوں پوری زمین کے بادشاہ تھے۔ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا یعنی اس میں ہم نے کھیتیاں، پھل اور نہریں نکال کر برکت رکھ دی۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وہ یہ ارشاد ہے: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ (القصص) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث)

بِمَا صَبَرُوْا یعنی ان کے اس صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے فرعون کی اذیت اور ستانے پر کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کیا۔ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ کہا جاتا ہے: عَرَشَ يَعْرِشُ (1) جب وہ تعمیر کرے، بنائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یعنی جو وہ محلات اور بلند مکان وغیرہ تعمیر کرتے تھے ہم نے انہیں برباد کر دیا (2)۔

اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد بیلوں کو بلندی پر چڑھانا ہے۔ ابن عامر اور ابوبکر نے عاصم سے را کے ضمہ کے ساتھ يَعْرُشُون پڑھا ہے (3)۔ کسائی نے کہا ہے: یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابراہیم بن ابی عبلہ نے يُعَرِّشون یعنی را کو مشدد اور یا کو مضموم پڑھا ہے۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور ہم نے پار اتارا بنی اسرائیل کو سمندر سے تو گزرے وہ ایک ایسی قوم پر جو مگن بیٹھے تھے اپنے بتوں کی عبادت میں، بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! بناؤ ہمارے لیے بھی ایک (ایسا) خدا جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا: یقیناً تم جاہل (اور بے سمجھ) لوگ ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ حمزہ اور کسائی نے کاف کو کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: عَكَفَ يَعْكِفُ ويَعْكُفُ اس کا معنی ہے کسی شے پر قائم رہنا اور اسے لازم پکڑنا۔ دونوں بابوں سے اس کا مصدر مفعول کے وزن پر آتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قوم لخم تھی اور وہ رقہ میں اترے ہوئے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے بت گائے کے مجسمے تھے (4)، اسی لیے سامری نے ان کے لیے بچھڑا نکالا تھا۔ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اسی کی مثل عرب جہلاء کا قول ہے درآنحالیکہ انہوں نے کفار کا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 194
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 55
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 532
4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 194

ایک سبز درخت دیکھا تھا اس کا نام ذات انواط تھا وہ ہر سال میں ایک دن اس کی تعظیم کرتے تھے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے لیے ایک ذات انواط بنا دیں جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اکبر۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم نے اسی طرح کہا جیسے قوم موسیٰ نے کہا تھا: اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (1) یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقہ پر پورے پورے چلو گے حتی کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم بھی اس میں داخل ہو گے''۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حنین کی طرف نکلنے کے دوران واقعہ پیش آیا۔ اس کا بیان سورۂ براۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۹ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۴۰

''بے شک یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں تباہ ہو کر رہیں گے اور باطل ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: کیا بغیر اللہ کے میں تلاش کروں تمہارے لیے کوئی اور خدا حالانکہ اسی نے فضیلت دی ہے تمہیں سارے جہانوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ، متبر بمعنی مهلك (ہلاک کیا گیا) ہے اور تبار بمعنی ہلاک) ہے (2)۔ ہر ٹوٹا ہوا برتن متبر کہلاتا ہے۔ اور أمر متبر (تباہ حال معاملہ) یعنی بلاشبہ عابد اور معبود ہلاک ہو کر رہیں گے۔ اور قولہ وَ بٰطِلٌ یعنی ختم ہو جانے والا اور اڑ جانے والا ہے۔ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس میں کانو اصلہ زائدہ ہے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا یعنی آپ نے فرمایا: کیا میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا تلاش کروں؟ کہا جاتا ہے: بغیته و بغیتُ له (میں نے اسے چاہا اور اس کے لیے طلب کیا) وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ یعنی حالانکہ اسی نے تمہیں تمہارے زمانے کے عالمین پر فضیلت دی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ اور ان آیات اور نشانیوں کے ساتھ جن کے ساتھ انہیں خاص فرمایا انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۱۴۱

''اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے جو چکھاتے تھے تمہیں سخت عذاب، مار ڈالتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی''۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے احسانات یاد دلائے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو خطاب ہے، یعنی تم وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف کو نجات دی، جیسا کہ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 57 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 448

میں گزر چکی ہے۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس رات کا اور مکمل کیا اسے دس راتوں سے، سو پوری ہوگئی اس کے رب کی میعاد چالیس راتیں۔ اور (طور پر جاتے وقت) کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا نائب رہنا میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کے راستہ پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عزت وتکریم عطا فرمائی۔ پس الله تعالیٰ کا آپ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا وعدہ فرمانا ان کے لیے باعث عزت وتکریم تھا۔ وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ حضرت ابن عباس (1)، حضرت مجاہد اور حضرت مسروق رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: یہ ذوالقعدہ اور ذوالحج کے دس دن تھے۔ آپ کو حکم ہوا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھیں اور آپ اس میں اس عبادت کے ساتھ منفرد رہوں گے، پس جب آپ نے روزے رکھے تو آپ نے اپنے منہ کی بو کو ناپسند کیا اور مسواک کی۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے خرنوب کی لکڑی سے مسواک کی، تو ملائکہ نے کہا: بلاشبہ ہم آپ کے منہ سے کستوری کی خوشبو سونگھتے تھے تو آپ نے مسواک کے ساتھ اسے فاسد کر دیا ہے۔ پس آپ پر ذوالحجہ کی دس راتیں اور بڑھا دی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نے مسواک کی تو الله تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: ''اے موسیٰ! میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ تیرا منہ اس حالت پر واپس لوٹ آئے جس پر پہلے تھا۔ کیا تو جانتا نہیں ہے کہ روزے دار کے منہ کی بو میرے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے'' (2)۔

چنانچہ الله تعالیٰ نے مزید دس دن آپ کو روزے رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الله تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا شرف یوم نحر (دسویں ذوالحج) کی صبح کو حاصل ہوا جس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام قربانی کے عوض ذبح ہونے سے محفوظ رہے۔ اور الله تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حج مکمل کیا۔ عشر کے لفظ کے آخر سے ہا کو اس لیے حذف کر دیا گیا، کیونکہ معدود مونث ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ثلاثین اور عشرۃ سے مراد چالیس ہے، تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے تیس دن انہی میں سے دس دنوں کے ساتھ مکمل کیے۔ پس یہ واضح کر دیا کہ وہ دس تیس کے سوا ہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ سورۂ بقرہ میں اربعین (چالیس) کہا ہے اور یہاں ثلاثین (تیس) فرمایا ہے، پس یہ نیا کلام ہو جائے گا۔ تو کہا گیا ہے: اس طرح نہیں ہے۔ تحقیق فرمایا: وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ تو اربعون، اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 59 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 195

ثلاثون وعشرۃ یہ ایک ہی قول ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں (کیونکہ دونوں کا معنی چالیس ہے) پس اللہ تعالیٰ نے تفصیل و تالیف کے طریقہ پر دوقول ارشاد فرمائے۔ پس قول مرکب میں اربعین فرمایا، اور پھر فرمایا ثلاثین، یعنی مسلسل ایک مہینہ اور دس دن۔ سب کا معنی چالیس ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

عشر و اربع......

یعنی چودہ، چاند کی رات۔ اور یہ کلام عرب میں جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کسی معاہدہ کی مدت مقرر کرنا سنت ماضیہ ہے اور قدیم معنی ہے اسے اللہ تعالیٰ نے قضایا (فیصلوں) میں بنیاد بنایا ہے اور اس کے ساتھ امتوں کے فیصلے فرمائے ہیں اور اس کے ساتھ انہیں اعمال میں تاخیر کرنے کی مقدار پر آگاہ کیا ہے، پس پہلی مدت جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ چھ دن ہے جن میں اس نے تمام مخلوقات کو تخلیق فرمایا ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں) ہم اس کا معنی اس سے قبل اسی سورۃ میں اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (الاعراف:54) کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے بیان فرمایا ہے: جب کسی معنی (مقصد) کے لیے مدت مقرر کر دی جائے تو اس میں مؤجل کو حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے اور جب وہ مدت آجائے اور وہ شے میسر نہ ہو تو اس میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے اور بطور عذر اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بیان فرمایا اور ان کے لیے تیس دن مقرر فرما دیے پر ان میں دس دن مزید بڑھا دیے تاکہ چالیس مکمل ہو جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دس دن اپنی قوم پر تاخیر کر دی اور وہ اس تاخیر اور تاخر کے جواز کو نہ سمجھ سکے، یہاں تک کہ وہ کہنے لگے: بلاشبہ موسیٰ بہک گیا یا بھول گیا (نعوذ باللہ من ذالک) اور انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا۔ اور آپ کے بعد انہوں نے اپنا نظریہ بدل دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور الٰہ کی عبادت کرنے لگے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: بلاشبہ میرے رب نے میرے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ فرمایا کہ میں اس سے شرف ملاقات حاصل کروں اور میں تم میں حضرت ہارون علیہ السلام کو نائب اور خلیفہ بنا رہا ہوں۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا۔ پس ان کا وہ فتنہ جس میں انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی انہی دس دنوں میں وقوع پذیر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر زائد کیے تھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ زیادتی جو مقررہ مدت پر ہوتی ہے وہ اسی طرح مقدر ہوتی ہے جیسے وہ مقررہ مدت مقدر ہوتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتی مگر حاکم کے ایسے اجتہاد کے ساتھ جو اس معاملہ سے متعلقہ معانی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 790

مثلاً وقت، حال اور عمل میں غور و فکر کرنے کے بعد ہو، پس یہ گزشتہ مدت کے ثلث (تہائی) کے مثل ہو سکتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مقرر فرمائی۔ اگر حاکم مناسب خیال کرے کہ وہ اپنے لیے اصل کو اجل اور زیادتی کو ایک ہی مدت میں جمع کر لے تو یہ جائز ہے، لیکن اس کے بعد انتظار ضروری ہے تا کہ انسان پر عذر طاری ہو جائے، یہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بندے کو معذور قرار دیا ہے اور اس کی مدت کو مؤخر کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بھی حکام کے محکوم علیہ کو یکے بعد دیگرے معذور قرار دینے کی اصل ہے اور یہ مخلوق کے ساتھ لطف و عنایت ہے اور چاہیے کہ طاقتور حکام ان پر حق نافذ کریں۔

کہا جاتا ہے: أعذر فی الأمر أی بالغ فیه یعنی اس نے معاملہ میں حد درجہ کوشش کی اتنی کہ اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہو سکتی (یعنی اس کے بعد کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا) اور بنی آدم کے لیے سب سے بڑی کوشش ان کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمانا ہے تا کہ ان پر حجت مکمل ہو جائے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو)

اور فرمایا: وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (فاطر: 37) (اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا) کہا گیا ہے کہ یہ رسل علیہم السلام ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد بڑھاپا ہے، کیونکہ وہ کہولت کی عمر میں آجاتا ہے اور یہ بچپن کی عمر سے مفارقت اور جدائی کی علامت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ساٹھ برس کو عذر دور کرنے کی غایت اور انتہا قرار دیا ہے، کیونکہ ساٹھ برس بندوں کے انتہائی تجربہ کار ہونے کے قریب ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے، خشوع و خضوع پیش کرنے اور اطاعت و فرمانبرداری کی عمر ہے۔ اور اس میں موت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات تاک میں ہوتی ہے۔ پس اس میں کوشش کے بعد کوشش ہے (اور ڈراوے کے بعد ڈراوا ہے) پہلا (ڈراوا) نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور دوسرا بڑھاپے کے ساتھ اور یہ چالیس برس مکمل ہونے کے وقت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (الاحقاف: 15) پس اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ جو آدمی چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے تو اب اس کے لیے وقت ہے کہ وہ اپنی ذات پر اور اپنے والدین پر اللہ تعالیٰ کے احکامات و احسانات کی مقدار کو جانے اور ان کا شکر ادا کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اپنے شہر کے اہل علم کو جانتا ہوں، وہ دنیا تلاش کرتے رہتے ہیں اور لوگوں میں مل جل کر رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے چالیس برس پورے ہو جاتے ہیں، پس جب ان پر یہ وقت آجائے تو وہ لوگوں سے علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ تاریخ راتوں سے (شمار) ہوتی ہے نہ کہ دنوں سے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (تیس راتیں) کیونکہ راتیں ہی مہینوں کی ابتدا ہیں۔ اور انہی کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایام کے

بارے خبر دیتے تھے، یہاں تک کہ مروی ہے کہ وہ کہتے تھے: صُمنا خمسًا مع رسول الله ﷺ (ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پانچ روزے رکھے)۔ اور عجمی اس میں مخالفت کرتے ہیں اور وہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے ہیں، کیونکہ ان کا اعتماد سورج پر ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورج کا حساب منافع (بیع، شرا اور اجارہ وغیرہ) کے لیے ہے اور چاند کا حساب مناسک (احکام) کے لیے ہے، اسی لیے فرمایا: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً کہا جاتا ہے: أرختُ تاریخا اور ورختُ توریخا (میں نے تاریخ بیان کی) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ اس کا معنی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی مناجات کے لیے جانے اور اسی میں اپنے آپ کو مشغول رکھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو فرمایا: تم میرے نائب اور خلیفہ ہو۔ پس یہی ارشاد اپنا نائب اور خلیفہ بنانے پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت علی کو فرماتے ہوئے سنا ہے جب آپ ﷺ نے انہیں ایک غزوہ کے وقت اپنا نائب بنایا: أما ترضى أن تكون منى بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبیَّ بعدی(1) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے) اس روایت سے روافض، امامیہ اور شیعہ کے تمام فرقوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر خلیفہ اور نائب بنایا، یہاں تک کہ امامیہ نے صحابہ کرام کو کافر قرار دیا۔ قبحہم اللہ (اللہ تعالیٰ ان کا برا کرے)

نوٹ: اب ان کے مقتدر علماء اس قسم کے اقوال سے اجتناب کرتے ہیں اور خلفاء راشدین، امہات المومنین اور صحابہ کرام کے بارے میں تکریم کے الفاظ ذکر کرتے ہیں۔

کیونکہ ان کے نزدیک انہوں نے اس عمل کو ترک کر دیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے۔ اور انہوں نے آپ کے سوا کسی اور کو اجتہاد کے ساتھ خلیفہ بنالیا۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دیا جب آپ اپنے حق کے مطالبہ کے لیے نہ اٹھے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے اپنے کفر میں اور ان کے کفر میں جو ان کے قول کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں کوئی شک نہیں ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی میں کسی کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا اس وکالت کی طرح ہے جو مؤکل کے معزول کرنے یا اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور یہ اس کی وفات کے بعد تک باقی رہنے کا تقاضا نہیں کرتی، پس اس سے وہ مسئلہ حل ہو جائے گا جس کے ساتھ امامیہ وغیرہ کا تعلق ہے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ پر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور کئی دوسروں کو نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور اس سے بالاتفاق ان کی خلافت کا دائمی ہونا لازم نہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اصل رسالت میں شریک کیا گیا تھا، پس ان کے لیے اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو قصد انہوں نے کیا ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 278

قولہ تعالیٰ: وَ اَصۡلِحۡ یہ اصلاح سے امر ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اصلاح میں سے یہ تھا کہ آپ سامری کو زجرو توبیخ کرتے اور اسے بدل دیتے (1)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور ان کے امور کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کی اصلاح کریں، یعنی مصلح ہو جائیں۔

وَ لَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ یعنی آپ گنہگاروں اور نافرمانوں کی راہ نہ چلیں۔ اور نہ ہی ظالموں کے معاون و مددگار بنیں۔

وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَ لٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَکَ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے (تو اس وقت) عرض کی: اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تا کہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے مجھے، البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے پھر جب تجلی ڈالی ان کے رب نے پہاڑ پر تو کر دیا اسے پاش پاش اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب آپ کو ہوش آیا تو عرض کی: پاک ہے تو (ہر نقص سے) میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا یعنی جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے۔ وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ اور ان کے رب نے انہیں بلا واسطہ اپنا کلام سنایا۔ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ تو آپ نے رب کریم کا دیدار کرنے کی التجا کی، اور جب اس نے آپ کو اپنا کلام سنایا تو آپ دیدار الٰہی کے مشتاق ہوئے۔ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ تو رب کریم نے فرمایا: تم دنیا میں مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے کہ آپ نے یہ ارادہ کیا۔ مجھے ایک عظیم نشانی دکھا تا کہ میں تیری قدرت کا نظارہ کر سکوں۔ کیونکہ آپ نے عرض کی اِلَیۡکَ (تیری طرف) اور رب کریم نے فرمایا: قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ اگر آپ کسی آیت اور نشانی کا سوال کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو وہ عطا فرما دیتا جو آپ مانگتے، جیسا کہ اس نے آپ کو دیگر تمام آیات اور نشانیاں عطا فرمائی تھیں، حالانکہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کسی دوسری آیت اور نشانی کی طلب سے اظہار عجز ہے، پس یہ تاویل باطل ہے۔ وَ لٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ آپ کے لیے اس شے سے مثال بیان کی گئی جو اپنی بناء کے اعتبار سے زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہے، یعنی اگر پہاڑ اپنی جگہ پر ثابت رہا اور ساکن رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے اور اگر وہ ساکن نہ رہا تو پھر بلا شبہ تم میری رؤیت کی طاقت نہیں رکھ سکتے، جیسا کہ پہاڑ مجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 450

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے قاضی ابو بکر بن طیب سے جو ذکر کیا ہے اس کا مفہوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اسی لیے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور یہ کہ پہاڑ نے اپنے رب کو دیکھا تو وہ یہ جان کر پاش پاش ہو گیا کہ اللہ کریم نے اسے اس کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ اور انہوں نے اس کا استنباط اس ارشاد گرامی سے کیا ہے: وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ پھر فرمایا: فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا، تجلی کا معنی ہے ظہر (ظاہر ہونا) یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: جلوتُ العروس ای أبرزتُها (میں نے دلہن کو ظاہر کیا) اور جلوتُ السیف (میں نے تلوار کو زنگ سے صاف کیا) ان دونوں میں جلا کا معنی موجود ہے اور تجلی الشی کا معنی ہوتا ہے انکشف (ظاہر ہونا، منکشف ہونا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تجلّی أمرہ و قدرتہ (یعنی اس نے اپنا امر اور اپنی قدرت کا اظہار کیا) یہ قطرب وغیرہ نے کہا ہے۔

اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت دکا ہے۔ اور اس کی صحت پر دکت الارض دکا دلالت کرتا ہے۔ اور بلاشبہ پہاڑ (جبل) مذکر ہے اور اہل کوفہ نے دکاء پڑھا ہے یعنی اسے ارض دکاء کی مثل قرار دیا ہے۔ اور اس سے مراد ہموار زمین ہے جہاں پہاڑ نہ ہوں۔ اور اس کا مذکر ادک ہے۔ اور دکاء کی جمع دکاوات اور دک ہے جیسا کہ حمراوات اور حمر ہیں۔ کسائی نے کہا ہے: الدك من الجبال کا معنی ہے پہاڑ کا چوڑا ہو جانا، اس کی واحد ادک ہے۔ ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: دکاء کی جمع دکاوات ہے۔ اس سے مراد مٹی کی وہ راب (اور کیچڑ) ہے جس میں شدت اور سختی نہ ہو۔ اور اسی طرح الدکداك من الرمل کا معنی ہے: وہ ریت جو زمین کی کوہان نہ ہو۔

اور ایک تفسیر میں ہے: پہاڑ زمین میں دھنس گیا اور وہ اب بھی اس میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے اسے مٹی بنا دیا۔ عطیہ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد اڑنے والی ریت ہے۔ وَ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آپ مردہ ہو کر گر پڑے۔ کہا جاتا ہے: صَعِق الرجل فھو صَعِق و صُعِق فھو مصعوق حضرت قتادہ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نویں ذی الحجہ جمعرات کے دن بیہوش ہو کر گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے دسویں ذوالحجہ جمعہ کے دن آپ کو تورات عطا فرمائی (1)۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ کی التجا کرنے سے توبہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ نے یہ عرض بغیر اجازت لیے کی، پس اسی لیے آپ نے توبہ کی۔ اور بعض نے کہا ہے: آیات وعلامات کے ظہور کے وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور خشوع وخضوع کے اظہار کے لیے یہ کلمات کہے۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ توبہ کسی معصیت سے نہ تھی، کیونکہ انبیاء معصوم ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک بھی رؤیت باری تعالیٰ جائز ہے۔ مبتدعہ کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے یہ التجا ایک قوم کے لیے کی تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ جائز نہیں ہے اور یہ توبہ کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 539

کہا گیا ہے: میں تیری بارگاہ میں قبطی کے قتل سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ الانعام میں یہ بیان گزر چکا ہے کہ رؤیت جائز ہے۔

علی بن مہدی طبری نے بیان کیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال محال ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کا اقدام نہ کرتے، جیسا کہ رب کریم کو یہ کہنا جائز نہیں ہے: اے رب! کیا تیری کوئی بیوی اور بیٹا ہے۔ عنقریب سورۃ القیامہ میں معتزلہ کا مذہب اور ان کا رد آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں اپنی قوم میں سے پہلا مومن ہوں۔ بعض نے کہا ہے: اس زمانے میں بنی اسرائیل میں سے میں پہلا مومن ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: یقیناً اس بارے میں تیرا پہلے وعدہ ہے کہ دنیا میں تجھے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حدیث صحیح میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کے درمیان (ترجیح کا) چناؤ نہ کرو، کیونکہ لوگ قیامت کے دن صعقہ کے سبب گرے پڑے ہوں گے تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا پس میں اچانک موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ عرش کے پایوں میں سے ایک کو پکڑے ہوئے ہیں، سو میں نہیں جانتا کہ کیا ان پر بھی صعقہ طاری ہوا ان لوگوں میں جن پر صعقہ طاری ہوا اور پھر انہوں نے مجھ سے افاقہ پا لیا یا پہلے صاعقہ کے ساتھ ہی ان کا حساب لیا گیا'' (1) یا فرمایا ''یا ان کے لیے پہلا صعقہ ہی کافی ہوا''۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام اور رؤیت کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو مرتبہ شرف ہمکلامی عطا فرمایا۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار شرف دیدار حاصل کیا۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغمبری سے اور اپنے کلام سے اور لے لو جو میں نے دیا ہے تمہیں اور ہو جاؤ شکر زار بندوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ، الاصطفاء بمعنی الاجتباء ہے۔ یعنی میں نے تجھے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور پھر آیت میں علی الخلق (مخلوق پر) نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس اصطفاء اور سرفرازی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور تحقیق اس نے ملائکہ سے بھی کلام فرمایا ہے اور اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جب کہ آپ کے علاوہ بھی اس نے رسول مبعوث فرمائے ہیں، پس عَلَى النَّاسِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت نافع اور ابن کثیر نے صیغہ مفرد کے ساتھ برسالتی پڑھا ہے (2)۔ اور باقیوں نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور الرسالۃ مصدر ہے، پس اسے مفرد لانا جائز ہے۔ اور جو جمع لائے ہیں وہ اس بنا پر ہے کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، سورۃ اعراف، جلد 2، صفحہ 668		2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

کو رسالت کی انواع واقسام کے ساتھ بھیجا اس کی انواع مختلف ہیں، نتیجۃ مصدر کی جمع اس کی انواع کے اختلاف کی وجہ سے ہے، جیسے فرمایا: اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾ (لقمان) أصوات (آوازیں) کی اجناس کے اختلاف اور آواز نکالنے والوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے اسے جمع لایا گیا ہے۔ اور لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ میں اسے واحد ذکر کیا، کیونکہ اس میں آوازوں میں سے ایک جنس کا ارادہ کیا ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کی قوم وصف تکلم میں آپ کے ساتھ شریک نہیں اور نہ ہی ستر افراد میں سے کوئی ایک آپ کے ساتھ شریک ہے، جیسے ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ یہ قناعت کرنے کی طرف اشارہ ہے، یعنی آپ اس پر قناعت کریں جو میں نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ یعنی میں نے جو احسانات تم پر کیے ہیں اور جو میرا فضل تم پر ہے اس کا اظہار کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے: دابۃ شکور یہ کہا جاتا ہے جب جانور کا موٹا پا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ اور شاکر (شکر گزار) کو مزید کی پیشکش کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) (کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا)۔ اور روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے بعد چالیس راتیں ٹھہرے رہے جس نے بھی آپ کو دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کے نور کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور ہم نے لکھ دی موسیٰ کے لیے تختیوں میں ہر چیز نصیحت پذیری کے لیے اور (لکھ دی) تفصیل ہر چیز کی پھر (فرمایا) پکڑ لو اسے مضبوطی سے اور حکم دو اپنی قوم کو کہ پکڑ لیں اس کی اچھی باتیں، عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں نافرمانوں کا (برباد شدہ) گھر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ اس میں الواح سے مراد تورات ہے۔ اور خبر میں روایت ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے آپ کو اپنے پر کے ساتھ اٹھایا اور بلندی میں لے گئے حتی کہ آپ کو اتنا قریب کیا کہ آپ نے قلم چلنے کی آواز سنی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے تختیاں لکھیں۔ اسے حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ تختیاں سبز رنگ کے زمرد کی تھیں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: وہ سرخ یاقوت کی تھیں۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: وہ زبرجد کی تھیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں (1)۔ اور وہ آسمان سے نازل ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ٹھوس پتھر سے بنی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نرم وملائم کر دیا تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ کاٹ دیا پھر اسے اپنی انگلیوں کے ساتھ شق کیا، تو اس پتھر نے آپ کی اسی طرح اطاعت کی جیسے لوہے نے حضرت داؤد علیہ السلام کی۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے تختیوں میں اس طرح لکھ دیا ہے جیسے انگوٹھی کا نقش

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

ہوتا ہے۔ (یعنی سب ان میں کندا کر دیا ہے)

حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے: تورات نازل ہوئی تو وہ ستر اونٹوں کا بوجھ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت اپنی ذات کی طرف تشریف کے لیے کی ہے، حالانکہ یہ تختیاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھی گئیں اور انہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے اس قلم کے ساتھ لکھا جس کے ساتھ ذکر (قرآن کریم) لکھا۔ اور نہر نور سے سیاہی لی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تحریر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا اور اسے تختیوں میں تخلیق کر دیا۔ اور اللوح کی اصل لوح لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ (البروج) تو گویا تختی وہ ہے جس میں معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور روایت ہے کہ وہ دو تختیاں تھیں اور جمع (الواح) اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ دو بھی جمع ہے۔

اور کہا جاتا ہے: رجل عظیم الألواح یہ تب کہا جاتا ہے جب کسی آدمی کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کی ہڈی بڑی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: تختیاں اس وقت ٹوٹ گئیں جب آپ نے انہیں پھینکا پس سوائے چھٹی تختی کے وہ سب اٹھالی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساتویں تختی باقی رہی اور بقیہ چھ اٹھالی گئیں پس وہ جو اٹھالی گئی اس میں ہر شے کی تفصیل درج تھی اور جو باقی رہی اس میں ہدایت اور رحمت کا ذکر تھا۔

حافظ ابو نعیم نے عمرو بن دینار سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے انہوں نے چالیس راتیں روزہ رکھا اور جب تختیوں کو پھینکا اور وہ ٹوٹ گئیں تو آپ نے پھر اسی طرح روزے رکھے تو وہ پھر آپ کی طرف واپس لوٹا دی گئیں۔ اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد حلال و حرام کی وضاحت اور آپ کے دین کے احکام میں سے ہر وہ شے ہے جس کی آپ کو احتیاج اور ضرورت تھی۔ یہ معنی ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ایسا لفظ ہے جو تفخیم کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اس سے تعمیم مراد نہیں ہوتی، مثلاً آپ کہتے ہیں: دخلتُ السوق فاشتریتُ کلّ شیٔ (میں بازار میں داخل ہوا اور میں نے ہر شے خرید لی) عند فلان کل شیٔ (فلاں کے پاس ہر شے ہے) اور تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف:25) (تہس نہس کر کے رکھ دے گی ہر چیز کو) وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل:23) (اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی احکام میں سے ہر اس شے کی تفصیل جس کا انہیں حکم دیا گیا، کیونکہ ان میں اجتہاد نہیں تھا، بلکہ یہ صرف امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص ہے۔ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ اس کلام میں حذف ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا (ای فقلنا له): اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، یعنی پوری کوشش اور نشاط کے ساتھ۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (البقرہ:63) (پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے) اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا یعنی اپنی قوم کو حکم دو وہ اوامر پر عمل کریں اور نواہی کو چھوڑ دیں اور ضرب الامثال اور نصائح و مواعظ میں تدبر اور غور و فکر کریں۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر:55) (اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) اور فرمایا: فَيَتَّبِعُوْنَ

أَحْسَنَهٗ (زمر:18) (کہ وہ اتباع اور پیروی کریں اس کی اچھی باتوں کی) پس معاف کر دینا قصاص لینے سے اچھا ہے۔ اور صبر کرنا انتقام لینے سے احسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اچھی چیزیں فرائض اور نوافل ہیں اور گھٹیا مباح ہے۔

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دَارَ الْفٰسِقِيْنَ سے مراد وہ ہے جس پر سے وہ گزرے جب انہوں نے سفر کیا یعنی قوم عاد وثمود کے گھر اور وہ بستیاں جو برباد کر دی گئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد جہنم ہے۔ یہ حسن اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، یعنی چاہیے کہ تم انہیں یاد رکھو اور اس سے بچو کہ تم ان میں سے ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے مصر کا ارادہ کیا ہے، یعنی میں عنقریب تمہیں قبطیوں کے گھر اور فرعون کے وہ مسکن دکھاؤں گا جو اب ان سے خالی پڑے ہیں۔ یہ حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں عنقریب تمہیں کفار کے وہ گھر دکھاؤں گا جن میں تم سے پہلے جبابرہ اور عمالقہ سکونت پذیر رہے تاکہ ان سے عبرت حاصل کرو، مراد شام ہے۔ یہ دونوں قول ان دونوں پر دلالت کرتے ہیں وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ، الآیہ (الاعراف:137) (اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل وحقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنا دیا) اس زمین کے شرق وغرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی) وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ الآیہ (القصص:5) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباس اور قسامہ بن زہیر رضی اللہ عنہم نے سأورثكم پڑھا ہے یہ ورث سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الدار سے مراد الہلاک (ہلاک کرنا) ہے اور اس کی جمع ادوار ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کو غرق کیا تو سمندر کو حکم ارشاد فرمایا کہ ان کے جسموں کو ساحل پر پھینک دے، فرمایا: پس اس نے ایسے ہی کیا، تو بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک ہونے والے فاسق دکھا دیئے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

''میں پھیر دوں گا اپنی نشانیوں سے ان لوگوں (کی توجہ) کو جو غرور کرتے پھرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیوں کو (تو بھی) نہ ایمان لے آئیں ان پر اور دیکھ بھی لیں راہ رشد وہدایت تب بھی نہ بنائیں اسے (اپنا) راستہ اور اگر دیکھیں گمراہی کے راستہ کو (تو جھٹ) بنالیں اسے (اپنی راہ) غفلت برتنے والے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو، ضائع ہو گئے ان کے سارے اعمال۔ کیا انہیں جزا

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 543

دی جائے گی سوائے اس کے جو وہ کیا کرتے تھے؟ (ہرگز نہیں)''۔

قولہ تعالیٰ: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں اپنی کتاب کی فہم اور سمجھ سے روک دوں گا۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے بھی یہی کہا ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں اس کے سبب انہیں ایمان سے پھیر دوں گا۔ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہی آیات کے نفع سے پھیر دوں گا۔ اور یہ ان کے تکبر اور غرور کی جزا (اور بدلہ) ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف:5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اس معنی کی بناء پر آیات سے مراد معجزات ہیں یا نازل کردہ کتب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد زمین و آسمان کی تخلیق ہے یعنی میں انہیں ان کا اعتبار کرنے (مراد عبرت حاصل کرنے) سے پھیر دوں گا۔ یَتَكَبَّرُوْنَ یعنی وہ اپنے آپ کو افضل الخلق گمان کرتے ہیں۔ اور یہ گمان باطل ہے، پس اسی لیے فرمایا: بِغَیْرِ الْحَقِّ یعنی نہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرتے تھے اور نہ ہی اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے ان کی طرف توجہ کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا یعنی یہ ان تکبر کرنے والوں کا انداز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ وہ چھوڑ دیں راہ رشد و ہدایت کو اور وہ راہ ضلالت و گمراہی کی پیروی کریں، یعنی کفر کو دین بنالیں۔ پھر اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یعنی یہ وہ فعل ہے جو میں نے ان کے ساتھ ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے کیا ہے۔

وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ یعنی وہ حق میں تدبر اور غور و فکر کرنے کے اعتبار سے غافلوں کی مثل ہیں۔ اور معنی میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے غافل ہوں جو اس کے سبب انہیں بدلہ اور سزا دی جائے گی، جیسے کہا جاتا ہے: ما أغفل فلان عما یراد بہ؟ (فلاں اس سے کتنا غافل ہے جس کا اس کے بارے ارادہ کیا جارہا ہے؟) حضرت مالک بن دینار نے دونوں حرفوں میں یا کے ضمہ کے ساتھ وان یُرَوا پڑھا ہے یعنی یہ ان کے ساتھ کیا جائے گا۔ اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے سبیل الرُّشْد راء کو ضمہ اور شین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا اہل کوفہ نے راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ الرشد پڑھا ہے۔

ابوعبید نے کہا ہے: ابوعمرو نے رُشْد اور رَشَد کے درمیان فرق کیا ہے۔ فرمایا: رُشْد اصلاح میں ہوتا ہے اور رَشَد دین میں ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: سیبویہ اس طرف گئے ہیں کہ رُشْد اور رَشَد سُخْط اور سَخَط کی مثل ہیں اور اسی طرح کسائی نے بھی کہا ہے۔ اور ابوعمرو سے صحیح اس کے سوا ہے جو ابوعبید نے کہا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: نصر بن علی نے اپنے باپ کے واسطہ سے ابوعمرو بن علاء سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب رشد آیت کے درمیان میں ہو تو اس میں شین ساکن ہوگی اور جب آیت کے سرے پر ہو تو وہ متحرک ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: رأس الآیہ سے مراد یہ ہے جیسے یہ آیت: وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (الکہف) پس آپ کے نزدیک یہ دونوں لغتیں ایک معنی میں ہیں، مگر آپ نے یہ فتحہ اس لیے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 544

دیا ہے تا کہ آیات متفق ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے: رَشَدَ یَرْشُدُ، رَشُدَ یَرْشُدُ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے رَشِدَ یَرْشَدُ، رُشْد اور رَشَد کا لغت میں حقیقی معنی ہے کہ انسان اس میں کامیاب ہو جس کا وہ ارادہ کرے اور یہ نقصان اور خسارے کی ضد ہے۔ (یعنی رشد کی ضد الخیبة ہے)

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

''اور بنالیا قوم موسیٰ نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا جو محض ڈھانچہ تھا اس سے گائے کی آواز آتی تھی، کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ وہ نہ بات کر سکتا ہے ان سے اور نہ انہیں ہدایت کی راہ بتا سکتا ہے، انہوں نے (خدا) بنالیا اسے اور وہ (بڑے) ظالم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے طور پر جانے کے بعد بنالیا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ (اپنے زیورات سے)۔ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے سوا اہل کوفہ نے اسے مِنْ حِلِيِّهِمْ حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے مِنْ حَلْيِهِمْ حا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ حَلْي، حُلِيّ اور حِلِيّ کی جمع ہے، جیسے ثَدْي، ثُدِيّ اور ثِدِيّ ہیں۔

اس کی اصل حلوی ہے، پھر واؤ کو یا میں مدغم کیا گیا اور لام یا کی مجاورت کے سبب مکسور ہو گئی اور لام کے کسرہ کی وجہ سے حا کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور حا کا ضمہ اصل کی بنا پر ہے۔ عِجْلًا یہ مفعول ہے (بچھڑا) جَسَدًا یہ نعت یا بدل ہے۔ لَّهٗ خُوَارٌ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ کہا جاتا ہے: خار یَخُور خُوارًا جب گائے آواز نکالے (یعنی وہ محض ڈھانچہ تھا اور اس سے گائے کی آواز آتی تھی) اس طرح جأر یَجأر جُؤارا بھی ہے۔ جب کوئی بزدل اور کمزور ہو جائے تو کہا جاتا ہے خَور یَخْوَر خَوَرًا۔

بچھڑے کے قصص میں مروی ہے کہ سامری جس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا، اس کی نسبت سامرہ نامی گاؤں کی طرف کی جاتی ہے(1)۔ وہ قتل الابناء کے سال پیدا ہوا (یعنی اس سال جس میں فرعون نے بچوں کو قتل کروا دیا تھا)، اس کی ماں نے اسے پہاڑ کی ایک غار میں چھپا دیا۔ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اسے غذا پہنچائی (اور اس کی پرورش کی) پس اس وجہ سے اس نے آپ کو پہچان لیا۔ اور جب انہوں نے نر کی خواہشمند گھوڑی پر فرعون کو سمندر میں دھکیلنے کے لیے سمندر کو عبور کیا تو اس (سامر) نے گھوڑی کے کھر کے نشان سے ایک مشت مٹی اٹھالی۔ اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (طٰہٰ:96) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے تیس دن کا وعدہ کیا تھا اور پھر جب مزید دس دن کی آپ نے تاخیر کر دی اور تیس راتیں گزر گئیں، تو آپ نے بنی اسرائیل کو کہا اور ان میں اس کی اطاعت و پیروی کی جاتی تھی۔ بلاشبہ تمہارے پاس آل فرعون کے زیورات میں سے زیورات ہیں۔ ان کی عید تھی جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور قبطیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 455

سے زیورات عاریۃً لیتے تھے پس آج بھی اسی لیے انہوں نے عاریۃً لیے ہوئے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر سے نکالا اور قبطیوں کو غرق کر دیا تو وہ زیورات انہیں کے قبضے میں رہ گئے، تو سامری نے انہیں کہا: بلاشبہ یہ تم پر حرام ہیں، پس جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ لے آؤ ہم انہیں جلا دیں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیورات وہ ہیں جو بنی اسرائیل نے قوم فرعون کے غرق ہونے کے بعد لیے تھے۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں کہا: بے شک یہ زیورات مال غنیمت ہے اور یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے، پس آپ نے ایک گڑھا کھدوا کر انہیں اس میں جمع کر دیا تو سامری نے انہیں اٹھا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس رات زیورات ادھار لیے جس رات انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے قبطیوں کو یہ وہم دلایا کہ ان کی شادی یا کوئی اجتماع ہے۔ اور سامری نے ان کا یہ قول سنا ہوا تھا اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:138) اور وہ الٰہ گائے کی شکل پر تھے تو اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا بنایا جو محض ڈھانچہ تھا، مگر وہ اس سے گائے کی آواز سنتے تھے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت اور خون میں بدل دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جب اس نے وہ مٹی کی مشت آگ میں ان زیورات پر ڈالی تو وہ بچھڑا بن گیا جس سے گائے کی آواز آتی تھی۔ پس اس نے ایک بار گائے کی آواز نکالی اور دوسری بار نہیں پھر اس نے قوم کو کہا: هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ (طٰہٰ:88) (یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے) وہ کہہ رہا ہے: وہ اسے بھول گیا اور اس کی تلاش میں چلے گئے اور اس سے بھٹک گئے، تو تم آؤ ہم اس بچھڑے کی عبادت کریں۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس حال میں بتایا کہ وہ مناجات میں مشغول تھے: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ (طٰہٰ) (کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! اس سامری نے ان کے زیور سے ان کے لیے بچھڑا بنایا ہے، پس اس کا جسم کس نے بنایا ہے؟۔ آپ کی مراد گوشت اور خون ہے۔ اور اس کے لیے گائے کی آواز کس نے بنائی ہے؟ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: میں نے۔ تو آپ نے عرض کی: تیری عزت وجلال کی قسم تیرے سوا انہیں کسی نے گمراہ نہیں کیا۔ رب کریم نے فرمایا: صدقت یا حکیم الحکماء (اے حکیم الحکماء تو نے سچ کہا ہے) اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (الاعراف:155) (نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش) اور قفال نے کہا ہے: سامری نے بچھڑے کا پیٹ خالی رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں ہوا بھر دی تھی، یہاں تک کہ اس سے گائے کی آواز آنے لگی اور اس نے انہیں وہم دلایا کہ بلاشبہ وہ اس طرح ہو گیا ہے جب اس نے اس ڈھانچے میں وہ مٹی ڈالی جو اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑوں کے قدموں سے اٹھائی تھی۔ اس کلام میں بہت کمزوری اور ضعف ہے۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ یہ بیان فرمایا کہ معبود کے لیے واجب اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ کلام کر سکے۔ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اور نہ وہ ان کی دلیل کی طرف کسی راستے کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اِتَّخَذُوْهُ انہوں نے اسے خدا بنا لیا ہے۔ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ یعنی وہ اس بچھڑے کو خدا بنانے میں اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ظلم

کرنے والے ہو گئے یعنی بچھڑے کو خدا بنانے کے سبب مشرک ہو گئے۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ رَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَ يَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾

''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ یعنی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقررہ وقت پر واپس آنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے۔ حیرت زدہ شرمندہ آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: قد سُقِطَ فی یَدِہٖ (تحقیق وہ سخت نادم اور پشیمان ہے)۔ اخفش نے کہا ہے: اسے کہا جاتا ہے: سُقِطَ فی یدہ و أسقط اور جنہوں نے علی بناء الفاعل سَقط فی ایدیھم کہا ہے: ان کے نزدیک اس کا معنی ہے: سَقَطَ الندمُ (پشیمانی اور ندامت کا آنا)۔ ازہری اور نحاس وغیرہما نے یہی کہا ہے: ندامت دل میں ہوتی ہے، لیکن ذکر ید (ہاتھ) کا کیا ہے، کیونکہ جو کسی شے پر قابض ہو جائے اس کے لیے کہا جاتا ہے: قد حصل فی یدہ أمر کذا (تحقیق اس طرح کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ غالب اشیاء کے معاملات ہاتھ کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ (الحج: 10) (اس روز اسے بتایا جائے گا کہ یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا) اور یہ بھی کہ اگرچہ ندامت دل میں ہوتی ہے لیکن اس کا اثر بدن میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ نادم آدمی اپنا ہاتھ کاٹنے لگتا ہے اور اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَصۡبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيۡهِ عَلٰى مَاۤ اَنۡفَقَ فِيۡهَا (کہف: 42) (پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا) یعنی وہ نادم ہوا۔ وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ (الفرقان: 27) یعنی ندامت کے سبب اس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور نادم انسان اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل استسار سے ہے اور اس سے مراد ایک آدمی کا دوسرے آدمی کو مارنا ہے یا اسے پچھاڑ دینا ہے پس وہ اسے ہاتھوں کے بل زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ اسے باندھ لے یا اس کی مشکیں کس لے، پس جسے گرایا گیا ہے وہ گرانے والے کے ہاتھ میں مسقوط بہ ہوتا ہے۔

وَرَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف پلٹ گئے ہیں۔

قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ یعنی وہ عبودیت کا اقرار اور استغفار کرنے لگے۔ حمزہ اور کسائی نے تا خطاب کے ساتھ ولئن لم ترحمنا ربنا و تغفرلنا پڑھا ہے۔ اس میں استغاثہ، تضرع، عجز و انکساری اور سوال و دعا میں خوب اصرار کرنے کا معنی ہے۔ ربنا حرف ندا کے حذف کے سبب منصوب ہے۔

اور دعا اور خشوع و خضوع میں یہی زیادہ بلیغ ہے۔ پس ان دونوں کی قراءت میں عجز و انکساری اور تضرع زیادہ ہے، لہٰذا یہی اولیٰ ہے۔

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

''اور جب واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف خشمناک (اور) غمگین ہو کر (تو) بولے (اے قوم!) بہت بری جانشینی کی ہے تم نے میری میرے بعد، کیا تم نے جلد بازی کی اپنے رب کے فرمان سے اور (غصہ سے) پھینک دیں تختیاں اور پکڑ لیا سر اپنے بھائی کا (اور) کھینچا اسے اپنی طرف، ہارون نے کہا: اے میری ماں جائے! اس قوم نے کمزور و بے بس بنا دیا مجھے اور قریب تھا کہ قتل کر دیں مجھے، سو نہ ہنساؤ مجھ پر دشمنوں کو اور نہ شمار کرو مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ۔ موسیٰ نے التجا کی اے میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو زیادہ رحم کرنے والا ہے تمام رحم کرنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا اس میں غَضْبَانَ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث غضبی ہے اور اس لیے کہ اس میں الف نون اس الف تانیث کی مثل ہے جو تیرے قول حمراء میں ہے اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اَسِفًا سے مراد شدید الغضب (سخت غصہ) ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ (1) نے فرمایا: اسف کا درجہ غضب کے بعد ہے یعنی جب غصہ غضب سے زیادہ شدید ہو تو اسف کہلاتا ہے (اور وہ آدمی) أسِف و أسِیف و أسفان اور أسُوف کہلاتا ہے۔ اور الأسیف کا معنی حزین (غمگین) بھی ہے۔

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے عمل کی وجہ سے غمگین و پشیمان واپس لوٹے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ عزوجل نے آپ کو واپسی سے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ انہیں بچھڑے کے سبب فتنہ و آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے، پس اسی لیے آپ غصے کی حالت میں واپس لوٹے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام میں غصہ لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا، لیکن وہ بہت جلد اتر جاتا تھا، پس وہ جتنا زیادہ تھا اتنا جلدی اترتا تھا۔

ابن القاسم نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب غصے میں ہوتے تو آپ کی ٹوپی سے دھواں ظاہر ہوتا تھا اور آپ کے بدن کے بال آپ کے جبے کو اٹھا دیتے تھے اور یہ اس لیے ہے کہ غصہ ایک انگارہ ہے جو دل میں جلنے لگتا ہے۔ اسی لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جسے غصہ آئے وہ چت لیٹ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 77 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

جائے اور اگر اس کا غصہ ختم نہ ہو تو پھر وہ غسل کرے، پس اس کا لیٹنا اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دے گا اور اس کا غسل کرنا اسے زائل کر دے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تیز غصہ ہی اس کا سبب بنا تھا کہ آپ نے حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ دے مارا اور ان کی آنکھ پھوڑ دی۔ اس بارے علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا ذکر سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس لیے اجازت طلب کی کیونکہ وہ کلیم اللہ تھے۔ گویا کہ انہوں نے یہ جانا کہ جس کسی نے آپ پر جرأت کی یا آپ کی طرف اذیت کا ہاتھ بڑھایا تو یہ انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جب انہوں نے آپ پر حجت پیش کی تو آپ نے فرمایا: تو میری روح کہاں سے نکالے گا؟ کیا میرے منہ سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب سے کلام کی ہے یا میرے کان سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب کا کلام سنا ہے یا میرے ہاتھ سے، حالانکہ میں نے ان کے ساتھ تختیوں کو پکڑا ہے یا میرے پاؤں سے، حالانکہ میں طور پر رب کریم سے ہم کلام ہونے کے لیے ان پر کھڑا ہوا یا میری آنکھوں سے، حالانکہ اس کے نور سے میرا چہرہ چمک اٹھا، پس وہ لاجواب ہو کر اپنے رب کی طرف واپس لوٹ گیا۔

مصنف ابی داؤد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے تو اگر اس سے غصہ زائل ہو جائے (تو بہتر) ورنہ اسے چاہیے کہ وہ لیٹ جائے'' (1)۔

ابو وائل القاص سے بھی مروی ہے انہوں نے بیان کیا: ہم عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے تو ایک آدمی نے ان سے گفتگو کی اور انہیں غصہ دلا دیا، تو آپ (مجلس سے) اٹھ گئے، پھر آپ اس حال میں واپس آئے کہ آپ نے وضو کیا ہوا تھا، انہوں نے فرمایا: میرے باپ نے میرے جد امجد عطیہ سے مجھے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور بلاشبہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور بلاشبہ آگ پانی کے ساتھ بجھائی جاتی ہے پس جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے وضو کرنا چاہیے'' (2)۔

قولہ تعالیٰ: **بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ** یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قوم کی مذمت ہے، یعنی بہت برا عمل ہے جو تم نے میرے بعد کیا ہے۔ جو عمل مکروہ اور ناپسندیدہ ہو اس کے لیے خلفہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ خیر اور بھلائی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے: خلفه بخير او بشر فی أهله و قومه بعد شخوصه (یعنی اس نے اپنے گھر والوں اور اپنی قوم میں اپنی بلندی کے بعد خیر یا شر کو اپنا خلیفہ بنایا)

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ یعنی کیا تم اپنے رب کے فرمان سے سبقت لے گئے؟ اور العجلۃ سے مراد کسی شے کے ساتھ اس کے وقت سے پہلے آگے بڑھنا ہے اور یہ مذموم ہے۔ اور السرعۃ کا معنی ہے: عمل الشیء فی أول أوقاته (کسی شی پر اس کے اول وقت میں عمل کرنا) اور یہ قابل تعریف ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 303 — 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 304

ایضاً، حدیث نمبر 4151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعقوب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: عجلتُ الشئ (یعنی) میں اس شے کی طرف سبقت لے گیا۔ اور أعجلتُ الرجلَ میں نے آدمی کو جلدی میں ڈالا، یعنی میں نے اسے عجلت پر ابھارا۔ اور اَمۡرَ رَبِّكُمۡ کا معنی ہے معیاد ربکم، یعنی تمہارے رب نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی تم نے اپنے رب کی ناراضگی لینے میں جلدی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم نے بچھڑے کی عبادت کرنے میں جلدی کی ہے اس سے پہلے کہ تمہارے رب کی طرف سے کوئی حکم تمہارے پاس آتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَلۡقَى الۡاَلۡوَاحَ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَلۡقَى الۡاَلۡوَاحَ اور آپ نے تختیاں پھینک دیں شدید غصے کی وجہ سے جو آپ پر اس وقت طاری ہوا جب آپ اپنی قوم کے پاس آئے اور وہ بچھڑے کی عبادت میں لگے ہوئے تھے، تو آپ ان کے معاملہ کو مہمل چھوڑنے اور اس پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اپنے بھائی پر غصے ہوئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر (1) نے کہا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے: لیس الخبرُ کالمعاینۃ (سنی ہوئی خبر دیکھی ہوئی شے کی مثل نہیں ہوتی)۔ اور وہ قابل التفات نہیں جو حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اگر وہ آپ سے صحیح ہے اور وہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے تختیوں کو اس وقت پھینکا جب آپ نے ان میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت دیکھی اور آپ کی امت کے لیے نہیں تھی۔ یہ ردی قول ہے اور قطعاً مناسب نہیں کہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ تختیاں ٹوٹ گئیں اور ان سے تفصیل اٹھالی گئی اور ہدایت اور رحمت ان میں باقی رہی۔

مسئلہ نمبر 2۔ تحقیق بعض جاہل متصوفہ نے اس سے کپڑے پھینکنے کے جواز پر استدلال کیا ہے جب غنا پر ان کی خوشی انتہائی بڑھ جائے (اور وہ جھومنے لگیں) پھر ان میں سے بعض صحیح کپڑے پھینکتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو پہلے انہیں پھاڑ ڈالتے ہیں اور پھر پھینکتے ہیں۔ فرمایا: یہ لوگ ایک غیبی اور مخفی حالت میں ہوتے ہیں پس انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی قوم کے بچھڑے کی عبادت کرنے کے سبب جب غم غالب آگیا، تو آپ نے تختیاں پھینک دیں اور انہیں توڑ دیا اور آپ کو اس کا ادراک نہ ہوا جو آپ نے کیا۔

علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: کون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے صحیح قرار دے سکتا ہے کہ آپ نے تختیاں توڑنے کے لیے انہیں پھینک دیا؟ جو قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ہے کہ آپ نے انہیں پھینکا، تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹ گئیں؟ پھر اگر کہا جائے کہ وہ ٹوٹ گئیں تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آپ نے انہیں توڑنے کا قصد اور ارادہ کیا؟ پھر اگر ہم اسے آپ سے صحیح قرار دیں تو ہم کہیں گے: آپ حالت غضب میں تھے، یہاں تک کہ اگر آپ کے سامنے آگ کا سمندر ہوتا تو آپ اس میں کود جاتے۔ اور کون ہے جو ان (متصوفہ) کی حالت غیبیہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے حالانکہ وہ دوسرے سے غنا کو سمجھ رہے ہوتے ہیں اور اگر ان کے پاس کنواں ہو تو اس سے بچتے اور ڈرتے بھی ہیں۔

پھر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے احوال کو ان سفہاء کے احوال پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ابن عقیل سے ان کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 457

وجد کرنے اور اپنے کپڑے پھاڑنے کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ خطا ہے اور حرام ہے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ایک کہنے والے نے آپ سے کہا: بلاشبہ وہ اسے نہیں جانتے ہوتے جو وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر وہ یہ جانتے ہوئے ایسی جگہوں پر حاضر ہوئے کہ ان پر خوشی غالب آ جائے گی اور وہ ان کی عقلوں کو زائل کر دے گی تو وہ اس وجہ سے گنہگار ہوئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایسی جگہ داخل کیا جہاں انہوں نے کپڑے پھاڑنے وغیرہ جیسے فاسد کام کیے اور ان سے شریعت کا خطاب ساقط نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں حاضر ہونے سے پہلے انہیں یہ خطاب کیا جا چکا ہے کہ وہ ایسی جگہ سے اجتناب کریں جو انہیں اس حال تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ انہیں کوئی نشہ آور مشروب پینے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح یہ وہ شدید خوشی ہے جسے اہل تصوف وجد کا نام دیتے ہیں اگر وہ سچے ہیں کہ اس میں طبعی نشہ ہے اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو انہوں نے صحو کے باوجود فاسد کام کیا، پس اس میں دونوں حالتوں (صحو اور سکر) میں سلامتی نہیں ہے۔ اور شک کے مقامات سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ یعنی آپ نے اپنے بھائی کی ریش اور زلفیں کھینچیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے اور آپ بنی اسرائیل کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ محبوب تھے، کیونکہ آپ میں غصہ بہت کم (اور مزاج نرم) تھا۔

علماء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے بھائی کا سر پکڑنے کی چار تاویلیں کی ہیں:

(۱) یہ انداز ان کے عرف اور عادت میں عام تھا، جیسا کہ عرب اپنے بھائی اور ساتھی کی تعظیم و تکریم کے لیے اس کی ڈاڑھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں، تو یہ عمل بطریق تذلیل و رسوائی نہ ہوا۔

(۲) آپ پر تختیوں کے نزول نے آپ کو بہت خوش کر رکھا تھا، کیونکہ یہ اسی مناجات میں آپ پر نازل ہوئی تھیں اور آپ نے چاہا کہ آپ انہیں تورات سے پہلے بنی اسرائیل سے مخفی رکھیں۔ تو حضرت ہارون علیہ السلام نے آپ کو کہا: میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑو، تاکہ اس تذلیل کی وجہ سے بنی اسرائیل پر آپ کی خوشی مشتبہ نہ ہو جائے۔

(۳) آپ نے یہ عمل اس لیے کیا کیونکہ آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کے ساتھ بچھڑے کی پرستش کے عمل کی طرف مائل ہیں۔ اور اس طرح کا عمل انبیاء علیہم السلام کے لیے جائز نہیں ہوتا۔

(۴) آپ نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملایا تاکہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ اسے جان لے، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے اسے ناپسند کیا تاکہ بنی اسرائیل یہ گمان نہ کریں کہ آپ نے ان کی اہانت کی ہے۔ پھر آپ کے بھائی نے آپ کو جتایا کہ بنی اسرائیل نے اسے کمزور سمجھا، یعنی بچھڑے کی عبادت کرنے والوں نے اور قریب تھا کہ وہ اسے قتل کر دیتے۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھائی کا عذر سنا تو کہا: اے میرے رب! میری اور میرے بھائی کی مغفرت فرما (رب اغفرلی ولاخی) یعنی میں نے جس غصے کے سبب تختیاں پھینکیں ہیں میرا وہ عمل معاف فرما دے اور میرے بھائی کی مغفرت فرما، کیونکہ میں نے انہیں بنی اسرائیل کو روکنے میں کوتاہی کرنے والا گمان کیا ہے اگرچہ ان سے کوتاہی واقع نہیں ہوئی۔ یعنی تو میرے

بھائی کی مغفرت فرما اگر اس سے کوتاہی ہوئی ہے۔

حسن نے کہا ہے: حضرت ہارون علیہ السلام کے سوا ان تمام نے بچھڑے کی پرستش کی، کیونکہ اگر وہاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے سوا کوئی مومن ہوتا تو آپ اپنے قول میں صرف اس پر اکتفا نہ کرتے: رب اغفرلی ولاخی، آپ یقیناً اس مومن کے لیے بھی دعا کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنے لیے اس فعل سے استغفار کیا جو آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا۔ آپ نے انہیں اس پر پانے کی وجہ سے ایسا کیا۔ جب کہ وہ اس عمل کے ساتھ ملحق نہ تھے تو انہوں نے جو کچھ ہوا اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا تا کہ آپ رجوع کر لیں پھر دونوں نے بنی اسرائیل کے عمل کا تدارک کیا۔ اسی لیے کہا: یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ الآیہ (طٰہٰ) (موسیٰ نے (آکر غصہ سے) کہا: اے ہارون! کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا)۔

تو حضرت ہارون علیہ السلام نے وضاحت کی کہ انہیں تو اپنے قتل کا خوف پیدا ہو گیا تھا پس یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ جسے برائی سے روکتے وقت اپنی جان پر قتل کا خوف ہو اس کے لیے سکوت اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کا بیان پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ غضب احکام کو تبدیل نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ نے آپ کے افعال میں سے کسی شی کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ یہ صرف تختیوں کو پھینکنے، بھائی کو عتاب کرنے اور حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ مارنے کا سبب بنا۔ مہدوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: چونکہ آپ کا غصہ اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے تھا اور بنی اسرائیل سے آپ کا سکوت ان کے باہم لڑنے اور متفرق ہونے کے خوف سے تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ابْنَ اُمَّ آپ ان کی ماں اور باپ دونوں کے بیٹے تھے (یعنی سگے بھائی تھے) البتہ یہ کلمہ انتہائی نرمی اور شفقت و مہربانی کا کلمہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے: کہا گیا ہے حضرت ہارون علیہ السلام صرف ماں کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے باپ کی طرف سے نہیں۔ لفظ ام کو میم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے فتحہ دیا ہے انہوں نے ابن ام کو ایک اسم قرار دیا ہے جیسے خمسۃ عشر۔ پس یہ تیرے اس قول کی طرح ہو گیا: یا خمسۃ عشر اقبلوا اور جنہوں نے کسرہ پڑھا ہے انہوں نے اسے ضمیر متکلم کی طرف مضاف کیا ہے پھر یا اضافت کو حذف کر دیا ہے، کیونکہ نداء کا دارو مدار حذف پر ہے اور انہوں نے میم میں کسرہ کو باقی رکھا ہے تا کہ وہ اضافت پر دلیل ہو جائے، جیسا کہ یہ قول یا عباد اور اس پر ابن السمیقع کی قراءت یا ابن امی دلالت کرتی ہے کہ اس میں یا اپنے اصل پر ثابت ہے۔

کسائی، فراء اور ابو عبید نے کہا ہے: یہ یا ابن ام فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس کی تقدیر یا ابن اماہ ہے۔ اور بصریوں نے کہا: یہ قول غلط ہے، کیونکہ الف خفیف حرف ہے حذف نہیں ہو سکتا، البتہ اس نے دو اسموں کو ایک اسم بنا دیا ہے۔ اخفش اور ابو حاتم نے کہا ہے: یا ابن ام یعنی کسرہ کے ساتھ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: یا غلام غلام اقبل، یہ لغت شاذ ہے اور اس کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

قراءت کرنا بعید ہے۔ بلاشبہ یہ اس میں ہوتا ہے جو تیری طرف مضاف ہو۔ اور رہا وہ مضاف جو اس کی طرف مضاف ہو جو تیری طرف مضاف ہے تو اس میں وجہ یہ ہے کہ تو کہے: یا غلام غلامی، اور یا ابن اخی۔ اور یا ابن ام اور یا ابن عم بھی کلام میں اس کی کثرت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا ہے۔

زجاج اور نحاس نے کہا ہے: لیکن اس کی حسین اور جید وجہ یہ ہے کہ الابن کو ام اور عم کے ساتھ ملا کر ایک اسم بنا دیا جائے۔ یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہے: یا خمسة عشر أقبلوا پس یا کو حذف کر دیا گیا جیسے یا غلام سے اسے حذف کیا گیا۔ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ یعنی قوم نے مجھے ذلیل و رسوا کیا اور مجھے کمزور و بے بس بنا دیا۔ وَ كَادُوْا یعنی یہ قریب ہو گئے۔ يَقْتُلُوْنَنِیْ یہ لفظ دونوں نونوں کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے۔ اور غیر قرآن میں اس میں ادغام جائز ہوتا ہے۔ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ یعنی آپ دشمنوں کو خوش کیجئے۔ اور الشماتہ کا معنی ہے: السرور بما يصيب أخاك من المصائب في الدين والدنيا (یعنی تیرے کسی بھائی کو دین و دنیا میں مصائب و آلام میں سے جو پہنچے اس پر اظہار مسرت کرنا، شماتت کہلاتا ہے) اور یہ حرام ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: لا تظهر الشماتة بأخيك فيعافيه الله ويبليك (تو اپنے بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کر (کہیں ایسا نہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ اسے نجات عطا فرما دے اور تجھے اس میں مبتلا کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پناہ مانگتے تھے اور یہ عرض کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إني أعوذ بك من سوء القضاء ودرك الشقاء وشماتة الأعداء (1) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بری تقدیر سے، بدبختی پانے سے اور دشمنوں کی تکلیف پر خوش ہونے سے) اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا ما الدّهرُ جر على أُناسٍ　　كَلَاكِلَه　　أناخ　　بآخرينا
فقل للشامتين بِنَا أَفِيقوا　　سَيَلقَى الشامتون كما لَقِينا

حضرت مجاہد اور مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہما نے تا کے نصب اور میم کے فتحہ کے ساتھ تَشْمَتْ اور الأعداء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے: تو میرے ساتھ وہ سلوک نہ کر جس کے سبب دشمن خوش اور مسرور ہوں (لا تفعل بي ما تشمت من أجله الأعداء) یعنی ان کی طرف سے ایسا کوئی فعل نہیں ہوا جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تشمت دونوں ہی فتحہ مروی ہے اور الأعداء نصب کے ساتھ ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اے میرے رب! تو مجھ پر خوش نہ ہو۔ اور یہ جائز ہے جیسا کہ یہ قول ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:15) وغیرہ۔ پھر مقصود اور مراد کی طرف رجوع فرمایا اور وہ فعل مضمر کر دیا جس کے ساتھ الْاَعْدَآءَ کو نصب دی، گویا کہ اس طرح فرمایا: ولا تشمت بي الأعداء۔

ابو عبید نے کہا ہے: میں نے حمید سے بیان کیا ہے کہ یہ فلا تشمت میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں، کیونکہ اگر یہ شمت سے ہو تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور اگر یہ اشمت سے ہے تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (ظالمین

1۔ صحیح بخاری، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 979

سے) مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

''بے شک انہوں نے بنالیا بچھڑے کو معبود جلدی ہی پہنچے گا انہیں غضب ان کے رب کی طرف سے اور رسوائی دنیا کی زندگی میں اور اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں بہتان باندھنے والوں کو۔ اور جنہوں نے کیے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے بے شک آپ کا رب اس کے بعد بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب ہونے کا معنی سزا ہے۔ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کیونکہ انہیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذلت سے مراد جزیہ ہے۔ لیکن یہ معنی بعید ہے، کیونکہ جزیہ ان سے نہیں لیا گیا تھا بلکہ ان کی اولاد سے لیا گیا تھا۔ پھر یہ کہا گیا ہے: یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام مکمل ہو رہا ہے، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے دی ہے اور کلام مکمل ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ یہ قول حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے اس سے پہلے کہ آپ کی قوم اپنے آپ کو قتل کرنے کے ساتھ توبہ کرے، کیونکہ جب انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس قتل عظیم کے بعد انہیں معاف فرما دیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ ان میں سے جو مقتول ہوا وہ شہید ہے اور جو زندہ باقی رہا تو اس کی بخشش کر دی گئی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وہاں ایک گروہ تھا ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ڈال دی گئی، انہوں نے توبہ نہیں کی، پس ارشاد باری تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سے مراد وہی لوگ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات سے واپس لوٹنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ان کی اولاد ہے۔ اور وہ وہ ہے جو بنی قریظہ اور بنی نضیر پر وقوع پذیر ہوا، یعنی عنقریب ان کی اولاد کو (غضب الٰہی) پہنچے گا۔ واللہ اعلم

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ یعنی جس طرح کا سلوک ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے اسی طرح ہم بہتان باندھنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کوئی بدعت کا ارتکاب کرنے والا نہیں ہے مگر وہ اپنے سر پر ذلت و رسوائی کو پاتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ یعنی مبتدعین (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور اس سے خون بہنے لگا اور آپ نے اسے مبرد کے ساتھ ٹھنڈا کیا

اور اسے خون سمیت سمندر میں پھینک دیا اور انہیں اس سے پانی پینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس جس کسی نے اس بچھڑے کی عبادت کی تھی اور اسے وہ پانی پلایا گیا تو وہ اس کے منہ کی اطراف پر ظاہر ہو گیا۔ پس اس سے بچھڑے کی عبادت کرنے والے پہچان لیے گئے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی بے شک اللہ تعالیٰ شرک وغیرہ سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ یہ بھی کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ یعنی جنہوں نے کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا۔ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا ایسا کرنے کے بعد پھر انہوں نے توبہ کر لی۔ وَاٰمَنُوْۤا٘ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا یعنی بلاشبہ آپ کا رب توبہ کے بعد لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ مغفرت فرمانے والا رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ ۝

"اور جب فرو ہو گیا موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ تو اٹھا لیا ان تختیوں کو اور ان کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اس میں سَكَتَ بمعنی سکن (ساکن ہونا، فرو ہونا) ہے۔ اسی طرح معاویہ ابن قرہ نے سکن نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ سکوت میں اصل سکون اور امساک (رک جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے جری الوادی ثلاثا ثم سکن، یعنی پھر وادی چلنے سے رک گئی۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سکت موسیٰ عن الغضب تو اس میں قلب کیا گیا ہے۔ جیسے تیرا یہ قول ہے: أدخلتُ الأصبع فی الخاتم (میں نے انگلی انگوٹھی میں داخل کی) اور أدخلت الخاتم فی الأصبع (میں نے انگوٹھی انگلی میں داخل کی) أدخلت القلنسوۃ فی رأسی (میں نے ٹوپی اپنے سر میں داخل کی) اور أدخلت رأسی فی القلنسوۃ (میں نے اپنا سر ٹوپی میں داخل کیا)

اَخَذَ الْاَلْوَاحَ یعنی آپ نے ان تختیوں کو اٹھا لیا جنہیں آپ نے پھینکا تھا۔ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ یعنی ان کی تحریر میں ضلالت و گمراہی سے ہدایت اور عذاب سے رحمت تھی۔ اور نسخ کا معنی ہے: نقل ما فی کتاب إلی کتاب آخر (یعنی جو کچھ ایک کتاب میں تحریر ہے اسے دوسری کتاب میں منتقل کرنا) جس اصل سے تو نے لکھا اسے نسخہ اور فرع کو بھی نسخہ کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے: جب تختیاں ٹوٹ گئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن روزے رکھے، پھر وہ آپ پر واپس کر دی گئیں اور آپ کو وہ تختیاں دو تختیوں میں لوٹا دی گئیں (1) اور ان سے کوئی شے مفقود نہ کی تھی۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اس بنا پر وَفِیْ نُسْخَتِهَا کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو کچھ ٹوٹی ہوئی تختیوں میں تحریر تھا اور وہ نئی تختیوں میں منتقل کیا گیا وہ ہدایت اور رحمت ہے۔ اور حضرت عطا نے بیان کیا ہے: اور اس میں جو ان میں سے باقی بچا اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ اور ان میں سے ساتویں تختی کے سوا کوئی باقی نہ رہی اور ان میں سے چھ ختم ہو گئیں۔ لیکن حدود اور احکام

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 549

میں سے کوئی شے ختم نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَفِيْ نُسْخَتِهَا کا معنی ہے: آپ کے لیے ان تختیوں میں جو کچھ لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے اس میں ہدایت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کچھ ان میں لکھا گیا ہے اس میں ہدایت اور رحمت ہے، پس وہ اس اصل کے محتاج نہیں ہیں جس سے یہ منقول ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: النسخ ما يقول فلان، یعنی اپنی کتاب میں وہی کچھ لکھ دے جو فلاں کہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ یہ بمعنی یخافون ہے (یعنی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ لِرَبِّهِمْ کے لام میں تین اقوال ہیں: کوفیوں نے کہا ہے یہ لام زائدہ ہے۔ کسائی نے کہا ہے: مجھے اس نے بتایا ہے جس نے فرزدق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نقدت لها مائة درهم بمعنی نقد تها (میں نے سو درہم گنے) اور بعض نے کہا ہے: یہ لام اجل ہے، معنی یہ ہے: وہ لوگ جو اپنے رب کی وجہ سے ڈرتے ہیں نہ ان میں ریا کاری ہے اور نہ شہرت، یہ اخفش سے منقول ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ لام مصدر کے متعلق ہے معنی یہ ہے: للذين هم رهبتهم لربهم (ان لوگوں کے لیے جن کا خوف اور ڈر اپنے رب کے لیے ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب مفعول مقدم ہو تو لام داخل کرنا اچھا اور حسین ہوتا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے: اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (یوسف) پس جب معمول مقدم ہو اور وہ مفعول ہو تو فعل کا عمل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے پس یہ اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو متعدی نہیں ہوتا۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور چن لیے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے وعدۂ ملاقات کے لیے پھر جب پکڑ لیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے تو موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی، کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم سے، نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش۔ تو گمراہ کرتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ہی ہمارا کارفرما ہے بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا اس میں قَوْمَهٗ اور سَبْعِيْنَ رَجُلًا دو مفعول ہیں اور ان میں سے ایک سے مِن کو حذف کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے یہ شعر بیان کیا ہے:

مِنَّا الذي اُخْتِيرَ الرجالَ سَماحةً وبِرًّا إذا هَبَّ الرِّياحُ الزَّعازِعُ(1)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 155

اور رائی نے ایک آدمی کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے:

اختَرتُكَ النّاسَ إذْ رَثّت خلائقُهُم   واختلَّ من كان يُرجَى عنده السُّولُ

اس میں مراد اختَرتُكَ من النّاس ہے۔ اختار اصل میں اختیر ہے۔ پس جب یا متحرک ماقبل مفتوح ہے تو اسے الف سے بدل دیا گیا، جیسے قال اور باع۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی جب وہ مر گئے۔ لغت میں الرجفة سے مراد شدید زلزلہ ہے۔ روایت ہے کہ ان پر زلزلہ آیا، یہاں تک کہ وہ مر گئے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتا، جیسے اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ (النساء: 176) (اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے) اور وَ اِيَّايَ معطوف ہے۔ معنی یہ ہے: اگر تو چاہتا تو ہمیں موت دے دیتا ہم بنی اسرائیل کی موجودگی میں اس سے پہلے کہ ہم وعدہ ملاقات کے لیے نکلتے تاکہ وہ مجھے متہم نہ کرتے۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے کہا ہے: یحییٰ بن سعید القطان نے سفیان سے، انہوں نے ابو اسحاق سے، انہوں نے عمارہ بن عبد سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام چلے اور ان کے ساتھ شبر اور شبیر بھی نکلے۔ یہ دونوں حضرت ہارون علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ پس وہ سب ایک پہاڑ کے پاس رکے اس میں ایک چارپائی تھی، تو حضرت ہارون علیہ السلام اس پر آرام فرما ہوئے تو ان کی روح قبض کر لی گئی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مراجعت فرما ہوئے، تو انہوں نے کہا: تم نے انہیں قتل کر دیا ہے، تم نے ہمارے ساتھ ان کی نرمی اور خوش اخلاقی پر حسد کیا ہے یا انہوں نے اسی طرح کا کلام کیا۔ یہ شک سفیان کو ہے۔

تو آپ نے فرمایا: میں انہیں کیسے قتل کر سکتا تھا حالانکہ ان کے دو بیٹے میرے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا: پس تم چن لو جسے تم چاہو۔ تو انہوں نے ہر قبیلے سے دس افراد چن لیے۔ آپ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: پس اسی کے متعلق یہ ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا وہ تمام آپ (ہارون علیہ السلام) کے پاس جا کر رکے اور کہا: اے ہارون! تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: ما قتلني أحد ولكن الله توفاني (مجھے کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے موت دی ہے) وہ کہنے لگے: اے موسیٰ (علیہ السلام) فیصلہ نہیں ہو رہا۔ تو زلزلے نے انہیں پکڑ لیا، پس وہ دائیں بائیں جھولنے لگے اور آپ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کہتے ہیں: لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ فرمایا: پس آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا اور ان تمام کو انبیاء بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اس قول کی وجہ سے انہیں شدید زلزلے نے پکڑ لیا۔ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء: 153) (تم ہمیں اللہ تعالیٰ کا ظاہر دیدار کراؤ) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (البقرہ: 55) (اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم

دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں شدید زلزلے نے اس لیے پکڑ لیا، کیونکہ انہوں نے انہیں منع نہیں کیا تھا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی، حالانکہ وہ اس کی عبادت پر راضی نہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ستر افراد ان کے سوا تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی زیارت ظاہراً کراؤ۔ اور وہب نے کہا(1) ہے: وہ مرے نہیں تھے، بلکہ انہیں شدید زلزلے نے پکڑا تو وہ ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس طرح ہو گئے کہ ان کے جوڑ جوڑ جدا جدا ہو جائیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی موت کا خوف لاحق ہو گیا۔ حالانکہ سورۃ البقرہ میں حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت گزر چکی ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات مردہ حالت میں رہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں زلزلہ کے پکڑنے کا سبب ان کے علاوہ ہے۔ صحیح سبب کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قول باری تعالیٰ: اَتُهْلِكُنَا میں مقصود استفہام انکاری ہے یعنی تو اس طرح نہیں کرے گا۔ اور عرب کلام میں اس کا استعمال کثیر ہے۔ اور جب کلام نفی ہو تو وہ بمعنی ایجاب ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ألستم خيرَ مَنْ ركب المطايا وأندَى العالمين بُطونَ راحِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی دعا اور طلب ہے، یعنی تو ہمیں ہلاک نہ کر اور اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے مراد وہ قوم ہے جو زلزلہ کے سبب مری۔ اور مبرد نے کہا ہے: استفہام سے مراد استفہام برائے استعظام ہے۔ گویا وہ کہہ رہے ہیں: تو ہمیں ہلاک نہ کر، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض ہلاک نہیں کرتا۔ لیکن آپ نے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی طرح کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ:118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) بعض نے کہا: سفہاء سے مراد یہی ستر افراد ہیں۔ اور معنی یہ ہے: کیا تو بنی اسرائیل کو اس عمل کے عوض ہلاک کر دے گا جو ان بے وقوفوں نے یہ قول کہہ کر کیا: اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء:153)

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش اور تیرا امتحان۔ اس میں آپ نے فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف کی ہے اپنی طرف اس کی نسبت نہیں کی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (الشعراء) اس میں انہوں نے مرض (بیماری) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔ اور حضرت یوشع نے کہا ہے تھا: وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (الکہف:63) (اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے) بلا شبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا استفادہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ (طٰہٰ:85) پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آئے تو دیکھا بچھڑا عبادت کے لیے کھڑا کیا گیا ہے اور اس کی آواز گائے کی طرح ہے۔ تو آپ نے کہا: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش تو فتنہ کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (جسے تو چاہتا ہے اور تو ہدایت دیتا

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 550

ہے جسے تو چاہتا ہے) یہ قدریہ کا رد ہے۔

وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں خیر و برکت اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف۔ الله نے فرمایا: میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً یعنی تو ہمیں ایسے اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرما جن کے عوض ہمارے لیے نیکیاں لکھی جائیں۔ وَّ فِي الْاٰخِرَةِ یعنی (آخرت میں) ان پر جزا ہو۔

اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ یہ حضرت مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور الھود کا معنی توبہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ یعنی جو اس کے مستحق ہیں، یعنی یہ زلزلہ اور صاعقہ میری طرف سے عذاب ہے میں اسے پہنچاتا ہوں جسے چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ مَنْ اَشَآءُ کا معنی ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ میں اسے گمراہ کردوں۔

قولہ: وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ اس میں عموم ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، یعنی جو بھی اس میں داخل ہو یہ اس سے عاجز نہیں (یعنی ہر شے اس عموم میں داخل ہے) اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری رحمت مخلوق میں سے ہر شے پر کشادہ ہے یہاں تک کہ چوپائے بھی اپنی اولاد پر رحمت کناں اور مہربان ہیں۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے: اس آیت میں ہر شے حتیٰ کہ ابلیس بھی شامل ہے، پس اس نے کہا: میں بھی شے ہوں، تو الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (سو میں اس کو لکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں) پھر یہود و نصاریٰ نے کہا: نحن متقون (ہم متقی ہیں) تب الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الآیہ (الاعراف: 157) (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے) پس یہ آیت عموم سے نکل گئی، والحمد لله۔ حماد بن سلمہ نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الله تعالیٰ نے اسے اس امت کے لیے لکھا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462

التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ۡ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ ﴿۱۵۷﴾

''(یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔ وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔ پس جو لوگ ایمان لائے اس (نبی امی) پر اور تعظیم کی آپ کی اور امداد کی آپ کی اور پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا آپ کے ساتھ وہی (خوش نصیب) کامیاب و کامران ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے نوف بکالی حمیری (1) سے روایت بیان کی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے وعدہ ملاقات کے لیے اپنی قوم کے ستر افراد چن لیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں تمہارے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنادوں تم نماز پڑھ سکو گے جہاں تمہیں نماز کا وقت آپہنچے سوائے غسل خانہ یا حمام یا قبرستان کے اور یہ کہ میں تمہارے دلوں میں سکینہ رکھ دوں اور میں تمہیں اس طرح بنادوں کہ تم تورات حفظ اور ازبر پڑھنے لگو، تم میں سے مرد و عورت، آزاد و غلام اور صغیر و کبیر سبھی اسے پڑھ سکیں گے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بارے اپنی قوم کو بتایا، تو انہوں نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ہم گرجا گھروں کے بغیر نماز پڑھیں اور نہ ہم اپنے دلوں میں سکینہ اٹھانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ سکینہ اس طرح ہو جیسے پہلے اور تابوت میں تھی اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم تورات کو دیکھے بغیر پڑھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ۡ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ پس اسے اس امت کے لیے بنادیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار، تو مجھے ان کا نبی بنادے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان کا نبی ان میں سے ہوگا۔ پھر عرض کی: اے میرے رب! مجھے ان میں سے بنادے۔ فرمایا: تم انہیں ہرگز نہ پاسکو گے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! میں تیرے پاس بنی اسرائیل کا وفد لے کر آیا ہوں، تو نے ہمارے وفد کا تحفہ ہمارے سوا دوسروں کو عطا فرمادیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 101

بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے)

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر راضی ہو گئے۔ نوف نے کہا(1) ہے: پس تم اس اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرو جس نے بنی اسرائیل کا تحفہ تمہیں عطا فرمایا ہے۔ ابونعیم نے بھی یہ قصہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ بن ابی عمرو شیبانی نے بتایا ہے انہوں نے کہا مجھے نوف بکالی نے بیان کیا ہے جب انہوں نے وعظ ونصیحت شروع کیا فرمایا: کیا تم اپنے اس رب کی حمد وثنا بیان نہیں کرو گے جس نے تمہاری حالت غیوبت میں تمہاری حفاظت کی اور اس نے تمہیں تمہارے نصیب کے بعد بھی مزید عطا کیا اور قوم بنی اسرائیل کو دیا جانے والا تحفہ تمہارے لیے رکھ چھوڑا۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا وفد لے کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں نے تمہارے لیے زمین کو مسجد بنا دیا ہے اس طرح کہ اس میں جہاں بھی تم نماز پڑھو گے میں تمہاری نماز قبول کرلوں گا سوائے تین جگہوں کے جس نے ان میں نماز پڑھی میں اس کی نماز قبول نہیں کروں گا اور وہ قبرستان، حمام اور غسلخانہ ہے۔ تو انہوں نے کہا: نہیں، مگر کنیسہ میں۔ رب کریم نے فرمایا: میں نے تمہارے لیے مٹی کو پاکیزہ بنا دیا ہے جب تم پانی نہ پاؤ (تو اس سے طہارت حاصل کرلو) انہوں نے کہا: نہیں مگر پانی کے ساتھ۔ فرمایا: اور میں نے تمہیں اس طرح بنا دیا ہے کہ جس نے اکیلے نماز پڑھی تو میں اس کی نماز قبول کرلوں گا۔ انہوں نے کہا: نہیں، مگر جماعت کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ** ان الفاظ نے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے(2) یہودی ونصاریٰ کو اس اشتراک سے خارج کر دیا ہے جو اس قول **فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ** میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ وعدہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے خاص ہو گیا۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم وغیرہما نے کہا ہے۔ اور **يَتَّبِعُوْنَ** کا مفہوم ہے یعنی وہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، آپ کے دین اور آپ کے لائے ہوئے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔ رسول اور نبی دو اسم ہیں اور دو معنوں کے لیے ہیں، کیونکہ رسول نبی کی نسبت اخص ہوتا ہے اور لفظ رسول کو معنی رسالت کے اہتمام کے لیے مقدم کیا گیا ہے، ورنہ معنوی اعتبار سے نبوت مقدم ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کا رد کیا جب انہوں نے یہ کہا: وبرسولك الذی أرسلت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: قل آمنتُ بنبیك الذی أرسلت یعنی کہو میں تیرے اس نبی کے ساتھ ایمان لایا جسے تو نے مبعوث فرمایا) یہ صحیح میں مذکور ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کے قول: وبرسولك الذی أرسلت میں رسالت کا ذکر مکرر ہے۔ اور اس کا معنی ایک ہے پس یہ ایسی زیادتی کی مثل ہو جائے گا جس میں کوئی فائدہ نہیں، بخلاف اس قول کے وبنبیك الذی أرسلت کیونکہ نبوت و رسالت میں کوئی تکرار نہیں ہے(3)۔ اس بنا پر ہر رسول نبی ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں، کیونکہ رسول اور نبی دونوں امر عام میں مشترک ہیں اور وہ ہے النبأ (خبر دینا مراد نبوت ہے) اور امر خاص میں دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور وہ ہے رسالت۔ پس جب تو نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہیں تو یہ اس معنی کو بھی متضمن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 461　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 462　3۔ ایضاً

اور رسول ہیں۔ اور اسی طرح آپ ﷺ کے سوا دیگر انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے بارے میں بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: الْاُمِّیَّ یہ اُمّۃ اُمیّۃ کی طرف منسوب ہے، وہ جو اپنی ولادت کی اصل حالت پر ہو، نہ وہ لکھنا سیکھے اور نہ ہی پڑھنا۔ یہ ابن عزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تمہارے نبی ﷺ امی تھے نہ وہ لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں اور نہ وہ حساب لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت: 48) (اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے)

اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: أنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب الحدیث (1) (بے شک ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ شمار کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم ﷺ کی مکہ ام القریٰ کی طرف نسبت ہے (اس وجہ سے آپ کو امی کہا گیا ہے) اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں محمد بن سنان نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں فلیح نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ہلال نے عطا بن یسار سے بیان کیا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما (2) سے ملاقات کی اور میں نے کہا: تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفت کے بارے میں مجھے بتایئے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہاں قسم بخدا! بے شک تورات میں آپ ﷺ کی بعض وہ صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا (الاحزاب) اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا) اور امیوں کے لیے پناہ گاہ بنا کر بھیجا، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ اکھڑ مزاج اور تند خو نہیں ہیں اور نہ آپ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں، آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے ہیں بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کی روح قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ان کے سبب ٹیڑھی ملت کو سیدھا کر دے۔ اس طرح کہ وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے لگیں اور وہ اس کے ساتھ اندھی آنکھوں کو، بہرے کانوں کو اور بند دلوں کو کھول دے۔

(بخاری کے علاوہ دوسری کتب میں ہے) حضرت عطا نے بیان کیا: پھر میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے ملا اور اسی کے بارے ان سے سوال کیا تو دونوں کے الفاظ میں کوئی اختلاف نہ ہوا (یعنی انہوں نے بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسا جواب دیا) مگر یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان میں فرمایا: قلوبا غُلُوفِيا وآذانا صمومياً وأعينا عموميا۔ ابن عطیہ (3) نے کہا ہے: میں یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ وہم ہے یا عجمہ ہے۔ تحقیق حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے: قلوبا غلوفا و آذانا صموما واعينا عموميا۔ علامہ طبری نے کہا ہے: یہ قبیلہ حمیر کی لغت ہے۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ کی صفات میں مزید یہ بیان کیں: آپ کا مولد شریف مکہ مکرمہ ہے۔ اور آپ کی ہجرت گاہ طابہ ہے اور آپ کا ملک

1۔ صحیح مسلم، کتاب القیام، جلد 1، صفحہ 347　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462　　3۔ ایضاً

شام ہے۔ آپ کی امت حمد اور تعریف بیان کرنے والی ہے وہ ہر حال اور ہر منزل میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے، وہ اپنے اعضاء کو وضو میں دھوئیں گے اور اپنی پنڈلیوں کے نصف تک چادریں باندھیں گے، دھوپ کو پسند کرنے والے ہوں گے اور وہ وہیں نماز پڑھیں گے جہاں انہیں نماز نے آلیا اگرچہ جھاڑو مارتے ہوئے۔ میدان جہاد میں ان کی صف نماز میں ان کی صف کی مثل ہوگی۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف) (بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ انہیں شرک چھوڑنے، مکارم اخلاق اپنانے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ انہیں منکر یعنی بتوں کی عبادت کرنے اور قطع تعلقی سے منع کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات سے مراد محللات (حلال چیزیں) ہیں۔ تو گویا آپ نے محللات کو طیب کی صفت سے متصف کیا ہے، کیونکہ یہ ایسا لفظ ہے جو مدح وتشریف کو متضمن ہے۔ اور اس اعتبار سے خبائث کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ ان سے مراد محرمات (حرام چیزیں) ہیں اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: خبائث سے مراد خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ہے۔ اور اس بنا پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے متقذرات (ناپسندیدہ چیزیں) مثلاً سانپ، بچھو، گبریلا وغیرہ کو حلال قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات وہ ہیں جو کھانے کے اعتبار سے طیب اور پاکیزہ ہوں مگر ان کے نزدیک یہ لفظ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ کھانے اور ذائقے کے اعتبار سے اس کا عموم شراب اور خنزیر کو حلال کرنے کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ آپ اسے ان چیزوں کے ساتھ مختص قرار دیتے ہیں جنہیں شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ اور آپ لفظ خبائث کو عام قرار دیتے ہیں اور یہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو شرعاً محرمات ہیں یا متقذرات ہیں۔ پس وہ بچھوؤں، گبریلوں اور چھپکلی اور ان جیسی دیگر چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ پس لوگوں کے یہی دونوں نظریے ہیں اور سورۃ البقرہ میں یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ، الاصر کا معنی ثقل اور بوجھ ہے (1)۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن جبیر نے یہی کہا ہے۔ اور اصر سے مراد عہد بھی ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور یہ آیت دونوں معنوں کو جامع ہے، کیونکہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ بوجھل اور بھاری اعمال کے ساتھ قائم رہیں، پس اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ان سے وہ عہد اور ان اعمال کا بوجھ اتار لیا، جیسا کہ پیشاب کو دھونا اور مال غنیمت کو حلال کر دینا، حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، اس کے ساتھ مل کر کھانا اور اس کے ہمراہ لیٹنا وغیرہ، کیونکہ ان میں سے اگر کسی کے کپڑے پر پیشاب لگ جاتا تو وہ اسے کاٹ دیتا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ اگر ان کی جلد پر پیشاب لگ جاتا اور جب وہ مال غنیمت جمع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463

کرتے تو آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی اور وہ اسے کھا جاتی (1) اور جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تو وہ اس کے قریب نہ جاتے۔ علاوہ ازیں بھی اسی طرح احکام تھے جو حدیث صحیح وغیرہ میں ثابت ہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ پس اغلال (زنجیریں) انہیں بوجھوں کے لیے مجاز اً ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان بوجھوں میں سے ہفتے کے دن کاروبار چھوڑنا بھی ہے، کیونکہ یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہفتے کے دن ایک آدمی کو گھاس (کانے) اٹھائے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن ماردی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے (2)۔ اور ان میں دیت نہ تھی، البتہ قصاص تھا۔ اور ان کی توبہ کی علامت کے طور پر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ آپس میں قتال کریں، علاوہ ازیں بھی احکام تھے۔ پس انہیں بھی اغلال کے ساتھ تشبیہ دی گئی، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فليس كعهد الدّار يا أم مالك　　ولكن أحاطت بالرقاب السلاسل(3)

وعاد الفتَى كالكَهْل ليس بقائل　　سوى العدل شيئا فاستراح العواذل

پس حدود اسلام اور ممنوعات کی طرف قدم بڑھانے کے موانع کو ایسی زنجیروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو گردنوں کو گھیرے ہوئے ہوں۔ اور اس معنی میں ابو احمد بن جحش کا ابو سفیان کے لیے قول ہے:

إذهب　بها　إذهب　بها　طُوِّقتَها　طوقَ　الحمامه

یعنی اس کی عار تجھے لازم ہے۔ کہا جاتا ہے: طوق فلان کذا جب وہ اسے لازم پکڑ لے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اگر کہا جائے: أغلال جو کہ جمع ہے اس کا عطف اصر پر کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ مفرد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصر مصدر ہے اور اس کا اطلاق کثرت پر ہوتا ہے۔ اور ابن عامر نے تو آصارھم جمع کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا أعمالهم ہے۔ اور اس کی جمع گناہوں کی اقسام مختلف ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور باقیوں نے اسے واحد پڑھا ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے اور اس کا اطلاق اپنی جنس کے قلیل و کثیر افراد پر ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ لفظاً مفرد ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا (البقرہ: 286) میں اس کے مفرد ہونے پر اجماع ہے۔ اور اسی طرح کا معنی ہوگا جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ آئیں گے، مثلاً وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ (البقرہ: 7) لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ (ابراہیم: 43) اور مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (الشوریٰ: 45) یہ تمام الفاظ جمع کے معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ یعنی انہوں نے آپ کی عزت و توقیر کی اور آپ کی مدد کی۔ اخفش نے کہا: جحدری اور عیسیٰ نے تخفیف کے ساتھ و عزروہ پڑھا ہے اور اسی طرح عزرتموھم میں بھی ہے کہا جاتا ہے: عَزَرَہ یَعْزِرُہ و یَعْزُرُہ اور الْفَوْز سے قرآن کریم اور الفلاح سے مراد مطلوب کو پانے میں کامیاب ہونا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

1۔ جامع ترمذی، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463　　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 464

الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''آپ فرمائیے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف وہ اللہ جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اس کی تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ''۔

ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے بارے میں یہ کہیں: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا(1) (بے شک میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں) اور كَلِمٰتِهٖ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ کلمات ہیں جو اس نے تورات، انجیل اور قرآن کریم میں لکھے ہیں۔

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے''۔

یعنی وہ لوگوں کو ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور یَعْدِلُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ حکم اور فیصلہ میں عدل کرتے ہیں اور تفسیر میں ہے: یہ ایک قوم ہے جو چین سے پرے اور دریائے رمل سے پرے ہے۔ وہ حق اور عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، وہ حضور نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور ہفتہ کو (کاروبار) چھوڑ دیا، وہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہم میں سے کوئی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ پس یہ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اختلاف رونما ہوا تو ان میں سے ایک گروہ تھا جو حق کے ساتھ راہ بتاتے تھے اور وہ اس پر قادر نہ تھے کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی زمین کے ایک کنارہ کی طرف مخلوق سے الگ تھلگ کر کے نکال دیا، پس ان کے لیے زمین میں ایک راستہ بن گیا، وہ اس میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے یہاں تک کہ وہ چین سے پرے نکل گئے اور وہ اب تک حق پر ہیں۔ ان کے درمیان اور لوگوں کے درمیان ایک سمندر ہے جس کی وجہ سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت جبرئیل امین علیہ السلام شب معراج حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ان کے پاس گئے۔ پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور آپ نے انہیں قرآن کریم کی سورتوں کی تعلیم دی اور پھر انہیں فرمایا: ''کیا تمہارا کیل اور وزن کا کوئی پیمانہ ہے''؟ انہوں نے بتایا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے''؟ انہوں نے بتایا: ہم کھلی زمین کی طرف نکلتے ہیں اور فصل کاشت کرتے ہیں، پھر جب ہم اسے کاٹ لیں تو اسے وہیں رکھ دیتے ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اس کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ قل یایہا الناس، جلد 2، صفحہ 668

حاجت اور ضرورت ہو تو وہ اپنی حاجت کے مطابق اس سے لے لیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری عورتیں کہاں ہیں''؟ انہوں نے بتایا: وہ ہماری ایک طرف (کنارے) میں ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اپنی بیوی کی حاجت اور ضرورت ہو تو وہ حاجت کے وقت اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی اپنی بات میں جھوٹ بولتا ہے''؟ تو انہوں نے بتایا: اگر ہم میں سے کوئی اس طرح کرے تو بھڑکتی آگ اسے پکڑ لیتی ہے، بے شک آگ اترتی ہے اور اسے جلا دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا وجہ ہے تمہارے گھر ہموار اور برابر ہیں''؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے بعض بعض سے بلند نہ ہوں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وجہ ہے تمہاری قبریں تمہارے دروازوں پر ہیں''؟ تو انہوں نے بتایا: تاکہ ہم موت کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ شب معراج دنیا کی طرف لوٹ کر آئے تو آپ پر یہ آیت نازل کی گئی: وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ (الاعراف) (1) مراد حضور نبی مکرم ﷺ کی امت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو آگاہ فرما رہا ہے کہ میں نے جو موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم میں عطا فرمایا میں نے وہ آپ کو آپ کی امت میں عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے ہمارے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایمان لائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو منسوخ ہونے سے پہلے مضبوطی سے تھامے رکھا، نہ انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی کی اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓــٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''اور ہم نے بانٹ دیا انہیں بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف جب پانی طلب کیا آپ سے آپ کی قوم نے (ہم نے وحی کی) کہ مارو اپنے عصا سے اس پتھر کو تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے۔ جان لیا ہر ایک گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اور ہم نے سایہ کر دیا ان پر بادل کا اور ہم نے اتارا ان پر من و سلوی۔ (اور فرمایا) کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ اور نہیں ظلم کیا انہوں نے ہم پر بلکہ وہ اپنی

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 2، صفحہ 270

جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ اور جب کہا گیا انہیں کہ آباد ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو اور کہو (اے کریم) بخش دے ہمیں اور داخل ہو دروازہ سے جھکتے ہوئے ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں (اور) زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو۔ تو بدل ڈالی جنہوں نے ظلم کیا تھا ان سے بات خلاف اس کے جو کہی گئی تھی انہیں، تب ہم نے بھیج دیا ان پر عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ ظلم کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں شمار کیں۔ اور انہیں قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ہر قبیلے کا معاملہ ان کے اپنے سردار کی طرف سے معروف ہو، تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر معاملہ آسان ہو جائے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (المائدہ:12)(1) (اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: اثْنَتَيْ عَشْرَةَ حالانکہ لفظ السبط مذکر ہے کیونکہ اس کے بعد امما ہے پس تانیث امم کی وجہ سے ہوئی۔ اور اگر السبط کے مذکر ہونے کی وجہ سے اثنی عشر کہا جاتا تو جائز ہوتا، یہ فراء سے منقول ہے۔ بعض نے کہا ہے: اسباط سے مراد قبائل اور فرقے ہیں، اسی لیے عدد مونث لایا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

وان قريشا كلها عشر أبطن　　وانت بری من قبائلها العشر

پس وہ بطن سے قبیلہ اور فصیلہ کی طرف گیا۔ پس اسی لیے اسے مونث ذکر کیا۔ اور بطن مذکر ہے، جیسا کہ اسباط مذکر کی جمع ہے۔ زجاج نے کہا (2) ہے: اس کا معنی ہے ہم نے ان کو بارہ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ أسباطا یہ اثنتی عشرۃ سے بدل ہے۔ امما یہ اسباط کی صفت ہے۔ مفضل نے عاصم سے وَقَطَعْنٰهُمُ مخفف روایت کیا ہے۔ أسباط حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں اسباط حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں قبائل کے قائم مقام تھے۔ اسباط، السبط سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی وہ درخت ہے جسے اونٹ چرتے ہیں اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

معمر نے ہمام بن منبہ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ کے بارے میں روایت کیا ہے انہوں نے کہا: دانے ابھی چھلکے میں ہیں۔ (یعنی یہ کام بہت مشکل ہے) اور انہیں کہا گیا: ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا پس وہ اپنی سرینوں پر سہارا لیتے ہوئے داخل ہوئے۔ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ یہ مرفوع ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے اور یہ محل نصب میں ہے۔ اور ما مصدریہ ہے، یعنی بظلمهم اس آیت میں جو معانی اور احکام ہیں وہ سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 557　2۔ ایضاً

مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾

''اور پوچھو ان سے حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر جب کہ وہ حد سے بڑھنے لگے ہفتہ (کے حکم کے بارے) میں جب آیا کرتیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتہ کے دن پانی پر تیرتی ہوئیں اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا تو وہ نہ آتیں ان کے پاس (اس طرح بے دھڑک) ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں بہ سبب اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے۔ اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ تم کیوں نصیحت کرتے ہو اس قوم کو، اللہ جنہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے سخت عذاب۔ انہوں نے کہا: تاکہ معذرت پیش کر سکیں تمہارے رب کے دربار میں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور شاید وہ ڈرنے لگیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ یعنی ان سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں (یعنی یہ اصل میں عن اهل القرية ہے) انہیں اس (قریہ) سے تعبیر کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ وہ ان کی جائے استقرار تھی یا اس لیے کہ وہ ان کے اجتماع کا سبب تھی۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا (یوسف: 82) (اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اهتز العرش لموت سعد بن معاذ یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے آنے سے ملائکہ میں سے اہل عرش فرحت وانبساط کے ساتھ جھومنے لگے۔ آیت میں مراد یہ ہے جو یہود آپ کے پڑوس میں ہیں ان سے ان کے اسلاف کے حال کے بارے پوچھو اور اس کے بارے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بندروں اور خنزیروں میں بدل دیا تھا۔ یہ سوال برائے تقریر وتوبیخ ہے۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی علامت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر تعلم کے ان امور پر مطلع فرما دیا تھا۔ اور وہ کہتے تھے: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتوں میں سے ہیں اور اسرائیل کے پوتوں میں سے ہیں اور وہ بکر اللہ تھے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کے بیٹے عزیر کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کی اولاد میں سے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس بستی والوں کے بارے میں پوچھو، کیا میں نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے عذاب نہیں دیا۔ اور وہ فروع شریعت میں سے ایک فرع کو تبدیل کرنے کے سبب ہوا۔ اور اس بستی کی تعیین کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس، عکرمہ اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ ایلہ ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ایلہ اور طور کے درمیان مدین ہے۔

زہری نے کہا ہے: وہ طبریہ ہے۔ حضرت قتادہ اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ شام کے سواحل میں سے ایک ساحل ہے اور یہ مدین اور عینون کے درمیان ہے، اسے مقناۃ کہا جاتا ہے۔ یہودی اس قصہ کو چھپاتے تھے، کیونکہ اس میں ان کی بہت سبکی اور بے عزتی ہے۔

الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ یعنی وہ سمندر کے قریب آباد تھے۔ تو کہتا ہے: كنتُ بحضرة الدار أي بقربها یعنی میں گھر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 467

کے قریب ہوں۔ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ یعنی وہ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے، حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے: سَبَت الیهودُ انہوں نے اپنے ہفتہ کے بارے حکم پر عمل ترک کر دیا۔ اور سُبِت الرجلُ مفعول کو سباتاً کہا جاتا ہے (یعنی آدمی کو نیند آ گئی) اس نے اسے گونگے کی مثل کر چھوڑا۔ اور اسبت وہ ساکن ہو گیا اور اس نے حرکت نہ کی اور القوم صاروا فی السبت قوم نیند اور آرام میں ہو گئی۔

اور یہودی ہفتہ کے دن میں داخل ہوئے الیهود دخلوا فی السبت اس میں السبت سے مراد معروف دن (یعنی ہفتہ کا دن ہے) اور راحة (آرام لینا) اور قطع (کسی شے کو کاٹنا) کے معنی میں بھی ہے۔ اس کی جمع أسْبُت، سُبُوت اور أسبات آتی ہے۔ اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، ''جس کسی نے ہفتے کے دن پچھنے لگوائے تو اسے برص کی بیماری لگ جائے گی پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے''، ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہفتہ کے دن خون جم جاتا ہے، پس جب تو اسے باہر نکالنے کے لیے کھینچے گا تو وہ جاری نہیں ہوگا اور وہ برص کی طرف لوٹ جائے گا۔

جمہور کی قراءت یَعْدُون ہے اور ابونہیک نے یُعِدُّون یاء کے ضمہ، عین کے کسرہ اور دال کی شد کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پہلا لفظ الاعتداء سے ہے اور دوسرا الاعداد سے ہے، یعنی وہ انہیں پکڑنے کا آلہ تیار کرتے ہیں۔ ابن السمیقع نے فی الأسبات، السبت کی جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ اور اسے أسباتهم بھی پڑھا گیا ہے۔ شُرَّعًا یعنی کثیر تعداد میں پانی پر ظاہراً تیرتے ہوئے۔ حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مچھلیاں اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ سمندر کی مچھلیاں ہفتے کے دن سمندر سے تیرتے ہوئے آتیں اور ایلہ میں جمع ہو جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کیا کہ انہیں ہفتہ کے دن شکار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کا شکار کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ان کے دروازوں پر اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتی تھیں، جیسا کہ سفید مینڈھے ہوتے ہیں۔ اسے بعض متاخرین نے بیان کیا ہے۔ پس وہ حد سے بڑھنے لگے اور انہوں نے انہیں ہفتے کے دن پکڑنا شروع کر دیا۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ اتوار کے دن پکڑنے لگے، یہی زیادہ صحیح قول ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

وَّیَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ یعنی وہ ہفتہ کے دن (ایسا) نہ کرتے۔ کہا جاتا ہے: سبت یسبِت جب وہ ہفتے کے دن کی تعظیم کرے۔ حسن نے یاء کے ضمہ کے ساتھ یُسْبِتون پڑھا ہے، یعنی وہ ہفتے کے دن میں داخل ہوتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: أجمعنا وأظهرنا وأشهرنا یعنی ہم جمعہ، ظہر اور مہینے میں داخل ہوئے۔ لَا تَاْتِیْهِمْ یعنی ان کی مچھلیاں نہ آتیں۔ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ یعنی ہم عبادت میں ان پر سختی کرتے ہیں اور انہیں آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ یعنی ان کے فسق کے سبب (ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا)۔ حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم کتاب اللہ میں کوئی حلال پاتے ہو جو تمہارے پاس سوائے خوراک اور غذا کے نہ آتا ہو اور ایسا حرام جو بغیر ناپ تول کے آتا ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، داؤد اور ایلہ کے قصہ میں ہے: اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّیَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ اس

آیت کے قصص میں مروی ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا کہ ابلیس نے ان کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی اور کہا: تمہیں ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا ہے پس تم حوض بنالو، پھر وہ جمعہ کے دن مچھلیاں ان کی طرف ہانکتے تھے اور وہ ان (حوضوں) میں باقی رہتی تھیں اور پھر پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے وہاں سے نکلنا ممکن نہ ہوتا تھا، چنانچہ اتوار کے دن وہ انہیں پکڑتے تھے۔

اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ابن رومان کا گمان ہے کہ ان میں سے ایک آدمی رسی پکڑتا تھا اور اس میں ایک پندھا سار کھتا اور اسے مچھلی کی دم میں ڈال دیتا اور رسی کی دوسری طرف کیل کے ساتھ بندھی ہوتی، وہ اسے اتوار تک اسی طرح چھوڑے رکھتا، پھر جب لوگوں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا اسے کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ مچھلی کا شکار بہت زیادہ ہو گیا اور اسے بازاروں میں لایا جانے لگا اور فاسقوں نے اس کے شکار کا اعلان کر دیا، پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ اٹھا اور وہ روکنے لگا اور اس نے روکنے کی اعلانیہ خوب کوشش کی اور علیحدگی اختیار کر لی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک روکنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ مل کر نہیں رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کو دیوار کے ساتھ تقسیم کر دیا۔ پس ایک دن منع کرنے والے اپنی مجالس میں آئے لیکن ان ظالموں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی بھی نہ نکلا، تو انہوں نے کہا: بے شک ان لوگوں کو کچھ ہو گیا ہے، پھر انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بن چکے تھے۔ پس انہوں نے دروازہ کھولا اور ان پر داخل ہوئے، تو بندروں نے انسانوں سے اپنے انساب کو پہچان لیا، لیکن انسان اپنے نسب بندروں سے نہ پہچانتے تھے، پس بندر انسانوں میں سے اپنے نسب والے کے پاس آتا اور اس کے کپڑے سونگھنے لگتا اور پھر رونے لگتا۔ تو وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا؟ تو وہ اپنا سر ہلا کر کہتا: ہاں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جوان بندر ہو گئے اور بوڑھے خنزیر ہو گئے۔ پس اس سے صرف انہوں نے ہی نجات پائی جو اس سے باز رہے (اور دوسروں کو منع کرتے رہے) اور وہ تمام کے تمام ہلاک ہو گئے۔ پس اس قول کی بنا پر بنی اسرائیل صرف دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا میں معنی ہو گا یعنی شکار کرنے والوں نے نصیحت کرنے والوں کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں نصیحت کی: جب تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاک کرنے والا ہے تو پھر تم ہمیں نصیحت کیوں کرتے ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں میں بدل دیا۔ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یعنی نصیحت کرنے والوں نے کہا: ہمارا تمہیں نصیحت کرنا تمہارے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے، یعنی بلاشبہ تمہیں نصیحت کرنا ہم پر واجب ہے شاید تم ڈرنے لگو۔

علامہ طبری نے یہ قول ابن کلبی سے بیان کیا ہے اور جمہور مفسرین نے کہا ہے: بے شک بنی اسرائیل تین گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور آیت میں ضمائر سے یہی ظاہر ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے نافرمانی کی اور شکار کیا، وہ ستر ہزار کے قریب لوگ تھے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے منع کیا اور ان سے علیحدہ ہو گیا اور وہ بارہ ہزار تھے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو علیحدہ تو ہو گیا لیکن نہ اس نے انہیں روکا اور نہ خود نافرمانی کی۔ اور اسی گروہ نے منع کرنے والوں کو کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جو

نافرمانی اور حکم عدولی کا ارادہ رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے۔ انہوں نے یہ قول ظن غالب کی بنا پر کیا اور اس وقت نافرمان امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل معہود نہ تھا، تو روکنے والوں نے کہا: ہمارا نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے شاید وہ ڈر جائیں، تقویٰ اختیار کرلیں۔ اور اگر دو گروہ ہوتے تو یقیناً روکنے والے نافرمانوں کو کہتے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، شاید تم ڈرنے لگو۔ پھر اس کے بعد اختلاف ہوا ہے پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ گروہ جس نے نہ منع کیا اور نہ خود نافرمانی کی وہ نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا اسے یہ سزا منع نہ کرنے پر دی گئی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: میں اسے نہیں جانتا جو ان کے ساتھ کیا گیا۔ اور یہی آیت سے ظاہر ہے۔ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس وقت کہا جب انہوں نے یہ کہا میں اسے نہیں جانتا جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا: کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انہوں نے اس عمل کو ناپسند کیا جو وہ کر رہے تھے اور انہوں نے ان کی مخالفت کی تو انہوں نے کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے؟ پس میں اسی نظریہ پر رہا یہاں تک کہ میں نے انہیں پہچان کرادی کہ وہ نجات پا گئے، تو آپ نے مجھے حلہ پہنایا۔ اور یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ صرف حدود سے تجاوز کرنے والا گروہ ہلاک ہوا کوئی اور نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (اور ہم نے ان کو پکڑ لیا جنہوں نے ظلم کیا) اور یہ ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ الآیہ (البقرہ:65) (اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی)

عیسیٰ اور طلحہ نے معذرةً کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی کے نزدیک اس کے نصب کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ نصب مصدر ہونے کی بنا پر ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ تقدیر کلام ہے فعلنا ذالك معذرة۔ اور یہی حضرت حفص کی حضرت عاصم سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ پسندیدہ ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی نیا عذر پیش کریں جس پر انہیں ملامت کی گئی ہے، لیکن جب انہیں یہ کہا گیا: تم کیوں نصیحت کرتے ہو تو انہوں نے جواباً کہا: موعظتنا معذرة (ہماری نصیحت ایک معذرت ہے) اور اگر کوئی آدمی کسی آدمی کو کہے: معذرةً إلى الله وإليك من كذا (یعنی فلاں عمل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اور تیرے پاس معذرت ہے) تو اس سے مراد معذررت پیش کرنا ہوتا ہے، تو یہ یقیناً منصوب ہوگا۔

یہ قول سیبویہ کا ہے۔ یہ آیت سد ذرائع کے قول پر دلیل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور تفصیلی گفتگو اس باب میں بھی گزر چکی ہے کہ جنہیں مسخ کر دیا گیا کیا ان کی آگے نسل چلی یا نہیں؟ الحمدللہ۔ سورۃ آل عمران اور سورۃ المائدہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام گزر چکا ہے اور سورۃ النساء میں فساد برپا کرنے والوں کے علیحدہ ہونے اور ان کے ایک طرف ہونے کا ذکر گزر چکا ہے اور یہ کہ جوان کے پاس بیٹھا وہ ان کی مثل ہو گیا، پس دوبارہ ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

''پھر جب انہوں نے فراموش کر دی جو انہیں نصیحت کی گئی تھی (تو) ہم نے نجات دے دی انہیں جو روکتے تھے برائی سے اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جنہوں نے ظلم کیا برے عذاب سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے''۔

نسیان کا اطلاق بھولنے والے پر ہوتا ہے۔ اور عامد کا اطلاق ترک کرنے والے پر، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖ** یعنی انہوں نے اسے بالارادہ ترک کر دیا۔ اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: **نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ** (التوبہ: 67) (انہوں نے بھلا دیا الله کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں) اور **بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍ** کا معنی ہے شدید عذاب۔ اور اس میں گیارہ قرائتیں ہیں: (۱) ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قراءت فعیل کے وزن پر بئیس ہے(1) (۲) اہل مکہ کی قراءت بئیس با کے کسرہ کے ساتھ ہے اور وزن ایک ہی ہے (۳) اہل مدینہ کی قراءت بیس ہے یعنی باء مکسور ہے اس کے بعد یاء ساکن ہے(2) اور اس کے بعد سین تنوین مکسور کے ساتھ ہے اور اس میں دو قول ہیں: کسائی نے کہا ہے: اس میں اصل بییس ہے ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے دو یا جمع ہوئی ہیں ان میں سے ایک کو حذف کر دیا گیا ہے اور پہلے حرف کو کسرہ دیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رغیف اور شهيد۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد بئس فعل کے وزن پر ہے، پھر پہلے حرف کو کسرہ دے دیا گیا، ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور کسرہ کو حذف کر دیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: رَحِم و رِحْم (۴) حسن کی قراءت میں با مکسور اس کے بعد ہمزہ ساکن اور اس کے بعد سین مفتوح ہے (۵) ابو عبد الرحمن مقری نے بئیس با کو مفتوح، ہمزہ کو مکسور اور سین کو تنوین مکسور کے ساتھ پڑھا ہے (۶) یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بعذاب بئیس بھی مروی ہے یعنی با مفتوح، ہمزہ مکسور اور سین مفتوح ہے (۷) اعمش کی قراءت فیعل کے وزن پر بیئس ہے اور ان سے بیائس، فیعل کے وزن پر بھی مروی ہے۔ اور آپ سے بئیس با مفتوح، ہمزہ مشدد مکسور اور سین تمام میں تنوین مکسور کے ساتھ مروی ہے۔ مراد اعمش کی قراءت ہے۔ (۱۰) نصر بن عاصم کی قراءت بعذاب بیّس ہے یعنی با مفتوح اور یا مشدد بغیر ہمزہ کے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بئیس مروی ہے یعنی با مکسور ہے اس کے بعد ہمزہ ساکن ہے اور اس کے بعد یا مفتوح ہے۔ پس یہ گیارہ قرائتیں ہیں جنہیں نحاس نے ذکر کیا ہے۔

علی بن سلیمان نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: جاء ببنات بیس یعنی وہ ردی شے لے کر آیا، پس بعذاب بیس کا معنی ہوا بعذاب ردئ۔

اور رہی حسن کی قراءت تو ابو حاتم کا گمان ہے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں، انہوں نے کہا: کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا مررت برجل بئس، بلکہ کہا جاتا ہے: بئس الرجل یا بئس رجلا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ ابو حاتم کے کلام سے مردود ہے، نحویوں نے بیان کیا ہے: ان فعلت کذا او کذا فبها و نعمت (اگر تو نے اس اس طرح کیا تو بہتر ہے اور اچھا ہے) وہ مراد یہ لیتے ہیں فبها و نعمت الخصلة (یعنی خصلت اچھی ہے) اور حسن کی قراءت پر تقدیر کلام یہ ہوگی: بعذاب بئس العذاب۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

''پھر جب انہوں نے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر راندے ہوئے''۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 213
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 469

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ یعنی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں حدود سے تجاوز کیا۔ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ کہا جاتا ہے: خسأته فخسأ یعنی میں نے اسے دور کر دیا اور میں نے اسے بھگا دیا۔ سورۃ البقرہ میں پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معافی اور گناہ عذاب کا سبب ہیں۔ اور اس میں کوئی خفا اور ابہام نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سنائی دینے والے کلام کے ساتھ فرمایا، تو وہ اس طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے انہیں بندر بنا دیا۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۷﴾

''اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب۔ بے شک آپ کا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور رحیم (بھی) ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلاف کو آگاہ کیا کہ وہ اگر تبدیل نہ ہوئے اور وہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسے شخص کو بھیج دے گا جو انہیں عذاب میں ڈال دے گا۔ اور ابو علی نے کہا ہے: آذن مد کے ساتھ ہو تو بمعنی اعلم (بتانا اور آگاہ کرنا) ہے اور أذن تشدید کے ساتھ ہو تو معنی نادی (پکارنا، ندا دینا) ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ آذن اور أذن دونوں بمعنی أعلم ہیں، جیسے أیقن اور تیقن کہا جاتا ہے۔ زہری نے کہا ہے:

فقلتُ تَعَلَّمْ إن للصيد غرّةً فإلّا تُضَيِّعها فإنك قاتِلُه

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تعلّم إن شر الناس حيّ يُنادَى في شعارهم يَسار

یعنی یہ بمعنی علم ہے اور یَسُوْمُهُمْ کا معنی ہے وہ انہیں چکھائے گا۔ اور یہ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: اس سے مراد بخت نصر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب مراد ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مراد ہے۔ اور یہی اظہر ہے، کیونکہ یہ یوم قیامت تک باقی رہنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ یہاں ان سے جزیہ لینا مراد ہے۔ اور اگر کہا جائے: ان کی شکلیں تو مسخ کر دی گئیں، تو پھر ان سے جزیہ کیسے لیا جا سکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ ان کے بیٹوں اور ان کی اولاد سے لیا جائے گا۔ اور وہ ذلیل ترین قوم ہیں اور وہ یہودی ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے(1) کہ انہوں نے کہا: سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد خراج ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی علیہ السلام نے کبھی خراج لازم نہیں کیا، سب سے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 168

پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہی خراج وضع کیا اور اسے تیرہ برس تک لاگو رکھا اور پھر روک دیا۔

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸

''اور ہم نے بانٹ دیا انہیں زمین میں کئی گروہوں میں ان میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ اس طرح ہیں اور ہم نے آزمایا انہیں نعمتوں اور تکلیفوں کے ساتھ تاکہ وہ (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا یعنی ہم نے انہیں شہروں میں تقسیم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ان کے معاملہ کو بکھیرنے اور پھیلانے کا ارادہ کیا ہے، پس کوئی کلمہ انہیں جمع نہیں کر سکا۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ یہ مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ مراد وہ لوگ ہیں جو حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور جنہوں نے ان میں سے کوئی تبدیلی نہیں کی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہونے سے پہلے فوت ہو گئے یا وہ لوگ مراد ہیں جو چین سے پرے ہیں، جیسا کہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اسے رفع دیا ہو۔ مراد ان میں سے کافر لوگ ہیں۔ وَ بَلَوْنٰهُمْ یعنی ہم نے انہیں آزمایا۔ بِالْحَسَنٰتِ یعنی خوشحالی اور عافیت کے ساتھ۔ وَ السَّيِّاٰتِ یعنی خشک سالی اور سختیوں کے ساتھ۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ وہ اپنے کفر سے لوٹ آئیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶۹

''پھر جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جو وارث ہوئے کتاب کے وہ لیتے ہیں مال اس دنیا کا اور (بایں ہمہ) کہتے ہیں کہ ضرور بخش دیا جائے گا ہمیں۔ اور اگر آ جائے ان کے پاس اور مال اس جیسا تو لے لیں اس کو بھی کیا نہیں لیا گیا تھا ان سے پختہ وعدہ کتاب میں کہ نہ منسوب کریں اللہ کی طرف کوئی بات سوائے حق کے اور پڑھ لیا انہوں نے جو کتاب میں تھا۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان کے لیے جو متقی ہیں، تو کیا تم (اتنا) بھی نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ یعنی ان کی اولاد جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں تقسیم کر دیا تھا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: الخلف لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ مراد اولاد ہے اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں (یعنی واحد اور جمع کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے) اور الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو واؤ بدل ہے چاہے وہ بچہ ہو یا کوئی اجنبی ہو۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مراد صالح اور نیک ہے اور اگر لام کے سکون کے ساتھ ہو تو مراد شریر اور بد ہے۔ لبید نے کہا ہے:

ذھبَ الذین یُعاشُ فی أکنافِھم وبقیتُ فی خلْف کجلد الأجرب(1)

اُور اسی سے یہ بھی ہے کہ ردی کلام کو خلف کہا گیا ہے۔ اور اسی سے یہ مشہور مثال بھی ہے سکت ألفا و نطق خلفا ہزار لحظہ خاموش رہا، بولا تو غلط بولا۔

پس لام ساکن کے ساتھ خلْف ذم میں اور لام مفتوح کے ساتھ خلَف مدح میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی اس کا مشہور استعمال ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یَحمِل ھذا العلم من کل خَلَف عدولہٗ (اس علم کو ہر نیک آدمی سے اس کا عادل جانشین روایت کرے گا او کمال قال) اور کبھی ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا:

لنا القَدَمُ الأولٰی إلیك وخَلْفُنا لِأوّلنا فی طاعۃ الله تابع (2)

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

إنا وجدنا خَلَفًا بئس الخلَفُ أغلق عنا بابَہ ثم حلف

لا یُدخل البوابُ إلا مَنْ عرفْ عبدا إذا ما ناء بالحِمل وَقَفْ

شعر میں وقف کی جگہ خضف بھی منقول ہے اور اس کا معنی ہے گوز کرنا۔ آیت سے مقصود مذمت بیان کرنا ہے۔

وَّرِثُوا الْكِتٰبَ مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد یہودی ہیں، وہ کتاب الله کے وارث بنے انہوں نے اسے پڑھا اور اسے سمجھا، لیکن اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اسے پڑھنے کے باوجود اس کے حرام کردہ امور کا ارتکاب کیا۔ پس یہ ان کے لیے زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى پھر ان کے بارے یہ خبر دی کہ وہ اپنی شدت حرص و طمع کے سبب سامان دنیا میں سے جو بھی انہیں ملے اسے وہ لے لیتے ہیں۔ وَ یَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا اور کہتے ہیں: ہم بخش دیئے جائیں گے حالانکہ وہ توبہ نہیں کرتے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ توبہ نہیں کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ اس میں عرض بمعنی سامان دنیا ہے، یہ را کے فتحہ کے ساتھ ہے اور جب را کے سکون کے ساتھ ہو تو پھر اس سے مراد درا ہم و دنانیر کے سوا ہر قسم کا مال ہوتا ہے۔ اس آیت میں اشارہ رشوت اور خبیث (حرام) کمائی کی طرف ہے۔ پھر الله تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی کہ وہ اپنے اس قول سَیُغْفَرُ لَنَا کے ساتھ دھوکہ کھا رہے ہیں اور یہ کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب دوسری بار ان کے لیے اس کا امکان ہو تو وہ اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ تو ان کا مغفرت کے ساتھ دھوکہ کھانا قطعی ہے، حالانکہ وہ (اپنے اعمال پر) مصر ہیں، بلاشبہ سَیُغْفَرُ لَنَا وہ کہہ سکتا ہے جو (ایسے اعمال کو) چھوڑ دے اور نادم ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وہ وصف ہے جس کی وجہ سے الله تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی ہے اور یہ ہم میں بھی موجود ہے۔ دارمی ابو محمد نے بیان کیا ہے کہ ہمیں محمد بن مبارک نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں صدقہ بن خالد نے ابن جابر سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 472 2۔ ایضاً

انہوں نے شیخ سے جن کی کنیت ابوعمرو تھی انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: عنقریب قرآن قوموں کے سینوں میں بوسیدہ ہو جائے گا جیسے کپڑا بوسیدہ ہو جاتا ہے اور وہ گر جاتا ہے، وہ اسے پڑھیں گے لیکن اس کا کیف اور لذت نہیں پائیں گے، وہ بھیڑوں کی کھالیں، بھیڑیوں کے دلوں (جسموں) پر پہن لیں گے، ان کے اعمال میں ایسی حرص ہوگی جس میں خوف کی آمیزش نہ ہوگی، اگر وہ کوتاہی کریں گے تو کہیں گے: ہم عنقریب پہنچ جائیں گے، اور اگر گناہ کریں گے تو کہیں گے: ہم بخش دیئے جائیں گے، بے شک ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یَّاْتِهِمْ میں ضمیر مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے لیے ہے، یعنی یثرب کے وہ یہودی جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کیا اگر ان کے پاس بھی اس طرح کا سامان دنیا آجائے تو وہ اسے لے لیں جس طرح ان کے اسلاف نے اسے لیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اس میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ شریعت اور احکام میں قول حق کو لازم پکڑنے میں شدید تاکید کا اظہار ہے اور یہ کہ حکام رشوت کے سبب باطل کی طرف مائل نہ ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ ہے جو ان پر لازم تھا اور اسی کے ساتھ قول حق کے بارے میں ان سے میثاق لیا گیا اور یہ ہمارے لیے لازم ہے اس کا ذکر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی ہوا اور ہمارے رب کی کتاب میں بھی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور تمام شریعتوں میں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ یعنی انہوں نے اسے پڑھا اور وہ ان کے قریب العہد ہیں۔ ابو عبدالرحمن نے وادارسوا ما فیہ پڑھا ہے یعنی انہوں نے تا کو دال میں ادغام کیا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حق حاصل کرنے والا رشوت لے کر ان کے پاس آتا تھا تو وہ اس کے لیے کتاب اللہ نکال کر لے آتے اور اس کے ساتھ اس کا فیصلہ کرتے۔ اور جب کوئی مبطل (باطل کرنے والا) آتا تو وہ اس سے رشوت لے لیتے اور اس کے لیے اپنی وہ کتاب نکال لاتے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ لکھی ہوتی اور اس کا فیصلہ کرتے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ تحقیق انہوں نے اپنے گناہوں کی بخشش کے بارے میں وہ باطل قول کیا جسے وہ ثابت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ یقین رکھتے ہیں۔

ابن زید نے کہا ہے: یعنی ان احکام میں جن کے بارے وہ فیصلہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ کا معنی ہے انہوں نے اس کے مطابق عمل ترک کر کے اور اس کی فہم اور سمجھ کو چھوڑ کر اسے مٹا دیا۔ یہ معنی تیرے اس قول سے ہے: درستِ الریحُ الآثارَ یہ تب کہا جاتا ہے جب ہوا آثار کو مٹا دے۔ خط دارس و ربع دارس، جب وہ اسے مٹا دے اور اس کا نشان ختم ہو جائے۔ اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے موافق ہے: نَبَذَ

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ الآیہ (البقرہ:101) اور اس قول کے: فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (آل عمران:187) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

''اور جنہوں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کتاب کو اور قائم کیا نماز کو بے شک ہم ضائع نہیں کریں گے اجر اصلاح کرنے والوں کا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ کتاب سے مراد تورات ہے، یعنی وہ جو اس کے ساتھ مضبوطی سے عمل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے: مسك به و تمسك به یعنی وہ اس کے ساتھ چمٹ گیا، اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ ابو العالیہ اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں یمسکون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ أمسك یمسك سے ہے۔ پہلی قراءت اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے لیے تکریر و تکثیر کا معنی موجود ہے اور اسی کے سبب ان کی مدح اور تعریف کی جا رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور دین کے ساتھ تمسک اور عمل ملازمت (لازم پکڑنا) تکریر کا محتاج ہوتا ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

فما تَمَسَّكُ بالعهد الذی زعمتُ　　إلّا كما تُمسك الماءَ الغرابيل(1)

اس نے کثرت کے ساتھ عہد توڑنے کی مذمت کرتے ہوئے طبعاً یہ شعر کہا ہے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

''اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ ان کے اوپر اس طرح گویا وہ سائبان ہے اور خیال کرنے لگے کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر (ہم نے کہا) پکڑ لو جو ہم نے دیا ہے تمہیں (پوری) قوت سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ، نَتَقْنَا اس کا معنی ہے ہم نے اٹھایا۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ یعنی گویا کہ وہ اپنے اٹھنے اور بلند ہونے کے سبب ایک بادل ہے جس کا سایہ کیا جا رہا ہے۔ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ یعنی جو ہم نے تمہیں دیا ہے تم اسے انتہائی قوت کے ساتھ پکڑ لو۔ سورۃ البقرہ میں آیت کے آخر تک کا ذکر گزر چکا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 473

اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''اور (اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنادیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا: بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی (یہ اس لیے ہوا) کہ کہیں تم یہ نہ کہو روزِ حشر کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ شرک تو صرف ہمارے باپ دادا نے کیا تھا (ہم سے) پہلے اور ہم تو تھے ان کی اولاد ان کے بعد تو کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس شرک کی وجہ سے جو کیا تھا باطل پرستوں نے۔ اور اسی طرح ہم مفصل بیان کرتے ہیں نشانیاں تاکہ وہ (ان میں غور کریں) اور کفر سے باز آجائیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ یعنی تم انہیں یاد دلاؤ اس کے باوجود کہ معاہدوں کا ذکر ان کی کتابوں میں پہلے گزر چکا ہے وہ میثاق جو میں نے بندوں سے اس دن لیا جس دن حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اولاد کو نکالا۔ یہ ایک مشکل آیت ہے اور علماء نے اس کی تاویل اور اس کے احکام کے بارے کافی گفتگو کی ہے، جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم حسبِ توفیق اسے ذکر کریں گے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بنی آدم کی پشتوں سے بعض کو نکالا۔ انہوں نے کہا: اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کے ساتھ انہیں اپنی توحید پر دلیل بنایا، کیونکہ ہر بالغ بالضرور یہ جانتا ہے کہ اس کا رب واحد و یکتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی فرمایا: (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!) پس یہ ان پر گواہ بنانے کے لیے قائم مقام اور ان کی طرف سے اقرار ہوگیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے بارے میں فرمایا: قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ۝ (فصلت) (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں) قفال اور اطنب نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جسموں کو پیدا کرنے سے پہلے ارواح کو نکالا۔ اور ان میں معرفت رکھ دی جس کے سبب انہوں نے اس خطاب کو جان لیا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان دونوں قولوں کے سوا اور مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے جسموں کو نکالا جن میں روحیں تھیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ۙ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا(1) پھر اپنے دستِ قدرت کے ساتھ ان کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے اعمال کریں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ باب فی القدر، حدیث نمبر 4081، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل نار کے اعمال کریں گے''۔ تو ایک آدمی نے عرض کی: تو پھر عمل کس لیے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ اس سے اہل جنت کے اعمال کی طرح عمل کراتا ہے یہاں تک کہ وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتے ہوئے فوت ہو جاتا ہے پس وہ اسے جنت میں داخل فرما دے گا اور جب کسی بندے کو جہنم کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کراتا ہے' یہاں تک کہ وہ اہل جہنم کے اعمال میں سے کوئی عمل کرتے ہوئے مرجاتا ہے پس اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل فرما دے گا''۔

ابوعمر نے کہا ہے: یہ حدیث منقطع الاسناد ہے، کیونکہ مسلم بن یسار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ اور اس میں یحییٰ بن معین نے کہا ہے: مسلم بن یسار معروف نہیں، ان کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان نعیم بن ربیعہ ہیں، اسے نسائی نے ذکر کیا ہے، اور نعیم علمی اعتبار سے غیر معروف ہے، لیکن اس حدیث کا معنی کئی وجوہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ہے جو ثابت بھی ہیں اور زیادہ بھی ہیں، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہیں (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کی پشت کو مس کیا تو ان کی پشت سے ہر وہ روح گری جسے قیامت تک ان کی اولاد میں سے پیدا ہونا تھا اور ان میں سے ہر آدمی کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی اور پھر انہیں آدم علیہ السلام پر پیش فرمایا تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہیں؟ رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد ہے، پس آپ نے ان میں سے ایک آدمی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے درمیان پائی جانے والی چمک نے انہیں متعجب کر دیا۔ تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد میں سے آخری امتوں میں سے ایک فرد ہے، اسے داؤد کہا جائے گا، تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! تو نے اس کی عمر کتنی بنائی ہے؟ رب کریم نے فرمایا: ساٹھ برس۔ تو انہوں نے عرض کی اے میرے پروردگار! اس کی عمر میں میری عمر میں سے چالیس سال کا اضافہ کر دے پس جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر گزر چکی تو حضرت ملک الموت علیہ السلام ان کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: کیا ابھی میری عمر میں چالیس برس باقی نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: کیا آپ نے وہ اپنے بیٹے حضرت داؤد علیہ السلام کو نہیں دے دیئے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کر دیا پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولنے لگی'' (2)۔ اور ترمذی کے علاوہ میں ہے، ''پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے کتاب اور گواہوں کو حکم فرمایا''۔ ایک روایت میں ہے، ''پس آپ نے ان میں ضعیف، غنی، فقیر

1۔ جامع ترمذی کتاب القدر عن رسول اللہ، حدیث نمبر 2061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(ذلیل) بیماری اور تکلیف میں مبتلا اور صحت مند کو دیکھا، تو آدم علیہ السلام نے پوچھا: اے میرے پروردگار! یہ کیا ہے؟ تو نے ان کے درمیان مساوات قائم نہیں فرمائی؟ تو رب کریم نے فرمایا: میں نے چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''انہیں آپ کی پشت سے نکالا گیا جیسے کنگھی سر سے نکالی جاتی ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی کی طرح عقل عطا فرما دی اور ان سے وعدہ لیا اس بارے میں کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس انہوں نے اس کا اقرار کیا اور اسے لازم پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ وہ عنقریب ان کی طرف انبیاء ورسل علیہم الصلوات والتسلیم مبعوث فرمائے گا، پس ان میں سے بعض بعض پر گواہ ہو گئے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان پر سات آسمانوں کو شاہد بنایا، پس اب قیامت تک جو بھی پیدا ہوگا اس سے وہ عہد لے لیا گیا ہے۔ اس جگہ اور مقام کے بارے اختلاف ہے جس میں اس وقت یہ میثاق لیا گیا اس بارے میں چار اقوال ہیں:

پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ جگہ بطن نعمان ہے، یہ عرفات کے پہلو میں ایک وادی ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہند میں اتارا، پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے ہر اس روح کو نکالا جسے یوم قیامت تک پیدا کرنا تھا، پھر فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ حضرت حسن نے کہا ہے: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی صلب میں لوٹا دیا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جگہ مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: وہ آسمان دنیا میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت سے اس کی طرف اتارا تو آپ کی پشت کو مس کیا تو آپ کی پشت کی دائیں جانب سے موتیوں کی مثل سفید اولاد کو نکالا اور انہیں فرمایا: تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور آپ کی پشت کی بائیں جانب سے سیاہ رنگ کی اولاد کو نکالا اور ان کے لیے فرمایا: تم جہنم میں داخل ہو جاؤ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ہر نفس جو جنت کے لیے پیدا کیا گیا وہ سفید رنگ میں نکلا اور ہر نفس جو جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ سیاہ رنگ میں نکلا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اگر یہ کہا جائے اس کا مخلوق کو عذاب دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے (1) حالانکہ انہوں نے گناہ نہیں کیے، یا وہ انہیں اس پر سزا دے جس کا اس نے ان سے ارادہ کیا ہے اور ان پر وہ لکھ دیا اور اس کی طرف انہیں چلایا ہے؟ تو ہم کہیں گے: یہ کہاں سے ممتنع ہے، کیا عقلاً یا شرعاً؟ پس اگر کہا جائے: کیونکہ ہم میں سے رحیم و حکیم کا اس طرح کرنا جائز نہیں ہوتا، تو ہم کہیں گے: اس لیے کہ اس سے اوپر تو ایک امر (حکم دینے والا) ہوتا ہے جو اسے حکم دیتا ہے اور منع کرنے والا ہوتا ہے جو اسے منع کرتا ہے، روکتا ہے۔ اور ہمارا رب تعالیٰ وہ ہے کہ اس سے اس کے بارے نہیں پوچھا جا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 801

سکتا جو وہ کرتا ہے اور ان لوگوں سے پوچھا جا سکتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق پر قیاس کیا جائے اور بندوں کے افعال کو معبود کے افعال پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحقیقت تمام کے تمام افعال اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہیں اور مخلوق ساری کی ساری اسی کی ہے، وہ ان میں تصرف کرتا ہے جیسے چاہے اور ان کے درمیان اسی کے بارے فیصلہ کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔ اور یہی وہ شے ہے جسے آدمی پاتا ہے کہ فطری نرمی، جنسی شفقت اور ثنا و مدح کی محبت اس پر ابھارتی اور برانگیختہ کرتی ہے، ہر اس شے کے لیے جس میں اسے نفع کی توقع ہوتی ہے۔ اور رب کریم کی ذات ان تمام سے پاک ہے، لہٰذا اس میں اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں''۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کے بارے اختلاف ہے، کیا یہ خاص ہے یا عام ہے؟ بعض نے کہا ہے: یہ آیت خاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ پس اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اولاد آدم میں سے جو ہے وہ آپ کی صلب سے نکلا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ پس اس سے یہ نکلا کہ ہر وہ جو آپ کے آباء نہ تھے وہ مشرک تھے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں مخصوص ہے جن سے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں پر عہد لیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے، کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ بچہ تھا پس اسے غذا دی گئی اور اس کی تربیت کی گئی اور بلاشبہ اس کا مدبر (تدبیر کرنے والا) اور خالق ہے۔ اور یہی معنی وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ کا ہے۔ اور قَالُوۡا بَلٰى کا معنی ہے بلاشبہ یہ ان پر واجب ہے۔ پس جب مخلوق نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا اعتراف کر لیا کہ وہ رب ہے پھر وہ اس سے غافل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے سبب انہیں یاد دلایا اور اس تذکیر کو اپنے منتخب اور اصفیاء میں سے افضل ترین کے ساتھ ختم کیا تا کہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حجت اور دلیل قائم ہو جائے پس اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فَذَكِّرۡ ۗ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ؕ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ۙ (الغاشیہ) پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں، آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو جبر کرنے کی قدرت بھی عطا فرمائی اور آپ کو سلطنت اور قوت عطا فرمائی اور آپ کے لیے آپ کے دین کو زمین میں غالب کر دیا۔ طرطوشی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: بے شک یہ عہد ہر بشر کو لازم ہے اگرچہ وہ اسے اس دنیا میں نہ یاد کرتے ہوں، جیسا کہ اس کی طلاق لازم ہو جاتی ہے جس پر اس کی شہادت دے دی جائے حالانکہ وہ اسے بھول چکا ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے کہا ہے: بے شک وہ جو صغر سنی میں ہی فوت ہو گیا تو وہ اپنے میثاق اوّل کے اقرار کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگا اور جو سن بلوغت کو پہنچ گیا تو میثاق اوّل اس کے لیے نفع مند نہیں۔ یہ کہنے والا یہ بھی کہتا ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں ہوں گے اور اس بارے میں یہی صحیح ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں آثار مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ الروم میں آئے گی ان شاء اللہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 475

ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں بھی کیا ہے۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنۡ ظُھُوۡرِهِمۡ یہ قول باری تعالیٰ مِنۡ بَنِیۡۤ اٰدَمَ سے بدل اشتمال ہے۔ اور آیت کے الفاظ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ عہد اولاد آدم سے لیا گیا ہے، لفظ کے اعتبار سے آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے اس پر الفاظ کی توجیہ ہے: وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُھُوۡرِهِمۡ ذُرِّیّٰتِهُمۡ (اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا) ظہر آدم کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ وہ سب کے سب آپ کی اولاد ہیں اور یہ کہ انہیں میثاق کے دن آپ کی پشت سے نکالا گیا۔ پس وہ اپنے ارشاد مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ کے سبب آپ کے ذکر سے مستغنی ہو گیا۔

ذُرِّیّٰتِهُمۡ کو فیوں اور ابن کثیر نے اسے واحد اور تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً (آل عمران: 38) یہ واحد کے لیے ہے، کیونکہ انہوں نے بچہ عطا کرنے کی التجا کی تو آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی اور قراء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنۡ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ (مریم: 58) میں اس کے واحد ہونے پر اجماع کیا ہے اور ذریت آدم سے زیادہ اور کوئی شے نہیں۔ اور فرمایا: وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ یہ جمع کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے ذریاتھم صیغہ جمع کے ساتھ قراءت کی ہے، کیونکہ ذریت کا لفظ جب واحد کے لیے واقع ہوتا ہے تو یہ ایسے لفظ کے ساتھ آتا ہے جو واحد کے لیے واقع نہیں ہوتا تو یہ جمع ہوتا ہے، کیونکہ کلمہ اپنے معنی مقصود کے لیے خالص ہوتا ہے اور اس (معنی) میں کوئی شے شریک نہیں ہوتی اور وہ معنی جمع ہے، کیونکہ بنی آدم کی پشتوں سے کثیر تعداد میں مناسب اولادوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نکالا گیا، ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پس جمع اس معنی کے لیے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: بَلٰی اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں ارشاد گرامی: بَلٰی مَنۡ كَسَبَ سَیِّئَةً (البقرہ: 81) کے تحت مکمل طور پر گزر چکی ہے، پس وہیں غور کر لو اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا۔

اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا ابو عمرو نے دونوں مقام میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو اس سے قبل غیب متکرر کے لفظ پر لوٹایا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُھُوۡرِهِمۡ ذُرِّیّٰتِهُمۡ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ اور قول باری تعالیٰ: قَالُوۡا بَلٰی بھی لفظ غیب ہے۔

اور اسی طرح وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ بھی ہے وَ لَعَلَّهُمۡ پس اسے اپنے ماقبل اور اپنے مابعد پر لفظ غیب کے ساتھ محمول کیا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں میں تا پڑھی ہے۔ انہوں نے اسے سابقہ لفظ خطاب پر راجع کیا ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی اور شَهِدۡنَا ملائکہ کے قول میں سے ہوگا۔ (یعنی) جب انہوں نے کہا: بَلٰی (تو) ملائکہ نے کہا: شَهِدۡنَا ۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا، اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا یعنی تاکہ تم نہ کہو۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب انہوں نے بَلٰی کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: تم گواہ ہو جاؤ (تو) انہوں نے کہا: ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں تاکہ تم نہ کہو یا کہو۔ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور سدی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدۡنَا یہ بنی آدم کے قول میں سے ہے اور

اس کا معنی ہے: ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر گواہ بنایا، پس اس کے مطابق یہ ہوگا "انہوں نے کہا: ہاں (کیوں نہیں) ہم بعض بعض پر گواہ ہیں"۔

جب یہ ملائکہ کے قول میں سے ہو تو پھر وقف بَلٰی پر کیا جائے گا اور اس پر وقف اچھا نہیں ہوگا جب یہ بنی آدم کے قول میں سے ہو کیونکہ أن، بلی سے ماقبل کے متعلق ہے۔ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ (اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نفسوں پر گواہ بنا دیا) تا کہ وہ نہ کہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو اس طرح نکالا جیسے سر سے کنگھی نکال لی جاتی ہے (1) اور ان سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: بے شک تو ہی ہمارا رب ہے (تو) ملائکہ نے کہا: ہم تمہارے اس قول پر گواہ ہیں"۔ یعنی ہم تم پر ربوبیت کا اقرار کرنے پر گواہ ہیں تا کہ تم یہ نہ کہو۔ پس یہ (مفہوم) تا پر دلالت کرتا ہے۔ مکی نے کہا ہے: معنی کے صحیح ہونے کی وجہ سے یہی پسندیدہ ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا نظریہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدْنَا اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے قول میں سے ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں۔ یہ ابو مالک نے کہا ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے ان کی اقتدا کی۔ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ یعنی معنی یہ ہے کہ تو یہ نہیں کرے گا (کہ تو ہمیں ... شرک کی وجہ سے ہلاک کر دے جو باطل پرستوں نے کیا) اور توحید (کے معاملہ) میں تقلید کرنے والوں کے لیے کوئی عذر نہیں۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝

"اور پڑھ سنایئے انہیں حال اس کا جسے دیا ہم نے (علم) اپنی آیتوں کا تو وہ کترا کر نکل گیا ان سے تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو ہو گیا وہ گمراہوں میں"۔

اہل کتاب نے ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا علم انہیں تورات سے ہوا ہے۔ اور اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے بارے یہ آیات نازل کی گئی ہیں۔

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا ہے: وہ بلعام بن باعوراء ہے، اسے ناعم کہا جاتا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ہے، وہ اس حیثیت میں تھا کہ جب دیکھتا تو عرش کو دیکھتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا سے مراد وہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیۃ (ایک آیت) نہیں کہا، اس کی مجلس میں بارہ ہزار پڑھنے والے علماء تھے جو اس سے پڑھتے لکھتے تھے۔ پھر وہ اس طرح ہو گیا کہ سب سے اوّل اس نے اس بارے میں کتاب لکھی کہ "عالم کو بنانے والا کوئی نہیں"۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 133　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 568

حضرت مالک بن دینار نے کہا ہے: بلعام بن باعوراء کو بادشاہ مدین کی طرف بھیجا گیا تا کہ وہ اسے دعوت ایمان دے۔ پس اس نے اسے بہت کچھ عطا کیا اور اسے خاموش کرا دیا نتیجۃً اس نے اس کے دین کی اتباع کر لی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو چھوڑ دیا، چنانچہ اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بلعام کو نبوت عطا کی گئی تھی (۱)، اس کی دعا قبول کی جاتی تھی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آئے آپ جابروں (اور ظالموں) کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، تو ان جابروں نے بلعام بن باعوراء سے درخواست کی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بددعا کرے پس وہ دعا کرنے کے لیے اٹھا تو اس کی زبان اپنے ساتھیوں کی بددعا کی طرف پھر گئی۔ اس بارے میں اسے کہا گیا، تو اس نے کہا: میں اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوں جو تم سن رہے ہو۔ اور اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی، تو اس نے کہا: تحقیق اب مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں چلی گئیں۔ مکر، دھوکہ اور حیلہ کے سوا کچھ باقی نہ رہا، میں عنقریب تمہیں ایک حیلہ اور مکر بتاؤں گا، میری رائے یہ ہے کہ تم اپنی نوجوان لڑکیوں کو ان کی طرف نکالو کیونکہ اللہ تعالیٰ زانیوں کو بہت مبغوض جانتا ہے، پس اگر وہ اس میں واقع ہو گئے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل فعل زنا کرنے لگے، نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون بھیجا تو اس کے سبب ان میں سے ستر ہزار مر گئے۔ یہ خبر مکمل طور پر ثعلبی وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ روایت ہے کہ بلعام بن باعوراء نے دعا (1) کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جبارین کے شہر میں داخل نہ ہوں، تو اس کی دعا قبول ہو گئی اور آپ تیہ میں ہی رہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کون سے گناہ کے سبب ہم تیہ میں ہی باقی رہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلعام کی دعا کے سبب۔ تو آپ نے عرض کی: جس طرح تو نے اس کی دعا میرے خلاف سن لی ہے اسی طرح میری دعا بھی اس کے خلاف قبول فرما لے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اسم اعظم سلب کر لیا اور اسے اس حالت سے بالکل نکال دیا جس پر وہ تھا۔

ابو حامد نے کتاب ''منہاج العارفین'' کے آخر میں اس کے بارے کہا ہے: میں نے بعض عارفین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بعض انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے بلعام اور اس کے ان آیات و کرامات کے بعد مطرود ہونے کے بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ میں نے اسے عطا کیا تھا اس پر ایک دن بھی اس نے شکر ادا نہ کیا تھا، اگر وہ اس پر ایک بار بھی میرا شکر ادا کرتا تو میں اس سے سلب نہ کرتا۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلعام نبی تھا اور اسے کتاب دی گئی تھی۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ اسے نبوت عطا کی گئی تھی، پس اس کی قوم نے اسے اس پر رشوت دی کہ وہ خاموش رہے چنانچہ اس نے وہی کیا اور قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ ماوردی نے کہا (2) ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی نبوت کے لیے منتخب نہیں فرماتا مگر اسے ہی جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کو چھوڑ کر معصیت و گناہ کی طرف نہیں نکلے گا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 221 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 279

ا۔ یہ قول کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ اس کا رد آگے آ رہا ہے۔ کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے عصمت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ آیت امیہ بن ابی صلت ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تحقیق اس نے کتابیں پڑھی تھیں اور یہ جان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت رسول بھیجنے والا ہے اور اس نے یہ تمنا کی کہ وہی وہ رسول ہے، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا تو اس نے اس پر حسد کیا اور آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا شعور ایمان لے آیا اور اس کے دل نے کفر کیا'' (1)۔

حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے: یہ آیت ابو عامر بن صیفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دور جاہلیت میں ٹاٹ پہنتا تھا، پس اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا، اس لیے کہ وہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کیا ہے جو تم لے کر آئے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں حنیفیہ دین ابراہیم لے کر آیا ہوں''۔ اس نے کہا: بلا شبہ میں اسی پر ہوں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس پر نہیں ہے کیونکہ تو نے اس میں وہ کچھ داخل کر دیا ہے جو اس میں سے نہیں ہے''۔ تو ابو عامر نے کہا: اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو مار دے اس حال میں کہ وہ مطرود اور اکیلا ہو۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو اسی طرح مار دے''۔ بے شک اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تعریض کرتے ہوئے کہا جب آپ مکہ مکرمہ سے نکلے۔ پھر ابو عامر شام کی طرف نکلا اور قیصر کے پاس رہنے لگا اس نے منافقین کی طرف لکھا: تم تیار رہو کیونکہ میں قیصر کے پاس سے ایک لشکر لے کر تمہارے پاس آ رہا ہوں تاکہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال سکیں، پھر وہ شام میں ہی تنہا مر گیا۔ اور اس کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا: وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ (التوبہ: 107) (اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے اب تک) اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں کہا ہے کہ یہ آیت ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی اس کے لیے تین دعائیں تھیں جو اس کے لیے قبول کی جاتی تھیں، اس کی ایک بیوی تھی اسے بسوس کہا جاتا اور اس سے اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ تو اس نے کہا: تو ان میں سے ایک دعا میرے لیے کر دے۔ تو اس نے کہا: ایک تیرے لیے ہے، بتا تو کیا حکم دیتی ہے؟ اس نے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر کہ وہ مجھے بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین عورت بنا دے۔ پس جب اس (عورت) نے یہ جان لیا کہ ان میں اس کی مثل کوئی نہیں ہے تو اس نے اس (خاوند) سے اعراض کر لیا، منہ پھیر لیا۔ تب اس نے اللہ تعالیٰ سے اس کے خلاف یہ دعا کی کہ وہ اسے بھونکنے والی کتیا بنا دے۔ تو اس میں دو دعائیں ختم ہو گئیں، پھر اس کے بیٹے آئے اور کہنے لگے: ہم اس پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہماری ماں کتیا رہے لوگ ہمیں اس پر عار دلاتے ہیں، پس تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ اسے اس حالت پر لوٹا دے جس پر وہ پہلے تھی۔ چنانچہ اس نے دعا کی اور وہ اپنی پہلے والی حالت پر لوٹ آئی اور اس میں اس کی دعائیں ختم ہو گئیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر اسی پر ہیں۔

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 171، حدیث نمبر 15241

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت قریش کے بارے نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی وہ نشانیاں اور آیات عطا کیں جو اس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائیں پس وہ ان سے کترا کر نکل گئے اور انہیں قبول نہ کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلعام جبارین کے شہر میں سے تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ یمن کا تھا۔ **فَانْسَلَخَ مِنْهَا** یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے نکل گیا، یعنی اس سے وہ علم چھین لیا گیا جو وہ جانتا تھا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: العلم علمان علم فی القلب فذالك العلم النافع و علم علی اللسان فذالك حجۃ اللہ تعالی علی ابن آدم (علم دو قسم کے ہیں ایک علم دل میں ہے وہی نفع بخش علم ہے اور ایک علم زبان کا ہے اور وہی ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے) پس یہ بلعام اور اس جیسے لوگوں کے علم کی مثال ہے، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم اس سے توفیق اور حق پر موت کی التجا کرتے ہیں۔

اور الانسلاخ کا معنی نکلنا ہے، کہا جاتا ہے: انسلخت الحیۃ من جلدھا یعنی سانپ اپنی جلد سے نکل گیا (یعنی اس کی کھال اتر گئی) **فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ** یعنی شیطان کے ساتھ مل گیا۔ کہا جاتا ہے: اُتبعتُ القوم یعنی میں قوم سے مل گیا۔ بعض نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار کرتے رہے پھر انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۞ سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۞

''اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو۔ آپ سنائیں (انہیں) یہ قصے شاید وہ غور و فکر کرنے لگیں۔ بہت بری کہاوت ہے اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور (وہ) اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: **وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ** اس سے مراد بلعام ہے۔ یعنی اگر ہم چاہتے تو اسے اس کے نافرمان اور گنہگار ہونے سے پہلے موت دے دیتے پھر اسے جنت کی طرف بلند کر دیتے۔ **بِهَا** یعنی ان آیتوں کے ساتھ عمل کرنے کے سبب۔ **وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ** یعنی لیکن وہ تو پستی کی طرف جھک گیا۔ یہ معنی حضرت ابن جبیر اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سکن الیھا یعنی وہ تو پستی کی لذتوں میں کھو گیا۔ الاخلاد کا اصل معنی لزوم ہے۔ کہا جاتا ہے: أخلد فلان بالمکان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے لازم پکڑے ہوئے ہو۔ زہیر نے کہا ہے:

لمن الديارُ عشيتَها بالغاقد كالوحي فى حجر المسيل المخلِد(1)

اس میں مخلد بمعنی مقیم ہے، تو گویا معنی یہ ہوا اس نے زمین کی لذتوں کو لازم پکڑ لیا۔ اور انہیں الارض سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سامان دنیا (اور اس کی لذات) زمین پر ہی ہیں۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی اس نے اس کی پیروی کی جو کچھ شیطان نے اس کے لیے آراستہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خواہشات کفار کے ساتھ تھیں۔ بعض نے کہا ہے: وہ اپنی بیوی کی رضا اور خوشنودی کی پیروی کرنے لگا، وہ اموال میں رغبت رکھتی تھی یہاں تک کہ اس نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف دعا پر ابھارا۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ اور یہ حال کے محل میں ہے، یعنی اس کی مثال ہانپنے والے کتے کی مثال کی طرح ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شے اور حالت پر ہے جس میں وہ معصیت اور گناہ سے نہیں ڈرتا۔ تو وہ اس کتے کی مثل ہے جس کی یہ حالت ہو پس معنی یہ ہوا کہ وہ ہر حال میں ہانپنے والا ہے، تو اسے بھگائے یا اسے نہ بھگائے۔

ابن جریج نے کہا ہے: کتا منقطع الفوائد ہے اس کا دل نہیں ہوتا، اگر تو اس پر حملہ کرے تو وہ ہانپتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپتا ہے۔ اسی طرح وہ ہے جو ہدایت کو ترک کر دیتا ہے اس کا دل نہیں ہوتا، بلاشبہ اس کا دل کٹ جاتا ہے۔ قتیبی نے کہا ہے: ہر شے ہانپتی ہے چاہے تھکاوٹ کی حالت ہو یا آرام و راحت کی حالت، بیماری کی حالت ہو یا صحت کی حالت، سیرابی کی حالت ہو یا پیاس کی حالت۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی مثل قرار دیا ہے جس نے اس کی آیات کو جھٹلایا اور فرمایا: اگر تو اسے وعظ و نصیحت کرے تب بھی وہ گمراہ ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ گمراہ ہے تو پس وہ اس کتے کی مثل ہے کہ اگر تو اسے چھوڑے تب بھی وہ ہانپے اور اگر تو اسے دھتکارے اور بھگائے تب بھی وہ ہانپے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ (الاعراف) (اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو)

جوہری نے کہا ہے: لهث الكلبُ يلهثُ لَهْثًا ولُهاثًا تب کہا جاتا ہے جب کتا تھکاوٹ یا پیاس کے سبب اپنی زبان باہر نکالے اور اسی طرح وہ آدمی ہوتا ہے جب وہ خوب تھک جائے۔ اور ارشاد گرامی: اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ کا مفہوم ہے کہ جب تو کتے پر حملہ کرے تو وہ بھونکتا ہے اور بھاگتے ہوئے واپس مڑ جاتا ہے اور جب تو اسے چھوڑ دے تو وہ تجھ پر زور دیتا ہے اور بھونکتا ہے، پس وہ تیری طرف بڑھنے اور تجھ سے پیچھے ہٹنے میں اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے تو اس وقت اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو شدت پیاس کے وقت طاری ہوتی ہے یعنی وہ زبان نکال لیتا ہے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے درندوں میں سے کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس لیے کہ کتے کا دل مردہ ہے اور بلاشبہ اس کا ہانپنا اس کے دل کی موت کی وجہ سے ہی ہے، چونکہ بقیہ تمام درندے اس طرح نہیں ہیں اس لیے وہ ہانپتے نہیں۔ اور کتا اس لیے اس طرح ہو گیا، کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو آپ کا دشمن بہت خوش ہوا اور وہ درندوں کی طرف گیا اور انہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 478

حضرت آدم کے خلاف انگیخت دلائی۔ پس کتے میں ان تمام سے زیادہ اس کی طلب ہوئی۔ تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام وہ عصا لے کر نازل ہوئے جو مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں آپ کے لیے اسے ایک نشانی اور معجزہ بنا دیا اور اس میں بہت بڑی طاقت رکھ دی اور وہ آس الجنۃ میں سے تھا، پس آپ (جبرئیل امین علیہ السلام) نے وہ اس دن حضرت آدم علیہ السلام کو دیا تا کہ آپ ان کے ساتھ درندوں کو اپنے آپ سے دور بھگائیں۔ اور ایک روایت کے مطابق آپ کو اس بارے حکم دیا کہ آپ کتے کے قریب ہوں اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھیں۔ پس اس وجہ سے کتا آپ کے ساتھ مانوس ہو گیا۔ اور اس کا دل ڈنڈے کی طاقت سے مر گیا اور وہ ہمارے آج دن تک آپ سے اور آپ کی اولاد سے محبت کرتا ہے، جب بھی کوئی اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دے اور وہ اولاد آدم کے پہرے داروں میں سے ایک پہرے دار (محافظ) بن گیا۔ اور جب اسے ادب سکھایا جائے اور شکار کی تعلیم دی جائے تو وہ ادب سیکھ جاتا ہے اور تعلیم کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اسی کے بارے یہ ارشاد ہے: تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (المائدہ: 4) (تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا ہے تمہیں اللہ نے)۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے بعد بلعام اسی طرح ہانپتا رہا جیسے کتا ہانپتا ہے۔ کثیر اہل علم کے قول کے مطابق یہ مثال تاویل کے ساتھ ہر اس کے لیے عام ہے جسے قرآن (کا علم) عطا کیا گیا اور اس نے اس کے مطابق عمل نہ کیا، بعض نے کہا ہے: یہ ہر منافق کے بارے میں ہے، پہلا قول اصح ہے۔

قول باری تعالیٰ: فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ کے بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی اگر تو اس پر اپنے جانور (سواری) یا اپنے پاؤں کے ساتھ حملہ کرے تو وہ ہانپنے لگتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا ہے۔ اور اسی طرح وہ آدمی ہے جو کتاب پڑھتا ہے لیکن جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل نہیں کرتا۔ اور کسی اور نے کہا ہے: یہ انتہائی بری تمثیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمثیل اس بارے میں دی ہے کہ اس پر اس کی خواہش اتنی غالب آگئی یہاں تک کہ وہ اس طرح ہو گیا کہ اپنے نفس کے بھی نفع اور نقصان کا مالک نہ رہا جیسا کہ ہمیشہ ہانپنے والا کتا ہوتا ہے، اس پر حملہ کیا جائے یا حملہ نہ کیا جائے، وہ ہانپنے کو چھوڑنے میں اپنے آپ کا مالک نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتے کی عادات میں سے یہ ہے کہ وہ اس پر واقع ہو جاتا ہے جو اسے ابتدا میں سختی اور شدت کے ساتھ خوفزدہ نہ کرے، پھر حقیر سا عوض پانے کے ساتھ ہی اس کی طیش پرسکون ہو جاتی ہے (یعنی اس کا غصہ اتر جاتا ہے اور وہ مانوس ہونے لگتا ہے) اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے بطور تمثیل بیان فرمایا ہے جو دین کے معاملہ میں رشوت لیتا ہے یہاں تک کہ اپنے رب کی آیات سے باہر نکل جاتا ہے۔ پس یہ آیت اس کی دلیل ہے جس نے اس میں اس اعتبار سے تدبر اور غور و فکر کی کہ کوئی نہ اپنے عمل کے ساتھ دھوکہ کھائے اور نہ اپنے علم کے ساتھ، کیونکہ وہ اس کے بارے نہیں جانتا جس پر اس کا خاتمہ ہوگا۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ حق کو باطل کرنے یا اسے تبدیل کرنے کے لیے رشوت لینا ممنوع ہے۔ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ بغیر ایسی حجت اور دلیل کے کسی عالم کی تقلید منع ہے جسے وہ بیان کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اسے اپنی یہ آیات عطا فرمائیں لیکن وہ ان سے نکل گیا پس واجب ہے کہ وہ کسی

دوسرے کے بارے اس کی مثل سے ڈرتا ہے اور یہ کہ وہ اس سے بغیر حجت کے کوئی شے قبول نہ کرے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ِۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ یعنی یہ تمام کفار کی مثال ہے۔ اور قولہ: سَآءَ مَثَلَا ِۨالْقَوْمُ۔ کہا جاتا ہے: ساء الشئ یعنی شی قبیح او بری ہے۔ یہ فعل لازم ہے اور ساء یسوء مساءۃ یہ متعدی ہے: أی قبح مثلھم (ان کی مثال قبیح ہے) اور تقدیر کلام ہے ساء مثلا مثل القوم (قوم کی مثال انتہائی قبیح مثال ہے) پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا، اور تمیز کی بنا پر مثلا کو نصب دی گئی ہے۔ اخفش نے کہا ہے: مجازا المثل القوم بنا دیا گیا ہے اور القوم مبتدا ہونے یا مبتدا مضمر ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ تقدیر کلام ہے: ساء المثل مثلاً ھو مثل القوم۔ ابوعلی نے تقدیر کلام یہ بیان کیا ہے: ساء مثلاً مثل القوم۔ عاصم جحدری اور اعمش نے ساء مثل القوم پڑھا ہے یعنی مثل ساء کے سبب مرفوع ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

''جسے ہدایت بخشے اللہ تعالیٰ سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جنہیں گمراہ کر دے تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس کا معنی اور مفہوم کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت قدریہ کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ ان کا رد بھی کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین کو ہدایت دی ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کرلے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور بے شک ہم نے پیدا کئے جہنم کے لیے بہت سے جن اور انسان ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ان سے اور ان کے کان تو ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ان سے وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اپنے عدل کے ساتھ جہنم کے لیے کئی اہل پیدا کیے ہیں، پھر ان کے اوصاف بیان کیے اور فرمایا: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا یعنی یہ اس کی طرح ہوتے ہیں جو سمجھتا نہیں، کیونکہ وہ دلوں سے کوئی نفع نہیں اٹھاتے، نہ وہ ثواب کی عقل و سمجھ رکھتے ہیں اور نہ سزا اور عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ ہدایت کو نہیں دیکھتے اور اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کان تو ہیں لیکن ان کے ساتھ نصائح کو نہیں سنتے۔ یہاں کلی طور پر ان کے حواس سے ادراک کی نفی مقصود نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سورۃ البقرہ میں اسے بیان کیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کیونکہ وہ (اہل جہنم) ثواب کی طرف ہدایت اور رہنمائی نہیں پا سکتے، پس وہ حیوانوں

کی طرح ہیں، یعنی ان کا مقصد کھانا اور پینا ہے اور وہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں، کیونکہ حیوان اپنے منافع اور نقصان کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے مالک کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہ اس کے خلاف ہیں۔

حضرت عطا نے کہا ہے: حیوان الله تعالیٰ کو پہچانتے ہیں، لیکن کافر اسے نہیں پہچانتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حیوان الله تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور کافر مطیع نہیں ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی انہوں نے تدبر اور غور و فکر چھوڑ دیا ہے اور جنت اور جہنم سے اعراض کر لیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑱⓪

''اور الله ہی کے لیے ہیں نام اچھے اچھے سو پکارو اسے انہی ناموں سے اور چھوڑ دو انہیں جو کجروی کرتے ہیں اس کے ناموں میں، انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا یہ امر اس بارے ہے کہ عبادت خالصۃً الله تعالیٰ ہی کے لیے ہو اور مشرکین و ملحدین سے کلی اجتناب ہو۔ مفسرین میں سے مقاتل وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مسلمانوں میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنی نماز میں کہہ رہا تھا: یا رحمن یا رحیم۔ تو مشرکین مکہ میں سے ایک آدمی نے کہا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب یہ گمان نہیں کرتے کہ وہ ایک رب کی عبادت کرتے ہیں، تو اسے کیا ہوا ہے کہ یہ دو ربوں کو پکار رہا ہے؟ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔

مسئلہ نمبر 2۔ ترمذی اور سنن ابن ماجہ وغیرہما میں حدیث طیبہ موجود ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے اس میں یہ بیان ہے کہ الله تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں (1)۔ دونوں میں سے ایک میں وہ کچھ ہے جو دوسرے میں نہیں ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء الله الحسنیٰ'' میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے اور ترمذی کی حدیث ذکر کی ہے اور وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اگرچہ اس میں ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صفوان بن صالح کی حدیث کے سوا نہیں جانتے، اور وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔ اس بارے میں انہی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول متواتراً منقول ہے: ''بے شک الله تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں، ایک کم سو ہیں جس نے انہیں شمار کیا (پڑھا) وہ جنت میں داخل ہوگا'' (2)۔

اس میں أحصاھا کا معنی ہے جس نے انہیں گنا اور انہیں یاد کیا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جسے ہم نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اور ہم نے وہاں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام ترمذی کی حدیث صحیح ہے۔ اور ہم نے اسماء میں سے وہ بھی ذکر کیے ہیں جن پر اجماع ہے اور وہ بھی جن میں اختلاف ہے جن پر ہم اپنے ائمہ کی کتب میں واقف ہوئے ہیں اور وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب اسماء الله عزوجل، حدیث نمبر 3850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 257

تقریباً دوسو اسم ہیں۔ اور ہم نے ان کی تعیین سے پہلے کتاب کے مقدمہ میں بتیس فصلیں ذکر کی ہیں جو ان کے احکام سے متعلق ہیں جو کوئی واقف ہونا چاہے وہ اس کتاب اور اس کے علاوہ دیگر کتب جو اس بارے میں لکھی گئی ہیں ان کی طرف رجوع کرے۔ واللہ الموفق للصواب، لا رب سواہ۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے اس باب میں اسم اور مسمیٰ میں اختلاف کیا ہے، علماء نے اس بارے میں جو کہا ہے ہم نے اسے ''الکتاب الاسنیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔ ابن الحصار نے کہا ہے: اس آیت میں اسم کا وقوع مسمیٰ پر بھی ہے اور تسمیہ پر بھی۔ پس قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یہ مسمیٰ پر واقع ہے، اور قول باری تعالیٰ: الْاَسْمَآءُ یہ اسم کی جمع ہے اور تسمیات پر واقع ہے، جو کچھ ہم نے کہا ہے فَادْعُوْهُ بِهَا اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، قول باری تعالیٰ فَادْعُوْهُ میں ہا ضمیر مسمیٰ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہی مدعو ہے اور بِهَا میں ھا ضمیر اسماء کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی وہ اسماء ہیں جن کے ساتھ پکارا جاتا ہے نہ کہ ان کے سوا کسی اور کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کا تقاضا لسان العرب کرتی ہے۔ اسی کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی بھی ہے: لی خمسة أسماء أنا محمد وأحمد الحدیث (میرے پانچ اسماء ہیں میں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں) اس میں سے کچھ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وہ رائے جسے اہل حق اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے، یا اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ اسم تسمیہ کا غیر ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے: اس میں تین اقوال ہیں۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا غیر ہو تو پھر ضروری ہے کہ اسماء اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے ہوں۔ دوسرا قول یہ ہے دوسروں نے کہا ہے: اس سے مراد تسمیات ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو واحد ہے اور اسماء جمع ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ آیت میں اسماء بمعنی تسمیات ہیں۔ اس پر تاویل کرنے والوں کا اجماع ہے اس کے سوا (کوئی اور مراد لینا) جائز نہیں۔

قاضی ابوبکر نے کتاب ''التمہید'' میں کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل یہ ہے ''کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسم ہیں جس نے انہیں پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا'' (1)۔ یعنی بلا اختلاف اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے مختلف اور متفرق اوصاف پر ہونے سے عبارت ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اپنی ذات کے لیے مستحق ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اس صفت کے لیے مستحق ہوتا ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کے وہ اسماء جو اس کی ذات کی طرف لوٹتے ہیں وہی وہ ہیں اور جو اس کی صفت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہی اس کے اسماء ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اس کی ذات کی صفات ہیں اور ان میں سے کچھ افعال کی صفات ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کی یہی تاویل ہے یعنی التسمیات الحسنی۔ تیسرا قول یہ ہے ان میں سے بعض دوسروں نے کہا ہے:

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 314

وللہ الصفات (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں)

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اسماء کو حسنیٰ کا نام دیا ہے، کیونکہ وہ کانوں اور قلوب میں حسنہ اور خوبصورت لگتے ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے جود و کرم اور اس کی رحمت و فضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اور الحسنی مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فعلی کے وزن پر الحسنی مقدر ہو، جو کہ احسن کی مؤنث ہے، جیسا کہ کبری، اکبر کی مونث ہے، اور جمع کبر اور حسن ہے۔ اور پہلے (قول) پر اسے مفرد لایا گیا ہے جیسا کہ غیر ذوی العقول کا وصف مفرد لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ (طٰہٰ) اور یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ (سبا: 10)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَادْعُوْهُ بِهَا یعنی تم اس میں سے اس کے اسماء کے سبب طلب کرو، پس ہر اسم کے ساتھ وہی چیز طلب کی جائے گی جو اس کے لائق اور مناسب ہوگی۔ پس تو کہے گا: اے رحیم! مجھ پر رحم فرما، اے حکیم! مجھے حکمت و دانائی عطا فرما، اے رازق! مجھے رزق عطا فرما، اے ہادی! مجھے ہدایت عطا فرما، اے فتاح! مجھے فتح اور کامیابی عطا فرما، اے تواب! میری توبہ قبول فرما۔ اسی طرح تمام اسماء ہیں۔

اور اگر تو عام اسم کے ساتھ دعا مانگے تو تو کہے گا: اے مالک! مجھ پر رحم فرما، اے عزیز! مجھے حکمت و دانائی عطا فرما، اے لطیف! مجھے رزق عطا فرما اور اگر اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگے اور کہے: اے اللہ! تو یہ ہر اسم کو متضمن ہے۔ اور یہ نہیں کہے گا: اے رزاق! مجھے ہدایت عطا فرما، مگر یہ کہ ارادہ یہ ہو اے رزاق مجھے خیر اور بھلائی عطا فرما۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی طرح تو اپنی دعا کو مرتب کر تو تو مخلصین میں سے ہو جائے گا۔ دعا کی شرائط سے سورۃ البقرہ میں اور اس سورت میں بھی گزر چکی ہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 6۔ قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد اسماء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں داخل کیے ہیں۔ مثلاً متم نورہ، خیر الوارثین، خیر الماکرین، رابع ثلاثۃ، سادس خمسۃ، الطیب اور المعلِم اور انہی کی مثل اور اسماء۔ ابن الحصار نے کہا ہے: انہوں نے اس میں ابن برجان کی اقتدا کی ہے، انہوں نے اسماء میں النظیف بھی ذکر کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی جو کتاب و سنت میں وارد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ان کے قول میں سے ذکر کیا گیا ہے مما لم یرد فی کتاب ولا سنۃ تو تحقیق صحیح مسلم میں الطیب آیا ہے۔ اور ترمذی نے النظیف ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: رب اعنی ولا تعن علی و انصرنی ولا تنصر علی و امکرلی ولا تمکر علی الحدیث(1) (اے میرے پروردگار! میری مدد فرما، میرے خلاف مدد نہ کر، مجھے نصرت عطا فرما اور میرے خلاف کسی کی نصرت نہ کر اور میرے لیے تدبیر فرما اور میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) اور اس حدیث کے بارے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ پس اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: یا خیر الماکرین امکرلی ولا تمکر علی (اے سب سے بہتر تدبیر فرمانے والے میرے لیے تدبیر فرما اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب دعوات عن رسول اللہ، باب فی دعاء النبی علیہ السلام، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) ہم نے الطیب اور النظیف کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی ہیں جن کا ذکر اخبار میں ہے اور وہ سلف صالحین سے منقول ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا اور ان کے ساتھ دعا مانگنا جائز ہے اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا تو جائز ہے اور ان کے ساتھ دعا نہیں مانگی جاتی اور وہ بھی ہیں جن کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ نام رکھا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ دعا مانگی جائے، جیسا کہ انہیں شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ وہاں تیرے لیے اس کی خوب وضاحت ہو جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يُلْحِدُوْنَ الحاد کا معنی ہے ایک طرف جھک جانا اور قصد ترک کر دینا، کہا جاتا ہے: الحد الرجل فی الدین (آدمی دین کے معاملہ میں کجرو ہو گیا یعنی اس نے دین کا اعتدال ترک کر دیا) اور جب کوئی جھک جائے تو کہا جاتا ہے: الحد اور اسی سے قبر میں لحد بھی ہے، کیونکہ وہ بھی قبر کی ایک طرف میں ہوتی ہے۔ يَلْحَدُوْنَ بھی پڑھا گیا ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الحاد تین وجوہ سے ہو سکتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں تغیر اور تبدیلی ہو جیسا کہ مشرکین نے کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے انہیں (اسماء کو) اس معنی سے پھیر دیا جس پر یہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ اپنے بتوں کے نام رکھ لیے۔ پس انہوں نے اللات کو لفظ اللہ سے، العزیٰ کو العزیز سے اور منات کو المنان سے مشتق کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ نے یہی کہا ہے۔ دوسری وجہ ان میں زیادتی کے سبب (الحاد ہو سکتا ہے)۔ اور تیسری وجہ ان سے کچھ کم کر کے (الحاد ہو سکتا ہے) جیسا کہ وہ جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں جو دعائیں اختراع کرتے ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا نام اس کے اسماء کے بغیر لیتے ہیں اور وہ اس کا ذکر اس کے بغیر کرتے ہیں اس کے افعال میں سے جن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسی چیزوں سے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: پس تو ان سے بچ اور پرہیز کر اور تم میں سے کوئی بھی اسے نہ پکارے مگر انہیں اسماء میں سے کسی کے ساتھ جو کتاب اللہ اور کتب خمسہ میں ہیں (پانچ کتابوں سے مراد) بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی ہیں۔ پس یہی وہ کتابیں ہیں جن پر اسلام کا دارومدار ہے اور ان میں وہ سب کچھ شامل ہے جو اس مؤطا میں ہے جو اصل التصانیف ہے۔ اور تم اس کے سوا (سب کو) چھوڑ دو اور تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں اس طرح کی دعا کو پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار کر لیا ہے اور اسی وجہ سے مخلوق کی طرف اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اسماء میں زیادتی سے مراد تشبیہ ہے اور نقصان سے مراد تعطیل ہے، کیونکہ مشبہ نے ایسے ناموں کے ساتھ اسے متصف کیا ہے جن کے بارے میں اس نے اجازت نہیں دی اور معطلہ نے اس سے وہ اوصاف سلب کر لیے ہیں جن کے ساتھ وہ متصف ہے۔ اسی وجہ سے اہل حق نے کہا ہے: بے شک ہمارا دین دو راستوں کے درمیان ایک راستہ ہے، نہ اس کا تعلق تشبیہ کے ساتھ ہے اور نہ ہی تعطیل کے ساتھ ہے۔ شیخ ابوالحسن بوشنجی سے توحید کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 810

فرمایا: ایک ذات کو ثابت کرنا جس کی دیگر ذاتوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو اور نہ ہی (اس کی) صفات میں سے کوئی معطل ہو۔
تحقیق قول باری تعالیٰ: وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ میں کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم انہیں چھوڑ دو اور تم ان سے بحث مباحثہ نہ کرو اور نہ ان کے ساتھ تعرض کرو۔ پس اس بنا پر یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی وعید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ (المدثر) (آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے)

اور اس کا ارشاد ہے: ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا (الحجر: 3) (انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں) اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَیُجۡزَوۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ

وَ مِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا فرمایا ایک امت ہے جو راہ دکھاتی ہے حق کے ساتھ اور حق کے ساتھ ہی عدل وانصاف کرتی ہے''۔

حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''وہ یہی امت ہے'' اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تمہارے لیے ہے اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو بھی اسی کی مثل عطا فرمائی''۔ اور آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: ''بے شک میری امت میں سے ایک قوم حق پر رہے گی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں گے''۔ پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کسی وقت بھی دنیا کو ایسے داعی سے خالی نہیں کرے گا جو حق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۲﴾

''اور جنہوں نے تکذیب کی ہماری آیتوں کی تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرادیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے جنہوں نے اس کی آیات کی تکذیب کی ہے کہ وہ انہیں آہستہ آہستہ پستی میں گرا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل مکہ ہیں اور استدراج کا معنی ہے بالتدریج منزل بمنزل کسی چیز کو پکڑنا اور درج کا معنی ہے کسی شے کو لپیٹنا۔ کہا جاتا ہے: أدرجتُه و درجتُه (میں نے اسے لپیٹ دیا) اور اسی سے أُدْرِجَ المیت فی اکفانه بھی ہے (یعنی میت کو اپنے کفن میں لپیٹ دیا گیا) بعض نے کہا ہے: یہ الدرجه سے ہے۔ پھر استدراج یہ ہوگا کہ کسی کو درجہ بدرجہ مقصود کی طرف گرایا جائے۔ ضحاک نے کہا ہے: جب بھی وہ ہمارے لیے نئی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں ہم انہیں نئی نعمت عطا فرما دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کونسی وہ انتہا ہے جس سے بندہ دھوکہ کھا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: الطاف وکرامات سے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ہم ان پر نعمتوں کی بوچھاڑ کر دیں گے

اور انہیں شکر بھلا دیں گے۔ اور انہوں نے یہ اشعار کہے ہیں:

أحسنتَ ظنّك بالأيام إذحَسُنتْ ولم تَخَفْ سوءَ ما يأتي به القَدَرُ

و سالمتْكَ الليالي فاغتررْتَ بها و عند صَفْوِ الليالي يحدثُ الكَدَرُ

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

''اور میں مہلت دیتا ہوں انہیں، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پختہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُمْلِیْ لَهُمْ یعنی میں ان کے لیے مدت طویل کر دیتا ہوں اور انہیں مہلت دیتا ہوں اور ان کی سزا مؤخر کر دیتا ہوں۔ اِنَّ كَیْدِیْ یعنی بے شک میری خفیہ تدبیر مَتِیْنٌ انتہائی قوی اور مضبوط ہے۔ اس کی اصل المتن سے ہے، اور اس سے مراد وہ موٹا گوشت ہے جو صلب کی جانب سے ہو۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت استہزاء کرنے والے قریش کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دینے کے بعد پھر ایک ہی رات میں ہلاک کر دیا۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً (انعام:44) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾

''کیا اب تک نہیں غور و فکر کیا انہوں نے۔ ان کے صاحب پر تو جنوں کا ذرا اثر نہیں، نہیں ہے وہ مگر کھلم کھلا ڈرانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا کیا اب تک انہوں نے اس میں غور و فکر نہیں کیا جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر ان کے پاس آئے۔ یَتَفَكَّرُوْا پر وقف کرنا اچھا ہے۔ پھر فرمایا: مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ یہ ان کے اس قول کا رد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ (الحجر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات قریش کو دعوت دینے کے لیے صفا پر کھڑے ہوئے، آپ علیحدہ علیحدہ قبیلہ کو بلاتے اور فرماتے: ''اے بنی فلاں'' آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی سزا سے ڈراتے رہے۔ تو ان میں سے بعض کہنے والوں نے کہا: بے شک ان کا یہ صاحب تو مجنون ہے، رات بھر آواز بلند ہوتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی (1)۔

اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں اور (اس میں) جو چیز پیدا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس میں کہ شاید نزدیک آ گئی ہو ان کی مقررہ میعاد۔ تو کس بات پر وہ اس (قرآن) کے بعد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 483

ایمان لے آئیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمۡ يَنۡظُرُوۡا فِىۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمۡ يَنۡظُرُوۡا یہ قرآن کریم کی آیات میں نظر و فکر کرنے سے ان کے اعراض کرنے پر اظہار تعجب ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کو پہچان سکتے، جیسا کہ ہم نے انہیں سورۃ البقرہ میں بیان کیا ہے۔ اور ملکوت مبالغہ میں سے ہے۔ اور اس کا معنی ہے وسیع مملکت، عظیم سلطنت۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں نظر و فکر کرنا اور اس کی مخلوقات سے عبرت حاصل کرنا واجب ہے انہوں نے اس آیت اور اس کی مثل دیگر آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (یونس: 101) (فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا (ق: 6) کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے۔ اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ۞ الآیہ (الغاشیہ) (کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے) وَفِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۞ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نظر و فکر نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی ہے اور ان کے اپنے حواس سے نفع اٹھانے کو سلب کر لیا ہے پس ارشاد ربانی ہے: لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا الآیہ (الاعراف: 179) (ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے) علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ واجبات میں سے پہلا واجب کیا ہے، کیا وہ نظر و فکر کرنا اور استدلال کرنا ہے یا وہ ایمان ہے جو دل میں حاصل ہونے والی تصدیق ہے اور اس کے صحیح ہونے کے لیے معرفت شرط نہیں؟ تو قاضی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر و فکر اور استدلال کرنا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو بداہۃً نہیں جانا جاسکتا، بلکہ اس کا علم نظر و فکر کرنے اور ان دلائل سے استدلال کرنے سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی معرفت اور پہچان کے لیے قائم کیے ہیں۔ یہی موقف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اپنی کتاب میں یہ باب باندھا ہے (باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ عزوجل: فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

قاضی نے کہا ہے: جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے نہیں جانتا تو وہ جاہل ہے اور جو اس کے بارے جاہل ہے وہ کافر ہے۔ ابن رشد نے اپنے مقدمات میں کہا ہے: یہ بین نہیں ہے، کیونکہ ایمان اس یقین کے ساتھ صحیح ہوتا ہے جو اسے حاصل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تقلید کے سبب ہدایت عطا فرمائی اور پہلے مرحلہ میں اعتبار اس کا ہے جس کے اعتبار کی طرف اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی آیت کے رہنمائی فرمائی۔ فرمایا: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر واستدلال ہے ان کے خلاف علامہ الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ تمام زمانوں میں عوام الناس اور مقلدین کا نام مومنین رکھنے پر تمام مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر وہ صحیح ہے جس کی طرف نظر واستدلال والے لوگ گئے ہیں تو پھر مومن صرف اسے ہی کہا جائے جس

کے پاس نظر و استدلال کے سبب علم ہو۔ اور مزید یہ کہا ہے: اگر ایمان صحیح نہ ہو مگر نظر و استدلال کے بعد تو پھر کفار کے لیے جائز ہے کہ جب مسلمان ان پر غالب آئیں تو وہ ان سے کہیں: تمہارے لیے ہمیں قتل کرنا حلال نہیں ہے، کیونکہ تمہارے دین میں سے یہ ہے کہ ایمان صحیح نہیں ہوتا مگر نظر وفکر اور استدلال کے بعد، پس تم ہمیں مہلت دو تا کہ ہم غور وفکر کریں اور دلائل حاصل کر سکیں۔ علامہ نے فرمایا: یہ شے انہیں ان کے کفر پر ہی چھوڑنے کی طرف پہنچانے والی ہے اور یہ کہ انہیں قتل نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ غور وفکر کرلیں اور استدلال کرلیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کا قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور وہ ایمان لائیں میرے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو میں لے کر آیا ہوں، پس جب انہوں نے ایسا کرلیا تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے اموال مجھ سے محفوظ کرلیے سوائے حق کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے''۔ ابن منذر نے ''کتاب الاشراف'' میں ایمان کامل کی صفات ذکر کی ہیں اہل علم میں سے جو کوئی اسے یاد رکھتا ہے ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ کافر جب کہے اشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده ورسوله اور یہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو لے کر آئے وہ حق ہے اور میں ہر اس دین سے اظہار برأت کرتا ہوں جو دین اسلام کے مخالف ہے، درآنحالیکہ وہ بالغ اور صحیح العقل ہو بلاشبہ وہ مسلمان ہے۔ اور اگر اس کے بعد وہ رجوع کرلے اور کفر ظاہر کرے تو وہ مرتد ہوگا اور اس پر وہ سزا واجب ہوگی جو مرتد پر واجب ہوتی ہے۔ ابوحفص زنجانی نے کہا ہے: ہمارے شیخ قاضی ابوجعفر احمد بن محمد سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اوّل الواجبات اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس دین کے ساتھ ایمان لانا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، بعد ازاں نظر و استدلال دونوں اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں، پس آپ کے نزدیک ایمان باللہ کا وجوب معرفت باللہ پر مقدم ہے۔ فرمایا: یہ صواب کے زیادہ قریب ہے اور مخلوق کے لیے زیادہ مفید ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر معرفت اور نظر و استدلال کی حقیقت کو جانتے ہی نہیں پس اگر ہم کہیں: اوّل الوجبات اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے تو یہ یقیناً ایک جم غفیر اور کثیر تعداد کی تکفیر تک پہنچا دے گا اور یہ کہ پھر اکا دکا لوگوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اور یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین دلایا ہے کہ اہل جنت میں سے سب سے زیادہ آپ کی امت ہوگی۔ اور یہ کہ تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی امتیں ایک صف ہوں گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اسی صفیں ہوگی۔ اور یہ اتنا بین اور واضح ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 3۔ متکلمین میں سے بعض متاخرین اور متقدمین نے یہ کہا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کو ان طرق سے نہ پہچانا جو انہوں نے معرفت کے طریقے مقرر کیے ہیں اور ان ابحاث سے نہ پہچانا جو انہوں نے تحریر کیے ہیں تو اس کا ایمان صحیح نہیں اور وہ کافر ہے۔ تو اس بنا پر تو اکثر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے اور سب سے اوّل جس سے تکفیر کی ابتدا کی جائے گی وہ اس کے اپنے آباء، اسلاف اور پڑوسی ہوں گے۔ اور بعض کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے کہا: مجھے اہل نار کی کثرت کے سبب برا بھلا نہ کہہ۔ اوکما قال

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول صادر نہیں ہو سکتا مگر اسی سے جو کتاب اللہ اور اپنے نبی ﷺ کی سنت سے جاہل ہو، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو متکلمین کی ایک قلیل سی جماعت پر محصور کر دیا ہے اور انہوں نے عام مسلمانوں کی تکفیر کی مشقت کی ہے۔ یہ اس اعرابی کے قول سے کہاں ثابت ہے جس نے پیشاب کرنے کے لیے اپنی شرمگاہ کو کھولا۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ کے اصحاب نے اسے جھڑکا: اللّٰھم ارحمنی و محمدًا ولا ترحم معنا أحدا (اے اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر) تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لقد حجرت واسعًا (1) (تحقیق تو نے وسیع (رحمت) کو محدود کر دیا ہے) اسے امام بخاری، ترمذی اور دیگر آئمہ نے روایت کیا ہے۔ کیا آپ اس اعرابی کے بارے جانتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو دلیل و برہان اور حجت و بیان کے ساتھ پہچان لیا تھا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شے سے وسیع ہے اور اس کی مثل اور کتنے ہوں گے جن کے لیے ایمان کا حکم لگایا گیا، بلکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے تو اس بارے بہت سے لوگوں کے بارے صرف اس پر اکتفا کیا کہ وہ شہادتین پڑھنے کے سبب اسلام لائے، حتیٰ کہ آپ نے اس میں اشارے پر بھی اکتفا کیا۔ کیا تم جانتے نہیں ہو جب آپ نے سوداء کو کہا تھا: ''اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟''۔ اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''میں کون ہوں؟''۔ اس نے کہا: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **أعتقها فإنها مومنة** (تو اسے آزاد کر دے بلاشبہ یہ مومنہ ہے) یہاں نظر و استدلال تو نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ نے پہلے ہی مرحلہ میں ان کے ایمان کا حکم لگا دیا، اگرچہ وہاں نظر و معرفت سے غفلت تھی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ امرد (بے ریش نابالغ بچہ) اور عورتوں میں سے حسینوں کے چہروں میں دیکھنا اور غور و فکر کرنا بھی جائز نہیں۔ علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوطیب طاہر بن عبداللہ طبری نے کہا ہے مجھے اس گروہ کی جانب سے یہ خبر پہنچی ہے جو سماع سنتا ہے کہ وہ امرد کے چہرے کی طرف کثرت سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات اسے زیور اور رنگ دار کپڑوں کے ساتھ آراستہ اور مزین کرتے ہیں اور وہ گمان یہ کرتے ہیں کہ وہ اس سے ایمان میں زیادتی کا قصد کرتے ہیں نظر و فکر کے ذریعے اور صنعت سے صانع پر استدلال کرتے ہیں۔ یہ خواہش نفس کی پیروی کرنے، عقل کو دھوکہ دینے اور علم کی مخالفت کرنے کی انتہا ہے۔ ابوالفرج نے کہا ہے: امام ابوالوفاء بن عقیل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے دیکھنا حلال نہیں کیا مگر صرف اس صورت میں جس کی طرف نفس کا میلان نہ ہو، اس میں ہواء و ہوس کا حصہ نہ ہو، بلکہ اس میں ایسی عبرت ہو جس میں شہوت کی آمیزش نہ ہو۔ اور نہ اس کے ساتھ لذات کی ملاوٹ ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی عورت کو رسول بنا کر مبعوث نہیں فرمایا اور نہ ہی کسی کو قاضی، امام اور موذن بنایا، یہ سب اس لیے ہوا کیونکہ عورت شہوت اور فتنہ کا محل ہے۔ پس جس نے کہا: میں حسین و جمیل صورت سے نصیحت پکڑتا ہوں تو ہم اس کی تکذیب کریں گے۔ اور ہر وہ جس نے اپنے آپ کو ایسی فطرت اور طبیعت کے ساتھ ممتاز کیا جو اسے ہماری طبائع سے نکال دے تو ہم اس کی تکذیب کریں گے، بلاشبہ یہ ان کے لیے شیطان کے دھوکے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: عالم کبیر کی ہر شے کی نظیر عالم صغیر میں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **لَقَدْ خَلَقْنَا**

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889

الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین) (بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل وشکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر) اور مزید یہ فرمایا: وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

ہم نے وجہ تمثیل سورۃ الانعام کے اول میں بیان کر دی ہے۔ پس صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرف دیکھے اور اپنی خلقت میں اس وقت سے غور وفکر کرے جب کہ وہ ٹپکنے والے پانی سے لے کر خلقا سویا کے مقام تک پہنچا، اسے غذائیں مہیا کی جاتی ہیں، نرمی کے ساتھ اس کی تربیت کی جاتی ہے اور انتہائی ملائمت کے ساتھ اس کی حفاظت کی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ قوت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے اور جوانی وبلوغت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اور جب وہ اس حال میں ہوتا ہے تو پھر کہتا ہے: میں ہی میں ہوں، اور اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس پر ایسا زمانہ بھی آیا ہے جب وہ قابل ذکر شے نہ تھا اور عنقریب وہ قبر میں لوٹ جائے گا۔ پس اس پر افسوس ہے اگر یہ تھکا ماندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ...... تا قولہ ...... الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں ...... پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا)

پس وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ بندہ ہے جسے پالا گیا ہے، احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اگر وہ کوتاہی کرے، اسے ثواب کی امید دلائی گئی ہے اگر وہ اطاعت وفرمانبرداری کرے، پس وہ اپنے مولیٰ کی عبادت پر متوجہ رہے (کیونکہ) اگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ (مولیٰ) تو اسے دیکھ رہا ہے اور وہ لوگوں سے نہ ڈرے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اس سے ڈرے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی پر تکبر نہ کرے، کیونکہ وہ غلاظت اور میل کچیل سے مرکب ہے، وہ جنت کی طرف جانے والا ہے اگر اس نے اطاعت کی یا پھر آتش جہنم کی طرف جانے والا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے شیوخ پسند کرتے ہیں کہ آدمی ان حکمت بھرے اشعار میں غور وفکر کرے جو ان علمی اوصاف کے جامع ہیں۔

کیف یَزْهُو مَن رجیعُه أبدَ الدهر ضجیعُه
فهو منه وإلیه وأخوه و رضیعُه
وهو یدعوه إلى الحشّ بصُغْر فیطیعُه

قولہ تعالیٰ: وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے، یعنی ان اشیاء میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں۔ وَ اَنْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ یعنی ان مقررہ مدتوں میں جن کے بارے امید ہے کہ وہ قریب آگئی ہوں۔ یہ کلام محل جر میں ہے اور اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ اس میں اقترب أجل (مقررہ میعاد کا قریب آنا) سے مراد غزوہ بدر اور غزوۂ احد کے دن ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ یعنی وہ قرآن جو حضور نبی

رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اس کے بغیر کون سا قرآن ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے؟ اور بعض نے کہا ہے: آیت میں ہا ضمیر کا مرجع اجل ہے، معنی یہ ہوگا مقررہ معیاد آنے کے بعد وہ کون سی بات کے ساتھ ایمان لائیں گے جس وقت ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا، کیونکہ آخرت تو دار التکلیف نہیں ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۸۶

''جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے۔ وہ رہنے دیتا ہے انہیں کہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں''۔

بیان فرمایا کہ ان کے اعراض کی وجہ یہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ یہ جملہ مستانفہ ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ فاء اور اس کے مابعد کے محل پر محمول کرتے ہوئے اسے جزم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ يَعْمَهُوْنَ یعنی وہ حیرت زدہ رہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ متردد ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدا میں پوری بحث گزر چکی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۷

''وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ کب ہوگا اس کا وقوع۔ آپ کہیے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی، یہ (حادثہ) بہت گراں ہے آسمانوں اور زمین میں، نہ آئے گی تم پر مگر اچانک۔ وہ پوچھتے ہیں آپ سے گویا آپ خوب تحقیق کر چکے ہیں اس کے متعلق۔ آپ فرمایئے: اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا، أیان یہ متیٰ کے مثل زمانے اور وقت کے بارے سوال کے لیے آتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

أيان تقضي حاجتي أيان　　أما ترى لِنجحِها أوانا(1)

اس میں أیان وقت کے بارے سوال کے لیے ہی ہے۔

یہودی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کرتے تھے: اگر آپ نبی ہیں تو ہمیں قیامت کے بارے بتایئے وہ کب قائم ہوگی؟ اور یہ روایت بھی ہے کہ مشرکین نے فرط انکار کی وجہ سے یہ کہا: مُرْسٰىهَا سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور خبر أیان ہے۔ اور یہ ظرف مبنی علی الفتح ہے۔ یہ مبنی ہے کیونکہ اس میں استفہام کا معنی ہے۔ اور مُرْسٰىهَا میم کے ضمہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 484

ساتھ ہے، یہ اَرساھا اللہ سے ہے یعنی اللہ نے اسے ثابت کر دیا، گویا اس کا معنی ہوا متی مُثْبَتُھا یعنی اس کا وقوع کب ہوگا؟ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ رَسَتْ سے ہے۔ بمعنی ثبتت و وقفت (ثابت ہوگئی اور ٹھہر گئی) اور اسی سے وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ (سبا: 13) ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بمعنی ثابتات ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کسی کے لیے اس نے اسے بیان نہیں کیا، تا کہ بندہ ہمیشہ محتاط اور خوفزدہ رہے۔

لَا یُجَلِّیْهَا یعنی وہ اسے ظاہر نہیں کرے گا۔ لِوَقْتِهَآ بمعنی فی وقتھا ہے یعنی اپنے وقت میں اِلَّا هُوَ مگر وہی۔ التجلیۃ کا معنی ہے شے کو ظاہر کرنا۔ کہا جاتا ہے: جلالی فلان الخبر یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ خبر ظاہر کر دے اور اس کی وضاحت کر دے۔ اور ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے باسیوں پر اس کا علم مخفی ہے۔ اور ہر وہ شے جس کا علم مخفی اور پوشیدہ ہو تو وہ دل پر ثقیل اور گراں ہوتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا آنا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں پر گراں ہے۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے: اس کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین کے مکینوں پر بھاری اور عظیم ہوگا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کے عظیم اور بھاری ہونے کی وجہ سے آسمان اور زمین (اسے برداشت کرنے کی) طاقت نہیں رکھیں گے، کیونکہ آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے اور سمندر بہہ جائیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے بارے سوال کرنا ثقیل اور بھاری ہے۔ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یعنی یہ تم پر اچانک آئے گی، بَغْتَةً مصدر ہے حال کے محل میں ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا یعنی وہ آپ سے اس کے بارے کثرت سے سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کے بارے جانتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے: الحفی کا معنی ہے کسی شے کے بارے جاننے والا۔ اور الحفی کا معنی ہے: سوال میں انتہا کو پہنچنے والا۔ اعشی نے کہا ہے:

فإن تسألی عنّی فیا رب سائل　　حَفِی عن الأعشی به حیثُ أصْعَدَا

کہا جاتا ہے: أحفی فی المسألۃ وفی الطلب (یعنی اس نے سوال میں اور طلب میں انتہا کر دی) فھو محفٍ وحفی علی التکثیر وہ کثرت میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے، مثلاً مخصِب اور خصیب۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: وہ آپ سے پوچھتے ہیں گویا آپ اس کے بارے سوال سے متعلق اصرار کرنے والے ہیں۔ المعنی یسألونك کأنك حفِی بالمسألۃ عنھا، ای مُلِحٌّ یہ اس طرف جاتا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: وہ آپ سے اس کے بارے پوچھتے ہیں گویا آپ ان کے ساتھ سلوک کرنے پر مصر ہیں اور ان کے سوال سے خوش ہیں یسألونك عنھا کانك حَفِیٌ بھم أی حفی ببرھم و فرِحٌ بسؤالھم اور یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے کہا: ہمارے اور آپ کے درمیان قرابت اور رشتہ داری ہے تو آپ ہم پر قیامت کے وقت کے بارے راز ظاہر فرما دیجیے۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ دو علموں میں سے ایک قیامت کے وقوع کے بارے ہے اور

دوسرا اس کی حقیقت و ماہیت کے بارے ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے نفع کا اور نہ ضرر کا، مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف، نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا (نافرمانوں کو) اور خوش خبری سنانے والا اس قوم کو جو ایمان لائی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا یعنی میں مالک نہیں ہوں کہ میں اپنی ذات کی طرف خیر اور نفع لا سکوں اور نہ اس کا مالک ہوں کہ اپنے آپ سے شر اور ضرر دور کر سکوں، تو پھر میں قیامت کے علم کا مالک کیسے ہو سکتا ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: میں اپنے آپ کے لیے ہدایت اور ضلال کا مالک نہیں ہوں۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ یہ استثنا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور معنی یہ ہے: مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ کہ وہ مجھے اس کا مالک بنا دے اور مجھے قدرت عطا فرما دے۔ سیبویہ نے کہا ہے:

مهما شاء بالناس يفعل

وہ لوگوں کے بارے جو چاہے وہ کر دیتا ہے۔

وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ اس کا معنی ہے اگر میں اسے جان لیتا جو مجھ سے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس سے پہلے کہ وہ مجھے اس کے بارے آگاہ فرمائے تو میں یقیناً اسے کرتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اگر میں جان لیتا کب جنگ میں میرے لیے مدد و نصرت آئے گی تو میں یقیناً قتال کرتا اور میں مغلوب نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے کہا ہے: اگر میں قحط سالی کے بارے جان لیتا تو میں یقیناً خوشحالی کے زمانہ میں اس کی تیاری کرتا جو مجھے کافی ہو رہتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں اس (مال) تجارت کے بارے جان لیتا جو ختم ہو جاتا ہے تو میں یقیناً اسے اس کی کساد بازاری کے وقت خرید لیتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں جان لیتا میں کب فوت ہوں گا تو میں یقیناً اعمال صالحہ میں سے بہت جمع کر لیتا۔ یہ حسن اور ابن جریج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) غیب جان لیتا تو میں یقیناً ہر اس کے بارے جواب دیتا جس کے بارے مجھ سے سوال کیا جاتا ہے۔ یہ سب ہی مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ یہ نیا کلام ہے، یعنی مجھے کوئی جنون نہیں ہے، کیونکہ انہوں (کفار مکہ) نے آپ کو مجنون کہا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور معنی یہ ہے اگر میں غیب جان لیتا تو مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور میں محفوظ رہتا۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۵﴾ (الشعرا) (نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 485

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے پھر جب مرد ڈھانپ لیتا ہے عورت کو تو حاملہ ہو جاتی ہے ہلکے سے حمل سے پھر چلتی پھرتی رہتی ہے اس کے ساتھ، پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دعا مانگتے ہیں (میاں بیوی) الله سے جوان کا رب ہے کہ اگر تو عنایت فرمائے ہمیں تندرست لڑکا تو ہم ضرور ہو جائیں گے تیرے شکر گزار بندوں سے پس جب الله عطا کرتا ہے انہیں تندرست لڑکا دونوں بناتے ہیں، الله کے ساتھ شریک اس میں جو اس نے انہیں دیا، تو بلند و برتر ہے الله ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ جمہور مفسرین نے کہا ہے: اس میں نفس واحد (ایک نفس) سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اور بنایا اس سے جوڑا) یعنی حواء علیہا السلام سے۔ لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا تا کہ وہ اس سے انس حاصل کریں اور اطمینان پائیں اور یہ سب جنت میں ہوا۔ پھر دوسری حالت کا آغاز ہوا جو ان دونوں کے زمین پر اترنے کے بعد دنیا میں پیش آئی۔ پس فرمایا: فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا یہ جماع سے کنایہ ہے۔ حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا ہر وہ شے ہے جو پیٹ میں ہو یا درخت کے اوپر ہو تو وہ حمل کہلاتی ہے (یعنی اس میں حا مفتوح ہے) اور جب وہ (بوجھ) پیٹھ پر ہو یا سر پر تو وہ حمل کہلاتا ہے (یعنی اس میں حا مکسور ہوتی ہے) یعقوب نے حمل النخلة بالکسر بیان کیا ہے۔ اور ابوسعید سیرافی نے کہا ہے: عورت کے حمل کے بارے میں حمل اور رحمل دونوں کہے جاتے ہیں، یہ ایک بار اپنے مخفی اور پوشیدہ ہونے کی وجہ سے عورت کے حمل کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور ایک بار اپنے واضح اور ظاہر ہونے کی وجہ سے حمل الدابة (چوپائے کا بوجھ) کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور حمل مصدر بھی ہے جب کوئی کسی پر حملہ کرے تو کہا جاتا ہے: حَمل علیه، یحمِل حملاً۔ فَمَرَّتْ بِهٖ یعنی پھر وہ منی کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے، یعنی اس ہلکے سے حمل کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ وہ فرما رہا ہے: وہ کھڑی ہوتی ہے، بیٹھتی ہے اور ادھر ادھر چلتی رہتی ہے، کروٹ بدلتی رہتی ہے اور وہ اپنے حمل کے بوجھل اور بھاری ہونے تک کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ یہ معنی حسن اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فاستمر بها الحمل (پس اس کے ساتھ حمل قائم رہتا ہے) پس اس میں قلب کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدخلتُ القلنسوة فی رأسی (میں نے ٹوپی سر میں داخل کی) حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہما

نے اسے فَمَارَتْ بِہٖ الف اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مَارَ، یَمُوْرُ سے ہے جب کوئی آئے، جائے اور تصرف کرے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہ نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ المِرْیَۃ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ اس بارے میں شک میں پڑ جاتی ہے جو اسے لاحق ہوتا ہے کہ کیا یہ حمل ہے یا بیماری ہے؟ یا اسی طرح کے اور شکوک وشبہات۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أثمر النخل (درخت پھل دار ہو گیا) اور بعض نے کہا ہے: جب وہ بوجھ میں داخل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصبح وأمسی (اس نے صبح کی اور شام کی) دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّہُمَا، دَعَوَا میں ضمیر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ اس قول کی بنا پر ہے جو اس آیت کے قصص میں روایت کیا گیا ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام جب پہلی بار حاملہ ہوئیں تو آپ نہ جانتی تھیں کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ اس کی قراءت کو تقویت دیتا ہے جس نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو آپ اس سے گھبرا گئیں۔ چنانچہ ابلیس نے آپ کی طرف موقع پا لیا۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک ابلیس ایک آدمی کی صورت میں حضرت حواء علیہا السلام کے پاس آیا جب آپ پہلے حمل کے ساتھ بوجھل ہوئیں اور کہا: تمہارے پیٹ میں یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں جانتی۔ اس نے کہا: مجھے تو یہ خوف ہے کہ کہیں یہ چوپایہ ہو۔ پس آپ نے یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کو بتائی، تو وہ دونوں اس وجہ سے پریشان رہنے لگے۔ پس وہ (ابلیس) دوبارہ آپ کے پاس گیا اور کہنے لگا: وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ پس اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو تو انسان کو جنم دے گی کیا تو اس کا نام میری نسبت سے رکھے گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: پس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ پس جب آپ نے بچے کو جنم دیا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اس کا نام میرے نام پر رکھو۔ تو آپ نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: حارث۔ اگر وہ آپ کو اپنا نام بتاتا تو یقیناً آپ اسے پہچان لیتی۔ پس آپ نے بچے کا نام عبدالحارث رکھا۔ اسی طرح ضعیف حدیث سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، یہ ترمذی وغیرہ میں ہے اور اسرائیلیات میں کثیر واقعات ہیں جو ثابت نہیں۔ اور کوئی بھی صاحب دل ان کی اعتماد نہیں کرتا۔ بلاشبہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہا السلام اگرچہ اس نے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کیا ہے لیکن مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جا سکتا، پس یہ قصے بنائے گئے ہیں اور لکھ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس نے ان دونوں کو دوبار دھوکہ دیا ایک بار جنت میں دھوکہ دیا اور (ایک بار) زمین میں دھوکہ دیا'' (1)۔ اور اس کی تائید سلمی کی قراءت أتشہا کون تا کے ساتھ سے کی گئی ہے۔ اور صَالِحًا کا معنی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست بچہ چاہتا ہے۔ فَلَمَّآ اٰتٰىہُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَكَآءَ فِیْمَآ اٰتٰىہُمَا وہ شرک جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی طرف منسوب ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 3۔ مفسرین نے کہا ہے: یہ تسمیہ اور صفت میں شرک تھا، نہ کہ عبادت اور ربوبیت میں۔ اہل معانی نے کہا: بلاشبہ دونوں نے یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ حارث ان دونوں کا رب ہے اس وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 204

عبدالحارث رکھا ہے، بلکہ یہ قصد کیا کہ حارث بیٹے کی نجات کا سبب ہے اس لیے اس کا نام اس کے نام کے ساتھ رکھا جیسا کہ کوئی آدمی انتہائی عاجزی اور خضوع کی بنا پر اپنے آپ کو عبد ضیفہ پکارنے لگے، نہ کہ اس بنا پر کہ ضیف (مہمان) اس کا رب ہے، جیسا کہ حاتم نے بھی کہا ہے:

وإنّي لَعبدُ الضيف مادام ثاوِيًا وما فيَّ إلّا تيلكَ من شِيمة العبدِ

اور ایک قوم نے کہا ہے: بے شک یہ آدمیوں کی جنس کی طرف راجع ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مشرکین کے حال کی وضاحت اور بیان ہے اور یہ وہ (معنی) ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پس قول باری تعالیٰ: **جَعَلَا لَهٗ** میں مراد مذکر اور مونث کفار ہیں اور اس سے دونوں جنسیں مراد لی گئی ہیں۔ اور اس پر دلیل **فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** ہے۔ اس میں یشرکان نہیں کہا ہے۔ یہ قول حسن ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے **هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ** وہ ہے جس نے تمہیں ایک شکل سے پیدا کیا ہے۔ **وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا** اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ **فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا** یعنی دونوں جنسوں نے (جب ایک دوسرے کو ڈھانپ لیا) اس قول کے مطابق آیت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کا ذکر نہیں ہوگا۔ پس جب الله تعالیٰ انہیں صحیح سالم صحت مند لڑکا عطا فرما دیتا ہے جیسے وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں تو پھر وہ دونوں اسے فطرت سے شرک کی طرف پھیر دیتے ہیں، یہ مشرکین کا فعل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی نومولود بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے ''وہ اس ملت پر پیدا کیا جاتا ہے، (پھر) اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں''۔

عکرمہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام اس کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بلکہ الله تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد تمام مخلوق کے لیے عام قرار دیا ہے۔ حسین بن فضل نے کہا ہے: اہل فکر ونظر کے نزدیک یہ زیادہ عجیب ہے، کیونکہ پہلے قول میں عظائم کو الله تعالیٰ کے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اہل مدینہ اور حضرت عاصم نے توحید اور مفرد کی بنا پر شرکًا پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو اور تمام اہل کوفہ نے صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ فعلاء کے وزن پر ہے اور شریک کی جمع ہے۔ اخفش سعید نے پہلی قراءت کا انکار کیا ہے۔ اور یہ قراءت صحیح ہے اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی جعلا له ذا شرك جیسا کہ **وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ** (یوسف: 82) میں ہے پس معنی اس طرف راجع ہوگا کہ انہوں نے اس کے شریک بنا لیے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت اس پر دلیل ہے کہ حمل امراض میں سے ایک مرض ہے۔ ابن القاسم اور یحییٰ نے مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حمل کی ابتدا آسانی اور سرور ہے (1) اور اس کا آخر بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے۔ یہ وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: إنه مرض من الأمراض قول باری تعالیٰ: **دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا** کا ظاہر اس کی تائید کرتا ہے اور یہ وہ حالت ہے جس کا مشاہدہ حاملہ عورتوں میں کیا جاتا ہے۔ امر کے عظیم ہونے اور خطاب کے شدید ہونے کی وجہ سے ہی اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 820

کی موت کو شہادت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے (1)۔ اور جب یہ ظاہر آیت سے ثابت ہے، تو پھر حاملہ کی حالت افعال میں مریض کی حالت کی مثل ہے۔ علماء امصار کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مریض کا فعل کسی کو ہبہ اور عطیہ دینے کے بارے اپنے (مال کے) ثلث (تہائی حصہ) میں جاری ہوتا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حاملہ میں آزاد آدمی کی حالت کی مثل جاری ہوگا اور رہا اس سے قبل تو وہ اس طرح نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حمل ایک عادت ہے اور اس میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا ہے: اس طرح اکثر بیماریوں میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے اور کبھی وہ مرجاتا ہے جو مریض نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس دن سے عورت حاملہ ہوئی اس دن سے جب اس کے چھ مہینے گزر جائیں تو پھر اس کا اپنے مال میں سوائے ثلث کے کوئی فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اور جس نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی درآنحالیکہ وہ حاملہ تھی تو جب اس پر چھ ماہ گزر گئے تو اس نے اس کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے یہ صحیح نہیں، کیونکہ وہ عورت مریضہ ہے اور مریضہ کا نکاح صحیح نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ یحییٰ نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے آدمی کے بارے میں جو قتال میں حاضر ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب وہ جنگ کے لیے صف میں موجود ہو تو پھر اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصہ کے سوا میں کسی شے کا فیصلہ کرے، بلاشبہ وہ حاملہ عورت اور ایسے مریض کے قائم مقام ہے جس پر اس کی حالت کے سبب (موت کا) خوف غالب ہوتا ہے۔ اور اسی حکم میں وہ بھی شامل ہے جسے قصاصاً قتل کرنے کے لیے قید کیا گیا ہو۔ اس بارے میں امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (2) نے کہا ہے: جب تو بنظر غائر دیکھے تو تجھے اس بارے میں کوئی شک نہ ہوگا کہ قتل کے لیے محبوس آدمی کی حالت مریض کی نسبت زیادہ شدید اور پریشان کن ہوتی ہے اور اس کا انکار نظر و فکر میں غفلت کی علامت ہے، کیونکہ دونوں کے نزدیک موت کا سبب موجود ہے۔ جیسا کہ مرض موت کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝ (آل عمران) (اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو)

اور رو شد طائی نے کہا ہے:

یاأیها الراکبُ المُزجِی مَطِیَّتَه سائِلْ بنی أسَدٍ ماهذه الصَّوتُ

وقل لهم بادروا بالعُذر والتمسوا قولا یُبَرِّئکم إنّی أنا المَوتُ

اور جو اس پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی فضل من مات فی الطاعون، حدیث نمبر 2704۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب:10) (جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے)

پس امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کیسے کہتے ہیں کہ شدید ترین حالت بلاشبہ یہ مبارزت (اور مقابلہ) کی حالت ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابل ہونے اور دونوں فریقوں کے ایک دوسرے کے ساتھ قریب ہونے کی اس عظیم حالت کے ساتھ خبر دی ہے جس میں دل نرخروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور (یہ) اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوء ظن رکھنے اور دلوں کے متزلزل اور ان کے اضطراب میں سے ہے، کیا یہ حالت تو مریض پر دیکھتا ہے یا نہیں؟ یہ وہ حالت ہے جس میں کوئی انصاف کرنے والا شک نہیں کر سکتا۔ اور یہ اس کے لیے جو اپنے اعتقاد میں ثابت اور پختہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس طرح جہاد کرے جیسے جہاد کا حق ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آیات و معجزات کی شہادت دے، پس یہ ہمارے بارے میں کیسے ہو سکتی ہے؟

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے علماء نے سمندر میں سفر کرنے والے کے بارے میں خوف کے وقت حکم میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اس کا حکم صحیح اور تندرست آدمی کے حکم میں ہوگا یا کہ حاملہ کے حکم میں؟ تو ابن القاسم نے کہا ہے: اس کا حکم صحت مند آدمی کے حکم کی طرح ہے۔ ابن وہب اور اشہب نے کہا ہے: اس کا حکم اس حاملہ کے حکم کی طرح ہے جس کے حمل کی مدت چھ ماہ ہو جائے۔ قاضی ابو محمد نے کہا ہے: ان دونوں کا قول زیادہ عمدہ اور اچھا ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس پر خوف کی حالت میں ہے جیسا کہ بوجھ اٹھانے والے (حالت خوف میں ہوتے ہیں)۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: ابن القاسم نے سمندر کا سفر نہیں کیا اور نہ اس نے عود پر کوئی کپڑا دیکھا۔ اور جو چاہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یقین کر لے کہ وہ اکیلا فاعل ہے اس کے ساتھ کوئی اور فاعل نہیں اور یہ اسباب کمزور ہیں یقین رکھنے والے کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور توکل اور تفویض کرنا ثابت ہوتا ہے پس چاہیے کہ وہ سمندر کا سفر کرے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

''کیا وہ شریک بناتے ہیں اسے جس نے پیدا نہیں کی کوئی چیز اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ نہیں طاقت رکھتے ان کو مدد پہنچانے کی اور نہ اپنی آپ مدد کر سکتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا یعنی کیا وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو کسی شے کو تخلیق کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ یعنی بت (خود) پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فرمایا يُخْلَقُوْنَ یہ واو اور نون کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بت نقصان اور نفع پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا انہیں الناس (لوگوں) کے قائم مقام قرار دیا گیا (اس لیے جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

ہیں) اور یہ ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ (النمل: 18) (اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں) وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ یعنی بلاشبہ بت نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ غالب آ سکتے ہیں۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

''اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ اخفش نے کہا ہے: اگر تم بتوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہ کریں گے۔ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: کیونکہ یہ راس الآیۃ ہے، مراد یہ ہے کہ فرمایا: اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا: أم صمتم اور صامتون اور صمتم سیبویہ کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ہیں جن کے بارے پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لَا يَتَّبِعُوْكُمْ کو مشدد اور مخفف دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور بعض اہل لغت نے کہا ہے: أتبعه جب مخفف ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے نہ پا سکے۔ اور اِتّبعه جب مشدد ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے پالے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

''(اے کفار) بے شک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، بندے ہیں تمہاری طرح تو پکارو انہیں پس چاہیے کہ قبول کریں تمہاری پکار کو اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں چلتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کے ہاتھ ہیں پکڑتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کی آنکھیں ہیں دیکھتے ہیں جن سے یا کیا ان کے کان ہیں وہ سنتے ہیں جن کے ساتھ، آپ کہیے: پکارو اپنے شریکوں کو پھر سازش کرو میرے خلاف اور مت مہلت دو مجھے۔ یقیناً میرا حمایتی اللہ ہے جس نے اتاری یہ کتاب اور وہ حمایت کیا کرتا ہے نیک بندوں کی''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اللہ تعالیٰ نے) بتوں کی پوجا کے بارے میں ان سے جھگڑا کیا ہے۔ تَدْعُوْنَ یہ تعبدون کے معنی میں ہے یعنی جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم انہیں (بتوں کو) الٰہ پکارتے ہو۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی من غیر اللہ، اللہ کے سوا کو۔ اور بتوں کو عباد کہا گیا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور

مسخر ہیں۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ بت تمہاری طرح مخلوق ہیں۔ جب مشرکین نے یہ اعتقاد بنالیا کہ بت نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کے قائم مقام قرار دیا اور فرمایا: فَادْعُوْهُمْ اور یہاں فادعوهن نہیں کہا (یعنی ان کے لیے مونث ضمیر ذکر کرنے کی بجائے جمع مذکر ضمیر ذکر کی جو ذوی العقول کے لیے ذکر کی جاتی ہے)

اور ان کے لیے فرمایا: عِبَادٌ (وہ بندے ہیں تمہاری طرح) اور مزید کہا: اِنَّ الَّذِیْنَ اس کی جگہ ان التی ذکر نہیں کیا۔ اور فَادْعُوْهُمْ کا معنی یہ ہے پس تم ان سے نفع اور نقصان کا مطالبہ کرو۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہاری پکار کو) اور یہ کہ بتوں کی پرستش نفع پہنچائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: فَادْعُوْهُمْ کا معنی ہے فاعبدوهم (پس تم ان کی پرستش کرو) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زجر و توبیخ کی اور ان کی عقلوں کی سفاہت اور حماقت کو بیان فرمایا اور فرمایا: اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا، الآیہ یعنی تم ان سے افضل ہو تو پھر تم ان کی پرستش کیونکر کرتے ہو۔ مقصود ان کی جہالت کا بیان ہے۔ کیونکہ معبود جوارح سے متصف ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ پڑھا ہے یعنی ان کو التقائے ساکنین کی وجہ سے تخفیف اور کسرہ کے ساتھ اور عِبَادٌ کو نصب اور تنوین کے ساتھ اور امثالکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے ما الذین تدعون ...... الخ۔ وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے نہیں ہیں، یعنی وہ تو پتھر اور لکڑی ہے پس تم جن کی پوجا کرتے ہو تم خود ان سے اشرف اور اعلیٰ ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے لیے مناسب نہیں کہ اسے اس طرح پڑھا جائے اس کی تین وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ سواد اور جمہور کی قراءت کے خلاف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیبویہ ان کی خبر پر رفع مختار سمجھتے ہیں جب وہ ما کے معنی میں ہو، پس وہ کہتے ہیں: إن زید منطلق کیونکہ ما کا عمل ضعیف ہے اور ان اس کے معنی میں ہونے کے سبب اس سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ کسائی نے گمان کیا ہے عرب کلام میں ان بمعنی ما آتا ہی نہیں مگر یہ کہ اس کے بعد ایجاب ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ۝ (الملک)

فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اس میں اصل تو یہ ہے کہ لام مکسور ہو، پھر ثقیل ہونے کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا گیا۔ پھر کہا گیا ہے: کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: فادعوهم إلى أن يتبعوكم فليستجيبوا لكم إن كنتم صادقين أنهم ألهة پس تم انہیں پکارو یہاں تک کہ وہ تمہاری اتباع کریں اور چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کو قبول کریں اگر تم سچے ہے کہ وہ معبود ہیں۔ ابو جعفر اور شیبہ نے أم لهم أيد يبطشون بها طا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ الفاظ الید، الرجل اور الأذن سب مونث ہیں ہا کے ساتھ ان کی تصغیر لائی جاتی ہے۔ اور الید میں تصغیر کے وقت یاء کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اسے اپنے اصل کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: يُدَية یعنی دو یا جمع ہونے کی وجہ سے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ اس میں شرکاء سے مراد بت ہیں۔ ثُمَّ كِیْدُوْنِ پھر تم اور وہ میرے خلاف سازش کرو۔ فَلَا تُنْظِرُوْنِ اور تم مجھے مہلت نہ دو۔ اصل میں کیدونی تھا اس سے یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کر

رہا ہے۔ اور اسی طرح فَلَا تُنْظِرُوْنِ کا معنی ہے۔ اور کید کا معنی مکر کرنا ہے۔ اور کید کا معنی جنگ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: غزا فلم یلق کیدا اس میں کید جنگ کے معنی میں ہے۔ اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یعنی وہ جو میری مدد اور حفاظت کا والی ہے وہ اللہ ہے۔ اور ولی الشئی کا معنی ہے: وہ جو اس شے کی حفاظت کرتا ہے اور اور اس سے ضرر اور نقصان کو روکتا ہے۔ اور الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ اور وہی نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ألا إن آل أبي يعني فلانا ...... ليسوا لي بأولياء إنما ولي الله و صالح المومنين (خبردار غور سے سنو! بے شک آل فلاں میرے اولیاء (محافظ) نہیں ہیں بلکہ میرا محافظ اور مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں)

اخفش نے کہا ہے: اسے إنّ ولیّ اللهِ الذی نزّل الکتاب بھی پڑھا گیا ہے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ عاصم جحدری کی قراءت ہے۔ اور پہلی قراءت زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ (اور وہ نیک بندوں کی حمایت کیا کرتا ہے)

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝

''اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا وہ طاقت نہیں رکھتے تمہاری امداد کے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو وہ نہ سنیں گے اور تو دیکھے گا انہیں کہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اسے مکرر ذکر فرمایا تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ جن کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى یہ شرط ہے اور جواب شرط لَا یَسْمَعُوْا ہے۔ وَتَرٰىهُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ یہ حال کے محل میں واقع ہے مراد بت ہیں۔ اور نظر کا معنی ہے اس کی طرف دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھنا جس کی طرف دیکھا جا رہا ہے، یعنی تو انہیں دیکھے گا جیسے وہ تیری طرف آنکھیں کھولے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں خبر واؤ (مراد جمع مذکر کا صیغہ ہے) کے ساتھ دی حالانکہ وہ جماد ہیں جو نہیں دیکھ سکتے، اس لیے کہ یہ خبر اس کے فعل کے قائم مقام ہے جو عقل رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی آنکھیں جواہر سے بنی ہوئی تھیں پس اس لیے فرمایا: وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں، ان کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ وہ نہیں دیکھ رہے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں سے نفع حاصل نہیں کر رہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ۝

''قبول کیجئے معذرت (خطا کاروں سے) اور حکم دیجئے نیک کاموں کا اور رخ (انور) پھیر لیجئے نادانوں کی طرف سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ آیت تین کلمات پر مشتمل ہے، جو مامورات اور منہیات میں قواعد شریعت کو متضمن ہیں۔ پس قول باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ میں قطع تعلقی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، گنہگاروں سے معذرت قبول کر کے انہیں معاف کرنا، مومنین کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور علاوہ ازیں اطاعت شعاروں کے اخلاق داخل ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، حلال وحرام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، آنکھوں کو نیچا رکھنا اور دار آخرت کے لیے تیاری کرنا داخل ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ میں علم کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر ابھارنا، ظلم کرنے والوں سے اعراض کرنا، احمقانہ جھگڑوں سے پرہیز کرنا، کندذہن جہلاء کی مساوات سے بچنا اور دیگر اخلاق حمیدہ اور افعال رشیدہ داخل ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خصال شرح وبسط کی محتاج ہیں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر بن سلیم کے لیے ان تمام کو جمع کیا۔ حضرت جابر بن سلیم ابو جری (1) نے بیان کیا ہے: میں اپنی سواری پر سوار ہوا پھر مکہ مکرمہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا، میں نے اپنی سواری مسجد کے دروازے پر بٹھائی۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میری رہنمائی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے آپ اپنے اوپر سرخ دھاری دار اونی چادر لیے ہوئے تھے، میں نے عرض کی: السلام علیک یارسول اللہ، تو آپ نے فرمایا: ''وعلیک السلام''۔ پھر میں نے عرض کی: بے شک ہم (دیہاتی) جنگل میں رہنے والے لوگ ہیں، ایسی قوم ہیں کہ ہم میں جفا اور زیادتی وافر ہے، سو آپ مجھے ایسے کلمات سکھا دیں جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے۔ آپ نے فرمایا: ''قریب آ''، آپ نے یہ تین بار فرمایا، چنانچہ میں قریب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف توجہ کر'' میں آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور کسی نیکی کو بھی حقیر نہ جان (اگرچہ) وہ تیرا اپنے بھائی کو متبسم چہرے کے ساتھ ملنا ہی ہو اور یہ کہ تو پانی طلب کرنے والے کے برتن میں اپنا ڈول مکمل طور پر انڈیل دے اگر کوئی آدمی تجھے ایسے سبب سے گالیاں دیتا ہے جسے وہ تجھ میں نہیں جانتا تو تو اسے اس وجہ سے گالیاں نہ دے جسے تو اس میں جانتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے تیرے لیے اجر بنا دے گا اور اس پر اسے بوجھ بنا دے گا اور تو ان (چیزوں) میں سے کسی شے کو بھی برا بھلا نہ کہہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہیں''۔ ابو جری نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں نے اس کے بعد کسی بکری اور کسی اونٹ کو بھی گالیاں نہیں دیں۔ اس کو اس معنی کے ساتھ ابو بکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ (2)

ابو سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تم لوگوں کو اپنے مالوں کے ساتھ وسعت نہیں دے سکتے البتہ تمہاری طرف سے چہرے کی کشادگی اور حسن اخلاق انہیں وسعت عطا کر سکتا ہے''۔ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823　　2۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے میں نازل فرمائی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما (1) کی حدیث سے قول باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ کے بارے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے نازل فرمائی ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ (2) سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''اے جبریل یہ کیا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں عالم (جاننے والے) سے پوچھ لوں۔ ایک روایت میں ہے: ''میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں اپنے رب سے پوچھ لوں''۔ چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی ہی دیر گزری کہ وہ واپس لوٹ آئے اور بتایا: بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرما رہا ہے کہ آپ اسے معاف فرما دیں جو کوئی آپ سے ظلم و زیادتی کرے اور اسے عطا فرمائیں جو آپ کو محروم رکھے اور اس سے صلہ رحمی کریں جو آپ سے قطع تعلقی کرے''۔

کسی شاعر نے اسے نظم کیا ہے اور اس نے کہا ہے:

مكارم الأخلاق فی ثلاثة من كَمُلَتْ فيه فذالك الفتَی

اعطاءُ مَنْ تحرِمه ووَصلُ مَن تَقْطَعُه والعفوُ عَمّن إعتدَی

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارم اخلاق کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے، قرآن کریم میں اس آیت سے زیادہ مکارم اخلاق کی جامع کوئی آیت نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں''۔ شاعر نے کہا ہے:

كلُّ الأمور تزول عنك و تنقضی إلّا الثناء فإنه لك باقی

ولو أنّنی خُيِّرتُ كلّ فضيلة ما أخترت غير مكارم الأخلاق

اور سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی۔ آپ سے کہا گیا: کون سی شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا: نو چیزوں کے بارے، سراً اور جہراً اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، حالت رضا اور غضب میں کلمہ حق کہنا، حالت فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلق کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور اس سے درگزر کروں جو مجھ پر زیادتی کرے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میرا دیکھنا عبرت ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم ارشاد فرمایا ہے سراً اور علانیۃً، اخلاص اختیار کرنا، حالت رضا اور غضب میں عدل کرنا، غنی اور فقر کی حالت میں میانہ روی اپنانا اور یہ کہ میں اس سے درگزر کروں جو مجھ پر ظلم و زیادتی کرے اور اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلقی کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میری نظر عبرت ہو''۔

1۔ صحیح بخاری، سورۂ اعراف، جلد 2، صفحہ 669 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ سے مراد زکوٰۃ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کثیر مال میں سے تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اور یہ معنی مراد لینے میں انتہائی بعد ہے، کیونکہ یہ عفا سے ہے جب وہ مٹ جائے (یعنی نام ونشان ختم ہو جائے) تحقیق کہا جاتا ہے: خذ العفو منه، یعنی تو اس پر تنقیص نہ کر اور اس سے درگزر کر لے۔ اور سبب نزول اس کی تردید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین پر حجت قائم کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے تو اس نے مکارم اخلاق پر آپ کی رہنمائی فرمائی ہے، کیونکہ یہی مشرکین کو ایمان کی طرف کھینچ لانے کا سبب ہے، یعنی لوگوں کے اخلاق میں سے جو مٹ چکے ہیں آپ ان کے ساتھ ان سے پیش آئیں اور انہیں آسان بنا دیں۔ تو کہتا ہے: أخذت حقي عفواً صفواً، أي سهلاً یعنی میں نے اپنا حق آسانی سے لے لیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ یہ عرف بمعنی معروف ہے یعنی آپ نیکی کا حکم دیجیے۔ عیسیٰ بن عمر نے العرف دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے، جیسے حلم ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ العرف، المعروف اور العارفة سے مراد ہر وہ اچھی خصلت ہے جسے عقول پسند کرتی ہیں اور اس کے ساتھ دل اطمینان پاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

من يفعل الخير لا يَعْدَم جَوازِيَه		لا يذهب العُرْف بين الله والنّاس

اور حضرت عطا نے کہا ہے: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یعنی جب آپ ان پر حجت قائم کر دیں اور انہیں نیکی کا حکم دیں پھر وہ آپ پر جہالت اور نادانی کا اظہار کریں تو آپ ان سے اعراض فرما لیں، ان کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے اور ان کے جواب سے اپنے درجہ اور مقام کو بلند رکھتے ہوئے۔ یہ اگرچہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مقصود اپنی تمام مخلوق کو ادب سکھانا ہے۔

ابن زید اور عطا رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ آیت آیۃ السیف سے منسوخ ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ محکم ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر آیا اور وہ اپنے بھتیجے حر بن قیس ابن حصن کے پاس آ کر اترا اور یہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریب رکھتے تھے اور قراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجالس اور آپ کی مشاورت کے اصحاب تھے، وہ بوڑھے تھے یا جوان، تو عیینہ نے اپنے بھتیجے کو کہا: اے بھتیجے! کیا تیرا اس امیر کے پاس کوئی تعلق اور ذریعہ ہے کہ تو میرے لیے اس کے پاس داخل ہونے کی اجازت لے لے۔ اس نے جواب دیا: میں عنقریب تمہارے لیے ان سے اجازت لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے عیینہ کے لیے اجازت طلب کی۔ پس جب وہ داخل ہوا تو کہا: اے ابن خطاب! قسم بخدا! تو ہمیں زیادہ نہیں عطا کرتا اور نہ تو ہمارے درمیان عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ راوی نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے یہاں تک کہ آپ نے اسے سزا دینے کا قصد کر لیا۔ تو حر نے کہا: اے امیر المومنین! بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ بلاشبہ یہ جاہلوں میں سے ہے۔ تو قسم بخدا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اس سے تجاوز کر

لیا (اور اعراض برت لیا) جونہی انہوں نے آپ پر یہ آیت تلاوت کی اور آپ الله عزوجل کی کتاب سے خوب واقف تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے مطابق عمل کرنا اور حضرت حر کا اس سے استدلال کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور اسی طرح اسے حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے بھی استعمال کیا ہے، اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور جب جفا اور زیادتی سلطان کے خلاف عمداً اور اس کے حق کو حقیر جانتے ہوئے ہو تو اس کے لیے اس پر تعزیر ہے۔ اور جب اس کے سوا ہو تو پھر اعراض، درگزر اور عفو ہے، جیسا کہ خلیفہ عادل نے کیا۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۰۰

''اور اگر پہنچے آپ کو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ تو فوراً پناہ مانگیے الله سے، بے شک وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب ارشاد باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ نازل ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا: اے میرے رب! کیسے غصہ سے بچ سکتا ہوں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ اور نزغ الشیطان سے مراد اس کے وساوس ہیں۔ اس میں دو لغتیں ہیں: نزغ اور نغز۔ کہا جاتا ہے: ایاك و النزاغ و النغاز وساوس سے بچ، درآنحالیکہ وہ (فساد پر) بھڑکانے اور ابھارنے والے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: النزغ سے مراد تھوڑی سی حرکت ہوتی ہے اور شیطان کی طرف سے ادنی سا وسوسہ ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر تھا اور ان کے درمیان شیطان کی جانب سے وسوسہ پیدا ہو گیا تو ان میں سے کسی ایک نے اپنے ساتھی کے لیے کوئی شے باقی نہ رکھی، پھر وہ دونوں آپس میں جدا نہیں ہوئے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی کے لیے استغفار کیا اور مغفرت طلب کی۔ اور یَنْزَغَنَّكَ کا معنی ہے: غصے کے وقت تجھے ایسا وسوسہ پہنچے اور عارض آئے کہ اس کے سبب وہ غصہ نہ اترے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اس بارے تو الله تعالیٰ سے پناہ طلب کر۔ پس الله تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس سے التجا کرنے اور اس کی پناہ طلب کرنے کے سبب وہ وسوسہ کو دور کرے اور الله تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے۔ پس کتوں سے پناہ طلب نہیں کی جائے گی مگر کتوں کے رب کی پناہ طلب کی جائے گی۔ اسلاف میں سے کسی سے یہ حکایت منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد کو کہا: تو شیطان کے بارے کیا کرے گا جب وہ تیرے لیے گناہوں کو مزین اور آراستہ کرے؟ تو اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پھر پوچھا: پھر اگر وہ لوٹ آئے؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پوچھا: اگر وہ پھر آ گیا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے کہا: یہ تو طویل ہو جائے گا، تیرا کیا خیال ہے اگر تو تیرا گزر کسی ریوڑ کے پاس سے ہو اور اس کا کتا تجھے بھونکنے لگے اور تجھے آگے بڑھنے سے روک دے تو تو کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کی تکلیف کو برداشت کروں گا اور اپنی ہمت کے ساتھ اسے واپس لوٹا دوں گا۔ اس نے کہا: یہ تو معاملہ تجھ پر طویل ہو جائے گا، البتہ تو ریوڑ کے مالک سے مدد طلب کر تو وہ اسے تجھ سے روک لے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ النغز والنزغ والهمز والوسوسة یہ تمام الفاظ معنی میں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ (المومنون) (اور کہیے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے) اور مزید فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ (الناس) (بار بار وسوسہ ڈالنے والے، بار بار پسپا ہونے والے کے شر سے) نزغ کا اصل معنی فساد برپا کرنا ہے، کہا جاتا ہے: نزغ بيننا یعنی اس نے ہمارے درمیان فساد برپا کر دیا۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ (یوسف:100) یعنی میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان شیطان نے فساد برپا کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا النزغ کا معنی الاغواء (گمراہ کرنا) اور الاغراء (بھڑکانا، ابھارنا) ہے اور یہ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے(1) اور اسے کہتا ہے فلاں فلاں شے کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ اسے یہ کہہ دیتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جب وہ اس تک پہنچ جائے تو اسے (آدمی کو) چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے اور اس (میں فکر کرنے) سے رک جائے (باز آجائے)''۔ اور اس بارے میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ محض ایمان ہے''۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''وہ صریح ایمان ہے''۔

اور صریح سے مراد خالص ہے (یعنی وہ خالص ایمان ہے) اور یہ اپنے ظاہر (معنی) پر نہیں، کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ وسوسہ بذات خود ایمان ہو، کیونکہ ایمان تو یقین ہے، بلاشبہ یہ اشارہ اس خوف الٰہی کی طرف ہے جو انہوں نے اپنے دلوں میں پایا کہ انہیں اس پر سزا دی جائے گی جو ان کے دلوں میں واقع ہوا ہے۔ تو گویا آپ نے یہ فرمایا: تمہارا اس (وسوسہ) سے ڈرنا محض ایمان اور خالص ایمان ہے، کیونکہ تمہارا ایمان صحیح ہے اور تمہیں وسوسہ کے فساد کے بارے علم ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کو ایمان کا نام دیا، کیونکہ اس کا دفاع، اس سے اعراض کرنا، اس کو رد کرنا، اسے قبول نہ کرنا اور اس سے ڈرنا ایمان کے سبب ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اور رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پناہ طلب کرنے کا حکم فرمایا ہے تو یہ اس لیے کہ وہ وساوس شیطان کے آثار اور علامات میں سے ہوتے ہیں۔ اور رہی اس معاملہ کی انتہا تو وہ ان کی طرف مائل ہونا اور ان کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جو صحیح الایمان ہوا اور اس نے اس کے مطابق عمل کیا جس کے بارے اسے اس کے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسے نفع دیا اور اس نے اس سے نفع حاصل کیا۔ اور رہا وہ جسے شبہ لاحق ہو گیا اور اس پر احساس غالب آ گیا اور وہ اس سے علیحدگی پر قادر نہ ہو سکا تو پھر اس کی تشفی کے لیے دلیل عقلی کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو فرمایا جسے اجرب اونٹ کے بارے شبہ لاحق ہو گیا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عدوی (متعدی مرض نہیں ہے) اور اعرابی نے کہا: اونٹوں کو کیا ہوا جو صحرا میں ہوتے ہیں تو ہرن کی مثل ہوتے ہیں پس جب ان میں اجرب اونٹ داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79

ہوا تو اس نے انہیں اجرب کر دیا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن أعدی ألاول تو پہلے کو بیماری کس نے لگائی؟ تو آپ کے اس ارشاد نے شبہ کو جڑ سے نکال دیا۔ پس جب شیطان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں انہیں اکسانے اور گمراہ کرنے سے مایوس ہو گیا، تو وہ وقتاً فوقتاً ان وساوس کے ذریعے ان میں تشویش پیدا کرنے لگ گیا۔ وساوس سے مراد باطل احساسات ہیں۔ پس ان کے دل ان سے نفرت کرنے لگے اور ان کے نزدیک ان کا وقوع ان پر بڑھ گیا پس وہ حاضر خدمت ہوئے، جیسا کہ صحیح میں ہے۔ اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ہم اپنے نفسوں میں وہ پاتے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی اسے اس سے بڑا سمجھ رہا ہے کہ وہ اس کے بارے کلام کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پاتے ہو''؟ عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك صریح الأیمان رغماً للشیطان حسب ما نطق به القرآن فی قوله: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (حجر: 42) (وہ صریح (خالص) ایمان ہے شیطان کے لیے ذلت اور خاک ہے جیسا کہ اس کے بارے قرآن نے فرمایا: بے شک میرے بندے ان پر تجھے کوئی غلبہ نہیں ہوگا) پس دل میں اٹھنے والے ایسے خیالات جو پختہ نہ ہوں اور نہ وہ کسی شبہ کے سبب پیدا ہوئے ہوں تو یہ وہ ہیں جن سے اعراض کر لینے کے سبب انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔ اور انہی کی مثل پر اسم وسوسہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ معنی سورۃ البقرہ کے آخر میں گزر چکا ہے، والحمدللہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

''بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کیے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں شیطان کھینچ لے جاتے ہیں انہیں گمراہی میں پھر (انہیں گمراہ کرنے میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (1) مراد شرک اور گناہ ہیں (یعنی وہ لوگ جو شرک اور گناہوں کے ارتکاب سے مجتنب رہے ہیں) اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ یہ اہل بصرہ اور اہل مکہ کی قراءت ہے۔ اور اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی قراءت طائف ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے طیف یاء کی تشدید کے ساتھ مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی مثل میں کلام عرب طیف تخفیف کے ساتھ ہے، اس بنا پر کہ یہ طاف یطیف کا مصدر ہے۔ کسائی نے کہا ہے: یہ طیف سے مخفف ہے جیسا کہ میتا اور میت ہے۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں طیف کا معنی وہ وہم اور خیال ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے یا نیند کی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح طائف کا معنی بھی ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی سے طیف کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: مصادر میں فیعل کا وزن نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مصدر نہیں ہے، لیکن طائف کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ لوگ جو گناہوں سے بچتے رہے جب انہیں کوئی شے لاحق ہو تو وہ اللہ عزوجل کی قدرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 492

اور اپنے اوپر اس کے انعامات میں غور وفکر کرتے ہیں اور معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الطیف اور الطائف دونوں مختلف المعنی ہیں۔ پس پہلے کا معنی تخیل (خیال کا آنا) ہے اور دوسرے کا معنی نفس شیطان ہے۔ پس پہلا طاف الخیال یطوف طیفا کا مصدر ہے۔ اور انہوں نے اس سے اسم فاعل کا صیغہ طائف نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: کیونکہ یہ ایک تخیل ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

رہا قول باری تعالیٰ: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (القلم: 19) تو اس میں طیف نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ حقیقۃً اسم فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: طفتُ علیھم اطوف اور طاف الخیال یَطِیفُ (یعنی پہلا باب نَصَرَ یَنْصُرُ بمعنی چکر لگانا اور دوسرا باب ضَرَبَ یَضْرِبُ بمعنی خیال آنا ہے)۔ اور حسان نے کہا ہے:

فَدَعْ هذا ولكن مَن لِطَيْفٍ يُؤَرِّقُنِي إذا ذهب العِشَاء

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الطیف بمعنی غضب (غصہ) ہے اور جنون، غضب اور وسوسہ کو طیف کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ دل میں پیدا ہونے والا خطرہ اور کھٹکا ہے جسے خیال کے خطرہ کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ یعنی وہ اس سے رک جاتے ہیں، باز رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس انہیں بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے تذکروا ذال کو مشدد پڑھا ہے۔ لغت عربیہ میں اس کی کوئی وجہ (دلیل) نہیں۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عصام بن مصطلق نے بیان کیا ہے: میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو دیکھا، تو ان کی شہرت اور ان کے چہرے کے حسن و جمال نے مجھے بہت متعجب کیا۔ نتیجۃً مجھ میں اس حسد کی آگ بھڑکنے لگی جسے ان کے باپ کے ساتھ بغض کے سبب میرا سینہ چھپائے ہوئے تھا۔ سو میں نے کہا: آپ ابن ابی طالب ہیں انہوں نے فرمایا: ہاں۔ چنانچہ میں نے انہیں اور ان کے باپ کو مبالغہ کی حد تک برا بھلا کہا۔ تو انہوں نے میری طرف انتہائی شفقت و مہربانی کی نظر سے دیکھا، پھر فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اور آپ نے اسے فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ تک پڑھا۔ پھر مجھے ارشاد فرمایا: نرمی اور ملائمت کا اظہار کر، اللہ تعالیٰ سے میرے لیے اور اپنے لیے استغفار کر، بلاشبہ اگر تو ہم سے مدد طلب کرے گا تو ہم تیری معاونت کریں گے اور اگر تو ہم سے عطیہ طلب کرے گا تو ہم تجھے عطیات سے نوازیں گے اور اگر تو ہم سے رہنمائی مانگے گا تو ہم تیری رہنمائی فرمائیں گے۔ پس جو مجھ سے زیادتی اور کوتاہی ہوئی اس پر مجھ میں ندامت اور شرمندگی ظاہر ہو گئی تو آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (یوسف) (آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرما دے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے) کیا تو اہل شام میں سے ہے؟ میں نے کہا: ہاں تو آپ نے فرمایا:

شِنْشِنَةٌ أعرفها من أَخْزَم

(اس عادت اور خراج کو تو میں اخزم سے جانتا ہوں)

اللہ تجھے سلامت رکھے اور تجھے سہارا عطا فرمائے، تجھے معاف فرمائے اور تیری مدد فرمائے۔ تو اپنی حاجات اور پیش آنے والی عوارض ہمیں پیش کر تو تو ہمیں اپنے گمان سے کہیں بڑھ کر پائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ عصام نے کہا: پس زمین اپنی وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی اور میں نے یہ چاہا کہ یہ (زمین) میرے لیے نرم ہو جائے، پھر میں ان سے چھپتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا، اس حال میں کہ سطح زمین پر ان سے اور ان کے باپ سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی محبوب نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے شیاطین کے بھائی اور وہ گمراہ انسانوں میں سے فاجر لوگ ہیں شیاطین انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں۔ اور فاجروں کو اخوان الشیاطین کہا گیا ہے، کیونکہ وہ ان کے وساوس کو قبول کرتے ہیں۔ تحقیق اس آیت میں شیطان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ جو کچھ اس کی وضاحت میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ، حضرت حسن اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور لَا يُقْصِرُوْنَ کا معنی ہے یعنی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ رجوع کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ تمہارے لیے مدد و نصرت کی استطاعت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں اور ان کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں، کیونکہ کفار شیاطین کے بھائی ہیں۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: بے شک مومن جب اسے شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اور خیال چھوتا ہے تو وہ قرب کے بارے آگاہ ہو جاتا ہے (اور وہ خدا کو یاد کرنے لگ جاتا ہے) اور رہے مشرک تو شیطان انہیں کھینچ لاتا ہے۔

اور لَا يُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: دونوں قولوں کی بنا پر اس کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا شیطان کی طرف لوٹنا بھی جائز ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر وہ نہ ان سے باز آتے ہیں اور نہ ان پر رحم کرتے ہیں۔ الاقصار کا معنی ہے: کسی شے سے رک جانا، باز آجانا، یعنی شیاطین کفار کو گمراہی کی طرف کھینچنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ (اور اس سے باز نہیں آتے)

اور قول باری تعالیٰ: فِي الْغَيِّ میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ يَمُدُّوْنَهُمْ کے ساتھ متصل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اخوان کے ساتھ متصل ہو۔ اور الغی کا معنی جہالت ہے۔ نافع نے يُمِدُّونهم (1) یا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں (یعنی) مد اور امد، مد کا بغیر الف کے استعمال زیادہ ہے۔ یہ مکی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: اہل عرب کی ایک جماعت اہل مدینہ کی قراءت کا انکار کرتی ہے۔ ان میں سے ابو حاتم اور ابو عبید بھی ہیں، ابو حاتم نے کہا ہے: میں اس کی کوئی وجہ نہیں جانتا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو وہ ان کے لیے گمراہی اور جہالت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور اہل لغت میں سے ایک جماعت نے بیان کیا ہے ان میں سے ابو عبید بھی ہیں کہ جب کوئی شے کسی شے کی ذات میں کثرت اور زیادتی پیدا کر دے تو مدہ کہا جائے گا، اور جب کوئی اس میں کسی غیر کے سبب زیادتی کر دے تو أمدہ کہا جائے گا، مثلاً يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿﴾ (آل عمران) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 236

رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں)

اور محمد بن زید سے بیان ہے کہ انہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے لیے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: کہا جاتا ہے: مددتُ له فی کذا یعنی میں نے اسے اس کے لیے مزین اور آراستہ کیا اور میں نے اسے ایسا کرنے کی استدعا کی۔ اور أمددتهُ فی کذا یعنی میں نے اپنی رائے یا کسی اور طریقے سے اس کی مدد کی۔ مکی نے کہا ہے: پسندیدہ فتحہ ہے۔

کیونکہ کہا جاتا ہے: مددتُ فی الشر اور أمددت فی الخیر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ يَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿﴾ (البقرہ) (ڈھیل دیتا ہے انہیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں) پس یہ اس حرف میں فتحہ کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا استعمال شر میں ہوا ہے اور گمراہی (غی) بھی شر ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جمہور اسی موقف پر ہیں۔ اور عاصم جحدری نے یمادونھم فی الغی پڑھا ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے يَقْصُرون یا کو فتحہ، صاد کو ضمہ اور قاف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے يُقْصِرون اس کی ضد کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امراء القیس نے کہا ہے:

سَمَالك شَوْقٌ بعد ما كان أقْصَرا

وَ إِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾

''اور (اے محبوب!) جب آپ نہیں لائے ان کے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں: کیوں نہ بنالیا تم نے خود اسے فرمائیے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے رب سے، یہ روشن دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہیں اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ إِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ یعنی جب آپ ان پر کوئی آیت نہیں پڑھتے۔ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا اس میں لَوْلَا بمعنی هلا (کیوں نہیں) ہے، اور اس معنی پر اس کے متصل بعد صرف فعل آسکتا ہے چاہے وہ ظاہر ہو یا مضمر ہو، اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور اجْتَبَيْتَهَا کا معنی ہے تو نے اسے گھڑ لیا اپنی طرف سے۔ پس آپ انہیں آگاہ کر دیجئے کہ آیات اللہ عزوجل کی جانب سے آتی ہیں اور یہ کہ آپ ان پر نہیں پڑھتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرماتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجتبیتُ الکلام أی ارتجلتُه واختلقته واخترعته جب تو اپنی طرف سے کوئی کلام لائے (تو تب مذکورہ جملہ کہتا ہے) قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي فرمائیے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے نہ کہ اپنی طرف سے۔ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ مراد قرآن کریم ہے، بَصَائِرُ، بصیرۃ کی جمع ہے، اور اس کا معنی رہنمائی اور نصیحت ہے، یعنی یہ وہ بصائر (دلائل) ہیں جن کے ساتھ میں نے تمہاری اس پر رہنمائی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے، یعنی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: بصائر سے مراد طرق (راستے) ہیں اور البصائر سے مراد دین کے طرق ہیں۔

جعفی نے کہا ہے:

راحوا بصائرُهم على أكتافهم و بَصيرتي يَغدُوبها عَتِدٌ وأى

هُدًى سے مراد رشد و بیان ہے۔ اور رَحْمَةٌ سے مراد نعمت ہے۔

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

''اور جب پڑھا جائے قرآن (مجید) تو کان لگا کر سنو اسے اور چپ ہو جاؤ تا کہ تم پر رحمت کی جائے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1 ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کہا گیا ہے: بے شک یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر، زہری، عبید اللہ بن عمیر، عطا بن ابی رباح اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تھے تو مشرکین آپ کے پاس آتے تھے اور مکہ میں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ (فصلت: 26) (مت سنا کرو اس قران کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا آلایہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خطبہ کے بارے نازل ہوئی ہے(1)۔ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، عطا، عمرو بن دینار، زید بن اسلم، قاسم بن مخیمرہ، مسلم بن یسار، شہر بن حوشب اور عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اس میں قرآن تھوڑا ہے۔ اور پورے خطبہ میں خاموش رہنا واجب ہوتا ہے۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ نقاش نے کہا ہے: یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں نہ خطبہ تھا اور نہ ہی جمعہ۔ علامہ طبری نے حضرت سعید بن جبیر (2) سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ عید الاضحیٰ، عید الفطر اور جمعہ کے دن کی نمازوں اور ان نمازوں میں خاموش رہنے کے بارے ہے جن میں امام بالجہر قراءت کرتا ہے پس یہ عام ہے۔ اور یہ قول صحیح ہے، کیونکہ یہ ان تمام کو جامع ہے جن میں اس آیت اور علاوہ ازیں سنت کے مطابق خاموش رہنا واجب ہے۔ نقاش نے کہا ہے: اہل تفسیر نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس میں استماع سے مراد نماز میں قرآن کریم کا سننا ہے چاہے وہ نماز فرض ہو یا غیر فرض۔ نحاس نے کہا ہے: لغوی طور پر تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاموشی ہر شے (یعنی ہر حال) میں واجب ہوتی ہے، مگر یہ کہ کوئی دلیل کسی شے کے اختصاص پر دلالت کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم اس کے مطابق عمل کرو جو اس میں ہے اور تم اس سے تجاوز نہ کرو۔ اور الانصات سے مراد (قرآن کریم) سننے کے لیے، غور و فکر کے لیے اور پھر (اس کے معنی کی) رعایت کے لیے خاموش رہنا ہے۔ اس کا باب أَنْصَتَ يُنْصِتُ إِنْصَاتًا ہے اور نَصَتَ بھی (اسی معنی میں ہے) شاعر نے کہا ہے:

قال الإمامُ عليكم أمْرَ سيّدكم فلم نُخالف و أنصتنا كما قالا

اور کہا جاتا ہے: أنصتوه و أنصتوا له (تم اسے خاموش کرا دو، اور تم اس کے لیے خاموش ہو جاؤ)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 238 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 494

شاعر نے کہا ہے:

إذا قالتْ حَذامِ فأنصِتوها فإنّ القولَ ما قالت حَذامِ

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کے بارے میں بعض نے کہا ہے: یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھا تا کہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے اسے یاد کر سکیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں بہت بعد ہے، صحیح قول وہی ہے جس میں عموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور تخصیص دلیل کی محتاج ہوتی ہے۔

عبد الجبار بن احمد نے فوائد القرآن میں اس کے بارے کہا ہے: بے شک مشرکین عناد اور سرکشی کی وجہ سے بہت زیادہ شور وشغب کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بطور حکایت بیان کیا ہے: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (فصلت) تو اللہ تعالیٰ نے اداء وحی کی حالت میں مسلمانوں کو اس حالت کے خلاف رہنے کا حکم دیا اور یہ کہ وہ غور سے سنیں اور اسی بنا پر جنوں کی مدح اور تعریف بیان کی پس فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ الآیہ (الاحقاف: 29) (اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں)

اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ جب نماز میں قرآن پڑھتے تو آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کا جواب دیتے، جب آپ ﷺ پڑھتے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو وہ بھی آپ کے قول کی طرح کہتے۔ یہاں تک کہ آپ سورۃ الفاتحہ اور سورت پوری کر دیتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ بعد ازاں وہ خاموش ہو گئے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ انصات (خاموش رہنا) سے مراد اس جہر (آواز بلند کرنا) کو ترک کرنا ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے جواب میں آواز بلند کرتے تھے۔ اور حضرت قتادہ نے اس آیت میں کہا ہے: ایک آدمی آتا تھا اس حال میں کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ ان سے پوچھتا: تم نے کتنی نماز پڑھ لی ہے؟ کتنی ابھی باقی ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ نماز میں اپنی حاجات وضروریات کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ سورۃ الفاتحہ میں قراءت خلف الامام کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور خطبہ کا حکم سورۃ الجمعہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

"اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی چلائے بغیر (یوں یاد کرو) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور نہ ہو جاؤ (یاد الٰہی سے) غافل رہنے والوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً اسی کی مثل یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (الاعراف:55) ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ دعا کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہاں ذکر سے مراد نماز میں قراءت کرنا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پورے غور وفکر اور تدبر کے ساتھ قرآن کریم پڑھو۔ تَضَرُّعًا مصدر ہے، اور کبھی یہ حال کے محل میں ہوتا ہے۔ اور وَّخِيفَةً اس پر معطوف ہے۔ خیفة کی جمع خوف ہے، کیونکہ یہ خوف کے معنی میں ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور خیفة کی اصل خِوْفة ہے، اس میں واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا ہے۔ (کہا جاتا ہے) خَاف الرجلُ یَخَاف خوفًا و خیفةً و مخافةً فهو خائفٌ اور قوم خُوَّف اپنے اصل کی بنا پر ہے۔ اور خُیفلفظ کی بنا پر ہے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے کہ خیفة کی جمع میں خیف بھی کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الخيفة (کا معنی) الخوف ہے اور جمع خیف ہے اور اس کی اصل واؤ ہے۔ وَّدُوْنَ الْجَهْرِ یعنی آواز بلند کیے بغیر، یعنی اسمع نفسك (تو اپنے آپ کو سنا) جیسا کہ ارشاد گرامی ہے: وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۞ (الاسراء) یعنی اتنی آواز جو جهر (چیخ وپکار) اور مخافتة (انتہائی دھیمی) کے درمیان ہو اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ذکر کے ساتھ آواز کو انتہائی بلند کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ پہلے کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ حضرت قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے: الْاٰصَالِ سے مراد شامیں ہیں اور الغدو غدوة کی جمع ہے۔ اور ابومجلز نے بالغدو والإيصال پڑھا ہے اور یہ آصلنا کا مصدر ہے، یعنی ہم شام کے وقت داخل ہوئے (دخلنا فی العشی) اور الآصال اصل کی جمع ہے، جیسے طنب کی جمع اطناب ہے اور جمع الجمع ہے اور اس کی واحد اصیل ہے اور اس کی جمع اصل ہے۔ یہ زجاج سے منقول ہے۔۔

اخفش نے کہا ہے: الآصال، اصیل کی جمع ہے۔ جیسے یمین اور ایمان ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: أصل، أصيل کی جمع ہے، اور کبھی اصل واحد بھی ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ولا بأحسن منها إذْ دَنَا الأُصُلُ

جوہری نے کہا ہے: اصیل عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک کا وقت ہوتا ہے اور اس کی جمع أُصُلُ و آصال و أصائِل ہے، گویا کہ یہ اصيلة کی جمع ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لعمرِی لأنتَ البيتُ أكرِمُ أهلَه وأقعد لی أفيائه بالأصائل

اور اس کی جمع اصلان بھی بنائی جاتی ہے جیسے بعیر کی جمع بعران ہے۔ پھر انہوں نے جمع کی تصغیر بنائی اور کہا: اصیلان، بعد ازاں انہوں نے نون کو لام سے بدل دیا اور کہا: اصیلال اور اسی کے مطابق نابغہ کا قول ہے:

وقفتُ فيها أُصَيْلَالًا أسائلها عَيَّتْ جوابا وما بالربع من أحدِ

اور لحیانی نے بیان کیا ہے: لقيته اصيلالا۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ اور ذکر سے غافل رہنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ یَسْجُدُوْنَ ۝

''بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے، وہ تکبر نہیں کیا کرتے اس کی عبادت سے اور پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اس کی اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ اس میں الَّذِیْنَ سے مراد بالاجماع ملائکہ ہیں۔ اور فرمایا عِنْدَ رَبِّكَ۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق تو ہر مکان کے ساتھ ہے لیکن چونکہ وہ اس کی رحمت کے قریب ہیں اور ہر وہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہے تو وہ اس کے پاس ہی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ اور اس کے سوا کسی نے کہا ہے: کیونکہ وہ ایسی جگہ میں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کوئی اور حکم نافذ ہی نہیں ہوتا (اس لیے فرمایا وہ تیرے رب کے مقرب ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: عند الخلیفة جیش کثیر (خلیفہ کے پاس بہت زیادہ لشکر ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی عظمت و شرف کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور یہ کہ وہ انتہائی محترم اور مکرم مکان میں ہیں۔ پس یہ ان کے لیے عظمت و کرامت کے اعتبار سے قرب کا بیان ہے نہ کہ مسافت کے اعتبار سے۔ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ یعنی وہ اس کی عظمت بیان کرتے ہیں اور ہر نقص اور کمزوری سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وَ لَهٗ یَسْجُدُوْنَ کہا گیا ہے: وہ اس کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی کمتری اور انتہائی عجز کا اظہار کرتے ہیں، بخلاف گناہ کرنے والوں کے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے بارے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ یہ قاری کے لیے محل سجدہ ہے۔ قرآن کریم کے سجود کی تعداد کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس اس بارے میں جو انتہائی قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تعداد پندرہ ہے۔ پہلا سجدہ سورہ اعراف کی آخری آیت ہے اور آخری سجدہ سورۂ علق کی آخری آیت ہے۔ یہ ابن حبیب اور ابن وہب کا قول ہے۔ اور ایک روایت میں اسحاق بھی ان میں شامل ہیں۔ بعض علماء نے سورۃ الحجر میں قول باری تعالیٰ: وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ۝ (الحجر) پر سجدہ کرنے کا اضافہ کیا ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس اس طرح کل سجدے سولہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کریم میں چودہ سجدے ہیں۔ ابن وہب نے دوسری روایت میں یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ ساقط کر دیا ہے۔ اور یہی اصحاب الرائے کا قول ہے اور اس کا ساقط ہونا صحیح ہے، کیونکہ اس کے ثبوت کے بارے کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جسے ابن ماجہ اور ابو داؤد نے اپنی سنن میں عبد اللہ بن منین سے اور یہ بنی عبد کلال میں سے تھے اور انہوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قرآن کریم میں پندرہ سجدے پڑھائے۔ ان میں سے تین مفصل میں ہیں اور دو سجدے حج میں ہیں (1)۔ اس میں عبد اللہ بن منین قابل حجت نہیں ہیں۔ ابو محمد عبد الحق نے یہی کہا ہے۔ ابو داؤد نے عقبہ بن عامر سے بھی حدیث ذکر کی ہے انہوں نے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیان کیا میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اور جس نے دو سجدے نہ کیے تو اس نے انہیں پڑھا ہی نہیں'' (1)۔ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن لہیعہ ہے اور وہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو ثابت رکھا ہے اور سورۃ ص کا سجدہ ساقط کر دیا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ کل سجدوں کی تعداد گیارہ ہے، اس میں سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ اور مفصلات کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ گیارہ سجدے کیے ہیں ان میں مفصل میں سے کوئی سجدہ نہیں ہے (اور وہ یہ ہیں) الاعراف، الرعد، النحل، بنی اسرائیل، مریم، سورۃ الحج کا ایک سجدہ، فرقان، سلیمان، سورۃ النمل، سجدہ، ص، سجدۃ الحوامیم (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سجدوں کی تعداد دس ہے، انہوں نے حج کا دوسرا سجدہ، سورہ ص کا سجدہ اور مفصل کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ چار ہیں، آلم تنزیل کا سجدہ، حم تنزیل کا سجدہ، سورہ نجم اور سورہ علق کا سجدہ۔ اس اختلاف کا سبب احادیث کے نقل اور عمل میں اختلاف ہے۔ اور ان کا اختلاف خالص اس امر میں ہے جو قرآن کریم میں سجود کے متعلق ہے، کیا اس سے مراد سجود التلاوۃ ہیں یا نماز میں فرض سجدوں کے متعلق؟

مسئلہ نمبر 3۔ سجود تلاوت کے وجوب میں اختلاف ہے، حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہیں۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ نے کہا ہے: سجدہ تلاوت واجب ہے۔ اور استدلال یہ ہے کہ سجود کے بارے مطلق امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے (3) اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان علیحدہ ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس (وہ ہلاک ہوا)''۔ اور ابو کریب کی روایت میں یا ویلی کے الفاظ ہیں (ہائے میری ہلاکت) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول سے جو آپ نے ابلیس لعنہ اللہ کی طرف سے بطور خبر ارشاد فرمایا: ''ابن آدم جو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا (4) تو اس نے سجدہ کیا پس اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کیا پس میرے لیے جہنم ہے''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ آقائے دو جہاں ﷺ اس کی محافظت اور اہتمام کرتے تھے۔ اور ہمارے الثابت کی حدیث کی تاویل کی ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے منبر پر آیت سجدہ پڑھی (پھر آپ نیچے اترے) اور سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا، پھر دوسرے جمعہ آپ ﷺ نے آیت سجدہ پڑھی پس لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! ٹھہر جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر فرض نہیں کیا مگر یہ کہ ہم چاہیں''۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 61 4۔ ایضاً

اور یہ انصار و مہاجرین صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا، تو کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا پس اس کیساتھ اس بارے میں اجماع ثابت ہو گیا۔ اور رہا آپ ﷺ کا یہ قول کہ ''ابن آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا'' تو یہ سجدہ کے واجب ہونے کے بارے خبر ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ کی مواظبت استحباب پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سجود تلاوت ادا کرنے میں ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی نماز میں ضرورت ہوتی ہے مثلاً حدث اور نجس سے پاک ہونا، نیت کرنا، قبلہ شریف کی طرف منہ کرنا اور وقت کا ہونا، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے ذکر کیا ہے کہ وہ بغیر طہارت کے سجدہ کر لیتے تھے۔ اسے ابن منذر نے شعبی سے ذکر کیا ہے۔ کیا جمہور کے قول کے مطابق سجدہ کرنے والا تکبیر تحریمہ کہنے، ہاتھوں کو اٹھانے، تکبیر کہنے اور سلام پھیرنے کا محتاج ہوتا ہے؟

اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ سجدہ کے لیے تکبیر کہے اور تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے (یعنی رفع یدین کرے) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک اثر میں مروی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے اور اسی طرح جب سجدہ سے اٹھتے تو تکبیر کہتے۔ (1)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کے دوران سجدہ میں جانے کے لیے اور اس سے اٹھنے کے لیے تکبیر کہے گا۔ اور آپ سے نماز کے باہر سجدہ کے لیے تکبیر کہنے میں اختلاف منقول ہے۔ اور تکبیر کے بارے اسی طرح عام فقہاء نے کہا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک سجدہ کے لیے سلام نہیں ہے۔ سلف میں سے ایک جماعت اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ وہ سجدے سے سلام پھیرے گا۔ اور اس مذہب پر یہ بات ثابت ہے کہ سجدے کے اوّل میں تکبیر احرام کے لیے ہے۔ اور ان کے قول کے مطابق جو کہتے ہیں کہ سلام نہیں ہے فقط سجود ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''نماز کی چابی طہارت حاصل کرنا ہے، اس کی تحریم تکبیر کہنا ہے اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے'' (2)۔ اور یہ عبادت ہے اس کے لیے تکبیر ہے، پس اس کی تحلیل بھی ہے نماز جنازہ کی طرح بلکہ اس سے بھی اولیٰ، کیونکہ یہ فعل ہے اور نماز جنازہ قول ہے۔ اور اسے ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اب رہا اس کا وقت! تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ مطلق تمام اوقات میں سجدہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ایک خاص سبب سے نماز ہی ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب تک صبح خوب روشن نہ ہو یا عصر کے بعد جب تک سورج زردی مائل نہ ہو (سجدہ کیا جا سکتا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سجدہ کیا جا سکتا ہے اور عصر کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مذہب میں یہی تین اقوال ہیں۔ اور سبب اختلاف وہ معارضہ ہے جس کا تقاضا قراءت پر مرتب

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یسمع السجدۃ وھو راکب الخ، حدیث نمبر 1204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب مفتاح الصلوٰۃ الطہور، حدیث نمبر 271-270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہونے والے سجود میں سے کسی سجدہ کی قراءت کا سبب کرتا ہے کیونکہ صبح اور عصر کے بعد نماز پڑھنے سے نہی عام ہے اور اس معنی میں ان کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ ان دونوں وقتوں میں نماز سے منع کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب وہ سجدے کرے تو اپنے سجدہ میں یہ کہے گا: اے اللہ! اس کے ساتھ مجھ سے بوجھ اتار دے۔ اور میرے لیے اس کا اجر لکھ دے اور اسے میرے لیے اپنے پاس ذخیرہ بنا دے (1)۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور اگر کوئی آیت سجدہ نماز میں پڑھے، پس اگر وہ نفل نماز ہے تو وہ سجدہ کر لے چاہے وہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت کے ساتھ اور وہ اس میں کسی اور کی آمیزش سے پر امن رہے۔ اور اگر وہ جماعت میں ہے تو وہ اس میں تخلیط سے پر امن نہیں ہے پس بیان یہ کیا گیا ہے کہ سجدہ کر لینا جائز ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ اور اگر وہ فرض نماز میں ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور قول یہ ہے کہ نماز میں سجدہ کرنا ممنوع ہے، چاہے وہ نماز سری ہو یا جہری، جماعت کے ساتھ ہو یا انفرادی ہو۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ سجدہ تلاوت ادا کرنے سے فرض نماز کے سجود کی تعداد میں اضافہ لازم آتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی علت جماعت میں تخلیط کا خوف ہے۔ اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ اور اس بنا پر سجدہ سے نہ کسی منفرد کو روکا جائے گا اور نہ اس جماعت کو جس میں تخلیط اور فساد سے امن ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ بخاری نے ابو رافع سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں عشاء کی نماز پڑھی اور آپ نے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ (الانشقاق) پڑھی اور سجدہ کیا، تو میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے اس کا سجدہ کیا ہے، تو میں اس میں سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ سے جا ملوں گا۔ یہ اسے بیان کرنے میں منفرد ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمران بن حصین کو کہا گیا: وہ آدمی جو آیت سجدہ سنتا ہے اور اس کے لیے نہیں بیٹھتا؟ تو آپ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے اگر وہ اس کے لیے بیٹھ جائے! تو وہ اس پر واجب نہیں ہو گا۔ اور حضرت سلمان نے کہا: ہم نے کبھی اس کی جرأت نہیں کی۔ اور عثمان نے کہا ہے: بے شک سجدہ اس پر ہے جس نے آیت سجدہ سنی۔ اور زہری نے کہا ہے: وہ سجدہ نہ کرے گا مگر اس حال میں کہ وہ باوضو ہو، پس جب تو سجدہ کرے اور تو شہر میں ہو تو منہ قبلہ شریف کی طرف کر اور اگر تو سوار ہو تو پھر تجھ پر لازم نہیں جس طرح تیرا چہرہ ہو (ادھر ہی منہ کر کے سجدہ کر لے) اور حضرت سائب قصص بیان کرنے والے کی آیات سجود پر سجدہ نہ کرتے تھے۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابن ماجہ، باب سجود القرآن، حدیث نمبر 1042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سورۃ الانفال

آیاتہا ۷۵ ۸ سورۃ الانفال مدنیۃ ۸۸ رکوعاتہا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حضرت حسن، عکرمہ، جابر اور عطا رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی بدری ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ سورۃ مدنی ہے سوائے سات آیات کے اور وہ قول باری تعالیٰ: وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے لے کر ساتویں آیت کے آخر تک ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

”دریافت کرتے ہیں آپ سے غنیمتوں کے متعلق۔ آپ فرمایئے: غنیمتوں کے مالک اللہ اور رسول ہیں پس ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور اصلاح کرو اپنے باہمی معاملات کی اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اگر تم ایمان دار ہو“۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں دشمن کا مقابلہ کیا، جب اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دو چار کر دیا (اور وہ بھاگ نکلے) تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے انہیں قتل کرنے کے لیے ان کا تعاقب کیا اور ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے آپ کے ارد گرد رہا اور ایک گروہ جمع شدہ مال اور چھینے ہوئے مال غنیمت پر قابض رہا، پس جب اللہ تعالیٰ نے دشمن کو بھگا دیا اور جو ان کے تعاقب میں گئے تھے وہ واپس لوٹ آئے تو انہوں نے کہا: مال غنیمت ہمارا ہے، ہم وہ ہیں جنہوں نے دشمن کا پیچھا کیا اور ہمارے سبب ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں مار بھگایا اور انہیں شکست اور ناکامی سے دو چار کیا۔ اور وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد جمع رہے انہوں نے کہا: تم مال غنیمت کے ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، بلکہ وہ ہمارا ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد جمع رہے تاکہ دشمن آپ کو کوئی دھوکہ نہ پہنچا سکے۔ اور وہ لوگ جو جمع شدہ اور چھینے ہوئے مال پر قابض رہے انہوں نے کہا: تم ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، وہ تو ہمارے لیے ہے، ہم نے ہی اسے جمع کیا ہے اور ہم نے اس پر قبضہ کیا ہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تیزی کے ساتھ ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔ ابو عمر نے کہا: اہل

علم نے لسان العرب میں کہا ہے: اِستَلوَذُوا (یعنی) وہ قریب ہوئے اور احاطہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے: الموت مُسْتَلْوِعلی العباد (موت بندوں کے قریب ہے اور احاطہ کیے ہوئے ہے) اور آپ کا قول: فقسمه عن فُواق یعنی تیزی کے ساتھ آپ نے اسے تقسیم کر دیا۔ وہ کہتے ہیں: والفُواقُ مابین حَلْبَتَی الناقة (یعنی فواق سے مراد اونٹنی کو دوبارہ دوہنے کے درمیان والا وقفہ ہے)

کہا جاتا ہے: انتظرہ فوق ناقة یعنی اتنی مقدار تو اس کا انتظار کر۔ اور وہ اسے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ بولتے ہیں یعنی فُواق اور فَواق۔ اور یہ حکم اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا: وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (الانفال: 41) (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ) گویا علماء کے نزدیک معنی یہ ہے یعنی اس بارے میں حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہے اور اس بارے میں عمل اس کے مطابق ہے جو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: ہمارے اصحاب میں سے عبدالرحمن بن حارث وغیرہ نے سلیمان بن موسیٰ اشدق سے انہوں نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مال غنیمت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم میں اصحاب بدر کی جماعت تھی جو (غزوۂ بدر میں) شریک تھے جس وقت ہمارے درمیان مال غنیمت کے بارے اختلاف ہوا اور اس میں ہمارے اخلاق درست نہ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برابر برابر تقسیم فرما دیا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے خوف، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اپنے معاملات میں اصلاح کے لیے تھا۔

اور صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بہت زیادہ مقدار میں مال غنیمت حاصل کیا، اس میں ایک تلوار تھی، میں نے اسے اٹھا لیا اور اسے لے کر میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یہ تلوار مجھے عطا فرما دیجیے، بلاشبہ میں وہ ہوں جس کی حالت سے آپ واقف و آگاہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے وہیں لوٹا دو جہاں سے تو نے اسے اٹھایا ہے''۔ پس میں چلا گیا یہاں تک کہ میں نے اسے مقبوض مال میں پھینکنے کا ارادہ کیا تو میرے نفس نے مجھے ملامت کی اور میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ کر آیا اور عرض کی: آپ یہ (تلوار) مجھے عطا فرما دیجیے۔ آپ بیان کرتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنی آواز سخت کی اور فرمایا: ''اسے وہیں لوٹا دو جہاں سے اسے اٹھایا ہے''۔ پس میں چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے اسے مال مقبوض میں ڈال دینے کا ارادہ کیا تو میرے نفس نے مجھے ملامت کی اور میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ آیا اور عرض کی: آپ یہ تلوار مجھے عطا فرما دیجیے۔ آپ فرماتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنا لہجہ سخت کیا اور فرمایا: ''تو اسے وہیں لوٹا دے جہاں سے تو نے اسے اٹھایا ہے''۔ تب اللہ تعالیٰ نے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ نازل فرمائی۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔ اور اس بارے میں روایات کثیر ہیں۔ اور اس بارے میں جو ہم نے ذکر کر دیا ہے وہ کافی ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ۔

مسئلہ نمبر 2۔ الْاَنْفَالِ کا واحد نفل فا متحرکہ کے ساتھ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إنّ تَقْوَى رَبِّنا خيرُ نَفَل و بإذن الله رَيْثي والعَجَلُ

اس میں خیر نفل بمعنی خیر غنیمۃ (اچھی غنیمت) ہے اور نفل کا معنی یمین (قسم) ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے فتبرئکم یہود بنفل خمسین منهم (یہود پچاس قسموں کے ساتھ تمہیں ان سے بری کر دیں گے) اور النفل کا معنی الانتفاء (نفی کرنا، انکار کرنا) بھی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے فانتفل من ولدها (پس اس نے اس کے بچے کا انکار کر دیا) اور نفل ایک معروف بوٹی بھی ہے۔ اور نفل کا معنی واجب پر زیادتی کرنا بھی ہے اور وہ نفلی عبادت ہے۔ اور بچے کا بچہ بھی نافلہ کہلاتا ہے، کیونکہ وہ بچے پر زائد ہی ہوتا ہے۔ اور مال غنیمت بھی نافلہ کہلاتا ہے، کیونکہ یہ وہ اضافہ اور زیادتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے حلال قرار دیا ہے اور یہ ان میں سے ہے جو دیگر امتوں پر حرام تھی۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے (دیگر) انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ اور ان میں۔ ایک یہ ہے کہ میرے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا ہے (1)۔ اور الْاَنْفَالِ سے مراد بذات خود غنائم ہی ہیں۔ عنترہ نے کہا ہے:

إنّا إذا أحمر الوَغَى نُروِى القنا ونَعِفت عند مقاسم الأنفال

اس میں الْاَنْفَالِ سے مراد غنائم ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ انفال کے محل میں علماء کا اختلاف ہے اس بارے میں چار اقوال ہیں:

(۱) اس کا محل اس مال میں ہے جو کافروں سے کٹ کر مسلمانوں کی طرف آ جائے یا بغیر جنگ کے لے لیا جائے (۲) اس کا محل خمس (پانچواں حصہ) ہے (۳) اس کا محل خمس کا خمس (پانچواں کا پانچواں حصہ) ہے (۴) اصل مال غنیمت، جیسا بھی امام وقت اسے پاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ انفال سے مراد وہ عطیات اور انعامات ہیں جو امام وقت خمس سے عطا کرتا ہے، جس طرح اس کے بارے وہ اپنی رائے رکھتا ہو۔ بقیہ چار حصوں میں کوئی نفل نہیں ہوتا، بلاشبہ وہ کل مال غنیمت سے نفل نہیں پاتا کیونکہ اس کے مستحق معین ہوتے ہیں اور وہ اسے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ حاصل کرتے ہیں اور خمس کی تقسیم امام کے اجتہاد اور رائے کو سونپ دی گئی ہے۔ اور اس کے مستحق معین نہیں ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جو مال غنیمت تمہیں عطا فرمایا ہے میرے لیے سوائے خمس کے اور کچھ نہیں اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جائے گا'' (2)۔ پس اس کے بعد یہ ممکن نہیں کہ نفل کسی ایک کا حق ہو اور بلاشبہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے وہ خمس ہے۔ آپ کے مذہب میں سے یہی معروف ہے۔ اور تحقیق آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ خمس کا خمس ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن مسیب، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور سبب اختلاف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے انہوں نے

1۔ مشکوٰۃ المصابیح باب فضائل سید المرسلین

2۔ سنن ابی داؤد، باب فداء الاسیر بالمال، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، باب فی الامام یستاثر بشیئ من الفیئ لنفسه، حدیث نمبر 2374، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے نجد کی جانب ایک سریہ بھیجا تو انہیں بہت سے اونٹ مال غنیمت میں ہاتھ آئے، ان کے حصے میں بارہ یا گیارہ گیارہ اونٹ آئے اور پھر انہیں ایک ایک اونٹ بطور نفل بھی دیا گیا۔ اسی طرح اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ شک آپ سے یحییٰ کی روایت میں موجود ہے اور اسی پر مؤطا کے راویوں کی ایک جماعت نے ان کی اتباع کی ہے سوائے ولید بن مسلم کے کیونکہ انہوں نے مالك عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس میں کہا ہے: ان کے حصص بارہ بارہ اونٹ تھے اور ایک ایک اونٹ انہیں بطور تنفیل دیا گیا۔ اور انہوں نے شک کا اظہار نہیں کیا۔ ولید بن مسلم اور حکم بن نافع نے شعیب بن ابی حمزہ سے انہوں نے حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک لشکر میں نجد کی جانب بھیجا۔ اور ولید کی روایت میں ہے اس کی تعداد چار ہزار تھی۔ اور لشکر سے ایک سریہ نکلا۔ اور ولید کی روایت میں ہے: پس میں بھی ان میں تھا جو اس میں نکلے تھے۔ پس لشکر کے حصص بارہ بارہ اونٹ تھے۔ اور اہل سریہ کے حصہ بطور تنفیل ایک ایک اونٹ تھا، پس ان کے حصص تیرہ تیرہ اونٹ ہو گئے، اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ اسی سے انہوں نے استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں: بے شک نفل مجموعی خمس سے ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ سریہ (چھوٹا سا دستہ) اگر کسی مقام پر اترا مثلاً اس میں دس افراد شامل تھے انہوں نے اپنے مال غنیمت میں ڈیڑھ سو (اونٹ) حاصل کیے، تو ان سے ان کا خمس تیس اونٹ پہلے نکال لیے جائیں گے اور ان کے لیے ایک سو بیس رہ جائیں گے، جو دس افراد پر تقسیم کیے جائیں گے اور وہ ہر ایک کے حصہ میں بارہ بارہ اونٹ آئیں گے، پھر اس قوم کو خمس میں سے ایک ایک اونٹ دے دیا جائے گا، کیونکہ اس میں تیس کا خمس دس اونٹ نہیں ہو سکتے۔ پس جب تو نے دس کے لیے حصہ پہچان لیا تو پھر سو، ہزار اور زائد کے لیے جو ہوگا اسے بھی معلوم کر لے گا۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ نفل خمس کے خمس میں سے ہوگا انہوں نے اس طرح کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (مال غنیمت میں) کپڑے بھی ہوں جو بیچے جا سکتے ہوں اور اونٹوں کے علاوہ بھی ساز و سامان ہو، تو وہ آدمی جسے اونٹ نہ ملے اسے اس سامان میں سے اونٹ کی قیمت ادا کر دی جائے۔ اور اسے اس حدیث سے تقویت پہنچتی ہے جسے مسلم نے اس حدیث کے بعض طرق میں بیان کیا ہے: ''پس ہم نے اونٹ اور بکریاں حاصل کیں''، الحدیث۔

محمد بن اسحاق نے اس حدیث میں ذکر کیا ہے کہ امیر (لشکر) نے تقسیم سے پہلے ان کے لیے تنفیل کی اور یہ اسے ثابت کرتا ہے کہ نفل کل مال غنیمت میں سے ہو۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے خلاف ہے۔ اور جنہوں نے ان کے خلاف روایت کی ہے ان کا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہ حفاظ ہیں، یہ ابو عمر رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اور مکحول اور اوزاعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: ثلث سے زیادہ کے ساتھ تنفیل نہیں کی جائے گی، جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ ان کے لیے زیادہ عطا کرنے کا قول کرے تو اسے ان کے لیے پورا کرنا چاہیے اور وہ اسے خمس میں سے ادا کرے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: نفل میں کوئی ایسی حد نہیں ہے جس سے امام تجاوز نہ کر سکتا ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس پر دلیل ہے جو ولید اور حکم نے شعیب سے اور انہوں نے نافع سے

ذکر کیا ہے کہ جب سریہ لشکر میں سے نکلے اور وہ مال غنیمت حاصل کرنے تو لشکر بھی ان کے ساتھ شریک ہوگا اور یہ ایک مسئلہ اور حکم ہے جسے حدیث میں شعیب کے سوا نافع سے کسی نے ذکر نہیں کیا اور اس کے بارے میں علماء میں اختلاف نہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کا امام وقت کے اس قول کے بارے اختلاف ہے جو قتال سے پہلے یہ کہتا ہے: جس نے اس قلعہ میں سے اتنا گرا دیا تو اس کے لیے اتنا (مال) ہوگا اور جو کوئی فلاں جگہ تک پہنچ گیا تو اس کے لیے اتنا (مال) ہوگا اور جو کسی کا سر لے کر آیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جو کوئی کسی کو قیدی بنا کر لا یا تو اس کے لیے اتنا ہوگا۔ گویا امام وقت یہ کہہ کر انہیں انگیخت دلا رہا ہے اور ان کے جذبات کو ابھار رہا ہے۔ پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قتال تو پھر حصول دنیا کے لیے ہوگا اور یہ جائز نہیں ہوگا۔ اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث میں موجود ہے، جب بدر کا دن تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جس نے کسی کو قیدی بنایا تو اس کے لیے اتنا ہوگا'' (1)۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور آپ رضی اللہ عنہ سے ہی حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس اس طرح کیا اور فلاں فلاں جگہ پر آیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا''۔ پس جوان تیزی سے دوڑ پڑے اور بوڑھے جھنڈوں کے پاس ہی ثابت قدم رہے۔ پس جب انہیں فتح حاصل ہوگئی تو جوان آئے اور اسی کا مطالبہ کرنے لگے جو ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا تو بوڑھوں نے انہیں کہا: تم ہمارے بغیر ادھر نہیں جا سکتے تھے، تحقیق ہم تمہارے لیے مددگار اور معاون تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ (اور تم اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو) اسے اسماعیل بن اسحاق نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو کہا جب وہ اپنی قوم میں آپ کے پاس آئے اور وہ شام کا ارادہ رکھتے تھے: کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو کوفہ آئے اور تیرے لیے تمام زمین اور قیدیوں کے بدلے خمس کے بعد ثلث (تیسرا حصہ ہو؟) اور یہ فقہائے شام کی جماعت نے کہا ہے: ان میں امام اوزاعی، مکحول اور ابن حیوہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم شامل ہیں۔ اور ان کی رائے میں خمس کل مال غنیمت میں سے ہے اور نفل خمس کے بعد ہے پھر اصل لشکر کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم ہے۔ اور اسحاق، امام احمد اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آج لوگوں کا موقف یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے نفل نہیں ہوگا یہاں تک کہ خمس نکال لیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ امام وقت سریہ کو کہے: جو مال تم نے حاصل کیا اس کا ثلث تمہارے لیے ہے۔ سحنون نے کہا ہے: وہ اس سے ابتداءً مراد لیتے ہیں۔ پس اگر یہ واقع ہو گیا تو وہ نافذ ہو جائے گا اور باقی مال میں ان کے حصص ہوں گے۔ اور سحنون نے کہا ہے: جب امام نے سریہ کو کہا: جو مال تم نے حاصل کیا تو تم پر اس میں خمس نہیں ہوگا۔ تو یہ قول جائز نہیں

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ پس اگر یہ واقع ہو گیا تو بھی میں اسے رد کرتا ہوں، کیونکہ یہ حکم شاذ ہے یہ جائز نہیں ہے اور نہ نافذ العمل ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مستحب قرار دیا ہے کہ امام تنفیل نہ کرے مگر اس مال میں جو ظاہر ہو مثلاً عمامہ (مراد خود ہوں گے یا دستاریں) گھوڑے اور تلواریں۔ اور بعض علماء نے اس سے منع کیا ہے کہ امام وقت سونے، چاندی یا موتیوں وغیرہ میں تنفیل کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: ہر شے میں تنفیل جائز ہے (1)۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول اور آیت کے مقتضی کے مطابق یہی قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ یہ تقوی اور اصلاح احوال کے بارے میں حکم ہے یعنی تم دعا میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر جمع ہو جاؤ: اللّٰھم أصلح ذات البَیْن یعنی اے اللہ ایسی حالت پیدا فرما دے جس کے سبب باہمی اتفاق اور اجتماعیت پیدا ہو جائے۔ پس یہ اس تصریح پر دلیل ہے کہ ان کے درمیان اختلاف پھوٹ پڑا یا نفوس باہم جھگڑنے کی طرف مائل ہو گئے جیسا کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ اور تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، یعنی تم اپنے اقوال و افعال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو۔ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اور غنائم اور دیگر معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی مومن کا طریقہ یہ ہے کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس کی پیروی کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان بمعنی اذ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

''صرف وہی سچے ایمان دار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں (اور) جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو، نیز اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں انہی کے لیے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور بخشش ہے اور باعزت روزی''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال غنیمت کو تقسیم کرنے کا جو حکم ارشاد فرمایا ہے یہ آیت اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازم پکڑنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔ الوجل کا معنی خوف ہے۔ اس کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 498

مضارع میں چار لغتیں ہیں۔ وَجِلَ، یَوْجَلُ و یَاجَلُ و یِیْجَلُ و یِیجلُ، اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے۔ اور مصدر وَجِلْ وَجَلًا و مَوْجَلًا بالفتح ہے۔ اور یہ جیم کے کسرہ کے ساتھ موجِل ہو تو پھر اسم ظرف بنتا ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے: یاجل انہوں نے مضارع میں واؤ ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا ہے اور قرآن کریم کی لغت واؤ کے ساتھ ہے۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ (الحجر: 53) اور جنہوں نے یا کے کسرہ کے ساتھ یِیجل کہا ہے تو یہ بنی اسد کی لغت کے مطابق ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: أنا إیجل، ونحن نِیجل، وانت تِیجل یہ تمام کلمات کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے: یَیجل تو ان کی بنا بھی اسی لغت پر ہے لیکن انہوں نے یا کو فتحہ دیا ہے جیسے انہوں نے یَعلم میں یا کو فتحہ دیا ہے اور یعلم میں یا کو کسرہ اس لیے نہیں دیا، کیونکہ انہوں نے یا پر کسرہ کو ثقیل سمجھا ہے، اور یِیجل میں کسرہ دیا گیا ہے اس لیے کہ دو یاؤں میں سے ایک نے دوسری کے سبب قوت پکڑ لی ہے۔ اور اس سے امر کا صیغہ اِیْجَل ہے (یہ اصل میں اِوْجَل تھا) اس میں واؤ ماقبل مکسور یا سے بدل گئی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں: انی منه لأوْجَل (میں اس کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہوں اس میں أوْجَل اسم تفضیل کا صیغہ ہے) اور مونث میں وَجْلٰی نہیں کہا جائے گا، بلکہ مونث وجلة ہے۔ سفیان نے سدی سے قول باری تعالیٰ: الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جب اس نے ظلم ڈھانے کا ارادہ کیا تو اسے کہا گیا: اللہ تعالیٰ سے ڈر، تو وہ رک گیا اور اس کا دل خوفزدہ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ اس کے ذکر کے وقت خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اور ایسا ان کی قوت ایمانی اور اپنے رب کی طرف توجہ اور رعایت کے اعتبار سے ہوتا ہے، گویا کہ وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہیں۔ اور اس آیت کی مثل یہ آیت بھی ہے: وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿٣٤﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الحج) اور (اے محبوب! مژدہ سنائیے تواضع کرنے والوں کو۔ وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں) اور فرمایا: وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (الرعد: 28) (اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے) پس یہ کمال معرفت اور وثوق قلب کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اور وجل کا معنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ ہونا اور گھبرا جانا ہے اور اس کے معنی میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں معنوں کو اپنے اس ارشاد میں جمع کر دیا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: 23) (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں اور کانپنے لگتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے، پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف)

یعنی ان کے نفوس اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے کی حیثیت سے پرسکون ہوتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی حالت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں اور اس کے رعب وجلال اور اس کی سزا سے خوفزدہ رہتے ہیں، نہ کہ اس طرح جیسا کہ جاہل عوام اور حقیر بدعتی لوگ کرتے ہیں مثلاً چیخ و پکار کرنا، شور مچانا اور ایسی آوازیں نکالنا جو گدھوں کے رینگنے کے مشابہ ہوتی ہیں۔ پس یہ صورت حال لاحق ہو اور وہ یہ گمان کرے کہ یہ وجد اور خشوع ہے تو اسے کہا جائے گا: تو اللہ تعالیٰ کی

معرفت، اس کا خوف اور اس کی عظمت وجلال کی تعظیم کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی حالت اور کیفیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے باوجود وعظ ونصیحت کے وقت ان کی حالت اللہ تعالیٰ کے بارے فہم اور اس کے خوف سے رونے کی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے سماع اور اپنی کتاب کی تلاوت کے وقت اہل معرفت کے احوال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ (المائدہ) (اور جب سنتے ہیں (قرآن) جو اتارا گیا رسول کی طرف تو تو دیکھے گا ان کی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ پہچان لیا انہوں نے حق کو، کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے پس تو لکھ لے ہمیں (اسلام کی صداقت کی) گواہی دینے والوں میں)

پس یہ ان کی حالت کا بیان اور ان کے قول کی حکایت ہے۔ اور جو اس طرح نہیں تو وہ نہ ان کی ہدایت پر ہے اور نہ ان کے طریقہ پر۔ پس جو ان کا طریقہ اپنائے ہوئے ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر چلتا رہے اور جو کوئی مجنونوں کے احوال اختیار کرے اور جنون تو ان کی اخس ترین حالت ہے۔ اور جنون ایک فن ہے۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ لوگوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے یہاں تک کہ انہوں نے آپ سے پوچھنے میں اصرار کیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: سَلُونِی لا تسألونی عن شیٔ الا بینته لکم ما دمتُ فی مقامی هذا (1) (تم مجھ سے پوچھو تم کسی شے کے بارے مجھ سے سوال نہیں کرو گے مگر میں اسے تمہارے لیے بیان کروں گا جب تک میں اپنے اس مقام میں ہوں)

پس جب لوگوں نے یہ سنا تو وہ خاموش ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات پیش کرنے سے خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس میں نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا تو ہر انسان اپنا سر اپنے کپڑے میں لپیٹ کر رو رہا تھا۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں انتہائی بلیغ وعظ ارشاد فرمایا، اس کے سبب آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور دل کانپ گئے۔ الحدیث

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موعظة بليغة ذرفت منها العيون، ووجلت منها القلوب آپ نے یہ نہیں فرمایا: زَعَقْنا ولا رَقَصْنا ولا زَفَنا ولا قُمنا (ہم چیخ و پکار کرنے لگے نہ یہ فرمایا کہ ہم رقص کرنے لگے، نہ یہ فرمایا کہ ہم اچھلنے کودنے لگے اور نہ یہ فرمایا کہ ہم اٹھ کھڑے ہوئے)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا یعنی ان کی تصدیق میں اضافہ کر دیتی ہیں، کیونکہ اس ساعت اور وقت کا ایمان گزشتہ کل کے ایمان سے زیادہ ہوتا ہے، پس جس نے دوسری اور تیسری بار تصدیق کی تو یقیناً اس کی تصدیق سابقہ تصدیق سے زیادہ ہو گئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آیات اور دلائل کی کثرت کے سبب انشراح صدر میں زیادتی ہے۔ اور یہ معنی سورۂ آل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 263

عمران میں گزر چکا ہے: وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ، توکل کا معنی بھی سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے: الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ اس کا بیان سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی وہ جن کا ظاہر اور باطن ایمان میں برابر ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: إن لكل حق حقيقة فما حقيقة إيمانك؟ الحدیث (بے شک ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟) کسی آدمی نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: اے ابا سعید! کیا آپ مومن ہیں؟ تو آپ نے اسے فرمایا: ایمان دو قسم کے ہیں، پس اگر تو مجھ سے اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل علیہم السلام، جنت،، دوبارہ زندہ کیے جانے اور حساب پر ایمان کے بارے پوچھ رہا ہے تو میں یقیناً مومن ہوں۔ اور اگر تو مجھ سے اس قول باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۚۖ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے بارے پوچھ رہا ہے تو قسم بخدا میں نہیں جانتا میں ان میں سے ہوں یا نہیں۔

ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو کوئی یہ کہے: أنا مؤمن بالله حقًا (میں یقیناً اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والا ہوں) تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو (کسی شی کی) آگاہی، اطلاع اور احاطہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، پس اس کے مفقود ہونے کی وجہ سے اس بارے میں اس کا دعویٰ باطل ہے۔ اور اس سے وہ اسی معنی کا ارادہ کر رہے ہیں جو اہل سنت نے بیان کیا ہے: بے شک مومن حقیقی وہ ہے جس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا گیا ہو، پس جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مخفی حکمت میں سے اسے نہیں جانتا تو اس کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ حقیقۃً مومن (انه مومن حقا) ہے صحیح نہیں ہے۔

كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۟ۙ

"جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ اور بے شک اہل ایمان کا ایک گروہ (اس کو) ناپسند کرنے والا تھا"۔

قولہ تعالیٰ: كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ بِالْحَقِّ زجاج نے کہا ہے: کاف محل نصب میں ہے، یعنی الأنفال ثابتة لك كما أخرجك ربك من بيتك بالحق (مال غنیمت آپ کے لیے ثابت ہے جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ) یعنی مثل إخراجك ربك من بيتك بالحق اور معنی یہ ہے: غنائم میں اپنا حکم جاری کر دیجئے اور جسے چاہیں بطور نفل دیجئے اگرچہ وہ ناپسند کریں، کیونکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کہا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قیدی بنا کر لانے والے کے لیے کوئی شے مقرر فرمائی: بہت سے لوگ بغیر شے کے باقی رہ جائیں گے۔ (یعنی بہت سے لوگوں کے حصہ میں کچھ بھی نہیں آئے گا) پس کما میں کاف کا محل نصب ہوا جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور فراء نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ قسم ہے، یعنی والذى أخرجك (قسم ہے اس کی جس نے آپ کو نکالا) پس کاف بمعنی واؤ ہوا اور ما بمعنی الذی ہوا۔ اور سعید بن مسعدہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اولئك هم المؤمنون حقًا كما اخرجك ربك من بيتك بالحق فرمایا: اور بعض علماء نے کہا ہے: كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ بِالْحَقِّ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا

ذَاتَ بَيْنِكُمْ (جس طرح آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ نکال لایا پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے درمیان معاملات کی اصلاح کرو)

اور عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معنیٰ ہے وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ، كَمَاۤ اَخْرَجَكَ (تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو جس طرح اس نے تمہیں نکالا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ قول باری تعالیٰ لَهُمْ دَرَجٰتٌ کے متعلق ہے اس کا معنی ہے: ان کے لیے اپنے رب کے پاس درجات ہیں اور بخشش ہے اور باعزت روزی ہے، یعنی مومنین کے لیے آخرت میں یہ وعدہ حق ہے جس طرح آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر سے اس حق کے ساتھ نکالا ہے جو اس کے لیے ثابت ہے۔ پس اس نے آپ کے ساتھ آپ کا وعدہ پورا کر دیا اور آپ کو آپ کے دشمن کے مقابلہ میں کامیاب فرمایا اور آپ کے لیے اسے پورا فرما دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لیے ہے) پس جس طرح اس نے یہ وعدہ دنیا میں پورا کر دیا ہے اسی طرح وہ تمہارے ساتھ اس وعدہ کو پورا فرما دے گا جو اس نے تمہارے ساتھ آخرت کے بارے کیا ہے۔ یہ قول حسن ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور اسے پسند کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَاۤ میں کاف کاف تشبیہ ہے اور اس کا مخرج مجازات کے طریقہ پر ہے، جیسا کہ کوئی کہنے والا اپنے غلام کو کہے: جس طرح میں نے تجھے اپنے دشمنوں کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے تجھے کمزور سمجھا اور تو نے مدد طلب کی تو میں نے تیری امداد کی اور تجھے قوی اور طاقتور بنا دیا اور تیری علت اور کمزوری دور کر دی، پس اب تو انہیں پکڑ لے اور اس کے ساتھ ان کا پیچھا کر۔ اور جس طرح میں نے تجھے لباس پہنایا اور تجھے کھانے پینے کی اشیاء مہیا کیں پس تو اس اس طرح عمل کر اور جس طرح میں نے تجھ پر احسان کیا تو تو اس پر میرا شکر ادا کر۔ پس ارشاد فرمایا: جس طرح آپ کا رب آپ کو آپ کے گھر سے حق کے ساتھ نکال لایا اور اس نے تمہیں غنودگی کے ساتھ ڈھانپ دیا تاکہ یہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے، یعنی اس کے ساتھ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو راحت حاصل ہو۔ اور اس نے آسمان سے پانی اتارا تاکہ اس سے تمہیں پاک کر دے اور اس نے تم پر آسمان سے فرشتے نازل فرمائے جو پے در پے آنے والے ہیں، سو تم مارو (ان کی) گردنوں کے اوپر اور چوٹ لگاؤ ان کے ہر بند پر، گویا وہ یہ فرما رہا ہے: تحقیق میں نے تمہاری علل دور کر دی ہیں اور ملائکہ کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی ہے پس تم ان کے ان مواضع پر مارو، درآنحالیکہ یہ متقل ہے، تاکہ تم حق کو حق قرار دینے اور باطل کو باطل قرار دینے میں اللہ تعالیٰ کی مراد کو پہنچ سکو۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ یعنی ایک گروہ مکہ کو چھوڑنا اور اپنے اموال اور گھروں کو چھوڑنا ناپسند کرنے والا تھا۔

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ؁

''جھگڑ رہے تھے آپ سے سچی بات میں اس کے بعد کہ وہ واضح ہو چکی تھی گویا وہ ہانکے جا رہے تھے موت کی طرف درآنحالیکہ وہ (موت کو) دیکھ رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ ان کا جھگڑا، ان کا یہ قول تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (ابوسفیان کے تجارتی) قافلہ کے مقابلہ کی دعوت دی اور پھر وہ قافلہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر آپ نے انہیں جنگ لڑنے کا حکم دیا اور ان کے پاس کوئی زیادہ ساز و سامان نہ تھا تو یہ حکم ان پر گراں گزرا اور انہوں نے کہا: اگر آپ ہمیں جنگ لڑنے کی خبر دیتے تو ہم یقینا تیاری کے ساتھ آتے اور فِي الْحَقِّ سے مراد فی القتال (جنگ کے بارے میں) ہے۔ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ یعنی ان کے لیے یہ واضح ہونے کے بعد کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی شی کے بارے کوئی حکم نہیں دیتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لیے یہ بات واضح ہونے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قافلے یا اہل مکہ کے مقابلے میں کامیابی کا وعدہ فرما رکھا ہے اور جب قافلہ چلا گیا تو پھر اہل مکہ سے مقابلہ ضروری ہے اور انہیں کے مقابلہ میں کامیابی بھی ہے۔ پس کلام کا مفہوم ان کے مجادلہ اور جھگڑنے کا انکار کرنا ہے۔ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ قوم کی ملاقات کو ناپسندیدگی کا اظہار ہے (یعنی ان کے لیے جنگ میں واقع ہونا گویا موت کو دعوت دینا ہے)

وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ یعنی وہ جانتے ہیں کہ موت ان پر واقع ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (النباء: 40) یعنی اس میں ینظر بمعنی یعلم ہے۔

وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ۸

''اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لیے ہے اور تم پسند کرتے تھے کہ نہتہ گروہ تمہارے حصے میں آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو حق کر دے اپنے ارشادات سے اور کاٹ دے کافروں کی جڑ، تاکہ ثابت کر دے حق کو اور مٹا دے باطل کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) عادی مجرم''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ اس میں اِحْدَى محل نصب میں مفعول ثانی ہے۔ اَنَّهَا لَكُمْ یہ بھی احدی سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ وَ تَوَدُّوْنَ یعنی اور تم پسند کرتے ہو۔ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ سے مراد وہ ہے جس کے پاس ہتھیار نہ ہوں۔ اور الشَّوْكَةِ کا معنی ہتھیار ہے۔ اور الشوك سے مراد وہ بوٹی ہے جس کے کانٹے ہوں۔ اور اسی سے رجل شائك السلاح (یعنی تیز دھار ہتھیار رکھنے والا آدمی) ہے، پھر اس میں قلب کر کے کہا جاتا ہے: شاكی السلاح مراد یہ ہے کہ تم پسند کرتے ہو کہ تم اس گروہ کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ جس کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہیں اور نہ اس میں جنگ ہے۔ یہ زجاج سے منقول ہے۔

وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ یعنی (اللہ چاہتا تھا) کہ وہ اسلام کو غالب کر دے اور حق ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے، لیکن اس کا اظہار (اور غلبہ) اس کو اس حیثیت سے ثابت کرنا ہے کہ اس کی باطل کے ساتھ کوئی مشابہت ظاہر نہ ہو۔ بِكَلِمٰتِهٖ سے مراد بوعدہٖ ہے یعنی اپنے وعدہ کے ساتھ، کیونکہ اس نے اس بارے میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ الدخان میں وعدہ

فرمایا ہے۔ پس ارشاد فرمایا: یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾ (الدخان) (جس روز ہم انہیں پوری شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدلہ لے لیں گے) یعنی ہم ابوجہل اور اس کے ساتھیوں سے انتقام لینے والے ہیں اور مزید فرمایا: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الفتح:28) (تاکہ غالب کردے اسے تمام دینوں پر)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکلماتہ کا معنی بامرہ یعنی تمہیں اپنے اس حکم کے ساتھ کہ تم ان کے ساتھ جہاد کرو۔ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی انہیں ہلاکت کے سبب نیست و نابود کردے۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ یعنی تاکہ وہ دین اسلام کو غلبہ عطا فرمائے اور اسے تقویت دے۔

وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ یعنی اور وہ کفر کو مٹا دے اور اسے باطل کرنے سے مراد اسے معدوم کرنا ہے جیسا کہ حق کو حق قرار دینے کا معنی اسے ظاہر کرنا اور غالب کرنا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (الانبیاء:18) (بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے کچل دیتا ہے اور وہ یکایک ناپید ہو جاتا ہے۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (اگرچہ عادی مجرم اسے ناپسند ہی کریں)

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

''یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔ اور نہیں بنایا فرشتوں کے نزول کو اللہ نے مگر ایک خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل۔ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت غالب ہے حکمت والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ الاستغاثۃ کا معنی مدد اور نصرت طلب کرنا ہے۔ غوث الرجل (اس نے آدمی کی مدد کی) کہا: واغوثاہ (اے مدد کرنے والے) اور اس سے اسم غوث، غَواث اور غُواث ہیں۔ اور إستغاثنی فلانٌ فأغثتہ (فلاں نے مجھ سے مدد طلب کی تو میں نے اس کی مدد کی) اس کا اسم الغیاث ہے، یہ جوہری سے منقول ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے آپ نے بیان فرمایا: جب غزوہ بدر کا دن تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تین سو سترہ افراد تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھوں کو پھیلایا اور اپنے کریم رب کی بارگاہ میں التجاء کرنے لگے: ''اے اللہ! میرے لیے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ فرمایا ہے (1)، اے اللہ! تو مجھے وہ عطا فرما جو تو نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 93

جائے گی"۔ پس آپ ﷺ اپنے دست مبارک پھیلا کر اور قبلہ رو ہو کر مسلسل اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے کندھوں سے آپ کی چادر گر گئی، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، انہوں نے آپ کی چادر مبارک اٹھائی اور آپ کے کندھوں پر ڈال دی، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو تھام لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ آپ کا اپنے رب کی بارگاہ میں مناجات کرنا اور التجا کرنا آپ کے لیے کافی ہے، یقیناً وہ عنقریب آپ کو عطا فرمائے گا جس کے بارے اس نے آپ سے وعدہ فرمایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ** پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ آپ ﷺ کی امداد فرمائی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آگے پوری حدیث ذکر کی (1)۔

مُرْدِفِيْنَ دال کے فتحہ کے ساتھ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کی قراءت ہے۔ اور باقیوں نے دال کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل کا صیغہ قرار دیا ہے بمعنی متتابعین (یعنی لگاتار، پے درپے) ہے، یکے بعد دیگرے جماعت آتی رہی اور یہ دکھائی دینے میں زیادہ خوفناک ہے۔ اور دال کے فتحہ کے ساتھ **مُرْدَفِيْنَ** مفعول مالم یسم فاعلہ کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ لوگ جنہوں نے بدر کے دن جنگ لڑی ان کے لیے ایک ہزار فرشتے پے درپے لائے گئے، یعنی کفار کے مقابلے میں ان کی مدد کے لیے ایک ہزار فرشتے ان کی طرف نازل کیے گئے۔ پس مردفین دال کے فتحہ کے ساتھ الف (ہزار) کی صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ **مُمِدُّكُمْ** میں ضمیر منصوب سے حال ہے (تقدیر کلام اس طرح ہوگی) ممدکم فی حالِ إردافکم بألف من الملائكة (میں تمہاری مدد کرنے والا ہوں اس حال میں کہ ایک ہزار فرشتے پے درپے تمہارے پاس آنے والے ہیں) اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ رَدِفَنِی اور أَرْدَفَنِی دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور ابوعبید نے أردف بمعنی رَدِفَ ہونے کا انکار کیا ہے۔

انہوں نے اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی وجہ سے یہ کہا ہے: **تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ** ۞ (النازعات) یہاں المردفة نہیں کہا۔ نحاس اور مکی وغیرہما نے کہا ہے: دال کو مکسور پڑھنا اولیٰ ہے، کیونکہ اہل تاویل اسی قراءت پر تفسیر بیان کرتے ہیں، یعنی أردف بعضهم بعضا (ان میں سے بعض بعض کے ردیف بنے، پیچھے آئے) اس لیے کہ اس میں فتحہ کا معنی موجود ہے جیسا کہ ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے۔ اور اس لیے کہ اکثر قراء اسی پر ہیں۔ سیبویہ نے کہا ہے: بعض نے اسے **مُرَدِّفِين** را کے فتحہ اور دال کے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نے **مُرِدِّفِين** را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے را کے ضمہ کے ساتھ **مُرُدِّفِين** پڑھا ہے۔ ان تینوں قراءتوں میں دال مکسور اور مشدد ہے۔ پس سیبویہ کے نزدیک یہ پہلی قراءت میں یہ اصل میں مرتدفین ہے، پھر تا کو دال میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اسی کی حرکت را کو دے دی گئی ہے تاکہ دو ساکن جمع نہ ہو جائیں۔ اور دوسری قراءت میں التقائے ساکنین کی وجہ سے را کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور تیسری میں میم کے ضمہ کی اتباع کرتے ہوئے را کو ضمہ دیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: رَدِّ و رُدُّ و رُدِّ یا ھذا۔ جعفر بن محمد اور عاصم جحدری نے بآلُفٍ پڑھا ہے یہ الف کی جمع ہے، جیسا کہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 208

فلس کی جمع افلس ہے۔ اور ان دونوں سے بالف بھی منقول ہے۔ اور ملائکہ کے نازل ہونے، ان کے نشان لگانے اور ان کے قتال کرنے کا ذکر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی (آل عمران:126) کی بحث بھی اس میں پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اور مراد امداد ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مراد ارداف (ردیف بنانا، پے درپے بھیجنا) ہو۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران:126) اس میں اس پر متنبہ کیا ہے کہ مدد اور نصرت اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف سے تھی نہ کہ ملائکہ کی طرف سے، یعنی اگر وہ آپ کی مدد نہ فرماتا تو فرشتوں کی کثیر تعداد کے ساتھ بھی نفع حاصل نہ ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد ونصرت تلوار کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور کبھی حجت ودلیل کے ساتھ ہوتی ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

''یاد کرو جب اللہ نے ڈھانپ دیا تمہیں غنودگی سے تاکہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے اور اتارا تم پر آسمان سے پانی تاکہ پاک کردے تمہیں اس سے اور دور کردے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کردے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدموں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اس میں دو مفعول ہیں۔ اور یہ اہل مدینہ کی قراءت ہے اور یہی اچھی ہے، کیونکہ اس میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کا ذکر پہلے وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران:126) کے تحت گزر چکا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس کے بعد وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ ہے اور اس میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ پس اس طرح اغشاء کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے گی تاکہ کلام باہم متوافق اور متشاکل ہو جائے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یغشاکم النعاس پڑھا ہے یعنی فعل کی نسبت نعاس کی طرف کی ہے۔ اس کی دلیل اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى (آل عمران: 154) ہے اس کی قراءت کے مطابق جس نے یا یا تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پس انہوں نے فعل کی اضافت نعاس کی طرف کی ہے یا اَمَنَةً کی طرف۔ اور الأمنة هی نعاس (غنودگی) ہے، پس یہ خبر دی کہ غنودگی وہی ہے جو حق کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور باقیوں نے یغشیکم غین کے یا کے ضمہ فتحہ اور شین کی شد کے ساتھ قراءت کی ہے اور النعاس حضرت نافع کی قراءت کے مطابق نصب کے ساتھ ہے، دو لغتیں غشی اور اغشی کے معنی کے مطابق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاَغْشَيْنٰهُمْ (یاسین:9) اور مزید فرمایا: فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ (النجم) اور مزید فرمایا: كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ (یونس:27) مکی نے کہا ہے: پسندیدہ قراءت یا کے ضمہ، تشدید اور نعاس کی نصب ہے، کیونکہ اس کے بعد أمنة منه ہے اور منه میں ہاء ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، پس وہی وہ ہے جو لوگوں کو غنودگی کے ساتھ ڈھانپ دیتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اکثر قراء اسی پر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أمنة من العدو ہے (یعنی ہا ضمیر کا مرجع عدو ہیں)

اور أمنة مفعول من اجلہ ہے یا مصدر ہے، کہا جاتا ہے: أمن أمنة وأمنا وأمانا یہ سب برابر ہیں۔ اور نعاس (غنودگی اور نیند) اس امن والے کی حالت ہے جسے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اور یہ غنودگی اس رات میں طاری ہوئی جس کی صبح کو جنگ تھی،

پس یہ نیند بھی عجیب تھی کہ اس کے باوجود کہ ان کے سامنے ایک اہم ترین اور مشکل میں ڈال دینے والا امر تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو مربوط اور پرسکون کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ہم میں حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا بدر کے دن کوئی گھوڑ سوار نہ تھا، وہ ابلق گھوڑے پر سوار تھے اور میں نے دیکھا کہ ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ہر کوئی سو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے نیچے نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

ماوردی (1) نے کہا ہے: اس رات نیند کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انہیں راحت و سکون پہنچانے کی دو وجہ تھیں: ان میں ایک یہ تھی کہ انہیں صبح کی جنگ کے لیے راحت اور سکون پہنچا کر طاقتور اور قوی بنانا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے دلوں سے رعب زائل کر کے انہیں امن اور سکون پہنچانا تھا، جیسے کہا جاتا ہے: امن سلا دیتا ہے اور خوف جگا دیتا ہے۔ الأمنُ مُنِيمٌ والخوف مُسْهِرٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ کریم نے انہیں دو لشکروں کے ملنے کی حالت میں (مراد حالت جنگ) انہیں ڈھانپ دیا۔ اور اس کی مثل گفتگو غزوہ احد کے بیان میں سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ ظاہر قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ غنودگی بارش سے پہلے طاری ہوئی۔ اور ابن ابی نجیح نے کہا ہے: بارش نیند سے پہلے ہوئی۔ زجاج نے بیان کیا ہے (2) کہ کفار بدر کے دن مومنین سے پہلے بدر کے پانی کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈالا۔ اور مومنین اس حال میں باقی رہ گئے کہ ان کے لیے کوئی پانی نہ تھا، پس ان کے نفوس گھبرا گئے اور وہ پیاس محسوس کرنے لگے اور جنبی ہوئے اور وہ اسی طرح نمازیں پڑھنے لگے۔ تو بعض نے اپنے دلوں میں شیطان کے وسوسے ڈالنے کے سبب کہا: ہم گمان کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور ہم میں اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں اور ہماری حالت یہ ہے اور مشرکین پانی پر قابض ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے سترہ رمضان المبارک غزوہ بدر کی رات اتنی بارش برسائی یہاں تک کہ وادیاں بھر کر بہنے لگیں۔ اور انہوں نے جی بھر کر پانی پیا، غسل اور طہارت کا اہتمام کیا اور اپنے اونٹوں کو خوب سیراب کیا۔ اور ان کے اور مشرکین کے درمیان جوریت اور دلدل تھی وہ خوب جم گئی، یہاں تک کہ جنگ کے وقت اس میں مسلمانوں کے پاؤں خوب جمے رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ احوال ان کے بدر پہنچنے سے پہلے تھے۔ اور یہی اصح ہے۔

اور یہی وہ ہے جسے ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں اور دوسروں نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ اس کا خلاصہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوسفیان کے بارے خبر دی گئی کہ وہ شام سے آ رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ان کی طرف ابھارا اور فرمایا: ”یہ قریش کا قافلہ ہے اس میں وافر اموال ہیں پس تم ان کی طرف نکلو شاید اللہ تعالیٰ یہ اموال تمہیں بطور غنیمت عطا فرما دے“۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک تھوڑی سی جماعت اٹھی اور قوم نے بوجھ محسوس کیا اور نکلنا ناپسند کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت تیزی کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے جس نے کوئی عذر پیش کیا اور نہ اس کا انتظار کیا جس کا اونٹ غائب تھا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہاجرین وانصار میں سے

1۔ تفسیر ماوردی، صفحہ 299

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 500

تین سو تیرہ اصحاب کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ اور بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: بدر کے دن مہاجرین کی تعداد اسی سے کچھ زائد تھی۔ اور انصار کی تعداد دو سو چالیس سے کچھ اوپر تھی۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ ہی سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ہم گفتگو کرتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو دس سے کچھ زائد تھی اور یہ طالوت کے ان ساتھیوں کی تعداد کے برابر تھی جنہوں نے اس کے ساتھ دریا کو عبور کر لیا تھا اور اس کے ساتھ سوائے مومن کے کسی نے عبور نہیں کیا تھا۔ اور علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: پس ہم بدر کی طرف نکلے، جب ہم نے ایک یا دو دن کا سفر کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا کہ ہم اپنی تعداد شمار کریں چنانچہ ہم نے ایسا کیا تو ہم تین سو تیرہ افراد تھے، ہم نے اپنی تعداد کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا تو آپ اس پر بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''یہ اصحاب طالوت کی تعداد تھی''(1)۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: ان تمام لوگوں کا گمان یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ نہیں لڑیں گے پس انہوں نے زیادہ تیاری نہ کی۔ اور ابوسفیان جس وقت حجاز کے قریب پہنچا تو وہ خبریں لینے لگا اور جس سوار سے ملاقات ہوتی اس سے حالات کے بارے پوچھتا، کیونکہ اسے لوگوں کے مال پر خوف لاحق ہو گیا تھا، یہاں تک کہ بعض سواروں سے اسے یہ خبر پہنچی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لیے لوگوں کو جمع کیا ہے (اور جنگ پر ابھارا ہے) تو وہ اس سے ڈر گیا اور اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو اجرت پر لیا اور اسے مکہ بھیجا اور اسے یہ حکم دیا کہ وہ قریش کے پاس جائے اور انہیں اپنے اموال (کی حفاظت) کے لیے جمع کرے اور انہیں یہ خبر دے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس کے لیے رکاوٹ ہیں۔ پس ضمضم نے ایسا ہی کیا۔ تو اہل مکہ ایک ہزار یا اسی طرح کی تعداد میں نکلے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ نکلے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے بارے خبر موصول ہوئی کہ وہ اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے نکل پڑے ہیں۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ کیا، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور بہت اچھی گفتگو کی، پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اٹھے اور آپ نے بھی انتہائی خوبصورت گفتگو کی، پھر حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ وہ کیجئے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، قسم بخدا! ہم اس طرح نہیں کہیں گے جیسے بنی اسرائیل نے کہا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ) (پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو (ان سے) ہم تو یہاں ہی بیٹھیں گے)

ولکن إذهب انت و ربك فقاتلا إنا معكم مقاتلون (بلکہ آپ چلیں اور آپ کا رب اور دونوں جنگ لڑیں بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ لڑیں گے) اور قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے آپ برک الغماد یعنی شہر حبشہ تک چلیں، ہم وہاں تک تمہاری معیت میں لڑیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت خوش ہوئے اور انہیں دعا خیر سے نوازا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو''۔ آپ کی مراد انصار تھے۔ اس لیے کہ وہی لوگ زیادہ تعداد میں تھے اور انہوں نے جس

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 564

وقت عقبہ پر آپ کی بیعت کی تھی تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہم آپ کی حفاظت اور ذمہ سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے شہر میں تشریف لے آئیں، پس جب آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے۔ ہم آپ کی ہر اس شے سے حفاظت کریں گے جس سے ہم اپنی، اپنی اولاد، اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خوف محسوس فرما رہے تھے کہ انصار یہ رائے نہ رکھتے ہوں کہ ان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت کرنا صرف مدینہ طیبہ میں لازم ہے اور ان پر یہ لازم نہیں کہ آپ انہیں ساتھ لے کر ان کے شہروں سے باہر دشمن کی طرف چل پڑیں۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو ان میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور بعض نے کہا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دن ان دونوں نے گفتگو کی ہو۔ عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ ہم گروہ انصار کا ارادہ فرما رہے ہیں؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''۔ تو انہوں نے عرض کی: بے شک ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور ہم نے آپ کی اتباع اور پیروی کی، آپ وہ کیجئے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ ہمیں اس سمندر تک لے چلیں اور پھر آپ اس میں کود جائیں تو یقیناً ہم آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امضوا علی برکۃ اللہ فکأنی أنظر الی مصارع القوم (تم اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ چلو گویا میں قوم کے گرنے کی جگہوں کی طرف دیکھ رہا ہوں)

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے اور بدر کے پانی تک قریش سے پہلے جا پہنچے۔ اور قریش کو پہلے پہنچنے سے اس موسلا دھار بارش نے روکا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمائی اور مسلمانوں پر صرف اتنی مقدار میں برسی جس نے ان کے لیے وادی کی نرم ریت کو سخت اور مضبوط کر دیا اور چلنے میں ان کی معاون ثابت ہوئی۔ الدھس سے مراد ایسی نرم ریت ہے جس میں پاؤں دھنس جاتے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے پانیوں میں سے مدینہ طیبہ کی جانب قریب تر پانی کے پاس اتر پڑے۔ تو حضرت حباب بن منذر بن عمرو بن جموح نے اس کے سوا کی طرف اشارہ کیا اور آپ سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس منزل کے بارے آپ کی کیا رائے ہے، کیا یہ ایسی منزل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اترنے کا حکم فرمایا اور ہمارے لیے اس جگہ سے آگے پیچھے ہونا جائز نہیں یا پھر یہ رائے اور جنگی چال ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(نہیں) بلکہ یہ رائے، جنگ اور تدبیر ہے''۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ یہ آپ کے لیے اترنے کی جگہ مناسب اور موزوں نہیں ہے، پس ہمیں اٹھا کر اس قوم کے قریب تر پانی کے پاس لے چلیں ہم وہاں پڑاؤ ڈالیں گے اور اس کے پیچھے جو کنوئیں ہیں ہم انہیں بند کر دیں گے، پھر ہم وہاں حوض بنالیں گے اور اسے پانی سے بھر دیں گے نتیجۃً ہم پانی پئیں گے اور وہ نہیں پی سکیں گے۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس رائے کو مستحسن قرار دیا اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ پھر دشمن سے مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مدد اور نصرت فرمائی، آپ نے ستر مشرکین کو قتل کیا اور ان میں سے ستر کو قیدی بنالیا اور ان سے مومنین کا انتقام لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں کو ان کے غیظ و غضب سے شفا عطا فرمائی۔ (اور انہیں ٹھنڈا کیا)

اور اسی بارے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

عَرفتُ دیار زینب بالکثِیب کخطّ الوحیِ فی الورَق القشِیبِ

میں نے ٹیلے پر زینب کے گھر کو اس طرح پہچان لیا جس طرح بوسیدہ کاغذ پر تحریر کے خط کو پہچان لیا جاتا ہے۔

تداولُها الریاح وکلّ جَوْنٍ من الوَسْمِیّ منهمِرٍ سَکُوبِ

ان گھروں پر ہوائیں چلتی ہیں اور موسم بہار کا ہر سیاہ بادل لگا تار اور موسلا دھار برستا ہے۔

فأمسی رُبعُها خلقا وأمست یبابا بعد ساکنها الحبیب

پس ان کے نشان بوسیدہ ہو گئے اور وہ اجڑے پڑے ہیں جب کہ پہلے کبھی وہاں محبوب رہتا تھا۔

فدع عنك التذکّر کلّ یوم ورُدّ حرارة الصدر الکئیب

پس تو ہر روز ان کو یاد کرنا چھوڑ دے اور اپنے غمزدہ سینے کی حرارت کو ختم کر دے۔

وخبّرِ بالذی لا عیب فیه بِصدق غیرِ إخبارِ الکذوبِ

اور ان جھوٹے قصوں کی اخبار کو چھوڑ کر اس سچی بات کی خبر دے جس کے سنانے میں کوئی حرج نہیں۔

بما صنع الإله غداۃ بدرٍ لنا فی المشرکین من النصیب

سنا کہ خداوند (مقتدر) نے ہمیں بدر کے دن مشرکین پر کامیابی عطا فرمائی

غداۃ کأن جمعهم حِراءٌ بدت أرکانه جُنُحَ الغروب

وہ دن جب ان کا گروہ کوہ حرا کی طرح معلوم ہوتا تھا لیکن ان کی بنیادیں زوال کے وقت جھک گئیں۔

فلاقیناهُم منّا بجمع کأسد الغاب مردانٍ و شِیبِ

ہم نے ایک ایسی جماعت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جس کے بوڑھے اور جوان سب جنگل کے شیر تھے۔

أمام محمّد قد وازروہ علی الأعداء فی لَفح الحروب

وہ جماعت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی جس نے جنگ کی لپیٹ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی۔

بأیدیهم صوارِم مرهفات وکلّ مجربٍ خاظِی الکعُوب

ان کے ہاتھوں میں پتلی اور تیز دھار والی تلواریں اور موٹی موٹی گرہوں والے آزمودہ نیزے تھے۔

بنو الأوسِ الغطارِفُ وازرتها بنو النجار فی الدّین الصلیب

وہ سرداران بنو اوس تھے جنہیں دین محکم میں بنو نجار نے مدد دی تھی۔

فغادرْنا أبا جهل صریعا وعتبةَ قد ترکنا بالجَبُوب

پس ہم نے ابو جہل کو بچھاڑا ہوا اور عتبہ کو سخت زمین پر پڑا ہوا چھوڑا۔

وشیبةَ قد ترکنا فی رجال ذوِی حسب إذا نسبوا حسیبِ

اور شیبہ کو ایسے لوگوں میں چھوڑا جن کے نسب جب بیان کیے جائیں تو وہ بڑے نسب والے نکلیں۔

يناديهم رسول الله لما قذفناهم كباكِبَ فى القليب

جب ہم نے انہیں جتھوں کی صورت میں کنوئیں میں ڈالا تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ندا دے رہے تھے۔

ألم تجِدوا كلامِىَ كان حقا وأمْرُالله يأخذ بالقلوب

کیا تم نے نہیں پایا کہ میری بات سچ تھی اور الله کا حکم دلوں کو (بھی) پکڑ لیتا ہے۔

فما نطقوا ولو نطقوا لقالوا أصبتَ وكنتَ ذارأى مصيب

وہ کچھ نہ بولے اور اگر وہ بولتے تو کہتے کہ آپ نے سچ کہا تھا اور آپ ہی صحیح رائے والے تھے۔

اور یہاں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: تم میں اہل بدر کیسے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ ہم میں انتہائی عظیم اور اچھے لوگ ہیں''۔ تو انہوں نے کہا: ''بلا شبہ وہ ہمارے درمیان بھی اسی طرح ہیں'' (1)۔ تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ مخلوقات کا شرف و عظمت ان کی ذاتوں کے سبب نہیں ہوتا، بلکہ ان کے افعال کے سبب ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کے افعال شریفہ دائمی تسبیح و تحمید پر مواظبت اختیار کرنا ہے۔ اور ہمارے افعال کا شرف اطاعت و بندگی میں اخلاص پیدا کرنے کے ساتھ ہے۔ اور طاعات کی افضیلت شریعت کے انہیں فضیلت دینے کے ساتھ ہے اور ان میں سب سے افضل جہاد ہے اور افضل ترین جہاد یوم بدر ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد (اور مضبوطی) اسی پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ کی راہ روکنے کے لیے نکلنا اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت کے حصول کے لیے لشکر لے کر نکلنا جائز ہے، کیونکہ یہ کسب حلال ہے۔ اور یہ اسے رد کرتا ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے، جب کہ انہوں نے کہا ہے: یہ جنگ دنیا کے حصول کے لیے ہے۔ اور یہ جو روایت ہے کہ جس نے اس لیے قتال کیا تا کہ الله تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو تو وہ الله تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والا ہے اور یہ اس کے سوا ہے جو مال غنیمت کے حصول کے لیے قتال کرتا ہے، تو اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس کا قصد اور ارادہ صرف یہی ہو اور اس میں دین کا کوئی حصہ نہ ہو۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر سے فارغ ہوئے تو انہوں (صحابہ کرام) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ پر قافلے کو پکڑنا لازم ہے، اس کے سوا کوئی شے نہیں۔ تو عباس نے انہیں ندا دی اور وہ اس وقت قیدیوں میں تھے۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا''۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''وہ کیوں''؟ انہوں نے کہا: کیونکہ الله تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کا آپ کے ساتھ وعدہ فرمایا، تحقیق الله تعالیٰ نے آپ کو وہ عطا فرما دیا جس کا اس نے آپ سے وعدہ فرمایا۔ تو حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا ہے'' (2) اور حضرت عباس کو اس کا علم حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، جلد 2، صفحہ 387　　2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی باتوں سے اور جو بدر کا معاملہ ہوا اس سے ہوا۔ پس انہوں نے اسے دوران گفتگو سنا۔

مسئلہ نمبر 3۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک مقتولین بدر کو چھوڑے رکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب کھڑے ہوئے اور انہیں ندا دی اور فرمایا: ''اے ابا جہل بن ہشام، اے امیہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ کیا تم نے اسے سچ نہیں پایا جو تمہارے رب نے وعدہ کیا بلاشبہ میں نے تو اسے سچ پا لیا ہے جو میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا الیس قد وجدتم ما وعد ربکم حقًا فانی قد وجدتُ ما وعدنی ربی حقًا (1) پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول سنا تو عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے سن سکتے ہیں اور وہ کیونکر جواب دے سکتے ہیں حالانکہ وہ مردار ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ما أنتم بأسمع لما أقول منھم ولکنھم لا یقدرون أن یجیبوا (قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میرا قول تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے لیکن وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے)

بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے حکم دیا پس انہیں گھسیٹا گیا اور انہیں بدر کے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ جیفوا جیم اور یا کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی ہے وہ بدبودار ہو گئے اور مردار بن گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول: یسمعون کا اطلاق اس پر بعید ہے جس کے مطابق عادت جاریہ ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیا کہ وہ زندوں کے سننے کی طرح سن رہے ہیں۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ موت نہ عدم محض ہے اور نہ صرف فنا ہے، بلکہ یہ تو روح کے تعلق کا بدن سے منقطع ہونا اور اس سے جدا ہونا ہے اور یہ ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی ہے۔ اور حالت کا تبدیل ہونا اور ایک دار سے دوسرے دار کی طرف منتقل ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إن المیّت إذا وضع فی قبرہ وتولی عنہ أصحابہ أنہ یسمع قرع نعالھم، الحدیث (2) (بے شک میت کو جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے واپس آتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا ہے) أخرجہ الصحیح۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ اس میں بہ میں ضمیر اس پانی کی طرف لوٹ رہی ہے جس نے وادی کی نرم ریت کو سخت کر دیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ربط القلوب (دلوں کو مضبوط کرنا) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس تثبیت الأقدام سے مراد میدان جنگ میں مدد و نصرت کا حاصل ہونا ہے۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾

''یاد کرو جب وحی فرمائی آپ کے رب نے فرشتوں کی طرف کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس تم ثابت قدم رکھو ایمان والوں کو، میں ڈال دوں گا کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب سو تم مارو (ان کی) گردنوں کے اوپر اور چوٹ لگاؤ ان کے ہر بند پر''۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ انفال، جلد 2، صفحہ 134
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، جلد 2، صفحہ 386

قولہ تعالیٰ: اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ، اِذْ میں عامل یُثَبِّتَ ہے یعنی یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ذالك الوقت (وہ اس وقت اس کے ساتھ قدموں کو جما دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عامل لیربط ہے ای ولیربط إذ یوحی (اور تاکہ مضبوط کردے (دلوں کو) جب اس نے وحی فرمائی) اور تقدیر عبارت ہوگی: أذکر (یاد کرو) اور اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ محل نصب میں ہے اور معنی ہے بانی معکم یعنی مدد و نصرت کے ساتھ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ معکم عین کے فتحہ کے ساتھ ظرف ہے اور جنہوں نے اسے ساکن پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ حرف ہے۔ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی تم انہیں بشارت دو مدد و نصرت کی یا ان کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کی یا بغیر جنگ کے ان کے ساتھ حاضر رہنے کی، پس فرشتہ صف کے آگے آدمی کی صورت میں چلتا رہا اور یہ کہتا رہا: چلو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اور مسلمان یہ گمان کرتے رہے کہ وہ ان میں سے ہے۔ تحقیق آل عمران میں یہ گزر چکا ہے کہ ملائکہ نے اس دن قتال کیا۔ پس انہوں نے کئی سروں کو گردنوں سے الگ ہوتے دیکھا اس کے بغیر کہ کوئی ظاہر مارنے والے انہیں ضرب لگاتے، بعض نے کہنے والے کو سنا کہ اس کا یہ قول سنائی دے رہا ہے لیکن اس کا سراپا نظر نہیں آرہا۔ أقدم حیزوم (حیزوم آگے بڑھو) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس تثبیت (ثابت قدمی) سے مراد رسول اللہ ﷺ کا مومنین کی مدد کے لیے فرشتوں کے نازل ہونے کا ذکر کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ اس کا بیان پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ یہ امر (حکم) ملائکہ کو ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امر مومنین کے لیے ہے۔ یعنی اضربوا الأعناق (تم گردنیں مار دو یعنی قتل کرو) اور لفظ فوق زائدہ ہے۔ یہ اخفش، ضحاک اور عطیہ نے کہا ہے۔ اور مسعودی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں اس لیے نہیں مبعوث کیا گیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا عذاب دوں بلکہ مجھے تو گردنوں کو مارنے اور بیڑیاں باندھنے کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ إنّی لم أبعث لأعذب بعذاب الله وإنما بعثتُ بضرب الرقاب وشدّ الوثاق (1)

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ فوق معنی کا فائدہ دے رہا ہے پس اسے زائدہ بنانا جائز نہیں ہے، البتہ معنی یہ ہے کہ ان کے لیے چہروں اور ان کے قریبی اعضاء پر مارنے کو مباح قرار دیا گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد ہر سر اور کھوپڑی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد گردنوں سے اوپر والا حصہ ہے اور وہ سر ہیں۔ یہ عکرمہ نے کہا ہے (2)۔ اور سر پر ضرب لگانا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ ادنیٰ شے بھی دماغ میں اثر کر جاتی ہے۔ اور اس معنی میں سے کچھ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور یہ کہ فوق زائدہ نہیں ہے۔ یعنی قول باری تعالیٰ: فَوْقَ اثْنَتَیْنِ (النساء: 11) کے تحت یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ زجاج نے کہا ہے: بنان کی واحد بنانۃ ہے اور یہاں ان سے مراد انگلیاں اور ان کے علاوہ دیگر اعضاء ہیں۔ اور البنان ان کے اس قول سے مشتق ہے: ابن الرجل بالمکان ((جب کوئی آدمی کسی جگہ مقیم ہو جائے تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)) پس بنان کا لفظ ہر اس شے کے لیے بولا جاتا ہے جو اقامت اور حیات کے لیے ہوتی ہے۔

1۔ کنز العمال، کتاب الحدود و محظوراته، جلد 5، صفحہ 393، حدیث نمبر 13391، مکتبۃ التراث الاسلامی

2۔ تفسیر طبری، سورۂ انفال، جلد 9، صفحہ 234، دار احیاء التراث العربیۃ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں بنان سے مراد دونوں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے پورے ہیں (1)۔ اور یہ جنگ میں ثابت رہنے اور محل ضرب سے عبارت ہے، کیونکہ جب پوروں پر ضرب لگائی جائے تو مضروب لڑنے کے قابل نہیں رہتا بخلاف دیگر تمام اعضاء کے (کہ ان پر ضرب لگنے کے باوجود مضروب جنگ جاری رکھ سکتا ہے)

جیسا کہ عنترہ نے کہا ہے:

وكان فَتَى الهَيْجاء يحمِي ذِمَارها ويضرب عند الكَرْب كلّ بنَانِ

اس سے مراد انگلیوں کے پورے ہیں۔

اور عنترہ کے قول میں بنان بمعنی انگلیاں بھی ہیں:

وأنّ الموت طوع يدى إذا ما وصلت بَنانَها بالهِنْدُوَانِي

اور یہ معنی کہ بنان بمعنی انگلیاں عرب کے اشعار میں کثرت سے موجود ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: البنان سے مراد انگلیاں ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: مراد انگلیوں کے پورے ہیں۔

اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام بنان رکھا گیا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ ان احوال کی اصلاح ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان قرار حاصل کرتا ہے اور اقامت اختیار کرتا ہے۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: البنان سے مراد اعضائے بدن کے تمام جوڑ ہیں (2)۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝

"یہ حکم اس لیے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جو مخالفت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (اے حق کے دشمنو!) یہ سزا ہے، پس چکھو اسے، نیز (یاد رکھو) کافروں کے لیے آتش (جہنم) کا عذاب بھی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ، ذٰلِكَ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تقدیر کلام ہے: ذالك الأمر، یا الأمر ذالك (یہ حکم اس لیے ہے) شَآقُّوا اللّٰهَ یعنی انہوں نے اللہ کے اولیاء (اور دوستوں) کی مخالفت کی ہے۔ اور الشقاق کا معنی ہر ایک کا مشقت میں پڑنا ہے (یا ہر ایک کا ایک طرف اور کنارہ میں ہو جانا ہے) یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ زجاج نے کہا ہے: ذالکم، الآمر یا القصہ مضمر ماننے کے سب مرفوع ہے۔ یعنی الأمر ذالکم فذوقوہ (معاملہ اور قصہ یہ ہے پس چکھو اسے) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذوقوا (فعل کا مفعول ہونے) کے سبب محل نصب میں ہو، جیسے تمہارا یہ قول: زیدا فاضربہ۔ اور کلام کا معنی کافروں کو جھڑکنا اور زجر و توبیخ کرنا ہے۔ اور وان، ذلکم پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو بمعنی وبأن للکافرین۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ انفال، جلد 9، صفحہ 235، دار احیاء التراث العربیۃ
2۔ تفسیر طبری، سورۂ انفال، جلد 9، صفحہ 235

انہوں نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہاں واعلموا ان مضمر مان لیا جائے۔ زجاج نے کہا ہے: اگر واعلموا کو مضمر ماننا جائز ہے تو پھر زید منطلق و عمرا جالسا بھی جائز ہے، بلکہ ابتدا میں زیدا منطلقا کہنا جائز ہو، کیونکہ خبر دینے والا معلم ہے اور نحویوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۶﴾

''اے ایمان والو! جب تم مقابلہ کرو کافروں کے لشکر جرار سے تو مت پھیرنا ان کی طرف (اپنی) پیٹھیں۔ اور جو پھیرے گا ان کی طرف اس روز اپنی پیٹھ بجز اس صورت کے کہ پینترا بدلنے والا ہو لڑائی کے لیے یا پلٹ کر آنے والا ہو اپنی جماعت کی طرف تو وہ مستحق ہوگا الله کے غضب کا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: زَحْفًا الزحف، الدنو قلیلا قلیلا یعنی اس کا معنی ہے آہستہ آہستہ قریب ہونا، آگے بڑھنا۔ اور اس کا اصل معنی ہے الإندفاع علی الألیة (سرین کے بل گھسٹ کر آگے بڑھنا) پھر جنگ میں آخر تک ہر چلنے والے کو زاحف کا نام دیا گیا ہے۔ اور التزاحف کا معنی ہے: باہم ایک دوسرے کے قریب ہونا۔ کہا جاتا ہے: زحف الی العدو زحفا (وہ دشمن کی طرف انتہائی قریب ہوگیا) اور ازدحف القوم کا معنی ہے ان میں سے بعض بعض کی طرف چلے۔ اور اسی سے زحاف الشعر بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دو حرفوں کے درمیان سے ایک حرف ساقط ہو جائے اور اس طرح ان میں سے ایک دوسرے کے قریب ہو جائے۔ پس رب کریم فرما رہا ہے: جب تم ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگو تو پھر تم ان سے مت بھاگو اور نہ تم ان کی طرف اپنی پیٹھیں کرو۔ الله تعالیٰ نے اسے مومنوں پر اس وقت حرام قرار دیا جب ان پر جہاد اور کافروں کا قتال فرض کیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ادبار، دبر کی جمع ہے۔ اس آیت میں لفظ دبر وضاحت کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بھاگنے والے پر اظہار ناپسندیدگی کے لیے اور اس کی مذمت بیان کرنے کے لیے ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں الله عزوجل نے حکم دیا ہے کہ مومنین کفار کے سامنے پیٹھ نہ پھیریں اور یہ امر اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ مومنین کے مقابلے میں دشمن کی تعداد دو مثل تک ہو، پس مومنین کا لشکر مشرکین کے ایسے لشکر کے مقابلہ میں ہو جس کی تعداد مومنین سے دوگنا تک ہو تو پھر فرض ہے کہ وہ اس کے سامنے سے نہ بھاگیں۔ پس جو کوئی دو کے مقابلے سے بھاگا تو وہ لشکر سے بھاگنے والا شمار ہوگا۔ اور جو کوئی تین کے مقابلہ سے بھاگا تو وہ لشکر سے بھاگنے والا نہ ہوگا، اور وعید اس کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔ اور فرار گناہ کبیرہ ہے، ہلاک کرنے والا ہے۔ یہ ظاہر قرآن سے اور اکثر ائمہ کے اجماع سے ثابت ہے (2)۔ ایک جماعت ان میں سے ابن ماجشون ہیں ''الواضحہ'' میں کہا ہے: بے شک ضعف، قوت اور تعداد کی رعایت کی

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ انفال، جلد 2، صفحہ 510 دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

جائے گی، پس ان کے قول کے مطابق ایک سو گھڑ سوار کا ایک سو گھڑ سوار کے مقابلے سے بھاگنا بھی جائز ہے جب کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ مشرکین کے پاس موجود قوت وطاقت ان کی قوت وطاقت سے کئی گنا ہے، لیکن جمہور کے قول کے مطابق ایک سو کا فرار اختیار کرنا حلال نہیں ہوگا مگر تبھی جب کفار کی تعداد دو سو سے زائد ہو، پس جب ایک مسلمان کے مقابلے میں دو سے زیادہ ہوں تو پھر پسپائی اختیار کرنا جائز ہوتا ہے، لیکن ڈٹ جانا اور استقامت اختیار کرنا احسان ہے۔ مؤتہ کی جنگ میں تین ہزار کا لشکر دو لاکھ کے مقابلے میں کھڑا رہا، ان میں سے ایک لاکھ رومی تھے اور ایک لاکھ لخم اور جذام کے مستعربہ تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: فتح اندلس کی تاریخ میں یہ موجود ہے کہ طارق مولیٰ موسیٰ بن نصیر سترہ سو افراد کے ساتھ لے کر اندلس کی طرف چلا اور یہ رجب 93ھ کا واقعہ ہے، پس اس کا اور شاہ اندلس لذریک کے درمیان مقابلہ ہوا اس کے ساتھ ستر ہزار گھڑ سوار تھے۔ پس طارق نے اس کے ساتھ جنگ لڑی اور اس کے مقابلے میں ڈٹ گیا تو اللہ تعالیٰ نے لذریک کی متکبر فوج کو شکست سے دوچار کیا اور طارق کو فتح وسرفرازی عطا فرمائی۔

ابن وہب نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے ایسی قوم کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جو دشمن کے مقابلے میں ہوتے ہیں یا وہ کسی قلعے میں محصور اور محفوظ ہوتے ہیں پھر ان کا دشمن ان پر چڑھائی کر دیتا ہے اور ان کی تعداد قلیل اور تھوڑی ہے، کیا وہ جنگ لڑیں گے یا پیٹھ پھیر کر واپس جائیں گے اور اپنے ساتھیوں کو اس بارے آگاہ کریں گے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر وہ جنگ کرنے اور لڑنے کی قوت رکھتے ہوں تو وہ ان کے ساتھ قتال کریں گے، ورنہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ جائیں گے اور انہیں اس پر آگاہ کریں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ لوگوں کا اس بارے اختلاف ہے کہ کیا جنگ کے دوران فرار اختیار کرنا بدر کے دن کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ حکم قیامت تک ہونے والی جنگوں کو عام ہے؟ تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ حکم صرف یوم بدر کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی قول نافع، حسن، قتادہ، یزید بن ابی حبیب اور ضحاک کا ہے(1)۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ یہ حکم اہل بدر کے ساتھ خاص ہے، پس ان کے لیے پسپائی اختیار کرنا جائز نہیں اور اگر انہوں نے پسپائی اختیار کی تو یقیناً انہوں نے مشرکین کے لیے پسپائی اختیار کی اور اس وقت ان کے سوا مسلمان نہ تھے اور نہ کوئی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی مسلمانوں کا لشکر تھا۔ تو رہا اس کے بعد کا زمانہ تو اس میں بعض دوسرے بعض کا لشکر تھے۔ الکیا نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں بہت سے انصار تھے جنہیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خروج کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ ان کا خیال تھا کہ یہ جنگ ہوگی، بلکہ ان کا گمان تو یہ تھا کہ یہ ایک قافلہ ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی لوگوں کے ہمراہ نکل پڑے جو قلیل تعداد میں آپ کے ساتھ تھے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام علماء سے روایت ہے کہ اس آیت (کا حکم) یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے(2)۔

اور پہلے گروہ نے اس سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد یومئذ سے بھی اور کہا ہے: کہ یہ اشارہ یوم بدر کی طرف ہے اور یہ کہ آیت کا حکم آیۃ الضعف سے منسوخ ہے اور لشکر سے فرار کا حکم باقی ہے لیکن وہ گناہ کبیرہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 238 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 843، سورۂ انفال، دار الفکر

نہیں ہے۔ تحقیق لوگ غزوۂ احد کے دن بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا اور غزوۂ حنین کے دن ان کے بارے میں فرمایا: ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ (التوبہ) (پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے) اور اس پر کوئی عتاب واقع نہیں ہوا۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ اس یوم الزحف کی طرف اشارہ ہے جسے قول باری تعالیٰ: اِذَا لَقِيْتُمْ متضمن ہے اور آیت کا حکم یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے بشرطیکہ تعداد اتنے گنا موجود ہو جسے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے اور اس آیت میں نسخ نہیں ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ آیت، قتال کے بعد، جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد اور جو کچھ اس دن میں ہوا اس کے ساتھ دن کے گزر جانے کے بعد نازل ہوئی۔ یہی موقف امام مالک، امام شافعی رحمہما اللہ اور اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اجتناب کرو اور ان میں ایک والتولی یوم الزحف (1) (میدان جہاد سے پیٹھ پھیرنا بھی ہے) اور یہ اس مسئلہ میں نص ہے۔ اور رہا احد کا دن! تو بلاشبہ لوگ اپنے سے دوگنا سے زیادہ لوگوں سے بھاگے اور اس کے باوجود ہلاکت اور مشقت میں پڑے۔ اور جہاں تک غزوۂ حنین کا تعلق ہے تو اسی طرح اس میں بھی وہی بھاگا جسے کثرت اور زیادتی کا انکشاف ہوا، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن القاسم نے کہا ہے: اس کی شہادت جائز نہیں ہوتی جو لشکر سے بھاگ آئے اور نہ ہی لشکریوں کے لیے فرار جائز ہوتا ہے اگرچہ ان کا امام (سالار) بھاگ جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ، الآیہ (اور جو پھیرے گا ان کی طرف اس روز اپنی پیٹھ) فرمایا: اگر مقابل لشکر کی تعداد دوگنا سے زیادہ ہو تو پھر فرار جائز ہوتا ہے۔ اور یہ تب ہے جب مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تک نہ پہنچے اور اگر بارہ ہزار تک پہنچ جائے تو پھر ان کے لیے فرار جائز نہیں اگرچہ مشرکین کی تعداد دوگنا سے زائد ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ولن يغلب اثنا عشر الفا من قلة (2) تعداد بارہ ہزار ہو تو اس پر قلت کے سبب ہرگز غلبہ نہیں پایا جاسکتا) اکثر اہل علم نے اس حدیث کے ساتھ آیت کے عموم میں سے اس عدد کو خاص کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابوالبشر اور ابوسلمہ العاملی جو کہ حکم بن عبداللہ بن خطاف ہیں نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث متروک ہے۔ ان دونوں نے بیان کیا ہے: زہری نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اکثم بن جون اپنی قوم کے سوا کے ساتھ مل کر جہاد کر وہ تیرے اخلاق کو اچھا کر دے گا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کرم اور مہربانی کا سلوک کرو۔ اے اکثم بن جون بہترین دوست چار ہیں، ہراول دستے کی بہترین اور اچھی تعداد چالیس ہے، سرایا میں سے بہترین وہ ہے جو چار سو افراد پر مشتمل ہو اور لشکروں میں سے بہترین وہ ہے جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہو اور بارہ ہزار کو قلیل ہرگز نہیں قرار دیا جائے گا'' (3)۔ اور امام مالک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 64　　2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 294

3۔ کنز العمال، فی آداب الجہاد، جلد 4، صفحہ 359-358

رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت ہے وہ ان کے مذہب کے مطابق اس پر دلالت کرتی ہے اور وہ عمری العابد (اس سے مراد عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز بن عمر بن خطاب ہے یہ اپنے اہل زمانہ میں بہت زیادہ زاہد اور پرہیزگار تھے) کے لیے آپ کا قول ہے کہ جب انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ کے نزدیک اس کے خلاف جہاد ترک کرنے کی گنجائش ہے جو احکام کو بدل دے، ان میں تغیر پیدا کر دے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تیرے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر ہو تو پھر تیرے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کوئی میدان جہاد سے بھاگ جائے تو پھر اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بلال بن یسار بن زید سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: مجھے میرے باپ نے میرے دادا سے حدیث بیان کی ہے انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: من قال أستغفر الله الذی لا إله إلّا هو الحیّ القیّوم وأتوب إلیه غفر الله له وإن کان قد فرّ من الزحف (1) (جس کسی نے کہا میں اس اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے اور میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا اگرچہ وہ لشکر سے بھاگا ہی ہو) فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں پہچانتے مگر صرف اسی سند سے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ، التحرف کا معنی ہے جهة استواء سے زائل ہو جانا، سیدھی جہت سے ایک طرف ہو جانا، پس جنگی چال کے لیے ایک جانب سے دوسری جانب ہٹ جانے والا شکست خوردہ نہیں ہوتا، اسی طرح پلٹنے والا جب مسلمانوں کی جماعت کی طرف پلٹنے کی نیت کرے تا کہ وہ ان سے مدد طلب کرے اور پھر جنگ کی طرف لوٹ آئے وہ بھی شکست خوردہ نہیں ہوتا۔ ابوداؤد نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرایا میں سے ایک سریہ میں تھے انہوں نے بیان کیا: پس لوگ ارد گرد گھومنے لگے اور میں بھی ان ارد گرد گھومنے والوں میں سے تھا (مقصود راہ فرار کی تلاش تھی) وہ کہتے ہیں: جب ہم ظاہر ہو گئے، ہم نے کہا: ہم کیا کریں گے، حالانکہ ہم لشکر سے فرار ہیں اور ہم غضب کے ساتھ پلٹے بھی ہیں۔ تو ہم نے کہا: ہم مدینہ طیبہ میں داخل ہوں گے اور اسی میں ٹھہرے رہیں گے اور ہم چلے جائیں گے اور ہمیں کوئی بھی نہیں دیکھے گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس ہم داخل ہوئے اور ہم نے کہا: اگر ہم اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کر دیں۔ اگر تو ہمارے لیے توبہ ہوئی تو ٹھہر جائیں گے، وگرنہ ہم واپس چلے جائیں گے (جنگ کی طرف لوٹ جائیں گے) فرماتے ہیں: پس ہم فجر کی نماز سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں بیٹھ گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو ہم آپ کے احترام کے لیے کھڑے ہو گئے اور عرض کی: ہم (اپنے لشکر سے) فرار ہو کر آنے والے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: لا بل انتم العکارون (نہیں بلکہ تم تو زبردست حملہ کرنے والے ہو) وہ فرماتے ہیں: فدنونا فقبلنا یده (پس ہم قریب ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک کا بوسہ لیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں مسلمانوں کا گروہ اور جماعت ہوں'' (2)۔ ثعلب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 356۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عکارون هم عطافون ہیں (وہ مہربانی کرنے والے اور مائل ہونے والے ہیں) اور کسی اور نے کہا ہے: وہ آدمی جو جنگ کے وقت پیٹھ پھیر کر آجاتا ہے پھر دوبارہ لوٹ جاتا ہے تو اس کے لیے عکہ اور اعتکر کہا جاتا ہے۔

جریر نے منصور کے واسطے سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: قادسیہ سے ایک آدمی شکست خوردہ ہوا اور وہ بھاگ کر مدینہ طیبہ میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! میں ہلاک ہو گیا، میں تو لشکر سے بھاگ آیا ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تیری جماعت ہوں۔ اور محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب ابوعبیدہ کے قتل کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا: اگر وہ میری طرف لوٹ کر آجاتا تو میں اس کے لیے ایک جماعت تھا، پس میں ہر مسلمان کی جماعت اور گروہ ہوں (1)۔

ان احادیث کی بنا پر فرار گناہ کبیرہ نہیں، کیونکہ یہاں فئة سے مراد مدینہ ہے امام وقت مسلمانوں کی جماعت ہے جہاں بھی یہ ہوں۔ اور دوسرے قول کی بنا پر یہ گناہ کبیرہ ہے، کیونکہ وہاں فئة سے مراد جنگ کے لیے حاضر لوگوں کی جماعت ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مطابق ہے کہ لشکر سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول تمام مومنین کا احاطہ کرنے کے اعتبار سے ہے، کیونکہ وہ اس زمانے میں اپنے آپ کو دو چند کرنے کے لیے کئی بار ثبات اختیار کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: والتولی یوم الزحف میں اتنا کافی ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔ باء کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ یعنی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور یہ ہمیشہ اس میں رہنے پر دلالت نہیں کرتا، جیسا کہ کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من قال أستغفر الله الذی لا إله إلا هو الحی القیوم غفر له وإن کان قد فر من الزحف۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

"پس تم نے نہیں قتل کیا انہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا انہیں اور (اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تا کہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ تو ہوا اور بلاشبہ اللہ کمزور کرنے والا ہے کفار کے مکروفریب کو"۔

قولہ تعالیٰ: **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** یعنی بدر کے دن تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کیا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب غزوۂ بدر سے واپس لوٹے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنا کارنامہ ذکر کیا:

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 609، سورۃ انفال

میں نے اس طرح قتل کیا، میں نے اس طرح کیا۔ تو اس وجہ سے ان میں تفاخر اور اس جیسی دیگر چیزیں آنے لگیں۔ تو اس حقیقت پر آگاہ کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی (1) کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی مارنے والا ہے اور وہی تمام چیزوں کی قدرت عطا کرنے والا ہے اور یہ کہ بندہ تو صرف اپنے کسب اور اپنے قصد کے ساتھ اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور یہ آیت ان کا رد کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق خود ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری طرف ہانک کر انہیں قتل کیا ہے، یہاں تک کہ اس نے تمہیں ان پر قدرت دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان ملائکہ کے ساتھ قتل کیا ہے جن کے ساتھ اس نے تمہاری مدد کی ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ اسی کی مثل ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اس رمی کے بارے میں علماء کے مابین چار مختلف اقوال ہیں:

(۱) بے شک اس رمی سے مراد غزوۂ حنین کے دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کنکریاں پھینکنا ہے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس دن کوئی باقی نہیں بچا مگر اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنکری لگی۔ اسی طرح ان سے ابن القاسم نے بھی روایت کیا ہے۔

(۲) یہ غزوۂ احد کے دن کا واقعہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کی گردن میں چھوٹا نیزہ مارا تو ابی شکست کھا کر واپس لوٹ گیا۔ تو مشرکین نے اسے کہا: قسم بخدا تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تو اس نے جواب دیا: واللہ لو بصق علی لقتلنی (قسم بخدا! اگر آپ مجھ پر تھوک دیتے تو یقیناً مجھے قتل کر دیتے) کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا: بل أنا أقتله (بلکہ میں اسے قتل کروں گا) ابی نے مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کی دھمکی دی تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا تھا: بل أنا أقتلك (2) (بلکہ میں تجھے قتل کروں گا) پس وہ دشمن خدا مکہ مکرمہ کی طرف واپس لوٹتے ہوئے مقام سرف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ضرب سے مر گیا۔

موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: جب غزوۂ احد کا دن تھا تو ابی لوہے میں لپٹا ہوا گھوڑے پر بیٹھ کر آیا اور کہنے لگا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نجات پا گئے تو پھر میں نہیں بچ سکوں گا۔ چنانچہ اس نے قتل کے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیا۔ موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا کہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس مومنین میں سے کچھ لوگ اس کے سامنے آ گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ تم اس کا راستہ چھوڑ دو۔ پھر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے اس کے مقابلے میں آئے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کی ہنسلی کی ہڈی کو خود اور زرہ کو ملانے والی جگہ کے درمیان ایک سوراخ سے دیکھ لیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چھوٹے نیزے کے ساتھ اسے مارا تو ابی اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور اسے نیزہ لگنے کی جگہ سے خون نہ نکلا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: پس آپ نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی توڑ دی۔ اور فرمایا: پس اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 511

2۔ البدایہ والنہایہ، فصل فی قتل رسول اللہ ابی بن خلف، جلد 4، صفحہ 35

(۳) اس سے مراد وہ تیر ہے جو رسول اللہ سلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قلعہ میں پھینکا تھا پس وہ ہوا میں چلتا رہا یہاں تک کہ ابن ابی الحقیق کو اس کے بستر پر جا لگا۔ یہ قول بھی فاسد ہے، خیبر کی فتح تو احد سے بھی بہت بعد میں ہوئی۔ ابن ابی الحقیق کے قتل کے بارے میں صحیح قول اس کے سوا ہے۔

(۴) بلاشبہ یہ واقعہ بدر کے دن پیش آیا۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے: اور یہی اصح ہے، کیونکہ یہ سورت بدری ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم سلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: ''آپ مٹی کی ایک مٹھی لیں'' (1)، پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اسے ان کے چہروں پر پھینکا اور مشرکین میں سے کوئی بھی نہیں بچا مگر یہ کہ وہ مٹی اس کی آنکھوں، نتھنوں اور اس کے منہ میں پڑی، اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے، عنقریب اس کا بیان آئے گا۔

ثعلب نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وَ مَا رَمَيْتَ ان کے دلوں میں گھبراہٹ، خوف اور رعب آپ نے نہیں ڈالا۔ اِذْ رَمَيْتَ جب آپ نے کنکریاں پھینکیں اور وہ پسپا ہو گئے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اور آپ کو فتح و کامرانی عطا فرمائی۔ عرب کہتے ہیں: رمی اللہ لک یعنی اللہ تعالیٰ نے تیری مدد کی اور تجھے کامیاب کیا اور تیرے لیے ایسا کیا۔ اسے ابوعبیدہ نے کتاب المعاذ میں بیان کیا ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: آپ نے اپنی قوت کے ساتھ نہیں پھینکی جب آپ نے پھینکی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قوت کے ساتھ آپ نے پھینکی ہے۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا یہاں البلاء سے مراد نعمت (واحسان) ہے۔ اور ''لام'' محذوف کے ساتھ تعلق کے لیے ہے، یعنی ولیبلی المؤمنین فعل ذالك (تاکہ اس طرح مومنوں پر احسان فرمائے) ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ یہ اہل حرمین اور ابوعمرو کی قراءت ہے۔ اور اہل کوفہ کی قراءت موھن کید الکافرین ہے اور تشدید میں مبالغہ کا معنی ہے اور حسن سے مُوْهِنُ كَيْدِ الكافرين اضافت اور تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دے گا یہاں تک کہ وہ تمام کے تمام متفرق ہو جائیں گے اور کمزور ہو جائیں گے اور کید کا معنی مکر ہے۔ اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

''(اے کفار!) اگر تم فیصلہ کے طلب گار تھے تو (لو) آ گیا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر تم (اب بھی) باز آ جاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے لیے اور اگر تم پھر شرارت کرو گے تو ہم پھر سزا دیں گے اور نہ فائدہ پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی چاہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہو اور یقیناً اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس میں تین اقوال ہیں: (۱) یہ خطاب کفار کے لیے ہوگا، کیونکہ انہوں نے فیصلہ طلب کیا اور کہا: اے اللہ! جو ہم میں سے زیادہ قطع رحمی کرنے والا ہے اور اپنے ساتھی پر زیادہ ظلم کرنے والا ہے تو اس کے خلاف دوسرے کی مدد فرما، یہ حسن اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما وغیرہما نے کہا ہے۔ انہوں نے یہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 611

قول قافلے کی مدد کے لیے نکلتے وقت کہا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ابو جہل نے جنگ کے وقت کہا تھا۔ اور نضر بن حارث نے کہا تھا: اللّٰھم إن کان ھذا ھو الحق من عندك فأمطر علینا حجارۃ من السمآء أو ائتنا بعذاب ألیم (اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب) اور یہ بھی مقتولین بدر میں سے تھا۔ اور الإستفتاح کا معنی ہے مدد طلب کرنا، یعنی تحقیق تمہارے پاس فتح اور مدد آ گئی لیکن وہ تمہارے خلاف مسلمانوں کے لیے ہے، یعنی تمہارے پاس وہ فیصلہ آ گیا جس کے ساتھ معاملہ واضح ہو گیا اور تمہارے لیے حق منکشف ہو گیا۔ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا یعنی اگر تم کفر سے (اب بھی) باز آ جاؤ۔ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا اور اگر تم پھر اس قول کی طرف اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قتال کی طرف لوٹو گے۔ نَعُدْ تو ہم بھی دوبارہ مومنوں کی مدد و نصرت فرمائیں گے۔ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا اور تمہاری جماعت تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ وَّ لَوْ كَثُرَتْ اگرچہ تعداد میں وہ بہت زیادہ ہو۔

(۲) یہ خطاب مومنین کو ہے، یعنی اگر تم مدد طلب کرتے ہو تو تحقیق تمہارے پاس مدد و نصرت آ گئی اور اگر تم باز رہے اس قسم کے کاموں سے جو تم نے کیے (مثلاً) اجازت سے قبل مال غنیمت اور قیدیوں کو پکڑنا وغیرہ۔ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا اور اگر تم پھر اس قسم کے کاموں کی طرف لوٹ آئے تو ہم بھی دوبارہ تمہیں زجر و توبیخ کریں گے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ الآیہ (الانفال: 68) (اگر نہ ہوتا حکم الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے)

(۳) کہ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ میں خطاب مومنین کو ہو اور جو اس کے بعد ہے وہ کفار کے لیے ہو، یعنی اگر تم قتال کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر واقعہ بدر کی مثل تمہیں سزا دیں گے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ یہ خطاب کفار کو ہے، کیونکہ وہ جب قافلے کی مدد کے لیے چلے تھے تو وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹ گئے اور یہ کہا: اللّٰھم انصر اھدی الطائفتین وأفضل الدینین (اے اللہ! دونوں گروہوں میں سے جو زیادہ ہدایت یافتہ ہے اور دو دینوں میں سے افضل ہے اس کی مدد فرما)۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ مشرکین نکلے تو ان کے پاس کعبہ معظمہ کا غلاف تھا وہ اس کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے رہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس احتمال کی وجہ سے کہ انہوں نے دو حالتوں میں ایسا کیا ہو اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ اس میں استیناف کی بنا پر ان کا ہمزہ مکسور ہے۔ اور یہ ہمزہ مفتوح ہوگا اگر اس کا عطف اس ارشاد پر ہو: وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (الانفال) یا اس کا عطف اَنِّيْ مَعَكُمْ پر ہو۔ اور اس کا معنی ہے: ولأن اللہ (کیونکہ اللہ تعالیٰ) اور تقدیر کلام ہے لکثرتھا وأن اللہ یعنی جس کا مددگار اور ناصر اللہ تعالیٰ ہو تو کوئی جماعت اس پر غالب نہیں آ سکتی اگرچہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نہ روگردانی کرو اس سے حالانکہ تم سن رہے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یہ خطاب تصدیق کرنے والے مومنین کو ہے۔ ان کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنے کے لیے انہیں منفرد خطاب فرمایا اور منافقین کو اس میں شامل نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں از سرنو اپنی اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں اس سے روگردانی کرنے سے منع فرمایا۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: اس آیت سے خطاب صرف منافقین کو ہے۔ اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو! جو صرف اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اگرچہ اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے لیکن یہ بہت ضعیف اور کمزور ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جنہیں خطاب کیا ہے انہیں ایمان کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ اور ایمان تصدیق کا نام ہے اور منافقین کسی شے کے سبب تصدیق سے متصف نہیں۔ اور اس سے زیادہ بعید وہ ہے جس نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے، کیونکہ یہ قول تو آیت سے بالکل اجنبی ہے (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ، التولی کا معنی اعراض کرنا ہے۔ اس میں عَنْهُ فرمایا ہے۔ عنهما نہیں کہا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (التوبہ: 62) (اس میں بھی ہ ضمیر واحد ذکر کی ہے هما تثنیہ ذکر نہیں کی) وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ یہ مبتدا اور خبر حال کے محل میں ہیں۔ اور معنی یہ ہے: حالانکہ تم سن رہے ہو وہ دلائل و براہین جو قرآن کریم میں تم پر تلاوت کیے جاتے ہیں۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

"اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا: ہم نے سن لیا، حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا یعنی تم یہود یا منافقین یا مشرکین کی طرح نہ بن جانا۔ اور اس میں مراد کانوں سے سننا ہے۔ وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ یعنی وہ اس میں تدبر نہیں کرتے جو وہ سنتے ہیں اور نہ وہ اس میں غور و فکر کرتے ہیں۔ پس وہ اس کی طرح ہیں جس نے کچھ نہیں سنا اور حق سے اعراض کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ان کی مثل ہونے سے منع فرمایا ہے۔ پس آیت اس پر دلیل ہے کہ مومن کا قول: سمعتُ و أطعتُ (میں نے سنا اور پیروی کی) اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے جب تک امتثال فعل کی صورت میں اس پر اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ پس جب اس نے اوامر میں کوتاہی اور سستی برتی تو پھر وہ اس پر عمل پیرا نہ ہوا۔ اور اس نے نواہی پر اعتماد کیا اور ان کا ارتکاب کیا تو پھر اس کے نزدیک کون سی سمع ہے اور کون سی طاعت ہے، بلاشبہ اس وقت تو وہ اس منافق کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ سے مراد یہی ہے، یعنی یہ منافقین کے بارے ہے یا یہود کے بارے یا مشرکین کے بارے ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بے شک کفار زمین پر چلنے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 513

والوں میں سے سب سے زیادہ شریر ہیں۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ فرمایا: یہ بنی عبد الدار کے لوگ ہیں (1)۔ اور شر اصل میں اشر تھا کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ وحذف کر دیا گیا اسی طرح خیر اصل میں اخیر تھا۔

وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۳

''اور اگر جانتا اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی تو انہیں ضرور سنا دیتا اور اگر سنا دیتا انہیں (قبول حق کی استعداد کے بغیر) تو وہ پیٹھ پھیر دیتے روگردانی کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ کہا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی جانتا تو انہیں ضرور دلائل و براہین اس طرح سنا دیتا کہ وہ انہیں سمجھ سکتے، لیکن ان کی شقاوت اور بدبختی پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ اگر وہ انہیں سمجھا دیتا تو وہ ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: تو وہ یقیناً انہیں ان مردوں کا کلام سنوا دیتا جنہیں زندہ کرنے کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا، کیونکہ انہوں نے قصی بن کلاب وغیرہ کو زندہ کرنے کا، مطالبہ کیا تھا تاکہ وہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دیں۔

زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر اس کا جواب سنا دیا جس کے بارے انہوں نے سوال کیا۔ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴

''اے ایمان والو! لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں اس امر کی طرف جو زندہ کرتا ہے تمہیں اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان بے شک اسی کی طرف تم اٹھائے جاؤ گے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ بلا اختلاف یہ خطاب تصدیق کرنے والے مومنین کو ہے۔ اور استجابۃ کا معنی الاجابۃ (جواب دینا) ہے۔ اور یُحْیِیْكُمْ اصل میں یُحْیِیُكم تھا، پھر یا پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے یا سے حذف کر دیا گیا اور ادغام جائز نہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: استجیبوا کا معنی أجیبوا (تم جواب دو) ہے لیکن عرف کلام یہ ہے کہ استجاب لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور اجاب بغیر لام کے متعدی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ (الاحقاف: 31) (اے ہماری قوم! قبول کر لو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو) اور کبھی استجاب بھی بغیر لام کے متعدی ہوتا ہے۔ اور اس پر شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

1۔ تفسیر ابن عباس، سورۃ انفال، جلد 1، صفحہ 440

وداعٍ دعا یا مَنْ یُجیب إلى النَّدَى فلم یَستجبْه عند ذاك مُجِیبُ(1)

آپ کہتے ہیں: اجابه و أجاب عن سواله (اس نے اسے جواب دیا اور اس نے اس کے سوال کا جواب دیا) اس میں مصدر الاجابة ہے، اور اسم الجابة ہے، جیسا کہ الطاقة اور الطاعة ہے۔ تو کہتا ہے: أساء سَمْعًا فأساء اجابة (اس نے غلط سنا اور غلط جواب دیا) اس حرف کے بارے اسی طرح کلام کی جاتی ہے۔ اور المجاوبة و التجاوب کا معنی ہے باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرنا، تبادلہ خیال کرنا۔ اور تو کہتا ہے: إنه لحَسن الجِيبة اس میں الجیبه (جیم کے کسرہ کے ساتھ) بمعنی الجواب ہے یعنی (بے شک اس نے خوبصورت جواب دیا)

لِمَا يُحْيِيكُمْ یہ استجیبوا کے متعلق ہے۔ اس کا معنی ہے: إستجيبوا لما يحييكم إذا دعاكم (تم جواب دو اس امر کا جو تمہیں زندہ کرتا ہے جب وہ رسول تمہیں بلائے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی الیٰ ہے۔ أي إلى ما يحييكم یعنی جب وہ تمہیں ایسے امر کی طرف بلائے جو تمہارے دین کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں (نور) علم عطا فرماتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی تمہیں بلاتا ہے ایسے امر کی طرف جس کے ساتھ تمہارے دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ پس تم نے اسے واحد اور یکتا تسلیم کر لیا، یہ احیاء مجازی ہے، کیونکہ یہ کفر اور جہالت کی موت سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت مجاہد اور جمہور نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم طاعت کو اور اوامر و نواہی میں سے جتنے احکام کو قرآن کریم متضمن ہے تمام کو قبول کرو(2)، اسی میں ابدی حیات ہے اور یہی نعمت سرمدیہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: لِمَا يُحْيِيكُمْ سے مراد جہاد ہے، کیونکہ ظاہر میں یہی زندگی کا سبب ہے کیونکہ دشمن کے ساتھ جب نہ لڑا جائے تو پھر وہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اور اس کے حملے میں موت ہے اور جہاد میں مرنا ابدی حیات ہے، جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا ۭ بَلْ أَحْيَاءٌ (آل عمران: 169) (اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں اللہ کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں) اور صحیح قول یہی ہے کہ یہ آیت عام ہے جیسا کہ جمہور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر2۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا (لیکن) میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں حاضر خدمت ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اللہ عزوجل نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ(3) اور حدیث ذکر کی''۔ یہ سورۃ فاتحہ میں پہلے گزر چکی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ فعل فرض یا قول فرض جب حالت نماز میں کیا جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے کا حکم ارشاد فرمایا اگرچہ وہ نماز میں ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی حجت اور دلیل ہے کہ اگر آدمی نماز پڑھ رہا ہو پھر اس نے کسی بچے کو دیکھا کہ وہ کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے پس اس نے اس کے بارے شور مچایا اور اس کی طرف گیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 514 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۂ انفال، جلد 2، صفحہ 699

اور اسے اس پر ڈانٹ پلائی تو (اتنے عمل سے) نماز میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوۡلُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ قَلۡبِهٖ کہا گیا ہے: یہ اس بارے میں نص ہونے کا تقاضا کرتی ہے کہ کفر اور ایمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پس وہ کافر آدمی اور اس ایمان کے درمیان جس کے بارے اس نے حکم دیا ہے حائل ہو جاتا ہے، پس بندہ اسے حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے اس پر قدرت نہ دے بلکہ اس نے اسے اس (ایمان) کی ضد پر قدرت دے رکھی ہے اور وہ کفر ہے، اور اسی طرح مومن ہے کہ اللہ کریم اس کے درمیان اور کفر کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ پس اس نص سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے جملہ اعمال کا خالق ہے چاہے وہ اعمال خیر ہوں یا شر ہوں۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: لا و مقلب القلوب (1) (قسم ہے اس کی جو دلوں کو پھیرنے والا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا فعل اس کے بارے میں عین عدل ہے جسے اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا، کیونکہ اس نے انہیں اس حق سے روکا نہیں جو اس پر واجب ہو کہ صفت عدل زائل ہو جائے، بلکہ اس نے تو انہیں اس فضل اور مہربانی سے روکا ہے جو اس کے پاس تھی چاہتا تو ان پر فرما سکتا تھا مگر وہ ان کے لیے واجب نہ تھی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے پس وہ اس کی اجازت کے بغیر ایمان لانے کی استطاعت نہیں رکھتا اور وہ کفر بھی نہیں کر سکتا مگر اس کی مشیت کے ساتھ۔ اور قلب (دل) غور و فکر کا محل ہے۔ اس کا بیان پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، جب وہ چاہتا ہے بندے اور اس کے درمیان کسی بیماری یا آفت کے سبب حائل ہو جاتا ہے تاکہ وہ سمجھ ہی نہ سکے۔ یعنی تم قبولیت کی طرف جلدی کر لو اس سے پہلے کہ تم عقل زائل ہونے کے سبب اس پر قادر ہی نہ رہو۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ آدمی اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آدمی جو کر رہا ہوتا ہے اسے سمجھ نہیں سکتا اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰی لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ (ق: 37) اس میں قلب سے مراد عقل ہے۔

(بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل (بینا) رکھتا ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آدمی اور اس کے عمل کے درمیان موت کے ساتھ حائل ہو جاتا ہے، لہٰذا جو عمل آدمی سے فوت ہو چکا ہوتا ہے اس کا تدارک اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غزوۂ بدر کے دن مسلمان دشمن کی کثرت کے سبب خوفزدہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمایا کہ وہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اس طرح کہ وہ انہیں خوف کے بعد امن سے بدل دے اور ان کے دشمن کو امن سے خوف میں بدل دے۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ امور کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلتا رہتا ہے۔ اور یہی جامع معنی ہے۔ اور علامہ طبری کی پسند یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہے کہ وہ بندوں کے دلوں کا مالک ہے اور یہ کہ وہ جب چاہتا ہے ان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کسی شے کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ یہ معطوف ہے۔ فراء نے کہا ہے: اگر جملہ مستانفہ ہوتا تو پھر ان کو کسرہ دیا جاتا۔ لہٰذا وَ اَنَّهٗۤ ہی درست اور صحیح ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 616

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

''اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر اور گناہ کو جڑ نہ پکڑنے دیں کہ ان تمام کو عذاب عام ہو جائے (1)۔ (اور بعض لوگوں کے گناہ کے سبب وہ سارے اس عذاب کی لپیٹ میں آجائیں) اسی طرح حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی تاویل کی ہے کیونکہ انہوں نے جمل کے دن کہا اور وہ 36ھ کا زمانہ تھا: آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اس آیت سے ہم ہی مراد لیے گئے ہیں اور میں اس کو اسی کے بارے گمان کر رہا ہوں جسے اس وقت مخاطب بنایا گیا۔ اور اسی طرح حضرت حسن بصری (2) اور سدی وغیرہما رحمۃ اللہ علیہما نے بھی تاویل کی ہے۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت صرف اہل بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پس انہیں جمل کے دن فتنہ آ پہنچا اور وہ آپس میں لڑ پڑے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر اور گناہ کو پختہ نہ ہونے دیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب عام میں مبتلا کر دے۔

اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اصحاب میں سے لوگوں کے درمیان فتنہ برپا ہوگا میرے ساتھ انہیں شرف صحبت ہونے کے سبب اللہ کریم ان کو اس میں معاف فرما دے گا اور ان کے بعد آنے والے لوگوں میں جو اس میں ان کی پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ اس کے سبب انہیں جہنم میں داخل کرے گا'' (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وہ تاویلات ہیں جنہیں احادیث صحیحہ سے تقویت حاصل ہوتی ہے پس صحیح مسلم میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ ہم میں صالحین ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں جب خبث (نجاست، گناہ وغیرہ) زیادہ ہو جائے گا'' (4)۔ اور صحیح ترمذی میں ہے۔ ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے ان تمام کو سزا دے'' (5)۔ یہ احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

اور صحیح بخاری اور ترمذی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم رہنے والا اور ان میں واقع ہونے والا اس قوم کی مثل ہیں جو ایک جہاز پر سوار ہوں، ان میں سے بعض اس کی اوپر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 515 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 388
4۔ ایضاً 5۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 39

والی منزل میں ہوں اور بعض نیچے والی منزل میں، پس وہ جو نیچے والے حصے میں ہیں جب انہیں پانی کی طلب ہو تو انہیں اوپر والوں کی طرف جانا پڑتا ہو چنانچہ انہوں نے یہ کہا: اگر ہم اپنے حصے میں سوراخ کر لیں اور ہم اوپر والوں کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ پس اگر اوپر والے انہیں چھوڑ دیں تو جو انہوں نے ارادہ کیا ہے وہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تو وہ بھی نجات پا گئے اور ان کے ساتھ سبھی نجات پا جائیں گے'' (1)۔ پس اس حدیث میں خاص لوگوں کے گناہوں کے سبب تمام لوگوں کو عذاب دینے کا تذکرہ ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس عذاب اور سزا کا استحقاق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کرنے کے سبب ثابت ہوا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس فتنہ، جب اس پر عمل کیا جائے تو تمام ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا گناہوں کے عام ہونے، منکر کے پھیلنے اور تبدیلی نہ آنے کے سبب ہوتا ہے اور جب حالات میں تبدیلی نہ آئے تو مومنوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اس کا انکار کرتے ہوئے اس شہر کو چھوڑ دیں اور وہاں سے نکل جائیں۔ اور اسی طرح ان لوگوں کے لیے حکم تھا جو ہم سے پہلے امتوں میں سے تھے، جیسا کہ سبت کے قصہ میں ہے جس وقت انہوں نے نافرمانوں کو چھوڑا اور کہا: ہم تمہارے ساتھ سکونت اختیار نہیں کریں گے۔ اور اسی کے مطابق اسلاف رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اس زمین کو چھوڑ دیا جائے گا جس میں بدکاری علانیہ ہوتی ہو اور اس میں ٹھکانا نہیں بنایا جائے گا۔ اور انہوں نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ربا کا اعلان کیا اور سونے کے برتن کی بیع ایسے برتن کے ساتھ جائز قرار دی جو وزن میں اس سے زیادہ ہو تو آپ (حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ) اس زمین سے نکل گئے، اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو وہ عذاب اس میں موجود ہر آدمی کو پہنچتا ہے پھر انہیں ان کے اعمال پر اٹھایا جائے گا'' (2)۔ پس یہ روایت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس میں عام ہلاک کرنے والا عذاب مومنین کے لیے پاکیزگی کا سبب ہوتا ہے اور وہی فاسقوں کے لیے سزا اور عذاب ہوتا ہے۔ اور امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت نیند میں اضطراب کا اظہار کیا (یعنی اپنے اعضاء جسم کو حرکت دی جیسے کوئی کسی شے کو پکڑتا ہے) تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے حالت نیند میں ایسا عمل کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی نہیں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تعجب اور حیرانی ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ قریش کے ایک آدمی کو پکڑنے کے لیے اس بیت (مراد بیت اللہ شریف) کا ارادہ رکھتے تھے حالانکہ وہ آدمی بیت اللہ شریف میں پناہ لیے ہوئے تھا یہاں تک کہ جب وہ مقام بیداء پر پہنچے تو وہ دھنسا دیئے گئے'' (3)۔ تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک راستہ تو بہت سے لوگوں کو جامع ہوتا ہے (یعنی راستہ تو ہر ایک کو اپنے اوپر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 40۔ ایضاً، حدیث نمبر 2099، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1053　3۔ ایضاً

چلنے کی اجازت دیتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، ان میں کچھ عمداً قصد کرنے والے تھے، کچھ مجبور اور مکرہ تھے اور کچھ مسافر تھے وہ سب ایک ہی ہلاکت خیز جھٹکے کے ساتھ ہلاک ہو گئے ہیں اور مختلف مقامات سے نکلیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا'' (1)۔

اور اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (انعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ (المدثر) (ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے) لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ: 286) (اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہو گا جو (برا عمل) اس نے کمایا) یہ ارشادات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسرے کے گناہ کے بدلے نہیں پکڑا جائے گا، بلاشبہ سزا گناہ کرنے والے کے ساتھ ہی متعلق ہوتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں میں جب گناہ ظاہر ہو جائے تو ہر دیکھنے والے پر فرض ہے کہ وہ اسے تبدیل کر دے (یعنی اسے روکنے کی کوشش کرے) اور جب وہ اس پر خاموش رہے تو تمام کے تمام سے گنہگار ہوں گے۔ (فرق صرف اتنا ہے) کچھ اس کا ارتکاب کر رہے ہیں (اس لیے وہ گنہگار ہیں) اور کچھ اس پر راضی ہونے کی وجہ سے گنہگار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم اور اپنی حکمت میں (گناہ پر) راضی ہونے والے کو (گناہ) کرنے والے کے قائم مقام قرار دیا ہے، پس سزا میں راضی بھی عامل کے ساتھ شامل ہو گا۔ یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہی ان احادیث کا مضمون ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور آیت کا مقصود یہ ہے کہ تم بچو ایسے فتنے سے جو ظالم سے تجاوز کر کے ہر نیک و بد تک پہنچ جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ نحویوں نے لَا تُصِیْبَنَّ میں نون کے داخل ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: انزل عن الدابة لا تطرحنك (تو سواری سے اتر آ وہ تجھے نہیں گرائے گی) تو یہ لفظ نہی کے ساتھ جواب امر ہے، یعنی معنی یہ ہے: ان تنزل عنها لا تطرحنك (اگر تو اس سے اتر آیا تو وہ تجھے نہیں گرائے گی) اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ (النمل: 18) یعنی ان تدخلوا لا یحطمنكم (گھس جاؤ اپنی بلوں میں کہیں کچل کر نہ رکھ دیں تمہیں) تو اس میں نون اس لیے داخل کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جزا کے معنی پائے جا رہے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: چونکہ یہ کلام قسم کے محل میں ہے اور نون داخل نہیں ہوتا مگر فعل نہی پر یا جواب قسم پر۔ اور ابوالعباس المبرد نے کہا ہے: بے شک یہ امر کے بعد نہی ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ ظالموں کے لیے نہی ہے یعنی تم ظلم کے قریب نہ جاؤ۔ اور سیبویہ نے بطور حکایت بیان کیا ہے: لا اریَنّك ههنا یعنی تو یہاں نہ ہو، کیونکہ جو یہاں ہو گا تو میں اسے دیکھوں گا۔ اور علامہ جرجانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا خاصة (تم بچو اس فتنہ سے جو صرف ان لوگوں تک نہ پہنچے گا جنہوں نے ظلم کیا) پس قول باری تعالیٰ لَا تُصِیْبَنَّ نکرہ کے وصف کے محل میں نہی ہے۔ اور اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کو فتنہ پہنچنے کی خبر ہے جنہوں نے ظلم کیا۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 847

حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے لتصیبن کو بغیر الف کے پڑھا ہے۔ مہدوی نے بیان کیا ہے: جنہوں نے لتصیبن پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ یہ لا تصیبن سے مقصود ہو اور اس میں الف کو اسی طرح حذف کر دیا گیا ہو جیسے ما میں حذف کیا گیا ہے اور یہ ماخت لا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے أمَ واللہ لأ فعلن اور اس کے مشابہ جملوں میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جمہور کی قراءت کی مخالفت ہو، پس معنی یہ ہوگا کہ یہ فتنہ صرف ظالم کو پہنچے گا۔

وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے ملک میں (ہر وقت) ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں اچک نہ لے جائیں تمہیں لوگ، پھر اللہ نے پناہ دی تمہیں اور طاقت بخشی تمہیں اپنی نصرت سے اور عطا کیں تمہیں پاکیزہ چیزیں تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ کلبی نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یعنی یہ ہجرت سے پہلے اور ابتدائے اسلام میں ان کی حالت کا بیان ہے۔ مُّسْتَضْعَفُوْنَ یہ صفت ہے فِي الْاَرْضِ مراد سرزمین مکہ ہے۔ تَخَافُوْنَ یہ بھی نعت (صفت) ہے۔ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ یہ محل نصب میں ہے اور الخطف کا معنی ہے تیزی کے ساتھ کسی چیز کو لے لینا (اچک لینا) النَّاسُ یہ فاعل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ حضرت قتادہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے: یہ اہل فارس اور روم ہیں (1)۔ فَاٰوٰىكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: (پس اللہ نے تمہیں پناہ دی) انصار کے پاس۔ سدی نے کہا ہے: پس اس نے تمہیں مدینہ طیبہ میں پناہ دی۔ دونوں کا معنی ایک ہے اوی الیہ مد کے ساتھ ہو تو معنی ہے ضم الیہ۔ اس نے تجھے اس کے ساتھ ملا دیا۔ اور أوی إلیہ (قصر کے ساتھ ہو) تو معنی ہے انضم الیہ (وہ اس کے ساتھ مل گیا) وَاَيَّدَكُمْ اور اس نے تمہیں قوت اور طاقت بخشی۔ بِنَصْرِهٖ اپنی مدد کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے تمہیں انصار کے ساتھ قوت و طاقت عطا کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس نے تمہیں بدر کے دن ملائکہ کے ساتھ قوت بخشی۔

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور اس نے تمہیں غنائم عطا کیں۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اے ایمان والو! نہ خیانت کرو اللہ اور رسول سے اور نہ خیانت کرو اپنی امانتوں میں اس حال میں کہ تم جانتے ہو''۔

روایت ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت انہوں نے بنی قریظہ کی طرف ذبح کا اشارہ کیا۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! میرے قدم نہیں پھسلے یہاں تک کہ مجھے علم ہو گیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کی ہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ اور کہا: قسم بخدا! نہ میں کھانا کھاؤں گا اور نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 619

پانی پیوں گا یہاں تک کہ میں مر جاؤں یا پھر اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے (1)۔ یہ خبر مشہور ہے۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب بنی قریظہ کا معاملہ پیش آیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے ساتھ بھیجا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ پس جب آپ ان کے پاس جا کر رکے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے نازیبا کلمات کہے اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ابلق (چتکبرہ گھوڑا) گھوڑے پر تشریف لائے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھ رہی ہوں کہ آپ حضرت جبریل امین علیہ السلام کے چہرے سے غبار صاف کر رہے ہیں۔ تو میں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا یہ دحیہ (رضی اللہ عنہ) ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں''۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سی شے آپ کو بنی قریظہ سے روک رہی ہے کہ آپ ان کی طرف آئیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے ان کے قلعے میں پہنچنا کیسے ممکن ہے''؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: میں اپنا یہ گھوڑا ان پر داخل کروں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ننگے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا، عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر ہوتا کہ آپ تشریف نہ لاتے، کیونکہ وہ آپ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہرگز نہیں بے شک عنقریب سلامتی ہو جائے گی''۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو''۔ تو انہوں نے کہا: اے ابا القاسم! آپ تو فحش کہنے والے نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم پر (نیچے) نہیں اتریں گے، البتہ ہم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اتر آئیں گے۔ پس وہ اترے۔ اور ان کے بارے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولادوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسی (فیصلے) کے ساتھ فرشتہ سحری کے وقت میرے پاس آیا (2)، پس ان کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝** یہ آیت حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی کہ انہوں نے بنی قریظہ کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب انہوں نے کہا: ہم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اتریں گے کہ تم اس طرح نہ کرو، کیونکہ یہ ذبح ہے اور ساتھ ہی اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بات سنتے تھے تو وہ اسے مشرکین تک پہنچا دیتے تھے اور اسے افشا کر دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مال غنیمت میں خیانت کرنا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، کیونکہ وہی وہ ہے جس نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا کرنے والے اور اسے قائم اور پختہ کرنے والے ہیں۔ اور الخیانۃ سے مراد غدر (دھوکا) اور کسی شی کو چھپانا ہے۔ اور اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: **يَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ** (غافر: 19) (وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو) اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کرتے ہیں: ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کیونکہ یہ بہت برا ساتھی ہے اور خیانت سے کیونکہ یہ انتہائی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 619
2۔ تفسیر در منثور، جلد 3، صفحہ 323

برا باطن ہے'' (1)۔ نسائی نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کان رسول اللہ ﷺ یقول پھر آگے اسے ہی بیان کیا ہے۔

وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ یہ محل جزم میں ہے، کیونکہ اس کا عطف ماقبل پر ہے۔ اور کبھی جواب کی بنا پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: لا تاكلِ السمك و تشرب اللبن (اس میں تشرب، لاتاکل کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہو سکتا ہے) اور امانات سے مراد وہ اعمال ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو امین بنایا ہے۔ اور انہیں امانت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ انہیں حق کے روکنے سے محفوظ کر دیا جاتا ہے، یہ الأمن سے ماخوذ ہے۔ اور سورۃ النساء میں امانات اور ودیعتوں کی ادائیگی کے بارے میں اور دیگر چیزوں کے بارے میں بحث گزر چکی ہے وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی خیانت میں جو قبح اور عار (ندامت) ہے اسے تم جانتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم جانتے ہو کہ یہ امانت ہے۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۲۸

''اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (سب) آزمائش ہے اور بے شک اللہ، اسی کے پاس اجر عظیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے اموال واولاد بنی قریظہ میں تھے (2) اور یہی وہ شے تھی جس نے آپ کو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے پر ابھارا تھا۔ اور یہ اشارہ اسی طرف ہے۔ فتنة کا معنی ہے آزمائش، امتحان (اللہ تعالیٰ نے) انہیں اس کے ساتھ امتحان میں ڈال دیا۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ پس تم اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دو (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس اجر عظیم ہے)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝۲۹

''اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت اور ڈھانپ دے گا تم سے تمہارے گناہ اور بخش دے گا تمہیں اور اللہ بڑے فضل (وکرم) والا ہے''۔

تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے بارے جانتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اسے لفظ شرط کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیونکہ اس نے بندوں کو ایسے انداز میں خطاب کیا ہے جیسے وہ آپس میں ایک دوسرے کو خطاب کرتے ہیں۔ اور جب بندہ اپنے رب سے ڈرنے لگے اور یہ اس کے اوامر کو بجالانے اور اس کی نواہی سے اجتناب کرنے سے، محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے شبہات کو ترک کرنے، اور اپنے دل کو خاص نیت کے ساتھ بھرنے سے، اور اپنے جوارح کو اعمال صالحہ میں مشغول رکھنے اور اعمال میں غیر اللہ کی رعایت کے سبب شرک خفی اور ظاہر کی آمیزش سے محفوظ رہنے، اور مال سے باز رہنے کے سبب دنیا کی طرف میلان سے بچنے سے حاصل ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 218۔ ایضاً، حدیث نمبر 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3344، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 620

تمیز اور فرق قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہر اس خیر اور نیکی میں رکھ دیا ہے جسے ممکن بنانے کا وہ ارادہ رکھتا ہے۔ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے قول باری تعالیٰ: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے مخرج (نکلنے کی جگہ) بنا دیا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝ (الطلاق)

ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بالکل اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس سے قبل اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اور شاعر کا قول ہے:

مَالكَ مِن طُول الأسَى فُرقان بعد قَطِينٍ رَحلوا و بَانُوا(1)

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

وكيف أرَجّي الخلد والموت طالبي وما لى من كأس المنية فرقانُ

ابن اسحاق نے کہا ہے: فُرْقَانًا اس کا معنی ہے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا۔ ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی نجات ہے۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی فتح و نصرت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے آخرت میں فرقان بنا دیا ہے، پس یہ تمہیں جنت میں داخل کر دے گا اور کفار کو جہنم میں داخل کرے گا۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝۳۰

''اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں۔ وہ بھی خفیہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے''۔

یہ اس خفیہ تدبیر اور مکر کے بارے خبر دی جا رہی ہے جس پر مشرکین حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دارالندوہ میں جمع ہوئے تھے۔ پس انہوں نے مشاورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے پر اجماع کیا نتیجۃً انہوں نے آپ کی دربانی کی اور طویل رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے دروازے پر آپ کی تاک میں بیٹھے رہے کہ جونہی آپ باہر نکلیں تو وہ آپ کو شہید کر دیں۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ وہ ان پر اپنا اثر ڈال دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو ڈھانک دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ ان پر نیند چھائی ہوئی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سروں پر مٹی ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔ جب انہوں نے صبح کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس باہر تشریف لائے اور انہیں بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے گئے ہیں اور نجات پا گئے ہیں۔ سیرت وغیرہ میں یہ خبر مشہور ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 518

اور لِيُثْبِتُوْكَ کا معنی ہے تا کہ وہ آپ کو قید کر دیں۔ کہا جاتا ہے: أثبتہ یہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے قید کر لے۔
حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیثبتوك وثاقاً (تا کہ وہ آپ کو بیڑیاں پہنا لیں) آپ سے بھی اور عبداللہ بن کثیر سے یہ منقول ہے: لیسجنوك (تا کہ وہ آپ کو جیل میں ڈال دیں) اور ابان بن تغلب اور ابو حاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تا کہ وہ آپ کو زخموں اور شدید مارنے کے سبب نڈھال اور کمزور کر دیں، جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلتُ ويحكما ما في صحيفتكم   قالوا الخليفة أمسى مُثبتًا وجعا

اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ یہ کلام معطوف ہے۔ وَيَمْكُرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اور المکر کا معنی ہے کسی معاملے میں خفیہ تدبیر کرنا۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکر کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر عذاب کے ساتھ ایسی جزا دے گا جس کے بارے انہیں شعور تک نہ ہوگا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتے ہیں (اجی رہنے دو) سن لیا ہم نے اگر ہم چاہیں تو کہہ لیں ایسی آیتیں نہیں ہیں یہ مگر کہانیاں اگلے لوگوں کی''۔

یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ تجارت کی غرض سے حیرہ کی طرف نکلا اور اس نے کلیلہ و دمنہ، کسریٰ اور قیصر کی کہانیاں خرید لیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماضی کی اخبار بیان فرماتے تو نضر کہتا: اگر آپ چاہیں تو میں بھی اس کی مثل بیان کروں۔ اور یہ انتہائی بے شرم اور جھوٹا تھا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: بے شک وہ اس وہم میں پڑ گئے کہ وہ اس کی مثل لا سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کو وہم ہوا تھا، پھر انہوں نے اس کا قصد کیا تو اس سے عاجز آ گئے اور از روئے عناد کہنے لگے: یہ تو فقط اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب انہوں نے کہا: اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب''۔

قراء نے الْحَقَّ کو كَانَ کی خبر ہونے کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور درمیان میں هُوَ ضمیر فصل ہے۔ اور هُوَ الْحَقُّ مرفوع بھی جائز ہے۔ مِنْ عِنْدِكَ (تیری طرف سے) زجاج نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس کے ساتھ پڑھا ہو۔ اور اس کے جائز ہونے میں علماء نحو کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، لیکن قرأت سنت ہے اور اس میں صرف قرات مرضیہ کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا۔ اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ یہ قول کس نے کیا ہے؟ پس حضرت مجاہد اور ابن جبیر نے کہا ہے: یہ کہنے

والا نضر بن حارث تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا: یہ کہنے والا ابو جہل ہے(1)۔ اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ قول اس شبہ کی بنا پر کیا ہو جو ان کے سینوں میں موجود تھا یا عناد کی وجہ سے کہا اور لوگوں کو یہ وہم دلانے کے لیے کہا کہ وہ صاحب بصیرت ہیں، پھر بدر کے دن ان پر وہ عذاب اترا جس کی انہوں نے دعا مانگی۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہودیوں میں سے ایک آدمی ملا تو اس یہودی نے کہا: آپ کن میں سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں قریش میں سے ہوں۔ تو اس نے پوچھا: آپ اس قوم میں سے ہیں جنہوں نے یہ کہا تھا: **اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ** الآیہ تو انہیں کیا تھا کہ وہ یہ کہہ دیتے: ان کان ھذا ھو الحق من عندك فاھدنا لہ! (اگر یہ تیری جانب سے حق ہے تو ہمیں ان کی طرف ہدایت عطا فرما) بلاشبہ وہ جاہل قوم تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے اسرائیل! تو اس قوم میں سے ہے جن کے پاؤں اس سمندر کی تری سے خشک نہیں ہوئے جس میں فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو نجات عطا فرمائی گئی۔ یہاں تک کہ وہ کہنے لگے: **اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ** (الاعراف: 138) (ہمارے لیے بھی ایسا الٰہ بنا دو جیسے ان کے الٰہ ہیں) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: **اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ** (الاعراف) (بلاشبہ تم جاہل قوم ہو) تو یہودی نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

فَاَمْطِرْ (عذاب کی بارش برسا) عذاب کے لیے امطر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور رحمت کے لیے مطر بولا جاتا ہے۔ یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

''اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ تشریف فرما ہیں ان میں اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں''۔

• جب ابو جہل نے کہا: **اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ** الآیہ تب یہ آیت نازل ہوئی: **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ** اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اہل بستی کو عذاب نہیں دیا یہاں تک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اس سے نکل گئے اور وہاں پہنچ گئے جہاں کا انہیں حکم دیا گیا(2)۔ **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: وہ طواف میں کہا کرتے تھے: غفرانك اور استغفار اگرچہ فاجروں سے واقع ہو اس کے ساتھ کئی قسم کے شر اور تکالیف دور کر دی جاتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ استغفار ان مسلمانوں کی طرف راجع ہے جو ان کے درمیان تھے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دینے والا نہیں ہے حالانکہ ان میں وہ مسلمان بھی ہیں جو مغفرت طلب کر رہے ہیں، پس جب وہ نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یوم بدر اور دوسرے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں استغفار سے مراد اسلام ہے یعنی **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ**، ای یسلمون حالانکہ وہ اسلام قبول کر رہے ہوں۔ یہ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **وَ هُمْ**

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ انفال، جلد 2، صفحہ 669　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 625

یَسْتَغْفِرُوْنَ اور وہ استغفار کر رہے ہوں ان کی صلبوں میں اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔

یہ بھی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَسْتَغْفِرُوْنَ کا معنی ہے لو استغفروا یعنی اگر وہ استغفار کریں تو وہ عذاب نہ دیئے جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں استغفار کرنے کی دعوت دی۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے یہی کہا ہے۔ مدائنی نے بعض علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں ایک آدمی تھا وہ اپنی ذات پر بہت فضول خرچی کرتا تھا اور وہ گناہ سے نہ بچتا تھا۔ پس جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو اس نے اونی لباس پہنا اور اپنے جملہ اعمال سے رجوع کر لیا اور دین اور طاعت و عبادت کو ظاہر کر دیا۔ تو اسے کہا گیا: اگر تو یہی عمل اس وقت کرتا جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو یقیناً آپ تجھ سے خوش ہوتے۔ تو اس نے جواباً کہا: میرے لیے دو امانیں تھیں پس ایک گزر گئی اور دوسری باقی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ یہ ایک امان ہے اور دوسری وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ہے۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞

''(مکہ سے آپ کی ہجرت کے بعد) اب کیا وجہ ہے ان کے لیے نہ عذاب دے انہیں اللہ حالانکہ وہ روکتے ہیں (مسلمانوں کو) مسجد حرام سے اور نہیں ہیں وہ اس کے متولی، اس کے متولی تو صرف پرہیز گار لوگ ہیں لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ اس کا معنی ہے: کون سی شے ان کے لیے اس سے مانع ہے کہ وہ عذاب دیئے جائیں، یعنی بلاشبہ وہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں ان برائیوں اور دیگر اسباب کے سبب جن کا انہوں نے ارتکاب کیا ہے، لیکن شے کے لیے ایک مقررہ وقت ہے، پس اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے (مکہ مکرمہ) سے نکلنے کے بعد انہیں تلوار کے ذریعہ عذاب دیا۔ اور اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۞ (المعارج) اور اخفش نے کہا ہے: بے شک ان زائدہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اگر ایسے ہوتا جیسے انہوں نے کہا تو يُعَذِّبُهُمْ مرفوع ہوتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی بلاشبہ متقین اس کے دوست ہیں۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۞ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ

فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس بجز سیٹی اور تالی بجانے کے، سو چکھو اب عذاب بوجہ اس کے کہ تم کفر کیا کرتے تھے۔ بے شک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تا کہ روکیں (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے پھر ہو جائے گا یہ خرچ کرنا ان کے لیے باعث حسرت و افسوس پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔ تا کہ الگ کر دے اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے اور رکھ دے سب ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھر اکٹھا کر دے ان سب کو پھر ڈال دے اس مجموعہ کو جہنم میں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: قریش ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے، وہ تالیاں بجاتے تھے اور سیٹیاں مارتے تھے(1) اور یہ ان کے گمان میں عبادت تھی۔ مکاء کا معنی سیٹی مارنا ہے اور التصدیہ کا معنی تالی بجانا ہے۔ یہ حضرت مجاہد، سدی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اسی کے مطابق عنترہ کا قول بھی ہے:

وحَلِيلِ غانيةٍ تركت مُجَدَّلًا　　تَمْكُو فَرِيصَتُه كشِدْقِ الأعْلَمِ(2)

یعنی اس میں تمکو بمعنی تصوت (آواز نکالنا، سیٹی مارنا کے) ہے۔ اور اسی سے مکتِ استُ الدابة یہ تب کہا جاتا ہے جب جانور ہوا خارج کرے۔ سدی نے کہا ہے: المکاء بمعنی الصفیر سیٹی مارنا ہے۔ یہ جب حجاز کے طائر ابیض (سفید پرندہ) کی آواز اور طرز پر ہو تو اس کے لیے المکاء کہا جاتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

إذا غَرَّدَ المُكَّاءُ فی غیرِ رَوْضَةٍ　　فَوَيْلٌ لأهلِ الشاءِ والحُمُراتِ

حضرت قتادہ نے کہا ہے: المکاء سے مراد ہاتھوں کے ساتھ تالی بجانا ہے اور تصدیہ سے مراد چیخ مارنا، سیٹی مارنا ہے۔ دونوں تفسیروں کی بنا پر اس میں ان جاہل صوفیاء کا رد ہے جو رقص کرتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ یہ سب کا سب منکر (اور ممنوع) عمل ہے اور عقلاً ایسے عمل سے پرہیز کرتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں۔ ایسا کرنے والا مشرکین کے ساتھ اس عمل میں مشابہ ہو جاتا ہے جو وہ بیت اللہ شریف کے پاس کرتے تھے۔

ابن جریج اور ابن نجیح نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ان سے مراد ان کا اپنے مونہوں میں انگلیاں داخل کرنا ہے۔ اور تصدیہ سے مراد سیٹی بجانا ہے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس عمل کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے غافل کر دے (آپ کی نماز میں خلل پیدا کریں)۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں معروف وہ معنی ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: مَكَا يَمْكُو مَكْوًا و مُكَاءً جب کوئی سیٹی بجائے۔ اور صَدّیٰ یُصَدّی تصدیۃ کہا جاتا ہے جب کوئی تالی بجائے، اس معنی میں عمرو بن اطنابۃ کا قول بھی ہے:

وظلّوا جميعا لهم ضجّةٌ　　مُكاءٌ لدى البيت بالتَّصدِيَةِ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 627　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 523

یعنی اس میں التصدیہ بمعنی التصفیق یعنی تالی بجانا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر اور ابن زید نے کہا ہے: التصدیة کا معنی ہے ان کا بیت اللہ شریف سے روکنا، اس معنی کی بنا پر یہ اصل میں تصددۃ ہے، پھر دو دالوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ کا معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ مومن کو کافر سے الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (حکم) ہر شے میں عام ہے چاہے اس کا تعلق اعمال سے یا نفقات سے یا کسی اور سے ہو۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

''فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آ جائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو ہو چکا۔ اور اگر وہ (پہلے کرتوت) دہرائیں تو گزر چکا ہے (ہمارا) طریقہ پہلے (نافرمانوں) کے ساتھ''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ کفار کو یہ بات کہیں، چاہے تو آپ انہیں الفاظ کے ساتھ کہیں یا ان کے علاوہ دوسرے الفاظ میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر ایسا ہے جیسے کسائی نے ذکر کیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس طرح ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ تو پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بعینہ ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا ہے، یہ اس کے لیے کافی ہے جس کا تقاضا الفاظ کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْتَهُوْا امراد یہ ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آ جائیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور یہی ضروری ہے۔ اور اس پر ابھارنے والا یہ جواب شرط ہے يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اور جو ہو چکا اس کی مغفرت فقط کفر سے باز رہنے کے سبب ہی ہو سکتی ہے(1)۔ ابو سعید احمد بن محمد زبیری نے بہت خوب کہا ہے۔

يستوجبُ العفوَ الفتى إذا اعترفْ　　ثم انتهى عما أتاه واقْتَرفْ

نوجوان معافی کا مستحق ہو جاتا ہے جب وہ اعتراف کرلے پھر اس سے باز آ جائے جو اس نے کیا۔

لقوله سبحانه فی المعترِفْ　　إن ينتهوا يغفرلهم ما قد سَلَفْ

کیونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے معترف کے بارے فرمایا ہے: اگر وہ باز آ جائیں تو بخش دیا جائے گا جو ہو چکا۔

امام مسلم نے ابو شماسہ مہری سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: ہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اس حال میں کہ وہ نزع کی کیفیت میں تھے طویل وقت تک روتے رہے(2)۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تو نہیں جانتا کہ اسلام اپنے سے پہلے والے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے اور ہجرت اپنے سے پہلے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 527　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 76

والے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے والے گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے''(1)۔ الحدیث

علامہ ابن عربی نے فرمایا: یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے انتہائی لطف وکرم ہے جس کے ساتھ اس نے مخلوق پر احسان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ کفار اپنے آپ کو کفر اور جرائم میں پھنسائے رکھتے ہیں اور معاصی اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پس اگر ان کا یہ عمل ان کے لیے مواخذہ کو واجب کر دے تو وہ کبھی بھی توبہ کو نہ پاسکیں اور نہ مغفرت انہیں حاصل ہو سکے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع الی اللہ کے وقت توبہ قبول فرما کر ان پر معاملہ آسان کر دیا اور اسلام کے بدلے انہیں مغفرت عطا فرما کر اور سابقہ سارے گناہوں کو گرا کر ان پر معاملہ آسان فرما دیا، تا کہ یہ انہیں دین میں داخل ہونے کے زیادہ قریب کر دے اور مسلمانوں کے کلمہ کو قبول کرنے کی انہیں زیادہ دعوت دے اور اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ ان کا مواخذہ کیا جائے گا تو نہ وہ توبہ کریں اور نہ اسلام قبول کریں(2)۔ اور صحیح مسلم میں ہے: جو لوگ تم سے پہلے تھے ان میں سے ایک آدمی نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ ایک عبادت گزار کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا اس کے لیے کوئی توبہ کا ذریعہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تیرے لیے کوئی توبہ نہیں، پس اس نے اسے بھی قتل کر دیا اور اس کے ساتھ سو مکمل ہو گئے(3)۔ الحدیث۔ پس تم عابد کے اس قول کی طرف دیکھو: تیرے لیے کوئی توبہ نہیں۔ تو جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ اس سے مایوس اور نا امید ہو گیا نتیجۃً اس نے اسے بھی قتل کر دیا، تو یہ ہے رحمت سے مایوس ہونے والے کا فعل۔ پس بھگانا اور نفرت دلانا مخلوق کو بگاڑ دیتا ہے اور آسانی وسہولت پیدا کرنا مخلوق کی اصلاح کرتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آپ کے پاس کوئی ایسا آدمی آتا جس نے قتل نہ کیا ہوتا اور وہ آپ سے پوچھتا: کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ تو آپ فرماتے: اس کے لیے کوئی توبہ نہیں، آپ اسے ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا فرماتے۔ اور جب ایسا آدمی آتا جس نے قتل کیا ہوتا اور وہ سوال کرتا: کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ تو آپ اسے فرماتے: تیرے لیے توبہ ہے۔ آپ یہ اسے آسانی اور سہولت پہنچانے کے لیے اور تالیف قلب کے لیے فرماتے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن القاسم اور ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں نقل کیا ہے جس نے حالت شرک میں طلاق دی اور پھر اسلام قبول کر لیا کہ اس کی طلاق نہیں ہے اور اسی طرح وہ آدمی جس نے قسم کھائی پھر اسلام قبول کر لیا تو اس پر حانث ہونا نہیں ہے۔ اور اسی طرح وہ آدمی جس پر یہ چیزیں واجب ہوئیں تو اس کے لیے (اسلام کے سبب) مغفرت اور بخشش ہے، لیکن وہ آدمی جس نے کسی مسلمان پر افتراء باندھا پھر اسلام قبول کر لیا یا سامان چوری کیا پھر اسلام قبول کر لیا تو اس پر افترا پردازی اور چوری کی حد قائم کی جائے گی۔ اور اگر کسی نے زنا کیا اور پھر اسلام لے آیا یا کسی مسلمان عورت کو غصب کیا پھر اسلام قبول کر لیا تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہ سب مراد لے رہا ہے جو اسلام سے پہلے ہو چکا، چاہے اس کا تعلق مال سے ہو یا دم سے یا کسی اور شے سے۔

1۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 75، حدیث نمبر 299
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 853-852
3۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 359

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہی صحیح اور درست ہے، کیونکہ ہم پہلے قول باری تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اور حدیث طیبہ: الاسلام یهدم ما قبله کی عمومیت بیان کر چکے ہیں اور اس کی دلیل وہ بھی ہے جو ہم نے آسانی باہم پہنچانے اور نفرت نہ دلانے کا معنی بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جہاں تک حربی کافر کا تعلق ہے تو اس نے حالت کفر میں دار الحرب میں جو کچھ بھی کیا ہے اس کے (اسلام کے سبب) ساقط ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اگر وہ امان لے کر ہمارے پاس آیا اور کسی مسلمان پر تہمت لگا دی تو اسے حد لگائی جائے گی اور اگر اس نے چوری کی تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اور اسی طرح ذمی نے جب کسی پر قذف لگائی تو اسے اسی کوڑے حد لگائی جائے گی اور جب اس نے چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر اس نے کسی کو قتل کیا تو اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ اور اسلام اس سے ان کو ساقط نہیں کرے گا، کیونکہ اس نے اپنا عہد حالت کفر میں ہی توڑ دیا ہے۔ یہ ابن قاسم وغیرہ کی روایت کے مطابق ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ایسے نصرانی کے بارے میں اختلاف ہے جو زنا کرتا ہے پھر اسلام قبول کر لیتا ہے، حالانکہ اس پر مسلمانوں میں سے بینہ موجود ہے، پس حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا گیا جب کہ وہ عراق میں تھے کہ اس پر نہ حد ہے اور نہ تغریب (جلاوطنی) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ اس کے موافق ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: جب اس نے اقرار اس حال میں کیا کہ وہ مسلمان تھا کہ اس نے حالت کفر میں زنا کیا ہے تو اس پر حد قائم کی جائے گی۔ اور کوفی سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 4۔ رہا مرتد جب وہ اسلام قبول کرلے درآنحالیکہ اس کی کئی نمازیں فوت ہو چکی ہوں، اس نے کئی جرائم کا ارتکاب کیا ہو اور مال ضائع کیے ہوں، تو اس کے بارے کہا گیا ہے: اس کا حکم کافر اصلی جیسا ہے جب وہ اسلام قبول کرے یا اس سے کسی شے کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جو کچھ اس نے حالت ارتداد میں کیا۔ امام شافعی نے اپنے ایک قول میں کہا ہے: اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ اور آدمیوں کے تمام حقوق لازم ہوتے ہیں، دلیل یہ ہے کہ آدمیوں کے حقوق اس کے ذمہ لازم ہیں تو پھر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی اس پر لازم ہوں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں وہ ساقط ہو جائیں گے اور جو آدمی کے حقوق ہیں وہ ساقط نہ ہوں گے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہی ہمارے علماء کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے حق سے مستغنی ہے اور آدمی اپنے حق کا محتاج ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حقوق اللہ بچوں پر واجب نہیں ہوتے لیکن حقوق العباد ان پر لازم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں عام ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّعُوْدُوْا مراد قتال کی طرف لوٹنا ہے، کیونکہ لفظ عاد جب مطلق آئے تو اس حالت کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 854-853

طرف لوٹنے کو متضمن ہوتا ہے جس پر انسان پہلے ہو اور پھر اس حالت سے (نئی حالت کی طرف) منتقل ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ہم اس آیت میں ان کفار کے لیے ایسی کوئی حالت نہیں پاتے جو سوائے قتال کے ہماری ذکر کردہ کسی کیفیت سے مشابہت رکھتی ہو۔ اور کفر کی طرف لوٹنے کی تاویل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ کفر سے جدا ہوئے ہی نہیں اور ہم نے عاد کے بارے میں جو کہا ہے کہ جب یہ مطلق ہو (تو اس کی وجہ یہ ہے) کیونکہ یہ کلام عرب میں کبھی مبتدا اور خبر پر داخل ہوتا ہے، تو اس وقت یہ بمعنی صار ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: عاد زید ملکا مراد ہے صار زید ملکا (زید بادشاہ ہو گیا) اور اسی پر امیہ بن ابی صلت کا قول ہے:

تلك المكارمُ لاقَعْبانِ من لبن　　شِيبَا بماء فعادا بعدُ أبوالاً(1)

اور یہ اس حالت کی طرف لوٹنے کو متضمن نہیں جس پر لوٹنے والا اس سے پہلے تھا۔ پس یہ اپنی خبر کے ساتھ مقید ہے اس کے بغیر اقتصار جائز نہیں، پس اس کا حکم صار کے حکم کی طرح ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ یہ عبارت وعید، تہدید اور تمثیل تمام کو جامع ہے ان کے ساتھ جو زمانہ ماضی کی امتیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ ہلاک ہوئیں۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٣٩ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۝٤٠

"اور (اے مسلمانو!) لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ باقی نہ رہے کوئی فساد اور ہو جائے دین پورے کا پورا اللہ کے لیے تو پھر اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے، وہ کیا ہی بہترین کارساز ہے اور کتنا بہترین مددگار ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ یعنی اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہے (یعنی اس میں فتنہ سے مراد کفر ہے) آیت کے آخر تک معنی و مفہوم اور اس کے الفاظ کی تفسیر سورۃ البقرہ اور دیگر مقامات پر گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝٤١

"اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس پر جسے ہم نے اتارا اپنے (محبوب) بندہ پر فیصلہ کے دن جس روز آمنے سامنے ہوئے تھے دونوں لشکر۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 527

قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ اس میں چھبیس مسائل ہیں (☆):

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ لغت میں غنیمت سے مراد وہ (مال) ہے جسے آدمی یا جماعت محنت اور کوشش کے ساتھ حاصل کرے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

وقد طوّفت فی الآفاق حتی　　رضیت من الغنیمة بالإیاب(1)

اور دوسرے شاعر نے کہا:

ومُطْعَم الغُنْم یوم الغنم مُطْعَمَهُ　　أَنَّی توجّه والمحروم محروم(2)

مغنم اور غنیمت دونوں ہم معنی ہیں: کہا جاتا ہے: غُنِم القومُ غُنْمًا (قوم کو مال غنیمت عطا کیا گیا) جاننا چاہیے کہ اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ قول باری تعالیٰ: غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ سے مراد کفار کا وہ مال ہے جسے مسلمانوں نے غلبہ اور جنگ کے ساتھ حاصل کیا ہو۔ لغت اس تخصیص کا تقاضا نہیں کرتی جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے، البتہ عرف شرع نے لفظ کو اس نوع کے ساتھ مقید کیا ہے۔ کفار کی جانب سے ہمیں جو اموال حاصل ہوتے ہیں شریعت نے انہیں دو نام دیئے ہیں: ایک غنیمت اور دوسرا فئی۔ پس وہ مال جسے مسلمان اپنے دشمن سے جدوجہد اور گھوڑوں، اونٹوں کو جنگ میں استعمال کر کے حاصل کرتے ہیں اسے مال غنیمت کہا جاتا ہے۔ اور یہ اسم اس معنی کے ساتھ لازم ہو چکا ہے حتی کہ یہ عرف بن گیا ہے۔ اور فئی، فاء یفی ء سے ماخوذ ہے جب کوئی لوٹ آئے، رجوع کر لے اور اس سے مراد ہر وہ مال ہے جو مسلمانوں کو بغیر جنگ کے اور گھوڑوں، اونٹوں کو کام میں لائے بغیر حاصل ہو جائے، جیسا کہ زمینوں کا خراج، لوگوں پر عائد ہونے والا جزیہ اور غنائم کا خمس (3)۔

اسی طرح سفیان ثوری اور عطاء بن سائب رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قسم کا مال ہیں اور ان دونوں میں خمس (پانچواں حصہ) ہے، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فئی ہر اس مال سے عبارت ہے جو مسلمانوں کو بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہو۔ دونوں معنی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور کے نزدیک یہ آیت سورت کی پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ اور ابن عبدالبر نے اس پر اجماع ہونے کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کے بعد نازل ہوئی ہے اور یہ کہ مال غنیمت کے چار خمس لشکریوں کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ اس وقت نازل ہوئی جب غنائم بدر کے بارے میں اہل بدر کے درمیان اختلاف رونما ہوا، جیسا کہ سورت کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا ہے وہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے انہوں نے کہا: محمد بن کثیر نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں سفیان نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے محمد بن سائب نے ابو صالح کے واسطہ سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 528　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　☆ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا: جب غزوۂ بدر کا دن تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: ''جس نے کسی آدمی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جس نے کسی کو قیدی بنایا تو اس کے لیے اتنا ہوگا'' (1)۔ پس انہوں نے ستر آدمیوں کو قتل کیا اور ستر کو قیدی بنایا۔

ابوالیسر بن عمرو دو قیدیوں کو لے کر آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آپ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ جس نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا، تحقیق میں دو قیدیوں کو لایا ہوں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بے شک ہمیں نہ تو اجر میں زیادتی کی خواہش نے روکا اور نہ دشمن کے سامنے بزدلی کے اظہار نے ہمیں روکا بلکہ ہم تو اس مقام پر اس خوف سے کھڑے رہے کہ کہیں مشرکین ادھر نہ مڑ آئیں، بلاشبہ آپ اگر انہیں عطا فرمائیں گے تو پھر آپ کے اصحاب کے لیے کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ راوی فرماتے ہیں: وہ کچھ کہتے رہے اور وہ کچھ کہتے رہے پس یہ آیت نازل ہوئی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ پس انہوں نے مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا، بعد ازاں یہ آیت نازل ہوئی وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ، الآیہ۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت محکم ہے، غیر منسوخ ہے اور یہ کہ مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور یہ لشکریوں کے درمیان تقسیم شدہ نہیں ہے اور اسی طرح آپ کے بعد آنے والے ائمہ کے لیے حکم ہے۔ اسی طرح مازری نے ہمارے بہت سے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے: اور یہ کہ امام وقت کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے ان سے نکال لے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور قصہ حنین سے استدلال کیا ہے۔

ابوعبید کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ بزور شمشیر فتح کیا اور وہاں کے باسیوں پر احسان فرمایا اور اسے انہیں پر واپس لوٹا دیا اور اسے تقسیم نہ کیا اور نہ اسے ان کے لیے فئی قرار دیا۔ اور بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ آپ کے بعد ائمہ کے لیے بھی یہ جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر قول باری تعالیٰ: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ کا معنی یہ ہوگا چار خمس امام کے لیے ہوں گے، اگر چاہے تو انہیں روک لے اور اگر چاہے تو انہیں لشکریوں کے درمیان تقسیم کر دے۔ اور یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اسے ذکر کر دیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مال غنیمت کی اضافت لشکریوں کی طرف کی ہے اور فرمایا ہے: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ پھر خمس کو اس کے لیے معین کر دیا جس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا اور چار خمس سے سکوت اختیار کیا۔ جیسا کہ اس ارشاد وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (النساء: 11) میں دو ثلث کے ذکر سے سکوت اختیار فرمایا، اس میں تو بالاتفاق باپ کے لیے دو ثلث ہیں۔ اسی طرح چار خمس بالاجماع لشکریوں کے لیے ہوں گے، جیسا کہ ابن منذر، ابن عبدالبر، داؤدی، مازری، قاضی عیاض اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور اس معنی کے ساتھ خبر دینا بالکل ظاہر ہے اور اس کا کچھ بیان عنقریب آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 20　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَنْفَالِ الآیہ کا معنی ہوگا۔ وہ مال جس کی امام وقت جس کے لیے چاہے مصلحت کے پیش نظر تقسیم سے پہلے تنفیل کر سکتا ہے۔
حضرت عطا اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ اس مال کے ساتھ مخصوص ہے جو مشرکوں سے مسلمانوں کی طرف بھاگ کر آئے چاہے وہ غلام ہو یا لونڈی یا کوئی جانور۔ امام وقت اس کے بارے جو پسند کرے فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انفال السرایا یعنی اس کے غنائم ہیں، اگر چاہے تو امام اس سے خمس نکالے اور اگر چاہے تو سارے کا سارا بطور تنفیل ادا کر دے۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے الامام یبعث السریۃ فیصیبون المغنم میں بیان کیا ہے: اگر چاہے تو امام سارے مال کو نفل بنا دے اور اگر چاہے تو اس کا خمس نکالے۔ اور اسے ابو عمر نے مکحول اور عطا سے بیان کیا ہے۔ حضرت علی بن ثابت نے کہا ہے: میں نے مکحول اور عطا سے امام کے بارے پوچھا جو قوم کو اس مال کی تنفیل کرتا ہے جو انہوں نے حاصل کیا، تو فرمایا: وہ ان کے لیے ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: جو اس طرف گئے ہیں انہوں نے قول باری تعالیٰ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ کی تاویل کی ہے کہ وہ مال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے آپ جہاں چاہیں اسے خرچ کر سکتے ہیں۔ اور یہ نظریہ نہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کے سوا ہے جو ہم نے اس کے بارے کتاب القبس فی شرح موطا مالک بن انس میں بیان کیا ہے۔

اور علماء میں سے کسی ایک نے اس بارے میں کوئی قول نہیں کیا جو میں جانتا ہوں کہ قول باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ، الآیہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ کے لیے ناسخ ہے، بلکہ جمہور نے کہا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے: بے شک قول باری تعالیٰ: ما غنمتم ناسخ ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کتاب اللہ میں تحریف و تبدیلی کا الزام جائز نہیں ہے۔

رہا فتح مکہ کا واقعہ تو اس میں کوئی دلیل نہیں، کیونکہ اس کی فتح میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم مکہ مکرمہ کے بارے نہیں جانتے کہ شہروں میں سے کسی کو اس کے ساتھ دو اعتبار سے مشابہت حاصل ہو: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انفال و غنائم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص فرمائے ہیں جب تک اس نے کسی دوسرے کے لیے انہیں مقرر نہیں کیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الآیہ، پس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے خاص ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ کے لیے ایسا طریقہ مقرر کیا جو دوسرے شہروں میں سے کسی کے لیے نہیں۔ اور جہاں تک حنین کے واقعہ کا تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو عوض عطا فرمایا جب انہوں نے کہا: آپ غنائم قریش کو عطا فرما رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کے خون ٹپک رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: أما ترضون أن یرجع الناس بالدنیا و ترجعون برسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم إلی بیوتکم (1) (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ دنیا ساتھ لے کر لوٹیں اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ) اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ کسی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 533

غیر کے لیے ایسا قول کرنا جائز نہیں، یہ فقط آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ قول باری تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ اپنے عموم پر نہیں ہے، بلکہ خصوص اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ پس انہوں نے اسے اجماع کے ساتھ خاص کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قاتل کے لیے مقتول کا سامان چھیننا اور سلب کرنا جائز ہے جب امام وقت اس کے بارے اعلان کرے اور اسی طرح قیدیوں کا بھی حکم ہے، اس بارے میں اختیار بلا اختلاف امام کے پاس ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اور اس سے زمین کو بھی خاص کیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے: جو مال غنیمت سونے، چاندی، تمام ساز و سامان اور قیدیوں میں سے تمہیں حاصل ہو۔ اور رہی زمین تو وہ اس آیت کے عموم میں داخل نہیں ہے، کیونکہ ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اگر دوسرے لوگ نہ ہوتے تو میں جس شہر کو بھی فتح کرتا اسے تقسیم کر دیتا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کو تقسیم فرمایا۔ اور جو دلیل اس مذہب کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے صحیح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے آپ ﷺ نے فرمایا: "عراق نے اپنا قفیز اور اپنا درہم روک لیا ہے اور شام نے اپنا مد اور اپنا دینار روک لیا ہے" (1) الحدیث۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: حدیث طیبہ میں منعت بمعنی ستمنع ہے (یعنی عنقریب روک لیں گے)

تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لشکریوں کے لیے نہیں ہوں گے، کیونکہ لشکری جس سامان کے مالک ہیں اس میں قفیز اور درہم نہیں ہوتے۔ اور اگر زمین بھی تقسیم کر دی جاتی تو غانمین کے بعد آنے والوں کے لیے کوئی شے نہ بچتی۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (الحشر: 10)

اس کا عطف اس قول پر ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ (الحشر: 8) فرمایا: بے شک وہ سامان تقسیم کیا جائے گا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دار الحرب والوں سے مال غنیمت میں سے جو بھی حاصل ہو گا چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر گھر ہو یا زمین، ساز و سامان ہو یا اس کے علاوہ کچھ، سب تقسیم کر دیا جائے گا، سوائے بالغ مردوں کے کیونکہ ان کے بارے میں امام وقت کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ انہیں بطور احسان آزاد کر دے یا قتل کر دے یا قیدی بنا لے۔ اور جو بھی ان سے لیا گیا اور قیدی بنایا گیا اس (کی تقسیم کا) طریقہ وہی ہے جو مال غنیمت کا طریقہ ہے۔ اور انہوں نے آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے۔ فرمایا: زمین بھی بالیقین مال غنیمت میں شامل ہے، لہٰذا واجب ہے کہ اسے بھی دیگر تمام غنائم کی مثل تقسیم کیا جائے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے خیبر کا جو حصہ طاقت کے ساتھ فتح کیا تھا اسے تقسیم فرما دیا۔ انہوں نے کہا ہے: اگر زمین میں خصوص کا دعویٰ کرنا جائز ہے تو پھر زمین کے علاوہ میں بھی یہ دعویٰ جائز ہو گا نتیجۃً آیت کا حکم باطل ہو جائے گا۔

اور جہاں تک سورۃ الحشر کی آیت کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حجت نہیں کیونکہ وہ تو مال فئی کے بارے میں ہے نہ کہ مال غنیمت کے بارے میں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (الحشر: 10) یہ نیا کلام ہے جو ان لوگوں کے لیے دعا کے متعلق ہے جو ایمان میں سبقت لے گئے یہ کسی اور معنی کے لیے نہیں۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل زمین

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، جلد 2، صفحہ 74

سے متعلق آپ کے توقف کے بارے میں دو وجہوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہے: یا تو وہ غنیمت ہے آپ نے اس کے رہنے والوں کو اچھا پایا اور وہ زمین اس بارے میں موزوں تھی تو آپ نے اسے وقف کر دیا اور اس طرح جریر نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے باسیوں میں سے اچھوں کو چن لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ہوازن کے قیدیوں میں اسی طرح کیا، جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے اپنے اصحاب میں سے اعلیٰ افراد کو ان چیزوں کے بارے چن لیا جو ان کے ہاتھوں میں تھیں یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو زمین وقف کی وہ مال فئی میں تھی پس اس صورت میں آپ کو کسی اور کی رضامندی کی ضرورت بھی نہ تھی۔

کوفیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ زمین کی تقسیم یا اسے قائم رکھنے اور اس پر خراج مقرر کرنے کا اختیار امام وقت کو ہے۔ اور یہ زمین اسی طرح ان کی ملکیت ہو جاتی ہے جیسے صلح سے حاصل کی ہوئی زمین۔

ہمارے شیخ ابو العباس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گویا یہ دو دلیلوں کو جمع کرنا اور دو مذہبوں کے درمیان ایک درمیانی رائے ہے اور یہی وہ ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ بالیقین سمجھے، اسی لیے آپ نے فرمایا: اگر دوسرے لوگ نہ ہوتے، پس آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کے منسوخ ہونے کی کوئی خبر نہ دی اور نہ ہی ان کے ساتھ ان کی تخصیص کی خبر دی ہے، مگر کوفیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل پر کچھ اضافہ کیا ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی مصالح پر اسے وقف کیا اور اہل صلح کو اس کا مالک نہیں بنایا اور انہوں (کوفیوں) نے یہ کہا ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ اہل صلح کو اس کا مالک بنا دے۔

مسئلہ نمبر 4۔ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے موقف اختیار کیا ہے کہ مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں ہے اور اس کا حکم مال غنیمت کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امیر کہے: جس نے کسی کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا سامان اس کے لیے ہوگا، تو اس صورت میں وہ سامان اسی کے لیے ہوگا۔

لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، طبری اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ہر حال میں چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا، چاہے امام نے وہ اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے: بلاشبہ چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا بشرطیکہ اس نے اسے سامنے سے آتے ہوئے قتل کیا ہو۔ اور جب اس نے اسے پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے پیچھے سے جا کر قتل کیا تو سلب کیا ہوا مال اس کے لیے نہیں ہوگا۔ اصحاب شافعی میں سے ابو العباس بن سریج نے کہا ہے: یہ حدیث من قتل قتیلا فلہ سلبہ (1) اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ جس نے کسی قیدی یا عورت یا بوڑھے کو قتل کیا تو ان میں سے کسی سے چھینا ہوا مال اس کا نہ ہوگا۔ اور اسی طرح جس نے کسی زخمی کو مار دیا اور اسے قتل کر دیا جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کٹے ہوئے تھے (تو ان کا سامان قاتل کے لیے نہ ہوگا) فرمایا: اس شکست خوردہ کا حکم بھی اسی طرح ہے، جس کے شکست کھانے میں اور پسپا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، تو وہ بندھے ہوئے آدمی کی مثل ہے۔ فرمایا: پس اس سے معلوم ہو گیا کہ سلب شدہ مال کو جو قاتل کے لیے بنایا گیا ہے تو وہ کسی زائد معنی کی وجہ سے ہے یا پھر اس کے لیے ہے جس کے قتل میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 87

فضیلت ہو اور وہ قاتل کے سامنے ہونا ہے، کیونکہ اس صورت میں (مقابلے کی) مشقت ہوتی ہے۔ اور رہا وہ جس کے لیے زخموں کے سبب مقابلہ کرنا یا بھاگنا دوڑنا مشکل ہو جائے تو اسے قتل کرنے میں سامان قاتل کے لیے نہ ہوگا۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا، چاہے وہ اسے سامنے سے آتے ہوئے قتل کرے یا پیٹھ کے پیچھے سے، بھاگتے ہوئے یا مقابلہ کرتے ہوئے بشرطیکہ وہ میدان جنگ میں ہو۔

اس کا رد اس روایت میں ہوتا ہے جس کا ذکر عبدالرزاق اور محمد بن بکر نے ابن جریج سے کیا ہے انہوں نے کہا میں نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ہم مسلسل یہ سنتے رہے ہیں کہ جب مسلمان اور کفار میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل ہوں اور مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کفار میں سے کسی آدمی کو قتل کر دے تو بلاشبہ اس کا چھینا ہوا مال اس کے لیے ہوگا، مگر یہ کہ وہ انتہائی زوردار جنگ کے دوران قتل ہو، کیونکہ اس وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے اسے قتل کیا ہے۔ پس اس قول کا ظاہر طبری کے اس قول کا رد کرتا ہے کہ انہوں نے چھینے ہوئے مال میں یہ شرط لگائی ہے کہ قتل میدان جنگ میں ہو۔ اور ابوثور اور ابن منذر نے بیان کیا ہے کہ چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا چاہے وہ میدان جنگ میں ہو یا باہر، سامنے کی جانب ہو یا پیچھے کی جانب، بھاگتے ہوئے یا مقابلے کے لیے شوخی کا اظہار کرتے ہوئے ہو، تمام حالتوں میں (چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا) کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عام ہے: مَنْ قتل قتیلا فله سلبه(1) (جس کسی نے کسی مقتول کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا مال اس کے لیے ہوگا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں بنی ہوازن کی جنگ میں شریک تھے پس اس اثناء میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک سرخ اونٹ پر ایک آدمی آیا، اس نے اپنا اونٹ بٹھایا، پھر اونٹ کے تنگ سے رسی کھولی اور اس کے ساتھ اونٹ کو باندھ دیا، پھر آگے بڑھا اور قوم کے ساتھ مل کر کھانا کھانے لگا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اور ہم میں کمزور لوگ بھی تھے ان کی سواریاں بھی نحیف اور لاغر تھیں اور بعض ہم میں پیدل تھے، جب کہ وہ تیزی کے ساتھ نکلا، اپنی سواری کے پاس آیا، اس کی رسی (ڈھنگا) کو کھولا پھر اسے بٹھایا اور اس پر بیٹھ گیا اور اسے تیز چلا دیا اور اونٹ اسے لے کر خوب تیزی سے چلنے لگا، تو ایک آدمی نے خاکستری رنگ کی اونٹنی پر اس کا پیچھا کیا۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں انتہائی تیزی کے ساتھ نکلا اور میں اونٹنی کی سرین کے قریب ہو گیا، پھر میں مزید آگے بڑھا یہاں تک کہ میں اونٹ کی سرین کے قریب ہو گیا، پھر مزید آگے بڑھا یہاں تک کہ اونٹ کی مہار کو پکڑ لیا اور اسے بٹھایا، پس جب اس نے اپنا گھٹنا زمین پر رکھا میں نے اپنی تلوار سونتی اور اس آدمی کے سر پر ماری تو وہ گر پڑا (یعنی مر گیا) پھر میں اس اونٹ کو پکڑ کر لے آیا، اس پر اس کا کجاوہ (بمع ساز و سامان) اور اس کے ہتھیار بھی تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا استقبال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور لوگ بھی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کس نے اس آدمی کو قتل کیا''؟ لوگوں نے عرض کی: ابن

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 87

اکوع نے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لہ سلبہ اجمع (1) اس سے چھینا ہوا تمام مال اس کے لیے ہے۔ پس یہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اسے بھاگتے ہوئے قتل کیا نہ کہ سامنے سے آتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے چھینا ہوا مال اسے عطا فرما دیا۔ اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے حجت ہے کہ امام کی اجازت کے بغیر قاتل سلب شدہ مال کا مستحق نہیں ہوتا، کیونکہ اگر نفس قتل کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے ثابت ہو جاتا تو آپ کو یہ قول مکرر لانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور آپ کی حجت وہ روایت بھی ہے جسے ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ابو الاحوص نے اسود بن قیس سے انہوں نے بشر بن علقمہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ جنگ قادسیہ کے دن میں نے ایک آدمی کو دعوت مبارزت دی اور میں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال لے لیا، پھر میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو خطاب کیا پھر فرمایا: یہ بشر بن علقمہ کا چھینا ہوا مال ہے اور یہ بارہ ہزار درہم سے بہتر (اور زیادہ) ہے۔ اور ہم نے یہ اسے بطور تنفیل (انعام) دے دیا۔ پس اگر چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوتا اور محض حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضا سے ہوتا تو پھر اس چیز کی ضرورت نہ ہوتی کہ وہ اپنے اجتہاد کے ساتھ امر کی نسبت اپنی ذاتوں کی طرف کریں اور یقیناً قاتل ان کے امر کے بغیر اس سامان کو لے سکتا۔ واللہ اعلم

اور صحیح میں ہے کہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے اپنی تلواروں کے ساتھ ابو جہل پر حملہ کیا، یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر وہ دونوں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''تم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے''؟ تو ان دونوں میں سے ہر ایک نے عرض کی: میں نے اسے قتل کیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں تلواروں کو غور سے دیکھا اور فرمایا: ''تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے'' (2)۔ اور پھر اس سے چھینے ہوئے مال کا فیصلہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کے حق میں فرمایا۔ تو یہ اس پر نص ہے کہ سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں، کیونکہ اگر اس کے لیے ہوتا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ان دونوں کے درمیان تقسیم فرما دیتے۔

اور صحیح میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے انہوں نے کہا: میں ان کے ساتھ نکلا جو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں غزوۂ موتہ کے لیے نکلے تھے۔ اور یمن سے آنے والے معاونین اور مددگاروں میں سے ایک آدمی نے میری مرافقت اور سنگت اختیار کی۔ آگے حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اے خالد! کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلب کیے ہوئے مال کا فیصلہ قاتل کے لیے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، لیکن میں اسے کثیر سمجھتا ہوں (3)۔ ابو بکر برقانی نے اپنی اس اسناد کے ساتھ اسے روایت کیا ہے جس کے ساتھ مسلم نے اسے روایت کیا اور اس میں یہ زائد ذکر کیا کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلب کیے ہوئے مال کا خمس نہیں نکالا اور بے شک وہ معاون و مددگار غزوۂ موتہ میں ان کا ساتھی تھا جو شام کی طرف سے آیا ہوا تھا، اس نے کہا: ان میں سے ایک رومی بڑی شدت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرنے لگا اور وہ اشقر (سرخ و زرد رنگ) گھوڑے پر سوار تھا۔ زین سنہری تھی، کمر کا کپڑا لتھڑا ہوا تھا اور تلوار سونے کے ساتھ آراستہ کی ہوئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: وہ انہیں اکسار ہا تھا، فرمایا: پس میرا معاون

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 89-88 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 88 3۔ ایضاً

ان کے لیے مہربان ہوا (یعنی اس نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا) یہاں تک کہ اس کے پاس سے گزرا اور اس کے گھوڑے کی کونچوں پر وار کیا اور وہ گر پڑا اور اس نے اسے تلوار کے ساتھ اٹھایا اور اسے قتل کر دیا اور اس کا اسلحہ لے لیا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے وہ اسے دیا اور اس میں سے کچھ روک لیا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس میں نے انہیں کہا: یہ سارے کا سارا اسے عطا فرما دو۔ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا ہے: السلب للقاتل (سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے ہے) انہوں نے فرمایا: ہاں، لیکن میں اسے زیادہ خیال کرتا ہوں۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میرے اور ان کے درمیان گفتگو ہوئی، تو میں نے انہیں کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور آگاہ کروں گا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم نے اسے کیوں نہیں دیا''؟ تو انہوں نے عرض کی: میں نے اسے بہت زیادہ سمجھا۔ آپ نے فرمایا: ''پس تم اسے وہ سب دے دو'' تو میں نے انہیں کہا: کیا میں نے آپ کے لیے وہ وعدہ پورا نہیں کر دیا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا؟ راوی کہتے ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں ہو گئے اور فرمایا: ''اے خالد تو اسے نہ دینا کیا تم میرے لیے میرے امراء (افسر) کو چھوڑ رہے ہو'' (1)۔ تو یہ اس پر واضح دلیل ہے کہ قاتل سلب کیے ہوئے مال کا نفس قتل سے مستحق نہیں ہوتا، بلکہ امام کی رائے اور اس کی نظر سے اس کا مستحق ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے کہا ہے: سوائے خاص مقابلہ کے سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ چھینے ہوئے مال سے خمس نکالنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور ابواسحاق نے کہا ہے: اگر چھینا ہوا مال تھوڑا ہو تو وہ قاتل کے لیے ہوگا اور اگر زیادہ ہو تو پھر اس سے خمس لیا جائے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ہی کیا جس وقت وہ مرزبان کے مقابل ہوئے اور اسے قتل کر دیا، تو اس کے کمر بند اور اس کے کنگنوں کی قیمت تیس ہزار تھی تو آپ نے اس کا خمس نکالا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے مشرکین کے سو آدمی قتل کیے مگر مقابلہ ایک آدمی کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے حب زارہ (بحرین کا ایک گاؤں) پر حملہ کیا تو الزارہ کے دہقان نکل آئے اور انہوں نے کہا: ایک ایک آدمی ایک دوسرے کے مقابل تھا، پس حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اس (مرزبان) سے مقابلہ کیا دونوں کی ایک دوسرے کے خلاف تلواریں چلیں، پھر دونوں نے ایک دوسرے کا گلا پکڑ لیا اور حضرت براء نے اسے سرین کے بل گرا دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گئے، پھر تلوار پکڑی اور اسے ذبح کر دیا۔ اس کے ہتھیار اور اس کا کمر بند اٹھا لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے، تو آپ نے ہتھیار انہیں بطور انعام (نفل) عطا فرما دیئے اور کمر بند کی تیس ہزار قیمت لگائی پھر اس سے خمس نکالا اور فرمایا: بے شک یہ مال ہے۔ اور امام اوزاعی اور مکحول رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: چھینا ہوا مال، مال غنیمت ہے اور اس میں خمس بھی ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی حجت وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 88

عوف بن مالک اشجعی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول سے چھینے ہوئے مال کا قاتل کے لیے فیصلہ فرمایا اور اس چھینے ہوئے مال سے خمس نہیں لیا۔

مسئلہ نمبر 6۔ جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سلب کیا ہوا مال قاتل کو نہیں دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ اس قتل کرنے پر گواہ پیش کرے۔ ان میں سے اکثر نے کہا ہے: ایک شاہد کی شہادت کافی ہوگی۔ ان کی بنیاد حضرت ابوقتادہ کی حدیث پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو گواہ ہوں یا پھر ایک شاہد ہو اور ساتھ قسم بھی ہو۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قاتل کو چھینا ہوا مال صرف دعویٰ کے ساتھ دے دیا جائے گا، اس کے استحقاق کے لیے بینہ شرط نہیں ہے، بلکہ اگر وہ اس پر متفق ہو جائے تو پھر تنازعہ ختم کرنے کے لیے بینہ لانا اولیٰ ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو مقتول سے چھینا ہوا مال بغیر کسی شہادت اور قسم کے عطا فرمایا۔ اور ایک آدمی کی شہادت کافی نہیں ہوگی اور نہ صرف اس کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ لیث بن سعد نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: میں نے اپنے شیخ الحافظ المنذری الشافعی ابو محمد عبدالعظیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسود بن خزاعی اور عبداللہ بن انیس کی شہادت کے ساتھ انہیں مقتول کا مال عطا فرمایا۔ اس بنا پر تو نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اشکال زائل ہو جاتا ہے اور حکم جاری رہے گا۔ اور رہے مالکیہ! تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ امام وقت کو اس بارے میں بینہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ ابتداءً امام کی طرف سے عطیہ ہے، پس اگر وہ شہادتیں شرط قرار دے تو اسے یہ اختیار ہے اور اگر شرط نہ قرار دے تو یہ جائز ہے کہ وہ اسے بغیر شہادت کے عطا کر دے۔

مسئلہ نمبر 7۔ سلب کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ بس ہتھیار اور وہ تمام چیزیں جو جنگ کے لیے ضرورت ہوتی ہے اس کے سلب ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے اور گھوڑا بھی اس میں داخل ہے اگر اس نے اس پر قتال کیا ہو اور اس سے اسے گرایا گیا ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے گھوڑے کے بارے کہا ہے کہ وہ سلب میں شامل نہیں ہے۔ اس طرح اگر اس کی تھیلی اور کمر بند میں دنانیر یا جواہر یا اسی طرح کی اور کوئی شی ہو تو بالاتفاق وہ مال سلب میں سے نہیں ہے۔ اور اس مال کے بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ وہ جنگ کے لیے مزین اور آراستہ ہوتا ہے، پس امام اوزاعی نے کہا ہے: وہ سارے کا سارا مال سلب میں سے ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: وہ سلب میں سے نہیں ہے۔ اور یہ حضرت سحنون رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، سوائے کمر بند کے کیونکہ ان کے نزدیک وہ سلب میں سے ہے۔ اور ابن حبیب نے "الواضحہ" میں کہا ہے: کنگن مال سلب میں سے ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ابو عبید نے کہا ہے: یہ اس سورت کی پہلی آیت قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ کے لیے ناسخ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم بدر میں سے خمس نہیں نکالا تھا، پس اس آیت کے ساتھ خمس نہ نکالنے کے بارے میں آپ کا فیصلہ منسوخ ہو گیا، مگر صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے: کہ "بدر کے دن

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت

مال غنیمت میں سے میرے حصے میں دوسال کی اونٹنی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن خمس سے دو سال کی اونٹنی مجھے عطا فرمائی"(1) الحدیث۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس نکالا، پس اگر معاملہ اس طرح ہے تو پھر ابو عبید کا قول مردود ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ خمس جس کا ذکر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا ہے وہ ان غزوات میں سے کسی کا ہو جو بدر اور احد کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ اور وہ غزوۂ بنی سلیم، غزوہ بنی مصطلق، غزوہ ذی امر اور غزوہ بحران ہیں۔ ان میں کوئی یادگار جنگ تو نہیں ہوئی لیکن یہ ممکن ہے کہ مال غنیمت حاصل کیا گیا ہو(2)۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول میں یومئذ کے الفاظ رد کرتے ہیں، کیونکہ اشارہ اس دن کی طرف ہے جس میں بدر کے غنائم کو تقسیم کیا گیا، مگر یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ خمس سے ہو اگرچہ بدر کے غنائم سے خمس نہ بھی نکالا گیا ہو، (وہ) سریہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے خمس میں سے ہو، کیونکہ وہی پہلا مال غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوا اور پہلا خمس ہے جو اسلام میں نکالا گیا تھا۔ بعد ازاں قرآن کریم میں وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وا الا ارشاد نازل ہوا۔ اور یہ پہلی تاویل سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 9۔ قول باری تعالیٰ: ما غنمتم میں ما بمعنی الذی ہے اور اس میں ھا ضمیر محذوف ہے۔ (اصل میں) الذی غنمتموہ ہے۔ اور اس میں (یعنی فان فیہ) فا داخل کی گئی ہے کیونکہ کلام میں مجازات کے معنی ہیں اور دوسرا ان پہلے کے لیے تاکید ہے۔ اور اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور یہ ابو عمرو سے مروی ہے۔ حسن نے کہا ہے: یہ مفتاح کلام ہے۔ دنیا اور آخرت اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے، اسے نسائی نے ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فئی اور خمس کے بارے کلام کا آغاز اپنی ذات کے ذکر سے کیا ہے، کیونکہ یہ دونوں انتہائی اشرف و اعلیٰ کسب (کمائی) ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی میل ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ خمس کی تقسیم کی کیفیت میں علماء کے مابین اختلاف ہے اس بارے چھ اقوال ہیں:

(1) ایک جماعت نے کہا ہے: خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، پس چھٹا حصہ کعبہ معظمہ کے لیے رکھا جائے گا اور یہی وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور دوسرا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا۔ تیسرا حصہ ذوی القربیٰ کے لیے۔ چوتھا یتامیٰ کے لیے۔ پانچواں حصہ مساکین کے لیے۔ اور چھٹا حصہ ابن سبیل کے لیے ہوگا۔ یہ قول کرنے والوں میں سے بعض نے کہا ہے: وہ حصہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۲) ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے: مال غنیمت پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا، پھر ان میں سے ایک حصہ الگ کر لیا جائے گا اور بقیہ چار حصے لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے، پھر اس جدا کیے گئے حصہ پر اپنا ہاتھ مارا جائے گا پس اس میں سے جس شی پر قبضہ کر لیا گیا اسے کعبہ معظمہ کے لیے مقرر کر دیا جائے، پھر اس باقی ماندہ حصہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کر دیا جائے گا، ایک حصہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا، ایک حصہ ذوی القربیٰ کے لیے، ایک یتامیٰ کے لیے، ایک حصہ مساکین کے لیے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، جلد 2، صفحہ 63　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 529

ایک حصہ ابن سبیل کے لیے ہوگا۔

(۳) منہال بن عمرو نے کہا ہے: میں نے عبداللہ بن محمد بن علی اور علی بن حسین سے خمس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ ہمارے لیے ہے۔ میں نے علی کو کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ تو انہوں نے فرمایا: مراد ہمارے یتیم اور ہمارے مساکین ہیں۔

(۴) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اسے پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ کو ایک قرار دیا ہے اور یہ کہ اسے مومنین کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ اور بقیہ چار حصے آیت میں مذکور چار صنفوں پر خرچ کیے جائیں گے۔

(۵) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے تین حصوں پر تقسیم کیا جائے گا: یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل پر۔ اور آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا حکم آپ کے وصال کے ساتھ ختم ہو چکا ہے، جیسا کہ آپ کے اپنے حصہ کا حکم ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: خمس کو پلوں کی اصلاح، مساجد کی تعمیر، قضاۃ اور لشکریوں کی تنخواہ وغیرہ کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح کا حکم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

(۶) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے امام کی رائے اور اجتہاد کے سپرد کر دیا جائے گا۔ پس وہ اس سے بغیر اندازے کے لے سکتا ہے اور اس سے اجتہاد کے ساتھ رشتہ داروں کو دے سکتا ہے اور باقی ماندہ مسلمانوں کے مصالح کے لیے خرچ کرے گا۔ اسی طرح خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اور اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: مالی مما أفاء الله علیکم إلا الخمس والخمس مردود علیکم (1) ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال غنیمت عطا فرمایا ہے میرے لیے اس میں سے سوائے خمس کے کچھ نہیں اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جائے گا''۔ کیونکہ آپ نے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور نہ تین حصوں میں اور آیت میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض ان پر تنبیہ کے لیے ذکر کر دیا گیا، کیونکہ وہ ان میں سے زیادہ اہم ہیں جنہیں وہ دیا جا سکتا ہے۔ زجاج نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمائیے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں''۔

اور آدمی کے لیے بالاجماع ان اصناف کے علاوہ کہیں اور خرچ کرنا جائز ہے جب وہ اسے زیادہ مستحق سمجھے۔ اور نسائی نے حضرت عطا سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا خمس اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس ایک ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے لیتے تھے اور اس سے عطا بھی فرماتے تھے اور اسے جہاں چاہتے خرچ کرتے اور اس سے جو چاہتے بناتے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلِذِی الْقُرْبٰى اس میں لام بیان استحقاق اور ملکیت کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ مصرف اور

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصدقات، جلد 7، صفحہ 17

محل بیان کرنے کے لیے ہے اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ فضل بن عباس اور ربیعہ ابن عبدالمطلب دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، ان میں سے ایک نے گفتگو کی اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ تمام لوگوں سے زیادہ نیک ہیں (1) اور عام لوگوں سے بڑھ کر آپ لوگوں کو ملانے والے ہیں۔ تحقیق ہم نکاح کی عمر کو پہنچ چکے ہیں ہم آپ کے پاس حاضر ہیں تاکہ آپ ہمیں ان بعض صدقات پر امارت عطا فرما دیجئے، تو ہم آپ کو اسی طرح ادا کریں گے جیسے لوگ ادا کرتے ہیں اور ہم اسی طرح حصہ دیں گے جیسے لوگ دیتے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طویل وقت تک خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے آپ سے کلام کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ فرماتے ہیں: حضرت زینب رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے ہمیں اشارہ فرما رہی تھیں کہ تم آپ سے کلام نہ کرنا۔ راوی کا بیان ہے: پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال نہیں بلاشبہ وہ لوگوں کی میل ہے، تم دونوں محمیہ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ وہ خمس پر مامور تھے۔ اور نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو بلا کر لاؤ''۔ بیان فرمایا: پھر وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے محمیہ کو فرمایا: ''تو اس بچے یعنی فضل بن عباس کا نکاح اپنی بچی سے کر دے''۔ تو اس نے ان کا نکاح کر دیا اور نوفل بن حارث کو فرمایا: ''تو اس بچے یعنی ربیعہ بن عبدالمطلب کا نکاح اپنی بیٹی سے کر دے'' اور پھر محمیہ کو فرمایا: ''تو ان دونوں کی طرف سے خمس میں سے اتنا اتنا صدقہ کر دے''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال فئی عطا فرمایا ہے اس میں سے سوائے خمس کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور وہ خمس بھی تم پر لوٹا دیا گیا ہے''۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ تمام اصناف کو عطا کیا اور بعض کو بھی اور آپ نے اس میں سے مؤلفۃ قلوب کو بھی دیا۔ اور یہ ان میں سے نہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تقسیم میں فرمایا ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق بخشنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ علماء نے ذوی القربیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور اس بارے میں تین اقوال ہیں:

(۱) تمام کے تمام قریش، یہ قول بعض سلف نے کہا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صفا پہاڑی پر چڑھے اور آپ بلند آواز سے پکارنے لگے: ''اے بنی فلاں، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی کعب، اے بنی مرہ، اے بنی عبد شمس اپنے آپ کو آتش جہنم سے بچالو'' (الحدیث) عنقریب اس کا بیان سورۃ الشعراء میں آئے گا۔

(۲) امام شافعی، امام احمد، ابو ثور، مجاہد، قتادہ، ابن جریج اور مسلم بن خالد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ذوی القربیٰ کا حصہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے درمیان تقسیم فرمایا تو فرمایا: ''بلاشبہ انہوں نے مجھے جدا نہیں کیا نہ زمانہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں بے شک بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب (2) ایک ہی شے ہیں''۔ اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے جال بنایا، اسے نسائی اور بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیث نے بیان کیا کہ مجھے یونس نے بتایا اور یہ زائد بیان کیا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی عبد شمس اور بنی نوفل کے لیے کوئی شے تقسیم نہیں کی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 344　2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 81

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: عبد شمس، ہاشم، مطلب یہ سب ماں کی جانب سے بھائی ہیں اور ان کی ماں عاتکہ بنت مرہ تھی اور نوفل ان کے باپ کی جانب سے ان کا بھائی تھا۔ امام نسائی نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ذوی القربیٰ کو حصہ دیا اور وہ (ذوی القربیٰ) بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں، ان میں غنی بھی ہیں اور فقیر بھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ان میں سے فقیر کے لیے تو حصہ ہے لیکن غنی کے لیے نہیں، جیسا کہ یتامیٰ اور ابن سبیل کے لیے ہے۔ اور میرے نزدیک راہ صواب کے زیادہ قریب دونوں قولوں میں سے یہی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس میں صغیر و کبیر اور مونث و مذکر سبھی برابر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لیے قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان میں اسے تقسیم فرمایا ہے۔ اور حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہو۔

(۳) ذوی القربیٰ سے مراد صرف بنو ہاشم ہیں۔ اسے مجاہد اور علی بن حسین نے بیان کیا ہے۔ اور یہی امام مالک، ثوری اور اوزاعی وغیرہم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ جب اللہ تعالیٰ نے خمس کا بیان فرمایا ہے اور بقیہ چار حصوں سے سکوت فرمایا ہے، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ لشکریوں کی ملکیت ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ بیان کیا ہے: ”جس بستی کے رہنے والوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نافرمانی کی تو بلاشبہ اس بستی کا خمس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ہے پھر وہ تمہارے لیے ہے“ (1)۔ اور یہ وہ ہے جس میں نہ امت کے درمیان اختلاف ہے اور نہ ہی ائمہ کے درمیان، جیسا کہ اسے علامہ ابن عربی نے احکام وغیرہ میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ کہ اگر امام قیدیوں کو رہا کر کے ان پر احسان کرنا چاہے تو وہ کر لے۔ اور ان میں غانمین کے حقوق باطل ہو جائیں گے، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ثمامہ بن اثال وغیرہ کے ساتھ کیا اور فرمایا: ”اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا پھر وہ ان قیدیوں (مراد بدر کے قیدی ہیں) کے بارے گفتگو کرتا تو میں اس کے لیے انہیں چھوڑ دیتا“ (2)۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے در حقیقت قریش مکہ کے معاہدہ کو توڑنے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا اس کے بدلہ کے لیے آپ نے یہ فرمایا: اور امام کو اختیار ہے کہ وہ تمام قیدیوں کو قتل کر دے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط کو قیدیوں کے درمیان سے پکڑ کر قتل کر دیا اور اسی طرح نضر بن حارث کو صفراء کے مقام پر پکڑ کر قتل کیا اور یہ وہ حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے دوسرے لشکریوں کے حصہ کی طرح حصہ ہوتا تھا چاہے آپ جنگ میں حاضر ہوتے یا وہاں سے غائب ہوتے۔ اور صفی کا حصہ بھی ہوتا، آپ تلوار، تیر یا خادم یا کوئی جانور چن سکتے تھے۔ حضرت صفیہ بنت حیی خیبر کے غنائم میں سے چنی ہی گئی تھیں (3)۔ اور اسی طرح ذوالفقار (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلوار کا نام ہے) بھی صفی میں سے تھی (4)۔ اور یہ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مگر ابو ثور کے نزدیک اب

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، صفحہ 74　　2۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الجہاد، جلد 5، صفحہ 209

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، حدیث نمبر 2600، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 1485۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بھی امام وقت کے لیے یہ حصہ باقی ہے وہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کے استعمال کی جگہ استعمال کر سکتا ہے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ اہل جاہلیت اپنے سردار کے لیے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ رکھتے تھے۔ ان کے شاعر نے کہا ہے:

لك المرباع منها والصفايا وحُكْمُك والنشيطةُ والفضول

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

مِنَّا الذی رَبَعَ الجیوش لصُلبه عشرون وهو یُعَدّ فی الأحیاء

کہا جاتا ہے: رَبَعَ الجیشَ یَرْبَعهٗ رباعة جب وہ مال غنیمت کا چوتھائی حصہ لے لے۔ اصمعی نے کہا ہے: جاہلیت میں چوتھائی حصہ تھا اور اسلام میں پانچواں حصہ ہے۔ پس اس وقت سردار بغیر کسی شریعت اور دین کے مال غنیمت سے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور اس سے جو چاہتا چن لیتا تھا، پھر صفی کے بعد جس شی کے بارے چاہتا اسی کے مطابق وہ فیصلہ کر دیتا اور گھریلو سامان اور دیگر ساز و سامان میں سے کوئی شی جو اس سے الگ ہوتی اور اس سے بچتی وہ اس کے لیے ہوتی، پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس کے لیے دین کا حکم نافذ فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صفی (چناؤ) کا حصہ باقی رکھا اور زمانہ جاہلیت کا حکم ساقط کر دیا۔

اور عامر شعبی نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک حصہ تھا وہ صفی کہلاتا تھا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غلام یا کنیز یا گھوڑے میں سے چاہتے تو آپ اسے خمس نکالنے سے پہلے چن سکتے تھے، اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا: پس کسی غلام سے ملتے اور کہتے: ''اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت عطا نہیں کی اور تجھے سردار نہیں بنایا اور تیری شادی نہیں کروائی اور تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ کو مسخر نہیں کیا اور تجھے چھوڑ نہیں دیا تو سردار بن جا اور چوتھائی لے'' (1) الحدیث۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ترب کا معنی ہے تأخذ المرباع یعنی تیری قوم کو غنائم اور دیگر کمائی میں سے جو مال حاصل ہوتا ہے اس سے چوتھائی لے۔ بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ خمس کا خمس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا آپ اسے اپنی اولاد اور اپنی ازواج مطہرات کی حاجات پورا کرنے کے لیے خرچ کرتے تھے اور اپنے سال بھر کی خوراک اس سے ذخیرہ کر لیتے تھے۔ اور باقی ماندہ گھوڑوں اور اسلحہ وغیرہ میں خرچ کرتے تھے۔ اسے وہ روایت رد کرتی ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: بنی نضیر کے اموال ان میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے لیکن اس پر مسلمانوں نے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ کوئی سعی نہیں کی، پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھے، آپ اس میں سے اپنی ذات پر سال بھر کی خوراک خرچ کرتے تھے اور ما بقی فی سبیل اللہ گھوڑوں اور اسلحہ کی تیاری میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا: والخمس مردود علیکم ''اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا گیا ہے''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

مسئلہ نمبر 14۔ کتاب اللہ میں گھوڑ سوار کو پیدل پر فضیلت دینے کے بارے کچھ نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ ہے کہ وہ سب برابر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خمس کے بعد بقیہ چار حصے ان کے لیے رکھے ہیں اور اس میں پیدل کو گھوڑ سوار سے خاص نہیں کیا۔ اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخبار وارد نہ ہوتیں تو یقیناً گھوڑ سوار پیدل کی طرح ہوتا، غلام آزاد کی مثل ہوتا اور بچہ بالغ کے برابر ہوتا۔

علماء نے ان چار حصوں کی تقسیم میں اختلاف کیا ہے، پس وہ موقف جو اس بارے میں عام اہل علم نے اپنایا ہے اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ گھوڑ سوار کو دو حصے دیئے جائیں گے اور پیدل کو ایک حصہ۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے ان میں امام مالک بن انس ہیں اور اہل مدینہ میں سے جو ان کے متبعین ہیں۔ اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اہل شام میں سے وہ جنہوں نے ان سے موافقت کی ہے۔ اور اسی طرح ثوری اور اہل عراق میں جو ان کے ہم خیال ہیں نے کہا ہے اور یہی لیث بن سعد کا قول ہے اور ان اہل مصر میں سے جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب نے کہا ہے۔ اسی کے مطابق امام احمد بن حنبل، اسحاق، ابوثور، یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے سوائے حضرت نعمان (امام ابوحنیفہ) کے جس نے اس میں اختلاف کیا ہو، کیونکہ آپ نے اس میں سنن اور جس نظریہ پر قدیم وجدید عظیم اہل علم ہیں سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: گھوڑ سوار کو بھی صرف ایک حصہ دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے شبہ واقع ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑ سوار کے لیے دو حصے رکھے اور پیدل کے لیے ایک حصہ۔ اسے دار قطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: رمادی نے کہا ہے اسی طرح ابن نمیر کہتے ہیں کہ ہمیں نیشاپوری نے بتایا: یہ میرے نزدیک ابن ابی شیبہ یا رمادی کی جانب سے وہم ہے۔ کیونکہ امام احمد بن حنبل اور عبد الرحمن بن بشر وغیرہما نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی اور اس کے گھوڑے کے لیے تین حصے مقرر کیے، ایک حصہ آدمی کے لیے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے (1)۔ اسی طرح اسے عبد الرحمن ابن بشر نے عبد اللہ بن نمیر سے انہوں نے عبید اللہ بن عمر سے انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور پوری حدیث ذکر کی ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے لیے دو حصے اور اس کے مالک کے لیے ایک حصہ مقرر کیا (2)۔ اور یہ نص ہے۔ اور تحقیق دار قطنی نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن مجھے چار حصے عطا فرمائے، دو حصے میرے گھوڑے کے لیے، ایک حصہ میرے لیے اور ایک حصہ ذوی القرابہ میں سے میری ماں کے لیے۔ اور ایک روایت میں ہے: اور ایک حصہ ان کی ماں کے لیے تھا وہ ذوی القربیٰ کا حصہ تھا۔ اور انہوں نے بشر بن عمرو بن محصن سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھوڑے کے لیے چار حصے عطا فرمائے اور میرے لیے ایک حصہ، پس میں نے پانچ حصے لیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے:

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 41
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 401

بے شک یہ امام کے اجتہاد کی طرف راجع ہے (یعنی ان کے سپرد ہے) جو اس کی رائے ہو گی وہ نافذ ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15۔ گھڑ سوار اور پیدل کے درمیان ایک سے زیادہ گھوڑوں کے ساتھ فرق نہیں کیا جائے گا (یعنی گھڑ سوار کے لیے صرف ایک گھوڑے کا اعتبار ہو گا اس سے زائد گھوڑوں کا اعتبار نہ ہو گا۔) یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک سے زیادہ گھوڑوں کا حصہ بھی دیا جائے گا، کیونکہ اس کی مشقت زیادہ ہے اور منفعت عظیم ہے۔ اس کے مطابق ہمارے اصحاب میں سے ابن الجہم نے بیان کیا ہے اور اسے سحنون نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ایک گھوڑے سے زیادہ کو حصہ عطا فرمایا اور اسی طرح آپ کے بعد ائمہ بھی ہیں، کیونکہ دشمن کے لیے قتال کرنا ممکن نہیں ہے مگر صرف ایک گھوڑے پر اور جو اس سے زائد ہوں گے وہ محض تیاری میں زیادتی اور سہولت و آسانی کے لیے ہوں گے۔ اور وہ حصوں کی زیادتی میں موثر نہیں ہوں گے۔ تو یہ اس کی طرح ہے جس کے پاس زیادہ تلواریں یا نیزے ہوں اور اسی میں قیاس تیسرے اور چوتھے نمبر کا ہے۔ اور سلیمان بن موسیٰ سے روایت ہے: اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا جس کے پاس گھوڑے ہوں۔ ہر گھوڑے کے لیے ایک حصہ ہو گا۔

مسئلہ نمبر 16۔ صرف عربی گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا، کیونکہ ان میں کر وفر ہے اور رومی گھوڑے اس معاملہ میں ان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور جو اس طرح نہیں ان کے لیے کوئی حصہ نہ ہو گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر امام وقت ان کی اجازت دے دے تو پھر ان کے لیے حصہ بھی نکالے، کیونکہ گھوڑوں کے ساتھ نفع حاصل کرنا جگہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ پس رومی گھوڑے کٹھن اور مشکل جگہوں میں کام کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں مثلاً گھاٹیاں اور پہاڑ وغیرہ اور عربی گھوڑے ایسی جگہوں میں زیادہ کام آتے ہیں جن میں کر وفر (بار بار پلٹ کر حملہ کرنا) ہوتا ہے، پس یہ امام کی رائے کے متعلق ہو گا۔ کتاب میں العتاق سے مراد عربی گھوڑے ہیں اور الھجن والبراذین سے مراد رومی گھوڑے ہیں۔

مسئلہ نمبر 17۔ ہمارے علماء نے ضعیف اور کمزور گھوڑے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس اشہب اور ابن نافع نے کہا ہے: اس کے لیے کوئی حصہ نہ نکالا جائے گا، کیونکہ ایسے گھوڑے پر جنگ کرنا ممکن نہیں ہوتی پس وہ ٹوٹے ہوئے (کسیر) کے مشابہ ہو جائے گا۔ اب رہا مریض! تو اگر اسے ہلکی سی بیماری ہو مثلاً رہیص (گھوڑے کے کھر کے اندر زخم اور درد ہونا) اور اسی طرح کی کوئی ایسی بیماری جو اس سے مطلوبہ منفعت کے حصول میں مانع نہ ہو تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ اور ادھار لیے ہوئے اور اجرت پر لیے ہوئے گھوڑے کو حصہ دیا جائے گا۔ اور اسی طرح مغصوبہ گھوڑے کا حصہ بھی دیا جائے گا۔ اور اس کا حصہ اس کے مالک کے لیے ہو گا۔ اور وہ گھوڑے کے لیے حصہ کا مستحق ہو جاتا ہے اگرچہ وہ کشتیوں میں ہوں اور غنیمت سمندر میں حاصل ہو، کیونکہ وہ خشکی کی طرف اترنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 18۔ فالتو اور رذیل لوگوں کے لیے غنائم میں کوئی حق نہیں جیسا کہ مزدور اور وہ کاریگر جو کاروبار کے لیے لشکر کے ساتھ ہو جاتے ہیں، کیونکہ نہ وہ جنگ کا قصد کرتے ہیں اور نہ مجاہدین بن کر نکلتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کو حصہ

دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: الغنیمة لمن شهد الواقعة(1) (جو جنگ میں حاضر ہوا اس کے لیے غنیمت ہے) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس بارے کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث اس کے بیان اور وضاحت کے لیے ہے جو عملاً جنگ میں شریک ہوا اور اس کی طرف نکلا اور جنگجو اور اہل معاش (تجار) مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا بیان کافی ہے اس حدیث سے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو الگ الگ فرقے قرار دیا ہے، ہر ایک کے لیے حکم اس کی حالت کے مطابق ہے، پس ارشاد فرمایا: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (المزمل: 20) "وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کرتے ہوں گے زمین میں تلاش کرر ہے ہوں گے اللہ کے فضل (رزق حلال) کو اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے"۔

مگر یہ کہ جب یہ لوگ (تجار) جنگ میں شریک ہوں پھر ان کا اپنے کاروبار میں مشغول ہونا ان کے لیے ضرر رساں نہیں، کیونکہ اب مال غنیمت میں استحقاق کا سبب ان کی جانب سے پایا گیا ہے۔ اور اشہب نے کہا ہے: ان میں سے کوئی اس کا مستحق نہیں ہوسکتا اگر چہ وہ قتال بھی کرے، اسی طرح ابن قصار نے اجیر (مزدور) کے بارے کہا ہے کہ اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا اگر چہ وہ عملاً جنگ میں شریک ہو۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کا رد کرتی ہے انہوں نے فرمایا: میں طلحہ بن عبید اللہ کے تابع تھا میں اس کے گھوڑے کو پانی پلاتا تھا اور اس پر کھریرا مارتا تھا اور اس کی خدمت کیا کرتا تھا اور اس کے کھانے میں سے کھالیتا تھا، الحدیث۔ اس میں ہے: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو حصے عطا فرمائے، ایک گھوڑ سوار کا حصہ اور ایک پیدل کا حصہ، پس آپ نے دونوں کو میرے لیے جمع کر دیا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن قصار اور جس نے اس کے قول کے مطابق قول کیا ہے اس نے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اسے عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے، اور اس میں ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "یہ تین دینار اس کی دنیا اور آخرت کے معاملہ میں اس کی جنگ میں سے حصہ اور نصیب ہیں" (2)۔

مسئلہ نمبر 19۔ رہے غلام اور عورتیں! تو صاحب کتاب کا مذہب یہ ہے کہ نہ ان کے لیے کوئی حصہ نکالا جائے گا اور نہ انہیں بچا کھچا سامان دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں بچا کھچا تھوڑا تھوڑا مال دے دیا جائے گا۔ اور جمہور علماء نے یہی کہا ہے۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر عورت نے عملاً قتال کیا تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کو حصص عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک مسلمانوں نے اسی سے اخذ کیا ہے۔ اور ہمارے اصحاب میں سے ابن حبیب بھی اسی قول کی طرف مائل ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نجدہ کی طرف اپنے خط میں لکھا: تو مجھ سے سوال کرتا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو جنگ میں ساتھ لے جاتے تھے؟ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں غزوہ میں ساتھ لے جاتے اور وہ زخمیوں کی مرہم پٹی علاج وغیرہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 440

2۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الجہاد، جلد 5، صفحہ 229۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتی تھیں اور انہیں مال غنیمت میں سے کچھ عطیہ دیا جاتا تھا اور رہا سہم (حصہ) تو وہ آپ نے انہیں نہیں دیا۔ اور جہاں تک بچوں کا تعلق ہے پس اگر وہ جنگ لڑنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ہمارے نزدیک اس بارے میں تین اقوال ہیں: سہم مقرر کرنا اور سہم کی نفی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے (بالغ ہونے سے پہلے اس کے لیے مال غنیمت سے سہم نہیں ہے) اس کی وجہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنا اس طرح کہ اگر وہ (بچہ) عملاً جنگ میں شریک ہو تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا اور اگر اس نے قتال نہیں کیا تو پھر اس کے لیے حصہ نہیں ہو گا۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ بنی قریظہ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم ارشاد فرمایا تھا کہ ان میں سے ان بچوں کو قتل کر دیا جائے جن کے بال پھوٹے ہوئے ہیں اور انہیں چھوڑ دیا جائے جن کے بال ابھی تک نہیں نکلے۔ اور اس میں جنگ کی طاقت رکھنے کا لحاظ رکھا گیا ہے نہ کہ بالغ ہونے کا(1)۔ اور ابو عمر نے ''الاستیعاب'' میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انصار کے بچوں کو پیش کیا جاتا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے صاحب ادراک کو (لشکر کے ساتھ) ملا دیتے۔ تو ایک سال مجھے آپ پر پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو ملحق کر لیا اور مجھے رد کر دیا۔ تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اسے شامل کر لیا ہے اور مجھے واپس لوٹا دیا ہے، حالانکہ اگر وہ مجھ سے کشتی لڑے تو میں اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔ راوی کا بیان ہے: پس اس نے مجھ سے کشتی لڑی تو میں نے اسے پچھاڑ دیا نتیجتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی ملا لیا(2)۔ رہے غلام! تو ان کے لیے بھی نہ کوئی حصہ نکالا جائے گا اور انہیں حقیر سا مال دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 20۔ کافر جب امام وقت کی اجازت سے جنگ میں حاضر ہو اور وہ عملاً قتال بھی کرے تو ہمارے نزدیک اس کو حصہ دینے کے بارے میں تین اقوال ہیں: سہم دینا اور اس کی نفی کرنا۔ اس کے مطابق امام مالک اور ابن قاسم نے کہا ہے۔ ابن حبیب نے یہ زائد کہا ہے کہ ان کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اور تیسرے میں تفریق کی جاتی ہے۔ اور وہ سحنون کا ہے۔ (فرق اس قدر ہے) کہ اگر مسلمان ذاتی اعتبار سے مستقل اور طاقتور ہوں تو پھر کافر کو کوئی حصہ نہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ مستقل نہ ہوئے اور انہیں کافر کی مدد کی ضرورت اور حاجت ہوئی تو اسے حصہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ عملاً جنگ میں شریک نہ ہوا تو وہ کسی شے کا مستحق نہ ہوگا۔ اسی طرح آزاد آدمیوں کے ساتھ غلاموں کا حکم ہے۔ امام ثوری اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: انہیں کوئی حصہ نہ دیا جائے گا، البتہ انہیں بچا کھچا حقیر سا مال دے دیا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام وقت مطلق مال کے ساتھ انہیں اجرت پر لے سکتا ہے نہ کہ بعینہٖ تیرا مال اس کے لیے ہوگا۔ اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ انہیں دے دے۔ اور دوسرے مقام پر کہا ہے: وہ مشرکین کو بچا کھچا تھوڑا سا مال دے سکتا ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر قتال کریں۔ ابو عمر نے کہا ہے: تمام اس پر متفق ہیں کہ غلام ان افراد میں سے ہیں جن کی امان جائز ہوتی ہے، جب وہ قتال کرے تو اس کے لیے سہم نہیں ہوگا بلکہ اسے بچا کچا تھوڑا سا مال دے دیا جائے گا، پس کافر کے لیے بدرجہ اولیٰ یہ حکم ہوگا کہ اسے سہم نہیں دیا جائے گا۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی 2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 21۔ اگر غلام اور اہل ذمہ چوری کرنے کے لیے نکلے اور وہ اہل حرب کا مال لے کر آ گئے تو وہ انہیں کا ہوگا، اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا، کیونکہ ان میں سے کوئی آیت کے عموم میں داخل نہیں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور نہ ہی کوئی عورت اس عموم میں داخل ہے۔ اور رہے کفار تو ان کا بغیر کسی اختلاف کے کوئی دخل نہیں ہے۔ اور سحنون نے کہا ہے: جو غلام کے قائم مقام ہوگا اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: خمس نکالا جائے گا، کیونکہ یہ جائز ہے کہ اس کا آقا اسے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے اور وہ دین کی خاطر جنگ لڑے، بخلاف کفار کے۔ اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: جب غلام اور ذمی لشکر سے نکلیں اور مال غنیمت لے آئیں تو وہ مال غنیمت ان کے سوا لشکر کے لیے بھی ہوگا۔

مسئلہ نمبر 22۔ سہم کے استحقاق کا سبب مسلمانوں کی مدد و نصرت کے لیے جنگ میں حاضر ہونا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس اگر کوئی جنگ کے آخر میں بھی شریک ہوگا تو وہ اس کا مستحق ہوگا۔ اور اگر کوئی جنگ ختم ہونے کے بعد حاضر ہوا تو وہ مال غنیمت میں سے سہم (حصہ) کا مستحق نہ ہوگا اور اگر وہ شکست خوردہ ہو کر غائب ہو گیا تو اس کا حکم بھی اسی طرح ہے۔ اور اگر وہ جماعت کے ساتھ ملنے کے ارادہ سے نکلا (تاکہ قوت کے ساتھ پلٹ کر آئے) تو اس کا استحقاق ساقط نہ ہوگا۔

امام بخاری اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہما نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابان بن سعید کو ایک سریہ پر مدینہ طیبہ سے نجد کی جانب بھیجا۔ تو حضرت ابان بن سعید اور ان کے ساتھی اسے فتح کرنے کے بعد خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آ ملے اور ان کے گھوڑوں کے تنگ (کھجور کی) چھال کے تھے۔ تو حضرت ابان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں تقسیم فرما دیجئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں تقسیم نہ کیجئے۔ تو حضرت ابان نے کہا: اے وبر (بلی کی مثل چھوٹا سا جانور) تو اس کے ساتھ بیری کے اوپر سے ہمارے اوپر نیچے اترا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابان بیٹھ جا" (1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تقسیم نہ فرمایا۔

مسئلہ نمبر 23۔ علماء کا ان کے بارے اختلاف ہے جو کوئی جنگ میں شریک ہونے کے لیے نکلا پھر کسی عذر نے اسے اس سے روک دیا جیسا کہ بیماری وغیرہ، اس کے سہم کے ثابت ہونے اور اس کی نفی میں تین قول ہیں: تیسرے میں فرق کیا گیا ہے اور وہی مشہور ہے۔ پس سہم اس کے لیے ثابت ہوگا اگر عذر کے سبب اس کا جنگ سے غائب ہونا جنگ شروع ہونے سے پہلے اور میدان جنگ میں داخل ہونے کے بعد ہو، اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ علامہ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ اور اگر اس کا غائب ہونا اس سے پہلے ہو تو وہ اس کے لیے سہم کی نفی کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ وہ آدمی جسے امیر لشکر نے لشکر سے ایسے کام کے لیے بھیجا جو لشکر کے لیے نفع بخش تھا اور وہ جنگ میں شریک ہونے کی بجائے اس میں مشغول رہا تو اس کے لیے سہم ہوگا۔ یہ ابن المواز نے کہا ہے، اور اسے ابن وہب اور ابن نافع نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ اس کے لیے سہم نہیں ہوگا بلکہ اسے بچا کھچا تھوڑا سا مال دیا جائے گا، کیونکہ وہ سبب معدوم ہے جس کے ساتھ وہ سہم کا مستحق ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 17

ایضاً، حدیث نمبر 2347، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشہب نے کہا ہے: قیدی کا حصہ دیا جائے گا اگرچہ وہ پڑوس میں ہو۔ اور صحیح قول یہ ہے کہ اسے حصہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے جنگ کے ساتھ حاصل ہونے والی ملک ضروری ہے۔ پس جو غائب ہوا یا حالت مرض میں حاضر ہوا تو وہ اس کی طرح ہے جو حاضر نہیں ہوا۔

مسئلہ نمبر 24۔ جو مطلق غائب ہوا اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم خیبر کے سوا کبھی بھی کسی غائب کو حصہ نہیں دیا، کیونکہ اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حدیبیہ میں سے جو حاضر تھے اور جو غائب تھے سبھی کو ان کا حصہ دیا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے: وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا (الفتح: 20) ' (اے غلامان مصطفیٰ!) اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم (اپنے اپنے وقت پر) حاصل کرو گے''۔ یہ موسیٰ بن عقبہ نے کہا ہے۔ اور سلف کی پوری جماعت سے یہ مروی ہے۔ اور بدر کے دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان، حضرت سعید بن زید اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کو حصہ عطا فرمایا حالانکہ وہ غائب تھے، پس وہ ان کی طرح تھے جو وہاں حاضر تھے ان شاء اللہ تعالیٰ، چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی رفیقہ حیات حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی وجہ سے ان کی تیمارداری کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پیچھے رہے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا لہٰذا وہ ان کی طرح ہوئے جو وہاں حاضر تھے۔ اور رہے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تو وہ تجارت کے لیے شام میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا۔ پس اس وجہ سے وہ اہل بدر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور رہے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تو وہ بھی شام میں غائب تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا اور وہ بدری صحابہ کرام میں شمار ہوئے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جہاں تک اہل حدیبیہ کا تعلق ہے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ تھا اس کے ساتھ وہی لوگ مختص ہیں اور اس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں۔

حضرت عثمان، سعید اور طلحہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خمس سے حصص عطا فرمائے ہوں، کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو کوئی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تو اس کے لیے سہم نہ ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ وہ حضرات عثمان، طلحہ اور سعید رضی اللہ عنہم کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا ان پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور بلاشبہ ان کا حصہ اصل مال غنیمت سے تھا ان تمام افراد کے حصص کی طرح جو وہاں حاضر تھے وہ خمس میں سے نہ تھا۔ یہی احادیث سے ظاہر ہے، واللہ اعلم۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بدر سے غائب ہوئے (اس کی وجہ یہ تھی) کیونکہ آپ کے نکاح میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: '' بے شک تمہارے لیے اس آدمی کا اجر اور حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر تھا'' (1)۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ زجاج نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے پس تم

1۔ صحیح بخاری، کتاب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 523

جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو (فاعلموا أن الله مولاکم إن کنتم) تو اس میں ان اس وعدہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک اِن قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ کے متعلق ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی صحیح ہے، کیونکہ قول تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا امر غنائم کے بارے میں اللہ کے حکم کی پیروی کرنے اور اس کو تسلیم کرنے کے معنی کو متضمن ہے، پس اس معنی کی بنا پر ان، واعلموا کے ساتھ معلق ہوا، یعنی اگر تم اللہ کے ساتھ ایمان رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرو اور اسے تسلیم کرو اس بارے میں جو مال غنیمت کے بارے میں، میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ اس میں ما محل جر میں ہے اور اس کا عطف اسم اللہ پر ہے۔ یَوْمَ الْفُرْقَانِ سے مراد وہ دن ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا گیا اور وہ غزوہ بدر کا دن ہے۔ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اس میں جمعان سے مراد ایک اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور دوسرا شیطان کا گروہ ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۴۲﴾

''جب تم وادی کے نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ (لشکر کفار) دور والے کنارہ پر تھا اور (تجارتی) قافلہ نیچے کی طرف تھا تم سے۔ اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو پیچھے رہ جاتے وقت مقرر سے لیکن (یہ بلا ارادہ جنگ اس لیے تھی) تا کہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا تا کہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ رہے جسے زندہ رہنا ہے دلیل سے اور بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی، أی أنزلنا إذ أنتم الخ یعنی ہم نے نازل کیے جب تم اس حالت پر تھے۔ یا معنی ہوگا واذکروا إذ أنتم (اور یاد کرو جب تم تھے) العدوۃ کا معنی ہے وادی کا کنارہ۔ اسے عین کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ضمہ کی صورت میں جمع عدی ہوگی اور کسرہ کی صورت میں جمع عدیٰ ہوگی جیسا کہ لحیۃ کی جمع لحی اور فریۃ کی جمع فری ہے۔ اور الدنیا، أدنی کی مونث ہے۔ اور القصوی، أقصی کی مونث ہے۔ یہ دَنَا یَدْنُو اور قَصَا یَقْصُو سے ہے اور کہا جاتا ہے: القصیا اس میں اصل واؤ ہے اور یہ اہل حجاز کی لغت کے مطابق قصویٰ ہے پس الدنیا سے مراد وادی کا وہ کنارہ ہے جو مدینہ طیبہ کی جانب ہے اور قصویٰ وہ ہے جو مکہ مکرمہ کی طرف ہے، یعنی جب تم مدینہ طیبہ کیطرف جانب قریب میں وادی کے کنارے اترے ہوئے تھے اور تمہارا دشمن دور کی جانب تھا۔

وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ یعنی ابوسفیان وغیرہ کا تجارتی قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ وہ ایسی جگہ میں تھے جو ان سے ساحل سمندر کی جانب بہت نیچے تھی اور اس میں ساز و سامان تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اونٹ ہیں جو ان کا ساز و سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ اور وہ ایسی جگہ میں تھے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے محفوظ و مامون تھے (یعنی انہیں سامان کے

ضیاع کا کوئی اندیشہ اور خطرہ نہ تھا) پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی وہ نعمت یاد دلائی جو ان پر فرمائی۔ الرَّكْبُ مبتدا ہے اور اَسْفَلَ مِنْكُمْ ظرف محل خبر میں ہے۔ یعنی مکانا أسفل منکم۔ اور اخفش اور کسائی اور فراء نے وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ کو بھی جائز قرار دیا ہے أی أشدّ تسفلا منکم (یعنی قافلہ تم سے بہت زیادہ نیچے کی طرف تھا) اور الرکب راکب کی جمع ہے۔ اور عرب صرف اونٹ سواروں کی جماعت کے لیے الرکب کا لفظ بولتے ہیں۔ ابن سکیت اور اکثر اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ راکب اور رکب صرف اسی کے لیے بولا جاتا ہے جو اونٹ پر ہو، جو گھوڑے یا کسی اور شے پر سوار ہو اس کے لیے راکب نہیں کہا جاتا اور الرکب والأرکب والرکبان اور الراکبون صرف وہ ہوتے ہیں جو اونٹوں پر سوار ہوں۔ یہ ابن فارس سے منقول ہے۔ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ یعنی ان کی کثرت اور تمہاری قلت کے سبب اتفاق نہ ہو سکتا، کیونکہ تم اگر ان کی کثرت اور زیادتی کو پہچان لیتے تو تم پیچھے ہٹ جاتے پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں توفیق عطا فرما دی۔ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد اور دین کو غالب کرنے کا وہ کام کر دکھائے جو ہو کر رہنا تھا۔ لِيَقْضِيَ میں لام محل محذوف سے متعلق ہے۔ اور اس کا معنی ہے: جمعھم لیقضی اللہ (انہیں جمع کیا تاکہ اللہ تعالیٰ وہ کام کر دکھائے) پھر اسے مکرر ذکر کیا اور فرمایا: لِّيَهْلِكَ، أی جمعھم ھنالك لیقضی أمرًا (انہیں وہاں جمع کیا تاکہ وہ کام پورا کر دے)

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ اس میں من محل رفع میں ہے۔ وَّيَحْيٰى یہ لِيَهْلِكَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور بَيِّنَةٍ کا معنی ہے حجت اور دلیل ختم کرنا، یعنی تاکہ وہ مر جائے جسے مرنا ہے ایسی حجت اور دلیل کے ساتھ جسے اس نے دیکھ لیا ہے اور ایسی عبرت کے ساتھ جس کا اس نے معائنہ کر لیا ہے، پس اس پر حجت قائم ہو جائے۔ اور اسی طرح زندہ رہے (دلیل کے ساتھ) جس نے زندہ رہنا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: تاکہ کفر کرے جس نے کفر کرنا ہے ایسی حجت اور دلیل کے بعد جو اس پر قائم ہو چکی ہے اور اس نے اس کا عذر ختم کر دیا ہے اور اسی طرح وہ ایمان لائے جس نے ایمان لانا ہے(1)۔ من حیی دو یا کے ساتھ اصل پر رکھتے ہوئے بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ایک یا مشددہ کے ساتھ بھی، پہلی اہل مدینہ، بزی اور ابو بکر کی قراءت ہے۔ اور دوسری باقیوں کی قراءت ہے اور یہی ابو عبید کی پسند ہے، کیونکہ یہ اسی طرح مصحف (عثمانی) میں واقع ہے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل۔ اور اگر دکھایا ہوتا آپ کو لشکر کفار کثیر تعداد میں تو ضرور تم لوگ ہمت ہار دیتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے اس معاملہ میں لیکن اللہ نے (تمہیں) بچا لیا، بے شک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے"۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب میں انہیں قلیل دیکھا اور پھر اسے اپنے اصحاب کے سامنے بیان فرمایا تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں پختہ اور ثابت قدم کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منام سے مراد سونے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 636

کی جگہ ہے اور وہ معین ہے، یعنی آپ نے اپنے سونے کی جگہ میں انہیں قلیل دیکھا، پھر اس سے مضاف (لفظ موضع) حذف کر دیا گیا۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، لیکن پہلا عربی میں زیادہ جائز ہے، کیونکہ یہ ارشاد بھی ہے: وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ (الانفال:44) تو اس سے اس پر دلیل ہے کہ یہ مقابلہ کے وقت کی رؤیت کا ذکر ہے اور وہ نیند کی رؤیت کا ذکر ہے۔ اور لَّفَشِلْتُمْ کا معنی ہے تم جنگ سے بزدلی کا اظہار کرتے (ہمت ہار دیتے) وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ اور اس معاملے میں تمہارا اختلاف ہو جاتا۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ یعنی اللہ نے تمہیں مخالفت سے بچالیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس نے تمہیں بزدلی سے بچالیا۔ یہاں دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سَلَّمَ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا معاملہ کامیابی و فتح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

''اور یاد کرو جب اللہ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل اور قلیل کر دیا تمہیں ان کی نظروں میں تاکہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں سارے معاملات''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا یہ رؤیت حالت بیداری میں تھی۔ اور پہلی آیت میں بھی رؤیت کو بیداری کی حالت پر محمول کرنا جائز ہے جب آپ یہ کہیں کہ منام سے مراد سونے کی جگہ ہے اور وہ معین ہے، پس اس بنا پر پہلی رؤیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور یہ تمام کے لیے ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے بدر کے دن ایک آدمی کو کہا جو میرے پہلو میں تھا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: وہ تقریباً سو ہیں۔ پھر ہم نے ایک آدمی کو قید کیا تو ہم نے اس سے پوچھا: تم کتنے تھے؟ تو اس نے بتایا: ہم ہزار تھے (1)۔ وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ یہ صورت حال جنگ کی ابتداء میں تھی یہاں تک کہ ابوجہل نے اس دن کہا: یہ تو اونٹ کے گوشت کا ایک نوالا ہیں۔ تم انہیں مضبوطی سے پکڑ لو اور تم انہیں رسیوں کے ساتھ باندھ دو۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمان ان کی نظروں میں بڑھ گئے اور بہت زیادہ ہو گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (آل عمران:13) ''دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دوچند (اپنی) آنکھوں سے''، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا اس کا تکرار ہے، کیونکہ پہلے میں معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مقابلے سے وہ کام کر دکھائے اور اس دوسرے میں ہے کہ مشرکین کے قتل اور دین کو غالب کر کے اللہ تعالیٰ وہ کام کر دکھائے۔ اور یہ مسلمانوں پر اتمام نعمت ہے۔ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یعنی امور کا انجام اور ان کا لوٹنا اسی کی طرف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 637

تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۴۵﴾

"اے ایمان والو! جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَةً، فِئَةً سے مراد جماعت اور لشکر ہے۔ فَاثۡبُتُوۡا یہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے وقت ثابت قدم رہنے کا حکم ہے، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں ان کے مقابلے سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا ہے، پس امر اور نہی بالکل برابر برابر ملے ہوئے ہیں اور یہ دشمن کے مقابلے میں ٹھہرے رہنے اور اس کے لیے مضبوطی دکھانے پر تاکید ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِیۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ اس ذکر کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) تم اپنے دلوں کی گھبراہٹ کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کیونکہ اس کا ذکر شدائد اور سختیوں میں ثبات اختیار کرنے پر معاون ہوتا ہے۔ (۲) تم اپنے دلوں کو مضبوط اور پختہ رکھو اور اپنی زبانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کیونکہ دل مقابلہ کے وقت پر سکون نہیں رہتے اور زبان مضطرب ہو جاتی ہے۔ پس ذکر کا حکم ارشاد فرمایا یہاں تک کہ دل یقین پر ثابت اور پختہ ہو جائے اور زبان ذکر پر ثابت ہو جائے اور وہ کچھ کہے جو اصحاب طالوت نے کہا: رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۲۵۰﴾ (البقرہ) "اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر"۔

اور یہ حالت صرف قوت معرفت اور نور بصیرت کے ساتھ ہی حاصل ہو سکتی ہے اور یہی وہ شجاعت اور بہادری ہے جو لوگوں میں قابل تعریف ہے۔ (۳) یاد کرو اسے جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اس بارے میں کہ اس نے تمہارے نفسوں کو خریدا ہے اور اسے تمہارے لیے عوض بنایا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر قول یہ ہے کہ مراد زبان کا ذکر ہے جو دل کے موافق ہو۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر ذکر چھوڑنے کے بارے میں کسی کو رخصت دی جاتی تو حضرت زکریا علیہ السلام کو رخصت دی جاتی۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِیۡرًا (آل عمران: 41) "کہ نہ بات کر سکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت) اور اس آدمی کو رخصت دی جاتی جو جنگ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَةً فَاثۡبُتُوۡا وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِیۡرًا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اور اس نے انہیں تلواروں کے ساتھ جنگ لڑتے وقت بھی اس میں مشغول رکھا ہے۔ اور اس ذکر کا حکم یہ ہے کہ وہ خفی ہو، کیونکہ جنگ کے مقامات میں آواز کو بلند کرنا ردی اور مکروہ ہے جب کہ ذکر کرنے والا ایک ہو، لیکن حملہ کے وقت جب ذکر کرنے والی جماعت ہو تو (آواز بلند کرنا) اچھا ہے، کیونکہ یہ دشمن کی قوت کو توڑ دیتا ہے۔ اور ابو داؤد نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جنگ کے وقت آواز بلند کرنا ناپسند کرتے تھے۔

ابو بردہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے اس کی مثل روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جنگ کے وقت ناک اور منہ پر کپڑا لپیٹنا مکروہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی وجہ سے سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں نے جنگ کے وقت ناک اور منہ پر کپڑا نہ لپیٹنے کا طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ وہ اس قول پر عمل پیرا ہو سکیں۔ واللہ اعلم

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی۔ اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور اکھڑ جائے گی تمہاری ہوا اور (ہر مصیبت میں) صبر کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا یہ ان کے لیے وصیت پر استمرار ہے اور بدر کے معاملہ میں ان کے اختلاف اور ان کے تنازع کی صورت میں ان کے ہاتھوں کو پکڑنا ہے۔ فَتَفْشَلُوْا یہ فا کے سبب منصوب ہے اور جواب نہی ہے۔ سیبویہ فا کے حذف اور جزم دینے کی اجازت نہیں دیتے لیکن کسائی نے اس کی اجازت دی ہے۔ شین کے کسرہ کے ساتھ تفشلوا بھی پڑھا گیا ہے لیکن یہ غیر معروف ہے۔ وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ یعنی تمہاری قوت اور تمہاری مدد و نصرت ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ ایسے ہی ہے) جیسے تو کہتا ہے: الریح لفلان (ہوا تو فلاں کے لیے ہے) جب وہ امر میں غالب ہو۔ شاعر نے کہا ہے:

إذا هبّت رياحك فاغتنمها فإنّ لكلّ خافقة سكون

تو اس میں ریح اور ریاح سے مراد قوت اور مدد و نصرت ہی ہے۔

حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: بے شک کبھی بھی مدد و نصرت حاصل نہیں ہوتی مگر ہوا کے ساتھ جو چلتی ہے اور کفار کے مونہوں پر جا لگتی ہے۔ اس معنی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: نُصِرتُ بالصبا و أهلكت عادٌ بالدبور(1) ''میری باد صبا (مشرق سے چلنے والی ہوا) کے ساتھ مدد کی گئی اور عاد کو دبور (مغرب سے آنے والی ہوا) کے ساتھ ہلاک کیا گیا''۔ حکم نے کہا ہے: وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ یعنی تمہاری باد صبا چلی جائے گی، جب کہ اس کے ساتھ حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کی امت کی مدد کی گئی ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم ﷺ کے صحابہ کرام کی ہوا اکھڑ گئی جب احد کے دن وہ آپس میں جھگڑ پڑے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ یہ صبر کے بارے حکم ہے اور یہ تمام مقامات میں قابل تعریف ہے بالخصوص میدان جنگ میں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۴۷﴾

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 638

''اور (دیکھو!) نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور (محض) لوگوں کے دکھلاوے کے لیے اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے (اپنے علم اور قدرت سے) گھیرے ہوئے ہے''۔

اس میں مراد ابوجہل اور اس کے وہ ساتھی ہیں جو بدر کے دن قافلے کی مدد و نصرت کے لیے نکلے تھے۔ وہ دوشیزاؤں گانا گانے والیوں اور آلات موسیقی کو ساتھ لے کر نکلے تھے۔ جب وہ جحفہ کے مقام پر پہنچے تو خفاف کنانی جو کہ ابوجہل کا دوست تھا اس نے اپنے بیٹے کے ہمراہ تحائف اور ہدایا اس کی طرف بھیجے اور کہلا بھیجا: اگر تو چاہے تو میں مردوں کے ساتھ تیری امداد کروں اور اگر چاہے تو میں بذات خود اپنی قوم کے اونٹوں سمیت تیری امداد کو آجاؤں۔ تو ابوجہل نے کہا: اگر ہماری جنگ اللہ تعالیٰ سے ہوئی جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) گمان کرتے ہیں، تو قسم بخدا! ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کی کوئی طاقت نہیں۔ اور اگر ہماری جنگ لوگوں سے ہوئی تو قسم بخدا! ہمارے پاس لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے قوت اور طاقت ہے۔ قسم بخدا! ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کیے بغیر واپس نہیں لوٹیں گے بلکہ ہم بدر میں اتریں گے اور وہاں شراب پئیں گے، دوشیزائیں آلات موسیقی بجا کر ہمارے اوپر گیت پیش کریں گی، کیونکہ عرب کے میلوں میں سے بدر ایک میلہ ہے اور ان کی منڈیوں میں سے ایک منڈی ہے، یہاں تک کہ عرب ہمارے نکلنے کے بارے سن لیں گے اور پھر ہمیشہ تک ہم سے ڈرتے رہیں گے۔ پس وہ بدر میں جا اترے لیکن ان کی ہلاکت و بربادی میں سے جو ہوا سو ہوا۔ لغت میں البطر سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ اور جو اللہ تعالیٰ نے اسے عافیت عطا فرمائی ہے اس سے معاصی اور گناہ پر قوت حاصل کرنا ہے یہ مصدر ہے اور حال کے محل میں ہے۔ أی خرجوا بطرین مراءین صادین (یعنی وہ نکلے اس حال میں کہ اترانے والے تھے، ریاکاری کرنے والے تھے، روکنے والے تھے) اور ان کے روکنے سے مراد لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔

وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۟

''اور یاد کرو جب آراستہ کر دیئے ان کے لیے شیطان نے ان کے اعمال اور (انہیں) کہا کہ کوئی غالب نہیں آسکتا تم پر آج ان لوگوں میں سے اور میں نگہبان ہوں تمہارا تو جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا میں بری الذمہ ہوں تم سے میں دیکھ رہا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھ رہے، میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

روایت ہے کہ اس دن شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں ان کے پاس آیا اور سراقہ بن بکر بنی کنانہ میں سے تھا، اور قریش بنی بکر کے بارے خوف رکھتے تھے کہ کہیں وہ ان کے پاس ان کے پیچھے آجائیں، کیونکہ انہوں نے ان کا ایک

آدمی قتل کیا ہوا تھا۔ پس جب وہ اس شکل میں ان کے پاس آیا تو کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اسے کوئی خبر نہیں دی۔

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: غزوہ بدر کے دن ابلیس اپنے جھنڈے اور اپنے لشکر کے ساتھ ان کے پاس آیا اور ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ ہرگز شکست نہیں دیئے جا سکیں گے اور وہ اپنے آباء کے دین پر لڑ رہے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی ہزار ملائکہ کے ساتھ امداد فرمائی۔ پس حضرت جبرئیل امین علیہ السلام پانچ سو ملائکہ کے ساتھ ایک طرف (میمنہ) میں تھے اور پانچ سو ملائکہ کے ساتھ حضرت میکائیل علیہ السلام ایک طرف (میسرہ) میں تھے اور ابلیس شیاطین کے لشکر میں آیا اور ان کے ساتھ بنی مدلج کے لوگوں کی صورت میں دستہ تھا اور شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت میں تھا۔ اور شیطان نے مشرکین کو کہا: آج کے دن لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور میں تمہارا نگہبان ہوں۔ پس جب قوم نے صفیں بنا لیں تو ابوجہل نے کہا: اے اللہ ہم میں سے جو حق کے زیادہ قریب ہے اس کی مدد فرما۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک بلند کیا اور عرض کی یا رب إنك إن تُهلك هذه العصابةُ فلن تُعبد في الأرض أبدًا (1) (اے میرے پروردگار! اگر یہ جماعت ہلاک کر دی گئی، تو پھر ہمیشہ کے لیے زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی) تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ''مٹی کی ایک مشت اٹھائیے''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشت مٹی لی اور اسے ان کے چہروں پر پھینک دیا۔ اور مشرکین میں سے کوئی بھی نہ تھا مگر اس کی آنکھوں، نتھنوں اور اس کے منہ میں وہ مٹی پہنچی۔ تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ابلیس کی طرف آئے پس جونہی اس نے آپ کو دیکھا وہ مشرکین میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے تھا ابلیس نے اپنا ہاتھ کھینچا اور پھر وہ اور اس کا گروہ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: اے سراقہ! کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ تو ہمارا نگہبان اور محافظ ہے؟ اس نے جواب دیا: بے شک میں تم سے بری الذمہ ہوں بے شک میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ اسے بیہقی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور موطا میں امام مالک نے ابراہیم بن ابی عبلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان نے اپنے آپ کو یوم عرفہ سے بڑھ کر کسی دن بھی زیادہ ذلیل، حقیر، دھتکارہ ہوا اور غیظ وغضب کی حالت میں نہیں دیکھا اور ایسا نہیں ہوا مگر تب جب اس نے رحمت کے نزول کو دیکھا اور بڑے بڑے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کے درگزر کرنے کو دیکھا۔ مگر جتنا اس نے بدر کے دن (اپنے آپ کو ذلیل ورسوا دیکھا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کے دن اس نے کیا دیکھا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اس نے حضرت جبریل امین کو دیکھا کہ وہ ملائکہ کو منظم ومرتب فرما رہے ہیں'' (2)۔ نکص کا معنی لغت سلیم کے مطابق رجع (لوٹا ہے)۔ یہ مؤرج وغیرہ سے منقول ہے۔ اور شاعر نے بھی کہا ہے:

لیس النکُوصُ علی الأدبار مَکرمۃً إن المکارم إقدامٌ علی الأسَل

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2
2۔ اوجز المسالک الی موطا امام مالک، کتاب الحج، جلد 8، صفحہ 238

وما ينفع المستأخرين نكوصهم ولا ضرّ أهل السابقات التقدمُ

یہاں الٹے پاؤں لوٹنا مراد نہیں بلکہ فرار ہونا مراد ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''جب وہ اذان کی آواز سنتا ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے (1) اور اس کی ہوا خارج ہو رہی ہوتی ہے''۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ کہا گیا ہے: ابلیس کو خوف لاحق ہوا کہ یوم بدر ہی وہ دن ہو (جس کے بارے کہا گیا) کہ اس کی طرف دیکھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ابلیس نے اپنے اس قول میں جھوٹ بولا ہے: اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ (کہ میں الله تعالیٰ سے ڈرتا ہوں) لیکن اسے یہ علم تھا کہ اس کے پاس کوئی قوت و طاقت نہیں۔ اور جار کی جمع اجوار اور جیران لائی جاتی ہے۔ اور قلیل طور پر جیرۃ بھی آئی ہے۔

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

''یاد کرو جب کہہ رہے تھے منافق اور وہ جن کے دلوں میں (شک کا) روگ تھا کہ مغرور کر دیا ہے انہیں ان کے دین نے۔ اور جو شخص بھروسہ کرتا ہے الله پر تو بے شک الله تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے''۔

کہا گیا ہے: منافق وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپائے رکھا۔ اور وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ سے مراد شک کرنے والے ہیں اور وہ منافقین کے سوا تھے، کیونکہ ابھی وہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کی نیتیں کمزور اور ضعیف تھیں۔ انہوں نے قتال کی طرف نکلتے وقت اور مقابلے کے لیے صفیں باندھتے وقت کہا: غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ''انہیں ان کے دین نے مغرور کر دیا''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں سے مراد ایک ہی قسم ہے۔ اور یہی اولیٰ ہے، کیا آپ الله تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (البقرہ: 3) پھر فرمایا: وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ (البقرہ: 4) اور ان دونوں سے مراد ایک ہی قسم کے لوگ ہیں۔

وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡہَہُمۡ وَ اَدۡبَارَہُمۡ ۚ وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿ۙ۵۱﴾

''اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر اور (کہتے ہیں) چکھو آگ کا عذاب۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور الله تعالیٰ ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے (اپنے) بندوں پر''۔

کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ لیے ہیں جو باقی بچے اور بدر کے دن مارے نہ گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے بارے میں ہے جو بدر میں قتل کر دیے گئے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے، اس کی تقدیر عبارت یہ ہے: لرأیت أمرا عظیما ''اگر تو دیکھے

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 398

جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے ...... تو تو امر عظیم کو دیکھتا"۔ یَضْرِبُوْنَ یہ حال کے محل میں ہے۔ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ "اس حال میں کہ وہ مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر"۔ یعنی ان کی سرینوں پر، کنایۃً اسے ادبار کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: اَدْبَارَهُمْ سے مراد ان کی پشتیں ہیں اور کہا: بے شک کسی آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بے شک میں نے ابوجہل کی پیٹھ پر (جوتے کے) تسمے کی مثل دیکھا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ ملائکہ کی ضرب تھی" (1)۔ اور کہا گیا ہے: یہ ضرب موت کے وقت لگتی ہے۔ اور کبھی یہ قیامت کے دن لگے گی جس وقت وہ انہیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ویقولون ذُوقوا اور وہ کہتے ہیں: چکھو۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ قیامت کے دن ہوگا، انہیں جہنم پر مقرر فرشتے کہیں گے: تم آگ کا عذاب چکھو۔

اور یہ روایت ہے کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ ملائکہ کے پاس لوہے کے بھاری گرز ہیں جب بھی وہ ان کے ساتھ مارتے ہیں تو زخموں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پس اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ "اور چکھو آگ کا عذاب" اور ذوق محسوسا بھی ہوتا ہے اور معنیً بھی۔ اور کبھی اسے ابتلا اور امتحان کی جگہ رکھا جاتا ہے، جیسے تو کہتا ہے: ارکب هذا الفرس فذقه (تو اس گھوڑے پر سوار ہو اور اسے چکھ (یعنی اسے آزما)) اور أنظر فلانا فذق ما عنده (تو فلاں کی طرف دیکھ اور جو اس کے پاس ہے اسے چکھ یعنی اس کا امتحان لے) شماخ نے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فذاق فأعطته من اللِّين جانبا كفَى ولها ان يُغرِق السهمَ حاجزُ

اور اس کا اصل معنی منہ کے ساتھ کسی شے کو چکھنا ہے۔

ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے، یعنی الأمر ذالك یا ذالك جزاء كم (یہ تمہاری جزا اور بدلہ ہے) بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ ان کا جو گناہ تم نے کیے ہیں۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ جب اس نے راستہ واضح کر دیا ہے اور رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا ہے، تو پھر تم نے اس کا خلاف کیوں کیا ہے؟ اس میں ان محل جر میں ہے اس کا عطف ما پر ہے اور اگر چاہے تو اسے نصب دے لے، یعنی یہ بمعنی بان اور پھر با کو حذف کر دیا گیا یا بمعنی و ذالك أن الله هو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذالك پر عطف نسق کرتے ہوئے محل رفع میں ہو۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

"جیسے دستور تھا فرعونیوں کا اور جو (زبردست) لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے کفر کیا آیات الٰہی کے ساتھ تو پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے باعث، بے شک اللہ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے"۔

كَدَاْبِ کا معنی عادت اور دستور ہے۔ اور یہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے، یعنی انہیں ارواح کو قبض کرنے کے

1۔ دلائل النبوۃ، باب سیاق قصۃ بدر، جلد 3، صفحہ 116

وقت اور قبروں میں عذاب دینے کی عادت اور دستور فرعونیوں کی عادت اور دستور کی طرح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے انہیں قتل اور قید کے ساتھ بدلہ دیا گیا ہے جیسے فرعونیوں کو غرق کے ساتھ بدلہ دیا گیا، یعنی ان کا دستور فرعونیوں کے دستور کی طرح ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

"یہ اس لیے کہ اللہ نہیں بدلنے والا کسی نعمت کو جس کا انعام اس نے فرمایا ہو کسی قوم پر یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہی اپنے آپ کو اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔

یہ علت بیان ہو رہی ہے یعنی یہ سزا اس لیے ہے کہ انہوں نے تبدیل کر دیا اور بدل ڈالا اور قریش پر اللہ تعالیٰ کا انعام شادابی، خوشحالی اور امن و عافیت کی صورت میں تھا، (جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ الآیہ (العنکبوت: 67) "کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے"۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام حضور نبی مکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی تو انہوں نے آپ کا انکار کیا اور کفر کا ارتکاب کیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے اور مشرکین پر سزا و عذاب نازل ہوا (1)۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

"(کفار مکہ کا طرز عمل بھی) فرعونیوں اور ان (سرکشوں) کا سا ہے جو پہلے گزر چکے، انہوں نے جھٹلایا اپنے رب کی آیتوں کو پس ہم نے ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے اور ہم نے غرق کر دیا فرعونیوں کو اور (وہ) سب کے سب ظالم تھے"۔

یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ پہلی آیت تکذیب اور جھٹلانے میں عادت اور دستور کے بارے ہے اور دوسری تغییر میں عادت کے بارے ہے اور باقی آیت بالکل واضح اور مبین ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

"بلاشبہ بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ انسان ہیں جنہوں نے کفر کیا پس وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے۔ وہ جن سے (کئی بار) آپ نے معاہدہ کیا پھر وہ توڑتے رہے اپنا عہد ہر بار اور وہ (عہد شکنی سے) ذرا نہیں

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 643

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر یہ کہا جائے کہ خیانت کے خوف کے ساتھ معاہدہ توڑنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، حالانکہ خوف ظن ہے جس کے ساتھ یقین نہیں ہے، تو عہد کا یقین خیانت کے ظن کے ساتھ کیسے ساقط ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب دو اعتبار سے ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ خوف کبھی یقین کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ رجاء (امید) علم (یقین) کے معنی میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح) (تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم پرواہ نہیں کرتے اللہ کی عظمت وجلال کی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب خیانت کے آثار ظاہر ہوجائیں اور اس کے دلائل ثابت ہوجائیں، تو معاہدہ کو توڑنا واجب ہوجاتا ہے تاکہ اس پر سرکشی کرنے والا ہلاکت میں نہ واقع کردے اور اس حالت میں ضرورۃً یقین کو ساقط کرنا جائز ہے (1)۔ اور رہی یہ صورت کہ جب یقینی علم حاصل ہوجائے تو پھر وہ ان کے پاس معاہدہ توڑنے کی اطلاع سے مستغنی ہوجاتا ہے، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال اہل مکہ کی طرف چل پڑے، جب ان کی طرف سے معاہدہ توڑنے کی خبر مشہور ہوگئی، بغیر اس کے کہ آپ انہیں معاہدہ توڑنے کی اطلاع کرتے۔ النبذ کا معنی پھینکنا (الرمی) اور چھوڑنا (الرفض) ہے۔

اور ازہری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے جب تو کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کرے تو تجھے ان کے بارے میں معاہدہ توڑنے کا علم ہوجائے تو تو معاہدہ توڑنے سے پہلے ان پر حملہ نہ کر، یہاں تک کہ تو ان سے ملے اس حال میں کہ تو معاہدہ اور باہمی وعدہ توڑ چکا ہو، تاکہ وہ معاہدہ توڑنے کے علم میں برابر ہوجائیں، پھر ان پر حملہ کردے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قرآن کریم کی ان آیات میں سے ہے جس کی مثل الفاظ کے اعتبار سے مختصر اور معانی کے اعتبار سے کثیر کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اور اس کا معنی ہے: اگر تمہیں اس قوم کے بارے میں خیانت کا اندیشہ ہو کہ جس قوم اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو تو ان کا معاہدہ توڑ دو، یعنی انہیں کہہ دو تحقیق میں نے تمہارا عہد توڑ دیا ہے اور میں تمہارے ساتھ جنگ کروں گا، تاکہ انہیں اس کا علم ہوجائے پس وہ تمہارے ساتھ علم میں برابر ہوجائیں گے اور تم ان سے قتال نہ کرو اس حال میں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور وہ تمہارے ساتھ یقین رکھتے ہوں، کیونکہ یہ خیانت اور غدر (دھوکہ) ہوجائے گا۔ پھر اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ بیان کیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

میں (مفسر) کہتا ہوں: معاہدہ توڑنے کے بارے میں جو ازہری اور نحاس نے ذکر کیا ہے کہ اس کے ٹوٹنے کا علم ہونا چاہیے فتح مکہ کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اسے رد کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے جب معاہدہ توڑا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ فرمایا: اللھم اقطع خبرنا عنھم (2) (اے اللہ! ان کی جانب سے خبر کو یقین بنا دے) اور ان پر حملہ کردیا۔ اور یہ بھی آیت کا معنی ہے، کیونکہ ان کی طرف سے عہد توڑنے کے بارے میں (اطلاع ہونا) اور اس کا علم رکھتے ہوئے عہد کو توڑ دینا ان کی طرف سے عہد توڑنا ہی ہے اور ان کے ساتھ یہ مساوات اور عدل ہے، البتہ ان کی جانب سے علم نہ ہونے کے باوجود عہد کو توڑنا نہ یہ حلال ہے اور نہ ہی جائز۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 871 2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 113

ترمذی اور ابو داؤد نے سلیم بن عامر سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا اور آپ ان کے شہروں کی طرف چلتے رہے تا کہ قریب ہو جائیں یہاں تک کہ جب معاہدہ (کی مدت) ختم ہوگئی تو ان پر حملہ کر دیا، تو اتنے میں گھوڑے یا ترکی گھوڑے پر سوار ہو کر ایک آدمی آیا اور وہ کہنے لگا: اللہ اکبر، اللہ اکبر (وعدہ وفا کرو، خیانت نہ کرو) پس انہوں نے اسے دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنی طرف بلا بھیجا اور ان سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''وہ آدمی جس کے اور اس کی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو وہ گرہ کو نہ مضبوط کرے اور نہ اسے کھولے یہاں تک کہ اس کی مدت گزر جائے یا برابری کی بنیاد پر ان سے وعدہ توڑے'' (1)۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس میں السواء کا معنی مساوات اور اعتدال ہے۔

اور راجز کا قول ہے:

فاضربْ وجوهَ الغُدَّرِ الأعداءِ　حتى يجيبوكَ إلى السَّوَاءِ

اس میں سواء کا لفظ مساوات کے معنی میں ہے۔

اور کسائی نے کہا ہے: سواء کا معنی عدل ہے اور کبھی یہ بمعنی وسط (درمیان) بھی ہوتا ہے اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِي سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ (الصافات) (جہنم کے وسط میں)

اور اسی معنی میں حسان کا قول ہے:

يا وَيْحَ أصحابِ النبيِّ ورهطِه　بعد المغيَّبِ في سواءِ المُلْحَدِ

فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ پس اعلانیہ ان سے وعدہ توڑ دو نہ کہ سراً۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام مسلم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن ہر خیانت کرنے والے کے لیے جھنڈا ہوگا وہ اس کے لیے اس کی خیانت اور وعدہ خلافی کی مقدار سے بلند کیا جائے گا اور امیر عام (سلطان وقت) سے بڑھ کر خیانت کرنے والا کوئی نہ ہوگا'' (2)۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے: امام وقت کے حق میں غدر اور خیانت کسی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اور فحش ترین ہے کیونکہ اس میں فساد اور بگاڑ زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ جب یہ خیانت کریں اور ان کی طرف سے یہ معلوم ہو جائے اور وہ معاہدہ نہ توڑیں تو پھر دشمن کو ان کے کسی عہد اور صلح پر اعتماد اور امن نہیں ہوگا، نتیجۃً اس کی قوت و طاقت سخت اور مضبوط ہو جائے گی اور اس کا ضرر و نقصان بڑھ جائے گا اور یہ دین میں داخل ہونے سے متنفر کر دے گا اور ائمہ مسلمین کی مذمت کا موجب ہوگا۔ لیکن

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 191

ایضاً، حدیث نمبر 1506، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 83

جب دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر چاہیے کہ اس کے خلاف ہر حیلہ استعمال کرے اور ہر چال اس پر آزمائے۔ اور اس پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ابھارتا ہے: الحرب خدعة (1) (جنگ تو حیلہ اور چال ہے) اور علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ معاہدہ توڑنے والے امام کی معیت میں جہاد کیا جائے گا؟ تو اس بارے دو قول ہیں: اکثر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی معیت میں قتال نہیں کیا جائے گا، بخلاف خائن (خیانت کرنے والا) اور فاسق کے۔ اور بعض نے کہا کہ اس کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے گا۔ یہ دونوں قول ہمارے مذہب میں ہیں۔

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ۝۵۹

''اور ہرگز نہ خیال کریں کافر کہ وہ بچ کر نکل گئے یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا یعنی وہ واقعہ بدر سے بچ گئے اور حیات کی طرف نکل گئے۔ پھر نیا کلام فرمایا اور ارشاد فرمایا: اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ بے شک وہ دنیا میں عاجز نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان پر فتح و کامرانی عطا فرما دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد آخرت میں عاجز نہ کر سکنا ہے۔ اور یہی حسن کا قول ہے۔ ابن عامر، حفص اور حمزہ نے یَحْسَبَنَّ یا کے ساتھ اور باقیوں نے تا کے ساتھ قراءت کی ہے، اس بنا پر کہ فعل میں ضمیر فاعل ہو۔ اور الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مفعول اوّل ہو۔ اور سَبَقُوْا مفعول ثانی ہو۔ اور رہی یا کی قرات تو اس کے بارے نحویوں کی ایک جماعت جن میں سے ابو حاتم بھی ہیں، کا خیال ہے کہ یہ غلطی (لحن) ہے اس کے ساتھ قراءت جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے وسعت ہے جو اعراب کو جانتا ہے یا اسے پہچان کرا دی جائے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: کیونکہ یَحْسَبَنَّ مفعول کے ساتھ مذکور نہیں حالانکہ وہ دو مفعولوں کا محتاج ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ انتہائی تکلیف دہ بات ہے، قراءت جائز ہے اور معنی یہ ہوگا: ولا یحسبن من خلفهم الذین کفروا سبقوا ''یعنی پیچھے رہ جانے والے کافر گمان نہ کریں وہ بچ کر نکل گئے''۔ پس ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے جو پہلے گزر چکا، مگر تا کے ساتھ قراءت کرنا زیادہ بین اور واضح ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اس میں یہ احتمال ہے کہ فعل میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو اور الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا دو مفعول ہوں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الذین کفروا فاعل ہو اور مفعول اوّل محذوف ہو۔

اس کا معنی ہوگا: ولا یحسبن الذین کفروا انفسهم سبقوا'' کافر اپنے بارے میں یہ گمان نہ کریں وہ بچ کر نکل گئے''۔

مکی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ سبقوا کے ساتھ ان مضمر ہو اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہو جائے اور تقدیر عبارت اس طرح ہو: ولا یحسبن الذین کفروا أن سبقوا پس یہ اس ارشاد کی مثل ہوا: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا (العنكبوت: 2) اس میں کہ أن قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

ابن عامر نے اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ میں ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم اور ابو عبید نے اس قراءت کو مستبعد قرار دیا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: یہ اس بنا پر جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: ولا تحسبن الذین کفروا انهم لا یعجزون۔ نحاس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 83

کہا ہے: جو کچھ ابو عبید نے ذکر کیا ہے بصری نحویوں کے نزدیک وہ جائز نہیں، (کیونکہ) حسبت زیدا أنه خارج کہنا جائز نہیں مگر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ (جائز ہے)

اور بلاشبہ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ مبتدا کے محل میں ہے، جیسے تو کہتا ہے: حسبت زیدا، أبوہ خارج، اور اگر آپ فتحہ دیں تو معنی ہوگا حسبتُ زیدا خروجه اور یہ محال ہے اور اس میں یہ بعد بھی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے ساتھ معنی کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں، مگر یہ کہ لا کو زائدہ بنایا جائے اور کتاب اللہ میں کسی حرف کو قابل تسلیم حجت کے بغیر تطول اور زیادت کی طرف پھیرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور قرات جید یہ ہے کہ معنی اس طرح ہو: لأنهم لا يعجزون (کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔) مکی نے کہا ہے: پس معنی یہ ہے: لا يحسبن الكفار أنفسهم فاتوا لأنهم لا يعجزون اى لا يفوتون (کفار اپنے بارے میں یہ گمان نہ کریں کہ وہ بچ گئے کیونکہ وہ بچ نہیں سکتے) پس أن لام کے حذف کے ساتھ نصب کے محل میں ہے یا لام کے عمل کرنے کی صورت میں محل جر میں ہے، کیونکہ انکے ساتھ ان کا حذف کثرت سے پایا جاتا ہے اور یہی خلیل اور کسائی سے روایت کیا گیا ہے۔ اور باقیوں نے ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ماقبل سے منقطع ہے اور یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اس میں تاکید کا معنی ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا موقف یہی ہے۔

اور ابن محیصن سے روایت ہے کہ انہوں نے لا يعجّزون تشدید اور نون کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ دو وجہوں سے غلط ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عجزه کا معنی ہے ضعفه و ضعف أمره (کسی کو کمزور کر دینا اور کسی کے کام کو کمزور کر دینا) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا دونوں کے ساتھ ہونا واجب ہے۔ اور أعجزه کا معنی ہے سبقه و فاته حتى لم يقدر عليه (کسی سے بچ نکلنا اور مفقود ہو جانا یہاں تک کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے)

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

''اور تیار رکھو ان کے لیے جتنی استطاعت رکھتے ہو قوت و طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے تاکہ تم خوفزدہ کر دو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور دوسرے لوگوں کو ان کھلے دشمنوں کے علاوہ تم نہیں جانتے ہو انہیں (البتہ) اللہ جانتا ہے انہیں اور جو چیز خرچ کرو گے راہ خدا میں اس کا اجر پورا پورا دیا جائے گا تمہیں اور (کسی طرح) تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو دشمنوں کے لیے قوت و طاقت تیار رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے بعد اس کے کہ پہلے تقویٰ کی تاکید فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو وہ انہیں محض کلام کے ساتھ، ان کے چہروں پر تھوکنے کے ساتھ اور مٹی کی ایک مشت ان پر ڈالنے کے ساتھ شکست اور ہزیمت سے دوچار کر دے جیسا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا لیکن اس نے چاہا کہ وہ بعض لوگوں کو ایسی بعض چیزوں کے ساتھ آزمائے جو پہلے سے اس کے علم میں ہیں اور اس کی قضا و قدر ان میں نافذ ہے۔ جب بھی خیر اور نیکی میں سے کوئی شے تو اپنے دوست کے لیے یا شر اور تکلیف میں سے کوئی اپنے دشمن کے لیے تیار کرے گا تو وہ تیری اس تیاری میں داخل ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں قوت سے مراد ہتھیار اور قوسیں ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اس حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے: ''اور تم ان کے لیے تیار رکھو قوت و طاقت میں سے جتنی استطاعت رکھتے ہو خبردار سنو! بے شک قوت تیر پھینکنا ہے، خبردار سنو! بے شک قوت تیر مارنا ہے، خبردار سنو! بے شک قوت تیر پھینکنا ہے''(1)۔ یہ نص ہے جسے حضرت عقبہ سے ابو علی ثمامۃ بن شفی ہمدانی نے روایت کیا ہے اور ان کی صحیح میں اس کے سوا (کوئی روایت) نہیں ہے۔

اور رمی کے بارے میں حضرت عقبہ سے ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''عنقریب تم پر زمین فتح کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ تمہیں کافی ہوگا پس چاہیے کہ تم میں سے کوئی اپنے تیروں کے ساتھ کھیلنے (یعنی انہیں چلانے) سے عاجز نہ ہو''(2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر شے جس کے ساتھ آدمی کھیلتا ہے وہ باطل ہے سوائے اپنی قوس کے ساتھ تیر اندازی کرنے کے، اپنے گھوڑے کو ادب سکھانے (یعنی اسے سدھارنے کے) اور اس کے اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنے (اور اظہار محبت کرنے) کے، کیونکہ یہ حق ہے''(3)۔ اس کا معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہر وہ شے جس کے ساتھ آدمی کھیلتا ہے اور وہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی فائدہ نہ دے تو وہ باطل ہے اور اس سے اعراض کرنا، بچنا اولیٰ ہے۔ اور یہ تینوں امور ہیں کہ اگر آدمی انہیں اس ارادہ پر کرتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ کھیلے اور چست اور ہشاش بشاش ہو تو یہ حق اور درست ہیں کیونکہ ان کا اتصال نفع بخش اور مفید چیز کے ساتھ ہے، کیونکہ قوس کے ساتھ تیر اندازی کرنا اور گھوڑے کی تادیب بھی امور جنگ میں معاون و مددگار ہیں۔ اور اہلیہ کے ساتھ کھیلنا اور محبت کا اظہار کرنا اس امر تک پہنچاتا ہے کہ اس سے ایسا بچہ پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے گا اور اس کی عبادت کرے گا۔ پس اس حیثیت سے یہ تینوں امور حق اور صحیح ہیں۔

سنن ابی داؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ساتھ تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا ایک اسے بنانے والا جو اسے بناتے وقت خیر اور نیکی کی نیت کرتا ہے اور دوسرا اسے پھینکنے والا اور تیسرا وہ جس کو تیر مارا جائے یا دیا جائے''(4)۔ تیر اندازی کی فضیلت عظیم ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کی منفعت اور فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اور کافروں پر اس کی مضرت اور تکلیف انتہائی شدید اور سخت

1۔ صحیح مسلم، باب فضل الرمی، جلد 2، صفحہ 143　　2۔ ایضاً　　3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 647

4۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 59۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الرمی، حدیث نمبر 1561، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے بنی اسماعیل! تیر اندازی کیا کرو کیونکہ تمہارے آباء تیر اندازی کرتے تھے''۔ اور گھوڑوں کو سکھانا اور اسلحہ کا استعمال جاننا فرض کفایہ ہے۔ اور کبھی فرض عین ہو جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ حسن، عمرو بن دینار اور ابوحیوہ نے ومن ربط الخیل را اور با کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ رباط کی جمع ہے، جیسے کتاب کی جمع کتب ہے۔ ابو حاتم نے ابن زید سے نقل کیا ہے کہ رباط سے مراد پانچ یا اس سے کچھ زائد گھوڑوں کو باندھنا ہے اور اس کی جمع ربط ہے۔ اور مراد وہی ہیں جو بندھے ہوئے ہوں۔ اسی سے کہا جاتا ہے: رَبَطَ يَرْبِطُ ربطا اور ارتبط یرتبط إرتباطاً۔ اور مربط الخیل اور مرابط الخیل سے مراد گھوڑوں کو دشمن کے مقابلے میں باندھنا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أمر الإله بربطها لعدوّه　　في الحرب إنّ الله خير موفِّقِ

اللہ تعالیٰ نے جنگ میں اپنے دشمن کے مقابلے میں گھوڑے باندھنے کا حکم دیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ بہتر توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

اور مکحول بن عبداللہ نے کہا:

تلومُ على رَبْطِ الجياد و حَبْسِها　　وأوصَى بها اللهُ النبيَّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

تو گھوڑوں کے باندھنے اور انہیں روکنے پر ملامت کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی ہے۔

اور گھوڑوں کو باندھنا فضل عظیم اور باعث عزت و شرف رتبہ ہے۔ عروہ البارقی کے ستر گھوڑے تھے جو جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اور ان میں سے مستحب اور پسندیدہ مؤنث (گھوڑیاں) ہیں۔ یہ عکرمہ اور ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ مؤنث کا (باطن) خزانہ ہے اور اس کا ظاہر عزت و فخر ہے۔ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام کا گھوڑا بھی مؤنث تھا۔ اور ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''گھوڑا تین درجے کا ہے ایک آدمی کے لیے باعث اجر ہے اور ایک کے لیے باعث ستر ہے اور ایک آدمی کے لیے یہ بوجھ ہے'' (1)۔ الحدیث۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکر کو مؤنث سے خاص نہیں فرمایا۔ اور ان میں سے عمدہ اور اعلیٰ اجر کے اعتبار سے عظیم ہے اور بہت زیادہ نفع دینے والا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کون سا غلام افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جو ثمن کے اعتبار سے مہنگا ہو اور اپنے گھر والوں کے نزدیک نفیس اور عمدہ ہو'' (2)۔

نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو وہب جشمی سے روایت نقل کی ہے۔ اور انہیں بھی شرف صحابیت حاصل تھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اسماء پر نام رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ اسماء (عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں) اور گھوڑے باندھ کر رکھو اور ان کی پیشانیوں اور ان کی پشتوں کو رگڑو (پونچھو) اور انہیں قلادہ

1۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 59　　2۔ ایضاً

پہناؤ اور انہیں تانت کا قلادہ نہ پہناؤ اور تم پر لازم ہے کہ سرخ سیاہی مائل گھوڑا رکھو جو پنج کلیان (یعنی چاروں پاؤں اور اس کی پیشانی سفید ہو) یا سرخ زردی مائل پنج کلیان یا خالص سیاہ رنگ کا پنج کلیان گھوڑا رکھو'' (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین گھوڑا سیاہ رنگ کا ہے جس نے دانت نکالا ہوا ہو اور اس کی ناک کے سرے پر سفید داغ ہو۔ (پھر وہ گھوڑا جس نے دانت نکالا ہو اور اس کے پاؤں سفید ہوں) پھر مطلق سیاہ رنگ کا گھوڑا اور اگر سیاہ رنگ کا گھوڑا نہ ہو تو پھر سرخ رنگ کا گھوڑا جو سیاہی مائل ہو اور مذکورہ اوصاف پر ہو'' (2)۔ اور اسے دارمی نے بھی حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تو میں کون سا گھوڑا خریدوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک پر سفید داغ ہو دائیں ہاتھ کے سوا بایاں ہاتھ اور دونوں پاؤں سفید ہوں یا پھر اسی طرح سرخ سیاہی مائل گھوڑا خرید لے تو نفع اٹھائے گا اور محفوظ رہے گا'' (3)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑوں میں سے الشکال ناپسند کرتے تھے۔ اور الشکال وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کے دائیں پاؤں میں اور بائیں ہاتھ میں سفیدی ہو یا دائیں ہاتھ میں اور بائیں پاؤں میں سفیدی ہو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ گھوڑا جس پر حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو شہید کیا گیا وہ اشکل تھا۔

مسئلہ نمبر 3۔ پس اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کافی تھا۔ پھر خاص طور پر تیروں اور گھوڑوں کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو یہ کہا جائے گا: بلاشبہ گھوڑا جنگوں کی اصل اور ان کا وہ اسلحہ ہے جس کی پیشانی میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے اور یہ قوت کے اعتبار سے انتہائی طاقتور، دوڑ کے اعتبار سے انتہائی مضبوط اور شہسوار کو محفوظ رکھنے والا ہے اور اس کے ساتھ میدان میں چکر لگایا جا سکتا ہے، لہٰذا از روئے عظمت و شرف کے اس کا ذکر خاص طور پر کیا اور عزت و تکریم کی خاطر اس کے غبار کی قسم کھائی۔ پس ارشاد فرمایا: وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا۝ الآیہ (العادیات)

اور جب تیر جنگوں میں استعمال کیے جانے والے ہتھیاروں میں سے اور دشمن کو قتل کرنے کے اعتبار سے اور انہیں ارواح کے زیادہ قریب کرنے کے اعتبار سے زیادہ کامیابی دلانے والا ہتھیار ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لیے اور اس پر تنبیہ کرنے کے لیے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا۔ اور قرآن کریم میں اس کی نظیر و جبریل و میکال ہے (یعنی ان فرشتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا) اس کی کثیر مثالیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے گھوڑا اور ہتھیار رکھنے اور دشمن کے مقابلے کی تیاری کے لیے خزانے اور ان کے محافظ رکھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ اور علماء نے حیوان رکھنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے جیسے گھوڑا

1۔ سنن نسائی، کتاب الخیل، جلد 2، صفحہ 122۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2181، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، حدیث نمبر 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131

اور اونٹ وغیرہ۔ اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ منع ہے، یہی قول ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ صحیح ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور یہی اصح ہے اور دلیل یہ آیت ہے۔ اور اس گھوڑے کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں حملہ کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حق میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: ''اور رہے خالد تو تم خالد پر زیادتی کرتے ہو کیونکہ اس نے اپنا گھوڑا باندھ کر رکھا اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں استعمال کیا''(1)۔ الحدیث

اور یہ بھی روایت ہے کہ ایک عورت نے اونٹ فی سبیل اللہ رکھا ہوا تھا پھر اس کے خاوند نے حج کا ارادہ کیا، تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو وہ اونٹ اسے دے دے تاکہ وہ اس پر حج کرے کیونکہ حج بھی اللہ تعالیٰ کے راستوں میں سے ہے''۔ اور اس لیے بھی کہ یہ مال ہے جس سے بوجہ قربت نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، پس جائز ہے کہ انہیں اونٹ کے بچوں کی طرح باندھ کر رکھا جائے۔ اور علامہ سہیلی نے اس آیت کے ضمن میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں اور آلات حرب کے نام ذکر کیے ہیں، جو انہیں جاننا چاہے وہ انہیں کتاب ''الاعلام'' میں پا سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ یعنی تم اس کے ساتھ خوفزدہ کردو۔ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ یعنی یہود، قریش اور کفار عرب میں سے جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔

وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو) مراد اہل فارس اور روم ہیں۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد جن ہیں۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ ہے جس کی عداوت و دشمنی معروف نہ ہو۔ سہیلی نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ ان سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ جن ہیں اور علاوہ ازیں بھی قول کیے گئے ہیں۔ اور مناسب نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی خاص شے کہی جائے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا ہے: وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ تو پھر کیسے کوئی ان کے بارے حقیقی علم کا دعویٰ کر سکتا ہے، مگر یہ کہ حدیث صحیح ہے جو اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور وہ اس آیت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: هم الجن (کہ مراد جن ہیں) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک شیطان ایسے گھر میں کسی کو نہیں بگاڑ سکتا جس میں خوش منظر گھوڑا ہو'' اس روایت میں فرس عتیق کہا گیا ہے یعنی گھوڑے کا نام عتیق رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ حقارت اور نسل کی خرابی سے الگ اور محفوظ ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ نے ابی ملیکی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے اپنے باپ اور پھر دادا کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ جن اس گھر کے قریب نہیں آتے جس میں گھوڑا ہو اور وہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سے بھاگ جاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ تاکہ تم صدقہ کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جو خرچ کرو گے اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑے پر۔ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ آخرت میں تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ (یعنی) ایک نیکی کا اجر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 316

اس کی مثل دس سے لے کر سات سوگنا تک اور پھر کثیر گنا تک۔ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۱﴾

''اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا اس میں لَهَا فرمایا ہے کیونکہ السلم مونث ہے۔ اور جائز ہے کہ تانیث فعلة کے لیے ہو۔ اور جنوح کا معنی مائل ہونا ہے۔ وہ فرماتا ہے: اگر وہ مائل ہوں۔ یعنی وہ جن کے عہد توڑنے کا علم آپ کو ہوا۔ صلح کی طرف، تو پھر آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جایئے۔ اور جنح الرجل إلى الآخر کا معنی ہے آدمی دوسرے کی طرف مائل ہوا۔ اور اسی وجہ سے پسلیوں کو جوانح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ انتڑیوں پر جھکی ہوئی ہیں (1)۔ اور جنحت الإبل (یہ تب کہا جاتا ہے) جب چال میں اونٹ کی گردن جھک جائے۔ اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

إذا مات فوق الرَّحْل أحييتُ روحَه　　بذِكراكِ والعِيسُ المراسيل جُنَّحُ

اور نابغہ نے کہا ہے:

جوانحُ قد أيقنّ أن قبيلَه　　إذا ما التقى الجمعان أوّل غالبِ

مراد پرندہ ہے۔ اور جنح الليل جب رات آئے اور اپنا اندھیرا زمین پر پھیلا دے۔ اور السلم والسلام دونوں کا معنی صلح ہے۔ اعمش، ابوبکر، ابن محیصن اور مفضل نے سین کو کسرہ کے ساتھ للسلم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا مکمل معنی سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور کبھی السلام بمعنی التسلیم ہوتا ہے۔ اور جمہور نے نون کے فتحہ کے ساتھ فاجنح پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے۔ اشہب عقیلی نے نون کے ضمہ کے ساتھ فاجنُح پڑھا ہے اور یہ قیس کی لغت ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہی لغت قیاس کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں یہ اختلاف کیا گیا ہے، کیا یہ منسوخ ہے یا نہیں؟ حضرت قتادہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبۃ: 5) نے منسوخ کر دیا ہے۔

وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (توبہ: 36) اور ان دونوں نے کہا ہے: ہر قسم کی صلح کی براءت منسوخ ہو چکی ہے یہاں تک کہ وہ کہہ دیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (یعنی باہمی صلح کے معاہدوں کی ذمہ داری منسوخ ہو چکی ہے یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جائیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا ناسخ فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ (محمد: 35) ہے۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، بلکہ اہل جزیہ سے جزیہ قبول کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور آپ کے بعد آنے والے بہت سے ائمہ نے بلاد عجم میں سے بہت

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

سے شہروں کی صلح اس بنا پر کی کہ ان سے جزیہ وصول کر لیا اور انہیں ان کے شہروں میں ہی رہنے دیا، حالانکہ وہ انہیں مکمل ختم کرنے پر قادر تھے۔ اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بلاد میں سے کثیر کے ساتھ اس مال پر صلح کی جو وہ آپ کو ادا کرتے تھے۔ ان میں سے خیبر بھی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ کے بعد وہاں کے باسیوں کو اس شرط پر وہیں رہنے دیا کہ وہ کام کرتے رہیں اور پیداوار کا نصف ادا کریں۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس آیت سے بنی قریظہ مراد لیے گئے ہیں، کیونکہ ان سے جزیہ قبول کیا جاتا تھا۔ اور رہے مشرک تو ان سے کوئی شی قبول نہیں کی جائے گی۔ اور سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ آپ کو صلح کی دعوت دیں تو آپ ان کی دعوت قبول کریں اور اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی وجہ سے اس کا جواب مختلف ہوتا رہا(1)، اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ﳓ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﳓ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ (محمد: 35) (اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے) پس جب مسلمان عزت وقوت میں طاقتور، متعدد جماعتوں میں اور انتہائی مضبوط ہوں تو پھر کوئی صلح نہیں ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فلا صلحَ حتى تُطعن الخيلُ بالقَنا و تُضرب بالبِيض الرقاق الجماجمُ

اور اگر مسلمانوں کے لیے صلح میں مصلحت ہو کسی ایسے نفع کے سبب جسے وہ اس کے ساتھ حاصل کر سکتے ہوں یا کسی ضرر اور نقصان کے سبب جسے وہ اس کے ساتھ دور کر سکتے ہوں، تو پھر کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمان اس کی ابتدا کریں جب انہیں اس کی ضرورت ہو۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ شرائط پر اہل خیبر سے صلح کی پھر انہوں نے ان شرائط کو توڑ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلح کو ختم کر دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضمری، اکیدر دومہ اور اہل نجران کے ساتھ صلح کی اور آپ نے قریش کے ساتھ دس برس کے لیے صلح کی یہاں تک کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا عہد توڑ دیا۔ اور خلفاء اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس راستے پر چلتے رہے ہیں جسے ہم نے مشروع قرار دیا ہے اور ان وجوہ اور اسباب کے ساتھ عمل کرتے رہے ہیں جن کی شرح اور وضاحت ہم نے کی ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: جب مسلمانوں کے پاس قوت اور طاقت ہو تو پھر چاہیے کہ صلح ایک سال تک نہ پہنچے (یعنی صلح کی مدت سال سے کم ہو) اور جب قوت وطاقت کفار کے پاس ہو تو پھر دس برس تک باہم صلح کرنا جائز ہے اور اس سے زیادہ جائز نہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے ساتھ دس سال کے لیے صلح کی۔

ابن منذر نے کہا ہے: علماء کا اس مدت کے بارے اختلاف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان حدیبیہ کے ساتھ مقرر ہوئی۔ پس حضرت عروہ نے کہا: وہ چار سال تھی۔ ابن جریج نے کہا: وہ مدت تین سال تھی۔ اور ابن اسحاق نے کہا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 876

ہے: وہ دس سال کا عرصہ تھا۔(1)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرکین کے ساتھ دس سال سے زیادہ عرصہ کے لیے صلح کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے سال کیا۔ پس اگر مشرکوں سے اس سے زیادہ عرصہ کے لیے صلح کی گئی تو وہ ٹوٹ جائے گی، کیونکہ دراصل مشرکین کو قتل کرنا فرض ہے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں یا جزیہ ادا کریں۔ ابن حبیب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: مشرکین کے ساتھ صلح کرنا جائز ہے ایک سال کے لیے، دو سال کے لیے، تین سال کے لیے اور غیر معینہ مدت کے لیے۔ مہلب نے کہا ہے: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ یہ ایسا معاہدہ کیا جس میں بظاہر مسلمانوں کی کمزوری کا اظہار تھا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناقہ کو مکہ مکرمہ سے روک دیا، جس وقت آپ نے مکہ مکرمہ کی طرف منہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حبسها حابس الفیل (اسے ہاتھی کو روکنے والے نے روک دیا ہے)

اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مسور بن مخرمہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور یہ مشرکین سے بغیر کسی ایسے مال کے جو ان سے لیا جائے گا صلح اور امن قائم کرنے کے جواز پر دلیل ہے، جب کہ امام وقت اس میں مصلحت اور بہتری دیکھے۔ اور مسلمانوں کی حاجت کے وقت ایسے مال کے عوض عقد صلح کرنا بھی جائز ہے جسے وہ دشمن کے لیے خرچ کریں گے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب کے وقت عیینہ بن حصن فزاری اور حارث بن عوف المری کو اس شرط پر قریش سے علیحدہ ہو جانے کو کہا تھا کہ آپ ان دونوں کو مدینہ طیبہ کی کھجوروں کا تیسرا حصہ عطا کریں گے(2) اور وہ دونوں بنی غطفان کو ساتھ لے کر واپس پھرے اور انہوں نے قریش کو رسوا اور ذلیل کیا۔ اور اپنی قوم کو ساتھ لے کر واپس لوٹ گئے۔ اور یہ گفتگو انہیں بہلانے پھسلانے کی تھی یہ معاہدہ نہ تھا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ دونوں مائل ہیں اور راضی ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما سے مشورہ کیا، تو ان دونوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ایسا امر ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں تو ہم آپ کی خوشنودی کے لیے یہ کریں گے یا یہ ایسی شے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے تو ہم اسے سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں۔ یا یہ ایسا امر ہے جسے آپ ہمارے لیے کر رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ یہ ایسا امر (معاملہ) ہے جسے میں تمہارے لیے کر رہا ہوں کیونکہ عربوں نے ایک معاہدہ کے تحت تمہارا قصد کیا ہے''۔ تب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم بخدا! ہم اور وہ مشرک قوم تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے، نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور نہ اسے پہچانتے تھے اور انہوں نے کبھی یہ طمع نہیں کیا کہ وہ ہم سے پھل حاصل کریں، مگر خرید کر یا بطور مہمان کے (ہم نے انہیں پیش کیا) اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے سبب ہمیں عزت و تکریم عطا فرمائی ہے، اس نے ہمیں اس کی طرف رہنمائی اور ہدایت عطا فرمائی ہے اور اس نے آپ کے سبب ہمیں معزز بنا دیا ہے۔ ہم انہیں اپنے اموال دیں! قسم بخدا! تلوار کے سوا ہم انہیں کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس طرح تفسیر کی گئی ہے فرمایا: انتم وذاك اور عیینہ اور حارث کو

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 876

فرمایا: ''تم دونوں چلے جاؤ تمہارے لیے ہمارے پاس سوائے تلوار کے سوا کچھ نہیں''۔ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے صحیفہ پایا اور اس میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت نہیں تھی تو آپ نے اسے مٹا دیا۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں (تو آپ فکرمند کیوں ہوں) بے شک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ، وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی نصرت اور مومنوں (کی جماعت) سے۔ اور اسی نے الفت پیدا کر دی ان کے دلوں میں۔ اگر آپ خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تو نہ الفت پیدا کر سکتے ان کے دلوں میں لیکن اللہ تعالیٰ نے الفت پیدا کر دی، ان کے درمیان بلاشبہ وہ زبردست ہے حکمت والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ یعنی اس کے ساتھ کہ وہ آپ کے لیے صلح ظاہر کریں۔ اور باطن میں غدر اور خیانت رکھیں، تو آپ مائل ہو جایئے پس آپ کا ان کی نیتیں فاسد ہونے کے سبب کوئی نقصان نہیں۔ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کافی ہے، یعنی وہ ہی آپ کی کفایت اور آپ کی حفاظت کا والی اور ذمہ دار ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

إذا كانت الهيجاءُ وانشقّتِ العصا　　فحسبُكَ والضحاكَ سيفٌ مُهَنَّدُ

یعنی تجھے اور ضحاک کو تلوار کافی ہے، تو اس میں بھی حَسْبَكَ بمعنی کافیك ہے۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ یعنی وہی ہے جس نے آپ کو اپنی نصرت کے ساتھ قوت عطا کی۔ مراد بدر کا دن ہے۔ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ نعمان بن بشیر نے کہا ہے: یہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ یعنی اوس اور خزرج کے دلوں کو (محبت والفت سے) جوڑ دیا۔ اور عرب میں شدید عصبیت کے باوجود حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات اور آپ کے معجزات کے سبب دلوں میں الفت اور محبت پیدا ہوگئی، کیونکہ ان میں سے کسی کو تھپڑ مارا جاتا تھا تو وہ اس کے عوض جھگڑ پڑتا تھا یہاں تک کہ وہ اس کا قصاص طلب کرتا تھا۔ اور وہ حمیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انتہائی شدید اور سخت تھے، پس اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ ان کے درمیان الفت پیدا کر دی، یہاں تک کہ ایک آدمی دین کے سبب اپنے باپ اور اپنے بھائی کے خلاف قتال کرنے لگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں مراد مہاجرین و انصار کے درمیان تالیف ہے۔ اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

''اے نبی (مکرم) کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے''۔

یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ ماسبق کلام میں فرمایا ہے: وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ اور یہ کفایۃ خاصہ ہے اور

اس ارشاد یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ میں تعمیم کا ارادہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں آپ کو کافی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تینتیس آدمی اور چھ عورتیں اسلام لا چکی تھیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور وہ (مسلمان) چالیس ہو گئے۔ یہ آیت مکی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدنی سورت میں لکھی گئی ہے اسے قشیری نے ذکر کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں انہوں نے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے، تحقیق سیرت میں اس کے خلاف واقع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم کعبہ معظمہ کے پاس نماز پڑھنے پر قدرت نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے، پس جب آپ نے اسلام قبول کیا تو آپ نے قریش کے ساتھ جھگڑا کیا یہاں تک کہ آپ نے کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے جو حبشہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے ان کی ہجرت کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مسلمانوں میں سے وہ تمام جو سرزمین حبشہ کے ساتھ جا ملے اور اس کی طرف ہجرت فرما ہوئے۔ ان کے ان بیٹوں کے سوا جو ان کے ساتھ چھوٹی عمر میں نکلے یا وہاں پیدا ہوئے۔ وہ تراسی آدمی تھے، اگر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ان میں شامل ہوں۔ کیونکہ ان کے بارے میں شک کیا جاتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت جنگ سے قبل غزوہ بدر کے بارے میں مقام بیداء پر نازل ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے۔ اور مہاجرین و انصار آپ کو کافی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے اور انہیں کافی ہے جنہوں نے آپ کی اتباع کی۔ اسے شعبی اور ابن زید رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور پہلا قول حسن سے منقول ہے اور اسے نحاس وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ اور من پہلے قول کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اسم جلالت لفظ اللہ پر معطوف ہے۔ اور معنی یہ بنتا ہے: فإن حسبك الله واتباعك من المؤمنين (بے شک اللہ تعالیٰ اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین آپ کو کافی ہیں)

اور دوسرے قول کے مطابق عطف ضمیر پر ہے۔ اور اسی کی مثل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: یکفینیه الله وأبناء قیلة (اللہ تعالیٰ اور قیلہ کے بیٹے (مراد اوس و خزرج ہیں) مجھے اس کے لیے کافی ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ، حسبهم الله (مومنین میں سے جو آپ کی اتباع کرنے والے ہیں اللہ انہیں کافی ہے)۔ پس خبر مضمر ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ من محل نصب میں ہو اور معنی یہ ہو یکفیك الله ویکفی من اتبعك (اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے اور وہ انہیں کافی ہے جنہوں نے آپ کی اتباع کی)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ۝۶۵ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ

مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

''اے نبی! برانگیختہ کیجئے مومنوں کو جہاد پر اگر ہوں تم سے بیس آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دوسو پر اور اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی (صبر کرنے والے) تو غالب آئیں گے ہزار کافروں پر کیونکہ یہ کافر وہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔ (اے مسلمانو!) اب تخفیف کردی ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے تو اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دوسو پر اور اگر ہوئے تم میں سے ایک ہزار (صابر) تو وہ غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ یعنی آپ انہیں جہاد پر برانگیختہ کیجئے اور ابھاریئے۔ کہا جاتا ہے: حارض علی الأمر و واظب وواصب وأكب ان تمام کا معنی ایک ہے (یعنی اس نے کام پر ابھارا، برانگیختہ کیا) اور الحارض وہ ہے جو ہلاک ہونے کے قریب ہو جائے۔ اس معنی میں رب کریم کا ارشاد بھی ہے: حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا (یوسف:85) (کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت) یعنی تو غم سے پگھلنے لگے اور تو ہلاک ہونے کے قریب ہو جائے تو تو ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائے گا۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ یہ الفاظ تو خبر ہیں، ان کے ضمن میں شرط کے ساتھ ایک وعدہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے آدمی صبر کریں گے تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے إن يصبر منكم عشرون صابرون يغلبوا مائتين، عشرون، ثلاثون اور اربعون ان میں سے ہر ایک ایسا اسم ہے جو اس عدد کے لیے جمع کی صورت میں وضع کیا گیا ہے۔ اور یہ اسم قائم مقام فلسطین کے ہو جائے گا۔ اگر کوئی کہنے والا یہ کہے: عشرین کے پہلے حرف کو کسرہ کیوں دیا ہے حالانکہ ثلاثین اور اس کے مابعد ثمانین تک سوائے ستین کے تمام میں پہلا حرف مفتوح ہے؟ تو سیبویہ کے نزدیک جواب یہ ہے کہ عشرۃ سے عشرین ایسے ہی ہے جیسے واحد سے اثنین (واحد سے تثنیہ) ہے پس عشرین کے پہلے حروف کو کسرہ دیا گیا جیسے اثنان کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل ان کا قول ستون و تسعون ہے، جیسا کہ ستة و تسعة کہا گیا ہے۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: یہ آیت اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ نازل ہوئی اور یہ امر مسلمانوں پر گراں اور شاق گزرا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض قرار دیا کہ ان میں سے ایک دس کے مقابلے سے نہ بھاگے، پھر تخفیف کا حکم نازل ہوا اور فرمایا: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ ابو توبہ نے اس قول تک پڑھا: مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے انہیں عدد میں تخفیف فرمائی تو جتنی ان کے لیے تخفیف فرمائی اتنا صبر کم کردیا۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے بے شک یہ حکم بدر کے دن تھا اور پھر منسوخ ہو

گیا۔ اور یہ کہنے والے کی خطا ہے۔ اور کہیں منقول نہیں کہ مشرکین نے مسلمانوں کے مقابلے میں اس پر صف بندی کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ان پر پہلے فرض کیا اور اسے اس کے ساتھ معلق کیا کہ بلاشبہ تم اسے سمجھتے ہو جس پر تم قتال کر رہے ہو اور وہ ثواب ہے۔ اور وہ اسے نہیں جانتے جس پر وہ قتال کرتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فرض ہے پھر جب ان پر یہ گراں گزرا تو دو کے مقابلے میں ایک کے ثابت قدم رہنے کے سبب یہ فرض ساقط ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں تخفیف فرما دی اور ان پر یہ فرض کر دیا کہ ایک سو دو سو کے مقابلے سے نہ بھاگیں۔ پس اس قول کی بنا پر تخفیف ہے نہ کہ نسخ۔ اور یہ حسن اور اچھا ہے۔ تحقیق قاضی ابن الطیب نے کہا ہے کہ حکم کا بعض حصہ اور اس کے بعض اوصاف جب منسوخ ہو جائیں یا اس کا عدد بدل دیا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ یہ نسخ ہے، کیونکہ اس وقت وہ بعینہ پہلا نہیں ہوتا بلکہ اس کا غیر ہوتا ہے۔ اور اس میں اختلاف ذکر کیا ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

"نہیں مناسب نبی کے لیے کہ ہوں اس کے پاس جنگی قیدی یہاں تک کہ غلبہ حاصل کرلے زمین میں، تم چاہتے ہو دنیا کا سامان اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (تمہارے لیے) آخرت اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب (اور) دانا ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَسْرٰى یہ أسیر کی جمع ہے، جیسے قتیل کی جمع قتلی اور جریح کی جمع جرحی ہے اور أسیر کی جمع میں أساری (ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ) اور أساری (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ عالیہ کے ساتھ نہیں ہے (مراد الف مقصورہ ہے) وہ قیدی کو چمڑے کی رسی کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور وہ أسار کہلاتا ہے۔ اور پھر ہر پکڑے جانے والے کو أسیر کا نام دیا گیا اگرچہ اسے نہ بھی باندھا جائے۔ اعشی نے کہا ہے:

وقيّدني الشعر في بيتهِ كما قيّد الآسِراتُ الحِمارا

اور یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: الاسریٰ وہ قیدی ہیں جو اس وقت باندھیں نہ جائیں جب وہ پکڑے جاتے ہیں، اور الاساری وہ ہیں جنہیں رسی وغیرہ کے ساتھ باندھا جائے۔ ابو حاتم نے اسے بیان کیا ہے انہوں نے یہ عربوں سے سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت بدر کے دن نازل ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو عتاب کیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے: تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم ایسا فعل کرو جو واجب قرار دے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غلبہ سے پہلے قیدی ہوں۔ اور ان کے لیے یہ خبر اس ارشاد کے ساتھ ہے: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (تم دنیا کا سامان چاہتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 877

ہو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے وقت مردوں کو باقی رکھنے کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا اور نہ کبھی آپ نے سامان دنیا کا ارادہ کیا، بلاشبہ جمہور جنگ کرنے والوں نے یہ فعل کیا۔ پس زجر و توبیخ اور عتاب اس کے سبب سے متوجہ ہے جس نے فدیہ لینے کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور یہی وہ قول ہے جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آیت میں اس وقت آیا جس وقت آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا جب آپ نے اسے عریش سے دیکھا جب کہ حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم نے اسے ناپسند کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاملے کے اچانک آنے اور مدد و نصرت کے نازل ہونے نے اس سے مشغول رکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھنے کے بارے نہی ترک کر دی، یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ واللہ اعلم۔

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے اور اس کا پہلا حصہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے اور یہ اس کی تکمیل ہے۔

ابوزمیل نے بیان کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب مسلمانوں نے قیدیوں کو قید کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''ان قیدیوں کے بارے میں تم کیا رائے رکھتے ہو؟'' تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ عمزاد اور خاندان کے لوگ ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں، وہ ہمارے لیے کفار کے خلاف قوت و طاقت کا باعث ہو گا اور یہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت عطا فرما دے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن الخطاب تو کیا رائے رکھتا ہے''؟ میں نے عرض کی: قسم بخدا! یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ رائے نہیں رکھتا جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے ہے، بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ہمیں اختیار اور قدرت دیں تو ہم ان کی گردنیں مار دیں، پس آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عقیل کے بارے اختیار دیں کہ وہ اس کی گردن مار دیں اور مجھے فلاں (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب آدمی) پر قدرت دیں تو میں اس کی گردن مار دوں، کیونکہ یہ کفار کے ائمہ اور ان کے سردار ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند کیا جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا اور اسے پسند نہ فرمایا جو میں نے کہا۔ جب دوسرا دن آیا تو میں حاضر خدمت ہوا تو اچانک دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ تو میں عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی بتائیے کون سی وجہ سے آپ اور آپ کے ساتھی رو رہے ہیں۔ پس اگر میں نے رونے کو پا لیا تو میں بھی رو لوں گا، اور اگر میں نے رونا نہ پایا تو تم دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے کی شکل بنا لوں گا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس وجہ سے رو رہا ہوں جو تمہارے ساتھیوں نے مجھ پر فدیہ لینے کی رائے پیش کی تحقیق مجھ پر ان کا عذاب اس درخت سے بھی قریب تر پیش کیا گیا ہے''(1)۔ (مراد وہ درخت ہے جو اس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب تھا) اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 93

ارشاد تک فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا تک نازل فرمائی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا۔

یزید بن ہارون نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یحییٰ نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں ابو معاویہ نے اعمش سے انہوں نے عمرو بن مرہ سے انہوں نے ابو عبیدہ سے اور انہوں نے عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب غزوہ بدر ہوا اور قیدی لائے گئے تو ان میں عباس بھی تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ان قیدیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟'' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کی قوم ہے اور آپ کے اہل ہیں، آپ انہیں باقی رہنے دیجئے شاید اللہ تعالیٰ انہیں توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: انہوں نے آپ کی تکذیب کی ہے اور انہوں نے آپ کو (شہر سے) نکالا ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ جنگ کی ہے۔ انہیں آگے لائیے اور ان کی گردنیں مار دیجئے (یعنی انہیں قتل کر دیجئے) اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کثیر لکڑیوں (ایندھن) والی وادی دیکھیے اور اسے ان پر بھڑکا دیجئے۔ تو عباس نے کہا درآنحالیکہ وہ یہ سن رہے تھے: تم نے قطع رحمی کی ہے۔ راوی کہتے ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اندر) داخل ہو گئے اور آپ نے انہیں کسی قسم کا جواب نہ دیا۔ تو لوگوں نے کہا: آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کریں گے۔ اور کچھ لوگوں نے کہا: آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول لے لیں گے اور بعض لوگوں نے کہا: آپ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کریں گے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بعض لوگوں کے دلوں کو نرم کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ دودھ سے زیادہ نرم ہو گئے ہیں اور اس نے بعض لوگوں کے دلوں کو سخت کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ اے ابوبکر! تیری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثل ہے انہوں نے کہا تھا: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم) (پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور رحیم ہے) اے ابوبکر! تیری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثل ہے جب انہوں نے کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدہ) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے ان کو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے)

اور اے عمر! تیری مثال حضرت نوح علیہ السلام کی مثل ہے جب کہ انہوں نے کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (نوح) (اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا) اور اے عمر! تیری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہے جب انہوں نے کہا: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ (یونس) (اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو تا کہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو) تم عیال دار ہو تو کوئی بھی فدیہ یا قتل کیے جانے کے بغیر نہیں چھوٹے گا''۔ تو عبداللہ نے کہا: سوائے سہیل بن بیضاء کے کیونکہ میں نے اسے اسلام کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔ پس رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ فرمایا: میں نے اپنے آپ کو اس دن سے بڑھ کر خوفزدہ نہیں دیکھا کہ مجھ پر آسمان سے پتھر گرنے لگیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیتیں نازل فرمائیں: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ، الی آخر الآیتین (الانفال)(1) اور ایک روایت میں ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قریب ہے کہ ہمیں ابن خطاب کی مخالفت میں عذاب آ پہنچے اور اگر عذاب نازل ہوا تو سوائے عمر کے کسی کو نہ چھوڑے گا'' ابو داؤد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا: جب بدر کا دن تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے لیا، تو اللہ تعالیٰ نے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ، تا قولہ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ (یعنی تم نے فدیہ لیا) عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (الانفال) تک دو آیتیں نازل فرمائیں۔ بعد ازاں غنائم کو حلال کیا۔

اور علامہ قشیری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہمارا مشرکین کے ساتھ یہ پہلا معرکہ ہے پس غلبہ پانا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور الاثخان کا معنی ہے کثرت سے قتل کرنا۔ یہ حضرت مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ یعنی وہ مشرکوں کو قتل کرنے میں مبالغہ کریں۔ عرب کہتے ہیں: أثخن فلان في هذا الأمر یعنی فلاں نے اس کام میں مبالغہ کیا۔ اور بعض نے کہا ہے: یہاں تک کہ آپ غلبہ پالیں اور اس کے ساتھ انہیں قتل کریں۔

اور مفضل نے شعر کہا ہے:

تصلى الضحى ما دهرها بتعبد　وقد أثخنت فرعون في كفره كفرا

اور یہ بھی کہا گیا ہے: حَتَّىٰ يُثْخِنَ یہاں تک کہ آپ قدرت پالیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاثخان سے مراد قوت اور شدت ہے پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ بدر کے وہ قیدی جن سے فدیہ لیا گیا انہیں قتل کرنا ان کے فدیہ سے اولیٰ اور بہتر تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یہ بدر کا دن تھا اور اس دن مسلمان قلیل تھے، پس جب یہ بڑھ گئے اور ان کی سلطنت مضبوط اور مستحکم ہو گئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں یہ فرمان نازل کیا: فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (محمد: 4) (بعد ازاں یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تحقیق کہا گیا ہے: بے شک انہیں عتاب کیا گیا کیونکہ واقعہ بدر بہت عظیم واقعہ تھا اور صنادید قریش، ان کے اشراف، ان کے سرداروں اور ان کے مالوں میں قتل، قید کیے جانے اور ان کا مالک بننے کے اعتبار سے یہ بہت بڑا تصرف تھا۔ اور یہ تمام کا تمام ہی انتہائی عظیم واقعہ تھا، پس ان کا حق یہ تھا کہ وہ وحی الٰہی کا انتظار کرتے اور جلدی نہ کرتے، لیکن جب انہوں نے جلدی کی اور انہوں نے انتظار نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس انداز سے توجہ فرمائی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فرمایا: اگر تم چاہو تو قیدیوں کا فدیہ لے لو اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر ستر افراد جنگ میں شہید کر دیئے جائیں گے اور اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دیا جائے اور تم

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 383

سلامت رہو'۔ لوگوں نے عرض کی: ہم فدیہ لے لیتے ہیں اور ہم میں سے ستر آدمی شہید ہو جائیں گے(1)۔ اور عبد بن حمید نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام لوگوں کو اس طرح کا اختیار دینے کے بارے پیغام لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے (2)۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

اور عبیدہ سلمانی نے کہا ہے: انہوں نے دونوں اختیار طلب کیے (یعنی دونوں کی انہوں نے خواہش کی فدیہ اور شہادت) پس ان میں سے ستر آدمی غزوۂ احد میں شہید کر دیئے گئے۔ اور یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اشکال میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب اختیار دیا گیا تو پھر لمسکم کے قول کے ساتھ زجر و توبیخ کیونکر واقع ہوئی' تو جواب یہ ہے کہ پہلے ان کے فدیہ لینے کی حرص کی وجہ سے زجر و توبیخ واقع ہوئی اور پھر اس کے بعد اختیار دیا گیا۔ اور اس پر حضرت مقداد کا قول دلالت کرتا ہے جو انہوں نے اس وقت کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط کو قتل کرنے کے بارے حکم دیا۔ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ میرا قیدی ہے۔ اور حضرت مصعب بن عمیر جن کے بھائی کو قیدی بنایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا: اس پر اپنا ہاتھ مضبوط کرلو، کیونکہ اس کی ماں خوشحال ہے۔ علاوہ ازیں بھی واقعات ہیں جو ان کے فدیہ لینے پر ان کی حرص کی دلیل ہیں۔ پس جب قیدی حاصل ہو گئے اور انہیں مدینہ طیبہ کی طرف چلایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نضر اور عقبہ وغیرہ کو قتل کا حکم نافذ فرمایا اور ان تمام پر سختی ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تخییر کا فرمان نازل ہوا۔ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ قتل کے بارے میں اپنی پہلی رائے پر ہی قائم رہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدیہ کے مال کے ساتھ مسلمانوں کی قوت کی مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف مائل ہوئے۔ یہ دونوں آراء تخییر کے بعد اجتہاد ہے۔ اس لیے اس کے بعد اس بارے میں کوئی سخت یا ناراضگی کا حکم نازل نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ ابن وہب نے کہا ہے: امام مالک نے بیان کیا ہے کہ بدر کے قیدی مشرک تھے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل فرمایا: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ وہ اس وقت مشرک تھے انہوں نے فدیہ دیا اور واپس لوٹ گئے اور اگر وہ مسلمان ہوتے تو یقیناً وہیں ٹھہر جاتے اور واپس لوٹ کر نہ جاتے۔ ان میں سے جو قتل کیے گئے ان کی تعداد چوالیس تھی، اور انہیں کی مثل قیدی بنائے گئے۔ اور شہداء کی تعداد کم تھی۔ اور عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے: بے شک مقتول ستر تھے اور اتنے ہی قیدی تھے۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور یہی صحیح ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں بھی ہے، پس اس دن ستر قتل کر دیئے گئے اور ستر قیدی بنا لیے گئے۔

اور بیہقی نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: پس قیدی لائے گئے اور ان پر شقران مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقرر تھے اور وہ انچاس آدمی تھے جو گنے گئے اور در اصل وہ ستر تھے، اسی پر اجماع ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا 'اور وہ مشرک تھے' کیونکہ مفسرین نے روایت کیا ہے کہ عباس نے حضور

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 54 2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی قتل الاساری، حدیث نمبر 1492، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نبی مکرم ﷺ سے کہا: بلاشبہ میں مسلمان ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ قیدیوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے کہا: ہم آپ کے ساتھ ایمان لائے۔ اس سب کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور اس کے بطلان پر استدلال اس روایت سے کیا ہے جس میں ان کے واپس لوٹنے کا ذکر ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ انہوں نے احد کے میدان میں پھر آپ ﷺ سے جنگ لڑی (1)۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے وقت میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ وہ غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی عباس سے ملے تو وہ انہیں قتل نہ کرے کیونکہ انہیں مجبوراً نکالا گیا ہے''۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن فرمایا: ''بے شک بنی ہاشم وغیرہ کے کچھ لوگ بالجبر نکالے گئے ہیں ہمیں انہیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں پس تم میں سے کسی کا بنی ہاشم کے کسی فرد سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ اسے قتل نہ کرے اور جو ابو البختری سے ملے وہ اسے قتل نہ کرے اور جس کا سامنا عباس سے ہو جائے تو چاہیے کہ وہ اسے قتل نہ کرے کیونکہ انہیں بالاکراہ نکال کر لایا گیا ہے''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت اسلام لائے جب بدر کے دن قیدی بنائے گئے۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ غزوۂ خیبر کے سال اسلام لائے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مشرکین کی خبریں لکھتے تھے اور وہ ہجرت کرنا پسند کرتے تھے پس رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف لکھا: أمكث بمكة فمقامك بها أنفع لنا (2) (تم مکہ میں ہی رہو پس تمہارا وہاں رہنا ہمارے لیے زیادہ نفع بخش ہے)

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

''اگر نہ ہوتا حکم الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے) تو ضرور پہنچتی تمہیں بوجہ اس کے جو تم نے لیا ہے بڑی سزا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ اگر پہلے سے اس بارے میں حکم الٰہی نہ ہوتا کہ وہ کسی قوم کو عذاب نہیں دے گا یہاں تک کہ ان کے لیے اس چیز کو بیان کر دے جس سے وہ بچیں اور پرہیز کریں۔ لوگوں نے کتاب اللہ السابق کے بارے میں مختلف قول کیے ہیں۔ ان میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ اگر غنائم کو حلال کرنے کے بارے میں پہلے سے فیصلہ نہ ہوتا، کیونکہ ہم سے پہلی امتوں پر غنائم کو حرام کیا گیا تھا۔ پس جب غزوہ بدر کا دن تھا، تو لوگ غنائم کی طرف بڑی تیزی سے بڑھے تو اللہ تعالیٰ نے غنائم کو حلال کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ۔ ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔

سلام نے اعمش سے، انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 881
2۔ جامع ترمذی، سورۂ انفال، جلد 2، صفحہ 134

انہوں نے کہا: جب بدر کا دن تھا لوگ بڑی جلدی سے غنائم کی طرف بڑھے اور انہوں نے انہیں پالیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إن الغنيمة لا تحل لأحدٍ سود الرؤس غيركم (1) بے شک مال غنیمت تمہارے علاوہ سیاہ بالوں والے کسی بندے کے حلال نہیں کیا گیا۔ تو نبی ﷺ اور ان کے اصحاب جب مال غنیمت حاصل کرتے اور اسے ایک جگہ جمع کر دیتے تو آسمان سے ایک آگ اترتی اور اسے کھا جاتی۔ تب اللہ تعالیٰ نے لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ دو آیتوں کے آخر تک نازل فرمائی۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور حضرت مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے۔ ان دونوں سے بھی اور حضرت سعید بن جبیر سے یہ بھی مروی ہے کہ کتاب سابق سے مراد اللہ تعالیٰ کا اہل بدر کے اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت فرما دینا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: الکتاب السابق سے مراد اللہ تعالیٰ کا ان کے اس معین گناہ کو معاف فرما دینا ہے (یعنی مال غنیمت کی طرف تیزی سے بڑھنا) لیکن اس میں عموم اصح ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اہل بدر کے بارے میں فرمایا: "تجھے کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر مطلع ہوا اور اس نے فرمایا تم عمل کرو جو چاہو، تحقیق میں نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے" (2)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتاب سابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہیں دے گا درآنحالیکہ محمد ﷺ ان میں موجود ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ کتاب سابق یہ ہے کہ وہ کسی کو اس گناہ کے بدلے عذاب نہ دے گا جو اس نے عہد جاہلیت میں کیا یہاں تک کہ وہ پھر اس کی طرف بڑھے (یعنی اسلام کے بعد دوبارہ اس کا ارتکاب کرے) اور ایک گروہ نے کہا ہے: کتاب سابق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے کے سبب صغیرہ گناہوں کو مٹا دینے کے بارے فیصلہ کیا ہے۔ اور علامہ طبری اس طرف گئے ہیں کہ یہ جملہ معانی اس لفظ کے تحت داخل ہیں اور یہ لفظ ان تمام کو شامل ہے۔ اور کسی معنی کی تخصیص کا فائدہ نہیں دے رہا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بندہ جب ان اقوال میں سے کوئی فعل کر بیٹھے جن کے حرام ہونے کا وہ اعتقاد رکھتا ہے اور وہ فعل اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کے لیے حلال ہو تو اس پر کوئی سزا نہیں، جیسا کہ روزے دار جب کہے: یہ میرے سفر کا دن ہے پس میں اب روزہ افطار کرتا ہوں یا عورت کہتی ہے: یہ میرے حیض کا دن ہے پس میں روزہ افطار کرتی ہوں، پھر دونوں نے عملاً ایسا کر لیا اور سفر اور حیض دونوں روزہ افطار کرنے کا موجب ہیں۔ تو اس بارے میں مشہور مذہب یہ ہے کہ اس میں کفارہ ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اور یہ دوسری روایت ہے۔ پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ اباحت کے طرق تحریم کی سزا میں عذر ثابت نہیں کرتے جب اس حرام کا ارتکاب کیا جائے، جیسا کہ اگر کوئی کسی عورت سے پہلے وطی کرے اور پھر اس سے نکاح کر لے۔ اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی حرمت ساقط ہو چکی ہے پس اس نے ہتک کا ارتکاب ایسے محل میں کیا ہے جو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں حرام نہیں ہے، پس یہ اس کے قائم مقام ہو گیا کہ اگر کوئی عورت سے وطی کرنے کا قصد کرے جو اس کی طرف شب زفاف بھیجی گئی اور وہ اس کے بارے یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ وہ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 302　　2۔ ایضاً

کی بیوی نہیں ہے جب کہ وہی اس کی بیوی ہو۔ اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ اور پہلی تعلیل لازم نہ آئے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہمارے علم کے ساتھ تحریم کے مسئلہ میں برابر ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ہمارا علم اور اللہ تعالیٰ کا علم مختلف ہیں پس اس کا حکم اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہوگا(1)، جیسا کہ اس نے فرمایا: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''سو کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی ہے حلال (اور) پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس ارشاد کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ سارے کا سارا مال غنیمت لشکریوں کے لیے ہو اور وہ تمام کے تمام اس میں برابر شریک ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال:41) نے اس سے خمس نکالنے کے وجوب کو بیان کیا ہے اور اسے مذکورہ وجوہ کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس بارے میں مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

''اے نبی (کریم!) آپ فرمایئے ان قیدیوں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں اگر جان لی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کوئی خوبی تو عطا فرمائے گا تمہیں بہتر اس سے جو لیا گیا ہے تم سے اور بخشے گا تمہارے (قصور) اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کریں آپ سے دھوکہ بازی کا (تو حیرت کیوں ہو) انہوں نے تو دھوکہ کیا ہے اللہ سے پہلے ہی (اسی لیے) تو اللہ نے قابو دے دیا (تمہیں) ان پر اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب صرف آپ کو ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس آیت میں قیدیوں سے مراد عباس اور ان کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم اس (دین) کے ساتھ ایمان لائے جو آپ لے کر آئے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یقیناً ہم آپ کے لیے آپ کی قوم پر مخلص رہیں گے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے اس کا بطلان پہلے گزر چکا ہے۔

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اہل جاہلیت کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 883

فدیہ چار سو مقرر کیا۔ اور ابن اسحاق سے مروی ہے: قریش نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا۔ اور ہر قوم نے اپنے قیدیوں کا اتنا فدیہ دیا جس پر وہ راضی ہوئے۔ اور عباس نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ بلاشبہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے پس اگر ایسا ہوا جیسے تم کہتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزا عطا فرمائے گا اور جہاں تک تمہارے معاملے کا ظاہر ہے تو وہ ہم پر عیاں ہے پس تم اپنی ذات، اپنے بھتیجوں نوفل بن حارث بن عبد المطلب اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو جو کہ حارث بن فہر کے بیٹوں کا بھائی ہے کا فدیہ ادا کرو''۔ تو انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: فاین المال الذی دفنته أنت و أم الفضل فقلت لها إن أصبتُ فی سفری هذا فهذا المال لبنی الفضل و عبدالله وقثم (1) (وہ مال کہاں گیا جسے تو نے اور ام فضل نے دفن کیا اور تو نے اسے کہا اگر میں اپنے اس سفر میں کام آ جاؤں تو یہ مال میرے بیٹوں فضل، عبداللہ اور قثم کے لیے ہے) تو انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ انی لأعلم إنك رسول الله، إنّ هذا الشئ ما علمه غیری و غیر ام الفضل (یارسول اللہ! ﷺ بے شک میں یقیناً جان گیا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، بے شک یہ وہ شے ہے جس کا میرے اور ام فضل کے بغیر کسی کو علم نہیں) پس آپ میرے لیے حساب لگائیے یارسول اللہ! ﷺ جو مال تم نے مجھ سے لینا ہے مال میں سے بیس اوقیہ میرے پاس ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں (صرف) وہ شے جو اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ہمیں عطا فرمائی ہے''۔ (صرف وہی لینی ہے) پس اس نے اپنا، اپنے بھتیجوں اور اپنے حلیف کا فدیہ ادا کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی، الآیہ

ابن اسحاق نے کہا ہے: تمام قیدیوں میں سے زیادہ فدیہ عباس بن عبد المطلب کا تھا، کیونکہ وہ خوشحال آدمی تھے، پس انہوں نے سو اوقیہ سونا اپنا فدیہ دیا (2)۔ اور بخاری میں ہے: موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا ہے کہ ابن شہاب نے کہا، مجھے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ آپ ہمیں اجازت عطا فرمائیں کہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں قسم بخدا! تم ایک درہم بھی نہ چھوڑو'' (3)۔ اور نقاش وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ قیدیوں میں سے ہر ایک کا فدیہ چالیس اوقیہ تھا، سوائے عباس کے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''عباس پر فدیہ دوگنا کر دو'' اور آپ نے انہیں پابند کیا کہ وہ اپنے بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی دیں چنانچہ انہوں نے ان کی طرف سے اسی اوقیہ اور اپنی طرف سے اسی اوقیہ فدیہ ادا کیا اور جنگ کے وقت ان سے بیس اوقیہ لیے گئے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے اہل بدر کو کھانا کھلانے کا ذمہ اٹھایا تھا اور ان کی باری بدر کی جنگ کے دن تھی پس ان کے کھانا کھلانے سے پہلے ہی جنگ شروع ہو گئی اور ان کے پاس بیس باقی بچ گئے جو جنگ کے وقت ان سے لے لیے گئے۔ اور اس دن ان سے سو اوقیہ اور اسی اوقیہ لیے گئے۔ پس عباس نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: تحقیق تم نے مجھے اس حال میں کر چھوڑا ہے کہ جب تک میں

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ انفال، جلد 2، صفحہ 369-368　　2۔ ایضاً　　3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 428

زندہ رہوں ہاتھ پھیلا کر قریش سے مانگتا رہوں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: این الذهب الذی ترکته عند إمراتك أم الفضل؟ (وہ سونا کہاں گیا جو تو نے اپنی بیوی ام افضل کے پاس چھوڑا تھا) عباس نے کہا: کون سا سونا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انك قلت لها لا أدری ما یصیبنی فی وجهی هذا فإن حدث بی حدث فهو لك ولولدك (بے شک تو نے اسے کہا تھا میں اسے نہیں جانتا جو مجھے پیش آئے گا پس اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہے) تو عباس نے پوچھا: اے بھتیجے! تجھے اس کے بارے کس نے خبر دی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے''۔ تب عباس نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں اور مجھے آپ کے رسول اللہ ہونے کا کبھی یقین نہیں ہوا مگر آج اور تحقیق میں نے جان لیا ہے کہ آپ کو اس پر کسی نے مطلع نہیں کیا مگر اس نے جو پوشیدہ اور مخفی چیزوں کو جاننے والا ہے۔ أشهد ان لا إله الا الله وانك عبده ورسوله اور میں اس کے سواہر (معبود باطل) کا انکار کرتا ہوں۔ اور پھر انہوں نے اپنے بھتیجوں کو بھی حکم دیا تو وہ بھی اسلام لے آئے، پس ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی اور جس نے عباس کو قید کیا تھا وہ ابوالیسر کعب بن عمرو بنی سلمہ کے بھائی تھے اور وہ بالکل چھوٹے قد کے آدمی تھے اور عباس موٹے تازے طویل القامت تھے پس جب وہ انہیں لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: لقد اعانك علیه ملك (تحقیق اس پر فرشتے نے تیری مدد کی ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا اس میں خیر سے مراد اسلام ہے (یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں اسلام جان لیا) یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ تو وہ تمہیں اس فدیہ سے بہتر عطا فرمائے گا جو تم سے لیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دنیا میں عطا فرمائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بحرین کا مال آیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: بے شک میں نے اپنا فدیہ بھی دیا تھا اور عقیل کا فدیہ بھی دیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''لے لو'' پس انہوں نے اپنا کپڑا بچھایا اور اتنا مال لے لیا جتنا اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے۔ یہ مختصر کیا گیا ہے۔

اور غیر صحیح میں ہے: تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یہ اس سے بہتر ہے جو مجھ سے لیا گیا اور اس کے بعد میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرما دے (1)۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: آپ نے مجھے زمزم عطا کیا۔ اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس کے بدلے اہل مکہ کے تمام اموال میرے لیے ہوں۔ اور طبری نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ تک سند بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میرے بارے میں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی جس وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام کے بارے میں آگاہ کیا اور میں نے آپ سے عرض کی کہ آپ میرے ان بیس اوقیہ کے بارے میں جانچ پرکھ کریں جو فدیہ کی ادائیگی سے پہلے مجھ سے لے لیے گئے تو آپ نے انکار کر دیا۔ اور فرمایا: وہ فے ہے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے بدلے بیس غلام عطا فرما دیئے وہ سب کے سب میرے مال کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز　　2۔ ایضاً

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضرت زینب (بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوالعاص کے فدیہ کے لیے کچھ مال بھیجا اور اس میں انہوں نے اپنا وہ ہار بھی بھیجا جو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور ابوالعاص کے ساتھ شادی کے وقت انہوں نے وہ انہیں پہنایا تھا۔ آپ فرماتی ہیں: پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا تو آپ پر انتہائی رقت طاری ہوگئی۔ اور آپ نے فرمایا: ''اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کے لیے ان کے قیدی کو رہا کردو اور اس کا یہ ہار اسے واپس لوٹا دو''۔ تو انہوں نے عرض کی: ہاں (ہم ایسا ہی کرتے ہیں) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ زینب کو آپ کے پاس بھیج دے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور انصار میں سے ایک آدمی کو بھیجا اور فرمایا: ''تم دونوں بطن یا جج میں جا کر رکو یہاں تک کہ زینب تمہارے پاس سے گزرے پس تم دونوں اس کے ساتھ ہو جانا یہاں تک کہ تم اسے لے آؤ''۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: یہ غزوۂ بدر کے ایک مہینہ بعد کا واقعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ابوالعاص مکہ میں آیا تو اس نے مجھے کہا: تو تیاری کر اور اپنے باپ کے پاس چلی جا۔ پس میں نکلی تیاری کرنے لگی تو مجھے ہند بنت عقبہ ملی اور اس نے کہا: اے محمد کی بیٹی! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو اپنے باپ کے پاس جانے کا ارادہ رکھتی ہے؟ تو میں نے اسے کہا: میں نے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ تو اس نے کہا: اے چچا کی بیٹی! تو ایسا نہ کر، بے شک میں خوشحال عورت ہوں اور میرے پاس تیری حاجت اور ضرورت کا سامان ہے۔ پس اگر تو سامان کا ارادہ کرے تو میں تجھے وہ بیچ دوں یا نفقہ کے لیے قرض چاہیے تو میں تجھے قرض دے دیتی ہوں، کیونکہ وہ کچھ عورتوں کے درمیان نہیں ہوتا جو مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں: قسم بخدا! میں اسے دیکھ رہی تھی کہ اس نے یہ بہتان تراشی کے لیے کہا ہے۔ پس میں اس سے ڈر گئی اور میں نے اس سے اسے چھپائے رکھا اور میں نے کہا: میں اس کا ارادہ نہیں رکھتی۔ بس جب زینب اپنی تیاری سے فارغ ہوگئیں تو آپ وہاں سے چل پڑیں اور ان کے ساتھ ان کا دیور اونٹ کی مہار پکڑ کر (قائد) کنانہ بن ربیع بھی نکلا اور یہ دن کے وقت گھر سے نکلے تھے۔ اور اس بارے میں اہل مکہ نے بھی سن لیا، چنانچہ ان کی تلاش میں ہبار بن اسود اور نافع بن عبدالقیس الفہری نکلے اور سب سے پہلے جو آپ کی طرف آگے بڑھا وہ ہبار تھا اس نے نیزے کے ساتھ آپ کو خوفزدہ کیا اور دھمکایا درآنحالیکہ آپ ہودج میں تھیں۔ کنانہ نے اونٹ بٹھایا اور اپنے تیر پھیلا دیئے، پھر اپنی قوس پکڑی اور کہا: قسم بخدا! جو آدمی بھی میرے قریب آئے گا میں اسے تیر ماروں گا۔ اشراف قریش میں سے ابوسفیان آیا اور اس نے کہا: اے فلاں! اپنا تیر ہم سے روک لے یہاں تک کہ ہم تیرے ساتھ گفتگو کرلیں۔ پس ابوسفیان اس کے پاس آیا اور کہا: بے شک تو نے کچھ نہیں کیا، تو لوگوں کے سامنے ایک عورت کے ساتھ نکلا ہے، حالانکہ تو ہماری اس مصیبت کو جانتا ہے جو بدر کے مقام پر ہمیں پہنچی پس عرب یہ گمان کرتے ہیں اور ہم یہ گفتگو کرتے ہیں کہ یہ ہماری طرف سے کمزوری اور ضعف ہے کہ تو ہمارے درمیان سے لوگوں کے سامنے ان کی بیٹی کو ساتھ لے کر ان کی طرف نکلے۔ تو اس عورت کو ساتھ لے کر واپس لوٹ جا اور چند دن یہیں قیام کرو، پھر رات کے وقت آہستہ سے اسے ساتھ لے کر چلے جاؤ اور اسے اس کے باپ کے پاس پہنچا دو۔ پس

مجھے اپنی عمر کی قسم! ہمیں اسے اپنے باپ سے روکنے کی کوئی حاجت نہیں اور ہمارے لیے اب اس بارے میں تکلیف کے وہ جذبات بھڑکے ہوئے ہیں جو ہمیں پہنچی ہے۔ پس اس نے ایسا کرلیا، پس جب دو دن یا تین دن اس طرح گزر گئے تو وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ پس میں چلتی رہی یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس پہنچ گئی۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب ہبار بن ام درہم نے انہیں خوفزدہ کیا تو جو خوف اور ڈر آپ کو لاحق ہوا اس کی وجہ سے وہ حمل ساقط ہو گیا جو آپ کے پیٹ میں تھا۔

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرکین میں سے جب لوگوں کو قیدی بنایا گیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسلام لانے کی گفتگو کی اور اس بارے میں وہ پرعزم نہ تھے اور نہ ہی اس بارے انہوں نے اعتراف یقینی کیا۔ اور شبہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے قریب ہونے کا ارادہ کیا اور وہ مشرکین سے دور نہ ہوئے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر کوئی کافر دل اور زبان سے ایمان کے بارے کلام کرے اور اس میں اسے عزیمت حاصل نہ ہو تو وہ مومن نہیں۔ اور جب اس کی مثل صورت مومن سے پائی جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، مگر یہ کہ وہ ایسا وسوسہ ہو جس کو روکنے پر وہ قادر نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہے اور اسے ساقط کر دیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور فرمایا ہے: وَ اِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ یعنی اگر ان کی طرف سے یہ قول بطور خیانت اور مکر ہے۔ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ تحقیق انہوں نے اس سے قبل اپنے کفر کے ساتھ اور آپ کے ساتھ اپنے مکر اور آپ کے ساتھ قتال کر کے اللہ تعالیٰ سے خیانت کی ہے۔ اور اگر ان کی طرف سے یہ قول خیر ہے اور اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے تو وہ ان سے اسے قبول کر لے گا اور انہیں اس سے بہتر عوض عطا فرمائے گا جو ان سے نکلا ہے اور ان کے سابقہ گناہ، ان کا کفر، ان کی خیانت اور ان کا مکر سبھی بخش دے گا (1)۔ اور خیانۃ کی جمع خیائن ہے۔ اور واجب تھا کہ یہ کہا جاتا: خوائن کیونکہ یہ واوی الفاظ میں سے ہے، مگر انہوں نے اس کے اور خائنۃ کی جمع کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: خائن و خوان و خونۃ و خانۃ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 885

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۵﴾

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور وہ جنہوں نے پناہ دی (مہاجرین کو) اور (ان کی) مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی نہیں تمہارے لیے ان کی وراثت سے کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملہ میں تو فرض ہے تم پر ان کی امداد مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح) کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، اگر تم (ان حکموں پر) عمل نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور (پھیل جائے گا) بڑا فساد۔ اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اور جنہوں نے پناہ دی اور ان کی امداد کی وہی (خوش نصیب) لوگ سچے ایمان دار ہیں انہیں کے لیے بخشش ہے اور باعزت روزی۔ اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہیں میں سے ہیں اور رشتہ دار (ورثہ میں) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں حکم الٰہی کے مطابق یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سورت کا اختتام موالاۃ کے ذکر کے ساتھ کیا تاکہ ہر فریق اپنے اس دوست اور ولی کو جان لے جس سے وہ مدد طلب کر سکتا ہے۔ ہجرت اور جہاد کا لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا یہ اس پر معطوف ہے۔ اور مراد وہ انصار ہیں جو ان سے پہلے ایمان کے ساتھ اپنے گھروں میں اقامت گزیں تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین ان سے آملے۔ اولئک یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ بَعْضُهُمْ یہ دوسرا مبتدا ہے۔ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یہ اس کی خبر ہے اور پھر سب مل کر ان کی خبر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اولیاء بعض، فی المیراث (یعنی وہ میراث میں ایک دوسرے کے ولی ہیں) پس وہ ہجرت کے سبب ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے۔ اور وہ آدمی جو ایمان تو لایا لیکن اس نے ہجرت نہ کی تو وہ اس کا وارث نہ بن سکتا جس نے ہجرت کی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول وَاُولُوا الْاَرْحَامِ، الآیہ کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اسے ابو داؤد نے بیان کیا ہے۔

اور میراث مومنین میں سے ذوی الارحام کے لیے ہوگی۔ اور دو دین رکھنے والے باہم کسی شے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد سامنے آیا: ''فرائض (حصص) کو ان کے اہل کے ساتھ ملحق کر دو''(1)۔ اس کا بیان پہلے آیۃ المواریث میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں نسخ نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی ہے وہ نصرت اور مدد کرنے میں ایک

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 997

دوسرے کے دوست ہیں، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ مبتدا اور خبر ہے۔ مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ یحییٰ بن وثاب، اعمش اور حمزہ نے واو کے کسرہ کے ساتھ مِّنْ وِّلَايَتِهِمْ پڑھا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ولیتُ الشئ (میں شے کا والی بنا) سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: ولی بین الولایۃ جس کی دوستی واضح ہو وہ ولی کہلاتا ہے اور وال بین الولایۃ (اور جس کی امارت بین ہو وہ والی کہلاتا ہے) اس مقام پر فتحہ یعنی ولایۃ زیادہ واضح اور احسن ہے، کیونکہ یہ نصرت اور نسب کے معنی میں ہے۔ اور کبھی وَلایۃ اور وِلایۃ دونوں کا اطلاق امارت پر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ مراد یہ ہے کہ وہ مومنین جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگر وہ تمہیں دار الحرب سے اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لیے افرادی یا مالی امداد کے لیے پکاریں تو تم ان کی امداد کرو اور یہ تم پر فرض ہے پس تم انہیں ذلیل و رسوا نہ کرو، مگر یہ کہ اگر وہ تم سے ایسی کافر قوم کے خلاف مدد طلب کریں جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہو تو پھر ان کے خلاف تم مدد نہ کرو اور اپنا عہد نہ توڑو یہاں تک کہ اس کی مدت مکمل ہو جائے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ انتہائی کمزور اور ضعیف ہوں تو پھر ان کے ساتھ دوستی اور موالات قائم رہے گی اور ان کی مدد و نصرت واجب ہوگی، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک جھپکنے والی آنکھ بھی باقی رہے گی یہاں تک کہ وہ انہیں بچانے کے لیے ضرور نکلے گی، اگر ہماری تعداد اسے برداشت کر سکتی ہو یا پھر انہیں وہاں سے نکالنے کے لیے ہم اپنے سارے مال خرچ کر دیں گے یہاں تک کہ کسی کے پاس ایک درہم بھی باقی نہ رہے۔ اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمیع علماء نے کہا ہے: لیکن اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، اس پر جس نے مخلوق کے لیے اپنے بھائیوں کو دشمن کی قید میں چھوڑے رکھنے کو حلال قرار دیا ہے اس کے باوجود کہ ان کے قبضے میں اموال کے خزانے بھی ہوں اور وافر احوال وقدرت، تعداد اور قوت و طاقت بھی میسر ہو۔ زجاج نے کہا ہے: اغراء کی بنا پر فعلیکم النصر نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے کفار اور مومنین کے درمیان موالات کو ختم کر دیا ہے۔ اور مومنین کو آپس میں ایک دوسرے کا دوست اور کفار کو آپس میں ایک دوسرے کا حمایتی قرار دیا ہے، وہ اپنے دین کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنے اعتقاد کے مطابق باہم معاملات کرتے ہیں۔ ہمارے علماء نے ایسی کافرہ عورت کے بارے میں کہا ہے جس کا بھائی مسلمان ہو کہ وہ اس کی شادی نہیں کر سکتا، کیونکہ ان دونوں کے درمیان ولایت موجود نہیں، اور اس عورت کی مثل دین رکھنے والا اس کی شادی کر سکتا ہے۔ بس جس طرح مسلمان عورت کی شادی مسلمان ہی کر سکتا ہے، اسی طرح کافرہ کی شادی بھی وہ کافر ہی کر سکتا ہے جو اس کا قریبی ہو یا اس کا بشپ ہو، اگرچہ وہ کسی مسلمان سے ہو، مگر یہ کہ وہ عورت آزاد ہو، پس اگر اس کا عقد غیر آزاد پر کیا گیا تو وہ فسخ کر دیا جائے گا اگر وہ کسی مسلمان کا ہو اور نصرانی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ اور اصبغ نے کہا ہے: وہ عقد فسخ نہیں کیا جائے گا، (کیونکہ) مسلمان کا عقد تو اولیٰ اور افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا تَفْعَلُوْهُ اس میں ضمیر موارثت اور اس کے التزام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کا معنی یہ

ہے: مگر تم انہیں چھوڑ دو وہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے جیسے وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ ضمیر تناصر (ایک دوسرے کی مدد کرنا) موازرۃ (اظہار ہمدردی اور غم خواری کرنا) معاونۃ اور اتصال الایدی (ہاتھ ملانا) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ اگر نہ کیا گیا تو قریب ہے اس سے فتنہ واقع ہو جائے اور یہ پہلے سے زیادہ مؤکد ہے۔

ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز سے انہوں نے عبید کے دو بیٹوں محمد اور سعد سے اور انہوں نے ابوحاتم مزنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے پاس وہ آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو تم اس کا نکاح کر دو اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ کفو اور مال کے اعتبار سے کچھ کمی بھی ہو؟ تو آپ نے فرمایا: إذا جاء کم من ترضون دینہ و خلقہ فأنکحوہ (1) آپ نے یہ تین بار فرمایا: ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر اس عہد میثاق کی حفاظت کی طرف لوٹ رہی ہے جسے یہ ارشاد متضمن ہے: اِلَّا عَلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ اور یہ اگر نہ کیا جائے تو یہ بذات خود ایک فتنہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دین کے بارے میں مسلمانوں کی مدد کرنے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہی دوسرے قول کا معنی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کو دین میں اپنی ولایت کا اہل قرار دیا ہے ان کے سوا کسی کو نہیں۔ اور کافروں کو ایک دوسرے کا حمایتی قرار دیا ہے۔ پھر فرمایا ہے: اِلَّا تَفْعَلُوْهُ اور وہ یہ ہے کہ مومن کافر کا ولی ہے نہ کہ مومنین کا۔ تَكُنْ فِتْنَةٌ یعنی جنگ کی مشقت آپڑے گی اور وہ جو اس کے ساتھ جاری ہوتی ہے مثلاً حملے، جلاوطنی اور قید وغیرہ۔ اور فساد کبیر سے مراد شرک کا ظاہر ہونا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ تَكُنْ فِتْنَةٌ میں نصب بھی جائز ہے اور معنی یہ ہوگا تکن فِعلتُکم فتنة و فسادا کبیرا (تمہارا ایسا کرنا فتنہ اور فساد کبیر کا باعث بن جائے گا) حقا یہ مصدر ہے، یعنی انہوں نے ہجرت اور نصرت کے ساتھ اپنے ایمان کو پختہ اور ثابت کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی اس بشارت کے ساتھ تصدیق کر دی ہے کہ فرمایا: مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ یعنی ان کے لیے جنت میں بہت بڑا ثواب ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا مراد وہ لوگ ہیں جو حدیبیہ اور بیعت رضوان کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی۔ اور وہ یہ کہ اس کے بعد ہجرت پہلی ہجرت سے رتبہ میں کم تھی۔ اور دوسری ہجرت وہ ہے جس میں صلح واقع ہوئی اور دو سال تک جنگ نے اپنے ہتھیار ڈالے رکھے پھر مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں''۔ تو یہ واضح ہو گیا کہ جو اس کے بعد ایمان لایا اور ہجرت کی تو وہ ان کے ساتھ مل جائے گا۔ اور منکم کا معنی ہے نصرت وموالات میں تمہاری مثل ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ یہ مبتدا ہے۔ اُولوا کی واحد ذو ہے اور الرحم مونث ہے، اس کی جمع

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 128۔ ایضاً، حدیث نمبر 1005-1004، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارحام ہے۔ اور یہاں اس سے مراد عصبات ہیں نہ کہ وہ جو رحم سے پیدا ہوا ہو۔ اور وہ جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ رحم سے مراد عصبات ہیں وہ عربوں کا یہ قول ہے: وصلتك رحم (عصبہ نے تجھے ملا دیا، جوڑ دیا) وہ اس سے ماں کی قرابت مراد نہیں لیتے۔ قتیلہ بنت حارث جو کہ نضر بن حارث کی بہن ہے نے کہا، اسی طرح ابن ہشام نے کہا ہے: سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ وہ نضر کی بیٹی ہے اس کی بہن نہیں، ''کتاب الدلائل'' میں اسی طرح ہے۔ وہ اپنے باپ کا مرثیہ کہتی ہے جس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بند کر کے وادی صفراء میں قتل کیا:

يا راكباً إن الأثيل مظِنةٌ   من صُبح خامسةٍ وأنت مُوَفَّقُ

اے سوار! مقام اثیل کے متعلق مجھے پانچویں روز کی صبح سے بدگمانی ہے اور تو بڑے ٹھیک وقت پر آیا ہے (جب تیری ضرورت تھی)

أبلِغ بها مَيْتًا بأن تحية   ما إن تزال بها النجائب تخفِقُ

وہاں کی ایک میت کو پیغام پہنچا دینا کہ اسے سلام ہو جب تک شریف اونٹنیاں وہاں تیزی سے آتی جاتی رہیں۔

منّي إليك و عبرةٌ مسفوحةٌ   جادت بواكِفها و أخرى تخنقُ

میری طرف سے تیرے لیے وہ بہائے گئے آنسو ہیں جو اپنے محل سے کثرت سے بہہ رہے ہیں اور وہ رونے میں پھندا لگائے ہوئے ہیں۔

هل يسمعَنّ النضر إن ناديتُه   أم كيف يسمع ميّت لاينطق

اگر میں پکاروں تو کیا نضر میری پکار سنے گا یا وہ مردہ کیسے سن سکتا ہے جو بول نہیں سکتا۔

أمحمدٌ يا خيرَ ضِنءِ كريمةٍ   في قومها والفحلُ فحلٌ مُعرِق

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اے اپنی قوم کی شریف عورت کی بہترین اولاد! اور شریف تو وہی ہوتا ہے جو نسلاً شریف ہو۔

ما كان ضرّك لو مننتَ وربما   منّ الفتى وهو المغيظ المُحْنَق

اگر آپ احسان کرتے (اور اسے چھوڑ دیتے) تو آپ کا کیا نقصان ہوتا اور ایسا کم ہوا ہے کہ نوجوان ایسی حالت میں احسان کرے جب کہ وہ غصہ سے بھرا کینہ ور ہو۔

لوكنتَ قابِلَ فدية لفديتُه   ياعزَّ ما يُفْدى به ما يُنفِق

اگر آپ فدیہ قبول کر لیتے تو میں اس کا فدیہ اس معزز (اور قیمتی) شے کے ساتھ ادا کرتی جس کے ساتھ فدیہ دیا جا سکتا ہے اور جو خرچ ہو سکتی ہے۔

فالنضْر أقربُ مَن أسَرْتَ قرابةً   وأحقُّهم إن كان عِتْق يُعْتَق

کیونکہ نضر ان تمام لوگوں میں زیادہ قریبی رشتہ دار ہے جن کو آپ نے اسیر کیا اور ان سب سے زیادہ اس بات کا حق دار ہے کہ اگر آزادی ممکن ہو تو آزاد کر دیا جائے۔

ظلّت سیوفُ بنی أبیه تَنوشُه لله أرحام هناك تُشقَّق

اس کے بھائیوں کی تلواریں اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہیں۔ ہائے خدایا وہاں قرابتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہے۔

صَبْرًا یُقاد إلى المنیّة مُتْعَبا رَسْفَ المُقیَّد وهو عانٍ مُوثَق

اسے موت کی جانب اس حالت میں کھینچا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں، تھکا ماندہ ہے، بیڑیوں میں بمشکل پاؤں اٹھا رہا ہے اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ سلف اور ان کے بعد آنے والوں نے ذوی الارحام کو وارث بنانے میں اختلاف کیا ہے۔ اور ذوی الارحام وہ ہیں جن کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ مقرر نہیں۔ اور یہ میت کے رشتہ دار تو ہیں لیکن عصبہ نہیں ہیں، جیسے بیٹیوں کی اولاد، بہنوں کی اولاد، بھائی کی بیٹیاں، پھوپھی اور خالہ اور چچا جو باپ کا ماں کی طرف سے بھائی ہو، نانا، نانی اور جوان کے قریبی ہیں۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: ذوی الارحام میں سے جس کا کوئی حصہ نہیں وہ وارث نہیں بن سکتا۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے۔ اور حضرت مکحول اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور جنہوں نے انہیں وارث بنائے جانے کا قول کیا ہے وہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود، حضرت معاذ، حضرت ابو درداء اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور یہی اہل کوفہ، امام احمد، اسحاق کا قول ہے۔ اور انہوں نے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: ذوی الارحام میں دو سبب جمع ہیں ایک قرابت اور دوسرا اسلام۔ پس وہ وراثت کا اس سے زیادہ حق دار ہے جس میں صرف ایک سبب پایا جاتا ہے اور وہ سبب اسلام ہے۔ پہلے فریق نے جواب دیتے ہوئے کہا ہے: یہ آیت مجمل اور جامع ہے۔ اور ظاہراً یہ ہر رشتہ دار کو شامل ہے چاہے وہ قریبی ہو یا بعیدی اور آیات مواریث مفسر ہیں اور مفسر مجمل پر راجح ہوتا ہے اور اس کی وضاحت اور بیان ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولاء کو سبب ثابت قرار دیا ہے اور اس میں مولیٰ کو قائم مقام عصبہ کے رکھا ہے اور ارشاد فرمایا: الولاء لمن أعتق (1) (ولاء اس کے لیے ہے جس نے آزاد کیا) اور ولاء کو بیچنے اور اسے ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور دوسروں نے اس سے استدلال کیا ہے جیسے ابو داؤد اور دار قطنی نے حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی بوجھ (یعنی قرض وغیرہ) چھوڑا تو وہ میرے سپرد ہے''۔ اور بسا اوقات یوں فرمایا ''پس وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے ہیں۔ اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے پس میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں میں ان کی طرف سے دیت اور تاوان ادا کروں گا اور میں ہی اس کا وارث ہوں گا اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا اور کوئی وارث نہ ہو اور اس کی طرف سے تاوان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 48

اور دیت ادا کرے گا اور اس کا وارث بنے گا'' (1)۔ اور دار قطنی نے حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کا مولی ہے جس کا کوئی مولیٰ نہیں اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہیں''۔ یہ روایت موقوف ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ماموں وارث ہے''۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نہیں جانتا یہاں تک کہ جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئیں''۔ پھر فرمایا: ''پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے پوچھنے والا سائل کہاں ہے''؟ راوی کا بیان ہے: پس وہ آدمی حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل امین نے مجھے ابھی پیغام پہنچایا ہے کہ ان دونوں کے لیے کوئی شے نہیں''۔ دار قطنی نے کہا ہے: اسے مسعدہ کے بغیر محمد بن عمرو سے کسی نے مسند ذکر نہیں کیا اور یہ ضعیف ہے۔ اور درست یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ زیاد بن ابی سفیان نے اپنے ہمنشین کو کہا: کیا تو جانتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھوپھی اور خالہ کے بارے میں کیسے فیصلہ کیا؟ تو انہوں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: بے شک میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے زیادہ جانتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے بارے میں کیسے فیصلہ کیا؟ آپ نے خالہ کو قائم مقام ماں کے اور پھوپھی کو قائم مقام باپ کے رکھا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 46-45

ایضاً، حدیث نمبر 2512، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب ذوی الارحام، حدیث نمبر 2727، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سورۂ براءۃ

آیاتہا ۱۲۹ ۹ سورۃ التوبۃ مدنیۃ ۱۱۳ رکوعاتہا ۱۶

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

''یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا مشرکوں میں سے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ پہلا مسئلہ اس کے اسماء کے بارے میں ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورت براءت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ فاضحہ (برائیاں ظاہر کرنے والی ہے) (حکم) مسلسل نازل ہوتا رہا کچھ ان کے بارے اور کچھ ان کے بارے، یہاں تک کہ ہم ڈرنے لگے کہ یہ کسی ایک کو نہیں چھوڑے گی (1)۔ ابونصر عبدالرحیم قشیری نے کہا: یہ سورت غزوہ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے بعد نازل ہوئی، اور اس کی ابتدا میں کفار کا ان کے ساتھ معاہدوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ اور اس سورت میں منافقین کے مخفی اور پوشیدہ رازوں کو کھولا گیا ہے۔ اور اس کا نام الفاضحہ اور البحوثہ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ منافقین کے رازوں کے بارے بحث کرتی ہے۔ اور اس کا نام مبعثرہ اور بعثرہ بھی ہے اور اس کا معنی بھی البحث ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے اس سورت کے اوّل سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ساقط ہونے کے سبب میں اختلاف کیا ہے اس بارے میں پانچ اقوال ہیں۔ (۱) یہ کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کے درمیان اور کسی دوسری قوم کے درمیان معاہدہ ہوتا تو جب وہ اسے توڑنے کا ارادہ کرتے تو ان کی طرف ایک تحریر لکھتے اور اس میں بسم اللہ نہ لکھتے تھے۔ پس جب اس معاہدہ کو توڑنے کے بارے میں سورت براءت نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس کے ساتھ بھیجا اور آپ نے حج کے دنوں میں یہ سورت ان پر جا کر پڑھی اور اس میں بِسْمِ اللّٰهِ نہ پڑھی گئی اس بنا پر کہ عہد توڑنے کی صورت میں بسم اللہ ترک کرنا ان کی عادت جاریہ تھی۔

اور دوسرا قول یہ ہے: امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن المثنی نے یحییٰ بن سعید سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عوف نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں یزید الرقاشی نے بیان کیا ہے انہوں

1۔ تفسیر ابن عباس، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 449

نے کہا ہمیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: تمہیں کس شے نے اس طرف برانگیختہ کیا کہ تم نے ''الانفال'' کا اور یہ مثانی میں سے ہے۔ اور براءت کا قصد کیا ہے اور یہ مئین میں سے ہے اور تم نے ان دونوں کو ملا دیا ہے اور تم نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کی سطر نہیں لکھی اور تم نے اسے سات طویل سورتوں میں رکھا ہے۔ پس تمہیں کس شے نے اس پر ابھارا ہے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی شے (آیت) نازل ہوتی تو آپ اپنے پاس کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے: ''اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں جگہ پر رکھو (یعنی لکھ دو)'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیات نازل ہوتیں تو آپ فرماتے: ''ان آیات کو اس سورت میں لکھ دو جس میں اس طرح کا ذکر کیا جاتا ہے'' (1)۔

اور ''انفال'' پہلے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اور ''براءت'' آخر قرآن میں سے ہے اور اس کا قصہ اس کے قصہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا اور ابھی آپ نے ہمارے لیے یہ وضاحت نہ کی تھی کہ یہ اس میں سے ہے تو میں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ (براءت) اس (الانفال) میں سے ہے۔ پس اسی وجہ سے ان دونوں کو ملا دیا گیا ہے اور ان کے درمیان بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کی سطر نہیں لکھی گئی۔ اسے ابوعیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے: اور یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں کہا ہے جسے ابن وہب، ابن قاسم اور ابن عبدالحکم نے روایت کیا ہے کہ جب اس کا اوّل حصہ ساقط ہوا تو اس کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ بھی ساقط ہو گئی۔ اور اسے ابن عجلان سے روایت کیا گیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ سورۃ براءۃ، سورۂ بقرہ کے برابر تھی یا اس کے قریب تھی۔ پس اس میں سے کچھ حصہ ختم ہو گیا، پس اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (2) نہیں لکھی گئی۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: یہ سورۂ بقرہ کی مثل تھی۔

اور چوتھا قول ہے: یہ خارجہ اور ابوعصمہ وغیر ہما نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: جب انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصحف لکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں اختلاف ہوا، ان میں سے بعض نے کہا: سورۂ براءت اور الانفال ایک سورت ہے۔ اور بعض نے کہا: یہ دو سورتیں ہیں۔ پس ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا گیا ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا کہ یہ دو سورتیں ہیں۔ اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ چھوڑ دی گئی ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا: یہ دونوں ایک سورت ہے۔ پس دونوں فریق ایک ساتھ راضی ہو گئے اور دونوں کی حجت مصحف میں ثابت ہو گئی۔

اور پانچواں قول یہ ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: سورت براءت میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ امان ہے۔ اور سورت براءت تلوار کے ساتھ نازل ہوئی اس میں امان نہیں ہے۔ اور مبرد سے اس کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ ایضاً، حدیث نمبر 3011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، باب من جهر بها، حدیث نمبر 668، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 891

انہوں نے کہا: اسی لیے ان دونوں کو جمع نہیں کیا گیا کیونکہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ رحمت ہے اور سورت براءت ناراضگی کے ساتھ نازل ہوئی۔ اور اس کی مثل سفیان سے بھی مروی ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: اس سورت کی ابتداء میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نہیں لکھی گئی کیونکہ تسمیہ رحمت ہے اور رحمت امان ہے اور یہ سورت منافقین کے بارے میں اور تلوار کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اور منافقین کے لیے امان نہیں ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کے شروع میں تسمیہ نہیں لکھا گیا، کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سورت میں تسمیہ کے ساتھ نازل ہی نہیں ہوئے۔ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ نے ہمارے لیے یہ بیان نہیں فرمایا کہ یہ اس میں سے ہے، یہ اس پر دلیل ہے کہ تمام سورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپ کے بیان کے ساتھ مرتب ہوئیں اور یہ کہ اکیلے براءت کو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سورۂ انفال کے ساتھ ملایا گیا۔ اس لیے کہ اس بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے سے پہلے ہی موت آپ کو جلدی آ گئی۔ اور ان دونوں کو قرینتین پکارا جاتا ہے، پس واجب ہے کہ ان دونوں کو جمع کیا جائے اور ان میں سے ایک کو دوسری کے ساتھ ملایا جائے، اس وصف اقتران کی وجہ سے جو ان دونوں کو لازم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باحیات تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس دین میں اصل (اور حجت) ہے، کیا آپ حضرت عثمان اور مقتدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف دیکھ نہیں رہے کہ انہوں نے نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس الشبہ کی طرف کیسے پناہ لی اور انہوں نے دیکھا کہ ''براءت'' کا قصہ ''الانفال'' کے قصہ کے مشابہ ہے پس انہوں نے اسے اس کے ساتھ ملا دیا؟ تو جب اللہ تعالیٰ نے تالیف قرآن میں دخول قیاس کو بیان کر دیا ہے تو دیگر تمام احکام میں تیرا کیا خیال ہے (یعنی قیاس حجت شرعیہ تسلیم کیا جائے گا)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: بَرَآءَةٌ آپ کہتے ہیں: برئت من الشی ابرأ براءۃ فأنا منه بری جب تو اپنی ذات سے کسی شے کو زائل کر دے اور تیرے اور اس کے درمیان جو سبب ہے اسے قطع کر دے۔ اور بَرَآءَةٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے هذه براءة اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسے مبتدا ہونے کے سبب رفع دیا جائے اور مخبر قول باری تعالیٰ الی الذین میں ہو۔ اور نکرہ کو مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ یہ نکرہ موصوفہ ہے اور یہ من وجہ معرفہ ہو چکا ہے لہٰذا اسے اخبار عنہ بنانا جائز ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے براءة نصب کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے التزموا براءة پس اس میں اغراء کا معنی پایا گیا۔ اور یہ فعالۃ کے وزن پر مصدر ہے، جیسا کہ شناءة اور دناءة مصدر ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ یعنی ان لوگوں کے ساتھ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا تھا، کیونکہ آپ عقد کرنے کے والی اور مختار تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام اس کے ساتھ راضی تھے، تو گویا انہوں نے باہمی عقد اور معاہدہ کیا پس یہ عقد ان کی طرف منسوب ہوا۔ اور اسی طرح کفار کے ائمہ اپنی قوم کی طرف سے جو معاہدہ کریں گے وہ ان کی طرف منسوب ہوگا وہ تمام کو شامل ہوگا اور اس کے ساتھ ان کا مواخذہ کیا جائے گا، جب کہ اس کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

سوا کچھ ممکن نہیں، کیونکہ تمام سے رضامندی حاصل کرنا متعذر رہے (1)، پس جب امام وقت کسی ایسے امر کے بارے معاہدہ کر لے جس میں وہ مصلحت دیکھتا ہے تو وہ تمام رعایا پر لازم ہو جائے گا (اور اس کی پابندی تمام پر لازم ہوگی)

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ۝

"(اے مشرکو!) پس چل پھر لو ملک میں چار ماہ اور جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **فَسِيحُوا** یہ خبر سے خطاب کی طرف رجوع ہے، ای قل لهم سيحوا تم ان مشرکوں سے کہہ دو تم زمین میں چل پھر لو درآنحالیکہ تم آتے جاتے رہو، محفوظ و مامون ہو تمہیں مسلمانوں میں سے کسی سے جنگ، مال چھیننے، قتل کرنے اور قید کرنے کا کوئی خوف نہیں۔ کہا جاتا ہے: ساح فلان فی الأرض يسيح سياحة و سيوحا و سيحانا (فلاں نے زمین میں سیر کی) اور اسی سے السيح فی الماء الجاری المنبسط (پھیلے ہوئے جاری پانی میں تیرنا) ہے۔ اور اس معنی میں طرفہ بن عبد کا قول ہے:

لو خفتُ هذا منك ما نِلْتَنِي حتى ترى خيلا أمامي تَسِيحُ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے تاجیل اور مہلت کی کیفیت میں اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں (اختلاف کیا ہے) جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع تعلق کا اعلان کیا ہے۔ پس محمد بن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے: یہ مشرکین کی دو قسمیں ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جن کے معاہدہ کی مدت چار ماہ سے کم تھی پس انہیں چار ماہ مکمل کرنے کی مہلت دی گئی اور دوسری وہ ہے جن کے معاہدہ کی کوئی معین اور محدود مدت نہ تھی پس اسے چار ماہ میں محصور کر دیا تا کہ وہ اپنے آپ کو پابند کر لیں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے اعلان جنگ ہے، جہاں کوئی پایا گیا وہیں قتل کر دیا جائے گا اور قیدی بنا لیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔ اور اس مدت کی ابتداء حج اکبر کے دن سے ہے اور اس کا اختتام دس ربیع الاخر کو ہوگا۔ اور رہے وہ جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تو ان کی مدت چار اشہر حرام کے گزرنے تک ہے۔ اور وہ پچاس دن ہیں: بیس ذوالحجہ اور محرم میں سے ہیں۔

اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ چار مہینے ان کے لیے تھے جن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ چار ماہ سے کم تھا اور جن کا معاہدہ چار مہینوں سے زیادہ تھا تو وہ وہ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: **فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ** (توبہ: 4) کے ساتھ حکم فرمایا کہ ان کا عہد مکمل کیا جائے۔ اور یہی موقف علامہ طبری وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

محمد بن اسحاق اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال قریش کے ساتھ صلح کی، اس شرط پر کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، اس عرصہ میں لوگ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

پرامن رہیں گے۔ اور ایک دوسرے پر (حملہ وغیرہ کرنے) سے باز رہیں گے۔ پس بنو خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاہدہ میں داخل ہو کر آپ کے حلیف ہو گئے اور بنو بکر قریش کے عہد میں داخل ہو کر ان کے حلیف بن گئے، پھر بنو بکر نے خزاعہ پر زیادتی کی اور انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔ اور اس کا سبب وہ دم تھا جو بنی بکر کا اسلام سے کچھ مدت پہلے خزاعہ پر لازم ہوا تھا (یعنی خزاعہ نے ان کا آدمی قتل کیا تھا اور اس کا بدلہ ابھی باقی تھا) پس جب حدیبیہ کے مقام پر صلح واقع ہو گئی، تو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پرامن ہو گئے، تو بنو بکر میں سے بنو دیل نے اسے غنیمت جانا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا دم واجب تھا۔

یعنی انہوں نے اس فرصت اور خزاعہ کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بنی اسود بن رزن کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور یہی وہ ہیں جنہیں خزاعہ نے قتل کیا تھا، پس نوفل بن معاویہ الدیلی ان لوگوں کے ہمراہ نکلا جنہوں نے بنی بکر بن عبد منات میں سے ان کی اتباع و پیروی کی (اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوئے) یہاں تک کہ انہوں نے رات کے وقت خزاعہ پر حملہ کر دیا اور وہ قتل ہو گئے اور قریش نے ہتھیاروں کے ساتھ بنی بکر کی معاونت کی اور قریش کی ایک جماعت نے تو بنفس نفیس ان کی مدد کی، پس خزاعہ نے شکست خوردہ حالت میں حرم میں پناہ لی جیسا کہ یہ مشہور واقعہ لکھا ہوا ہے۔ پس یہ اس صلح کو توڑنا ہے جو حدیبیہ میں واقع ہوئی تھی، چنانچہ عمرو بن سالم، بدیل بن ورقاء الخزاعی اور بنی خزاعہ کی ایک جماعت یہ سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد طلب کرنے کے لیے اس معاملہ میں جو انہیں بنو بکر اور قریش کی طرف سے پیش آیا۔ اور عمرو بن سالم نے اسے شعر کی صورت میں اس طرح کہا:

يا ربِّ إنّي ناشدٌ محمدا ۔۔۔ حِلْفَ أبينا وأبيه الأتْلَدا

اے میرے رب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اور ان عظیم آباء واجداد کے درمیان قائم معاہدہ کو یاد دلاتا ہوں۔

كنتَ لنا أبًا و كنّا وَلَدَا ۔۔۔ ثُمَّتَ أسلمنا ولم ننزِع يَدَا

آپ ہمارے لیے باپ ہیں اور ہم اولاد ہیں پھر ہم نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔

فانصرْ هداكَ الله نصرًا عَتَدَا ۔۔۔ وادْعُ عبادَ الله يأتوا مَدَدَا

اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے آپ فوراً مدد فرمایئے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بلایئے کہ وہ مدد کو آئیں۔

فيهم رسولُ الله قد تجرّدَا ۔۔۔ أبيضُ مثلَ الشمس ينمُو صُعُدَا

ان (لشکر) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں جو مقام و مرتبہ میں منفرد اور یکتا ہیں مثل آفتاب روشن ہیں بلندیاں چڑھ رہے ہیں۔

إن سِيمَ خَسْفًا وجهُه تَربّدَا ۔۔۔ في فَيْلَقٍ كالبحر يجري مُزْبِدَا

اگر ان پر زیادتی کی جائے تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے ایسے عظیم لشکر میں جو سمندر کی جھاگ اچھالتے ہوئے چلتا ہے۔

إنّ قريشا أخلفوك الموعِدَا ۔۔۔ و نقضوا ميثاقَكَ المؤكّدَا

بے شک قریش نے آپ کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ کیا ہوا پختہ وعدہ توڑ دیا ہے۔

وزعموا أن لست تدعو أحدا　　وهم أذلّ و أقلّ عددا

اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ آپ کسی کو نہیں بلائیں گے اور وہ خود ذلیل (کمزور) اور تعداد میں تھوڑے ہیں۔

هم بيّتونا بالوتير هجّدا　　وقتلونا رُكّعا و سُجّدا

انہوں نے وتیر کے مقام پر رات کے وقت حملہ کیا جب کہ ہم سوئے ہوئے تھے یا نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے ہمیں رکوع و سجود کرتے ہوئے (اسلام کی حالت میں) قتل کیا۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں غالب نہیں آسکتا اگر میں بنی کعب کی مدد نہیں کرتا''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادل کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''بے شک یہ بھی بنی کعب کی مدد کے لیے رو رہا ہے''۔ بنی کعب سے مراد خزاعہ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیل بن ورقاء اور ان کے ساتھیوں کو فرمایا: ''بے شک ابوسفیان عنقریب آئے گا تا کہ معاہدہ کو پختہ کرے اور صلح میں اضافہ کرے اور وہ بغیر مقصد اور حاجت (حاصل کیے) واپس لوٹ جائے گا''۔ قریش نے جو کیا وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہوئے، پس ابوسفیان مدینہ طیبہ کی طرف نکلا تا کہ معاہدہ کو برقرار رکھے اور صلح میں اضافہ کرے، لیکن وہ بغیر حاجت کے لوٹ آیا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ اور آپ کی یہ خبر معروف ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح فرما دیا۔ اور یہ 8 ہجری میں ہوا۔ پس جب ہوازن میں فتح مکہ کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری نے انہیں جمع کیا، جیسا کہ غزوۂ حنین کے بارے میں مشہور و معروف ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ عنقریب آئے گا۔ اور کافروں کے خلاف مسلمانوں کو فتح و کامرانی اور مدد و نصرت حاصل ہوئی۔ حنین کے دن غزوۂ ہوازن یکم شوال 8 ہجری کو پیش آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم میں سے اموال اور عورتوں کی تقسیم چھوڑ دی۔ آپ نے اسے تقسیم نہ کیا یہاں تک کہ آپ طائف میں آگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سے کچھ زائد راتیں ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور اس کے سوا بھی کہا گیا ہے اور آپ نے ان کے خلاف منجنیق نصب کی اور ان پر اس کے ساتھ پتھر برسائے، جیسا کہ اس غزوۂ میں یہ معروف ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کی طرف واپس تشریف لائے اور حنین کے مال غنیمت کو وہاں تقسیم فرمایا، جیسا کہ اس کے بارے امر و خبر سب مشہور ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اور الگ الگ ہو گئے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال لوگوں کے لیے حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا۔ اور آپ پہلے امیر ہیں جنہوں نے اسلام میں حج ادا کروایا۔ مشرکوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا۔ اور حضرت عتاب بن اسید انتہائی نیکوکار، فضیلت رکھنے والے، متقی، زاہد تھے۔ کعب بن زہیر بن ابی سلمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کی مدح بیان کی اور آپ کے سامنے اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا آغاز اس طرح ہے:

بانت سعاد فقلبي اليوم متبول

(میری سعاد جدا ہو گئی جس کی وجہ سے آج میرا دل ہلاک ہوا چاہتا ہے) اور اس نے آخر تک یہ قصیدہ کہہ دیا اور اس میں مہاجرین کا ذکر بھی کیا اور ان کی تعریف کی۔ اور اس سے پہلے اس کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ہجو محفوظ تھی۔ پس انصار

نے اس پر نکتہ چینی کی اور اعتراض کیا جب اس نے ان کا ذکر نہ کیا، تو وہ دوسرے دن ایک اور قصیدہ لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں آیا اور اس میں وہ انصار کی مدح کرتا ہے۔ پس اس نے کہا:

من سرّہ کرم الحیاۃ فلا یزل فی مِقْنَب من صالحی الأنصار

جسے زندگی کی شرافت خوش کرتی ہو تو وہ انصار کی صالح جماعت کے ساتھ رہے۔

وَرِثوا المکارم کابرًا عن کابرٍ إنّ الخیار هُمُبنُو الأخیار

یہ نسل در نسل بزرگی کے وارث چلے آرہے ہیں، بہترین لوگ تو صرف بہترین لوگوں کی اولاد ہوتے ہیں۔

المکرِهین السَّمهریَّ بأذرع کسوافل الهِنْدِی غیرِ قِصار

وہ اپنے ہاتھوں سے سمہری نیزے چلاتے ہیں ہندی تلواروں کی طرح جو لمبی ہیں چھوٹی نہیں۔

والناظرین بأعینٍ محمَرَّۃ کالجَمْر غیرِ کَلِیلۃ الأبصار

وہ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہیں گویا وہ آگ کے انگارے ہیں ان کی آنکھیں تھکی ماندی ہیں۔

والبائعین نفوسَهم لنبیّهم للموت یوم تَعانُقٍ و کِرار

یہ اپنے نبی کی خاطر اپنے نفوس کو موت کے عوض بیچنے والے ہیں اس روز جو لشکروں کے ملنے کا دن ہے اور بار بار حملے کا دن ہے۔

یتطهّرون یرونه نُسکاً لهم بدماءِ مَن عَلِقوا من الکفار

یہ پاکیزگی حاصل کرتے ہیں اور اسے اپنی عبادت خیال کرتے ہیں ان کے خونوں سے جنہیں وہ کفار میں سے قتل کرتے ہیں۔

دَرِبوا کما دَربت ببطنِ خَفِیّۃٍ غُلْبُ الرّقابِ من الأسود ضَوَارِ

یہ عادی ہو گئے ہیں جس طرح خفیہ وادی میں موٹی گردنوں والے اور چیر پھاڑ کرنے والے شکاری شیر عادی ہو گئے ہیں۔

وإذا حَللت لیمنعوك إلیهُم أصبحت عند معاقل الأغفار

جب تو ان کے پاس اترے تا کہ وہ تیری حفاظت کریں تو گویا تو پہاڑی بکروں کی پناہ گاہ میں پہنچ گیا ہے۔

ضربوا علیًّا یوم بدرٍ ضربۃً دانت لوقعتها جمیعُ نِزار

انہوں نے بدر کے دن قریش پر ایسا وار کیا جس کے پڑنے سے قبیلہ نزار کے تمام افراد نے اطاعت اختیار کرلی۔

لو یعلم الأقوامُ عِلمِی کلّه فیهم لصَدّقنی الذین أماری

اگر لوگ ان کے بارے میں میرے علم جیسا علم رکھیں تو وہ بھی میری تصدیق کریں جو میرے بارے میں شک رکھتے ہیں۔

قومٌ إذا خوَت النجوم فإنهم للطارقین النازلین مَقَارِی

وہ ایسی قوم ہیں جب ستارے غروب ہونے لگیں تو یہ رات کے وقت آنے والے مہمانوں کی خوب میزبانی کرتے ہیں۔

پھر طائف سے واپس لوٹنے کے بعد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذوالحجہ، صفر، ربیع الاول، ربیع الآخر، جمادی الاولی اور جمادی

الآخرہ میں مدینہ طیبہ مقیم رہے اور رجب 9 ہجری میں مسلمانوں کا لشکر ساتھ لے کر غزوۂ روم، غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے۔ یہی وہ آخری غزوہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا پھر فرمایا کہ ''وہ بیت اللہ شریف میں حاضر ہوں ننگے بدن مشرک بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہوں تو میں پسند نہیں کرتا کہ میں حج کروں یہاں تک کہ اس طرح نہ ہو'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سورۂ براءت کی ابتدائی چالیس آیات بھیجیں تاکہ آپ انہیں حاجیوں کے سامنے پڑھیں۔ جب وہ چلے گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ''سورۂ براءت کی ابتدا سے اس قصہ کو لے کر جاؤ اور اس کے بارے لوگوں میں اعلان کر دو جب وہ جمع ہوں'' پس حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ناقہ عضباء پر سوار ہو کر نکلے یہاں تک کہ مقام ذوالحلیفہ پر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پا لیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا: ''أمیر أو مأمور''؟ (کیا امیر ہو یا مامور (تابع) ہو) تو انہوں نے جواب دیا: بلکہ میں تو مامور ہوں، پھر دونوں اٹھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کے لیے ان مراتب پر کھڑا کیا جن پر وہ دور جاہلیت میں تھے (1)۔ نسائی کی کتاب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم ترویہ (آٹھویں ذی الحجہ کا دن) سے ایک دن قبل لوگوں پر سورت براءت پڑھی یہاں تک کہ اسے ختم کیا۔ (یعنی مکمل سورت براءت پڑھ کر سنائی) اور یوم عرفہ اور یوم نحر (نویں اور دسویں ذی الحجہ کے دن) میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبہ ختم ہونے کے بعد تین دنوں میں (اسے پڑھا) اور جب وہاں سے واپس لوٹنے کا پہلا دن تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور انہیں بتایا وہ کیسے واپس چلیں گے اور کیسے رمی کریں گے، آپ انہیں ان کے مناسک سکھاتے رہے۔ پس جب آپ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں پر پوری سورت براءت پڑھی (2)۔

سلیمان بن موسیٰ نے کہا ہے: جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عرفات میں خطبہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے علی! اٹھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دو، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور وہ عمل کیا (یعنی سورت براءت پڑھ کر سنائی) فرمایا: میرے دل میں یہ بات آئی کہ تمام لوگ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر نہیں، چنانچہ میں نے یوم نحر کو خیموں کی تلاش شروع کر دی (اور وہاں جا کر انہیں پیغام پہنچایا)۔ ترمذی نے زید بن یثیع سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کون سی شے کے ساتھ آپ کو حج پر بھیجا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا: چار چیزوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے کہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے اور وہ جن کے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین معاہدہ ہے تو وہ اپنی پوری مدت تک ہے اور جن کا کوئی عہد نہیں تو ان کے لیے مدت چار ماہ ہے اور جنت میں سوائے مومن نفس کے کوئی داخل نہ ہوگا اور اس سال کے بعد مسلمان اور مشرک اکٹھے نہ ہوں گے (3)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور نسائی نے اسے نقل کیا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899 2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، جلد 2، صفحہ 42
3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 106۔ ایضاً، حدیث نمبر 3017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کہا ہے کہ آپ نے فرمایا: پس میں اعلان کرتا رہا یہاں تک کہ میری آواز بیٹھ گئی۔

ابوعمر نے بیان کیا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تا کہ آپ ہر عہد والے کے ساتھ اس کا عہد توڑ دیں۔ اور ان سے یہ عہد لیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور اس سال 9 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کروایا۔ پھر آئندہ سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وہ حج ادا فرمایا جس کے بغیر آپ نے مدینہ طیبہ سے کوئی حج نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حج ذوالحجہ میں ادا ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک زمانہ گردش کناں ہے'' الحدیث۔ اس کا بیان آیۃ النسیٔ میں آئے گا۔ اور حج یوم قیامت تک ذوالحجہ میں ثابت اور پختہ ہو گیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے 9 ہجری میں ذوالقعدہ میں حج ادا کیا تھا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورت ''براءۃ'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ براءت اس نقض عہد کو متضمن ہے جس کا عقد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور عربوں کا عمل اور طریقہ یہ تھا کہ عقد کوئی نہیں کھول سکتا تھا مگر وہی جس نے وہ عقد کیا ہوتا یا پھر اس کے خاندان میں سے کوئی آدمی ایسا کر سکتا تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجت کے ساتھ عربوں کی زبانوں کو بند کرنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے اہل بیت میں سے اپنے عم زاد ہاشمی کو نقض عہد کے اعلان کے لیے بھیجا تا کہ ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی باقی نہ رہے (1)۔ اس مفہوم کو زجاج نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے کہا ہے: یہ آیت ہمارے اور مشرکین کے درمیان عہد توڑنے کے جواز کو متضمن ہے۔ اور اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان مدت گزر جاتی ہے تو ہم انہیں جنگ کے بارے آگاہ کرتے ہیں۔ ایذان کا معنی اختیار دینا ہوتا ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے: ہمیں ان کی طرف سے دھوکہ دہی کا خوف ہوتا ہے، تو ہم ان کے ساتھ معاہدہ توڑ دیتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا پھر آپ نے عہد توڑ دیا جب آپ کو قتال کا حکم دیا گیا۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾

''اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لیے بڑے حج کے دن کہ اللہ تعالیٰ بری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی، اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے۔ اور اگر تم منہ پھیرے رہو تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور خوشخبری سنا دو کافروں کو دردناک عذاب کی''۔

اس میں تین مسئلے ہیں:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَذَانٌ، الأذان کا لغوی معنی بغیر کسی اختلاف کے الاعلام (اطلاع کرنا، اعلان کرنا) ہے اور یہ براۃ پر معطوف ہے۔ اِلَى النَّاسِ یہاں الناس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ یہ ظرف ہے اور اس میں عامل أذان ہے اگر چہ اس کی صفت مِّنَ اللّٰهِ کے قول سے لگائی گئی ہے، کیونکہ اس میں فعل کی بو باقی ہے اور یہ ظروف میں عمل کر سکتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں عامل مخزی ہے۔ اور أذان کا عمل کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی صفت لگائی گئی ہے اور یہ فعل کے حکم سے خارج ہو گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حج اکبر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس بعض نے کہا ہے: اس سے مراد یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) ہے یہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت طاؤس اور حضرت مجاہد سے مروی ہے۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن ابی اوفی اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حج اکبر یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) ہے اور اسے ہی علامہ طبری نے پسند کیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال حج کے دوران جس میں آپ نے حج ادا فرمایا دسویں کے دن وقوف کیا اور فرمایا: ''یہ کون سا دن ہے؟'' ۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی: یوم نحر ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ حج اکبر کا دن ہے'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے ان لوگوں میں بھیجا جو دسویں ذی الحجہ (یوم نحر) کو منیٰ میں اعلان کریں گے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور حج اکبر کا دن یوم نحر ہے۔ اور اسے لوگوں کے اس قول کی وجہ سے حج اکبر کہا گیا ہے: (کہ وہ) حج اصغر بولتے ہیں۔ پس اس سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے معاہدے توڑ دیئے۔ پس حجۃ الوداع کے سال جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج ادا فرمایا کسی مشرک نے حج نہیں کیا (2)۔

اور ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یوم نحر ہی حج اکبر کا دن ہے، اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اس میں بال کٹوائے جاتے ہیں (یعنی حلق وغیرہ کیا جاتا ہے) اس میں میل کچیل اتاری جاتی ہے اور اس میں احرام کھل جاتے ہیں۔ اور یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ اس میں مکمل حج یوم نحر میں ہے، کیونکہ وقوف اس کی رات کو ہے، رمی جمار، قربانی، حلق اور طواف اس کی صبح کے وقت ہیں۔

فریق اوّل نے حدیث مخرمہ سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حج اکبر کا دن یوم عرفہ ہے'' (3)۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 2

سنن ابن ماجہ، باب الخطبۃ یوم النحر، حدیث نمبر 3048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 451

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

اسے قاضی اسماعیل نے روایت کیا ہے اور امام ثوری اور ابن جریج رحمۃاللہ علیہما نے کہا ہے: حج اکبر تمام کے تمام ایام منیٰ ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: یوم صفین، یوم الجمل اور یوم بعاث وغیرہ۔ پس اس سے مراد مطلق وقت اور زمانہ ہوتا ہے صرف وہ دن مراد نہیں ہوتا۔

اور حضرت مجاہد رحمۃاللہ علیہ سے روایت ہے: حج اکبر سے مراد حج قران ہے۔ اور حج اصغر حج مفرد ہے۔ اس آیت میں ان میں سے کوئی شے مراد نہیں ہے۔ اور انہیں سے اور حضرت عطا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حج اکبر وہ ہے جس میں وقوف عرفات ہو اور حج اصغر عمرہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃاللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد تمام ایام حج ہیں۔ اور حسن اور عبداللہ بن حارث بن نوفل نے کہا ہے: اسے یوم الحج الاکبر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس سال مسلمانوں اور مشرکوں نے حج کیا(1) اور اس میں اس وقت کئی دینوں کی عیدیں اکٹھی اور متفق ہوئیں، مثلاً یہود، نصاریٰ اور مجوسی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس لیے اسے اکبر کی صفت سے متصف کرے۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: بے شک اس حج کا نام اکبر رکھا کیونکہ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا اور اس میں معاہدے توڑ دیئے گئے (2)۔ اور یہ وہ ہے جو حسن کے نظریہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن سیرین نے کہا ہے: یوم الحج الاکبر وہ سال ہے جس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا۔ اور اس میں آپ کی معیت میں امتیوں نے بھی حج ادا کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ اس میں أن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے بأن اللہ ہے اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس طرح تقدیر ذکر کی ہے قال إن اللہ، بریٔ یہ ان کی خبر ہے۔ وَ رَسُوْلُهٗ یہ محل پر معطوف ہے اور اگر آپ چاہیں تو برء میں ضمیر مرفوع پر عطف کرلیں۔ یہ دونوں حسن ہیں، کیونکہ کلام طویل ہو گیا ہے۔ اور اگر چاہیں تو اسے مبتدا پر معطوف کرلیں اور خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام ہو: و رسولہ بریٔ منھم اور جنہوں نے و رسولہ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ حسن وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اس کا عطف اسم جلالت لفظ اللہ پر کیا ہے۔ اور شواذ میں سے یہ ہے کہ و رسولہ قسم کی بنا پر مجرور بھی ہے۔ تقدیر عبارت ہے وحق رسولہ (اور اس کے رسول کے حق کی قسم) اور یہ حسن سے مروی ہے۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ اول کتاب میں گزر چکا ہے۔ فَاِنْ تُبْتُمْ پس اگر تم توبہ کرلو شرک سے۔ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ وَ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اور اگر تم منہ پھیرے رہو ایمان سے۔ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ تو خوب جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، کیونکہ وہ تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اپنی سزا تم پر اتارنے والا ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝

”بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 146	2۔ ایضاً

نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک، بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیزگاروں کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ استثنا متصل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بری ہے سوائے ان کے جو ایک معینہ مدت تک معاہدہ کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان سے بری ہے لیکن وہ جن سے تم نے معاہدہ کیا اور وہ اس عہد پر ثابت قدم رہے پس تم ان کا معاہدہ مدت مقررہ تک مکمل کرو۔ اور قول باری تعالیٰ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ معاہدہ کرنے والوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور بعض وہ ہیں جو اسے پورا کرنے پر ثابت قدم رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے معاہدہ کو توڑنے کی اجازت عطا فرمائی جنہوں نے معاہدہ میں خلاف ورزی کی اور ان کے معاہدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا جو معینہ مدت تک اپنے عہد پر باقی رہے(1)۔ اور لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ کا معنی ہے کہ انہوں نے معاہدہ کی شرائط میں ذرہ بھر کمی نہیں کی۔ وَلَمْ يُظَاهِرُوْا اور انہوں نے (تمہارے خلاف) کسی کی مدد اور معاونت نہیں کی۔ حضرت عکرمہ اور عطا بن یسار رحمۃ اللہ علیہما نے ثُمَّ لَمْ يَنْقُضُوْكُمْ ضاد کے ساتھ مضاف کو حذف کر کے پڑھا ہے تقدیر عبارت ہے ثم لم ینقضوا عھدھم کہا جاتا ہے: بے شک یہ (حکم) مخصوص ہے اور اس سے خاص کر بنوضمرہ مراد لیے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا: فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ پس تم ان کے عہد کی معینہ مدت پوری کرو اگرچہ وہ چار ماہ سے زیادہ ہو۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞

"پھر جب گزر جائیں حرمت والے مہینے تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں اور گرفتار کرو انہیں اور گھیرے میں لے لو انہیں اور بیٹھو ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ یعنی جب نکل جائیں حرمت والے مہینے اور سلخت الشھر جب تو مہینے کے آخری ایام میں پہنچ جائے (تو یہ جملہ کہتا ہے) تسلخہ سلخا و سلوخا بمعنی خرجت منہ (یعنی میں اس سے نکل گیا) اور شاعر نے بھی کہا ہے:

إذا ما سلختُ الشهرَ أهللتُ قبله كفى قاتلا سلخى الشهور و إهلالى

اور انسلخ الشھر (مہینہ گزر گیا، نکل گیا) اور انسلخ النھار من اللیل المقبل (آنے والی رات سے دن نکل گیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 900

اور سلخت المرأۃ درعھا (عورت نے اپنی قمیص اتار دی) اور قرآن کریم میں ہے: وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (یٰسین: 37) (اور دوسری نشانی ان کے لیے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو) اور نخلۃ مسلاخ یہ وہ درخت ہوتا ہے جس کی سبز خشک کھجوریں بکھر جائیں۔

الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ معروف مہینے ہیں، تین مہینے لگا تار ہیں اور ایک مہینہ الگ اور مفرد ہے۔ اصم نے کہا ہے: مراد وہ ہیں جن کا مشرکوں سے کوئی عقد نہیں پس ان پر لازم ہے کہ وہ ان کے قتال سے رکے رہیں یہاں تک کہ حرمت والے مہینے گزر جائیں۔ اور یہ پچاس دنوں کی مدت ہے جیسا کہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اس کے بارے اعلان یوم نحر کو ہوا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ معاہدہ کے چار مہینے ہیں۔ یہ مجاہد، ابن اسحاق، ابن زید اور عمرو بن شعیب نے کہا ہے۔ اور انہیں حرم کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر ان میں مشرکوں کا خون اور ان کے ساتھ تعرض کرنا سوائے سبیل خیر کے حرام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ یہ حکم عام ہے اور ہر مشرک کے بارے میں ہے، لیکن سنت نے اسے خاص کر دیا ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ عورت، راہب اور بچے وغیرہ کا قصہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ (التوبہ: 29) (یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں)

مگر یہ جائز ہے کہ مشرکین کا لفظ اہل کتاب کو شامل نہ ہو اور یہ بتوں کی پوجا کرنے والوں اور دوسروں سے جزیہ لینے کے منع کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ جاننا چاہیے کہ مطلق ارشاد باری تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ان کے قتل کے جائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے وہ کسی وجہ سے بھی مشرک ہوں، مگر مثلہ سے نہی کے بارے احادیث موجود ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ جائز ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس وقت مرتدوں کو آگ کے ساتھ جلا کر، پہاڑوں کی چوٹیوں سے پتھر اور تیر مار کر اور کنوؤں میں الٹا لٹکا کر قتل کیا یہ آیت کے عموم کے ساتھ متعلق ہے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتدوں کی ایک جماعت کو جلا دینا بھی جائز قرار دیتا ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف مائل ہیں۔ اور اس کا اعتماد لفظ کے عموم پر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یہ ہر جگہ کے بارے عام ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد حرام کو خاص کیا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ پھر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسین بن فضل نے کہا ہے: اس نے قرآن کریم کی ہر اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے جس میں دشمنوں کی اذیت پر صبر کرنے اور ان سے اعراض کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت ضحاک، سدی اور عطا رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) اور یہ کہ کسی قیدی کو پکڑ کر قتل نہیں کیا جائے گا، (بلکہ) یا تو اس پر احسان کیا جائے گا (یعنی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا جائے گا) یا پھر اس سے فدیہ لیا جائے گا۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلکہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لیے ناسخ ہے: فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً اور یہ کہ مشرک قیدیوں میں سوائے قتل کے اور کوئی شی جائز نہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: دونوں آیتیں محکم ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ احسان کرنا، قتل کرنا اور فدیہ لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان

میں اس پہلی جنگ سے مسلسل جاری رہا جو آپ نے ان کے ساتھ لڑی اور وہ غزوۂ بدر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ خُذُوْهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے اور اخذ کا معنی قید کرنا، گرفتار کرنا ہے۔ اور گرفتاری قتل کے لیے ہوتی ہے یا فدیہ کے لیے یا احسان کرنے کے لیے جس پر امام وقت کی رائے قائم ہو جائے۔ اور احْصُرُوْهُمْ کا معنی ہے جو کوئی تمہارے شہروں میں تصرف کرنے اور تمہارے پاس آنے کا ارادہ کرے تو تم اسے روک لو، مگر یہ کہ تم انہیں اجازت دو اور وہ تمہارے پاس امان لے کر داخل ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، المرصد سے مراد وہ جگہ ہے جس میں دشمن کی تاک میں بیٹھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رصدتُ فلانا أرصدہ یعنی میں فلاں کی تاک میں بیٹھا (1)۔ یعنی تم ان کے لیے ایسی مخفی اور پوشیدہ جگہوں میں بیٹھو جہاں سے انہیں تاکا جا سکتا ہو۔ عامر بن طفیل نے کہا ہے:

ولقد علمت وما إخالك ناسیا أن المنیّة للفتی بالمَرْصَد

اور عدی نے کہا ہے:

أعاذل إنّ الجهل من لذة الفتی وإن المنایا للنفوس بمرصد

ان دونوں میں مرصد تاک میں بیٹھنے کی جگہ کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس میں انہیں دعوت اسلام دینے سے پہلے بھی قتل کرنے اور انہیں پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے (2)۔ اور کل ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ زجاج کی پسند ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ذهبت طریقا و ذهبت کلّ طریق یا یہ حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہے اور تقدیر عبارت ہے: فی کل مرصد و علی کل مرصد اور مرصد کو طریق کا اسم بنایا جائے گا۔ اور ابو علی نے زجاج کو اس بارے میں غلط قرار دیا ہے کہ انہوں نے الطریق کو ظرف بنایا ہے اور کہا: طریق مخصوص جگہ ہوتی ہے جیسا کہ بیت اور مسجد (مخصوص مقام ہیں) پس اس سے پہلے حرف جر کو حذف کرنا جائز نہیں ہوگا سوائے ان مقامات کے جن میں حذف سائی ہو، جیسا کہ سیبویہ نے بیان کیا ہے: دخلتُ الشام و دخلتُ البیت اور جیسا کہ کہا گیا ہے:

کما عسل الطریق الثعلب

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَابُوْا پس اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ اس آیت میں تامل اور غور و فکر ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قتل کو شرک پر معلق کیا ہے، پھر فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا اور اس میں اصل یہ ہے کہ قتل جب شرک کے سبب ہے تو وہ اس کے زوال کے سبب زائل ہو جائے گا۔ اور یہ صرف توبہ کے ساتھ قتل کے زوال کا تقاضا کرتا ہے، اس میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اور اسی لیے نماز اور زکوٰۃ کا وقت آنے سے پہلے صرف توبہ کے ساتھ قتل ساقط ہو جاتا ہے اور یہ اس معنی میں بین اور واضح ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ دوسری دو شرطیں ذکر کی ہیں۔ اور انہیں لغو قرار دینے کا کوئی ذریعہ اور

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ 2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سبب نہیں۔ اس کی نظیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کریں تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے بچا لیے، محفوظ کر لیے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے''۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں اسے ضرور قتل کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ کتنے عظیم فقیہ تھے۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: پس قرآن وسنت دونوں منظم ہیں اور دونوں پر عمل جاری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے نماز اور تمام فرائض حلال سمجھ کر ترک کیے وہ کافر ہے اور جس نے غفلت اور سستی کرتے ہوئے سنن کو ترک کر دیا وہ فاسق ہو گیا اور جس نے نوافل کو چھوڑ دیا تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں، مگر یہ کہ اگر وہ ان کی فضیلت کا انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس کے بارے آپ نے خبر دی وہ اسے رد کرنے والا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے نماز کو ترک کر دیا لیکن نہ اس کا انکار کیا اور نہ اسے حلال سمجھا۔

یونس بن عبدالاعلیٰ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے ابن وہب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی اور نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور یہی ابوثور اور تمام اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور یہی قول حماد بن زید، مکحول اور وکیع کا بھی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے قید کر دیا جائے گا اور مارا جائے گا (لیکن) اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول ابن شہاب کا ہے اور اسی طرح داؤد بن علی کہتے ہیں۔ اور ان کی حجت اور دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ إلا اللہ فإذا قالوا ذالك عصموا منی دماء ھم و أموالھم إلا بحقھا۔ (1) اور انہوں نے کہا: ان کا حق وہ تین چیزیں ہیں جن کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین چیزوں میں سے ایک کے پائے جانے کے ساتھ: ایمان کے بعد پھر کفر کرنا یا احصان کے بعد زنا کا ارتکاب کرنا یا کسی آدمی کو بغیر قصاص کے قتل کرنا'' (2)۔ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جس نے ایک نماز جان بوجھ کر بغیر عذر کے چھوڑی یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور اس نے اسے ادا کرنے اور قضاء کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: میں نماز نہیں پڑھوں گا، تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا خون اور مال دونوں حلال ہوں گے، اس کے مسلمان ورثا میں سے کوئی اس کا وارث نہیں بنے گا اور اسے توبہ کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ پس اگر اس نے توبہ کر لی (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے مال کا حکم مرتد کے مال کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور یہی قول اسحاق کا ہے۔ اسحاق نے کہا ہے:

1۔ سنن النسائی، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، حدیث نمبر 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ مقدس سے لے کر ہمارے اس زمانے تک اہل علم کی رائے اسی طرح رہی ہے۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے تارک نماز کو کب قتل کیا جائے گا؟ پس بعض نے کہا ہے: مختار وقت کے آخر میں۔ اور بعض نے کہا ہے: وقت ضرورت کے آخر میں۔ اور اس میں سے یہی صحیح ہے۔ اور وہ یہ کہ عصر کے وقت میں چار رکعتیں سورج کے غروب ہونے تک اور رات کے وقت چار رکعتیں عشاء کے وقت کی انتہا تک اور صبح کے وقت دو رکعتیں سورج طلوع ہونے سے پہلے تک (وقت ضرورۃ) باقی ہوتا ہے۔ اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ذھاب الوقت (وقت نکل جانا) سے مراد یہ ہے کہ ظہر کی نماز کو غروب آفتاب تک موخر کر دیا جائے اور مغرب کی نماز کو طلوع فجر تک موخر کر دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے کہا: میں نے توبہ کر لی ہے، تو اس کا یہ قول کافی نہ ہوگا یہاں تک کہ توبہ کو ثابت کرنے والے اس کے افعال اس کی طرف منسوب ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں توبہ کے ساتھ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط ذکر کی ہے تاکہ ان کے ساتھ وہ توبہ کو ثابت کر سکے۔ اور آیت ربا میں فرمایا: وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ (البقرہ: 279) (اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال) اور مزید فرمایا: اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَيَّنُوۡا (البقرہ: 160) (البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں اور ظاہر کر دیں) اس کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝

''اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے، تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام پھر پہنچا دیجئے اسے اس کی امن گاہ میں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو (قرآن کو) نہیں جانتے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ یعنی ان میں سے جنہیں قتل کرنے کے بارے میں آپ کو حکم دیا ہے۔ اسۡتَجَارَكَ یعنی آپ سے پناہ طلب کرے، یعنی آپ کی امان اور آپ کی ذمہ داری کا مطالبہ کرے، تو اسے وہ امان عطا فرما دیجئے تاکہ وہ قرآن کریم کو سنے، یعنی اس کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کو سمجھے۔ پس اگر اس نے ایک امر بھی قبول کر لیا تو یہ اچھا ہے اور اگر وہ انکار کر دے تو پھر اسے ان کی امن گاہ تک پہنچا دو (1) اور یہ وہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مسلمان ملکوں کے راستے میں کوئی حربی پایا گیا اور اس نے کہا: میں امان طلب کرنے کے لیے آیا ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ مشتبہ امور ہیں (2) اور میری رائے یہ ہے کہ اسے اس کی امان گاہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسی طرح وہ ہے جو پایا جائے درآنحالیکہ وہ تجارت کے لیے ہمارے ساحل پر اترا ہو اور کہتا ہو: میرا گمان یہ تھا کہ تم اس کے ساتھ تعرض نہیں کرو گے جو تجارت کے لیے آئے یہاں تک کہ وہ (سامان) بیچ لے۔ ظاہر آیت بلاشبہ اسی کے بارے میں ہے جو قرآن کریم سننے اور دین اسلام میں نظر و فکر کا ارادہ رکھتا ہے۔ رہا اس کے علاوہ کسی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 891
2۔ ایضاً

کو پناہ دینا تو یہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر ہے اور ان امور میں نظر وفکر کے اعتبار سے جن کی منفعت اور فوائد اس کے سبب انہیں پہنچیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ تمام علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ سلطان وقت کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ نظر وفکر اور مصلحت کو پیش نظر رکھنے کے اعتبار سے تمام سے آگے اور مقدم ہے۔ اور منافع کے حصول اور نقصانات کو دور کرنے میں تمام کا نائب ہے، البتہ غیر خلیفہ کی امان میں اختلاف ہے۔ پس تمام علماء کے نزدیک آزاد آدمی کی امان قبول اور نافذ ہوتی ہے۔ مگر ابن حبیب نے کہا ہے: اس میں امام وقت غور وفکر کرے گا۔ اور رہا غلام تو مشہور مذہب میں اس کی امان جائز ہے۔ امام شافعی اور آپ کے اصحاب امام احمد، اسحاق، اوزاعی، ثوری، ابوثور، داؤد اور محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: غلام کی امان جائز نہیں ہے اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے: کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمانوں کے خون کی نگرانی اور دفاع کیا جائے گا اور ان کے ادنی ان کے ذمہ کے بارے کوشش کریں گے''۔ انہوں نے کہا ہے: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے أدناهم فرمایا ہے (تو یہ اس طرف اشارہ ہے) کہ غلام کی امان جائز ہے۔ اور آزاد عورت اس کے زیادہ لائق اور مناسب ہے اور اس علت کا کوئی اعتبار نہیں کہ ''اس کے لیے (یعنی غلام کے لیے) وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا''۔ اور عبدالملک بن ماجشون نے کہا ہے: عورت کی امان جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ امام وقت اس کی اجازت دے اور یہ اپنے اس قول کے ساتھ جمہور سے الگ اور جدا ہیں۔ اور جہاں تک بچے کا تعلق ہے تو جب وہ قتال کی طاقت رکھتا ہو تو اس کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ بھی من جملہ قتال کرنے والوں سے ہوتا ہے اور حفاظت کرنے والے گروہ میں داخل ہے۔ اور حضرت ضحاک اور سدی رحمۃ اللہ علیہما اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور قیامت تک ثابت ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت کا حکم ان چار ماہ کی مدت باقی رہا جو مدت ان کے لیے بیان کی گئی اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ مشرکوں میں سے ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اگر ہم میں سے کوئی آدمی چار ماہ گزرنے کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آنے کا ارادہ کرلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنے یا کسی حاجت کے لیے آپ کے پاس آئے تو وہ قتل کر دیا جائے گا؟ تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ اور یہی صحیح ہے اور آیت محکم ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ وَ اِنْ اَحَدٌ، احد مرفوع ہے اسی طرح کے فعل مضمر کے سبب جو اس کے بعد ہے اور یہ ان میں تو اچھا ہے لیکن اس کے اخوات میں قبیح ہے۔ ان اور اس کے اخوات کے درمیان فرق کے بارے میں سیبویہ کا مذہب ہے کہ یہ جب حروف شرط کی اصل ہے تو اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ (وصف) اس کے علاوہ میں نہیں ہوتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ ان کا قول لأنها لا تكون في غيره یہ غلط ہے، کیونکہ یہ (ان) بمعنی ما ہوتا ہے اور ثقیلہ سے

مخففہ ہوتا ہے لیکن یہ مبہم ہے۔ اور اس کے سوا دوسرے اس طرح نہیں۔ اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

لَا تَجْزَعِي إِنْ مُنْفِسًا أَهْلَكْتُه　　وإذا هلكتُ فعند ذالكِ فَاجْزَعِي

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ میں اس پر دلیل ہے کہ الله تعالیٰ کا کلام قاری کی قرأت کے وقت سنا جائے۔ یہ شیخ ابوالحسن، قاضی ابوبکر، ابوالعباس القلانسی، ابن مجاہد اور ابواسحاق الاسفرائنی رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ نے کہا ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ پس یہ اس پر نص ہے کہ الله تعالیٰ کا کلام اس کا کلام ہونے کی وجہ سے قاری کو قراءت کے وقت سنا جائے۔ اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی دلالت کرتا ہے کہ قاری جب فاتحۃ الکتاب یا کوئی سورت پڑھتا ہے تو کہتے ہیں: ہم نے الله تعالیٰ کا کلام سنا۔ اور انہوں نے الله تعالیٰ کا کلام پڑھے جانے اور امرء القیس کا شعر پڑھے جانے کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور کلام الله تعالیٰ کے معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور یہ کہ نہ اس کے حرف ہیں اور نہ آواز۔ والحمدلله

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"کیونکر ہو سکتا ہے (ان عہد شکن) مشرکوں کے لیے کوئی معاہدہ الله کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مسجد حرام کے پاس۔ تو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے معاہدہ پر تم بھی قائم رہو ان کے لیے، بے شک الله تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے"۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہاں کیف تعجب کے لیے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیف یسبقنی فلان (کیونکر فلاں مجھ سے سبقت لے جائے گا) یعنی اسے نہیں چاہیے کہ وہ مجھ پر سبقت لے جائے۔ اور عہد یکون کا اسم ہے۔ اور آیت میں اضمار ہے، ای کیف یکون للمشرکین عهد مع اضمار الغدر (1) (یعنی کیونکر مشرکین کے لیے عہد ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کہ غدر اور دھوکہ دہی مخفی ہو) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

خبرتماني إنما الموت بالقُرى　　فكيف وهَاتَا هَضْبةٌ و كَثِيبُ

تقدیر عبارت ہے: فکیف مات، یہ زجاج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کیونکہ ان مشرکوں کے لیے الله تعالیٰ کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ کل اس کے سبب اس کے عذاب سے پرامن اور محفوظ ہو جائیں اور کیونکر ان کے لیے الله تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے سبب دنیا کے عذاب سے پرامن اور محفوظ ہو جائیں، پھر استثنیٰ کی اور فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ بنو بکر ہیں۔ یعنی معاہدہ نہیں مگر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نہ معاہدہ توڑا اور نہ اسے فسخ کیا۔

1۔ تفسیر الرازی

قولہ تعالیٰ: فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ یعنی جب تک تمہارے عہد کو پورا کرنے پر وہ قائم رہیں تو تم بھی ان کے لیے اسی کی مثل پر قائم رہو۔ ابن زید نے کہا ہے: پس وہ قائم نہیں رہے تو ان کے لیے چار مہینے مدت مقرر کر دی گئی۔ اور رہے وہ جن کے لیے کوئی عہد نہیں تو تم انہیں قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ

"کیونکر (ان کے معاہدہ کا لحاظ رکھا جائے) حالانکہ اگر وہ غالب آ جائیں تم پر تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا، راضی کرنا چاہتے ہیں تمہیں (صرف) اپنے منہ (کی باتوں) سے اور انکار کر رہے ہیں ان کے دل اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ اس پر تعجب کا اعادہ فرمایا کہ ان کے لیے ان کے خبث اعمال کے باوجود عہد ہو، یعنی کیونکر ان کے لیے معاہدہ ہو سکتا ہے حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا۔ کہا جاتا ہے: ظهرتُ على فلان یعنی میں اس پر غالب آ گیا اور ظهرت البيت میں مکان پر چڑھا۔ اور اسی سے ہے: فما اسطاعوا أن يظهروه پس انہوں نے طاقت نہ رکھی کہ وہ اس پر غالب آئیں۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً، يَرْقُبُوْا وہ محافظت کریں۔ اور رقیب حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِلًّا اس سے مراد عہد ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس کا معنی قرابت اور رشتہ داری ہے۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی جوار اور پڑوس ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد حلف (دوستی یا قسم) ہے اور ذِمَّةً سے مراد عہد ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: مراد قسم، یمین ہے۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے الا العہد اور الذمۃ بمعنی بالتذمم (بچنا) ہے۔ ازہری نے کہا ہے: یہ عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ اور اس کی اصل الأليل سے ہے اور اس کا معنی ہے چمکدار، روشن۔ کہا جاتا ہے: ال لونه يؤل الا یعنی اس کا رنگ صاف اور چمک دار ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الحدة سے ہے (تیز دھار ہونا) اور اسی سے الألة للحربة (تیز دھار نیزہ) اور اسی سے أُذُن مُؤَلَّلَة (تیز کان) اور اسی سے طرفہ بن العبد کا قول ہے وہ اپنی ناقہ کے کانوں کی تیزی اور کھڑے ہونے کا وصف بیان کرتا ہے:

مُؤَلَّلَتَان تعرف العِتق فيهما　كما مِعَقَ شاةٍ بحَومَل مُفْرَدِ

پس جب عہد، جوار اور قرابت کو اِل کہا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ کان ان جہتوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں، یعنی ان کے لیے تیز کر لیے جاتے ہیں۔ اور عہد کو اس کے صاف و شفاف اور ظاہر ہونے کی وجہ سے اِل کہا جاتا ہے۔ اور اس کی جمع قلت آلال آتی ہے۔ اور جمع کثرت اِلال آتی ہے۔ اور جوہری وغیرہ نے کہا ہے: الإل کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور الإل کا معنی عہد اور قرابت بھی ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

لعمرُك إنّ إلّكِ من قريش كإلّ السَّقْب من رَأْل النَّعام

قولہ تعالیٰ: ولا ذمۃً یعنی وہ کسی عہد کا لحاظ نہ رکھیں گے۔ اور اس سے مراد ہر وہ حرمت ہے جو تجھ پر لازم ہو جب تو اسے ضائع کرے تو گناہ ہو۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور ابن زید نے کہا ہے: الذمة کا معنی عہد ہے۔ اور جنہوں نے الإلّ سے مراد بھی عہد لیا ہے تو پھر یہ تکرار دو مختلف لفظوں کے سبب ہے۔ اور ابو عبید معمر نے کہا ہے: الذمة سے مراد التذمم ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں ذمہ سے مراد امان ہے: ويسعى بذمتهم أدناهم اور ذمہ کی جمع ذمم ہے۔ اور بئر ذمة (ذال کے فتحہ کے ساتھ) تھوڑے پانی والا کنواں۔ اور اس کی جمع ذمام ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

على حِمْيَرِيّات كأنّ عيونَها ذِمامُ الرّكايا أنكزَتْها المَوَاتِحُ

اس میں انكزتها کا معنی ہے اس نے اپنے پانی کو ختم کر دیا، کم کر دیا۔ اور اهل الذمه اہل عقد ہوتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یعنی وہ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جس کا ظاہر راضی اور خوش کر دیتا ہے۔ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ یعنی وہ عہد توڑنے والے ہیں۔ اور ہر کافر فاسق ہے، لیکن یہاں مراد وہ ہیں جو اعلانیہ برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اور عہد توڑنے والے ہیں۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹

"انہوں نے بیچ دیں اللہ کی آیتیں تھوڑی سی قیمت پر (مزید برآں) روکا انہوں نے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے، بے شک وہ بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے"۔

یعنی مشرکوں نے چند لقموں کے عوض معاہدے توڑ دیئے جو انہیں ابوسفیان نے کھلائے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے قرآن کے بدلے دنیوی ساز و سامان لے لیا۔ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی انہوں نے اعراض کر لیا اور صدوا، الصدود سے ماخوذ ہے۔ یا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ سے (لوگوں کو) روکا۔ اس صورت میں یہ الصد سے ماخوذ ہے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

"نہیں لحاظ کرتے کسی مومن کے حق میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی وعدہ کا۔ اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں"۔

نحاس نے کہا ہے: یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ پہلا ارشاد تمام مشرکوں کے لیے اور یہ دوسرا یہودیوں کے لیے خاص ہے۔ اور اس پر دلیل اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ہے یعنی یہودیوں نے اللہ عزوجل کے دلائل اور اس کے بیان کو طلب ریاست اور دیگر چیزوں کے طمع اور حرص کے عوض بیچ دیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ یعنی وہ معاہدہ توڑنے کے ساتھ حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑪

''پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) آیتیں اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَابُوْا یعنی اگر وہ شرک سے توبہ کرلیں اور احکام اسلام کو لازم پکڑ لیں۔ فَاِخْوَانُكُمْ تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ فِي الدِّيْنِ (دین میں)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت نے اہل قبلہ کے خون حرام کردیئے ہیں۔ اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض کی ہیں اور اس سے منع کیا ہے کہ کوئی ان دونوں کے درمیان فرق کرے اور اس کا بھی انکار کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے بغیر نماز کو قبول کرے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: تمہیں نماز اور زکوٰۃ کے بارے حکم دیا گیا ہے پس جس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کی نماز بھی نہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تین چیزوں کے درمیان فرق کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے اور اپنی رحمت کے درمیان فرق کردے گا، جس نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہوں اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا''۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (المائدہ:92) اور جس نے کہا: میں نماز قائم کروں گا اور زکوٰۃ نہیں دوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ:43) اور جس نے اللہ تعالیٰ کے شکر اور اپنے والدین کے شکر کے درمیان فرق کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (لقمان:14) (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا)

قولہ تعالیٰ: وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ یعنی ہم اپنی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ نے ذکر میں اہل علم کو خاص کیا ہے کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرسکتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ⑫

''اور اگر یہ لوگ توڑ دیں اپنی قسمیں اپنے معاہدہ کے بعد اور طعن کریں تمہارے دین پر تو جنگ کرو کفر کے پیشواؤں سے، بے شک ان لوگوں کی کوئی قسمیں نہیں ہیں (ایسوں سے جنگ کرو) تاکہ یہ لوگ (عہد شکنی سے) باز آجائیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا، النکث کا معنی توڑنا ہے اور اصل میں یہ ہر اس شے کے لیے ہے جسے پہلے بٹا جائے اور پھر کھول دیا جائے۔ اور یہ قسم اور معاہدوں میں مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

وان حَلَفَتْ لا ينقض النائی عهدها　　فليس لمخضوب البَنَان يَمِينُ

اس میں یمین بمعنی عہد (معاہدہ) ہے اور قولہ: وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ اور وہ تمہارے دین میں طعن کریں معاہدے توڑ کر،

جنگ کے ساتھ اور دیگر ایسے امور کے ساتھ جو مشرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: طعنه بالرمح (اس نے اسے نیزے کے ساتھ کچوکا لگایا) اور طعن بالقول السیء فیه، یطعن (اس نے برے قول کے ساتھ طعنہ دیا) اس میں وہ طعنہ زنی کرتا ہے، دونوں مثالوں میں یہ لفظ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یطعن بالرمح (یہ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے) اور یطعن بالقول (یہ عین کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ یہاں استعارۃ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ قول ہے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا۔ ''اگر تم ان کی امارت پر طعن کرو گے تو تحقیق اس سے پہلے تم نے ان کے باپ کی امارت پر طعن کیا اور اللہ کی قسم بلاشبہ وہ امارت کے لیے انتہائی موزوں اور اہل تھے'' (1)۔ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ دین میں طعن کرنے والے ہر آدمی کو قتل کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ کافر ہے۔ اور طعن کا معنی یہ ہے کہ اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کرنا جو اس کے لائق اور مناسب نہ ہو یا کسی امر دینی کو حقیر سمجھتے ہوئے اس پر اعتراض کرنا، جب کہ اس کے اصول کا صحیح ہونا اور اس کے فروع کا درست ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کی اس کی سزا قتل ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے ان میں سے امام مالک، لیث، احمد اور اسحاق ہیں اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور حضرت نعمان (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) سے بیان ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی گلوچ دی اسے قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کسی آدمی نے کہا: کعب بن اشرف کو قتل نہیں کیا گیا مگر دھوکے کے ساتھ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اور ایک دوسرے آدمی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کہا تو حضرت محمد بن مسلمہ اٹھے اور کہا: کیا آپ کی مجلس میں یہ کہا جا رہا ہے اور آپ خاموش ہیں؟ قسم بخدا! میں آپ کو اس چھت کے نیچے ہمیشہ نہیں رہنے دوں گا اور اگر مجھے اس کے ساتھ علیحدہ موقع ملا تو میں اسے ضرور قتل کروں گا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غدر کی نسبت کی۔ اور یہی وہ مفہوم ہے جو حضرت علی اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما اس کہنے والے کے قول سے سمجھے، کیونکہ یہ زندقہ ہے۔ اور اگر اس نے اس کے قتل کی نسبت مباشرین (عملاً قتل کرنے والے) کی طرف کی ہے اس حیثیت سے کہ وہ کہتا ہے: بے شک انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا پھر اسے توڑ دیا تو یقیناً یہ نسبت کذب محض ہے، کیونکہ اس کے ساتھ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا ہو اور نہ انہوں نے اسے یہ صراحتاً کہا ہے اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ امان نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قتل کی طرف متوجہ کیا نہ کہ اسے امان دینے کی طرف۔ اور آپ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں اجازت دی کہ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرے۔ اور اسی بنا پر اسے قتل کرنے کے بارے میں نظر اور تردد ہے جس نے اس کی نسبت ان کی طرف کی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کیا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 11-12

حضور نبی مکرم ﷺ کی طرف کرنا لازم آتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ان کے فعل کو درست قرار دیا اور اس کے ساتھ راضی ہوئے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ غدر کے ساتھ راضی ہوئے اور جس نے صراحۃً ایسا کیا وہ قتل کر دیا جائے گا یا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف لازم نہیں آتی پس وہ قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور جب ہم کہتے ہیں: اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ تو وہاں اس قائل کو قابل عبرت سزا دینا، اسے جیل میں قید کرنے کی سزا دینا، شدید مارنا اور بہت زیادہ ذلیل ورسوا کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور رہا ذمی تو جب وہ دین کے بارے میں طعن کرے تو اس کا عہد توڑ دیا جائے گا یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ، الآیہ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے(1)۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں کہا ہے: بے شک اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا اور بے شک صرف طعن کے ساتھ معاہدہ نہیں ٹوٹتا مگر جب عملاً ٹوٹنے کا وجود پایا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو شرطوں کے ساتھ انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں سے ایک ہے ان کا معاہدہ کو توڑنا اور دوسری ہے ان کا دین میں طعن کرنا۔ ہم نے کہا ہے: اگر انہوں نے ایسا عمل کیا جو معاہدہ کے خلاف ہو تو ان کا عہد ٹوٹ جائے گا اور دو امروں کا ذکر اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ اس کا قتل ان دونوں کے پائے جانے پر موقوف ہے، کیونکہ معاہدہ توڑنا ہی انفرادی طور پر ان کے لیے قتل کو عقلاً و شرعاً مباح کر دے گا۔ اور ہمارے نزدیک تقدیر آیت اس طرح ہے: فان نکثوا عهدهم حل قتالهم وان لم ینکثوا بل طعنوا فی الدین مع الوفاء بالعهد حل قتالهم (پس اگر وہ اپنا معاہدہ توڑ دیں تو ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے اور اگر معاہدہ نہ توڑیں بلکہ عہد کو پورا کرنے کے باوجود دین میں طعن کریں (تب بھی) ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے) تحقیق روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ذمی کو پیش کیا گیا جس نے ایک جانور کو کیل (یا نوک دار لکڑی) چبھویا اس پر ایک مسلمان عورت سوار تھی پس سواری اچھلی اور اس نے اسے گرا دیا اور اس کی کچھ شرمگاہ ننگی ہوگئی۔ تو آپ نے اسی جگہ اسے سولی دینے کا حکم دیا(2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب ذمی نے جنگ میں حصہ لیا تو اس کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور اس کا مال اور اس کی اولاد اس کے ساتھ مال فے بن جائیں گے۔ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کے سبب اس کی اولاد کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس اکیلے نے عہد توڑا ہے۔ اور فرمایا: جہاں تک اس کے مال کا تعلق ہے تو وہ لے لیا جائے گا۔ اور یہ ایسا تعارض ہے جو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے منصب کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ اس کا معاہدہ تو وہی ہے جس نے اس کے مال اور اس کی اولاد کو محفوظ کیا ہے۔ تو جب اس سے مال نکل گیا تو پھر اس سے اس کی اولاد بھی نکل جائے گی (یعنی دونوں میں سے کوئی شے بھی محفوظ نہ ہوگی)

اور اشہب نے کہا ہے: جب ذمی نے اپنا عہد توڑ دیا تو وہ اپنے عہد پر ہی رہے گا اور کبھی بھی غلامی کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اور یہ تعجب خیز ہے، گویا کہ اس نے عہد کو معنیً اور محسوساً دیکھ لیا۔ بلاشبہ اقتضاء عہد کا حکم برائے نظر و فکر ہے اور مسلمانوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی والمحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

اس کے لیے اس کا التزام کیا ہے، تو جب اس نے عہد توڑ دیا تو وہ دیگر تمام عقود کی طرح ٹوٹ گیا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم ﷺ کو گالیاں دیں یا آپ سے تعرض کیا یا آپ ﷺ کی قدر و منزلت یا آپ کے وصف کو کسی ایسی وجہ کے بغیر حقیر سمجھا جس سے وہ کافر ہو جائے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ ہم نے اس پر اس سے عقد ذمہ یا معاہدہ نہیں کیا۔ مگر امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری اور اہل کوفہ میں سے ان دونوں کے متبعین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ قتل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ جس نظریہ پر ہے وہ شرک سے بڑھ کر نہیں ہے، لیکن اسے ادب ضرور سکھایا جائے گا اور اسے تعزیز لگائی جائے گی۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاِنْ نَّكَثُوْٓا (اور اگر وہ توڑ دیں) الآیہ

اور بعض نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا حالانکہ اس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی پر غصے اور ناراض ہوئے تو حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا میں اس کی گردن نہ ماردوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اس کی اجازت نہیں (1)۔ اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک اندھا آدمی تھا اس کی ایک ام ولد (لونڈی) تھی، اس کے موتیوں کی مثل اس سے دو بیٹے تھے۔ پس وہ حضور نبی مکرم ﷺ کو گالیاں دیتی تھی اور وہ اس طرح کا فعل کرتی رہتی تھی تو وہ اسے منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہ آئی اور وہ اسے جھڑکتا اور ڈانٹتا تھا لیکن وہ اس کا اثر قبول نہ کرتی تھی۔ پس جب ایک رات حضور نبی مکرم ﷺ کا ذکر کیا تو اس کا آقا صبر نہ کر سکا پس وہ کلہاڑے کی طرف اٹھ کر گیا اور اس کے پیٹ پر رکھ دیا پھر اس پر زور لگایا یہاں تک کہ اسے آر پار کر دیا۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''خبردار گواہ رہو بے شک اس کا خون رائیگاں ہے''۔(2)

اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پس اس نے اسے قتل کر دیا، جب صبح ہوئی تو حضور نبی مکرم ﷺ کو اس کے بارے بتایا گیا۔ پس وہ نابینا شخص اٹھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں اس کا مالک ہوں، وہ آپ ﷺ کو گالیاں دیتی تھیں اور آپ کے بارے میں الزام تراشی کرتی تھی، میں اسے اس سے منع کرتا لیکن وہ نہ رکتی اور میں اسے جھڑکتا اور وہ اس سے باز نہ آتی اور میرے اس سے موتیوں کی مثل دو بیٹے ہیں۔ اور وہ میرا ساتھی تھی، پس جب گزشتہ رات آئی تو وہ آپ کو گالیاں دینے شروع ہو گئی اور آپ کے بارے میں الزام تراشیاں کرنے لگی تو میں نے اسے قتل کر دیا۔

تب حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''خبردار سنو! تم گواہ رہو بلاشبہ اس کا خون رائیگاں ہے''۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ جب کوئی گالیاں دے پھر قتل سے بچنے کے لیے اسلام قبول کرے، تو بعض نے کہا ہے: اس کا اسلام لانا اس کے قتل کو ساقط کر دے گا اور یہی مشہور مذہب ہے، کیونکہ اسلام اپنے ماقبل ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ جب اس نے سب و شتم کیا اور پھر توبہ کر لی۔ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: 38) (فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، حدیث نمبر 3797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3795

جائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو کچھ ہو چکا)

اور بعض نے کہا ہے: اسلام اس کے قتل کو ساقط نہیں کرے گا۔ یہ قول عتبیہ میں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ کا حق آپ ﷺ کی انتہاء حرمت اور اس نقص اور عیب کو آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ ملانے کے قصد کی وجہ سے واجب اور ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا اسلام کی طرف رجوع کرنا ایسا نہیں ہے جو اسے ساقط کر سکے۔ اور نہ ہی وہ کسی مسلمان سے احسن اور بہتر حالت میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ اس میں ائمۃ امام کی جمع ہے۔ بعض علماء کے قول کے مطابق مراد صنادید قریش ہیں مثلاً ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف۔ اور یہ قول بعید از حقیقت ہے، کیونکہ یہ آیت سورت براءۃ میں ہے اور جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اور لوگوں پر پڑھی گئی تو اللہ تعالیٰ قریش کی قوت و طاقت کو پامال کر چکا تھا پس اب سوائے اسلام لانے یا صلح کرنے کے کچھ باقی نہ تھا۔ پس یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ سے مراد ہو، جو معاہدہ توڑنے اور دین میں طعن کرنے کا اقدام کرے وہی کفر میں اصل اور سردار ہوگا۔ پس اس بنا پر وہ ائمہ کفر میں سے ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے متقدمین اور رؤساء ہوں اور یہ کہ انہیں قتل کرنا ان کے متبعین کو قتل کرنا ہے اور یہ کہ ان کے لیے کوئی حرمت (اور عزت) نہیں ہے۔ اور ائمۃ اصل میں أأممة ہے جیسے مثال اور أمثلة ہے، پھر میم کو میم میں مدغم کیا گیا اور حرکت کو ہمزہ کی طرف منتقل کر دیا گیا اب دو ہمزے جمع ہو گئے اور پھر دوسرے ہمزہ کو یا سے بدل دیا گیا۔ اور اخفش کا خیال ہے کہ تو کہتا ہے: هذا أیم من هذا یعنی یہ یا کے ساتھ ہے۔ اور مازنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أوم من هذا یعنی واؤ کے ساتھ۔ اور حمزہ نے ائمۃ پڑھا ہے۔ اور اکثر نحوی اس طرف گئے ہیں کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ انہوں نے دو ہمزے ایک کلمہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ بے شک ان کا کوئی معاہدہ نہیں، یعنی ان کے معاہدے سچے نہیں ہیں جنہیں وہ پورا کریں گے۔ ابن عامر نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ لَاۤ اِیْمَانَ لَهُمْ پڑھا ہے یہ ایمان سے ہے، یعنی ان کا کوئی اسلام (اور دین) نہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آمنته ایمانًا کا مصدر ہو اور یہ اس امن سے ہو جس کی ضد خوف ہے، یعنی وہ امن میں نہیں ہوں گے۔ یہ آمنته ایمانًا سے ہے یعنی میں نے اسے پناہ دی۔ پس اسی لیے فرمایا: فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ۔

لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ تا کہ وہ شرک سے باز آجائیں۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم ﷺ نے اہل مکہ سے ایک سال معاہدہ کیا اور آپ ﷺ حدیبیہ میں تھے اور انہوں نے آپ ﷺ کو بیت اللہ شریف سے روک لیا، پھر انہوں نے اس شرط پر آپ ﷺ سے صلح کی کہ آپ واپس لوٹ جائیں، پس وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے حلیف خزاعہ کی بنی امیہ کی حلفاء جو کنانہ سے تھے، کے ساتھ جنگ ہوگئی اور بنو امیہ نے ہتھیاروں اور خوراک کے ساتھ اپنے حلیفوں کی امداد کی، تو خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کی پس یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے حلفاء کی امداد کریں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور بخاری میں حضرت زید بن وہب سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ہم حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے تو انہوں نے فرمایا: اس آیت فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ کے مصداق سے سوائے تین کے کوئی باقی نہیں۔ اور منافقین

میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ تو ایک اعرابی نے کہا: بے شک تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو تم ایسی خبریں دیتے ہو کہ ہم نہیں جانتے وہ کیا ہیں؟ تم گمان کرتے ہو کہ سوائے چار کے کوئی منافق نہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ہمارے گھروں میں گھس آتے ہیں اور ہمارا قیمتی اور عمدہ سامان چوری کر لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ فاسق لوگ ہیں، ہاں ان میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ ان میں سے ایک شیخ کبیر ہے کہ اگر وہ ٹھنڈا پانی پیے تو اس کی ٹھنڈک کو نہیں پاتا۔ قولہ تعالیٰ: لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ تاکہ وہ اپنے کفر سے اپنے باطل (عقائد) سے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے سے باز آجائیں۔ اور یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کے ساتھ قتال اور جنگ کرنے سے غرض اور مقصود ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنا ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے رک جائیں اور وہ ہمارے دین میں داخل ہوجائیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

"کیا نہیں جنگ کرو گے تم اس قوم کے ساتھ جنہوں نے توڑ ڈالا اپنی قسموں کو اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکال دینے کا اور انہی نے آغاز کیا تھا تم پر (زیادتی کا) پہلی مرتبہ، کیا تم ڈرتے ہو ان سے (سنو!) اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر ہو تم (سچے) ایمان دار"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور اس میں تحضیض کا معنی ہے۔ یہ آیت کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ یعنی نکلنے کا سبب ان کی طرف سے تھا۔ پس نکالنے کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے اہل مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکالا اس معاہدہ کو توڑنے کی وجہ سے جسے انہوں نے توڑا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اور انہوں نے ہی تم سے لڑنے کا آغاز کیا۔ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی انہوں نے معاہدہ توڑا اور بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کر دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر کے دن انہوں نے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کا آغاز کیا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو قافلے کے لیے نکلے تھے اور جب انہوں نے اپنا قافلہ بچا لیا تو ان کے لیے واپس لوٹنا ممکن تھا، لیکن انہوں نے بدر تک پہنچے اور وہاں شراب پینے کے بغیر واپس جانے سے انکار کر دیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم ان کے ساتھ قتال ترک کرنے کی صورت میں اس کی سزا سے ڈرو، اس سے کہ تم ان کے ساتھ لڑنے کی صورت میں کسی تکلیف اور ضرر کے پہنچنے سے ڈرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے سے مراد ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج، عمرہ اور طواف سے روکنا ہے اور یہی ان کی طرف سے ابتدا تھی۔ واللہ اعلم

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''جنگ کرو ان سے عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے اور رسوا کرے گا انہیں اور مدد کرے گا تمہاری ان کے مقابلے میں اور (یوں) صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔ اور (یوں) دور فرما دے گا غصہ ان کے دلوں کا اور اپنی رحمت سے توجہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوْهُمْ یہ امر ہے (یعنی تم ان سے جنگ کرو) یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ یہ جواب امر ہے۔ اور اس کی جزم بمعنی مجازات ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: إن تقاتلوهم يعذبهم الله...... الآیہ (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور یوں صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کا غصہ انتہائی شدید تھا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد خزاعہ قبیلے والے ہیں جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف تھے اور یہ سب معطوف ہے۔ اور اس میں یہ بھی جائز ہے کہ پہلی کلام سے منقطع ہونے کی وجہ سے یہ سب مرفوع ہوں۔ اور اس میں أن کو مضمر ماننے کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے کوفیوں کا موقف یہی ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فإن يَهلِكْ أبو قابوس يَهلِكْ　　رِبيعُ الناس والشهرُ الحرامُ
و نأخذ بعده بِذِناب عيش　　أَجَبِّ الظهر ليس له سَنام

اس میں اگر آپ چاہیں تو و ناخذ کو رفع دیں اور اگر چاہیں تو اسے نصب دیں۔(1)

اور قول باری تعالیٰ: وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ میں مراد بنو خزاعہ ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے، کیونکہ قریش نے ان کے خلاف بنی بکر کی مدد کی اور بنی خزاعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف تھے۔ بنی بکر کے کسی آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو بیان کی، تو خزاعہ میں سے کسی نے اسے کہا: اگر تو نے دوبارہ ایسا کیا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ چنانچہ اس نے اس کا اعادہ کیا اور اس نے اس کا منہ توڑ دیا اور ان کے درمیان جنگ بھڑک اٹھی۔ اور انہوں نے خزاعہ قبیلے کے کئی افراد قتل کر دیئے۔ پس عمرو بن سالم خزاعی ایک جماعت کے ہمراہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے بارے اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہوئے اور فرمایا: ''مجھ پر پانی انڈیلو''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل کرتے رہے اور یہ کہنے لگے: ''میری مدد نہیں کی جائے گی اگر میں نے بنی کعب کی مدد نہ کی''۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کی تیاری کی اور مکہ مکرمہ کی طرف خروج کا حکم ارشاد فرمایا نتیجۃً مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

قولہ تعالیٰ: وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ رفع کے ساتھ قراءت استیناف کی بنا پر ہے، کیونکہ یہ پہلی کلام کی جنس میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزم کے ساتھ ویتب نہیں کہا۔ کیونکہ جنگ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کو ان کے لیے ثابت نہیں کرتی، بلکہ یہ تو ان کے لیے عذاب اور رسوائی ہے اور مومنین کے سینوں کے لیے شفا اور ان کے دلوں سے غصے کو نکالنے اور دور

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 205

کرنے کا موجب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے۔ فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ (الشوریٰ:24) کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا وَ یَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ:24) (اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو)

اور وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے توجہ فرمائی مثلاً ابو سفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور سلیم بن ابی عمرو کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ابن ابی اسحاق نے ویتوب نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح عیسیٰ الثقفی اور اعرج سے مروی ہے۔ اور اس بنا پر توبہ جواب شرط میں داخل ہوگی، کیونکہ معنی یہ ہے: ان تقاتلوھم یعذبھم اللہ اور اسی طرح وہ ہیں جو اس پر معطوف ہیں۔ پھر فرمایا: وَ یَتُوْبُ اللّٰهُ، ای ان تقاتلوھم (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر توجہ فرمائے گا) پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھوں کے ساتھ انہیں عذاب دینے، تمہارے سینوں کو شفا دینے، تمہارے دلوں سے غصہ دور کرنے اور تم پر توجہ دینے کو جمع کر دیا۔ اور رفع پڑھنا احسن ہے، کیونکہ توبہ کا سبب قتال نہیں ہے، کیونکہ کبھی یہ بغیر قتال کے بھی پایا جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اس پر ہر حال میں توجہ دے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تک پہچان نہیں کرائی اللہ نے ان کی جو جہاد کریں گے تم سے اور جنہوں نے نہیں بنایا بغیر اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے (کسی کو اپنا) محرم راز، اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو تم کرتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: اَمْ حَسِبْتُمْ ایک شے سے دوسری شے کی طرف خروج ہے۔ اَنْ تُتْرَكُوْا یہ سیبویہ کے قول کے مطابق دو مفعولوں کے محل میں ہے۔ اور مبرد کے نزدیک دوسرا مفعول حذف کر دیا گیا ہے(1)۔ اور کلام کا معنی ہے: أم حسبتم أن تتركوا من غير أن تبتلوا بما يظهر به المؤمن والمنافق الظهور الذی يستحق به الثواب والعقاب (کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں اس کے بغیر ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ تم ایسی شے کے ساتھ آزمائے جاؤ جس کے ساتھ مومن اور منافق اس طرح ظاہر ہو جاتے ہیں جس کے سبب وہ ثواب و عقاب کے مستحق بنتے ہیں) یہ معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لَمَّا یَعْلَمِ اس کی جزم لما کے سبب ہے اگرچہ ما زائدہ ہے، کیونکہ سیبویہ کے نزدیک یہ تیرے اس قول کا جواب ہوتا ہے: قد فعل، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ دیا گیا ہے۔ ولیجۃ ہمراز، اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ یہ دلوج سے ہے اور اس کا معنی داخل ہونا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کچھار جس میں وحشی جانور داخل ہوتے ہیں اس کا نام تولج رکھا گیا ہے۔ ولج یلج ولوجا جب وہ داخل ہو۔ اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بغیر کسی کی محبت و مودت میں داخل ہونے والا۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: ہر وہ شے جسے تو ایسی شے میں داخل کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہی ولیجہ ہے۔ اور آدمی کسی قوم

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 206

میں شامل ہو حالانکہ وہ ان سے نہ ہو تو وہ ولیجة ہوتا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ولیجه کا معنی دخیله (اندرونی معاملات میں داخل ہونے والا) ہے اور الولجاء کا معنی الدخلاء ہے۔ پس ولیجة الرجل وہ ہوتا ہے جو عام لوگوں کے سوا کسی کے اندرونی معاملات کے لیے مختص ہو یعنی محرم راز۔ تو کہتا ہے: ھو ولیجتی (وہ میرا محرم راز ہے) اور ھم ولیجتی اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں۔ ابان بن تغلب رحمہ اللہ نے کہا ہے:

فبئس　الولیجة　للهاربین　والمعتدین　واهل　الرِّیَب

پس بھاگنے والوں اور ظلم و زیادتی کرنے والوں اور شک کرنے والوں کی نیت اور ان کا اندر کتنا برا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ وَلِيْجَةً کا معنی بطانة ہے۔ اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ اس کی نظیر لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران: 118) ہے (نہ بناؤ اپنا رازدار غیروں کو) اور فراء نے کہا ہے: وَلِيْجَةً سے مراد مشرکین میں سے محرم راز جنہیں وہ بناتے ہیں اور وہ ان کے اسرار و رموز ان کے پاس افشاء کر دیتے ہیں اور ان کے معاملات کے بارے انہیں آگاہ کر دیتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

"نہیں ہے روا مشرکوں کے لیے کہ وہ آباد کریں الله کی مسجدوں کو حالانکہ وہ خود گواہی دے رہے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی یہ وہ (بدنصیب) ہیں ضائع ہو گئے جن کے تمام اعمال اور (دوزخ کی) آگ میں ہی یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ، اَنْ يَّعْمُرُوْا سے جملہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ شٰهِدِيْنَ حال ہے۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد ان کے لیے کوئی حج نہیں جب ان میں مسجد حرام سے روکنے کے بارے اعلان کر دیا گیا ہے۔ اور بیت الله شریف کے امور مثلاً خدمت کرنا، پانی پلانا اور نیابت کی ذمہ داری ادا کرنا مشرکین کے سپرد تھے، تو یہ بیان کر دیا کہ وہ اس کے اہل نہیں، بلکہ اس کے اہل مومن ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو (اسلام قبول کرنے سے قبل غزوہ بدر میں) جب قید کیا گیا اور انہیں کفر اور قطع رحمی کی عار دلائی گئی تو انہوں نے کہا: تم ہماری برائیاں تو ذکر کرتے ہو اور ہمارے محاسن اور خوبیاں ذکر نہیں کرتے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمہارے محاسن بھی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں بے شک ہم مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کعبہ معظمہ کی خدمت اور دربانی کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور مشقت میں پھنسے ہوئے اور تکلیف زدہ کو رہائی دلاتے ہیں۔ تو یہ آیت اس کے رد میں نازل ہوئی۔

پس تب مسلمانوں پر مساجد کے احکام کی تولیت واجب ہو گئی اور مشرکوں کو ان میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ اس میں عام قراءت یعمر یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ عمر یعمر سے ماخوذ ہے۔ ابن السمیقع نے یا کو ضمہ اور میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی (مشرکین کے لیے نہیں کہ) وہ اسے آباد کرنے والے یا اس کی آبادی اور تعمیر پر معاونت کرنے والے

ہوں۔ اور مَسْجِدَ اللّٰهِ واحد کی صورت میں بھی قراءت کی گئی ہے۔ مراد مسجد حرام ہے۔ اور یہ قراءت حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، ابن کثیر، ابو عمرو، ابن محیصن اور یعقوب رحمہم اللہ کی ہے۔ اور باقیوں نے مَسٰجِدَ تعمیم کی صورت میں قراءت کی ہے۔ اور یہی ابو عبید کی پسند ہے، کیونکہ اعم اور اخص عام کے تحت داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جمع کی قراءت سے بھی صرف مسجد حرام مراد ہو۔ اور یہ ان میں جائز ہے جو اسماء جنس میں سے ہو، جیسے کہا جاتا ہے: فلاں یرکب الخیل اگرچہ وہ سوار تو صرف ایک گھوڑے پر ہوا۔ اور مساجد پڑھنا زیادہ درست ہے، کیونکہ یہ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ میں جمع کی قراءت پر قراء نے اجماع کیا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: بے شک مساجد کہا ہے اور مراد مسجد حرام ہے، کیونکہ وہ تمام مساجد کا قبلہ اور ان کی امام ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: شٰهِدِيْنَ کہا گیا ہے کہ مراد وهم شاهدون به (درآنحالیکہ وہ شہادت دیتے ہیں) اور جب هم کو گرادیا گیا تو اسے (یعنی شاهدين) کو منصوب پڑھا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی اپنے نفسوں پر کفر کی گواہی ان کا اپنے بتوں کو سجدہ کرنا ہے(2) اور ان کا یہ اقرار کرنا ہے کہ وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کی کفر کے بارے شہادت یہ ہے کہ تو نصرانی کو کہتا ہے تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: نصرانی اور یہودی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: یہودی اور صابی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: صابی۔ اور کسی مشرک کو کہا جائے: تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: مشرک۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸

''صرف وہی آباد کرسکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہو اللہ کے سوا کسی سے پس امید ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں ہدایت پانے والوں سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ یہ اس پر دلیل ہے کہ مساجد کو آباد کرنے والوں کے لیے ایمان کی شہادت دینا صحیح ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اس کے ساتھ ہی مربوط کیا ہے اور اسی کے بارے مساجد کو لازم پکڑنے کی خبر دی ہے۔ اور بعض سلف نے کہا ہے: جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد آباد کر رہا ہے تو تم اس کے ساتھ حسن ظن رکھو۔ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد کے اہتمام کا عادی ہے تو تم اس کے لیے ایمان کی شہادت دو''۔(3) (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ

1۔ تفسیر بغوی　　2۔ ایضاً

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، حدیث نمبر 2542، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب لزوم المساجد وانتظار الصلاة، حدیث نمبر 793، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور ایک روایت میں ہے ''وہ مسجد کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتا ہے'' فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ظاہر اُدرست اور صحیح ہونے کے بارے میں ہے شہادت کے قطعی مقام کے بارے میں نہیں ہے، کیونکہ عارفین کے نزدیک شہادت کے مختلف احوال ہیں، کیونکہ ان میں کوئی انتہائی ذہین وفطین ہوتا ہے وہ ایسی شے کو حاصل کر لیتا ہے جس سے اسے کسی چیز کے اعتقاد اور خبر کا علم ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے بعض اس سے عاری ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے مقام اور مرتبہ پر ہوتا ہے اور اپنے وصف پر قائم ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ اگر کہا جائے: کوئی مومن نہیں ہے مگر وہ غیر اللہ سے ڈرتا ہے۔ اور مومنین اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اپنے سواد شمن سے ڈرتے رہے۔ تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اس کا معنی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان میں سے کسی سے نہ ڈرتا ہو جن کی عبادت کی جاتی ہے، کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان سے ڈرتے بھی ہیں اور ان سے امیدیں بھی وابستہ رکھتے ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ دین کے باب میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈرتا ہو۔ (1)

مسئلہ نمبر 3۔ اور کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آیت میں ان کے لیے ایمان ثابت کیا ہے جنہوں نے مساجد کو نماز کے ساتھ، ان کی صفائی اور ان کی کسی بوسیدہ چیز کی مرمت اور اصلاح کر کے آباد کیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا۔ اور اس میں ایمان بالرسول کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس کا کوئی ایمان نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان نہیں لایا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: آیت میں جو اقامت صلوٰۃ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے وہی ایمان بالرسول پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ پس نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بلاشبہ اس کی طرف سے صحیح ہوتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو۔ پس اسی لیے اسے علیحدہ ذکر نہیں کیا اور عسیٰ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب (اور ثابت) کے معنی میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عسیٰ بمعنی خلیق ہے اسی فخلیق۔ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (پس لائق اور مناسب ہے کہ وہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞

''کیا تم نے ٹھہرا لیا ہے حاجیوں کو پانی پلانے (والے) کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے (والے) کو اس شخص کی مانند جو ایمان لے آیا اللہ پر اور روز قیامت پر اور جہاد کیا اس نے اللہ کی راہ میں۔ وہ نہیں یکساں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ان لوگوں کو جو ظالم ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ عربی میں تقدیر یہ ہے: أجعلتم أصحاب سقاية الحاج أو أهل سقاية الحاج، مثل من أمن بالله و جاهد في سبيله (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والوں کو ان کی مثل بنا لیا ہے جو اللہ

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 436
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 376

تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا) اور صحیح یہ ہے کہ من امن میں حذف کو مقدر مانا جائے یعنی أجعلتم عمل سقی الحاج کعمل من أمن (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے کے عمل کو ایمان لانے والے کے عمل کی مثل بنا لیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام ہے کایمان من آمن (یعنی اس کے ایمان کی مثل جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا) السقایة یہ مصدر ہے جیسا کہ السعایة اور الحمایة مصدر ہیں۔ اور اسم کو مصدر کے محل میں رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کا معنی معلوم ہے، جیسے کہا جاتا ہے: انما السخاء حاتم، وانما الشعر زهیر (بلاشبہ سخاوت تو حاتم کی ہے اور شعر زہیر کا ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ عمارة المسجد الحرام، واسأل القریة کی مثل ہے۔ ابو وجزہ نے أجعلتم سقاة الحاج و عمرة المسجد الحرام پڑھا ہے۔

سقاة، ساق کی جمع ہے۔ اور اصل میں یہ سقیة ہے یہ فُعلته کے وزن پر ہے، اس سے معتل کی جمع اسی طرح بنائی جاتی ہے، جیسے قاض کی جمع قضاة اور ناس کی جمع نساة ہے۔ اور اگر یہ معتل نہ ہو تو فعلة کے وزن پر جمع بنائی جائے گی جیسے اسی کی جمع نساة ہے، یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مہینوں میں نسی کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح ابن زبیر اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے سقاة و عمرة پڑھا ہے، مگر ابن جبیر نے عمرة میں تنوین کے ارادہ پر المسجد کو نصب دی ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سقایة سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور الحاج، الحجاج کی اسم جنس ہے۔ اور عمارة المسجد الحرام سے مراد اس کی حفاظت، دیکھ بھال اور اس کے مصالح کا اہتمام کرنا ہے۔

اس آیت کا ظاہر بلاشبہ اس کے قول کو باطل کرتا ہے مشرکین میں سے جس نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے پر فخر کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام اور جہاد کے ساتھ اظہار فخر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصدیق کر دی اور ان دونوں کو جھٹلا دیا اور یہ خبر دے دی کہ مسجد کی آبادی کفر کے ساتھ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ایمان، عبادت اور طاعت و فرمانبرداری کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور یہ اتنا بین اور واضح ہے جس پر کوئی غبار نہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ مشرکوں نے یہودیوں سے سوال کیا اور کہا: ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کیا ہم افضل ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب؟ تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عناد رکھنے کی وجہ سے انہیں کہا: تم افضل ہو۔ اور یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر شریف کے پاس تھا تو ایک آدمی نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں حاجیوں کو پانی پلاؤں۔ اور دوسرے نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں مسجد حرام کو آباد کرتا رہوں۔ اور ایک تیسرے نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اس سے افضل ہے جو تم نے کہا ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر کے پاس اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ اور وہ جمعہ کا دن تھا۔ لیکن جب جمعہ کی نماز پڑھ لی گئی تو میں آپ کے پاس داخل ہوا اور آپ سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا جس میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ الی آخر الآیہ

اور یہ سیاق تقاضا کرتا ہے کہ بے شک یہ آیت مسلمانوں کے ان اعمال میں سے افضل کے بارے اختلاف کے وقت نازل ہوئی۔ اور اس وقت یہ مناسب نہیں کہ ان کے لیے آیت کے آخر میں یہ کہا جائے: وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ پس اشکال متعین ہو گیا۔ اور اس کا ازالہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا: بے شک بعض راویوں سے اپنے اس قول فانزل اللہ الآیۃ (پس اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی) میں تسامح ہوا ہے۔ بلاشبہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس وقت یہ آیت پڑھی جس وقت انہوں نے آپ کے سامنے عرضداشت پیش کی تو اس سے راوی کو یہ گمان ہوا کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔ اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جہاد اس سے افضل ہے جو ان لوگوں نے کہا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا اور ان کے لیے فتویٰ طلب کیا اور تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ پر وہ آیت تلاوت فرمائی جو آپ پر نازل کی گئی تھی، نہ یہ کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم

پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس بنا پر تو مسلمانوں پر استدلال کرنا اس سے جائز ہوا جو کافروں کے بارے نازل کیا گیا اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اس کے احکام مختلف ہیں۔ تو کہا جائے گا: یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مشرکوں کے بارے میں نازل کیا ہے اس سے وہ احکام نکال لیے جائیں جو مسلمانوں کے لائق اور مناسب ہوں۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک اگر ہم چاہیں تو ہم بھنا ہوا گوشت لے لیں اور اسے بڑے پیـ ـلے میں کھ دیا جائے اور دوسرے کو پیش کر دیا جائے، لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن رکھا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھا لیا تھا تم نے ان سے) ور یہ آیت ر کے بارے میں نص ہے اور اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اس زجر و توبیخ کے حکم کو سمجھ لیا جو من وجہ ان کے احوال سے مناسبت رکھتا تھا اور صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پس یہ ممکن ہے کہ یہ آیت اسی نوع سے ہو۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس ہے اور اس سے اشکال زائل ہو جاتا ہے اور ابہام اٹھ جاتا ہے، واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰

”جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، بہت بڑا ہے (ان کا) درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ اور یہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ اور دَرَجَةً بیان (اور تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے (1)، یعنی (ان کا درجہ ان کی نسبت بہت بڑا ہے) جنہوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کو آباد کرنے کے ساتھ فخر کیا۔ اور کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی درجہ نہیں کہ کہا جائے: المومن اعظم درجۃ (کہ مومن درجہ کے اعتبار سے بہت بڑا ہے) اور مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لیے مسجد کو آباد کرنے اور حاجیوں

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 207

کو پانی پلانے کے سبب ایک درجہ اور رتبہ کا اندازہ لگایا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر خطاب کیا جو انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں اندازہ لگایا اگرچہ وہ اندازہ مقرر کرنا غلطی اور خطا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَعْظَمُ دَرَجَةً، من کل ذی درجة یعنی ان کا درجہ ہر صاحب درجہ سے زیادہ اور بلند رتبہ ہے۔ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفَآىٕزُوْنَ اور یہی ہیں جو اس کے سبب کامیاب ہونے والے ہیں۔

یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۲﴾

"خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور (ایسے) باغات کی کہ ان کے لیے ان میں دائمی نعمت ہوگی۔ ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ اس میں تا ابد، بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی اجر عظیم ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں بتا رہا ہے اس بہت بڑے ثواب اور ہمیشہ رہنے والی نعمت کے بارے جو آخرت میں ان کے لیے ہوگی۔ اور نعیم سے مراد زندگی کا پرسکون اور خوشحال ہونا ہے۔ خٰلِدِیْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ اور الخلود کا معنی مقیم رہنا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے دار کرامت میں وہ ثواب تیار کر رکھا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اے ایمان والو! نہ بنالو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دلی دوست اگر وہ پسند کریں کفر کو ایمان پر اور جو دوست بناتا ہے انہیں تم میں سے تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں"۔

اس آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب تمام کے تمام مومنوں کے لیے ہے اور مومنوں اور کافروں کے مابین ولایت کو منقطع کرنے والا یہ حکم یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اور ایک جماعت نے یہ روایت کیا ہے کہ یہ آیت بلاشبہ ہجرت پر ابھارنے کے لیے اور کافروں کے شہروں کو چھوڑنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر یہ خطاب ان مومنوں کے لیے ہے جو مکہ مکرمہ اور اس کے علاوہ بلاد عرب میں سے دیگر شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں خطاب کیا گیا کہ وہ باپوں اور بھائیوں کو والی اور دوست نہ بنالیں کہ وہ بلاد کفر میں رہائش کے دوران ان کے تابع ہو جائیں۔ (1)

اِنِ اسْتَحَبُّوا یعنی اگر وہ پسند کریں: (اس میں استحبوا بمعنی احبوا ہے) جیسے کہا جاتا ہے: کہ استجاب بمعنی اجاب ہے۔ یعنی تم ان کی اطاعت نہ کرو اور نہ تم انہیں خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آباء اور بھائیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ان سے بڑھ کر اور کوئی قریب تر قرابت نہیں۔ پس ان کے درمیان موالات اور دوستی کی نفی ایسی ہی ہے جیسے لوگوں کے درمیان اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17

تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اس کی نفی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ (المائدہ: 51)
تا کہ وہ یہ بیان کر دے کہ بے شک حقیقی قرب ادیان کا قرب ہے نہ کہ ابدان کا قرب۔ اور اس کی مثل میں صوفیہ کہتے ہیں:

يقولون لی دار الأحبة قد دنتْ   وأنت كئيبٌ إنّ ذا لعجيب

وہ مجھے کہتے ہیں محبوبوں کی بستی قریب ہے اور تو غمگین ہے بے شک یہ عجیب بات ہے۔

فقلت وما تغنى ديارٌ قريبة   إذا لم يكن بين القلوب قريب

تو میں نے کہا: گھروں کا قریب ہونا کیا فائدہ دے سکتا ہے جب دلوں کے درمیان قرب اور نزدیکی نہ ہو۔

فكم من بعيد الدار نال مُرادَه   و آخر جارُ الجَنْب مات كئيب

پس کتنے دور رہنے والے ہیں کہ اس نے اپنا مقصود پا لیا ہے اور دوسرا پہلو میں رہنے والا پڑوسی غمزدہ حالت میں مایوس ہو کر مر گیا۔

اس آیت میں بیٹوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ انسانوں میں اغلب یہی ہے کہ بیٹے باپوں کے تابع ہوتے ہیں (1)۔ اور احسان اور ہبہ ولایت سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک میری ماں انتہائی رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی اور وہ مشرک ہے کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلی أملك تو اپنی ماں سے مل (حسن سلوک سے پیش آ) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (2)۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اور جو تم میں سے انہیں دوست بناتا ہے) وہ انہی کے مثل مشرک ہے، کیونکہ جو شرک کے ساتھ راضی ہوا تو وہ مشرک ہی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾

"(اے حبیب!) آپ فرمایئے: اگر ہیں تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو نافرمان ہے"۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو ایک آدمی اپنے باپ کو اور باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو اور آدمی اپنی بیوی کو کہنے لگا: بے شک ہمیں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے۔ تو ان میں سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17   2۔ صحیح بخاری، باب صلة المرأة امها ولها زوج، حدیث نمبر 5521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بعض نے اس کے لیے تیزی اور جلدی کی۔ اور بعض نے ہجرت کرنے سے انکار کیا۔ تو وہ کہتا: قسم بخدا! اگر تم دار الہجرت کی طرف نہ نکلے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں دوں گا اور نہ تم پر کبھی کوئی شی خرچ کروں گا۔ اور ان میں سے وہ بھی تھے جس کے ساتھ اس کی بیوی اور اولاد چمٹ گئی اور وہ اسے کہنے لگے: میں تجھے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو نہ نکل پس تیرے بعد ہم ضائع ہو جائیں گے۔ پھر ان میں سے بعض تھے جو نرم ہو گئے اور انہوں نے ہجرت کو چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ مقیم ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ رب کریم فرما رہا ہے: اگر انہوں نے مکہ مکرمہ میں رہنے کو پسند کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے پر وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں) پھر جو پیچھے رہ گئے اور انہوں نے ہجرت نہ کی ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ اور یہ (عشیرہ) وہ جماعت ہے جو ایک عقد کی طرف راجع ہو جیسے دس یا زیادہ افراد کا عقد کرنا۔ اور اسی سے المعاشرہ ہے اور اس کا معنی کسی شے پر جمع ہونا ہے۔ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وہ فرما رہا ہے: اور وہ اموال جو تم نے مکہ مکرمہ میں کمائے۔ اور اقتراف کا اصل معنی کسی شے کا اپنی جگہ سے دوسرے کی طرف کٹ جانا، منتقل ہو جانا ہے۔

وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بیٹیاں اور بہنیں ہیں جب گھر میں ان کا مندا ہو جائے تو وہ اپنے لیے کوئی دعوت نکاح دینے والا نہیں پاتیں۔ شاعر نے کہا ہے:

کَسَدْنَ من الفقر فی قومهنّ　　وقد زادهنّ مقامی کُسودا

وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ وہ فرما رہا ہے: اور وہ گھر جن میں اقامت اختیار کرنا تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔

اَحَبَّ اِلَیْكُمْ (یہ تمہارے نزدیک زیادہ محبوب ہو جائے) اس سے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ طیبہ میں ہجرت کرو۔ واحب یہ کان کی خبر ہے اور غیر قرآن میں مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر أحب کو مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے، اور کان کا اسم اس میں مضمر ہے، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

إذا متُّ کان الناسُ صنفان شامِتٌ　　وآخَرُ مُثْنٍ بالذی کنتُ أصنَعُ

هی الشفاء لدائی لو ظَفِرتُ بها　　ولیس منها شفاءُ الداء مبذول

اور آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واجب ہے اور امت کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ کہ یہ ہر محبوب پر مقدم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا معنی و مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا اس میں تربصوا صیغہ امر ہے اور اس کا معنی تہدید ہے۔ وہ فرما رہا ہے: پس تم انتظار کرو۔ حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قتال اور فتح مکہ کے بارے حکم لے آئے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

حسن نے کہا ہے: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اخروی یا دنیوی سزا کا حکم لے آئے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ میں فضیلت جہاد پر دلیل ہے اور اسے راحت نفس اور اسے اہل و مال کے ساتھ چمٹائے رکھنے پر ترجیح دینے پر دلیل ہے۔ سورت کے آخر میں جہاد کی فضیلت کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہجرت سے متعلقہ احکام سورۃ النساء میں گزر چکے ہیں اور وہ کافی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور حدیث صحیح میں ہے "بے شک شیطان ابن آدم کے لیے تین مقامات پر بیٹھا وہ اس کے لیے اسلام کی راہ میں بیٹھا اور کہا: تو اپنا دین اور اپنے آباؤ اجداد کا دین کیوں چھوڑتا ہے؟ تو اس نے اس کی مخالفت کی اور اسلام قبول کر لیا پھر وہ اس کے لیے ہجرت کی راہ میں بیٹھا، کیا تو اپنے مال اور اپنے گھر والوں کو چھوڑتا ہے؟ پس اس نے اس کی مخالفت کی اور ہجرت کی۔ پھر وہ جہاد کے راستے میں بیٹھا اور اسے کہا: تو جہاد کرے گا تو تو قتل کر دیا جائے گا اور تیری بیوی (نیا) نکاح کرے گی اور تیرا مال تقسیم کر دیا جائے گا، تو اس نے اس کی مخالفت کی اور جہاد کیا، پس اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے"۔ امام نسائی نے اسے سبرہ بن ابی فاکہ کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الشیطان...... اور آگے مذکورہ حدیث ذکر کی ہے۔ بخاری نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور اس میں اختلاف ذکر نہیں کیا۔ اور ابن ابی عدی نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور ابن ابی الفاکہ کہا جاتا ہے۔ انتہی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾

"بے شک مدد فرمائی تمہاری اللہ نے بہت سے جنگی میدانوں میں اور حنین کے روز بھی، جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) کچھ بھی اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے، پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ پھر نازل فرمائی اللہ نے اپنی (خاص) تسکین اپنے رسولوں پر اور اہل ایمان پر اور اتارے وہ لشکر جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے کافروں کی۔ پھر رحمت سے توجہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ جب بنی ہوازن کو مکہ مکرمہ فتح ہونے کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری جو بنی نصر بن مالک میں سے تھا، نے انہیں جمع کیا اور تمام لشکر میں ریاست و حکومت اسی کی تھی اور وہ کفار کو ان کے مالوں، مویشیوں، عورتوں اور ان کی اولاد سمیت ساتھ لے کر چلا۔ اور اس کا خیال یہ تھا کہ اس کے سبب ان

کی جائیں محفوظ رہیں گی اور اس طرح جنگ میں ان کی قوت و طاقت انتہائی مضبوط ہوگی۔ حضرت حسن اور مجاہد رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ہوازن وثقیف میں سے چار ہزار تھے۔ اور ہوازن پر مالک بن عوف اور ثقیف پر کنانہ بن عبد سالار تھا۔ پس وہ اوطاس میں اترے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے (یعنی جاسوسی کرنے کے لیے) بھیجا پس وہ آئے اور جو کچھ ان کے بارے میں دیکھا تھا اس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے پختہ عزم کیا۔ اور صفوان بن امیہ بن خلف جمحی سے کچھ زرہیں عاریۃً لیں، کہا گیا ہے کہ وہ سو زرہیں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ چار سو زرہیں تھیں۔ اور ربیعہ مخزومی سے تین ہزار یا چالیس ہزار قرض لیے، پھر جب آپ آئے تو آپ نے اسے وہ ادا کر دیئے۔ پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھے تیرے گھر والوں میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ بے شک قرض کی جزا اور بدلہ اسے پورا کرنا اور شکر ادا کرنا ہے'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار مسلمانوں کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ ان میں سے دس ہزار وہ صحابہ کرام تھے جو مدینہ طیبہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے اور یہ اس کے بارے میں آزاد تھے جو کوئی اعرابیوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ملا۔ یہ سلیم بن کلاب، عبس اور ذبیان میں سے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر عامل مقرر کیا۔ اور آپ کے اس سفر کے دوران جاہل اعرابیوں نے ایک سرسبز شاداب درخت دیکھا اور ان کے لیے زمانہ جاہلیت میں معروف درخت تھا اس کا نام ذات انواط تھا۔ کفار سال میں ایک معین دن میں اس کی طرف نکلتے تھے اور وہ اس کی تعظیم بجا لاتے تھے۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے بھی اسی طرح ایک ذات انواط بنا دیجئے جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اکبر قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم نے اس طرح کہا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا (کہ) ہمارے لیے الٰہ بنا دیجئے جیسے ان کے لیے الٰہ ہیں تو فرمایا: بلاشبہ تم جاہل قوم ہو تو یقیناً تم بھی برابر برابر اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو تم بھی اس میں داخل ہو گے''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے یہاں تک کہ آپ وادی حنین میں آ گئے۔ اور یہ تہامہ کی وادیوں میں سے ہے اور ہوازن وادی کی دونوں طرفوں میں چھپے ہوئے تھے اور یہ صبح کے وقت آخر شب کی تاریکی میں تھے، پس انہوں نے ایک آدمی کی طرح یکبارگی مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور جمہور مسلمان پسپا ہو گئے اور کسی نے کسی کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت قدم رہے اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور آپ کی اہل بیت میں سے حضرت علی، حضرت عباس، ابو سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے حضرت جعفر اور حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمن بن عبید اور وہ ایمن بن ام ایمن تھے جو اس دن حنین میں شہید ہوئے۔ اور حضرت ربیعہ ابن حارث اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہم بھی ثابت قدم رہے۔ اور جعفر بن ابی سفیان کی جگہ میں قثم بن عباس بھی کہا

1۔ سنن ابن ماجہ، باب حسن القضاء، حدیث نمبر 2414، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گیا ہے۔ پس یہ دس افراد تھے۔ اسی لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا:

نصرنا رسولَ الله فی الحرب تسعۃً　وقد فرّ مَن قد فرّ عنه وأقشعوا

ہم نو نے جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی حالانکہ جو آپ سے بھاگ گئے وہ بہت دور چلے گئے۔

وعاشرنا لاقی الحمام بنفسه　بما مسّه فی الله لا یتوجّع

اور ہم میں سے دسویں کی ذات نے موت سے جا ملاقات کی اس تکلیف کے سبب جو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں آئی اور اس نے کوئی درد محسوس نہیں کیا۔

ام سلیم بھی ان تمام کے ساتھ ثابت قدم رہی جو ثابت قدم رہے، درآنحالیکہ وہ حضرت ابوطلحہ کے اونٹ کی رسی کو کمر سے باندھ کر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسپا نہیں ہوئے اور نہ ہی ان میں کوئی پسپا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شہباء خچر پر سوار تھے اور اس کا نام دلدل تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھا اور میں اس ارادے سے اسے روکتا تھا کہ وہ تیز نہ چلے اور ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عباس! ببول کے درخت والوں کو بلاؤ'' (مراد اصحاب شجرہ ہیں جو بیعت رضوان میں شریک تھے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ بہت بلند آواز والے آدمی تھے۔ اور آپ کی آواز کی شدت کے بارے روایت کیا جاتا ہے کہ ایک دن مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیا گیا تو انہوں نے آواز لگائی واصباحاہ! تو جس حاملہ عورت نے آپ کی آواز سنی اس نے اپنا جنین گرا دیا۔ پس میں نے بلند آواز کے ساتھ کہا: اصحاب شجرہ کہاں ہیں؟ آپ فرماتے ہیں: قسم بخدا! جس وقت انہوں نے میری آواز سنی تو وہ اس کی طرف مائل ہوئے اور لپک کر آئے جیسے گائے اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا: یا لبیک یا لبیک (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) انہوں نے بیان کیا: پھر وہ کفار کے ساتھ لڑنے میں مشغول ہو گئے الحدیث (1)۔

اور اس میں ہے: فرمایا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگریزے اٹھائے اور انہیں کفار کے چہروں پر پھینک دیا''۔ پھر فرمایا: ''حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم وہ شکست کھا گئے''۔ فرمایا پس میں دیکھتا چلا گیا تو جنگ اپنی اسی ہیئت پر تھی جس میں میں اسے دیکھتا رہا۔ فرمایا: قسم بخدا! وہ نہیں ہوا مگر ان سنگریزوں کے سبب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پھینکے۔ پس میں مسلسل ان کی تیز دھار تلواروں کو کند ہوتا اور ان کے معاملے کو پیٹھ پھیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ابوعمرو نے کہا ہے: ہم نے کئی اسناد سے ان بعض افراد سے روایت بیان کی ہے جو مشرکین میں سے اسلام لائے تھے اور غزوۂ حنین میں حاضر تھے کہ انہوں نے بیان کیا درآنحالیکہ ان سے غزوۂ حنین کے بارے پوچھا گیا: ہم مسلمانوں سے ملے (مقابلہ کیا) زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہم نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا اور ہم نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ ہم اس آدمی تک پہنچ گئے جو سفید خچر پر سوار تھا، پس جب اس نے ہمیں دیکھا تو اس نے ہمیں سخت جھڑکا اور ہم سہم گئے، خوفزدہ ہو گئے اور اس نے اپنی ہتھیلی میں کنکریاں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1775

اور مٹی اٹھائی اور اسے پھینک دیا اور زبان سے فرمایا: شاھت الوجوہ (چہرے بدشکل ہوں)

پس کوئی آنکھ نہ بچی جس میں وہ مٹی داخل نہ ہوئی ہو اور ہم اپنے نفسوں کے مالک نہ رہے کہ ہم الٹے پاؤں واپس لوٹ جائیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہمیں مشرکوں میں سے ایک آدمی نے حنین کے دن کے بارے بیان کیا کہ جب ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے آمنا سامنا ہوا تو وہ بکری دوہنے کی مقدار بھی ہمارے سامنے نہ ٹھہرے، یہاں تک کہ جب ہم شہباء خچر والے...... یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... کے پاس پہنچے تو سفید چہروں والے خوبصورت آدمی ہمارے سامنے آگئے۔ اور انہوں نے ہمارے لیے کہا: شاھت الوجوہ واپس لوٹ جاؤ، پس ہم واپس لوٹ گئے اور وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے اور وہ وہ تھے یعنی ملائکہ تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ شاھت الوجوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول بھی ہو اور ملائکہ کا قول بھی ہو اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ملائکہ نے حنین کے دن جنگ لڑی۔ فاللہ اعلم۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ حنین میں اپنے ہاتھ سے چالیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار ہزار افراد کو قیدی بنایا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ قیدی چھ ہزار تھے اور بارہ ہزار اونٹ تھے یہ اس کے سوا ہے جو مال غنیمت معلوم نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس غزوہ کے بارے میں علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی آدمی کو قتل کیا اور اس کے پاس اس پر بینہ موجود ہو تو اس سے چھینا ہوا مال اسی کے لیے ہوگا''۔ اور اس کا بیان سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی نکتہ اور دیگر قرائن کی وجہ سے احکام بیان کرنے والوں نے اس آیت کو احکام میں داخل کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس میں یہ بھی ہے کہ ہتھیار عاریۃً لینا جائز ہے، عاریۃً لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس معہود کی مثل ہو جس کے لیے عاریۃً لیا جا سکتا ہو اور امام کا حاجت کے وقت مال کو خرچ کرنا جائز ہے اور پھر وہ اسے اس کے مالک تک واپس لوٹا دے۔ اس باب میں صفوان کی حدیث اصل ہے۔ اور اس غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ''کسی حاملہ سے وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ وضع حمل کر لے اور غیر حاملہ سے بھی وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ ایک کامل حیض گزار لے''۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ قید عصمت کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس کا مکمل بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے کہ صفوان اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلا کہ وہ کافر تھا، پس وہ حنین اور طائف میں حاضر ہوا اور اس کی بیوی مسلمان تھی۔ الحدیث۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نہیں ہوا اور میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ مشرکوں سے مشرکوں کے خلاف مدد طلب کی جائے مگر یہ کہ وہ خادم ہوں یا ملاح ہوں۔

امام ابو حنیفہ، امام شافعی، ثوری اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اسلام کا حکم غالب ہو اور ان سے مدد طلب کرنا مکروہ ہے جب کہ شرک کا حکم بھی ظاہر ہو۔ ان کے حصص کے بارے میں گفتگو سورۃ الانفال میں گزر

چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ وَّیَوۡمَ حُنَیۡنٍ، حُنَیۡنٍ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے اور یہ لفظ منصرف ہے کیونکہ یہ مذکر کا اسم ہے اور یہ قرآن کی لغت ہے۔ اور عربوں میں سے جو اسے غیر منصرف بناتے ہیں، وہ اسے بقعہ کا اسم بناتے ہیں۔ اور انہوں نے یہ شعر بیان کیا ہے:

نصروا نبیّهم و شدّوا أزره　بحنینَ یومَ تواكلُ الأبطالِ

تو اس میں بحنین کو غیر منصرف پڑھا گیا ہے۔ اور یوم ظرف ہے اور اس معنی کی بنا پر یہاں منصوب ہے: دنصرکم یوم حنین اور فراء نے کہا ہے: مواطن منصرف نہیں ہے کیونکہ مفرد میں اس کی کوئی نظیر نہیں اور نہ اس کی جمع آتی ہے۔ مگر شاعر بسا اوقات مجبور ہوتے ہیں اور وہ جمع لے آتے ہیں اور نثر کلام میں وہ جائز نہیں ہوتا ہر وہ جو شعر میں جائز ہوتا ہے اور شعر بیان کیا:

فهنّ یعْلُکْنَ حدائداتها

اور نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس پر تعجب کرتے ہوئے دیکھا ہے انہوں نے کہا ہے: انہوں نے خلیل کا قول لیا ہے اور اس میں خطا کی ہے، کیونکہ خلیل اس بارے میں کہتے ہیں: یہ منصرف نہیں ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی واحد میں کوئی نظیر نہیں ہے اور نہ اس کی جمع مکسر بنائی جا سکتی ہے اور رہی جمع الف اور تا کے ساتھ تو یہ ممتنع نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِذۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ کَثۡرَتُکُمۡ کہا گیا ہے کہ لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گیارہ ہزار پانچ سو تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ سولہ ہزار تھے۔ تو ان میں سے بعض نے کہا: آج کے دن قلت کے سبب ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔ پس انہیں اسی کلمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ تو پھر وہ ہوا جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ ابتدا میں ہزیمت کا سامنا ہوا یہاں تک کہ واپس لوٹ گئے، پس مسلمانوں کی مدد و نصرت اور کامیابی و کامرانی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی۔ تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا کہ غلبہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب ہوتا ہے نہ کہ کثرت کے ساتھ۔ تحقیق ارشاد فرمایا: وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ (آل عمران: 160) (اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَّضَاقَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ یعنی خوف کے سبب زمین تم پر تنگ ہو گئی باوجود اپنی وسعت کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

كأنّ بلادَ الله وهي عریضةٌ　على الخائف المطلوب كِفّةُ حابِلِ

اور الرحب (را کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی وسعت ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: فلان رحب الصدر (فلاں وسیع سینے والا ہے) اور الرحب (را کے فتحہ کے ساتھ) کا معنی الواسع ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: بلد رحب (کھلا شہر) اور أرض رحبة (کھلی زمین) اور تحقیق رَحُبت ترحُب رحُبا و رَحابة (وسیع ہونا) اور کہا گیا ہے کہ بما میں با معنی مع ہے، ای مع رحبها اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی علی ہے، یعنی علی رحبها۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی برحبها ہے اور ما مصدریہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ مسلم نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک آدمی حضرت براء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابا عمارہ! کیا تم غزوۂ حنین کے دن پیٹھ پھیر کر مڑے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت دیتا ہوں کہ آپ پیٹھ پھیر کر نہیں مڑے، بلکہ لوگوں میں سے جلد باز اور ہتھیار وں سے خالی لوگ بنی ہوازن کے اس قبیلہ کی طرف چلے۔ اور وہ تیر انداز قوم تھی انہوں نے یکبارگی ان پر تیروں کی بارش کر دی گویا کہ وہ مکڑی کا جتھہ ہے اور وہ ظاہر ہو گیا ہے۔ پس ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کو پکڑے ہوئے تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے۔ دعا کی اور مدد طلب کی اور آپ یہ فرما رہے تھے: أنا النبي لا كذب أنا ابن عبد المطلب (میں یقیناً نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبدالمطلب کا پوتا ہوں) اللّٰهُمَّ نَزِّلْ نصرك ''اے اللہ! اپنی مدد و نصرت نازل فرما'' حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: قسم بخدا! جب جنگ شدت کے ساتھ بھڑک گئی تو ہم اس سے ڈر رہے تھے اور جو ہم میں سے شجاع اور بہادر تھا وہ اس کے مقابلہ میں تھا۔ شجاع سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر انہیں سکون پہنچانے والی اور ان سے خوف دور کرنے والی چیز نازل فرمائی، یہاں تک کہ وہ پیٹھ پھیرنے کے بعد پھر مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے پر جری ہو گئے۔ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا اور اللہ تعالیٰ نے وہ لشکر اتارے جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور وہ ملائکہ ہیں، وہ مومنوں کو ان خواطر اور ثابت قدم رہنے کے جذبات کے ساتھ طاقتور اور قوی بناتے رہے جو وہ ان کے دلوں میں ڈال رہے تھے اور کافروں کو بزدلی کے جذبات کے ساتھ کمزور کرتے رہے اس حیثیت سے کہ نہ وہ انہیں دیکھ سکے اور نہ وہ جنگ میں عملاً شریک ہوئے، کیونکہ ملائکہ نے غزوۂ بدر کے سوا کسی دن عملاً جنگ نہیں لڑی۔

اور روایت ہے کہ جنگ کے بعد بنی نصر کے ایک آدمی نے مومنوں کو کہا: وہ ابلق (چتکبرے) گھوڑے کہاں ہیں؟ اور وہ لوگ کہاں ہیں جو ان پر خود پہنے ہوئے تھے؟ ہم ان کے سامنے نہیں تھے مگر ناک کے بال کی طرح اور ہم فقط انہیں کے ہاتھوں سے قتل کیے گئے؟ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے اس بارے خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے''۔

وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تلواروں کے ساتھ کافروں کو عذاب دیا۔

وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ یعنی پھر اللہ تعالیٰ رحمت سے ان پر توجہ فرمائے گا جو شکست خوردہ ہوئے اور انہیں اسلام کی طرف ہدایت اور رہنمائی فرمائے گا (جنہیں چاہے گا) جیسا کہ مالک بن عوف نصری حنین کا سردار تھا اس کے ساتھ اس کی قوم بھی اسلام لے آئی۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ کے مقام پر حنین کے مال غنیمت تقسیم فرمائے، تو ہوازن کا ایک وفد اسلام کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے اوپر عطف و مہربانی چاہتے ہوئے اور اپنے اوپر احسان کرنے کی خواہش اور طلب لے کر حاضر ہوا اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آپ سارے لوگوں سے بہتر اور لوگوں سے بڑھ کر نیکوکار ہیں۔ تحقیق آپ نے ہماری اولاد، ہماری عورتیں اور ہمارے اموال لے لیے ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''بلا شبہ

میں تمہارے بارے میں غور وفکر کرتا رہا حالانکہ تقسیم واقع ہو چکی ہے اور میرے پاس وہ ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو اور بے شک بہترین قول وہی ہے جو زیادہ سچا ہو پس تم اپنی اولاد یا اپنے مالوں میں سے (ایک کو) اختیار کرلو''۔ تو انہوں نے عرض کی: ہم کسی شے کو بھی اولاد کے برابر قرار نہیں دیتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''یہ لوگ مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئے ہیں اور ہم نے انہیں اختیار دیا ہے اور انہوں نے اولاد کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا پس تم ان کی اولاد واپس لوٹانے پر راضی ہو جاؤ پس جو میرے اور بنی عبدالمطلب اور بنی ہاشم کے حصہ میں ہیں تو وہ ان کے لیے ہیں'' (یعنی میں انہیں واپس لوٹاتا ہوں) تو یہ سن کر مہاجرین وانصار نے کہا: جو ہمارے حصہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہیں۔ اور اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن نے اپنی قوم کے ساتھ اس سے انکار کر دیا کہ وہ انہیں اس میں سے کوئی شے واپس لوٹائیں جو ان کے حصہ میں ہے اور اسی طرح عباس بن مرداس سلمی نے بھی انکار کر دیا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ اس کی قوم اس کے ساتھ اسی طرح تعاون کرے گی جیسا کہ اقرع اور عیینہ کے ساتھ ان کی قوم نے تعاون کیا، لیکن بنوسلیم نے انکار کر دیا اور کہا: بلکہ جو کچھ ہمارے لیے ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے تم میں سے اس کے بارے بخل کا اظہار کیا جو اس کے قبضے میں ہے تو ہم اسے اس کا معاوضہ ادا کریں گے''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی عورتیں اور بچے واپس لوٹا دیئے۔ اور جو اپنا حصہ خوشی کے ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے انہیں اتنا عوض عطا فرمایا کہ وہ اس سے راضی ہو گئے (1)۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہمیں بتایا گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دایہ جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا وہ بنی اسد سے تھی، وہ حنین کے دن آپ کے پاس حاضر ہوئی اور حنین کے قیدیوں کے بارے آپ سے درخواست کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میں صرف اسی کا مالک ہوں جو حصہ مجھے ان سے ملا ہے البتہ تم کل صبح میرے پاس آؤ اور مجھ سے اور میرے پاس موجود لوگوں سے یہ درخواست کرو تو جب میں اپنا حصہ تمہیں عطا کر دوں گا تو لوگ بھی آپ کو دے دیں گے''۔ پس وہ دوسرے دن صبح حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے اپنا کپڑا بچھایا اور اس پر انہیں بٹھایا۔ پھر انہوں نے آپ سے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا حصہ عطا فرما دیا۔ تو جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے حصص دے دیئے (2)۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوازن کے قیدیوں کی تعداد پورے چھ ہزار تھی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھی۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: ان میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بھی تھی اور یہ حارث بن عبدالعزی جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھا اور حضرت حلیمہ سعدیہ کی بیٹی تھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عزت وتکریم دی اور اسے بہت نوازا اور اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کیا اور وہ انتہائی خوشی خوشی اپنے دین کے ساتھ اور اس مال کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا اپنے شہر واپس لوٹ گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم اوطاس کو ایک عورت کو

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6729-7073　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 389

دیکھا وہ دوڑ رہی ہے اور چیخ و پکار کر رہی ہے اور اسے قرار حاصل نہیں ہو رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے پوچھا تو آپ کو بتایا گیا: اس نے اپنا بچہ گم کر دیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنے بچے کو پالیا ہے وہ اس سے پیار کر رہی ہے اور اسے قریب لا رہی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اپنے اصحاب کو فرمایا: اطارحة هذه ولدها في النار؟ (کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟) صحابہ کرام نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں؟''۔ انہوں نے عرض کی: اپنی شفقت (اور پیار و محبت) کی وجہ سے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله أرحم بكم منها (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اس سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے)۔ اسی معنی میں مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''اے ایمان والو! مشرکین تو بڑے ناپاک ہیں سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجد حرام سے اس سال کے بعد اور اگر تم اندیشہ کرو تنگ دستی کا تو غنی کر دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اگر چاہے گا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ مشرک کے نجس (ناپاک ہونے) کے ساتھ متصف ہونے کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت قتادہ اور معمر بن راشد وغیرہما نے کہا ہے: کیونکہ وہ جنبی ہوتا ہے (اس لیے ناپاک ہے) کیونکہ جب وہ غسل جنابت کرے تو وہ غسل نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: بلکہ شرک ہی وہ شے ہے جس نے اسے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے۔ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے مشرک کے ساتھ مصافحہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ اور تمام مذاہب اس پر متفق ہیں کہ کافر جب اسلام قبول کرے تو اس پر غسل کرنا واجب ہوتا ہے، سوائے ابن عبدالحکم کے کیونکہ اس نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہے (1)، کیونکہ اسلام سابقہ سارے گناہ مٹا دیتا ہے۔ اور اس پر غسل کے واجب ہونے کا قول ابو ثور اور احمد نے کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ساقط کر دیا ہے اور کہا ہے: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ وہ غسل کرے اور اسی طرح ابن قاسم نے بیان کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ غسل کو نہیں پہچانتے۔ اسے ان سے ابن وہب اور ابن ابی اویس نے روایت کیا ہے اور حضرت ثمامہ اور قیس بن عاصم کی حدیث ان اقوال کا رد کرتی ہے ان دونوں کو ابو حاتم البستی نے اپنی صحیح مسند میں روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ثمامہ کے پاس سے گزرے اور وہ اسلام لا چکا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کرنے کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعتیں نماز پڑھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

نے فرمایا: ''تحقیق تمہارے ساتھی کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا ہے''۔ اسی معنی میں اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ثمامہ پر جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان فرمایا تو وہ مسجد کے قریب ایک نخلستان کی طرف چلا گیا اور غسل کیا۔ اور قیس بن عامر نے حکم دیا ہے کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل کرے۔ پھر اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے اسلام لائے تو اس کا غسل کرنا مستحب ہے اور جب وہ اپنے بالغ ہونے کے بعد اسلام لائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے غسل جنابت کی نیت کرے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی مذہب کا ماحصل ہے۔

ابن قاسم نے کافر کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسلام کی شہادت کا اظہار کرنے سے پہلے غسل کر لے، بشرطیکہ اپنے دل کے ساتھ اسلام کا اعتقاد رکھتا ہو۔ یہ نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف قول ہے اور اثر کے مخالف ہے۔ اور وہ اس لیے کہ کوئی بھی قول کے بغیر صرف نیت کے ساتھ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اہل السنت والجماعت کا ایمان کے بارے میں یہ قول ہے: بے شک یہ زبان کے ساتھ اقرار کرنے اور دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے اور عمل کے ساتھ یہ نمو پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر: 10) (اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے) (1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، فَلَا یَقْرَبُوا یہ نہی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے نون حذف کر دی گئی ہے۔ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اس لفظ کا اطلاق پورے حرم پر کیا جاتا ہے، یہی حضرت عطا کا مذہب ہے۔ تب پورے حرم میں کسی مشرک کو داخل ہونے کی قدرت دینا حرام ہو گا پس جب کوئی ان کی طرف سے ہمارے پاس قاصد آئے تو امام مقام حل کی طرف نکلے تاکہ وہ (پیغام) سن سکے جو وہ کہتا ہے اور اگر کوئی مشرک چھپ کر حرم پاک میں داخل ہوا اور وہ مر گیا تو اس کی قبر اکھیڑ کر اس کی ہڈیاں نکال لی جائیں گی، نتیجۃً اس کے لیے اس کے اندر داخل ہونا جائز نہیں اور نہ اس سے گزرنا جائز ہے۔ اور رہا جزیرۃ العرب اور یہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمامہ، یمن اور اس کی بستیوں پر مشتمل ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو بھی دین اسلام پر نہیں وہ ان مقامات سے نکل جائے اور اس کے بارے متردد مسافروں کو نہیں روکا جائے گا اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، مگر آپ نے اس سے یمن کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ان کے لیے تین دنوں کی مدت مقرر کی جائے گی جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے اتنی مدت مقرر کی جس وقت آپ نے انہیں جلاوطن کیا۔ انہیں نہ تو اس میں دفن کیا جائے گا اور نہ انہیں حل کی طرف پناہ دی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا کفار کے مساجد اور مسجد حرام میں داخل ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس کے بارے پانچ قول ہیں: پس اہل مدینہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین اور تمام مساجد کے بارے عام ہے۔ اور اسی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کی طرف لکھا اور اپنے خط میں اس آیت سے استدلال کیا۔ اور اس کی تائید یہ ارشاد گرامی بھی کرتا ہے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ (النور: 36) (ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 209

کہ بلند کیے جائیں اور لیا جائے ان میں الله تعالیٰ کا نام) اور کفار کا ان میں داخل ہونا ان کی رفعت شان کے خلاف ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے: ''بے شک یہ مساجد بول وقذر میں سے کسی شی کی صلاحیت نہیں رکھتیں'' (1)۔ الحدیث (یعنی غلاظت سے انہیں پاک اور محفوظ رکھنا چاہیے) اور کافر ان سے خالی نہیں ہوتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں مسجد کو کسی حائضہ عورت اور جنبی کے لیے حلال نہیں کروں گا''۔ اور کافر جنبی ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ میں تو الله تعالیٰ نے اسے نجس کا نام دیا ہے۔ پس یہ اس سے خالی نہیں کہ یہ نجس العین ہوگا یا پھر بطریق حکم اسے دور رکھا گیا ہوگا۔ اور جو صورت بھی ہو اسے مسجد سے روکنا واجب ہے، کیونکہ ان میں علت جو کہ نجاست ہے وہ موجود ہے اور مسجد میں حرمت موجود ہے۔

کہا جاتا ہے: رجل نجس، امرأة نجس، رجلان نجس، إمراتان نجس، رجال نجس اور رجال نجس و نساء نجس چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے نہ اس کا تثنیہ بنایا جائے گا اور نہ ہی جمع بنائی جائے گی۔ اور النجس (نون کے کسرہ اور جیم کی جزم کے ساتھ) تو یہ نہیں کہا جائے گا مگر تب جب اس کے ساتھ گندگی اور پلیدی (رجس) بھی ہو۔ پس جب مفرد ہو تو نَجِس (نون کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) اور نَجُس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) کہا جائے گا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین کے بارے میں عام ہے اور مسجد حرام کے بارے میں خاص ہے، لہٰذا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے انہیں نہیں روکا جائے گا۔ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے تمام مساجد میں داخل ہونے کو مباح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ان کی طرف سے ظاہر پر جمود ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ شرک اور نجاست کے ساتھ علت پر تنبیہ ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثمامہ کو مسجد میں باندھا تھا اور وہ مشرک تھا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: ہمارے علماء نے اس حدیث کے کئی جوابات دیئے ہیں اگر یہ صحیح ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ واقعہ نزول آیت سے پہلے کا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے اسلام لانے کے بارے میں علم تھا اس لیے آپ نے اسے وہاں باندھا۔ اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک معین فرد کا قضیہ ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ اس کے ساتھ ان ادلہ کا دفاع کیا جائے جو ہم نے ذکر کی ہیں، کیونکہ وہ قاعدہ کلیہ کے حکم کو مقید کرتی ہیں اور یہ کہا جانا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مسجد میں باندھا ہو تا کہ وہ مسلمانوں کی نماز کے حسن اور ان کے اجتماع کو اور مسجد میں ان کے بیٹھنے کے آداب کے حسن و جمال کو دیکھے، تو وہ اس سے مانوس ہو جائے اور اسلام قبول کر لے۔ اور اسی طرح ہوا۔ اور یہ کہا جانا بھی ممکن ہے کہ ان کے پاس مسجد کے سوا اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ اسے باندھ سکتے۔ والله اعلم

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: یہود و نصاریٰ کو مسجد حرام یا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا اور مشرکوں اور بت پرستوں کے سوا کسی کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا۔ اور یہ ایسا قول ہے جسے آیت وغیرہ میں سے جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ سب رد کرتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

الکیا طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذمی کے لیے بغیر حاجت کے تمام مساجد میں داخل ہونا جائز ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حاجت کا اعتبار کیا جائے گا اور حاجت کے ساتھ بھی مسجد حرام میں داخل ہونا جائز نہیں۔ اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرم پاک سارے کا سارا قبلہ اور مسجد ہے، پس چاہیے کہ انہیں حرم پاک میں داخل ہونے سے منع کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الاسراء: 1) ((ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے) اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ام ہانی کے گھر سے اٹھایا گیا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب نہ جائے، سوائے اس کے جو صاحب جزیہ (جزیہ دینے والا) ہو یا کسی مسلمان کا کافر غلام ہو۔ اسماعیل بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ یحییٰ بن عبدالحمید نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا ہمیں شریک نے اشعث سے انہوں نے حسن سے انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی مشرک مسجد کے قریب نہ جائے سوائے اس کے کہ وہ کسی کا غلام یا کنیز ہو پس وہ کسی حاجت اور ضرورت کے لیے اس میں داخل ہوسکتا ہے'' (1)۔ اور اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: عموم مشرک کو مسجد حرام کے قریب جانے سے روکتا ہے اور اسے غلام اور لونڈی کے حق میں خاص کر دیا گیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری کا سال ہے جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ مراد 10 ہجری ہے۔ یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ عنہ نے کہا ہے: اور یہی وہ صحیح قول ہے لفظ کا مقتضی جس کی موافقت کرتا ہے اور بلاشبہ یہ عجیب بات ہے کہ کہا جائے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری ہے۔ اور یہی وہ سال ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا (کہ آئندہ کوئی مشرک حرم پاک میں داخل نہیں ہوسکتا) اگر کسی آدمی کا غلام کسی دن اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس کا آقا اسے یہ کہے: لا تدخل هذه الدار بعد یومك (تو آج کے بعد اس گھر میں مت داخل ہو) تو اس سے مراد وہ دن نہیں ہوسکتا جس میں وہ داخل ہوا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً عمرو بن فائد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے واذ خفتم (اور جب تمہیں خوف ہو) اور یہ عجمہ ہے اور اس کا معنی عمدہ اور حسین ہے اِنْ کے ساتھ۔ مسلمانوں نے جب مشرکوں کو حج سے روک دیا حالانکہ وہ اناج اور دیگر سامان تجارت لے کر آتے تھے، تو شیطان نے ان کے دلوں میں فقر و افلاس کا خوف ڈال دیا اور کہنے لگے: ہم زندگی کہاں سے گزاریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے فضل سے انہیں غنی فرما دے گا۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اہل ذمہ کی جانب سے جزیہ کا دروازہ کھول دیا اپنے اس ارشاد گرامی کے ساتھ: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ (التوبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر)

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 89 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 901 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 903

اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں موسلادھار بارش، نباتات اور زمین کی سرسبز و شادابی کے ساتھ غنی فرما دیا۔ پس یمن کے شہر اور نواحی بستیاں بھی سرو سبز شاداب ہو گئیں اور وہ اناج، گوشت کی چربی اور تیل اور دیگر کثیر نفع بخش چیزیں مکہ مکرمہ لے کر آئے۔ اور عرب اسلام لے آئے مراد نجد، صنعاء اور دوسرے علاقے کے لوگ ہیں۔ پس ان کا حج اور ان کی تجارت انتہا تک پہنچ گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جہاد اور دیگر امتوں پر غلبے کے سبب انہیں غنی کر دیا۔ عیلہ کا معنی فقر و افلاس ہے۔ کہا جاتا ہے: عالَ الرجلُ یَعِیل جب کوئی آدمی محتاج اور فقیر ہو جائے (1) (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وما یَدرِی الفقیر متی غَنَاہ　　وما یدرِی الغنیّ متی یَعِیلُ

فقیر نہیں جانتا کہ کب (اللہ تعالیٰ) اسے غنی کر دے اور غنی (دولت مند) نہیں جانتا کہ وہ کب محتاج ہو جائے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے علقمہ وغیرہ نے اسے عائلۃ پڑھا ہے اور یہ مصدر ہے، جیسا کہ قال یہ تیل سے قائلۃ ہے۔ اور اسی طرح عافیۃ بھی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ محذوف موصوف کی نعت ہو اور تقدیر عبارت ہو: حالا عائلۃ اور اس کا معنی ہو مشکل اور تکلف دہ خصلت۔ اسی سے یہ کہا جاتا ہے: عالنی الأمر یعولنی یعنی معاملہ مجھ پر شاق اور سخت ہو گیا۔ اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: عال یعول جب کوئی محتاج اور فقیر ہو جائے (2)۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رزق کے بارے میں دل کا تعلق اسباب کے ساتھ قائم کرنا جائز ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے، اگرچہ رزق مقدر ہے، اللہ تعالیٰ کا امر ہے اور اس نے اسے تقسیم کیا ہوا ہے، لیکن اس نے اسے حکمت کے تحت اسباب کے ساتھ معلق کر دیا ہے تاکہ وہ ان دلوں کو جان لے جو اسباب کے ساتھ متعلق ہیں ان دلوں میں سے جو رب الارباب پر توکل رکھتے ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ سبب توکل کی نفی نہیں کرتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جیسے اس کے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے گا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے وہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں'' (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے پس اس میں خبر دی ہے کہ رزق کی تلاش میں صبح و شام آنا جانا توکل حقیقی کے خلاف نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیکن مشائخ صوفیہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ صبح و شام آنا جانا طاعات (اور تعمیل حکم) میں ہے۔ اور یہی وہ سبب ہے جو رزق کو کھینچ لاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل دو امر ہیں: ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ (طٰہٰ: 132) (اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہیے اس پر۔ نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو)

اور دوسرا یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر: 10) پس وہ اپنے محل......

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 21　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 400

3۔ جامع ترمذی، باب فی التوکل علی اللہ، حدیث نمبر 2266، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو کہ آسمان ہے...... سے رزق نازل نہیں کرتا مگر وہی جو اس کی طرف بلند ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ ذکر اور عمل صالح ہے اور وہ زمین میں سعی اور دوڑ دھوپ کرنا نہیں ہے، کیونکہ اس میں رزق نہیں ہے۔ اور صحیح وہ ہے جسے فقہاء ظاہر کے نزدیک سنت نے ثابت اور مستحکم کر دیا ہے اور وہ اسباب دنیوی کے ساتھ کام کرنا ہے، مثلاً زمین میں ہل چلانا (کاشتکاری کرنا)' بازاروں میں تجارت کرنا، اموال (کاروبار) کے لیے تعمیرات کرنا اور باغات لگانا وغیرہ۔ تحقیق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس طرح عمل کرتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس پاکیزہ مال میں سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو انہوں نے کمایا، علاوہ ازیں دیگر آیات بھی ہیں۔ اور فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرہ: 173) (لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں) پس اللہ تعالیٰ نے مضطر اور مجبور آدمی کے لیے وہ (کھانا) حلال قرار دیا ہے جو اس پر حرام ہے جب اس کے پاس کھانے کے لیے وہ موجود نہ ہو جسے کمانے اور غذا بنانے کا اس نے حکم دے رکھا ہے اور اس نے اسے آسمان سے کھانا نازل ہونے کے انتظار کرنے کا حکم نہیں دیا اور اگر وہ شے جسے عذاب بنایا جا سکتا ہے اسے چھوڑ کر اس نے سعی اور کوشش ترک کر دی تو وہ اپنی جان کا قاتل ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھوک سے بل کھاتے رہتے تھے جو آپ پاتے تھے وہ کھا لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آسمان سے کھانا نازل نہیں ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے لیے سال کی خوراک جمع کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتوحات عطا فرمائیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اونٹ کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اسے ڈھنگا ڈال دوں اور توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے رسی ڈال اور پھر توکل کر''۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کے لیے اہل صفہ میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ وہ فقراء تھے مسجد میں بیٹھتے تھے نہ وہ ہل چلاتے تھے اور نہ تجارت کرتے تھے، ان کے لیے نہ کمائی تھی اور نہ کوئی مال، بلاشبہ وہ شہروں کی تنگی کے وقت اسلام کے مہمان تھے اور اس کے باوجود وہ دن کے وقت لکڑیاں (ایندھن) چنتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں پانی بھر کر لاتے تھے اور رات کے وقت قرآن کریم پڑھتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح ان کا وصف بیان کیا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی سبب پیدا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی ہدیہ آتا تو آپ اسے ان کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ اور اگر صدقہ آتا تو وہ انہیں کو عطا فرما دیتے تھے، پس جب فتوحات کثیر ہو گئیں اور اسلام پھیل گیا تو وہ بھی نکل گئے اور حکم کی تعمیل میں لگ گئے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور وہ بیٹھے نہ رہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ وہ اسباب جن سے رزق حاصل کیا جاتا ہے ان کی چھ قسمیں ہیں:

(۱) ان میں سے سب سے اعلیٰ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے) میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھا ہے اور ذلت اور حقارت کو اس پر ڈال دیا ہے جس نے میرے حکم کے خلاف

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث نمبر 2441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا''۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رزق اپنے فضل سے ان کی کمائی اور کسب میں رکھا ہے اور اسے کسب کی افضل ترین نوع کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے شرف وعظمت کے سبب (دشمن پر) غلبہ اور (فتح) حاصل کرنا ہے۔

(۲) آدمی کا اپنے ہاتھ کے عمل سے کھانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک آدمی جو کچھ کھاتا ہے اس میں سے اطیب اور پاکیزہ وہ ہے جو اس کے ہاتھ کی کمائی سے ہو اور بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے کھاتے تھے''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80) (اور ہم نے سکھادیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے) اور روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے (سوت) کاتنے کی کمائی کھاتے تھے۔(1)

(۳) تیسری قسم تجارت ہے اور یہ بزرگ اور اجل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تھا بالخصوص مہاجرین صحابہ کرام کا اور قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس کی رہنمائی کی ہے۔

(۴) کاشتکاری کرنا اور باغات اور درخت لگانا۔ تحقیق ہم اسے سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

(۵) قرآن کریم پڑھنا اور اس کی تعلیم دینا اور دم کرنا وغیرہ، اس کا بیان سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

(۶) کسی سے اس ارادہ اور نیت کے ساتھ لینا کہ پھر اسے ادا کر دے گا بشرطیکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ پر لیے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دے گا اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ پر لیا تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ شَآءَ اس پر دلیل ہے کہ رزق اجتہاد اور کوشش کے ساتھ نہیں، بلکہ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے وہی اسے اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کرنے کا والی ہے۔ اور اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیہ (الزخرف: 32) (ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

''جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 17، صفحہ 59

یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں''۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ جب اللہ تعالیٰ نے کفار پر مسجد حرام کے قریب آنا حرام قرار دیا، تو مسلمانوں نے اپنے دلوں میں اس تجارت کے بارے خوف سا محسوس کیا جو ان سے ختم کر دی گئی (کیونکہ) مشرکین اسے اپنائے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً، الآیہ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اس آیت میں جزیہ کو حلال قرار دیا اور یہ اس سے پہلے نہیں لیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا عوض بنا دیا جو انہیں مشرکین کے ساتھ تجارت میں شریک ہونے سے منع کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ اس وصف پر وہ تمام متفق ہیں اور اہل کتاب کا ذکر ان کی کتاب کی تکریم کے لیے خاص طور پر علیحدہ کیا، کیونکہ وہ توحید و رسالت، شرائع اور ادیان کو جانتے تھے اور خصوصاً حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ملت اور آپ کی امت کے بارے علم رکھتے تھے۔ تو جب انہوں نے اس کا انکار کیا تو ان پر حجت موکد ہو گئی اور ان کا جرم بڑھ گیا۔ پس پہلے ان کے مقام و محل پر آگاہ فرمایا پھر قتال کے لیے غایت کو ذکر کیا اور وہ قتل کے بدلے جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے ایک مجلس نظر و فکر میں ابو الوفاء علی بن عقیل کو سنا ہے وہ یہ آیت پڑھتے تھے اور اس سے استدلال کرتے تھے۔ پس فرمایا: قَاتِلُوا یہ سزا کے بارے امر ہے۔ پھر فرمایا: الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ یہ اس گناہ کا بیان ہے جس نے عقوبت (سزا) کو واجب کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ جانب اعتقاد میں گناہ کی تاکید ہے۔ پھر فرمایا: وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ یہ اعمال کی مخالفت میں گناہ کے بڑھ جانے اور زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا: مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یہ حجت کے لیے تاکید ہے، کیونکہ وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں اسے لکھا ہوا پاتے تھے۔ پھر فرمایا: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ پس اس غایت کو بیان کر دیا جس تک سزا ممتد ہو سکتی ہے اور اس بدل اور عوض کو معین کر دیا جس کے سبب وہ سزا اٹھ سکتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جن لوگوں سے جزیہ لیا جاتا ہے ان کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا مگر صرف اہل کتاب سے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی۔ دلیل یہی آیت ہے، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے پس حکم صرف انہیں کی طرف متوجہ ہو گا ان کے سوا دوسروں کی طرف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْہُمْ (التوبہ: 5) (تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں) اور آگے یہ نہیں فرمایا: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں جیسا کہ اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے اور (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) نے مزید یہ کہا ہے: جزیہ مجوسیوں سے قبول کیا جائے گا اور یہ سنت سے ثابت ہے۔ اسی طرح امام احمد اور ابو ثور نے کہا ہے۔ اور یہی ثوری، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بتوں کی عبادت کرنے والے، آتش پرست، منکر اور جھٹلانے والے سبھی سے ہی جزیہ لیا جائے گا اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے، کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ شرک اور انکار کی تمام اجناس سے جزیہ لیا جائے گا چاہے وہ عربی ہو یا عجمی، تغلبی ہو یا قریشی، جو بھی ہو سوائے مرتد کے (سبھی سے جزیہ لیا جائے گا) ابن القاسم، اشہب اور سحنون نے کہا ہے: جزیہ عرب کے مجوسیوں اور تمام امتوں سے لیا جائے گا۔ اور رہے عرب بت پرست تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جزیہ کا تذکرہ نہیں کیا، ان میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہے گا، بلاشبہ ان کے لیے یا قتال ہے یا اسلام۔ اور ابن القاسم کا یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اور یہ ابن جلاب کی تفریع میں ہے اور یہ احتمال ہے نص نہیں۔

اور ابن وہب نے کہا ہے: عرب کے مجوسیوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے سوا سے قبول کر لیا جائے گا۔ فرمایا: کیونکہ عرب میں مجوسی کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ ان تمام نے اسلام قبول کر لیا۔ پس ان میں سے کوئی خلاف اسلام پایا گیا تو وہ مرتد ہوگا، ہر حال میں اسے قتل کیا جائے گا اگر وہ اسلام نہ لایا اور ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور ابن الجہم نے کہا ہے: جزیہ ہر اس سے قبول کیا جائے گا جو اسلام کے سوا کسی بھی دین پر ہو سوائے ایسی شی کے جس پر کفار قریش کا اجتماع ہوا اور اس کی علت بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ذلت اور حقارت کے بدلے ان کی تکریم کے لیے ہے، کیونکہ ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اور کسی اور نے یہ کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام کے تمام فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ اور رہے مجوس! تو ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ اور مؤطا میں ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجوس کا معاملہ ذکر کیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا میں ان کے بارے کیا کروں؟ تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: سنوبهم سنة اهل الكتاب (تم ان سے اہل کتاب جیسا برتاؤ کرو) ابو عمر نے کہا ہے: یعنی خاص طور پر جزیہ میں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، سنوابهم سنة اهل الكتاب میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اور یہی مذہب جمہور فقہاء کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ وہ اہل کتاب تھے پھر بدل دیئے گئے۔ اور میرا گمان یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اس کی طرف گئے ہیں جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک سند سے مروی ہے اور اس میں ضعف ہے، اس کا دارومدار ابو سعید البقال پر ہے۔ اسے عبدالرزاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: روایت ہے کہ مجوس کی طرف ایک نبی مبعوث کیے گئے جن کا نام زرادشت تھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں جزیہ کی وہ مقدار ذکر نہیں کی جو ان سے لی جائے گی۔ تحقیق علماء نے جزیہ کی اس مقدار میں اختلاف کیا ہے جو ان سے لی جائے گی۔ پس حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس میں کوئی مقرر مقدار نہیں، بلکہ یہ اتنا ہی ہوگا جس پر ان سے صلح کی گئی۔ اسی طرح یحییٰ بن آدم، ابو عبید اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا

ہے، مگر علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے: اس کی کم سے کم مقدار ایک دینار ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ اور انہوں نے استدلال اس روایت سے کیا ہے جسے اہل الصحیح نے حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے جزیہ پر صلح کی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: غنی اور آزاد بالغ فقیر پر ایک دینار ہوگا اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد وغیرہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ہر بالغ سے جزیہ میں ایک دینار وصول کریں (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی ارشاد اللہ تعالیٰ کے مراد بہ کے لیے مبین اور اس کی وضاحت کرنے والا ہے اور یہی ابوثور کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اور اگر ایک دینار سے زیادہ پر ان سے صلح کر لی گئی تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر انہوں نے زیادہ دیا اور اس پر ان کے دل مطمئن اور خوش ہوں تو وہ ان سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر ان سے صلح تین دنوں کی ضیافت پر کی گئی تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ ضیافت معلوم ہو مثلاً روٹی، جو، پنیر اور سالن وغیرہ۔ اور اس کا ذکر کرے جو ان میں سے متوسط پر ہوگا اور جو ان میں سے خوشحال اور دولت مند پر ہوگا اور سردی، گرمی اترنے اور واپس لوٹنے کی جگہ کا بھی ذکر ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں کہا ہے جو آپ سے ابن قاسم، اشہب اور محمد بن حارث بن زنجویہ نے روایت کی ہے کہ جزیہ سونے والوں پر چار دینار ہوگا اور چاندی والوں پر چالیس درہم، اس میں غنی اور فقیر برابر ہیں اگرچہ وہ مجوسی ہو۔ جو مقدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کر دی ہے نہ اس پر اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس میں کمی کی جائے گی، ان سے اس کے سوا کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کمزور اور ضعیف کو اتنی مقدار تخفیف کر دی جائے گی جتنی امام وقت مناسب سمجھے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: تنگی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ مقدار میں کمی نہیں کی جائے گی اور خوشحالی اور دولت کی وجہ سے اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ابوعمر نے کہا ہے: ان کے فقراء سے اتنی مقدار میں لیا جائے گا جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں اگرچہ وہ ایک درہم ہی ہو۔ اور اسی کی طرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے رجوع کیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام محمد بن حسن اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جزیہ کی مقدار بارہ، چوبیس اور چالیس ہے۔ امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں مختلف مقداروں کا ذکر مروی ہے، پس والی کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے لے لے، جب کہ وہ اہل ذمہ ہوں۔ اور رہے اہل صلح تو ان پر اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا جس پر صلح کی گئی ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ جس پر قرآن کریم دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جزیہ جنگ لڑنے والے مردوں سے لیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا**

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب فی زکوٰۃ البقر، حدیث 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ پس یہ ارشاد ان پر جزیہ کے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو قتال کرتے ہیں۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ غلام پر جزیہ نہیں ہے اگرچہ وہ جنگ لڑنے والا ہو، کیونکہ اس کے پاس کوئی مال نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **حَتّٰى يُعْطُوا** اور جو کسی شے کا مالک نہ ہو اس کے لیے حتی یعطی نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جزیہ آزاد، بالغ مردوں کے سروں پر لگایا جائے گا اور وہ وہی ہیں جو قتال کرتے ہیں نہ کہ عورتیں، بچے، غلام، ایسے مجنون افراد جن کی عقلیں مغلوب ہوں اور بوڑھے، پیرفرتوت وغیرہ۔ اور راہبوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب وہ جزیہ لگ جانے کے بعد راہب نہ بنا ہو اور اگر جزیہ پہلے لگا دیا گیا پھر وہ راہب بنا تو اس کی رہبانیت جزیہ کو ساقط نہیں کرسکتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب اہل جزیہ جزیہ ادا کردیں تو پھر ان کے پھلوں، سامان تجارت اور ان کی فصلوں کی پیداوار سے کوئی شے ان سے نہ لی جائے، مگر یہ کہ وہ ان شہروں کے علاوہ دوسرے شہروں میں تجارت کریں جن میں انہیں ٹھہرایا گیا اور جن پر ان سے صلح کی گئی۔ پس اگر وہ تجارت کی غرض سے اپنے مقیمی شہروں سے دوسرے شہروں کی طرف نکلے تو ان سے (محصول، عشر ٹیکس) لیا جائے گا جب وہ سامان بیچیں اور اس کے ثمن نقد ان کے پاس موجود ہوں، اگرچہ سال میں ان کا گزر کئی بار ہو، مگر یہ کہ وہ طعام گندم اور زیتون وغیرہ لے کر مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کی طرف خاص طور پر لے جائیں، تو اس صورت میں ان سے نصف العشر لیا جائے گا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کیا ہے۔ اور اہل مدینہ میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ اہل ذمہ سے ان کے سامان تجارت کا محصول ٹیکس سال میں صرف ایک بار لیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ یہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ فقہاء کی جماعت کا مذہب ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب اہل جزیہ نے اپنا وہ جزیہ ادا کردیا جو ان پر لگایا گیا یا جس پر ان سے صلح کی گئی تو پھر انہیں ان کے تمام مالوں، ان کی انگور کی بیلوں اور ان کے اس عصیر (نچوڑ) کو جس کی شرابوں کو انہوں نے چھپا رکھا ہو اور وہ انہیں کسی مسلمان کو بیچنے کا اعلان نہ کریں تو ان سب کو چھوڑ دیا جائے (اور درمیان میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے) اور انہیں شراب (خمر) اور خنزیر کو مسلمانوں کے بازاروں اور ظاہراً لانے سے منع کیا جائے، پس اگر وہ ان سے کوئی شے ظاہراً لائیں تو شراب کو ان پر انڈیل دیا جائے اور جو خنزیر کو لے کر آئے اسے تادیبی سزا دی جائے۔ اور اگر کسی مسلمان نے شراب کے اظہار کے بغیر اسے بہا دیا تو یہ تعدی اور زیادتی ہے، لہٰذا اس پر ضمان واجب ہوگی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمان نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی نے شراب غصب کرلی تو اس پر اسے واپس لوٹانا واجب ہے۔ ان کے احکام میں اور ان کے آپس میں سودی کاروبار میں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر وہ اپنا کوئی مقدمہ ہمارے پاس فیصلہ کے لیے پیش کریں تو پھر حاکم کو اختیار ہے، اگر چاہے تو ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کردے اور اگر چاہے تو اعراض کرلے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے باہمی مظالم کے بارے میں ہر حال میں ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور ان کے طاقتوروں سے ان کے

کمزوروں کا حق لیا جائے گا، کیونکہ یہ ان سے دفع مضرت کے باب سے ہے۔ اور امام وقت پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف سے ان کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑے اور دشمنوں سے جنگ لڑنے میں ان سے مدد بھی طلب کرے۔ مال فے (غنیمت) میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا اور عبادت گاہوں میں جن پر صلح کی گئی ہے وہ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے (یعنی مزید ان کی تعمیر کو بڑھا نہیں سکتے) البتہ ان میں سے جو بوسیدہ ہو جائے اس کی اصلاح اور مرمت سے انہیں نہ روکا جائے۔ اور ان کے لیے ان کے علاوہ نئی تعمیر کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اور وہ ایسا لباس اور ہیئت اختیار کریں گے جس کے ساتھ وہ خود مسلمانوں سے الگ اور جدا ہو جائیں اور اہل اسلام کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے انہیں روکا جائے گا۔ اور ان سے دشمن کے بچوں کو خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ ان کے لیے ذمہ نہ ہو۔ اور جزیہ ادا کرنے میں جس کسی نے جھگڑا کیا تو اسے اس جھگڑنے پر تادیبی سزا دی جائے گی۔ اور اس سے جزیہ لیا جائے گا اس حال میں کہ وہ مغلوب ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ جس کے سبب جزیہ واجب ہے اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس علماء مالکیہ نے کہا ہے: یہ اس قتل کے بدل کے طور پر واجب ہے، جو کفر کے سبب لازم ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جان کی حفاظت اور دار کی سکونت کے بدل کے طور پر واجب ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے یہ کہا کہ یہ قتل کے بدلے واجب ہے پھر وہ اسلام لے آیا تو اس سے گزری ہوئی مدت کا جزیہ ساقط ہو جائے گا، اگرچہ اس نے سال مکمل ہونے سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد اسلام قبول کیا۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جزیہ ایک دین (قرض) ہے جو اس کے ذمہ پختہ ہو چکا ہے پس اسلام اسے ساقط نہیں کر سکتا جیسا کہ دار کی اجرت (ساقط نہیں ہوتی) اور بعض حنفیہ نے ہمارے قول کی مثل ہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جزیہ مدد و نصرت اور جہاد کے بدل کے طور پر واجب ہے۔ اور قاضی ابوزید نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور ان کا گمان یہ ہے کہ یہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا سر اور راز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کسی مسلمان پر کوئی جزیہ نہیں ہے'' (1)۔

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ذمی اپنے اوپر جزیہ واجب ہونے کے بعد جب اسلام لے آئے تو اس سے جزیہ باطل ہو جائے گا۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ کیونکہ اسلام کے سبب یہ معنی زائل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا نہیں کریں گے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے بعد اس وجہ اور سبب کی بنا پر نہیں لیتے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ بے شک وہ یہ فرماتے ہیں کہ جزیہ ایک دین ہے، جو اس پر سبب سابق کے ساتھ واجب ہوا ہے اور وہ سبب سکنیٰ (رہائش) یا قتل کے شر سے بچنا اور حفاظت ہے، پس یہ تمام قرضوں کی مثل ہو گیا۔

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء لیس علی المسلمین جزیۃ، حدیث نمبر 574، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9۔ اگر امامِ وقت کسی شہر یا قلعہ کے باسیوں کے ساتھ معاہدہ کرے پھر وہ اپنا عہد توڑ دیں اور جزیہ وغیرہ میں سے جو ان کے ذمہ لازم ہوتا ہے اسے ادا کرنے سے رک جائیں (انکار کر دیں) اور وہ اسلام کے حکم سے بھی انکار کر دیں بغیر اس کے کہ ان پر کوئی ظلم و زیادتی کی جائے اور امام وقت بھی ان پر جبر اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو مسلمانوں پر اپنے امام کی معیت میں ان کے ساتھ جنگ اور قتال کرنا واجب ہے، پس اگر وہ قتال کریں اور مغلوب ہو جائیں تو ان کے بارے میں بالکل اسی طرح حکم ہوگا جو دار الحرب والوں کے بارے حکم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کی عورتیں مال فے ہوگا اور ان میں خمس نہیں ہوگا۔ اور یہ ایک مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ چوریاں کرتے ہوئے اور ڈاکے ڈالتے ہوئے خروج کریں تو وہ لوٹ مار کرنے والے مسلمانوں کے قائم مقام ہوں گے جب کہ وہ جزیہ دینے سے انکار نہ کریں اور اگر وہ ظلم و زیادتی کی شکایت کرتے ہوئے نکلیں تو ان کے معاملہ میں غور و فکر کیا جائے گا اور انہیں اصل ذمہ اور معاہدہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور انہیں ان کے ساتھ ظلم کرنے والوں سے انصاف دلایا جائے اور ان میں سے کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور وہ آزاد ہوں گے۔ اور اگر ان میں سے بعض نے معاہدہ توڑ دیا تو جنہوں نے نہیں توڑا وہ اپنے معاہدہ پر باقی رہیں گے اور انہیں کسی دوسرے کے توڑنے کے سبب نہیں پکڑا جائے گا اور انہیں معاہدہ پر قائم رہنے کو اسی طرح پہچانا جائے گا کہ وہ توڑنے والوں کے خلاف ہوں اور ان کا انکار کرتے ہوں۔

مسئلہ نمبر 11۔ اَلْجِزْيَةَ یہ فعلۃ کے وزن پر ہے۔ اور جزی یجزی سے ہے جب کوئی بدلہ دے اس احسان کا جو اس پر کیا گیا ہو (تو اس کو جزی یجزی بدلہ دینا کہا جاتا ہے) تو گویا انہوں نے جزیہ اس جزا اور بدلے کے طور پر دیا جو انہیں امن و سلامتی عطا کی گئی اور یہ لفظ القعدۃ اور الجلسۃ کی طرح ہے۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

يُجزيك اويُثْنِي عليك وانّ مَن أثنى عليك بما فعلت كمن جزى

مسئلہ نمبر 12۔ مسلم نے ہشام بن حکیم بن حزام سے روایت نقل کی ہے کہ وہ شام کے کسانوں میں سے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ انہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے: اور ان کے سروں پر تیل انڈیلا گیا تھا۔ تو انہوں نے پوچھا: ان کا کیا معاملہ ہے؟ تو بتانے والے نے کہا: انہیں جزیہ میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ تو ہشام نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں''۔ اور ایک روایت میں ہے ان دنوں ان کا امیر عمیر بن سعد فلسطین میں تھا، پس وہ اس کے پاس گیا اور اس سے بات کی تو اس نے ان کے بارے حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: رہی ان کی سزا! تو جب وہ جزیہ دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود جزیہ ادا کرنے سے انکار کر دیں تو انہیں سزا دینا جائز ہے، لیکن جب ان کا عجز ظاہر ہو تو پھر انہیں سزا دینا حلال نہیں، کیونکہ جو جزیہ دینے سے عاجز آ جائے ان سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور امیر لوگوں کو فقراء کی طرف سے جزیہ ادا کرنے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اور ابو داؤد نے صفوان بن سلیم سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے متعدد بیٹوں سے اور انہوں نے اپنے آباء سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: ''جس نے کسی معاہدہ کرنے والے کے ساتھ ظلم کیا یا اسے نقصان پہنچایا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے کام کا مکلف بنایا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس کا حجیج ہوں گا'' (1)۔ (یعنی دلیل سے اس پر غالب آؤں گا)

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: عَنْ یَّدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بذات خود جزیہ دے گا اس میں کسی کو نائب نہیں بنائے گا۔ ابوالبختری نے سلمان سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: اس کا معنی ہے انتہائی مذموم حالت میں دے گا۔ اور معمر نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس سے مراد ہے عن قھر (مغلوب اور مجبور ہو کر دے گا) اور بعض نے کہا ہے: عَنْ یَّدٍ یعنی تمہاری طرف سے ان پر جو انعام ہے اس کے عوض دے گا، کیونکہ جب ان سے جزیہ لیا گیا تو تحقیق ان پر اس سے انعام کیا گیا۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: وہ جزیہ دے گا اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو گا اور لینے والا بیٹھا ہوا ہو گا۔ اور یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول باری تعالیٰ عن ید سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ سے ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ ائمہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا مانگنے والا ہے''۔ اور یہ بھی روایت ہے، ''اور اوپر والا ہاتھ ہی عطا کرنے والا ہے''۔ پس آپ نے صدقہ میں دینے والے ہاتھ کو علیا (اوپر والا ہاتھ) قرار دیا ہے اور جزیہ میں دینے والے ہاتھ کو سفلی (نیچے والا ہاتھ) قرار دیا ہے۔ اور لینے والے ہاتھ کو علیا قرار دیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کیونکہ وہی بلند کرنے والا اور پست کرنے والا ہے، جسے چاہتا ہے بلند کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پست کر دیتا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور عرض کی: بے شک خراج والی زمین سے اس کے باسی عاجز آ رہے ہیں کیا میں اسے آباد کر سکتا ہوں اور اسے کاشت کر کے اس کا خراج ادا کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں۔ اور پھر ایک دوسرا آیا تو اس نے بھی آپ کو اسی طرح کہا، تو آپ نے فرمایا: نہیں اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ کیا تم میں سے کوئی اس ذلت و حقارت کا قصد کرتا ہے جو ان میں سے کسی کی گردن میں ہے کہ وہ اسے اتار لے اور اسے اپنی گردن میں ڈال لے۔ اور کلیب بن وائل نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: میں نے زمین خریدی ہے۔ انہوں نے فرمایا: خریدنا اچھی شے ہے۔ میں نے کہا: پس میں زمین کی ہر جریب کے بدلے ایک درہم اور ایک قفیز اناج دوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو اپنی گردن میں ذلت اور حقارت کو نہ ڈال۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی تعشیر اهل الذمة، حدیث نمبر 2654، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ باعث مسرت نہیں کہ میرے لیے ساری زمین پانچ درہم جزیہ کے بدلے ہو میں اس میں اپنے نفس کے لیے ذلت و رسوائی کا اقرار کرتا ہوں۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـــُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

''اور کہا یہود نے کہ عزیر الله تعالیٰ کا بیٹا ہے اور کہا نصرانیوں نے کہ مسیح الله کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی (بے سروپا) بات ہے ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی، نقل اتار رہے ہیں ان لوگوں کے قول کی جنہوں نے کفر کیا پہلے، ہلاک کرے انہیں الله تعالیٰ، کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ عاصم اور کسائی نے عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ عزیر کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ اس بنا پر ابن، عزیر مبتدا کی خبر ہے اور عزیر منصرف ہے چاہے عجمی ہو یا عربی ہو۔ ابن کثیر، نافع، ابوعمرو اور ابن عامر نے عزیر ابن اجتماع ساکنین کی وجہ سے تنوین کو ترک کر کے پڑھا ہے۔ اور اسی سے ان کی قراءت ہے جنہوں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (الاخلاص) پڑھا ہے(1)۔ ابو علی نے کہا ہے: شعر میں ترک تنوین کا استعمال زیادہ ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں یہ شعر بیان کیے ہیں:

لَتَجِدَنِّي　بالأمير　بَرًّا　وبالقناة　مِدْعَسا　مِكَرًّا

إذَا غُطَيْفُ السُّلَمِيُّ فَرَّا (2)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ یہ لفظ بظاہر عام ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے، کیونکہ تمام یہودیوں نے اس طرح نہیں کہا۔ اور یہ الله تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (آل عمران: 173) اور یہ تمام لوگوں نے نہیں کہا۔ اور کہا گیا ہے کہ جو بیان کیا گیا ہے یہودیوں میں سے اس کے قائل سلام بن مشکم، نعمان بن ابی اوفی، شاس بن قیس اور مالک بن صیف تھے۔ انہوں نے یہ قول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا۔ نقاش نے بیان کیا ہے: کوئی یہودی باقی نہیں رہتا جو یہ کہتا ہو، بلکہ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ پس جب ایک نے یہ کہا پھر وہ اس طرف متوجہ ہوا کہ قول کی برائی اور نقصان پوری جماعت کو لازم ہو گی۔ اس لیے کہ ان میں کہنے والے کی شہرت ہے۔ اور شریف اور بیدار مغز لوگوں کے اقوال ہمیشہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے۔ پس یہاں یہ صحیح ہے کہ جماعت اپنے قائد اور شریف فرد کا قول کرنے لگے۔ والله اعلم

روایت کیا گیا ہے کہ اس قول کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کو قتل کر دیا، تو الله تعالیٰ نے ان سے تورات کو اٹھا لیا اور ان کے دلوں سے اسے محو کر دیا، پھر حضرت عزیر علیہ السلام زمین میں تسبیح بیان کرتے ہوئے نکلے، تو ان کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھا: ''تم کہاں جا رہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 23　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 412

ہو؟'' انہوں نے کہا: میں علم کی طلب میں ہوں، تو آپ نے انہیں پوری تورات سکھادی پس حضرت عزیر علیہ السلام تورات لے کر بنی اسرائیل کی طرف آئے اور انہیں اس کی تعلیم دی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو تورات حفظ کرادی اور یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عزت افزائی ہے، تو انہوں نے بنی اسرائیل کو کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات حفظ کرادی ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اس کی تدریس شروع کردی، حالانکہ تورات دفن کی جاچکی تھی، ان کے علماء نے اس وقت اسے دفن کردیا تھا جب انہیں طرح طرح کے فتنے، جلاوطنی اور بیماری جیسی چیزیں پہنچی جن میں وہ مبتلا ہوئے اور بخت نصر نے انہیں قتل کیا۔ پھر دفن شدہ تورات پالی گئی وہ بالکل اس کی مثل تھی جو عزیر علیہ السلام پڑھا رہے تھے، تو اس وقت وہ گمراہ ہوگئے اور وہ کہنے لگے: بے شک یہ حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے تیار نہیں کی گئی مگر تبھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس قول ''کہ مسیح ابن اللہ ہیں'' کا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے اس سے بنوت النسل کا ارادہ کیا ہے، جیسا کہ عربوں نے ملائکہ کے بارے میں کہا۔ اسی طرح حضرت ضحاک اور طبری وغیرہ کا قول تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ انتہائی شنیع اور برا کفر ہے۔

ابوالمعالی نے کہا ہے: نصرانیوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام الٰہ ہیں اور یہ کہ وہ الٰہ کے بیٹے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے بے شک ان میں سے بعض بنوت شفقت و رحمت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہ معنی بھی درست نہیں ہے کہ اس پر بنوۃ (بیٹا ہونے) کا اطلاق کیا جائے اور یہ کفر ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اس میں ہمارے رب تبارک و تعالیٰ کے قول سے اس پر دلیل موجود ہے کہ جو کوئی کسی دوسرے کے ایسے کفر کے بارے خبر دے جس سے ابتدا کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، اس پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ اس کا انکار کرتے ہوئے اور اس کا رد کرنے کے لیے اس کے بارے گفتگو کر رہا ہے۔ اور اگر ہمارا رب چاہے تو کوئی اس کے بارے کلام نہ کرے۔ تو جب اس کے بارے زبانیں کھولنے کی قدرت دے دی ہے تو پھر اس کے بارے خبر دینے کی بھی اجازت ہے، اس معنی میں کہ دل اور زبان اس کا انکار کرتے ہوں۔ اور دلیل و برہان کے ساتھ اس کا رد مقصود ہو۔ (2)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی تاکید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں ہے: یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ (البقرہ: 79) وَ لَا طٰٓىٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (الانعام: 38) فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ (الحاقۃ) اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب یہ قول ہی جھوٹا ہے نہ اس میں کوئی بیان ہے اور نہ کوئی دلیل، تو یقیناً یہ فقط ''منہ'' کی بات ہے، ایسا دعویٰ ہے جس کے تحت کوئی صحیح معنی نہیں ہے، کیونکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کسی کو بیوی نہیں بنایا تو پھر وہ کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، تو یہ کذب ہے اور فقط زبان کا قول ہے، بخلاف ان اقوال صحیحہ کے جنہیں دلائل مضبوط اور پختہ کرتے ہیں اور ان پر دلائل قائم ہوتے ہیں۔ اہل معانی نے کہا ہے: بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جہاں بھی قول کو افواہ (مونہوں) اور السن (زبان) کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 913

ذکر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے تو وہاں یقیناً مراد قول زور (جھوٹا قول) ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران: 167) (کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں) اور كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ (الکہف) (کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے وہ نہیں کہتے مگر (سراسر) جھوٹ) اور یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (الفتح: 11) (اے حبیب!) یہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ، یُضَاهِـُٔوْنَ وہ مشابہت اختیار کرتے ہیں (نقل اتارتے ہیں) اور اسی معنی میں عربوں کا قول ہے: امرأۃ ضھیا یہ اس عورت کو کہتے ہیں جسے حیض نہ آتا ہو یا جس کے پستان نہ ہوں، گویا کہ وہ مردوں کے مشابہ ہے۔

اور قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا بت پرستوں کا قول ہے: اللات والعزی و مناۃ الثالثہ الاخری (لات و عزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے) اور دوسرا قول، کافروں کا قول ہے: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (الملائکۃ بنات اللہ) اور تیسرا ان کے اسلاف کا قول ہے، پس تم انہوں نے باطل میں ان کی تقلید کی اور کفر میں ان کی اتباع اور پیروی کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (الزخرف: 23) (کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر) (1)

مسئلہ نمبر 6۔ علماء کا ضھیا کے بارے اختلاف ہے کہ کیا اس میں مد ہوگی یا نہیں؟ پس ابن ولاء نے کہا ہے: امرأۃ ضھیا اور یہ وہ عورت ہے جسے حیض نہ آئے۔ یہ مہموز ہے اور بغیر مد کے ہے۔ اور بعض اسے مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور وہ سیبویہ ہیں پس وہ اسے فعلاء کے وزن پر مد کے ساتھ بناتے ہیں۔ اور اس میں ہمزہ زائد ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: نساء ضُھْی پس وہ ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں۔

ابوالحسن نے بیان کیا ہے کہ نجیرمی نے مجھے کہا: ضھیاۃ یعنی مد اور ہاء کے ساتھ۔ اس نے تانیث کی دو علامتیں جمع کر دیں۔ اس نے اسے ابوعمرو شیبانی سے نوادر میں بیان کیا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

ضھیأۃ أو عاقر جماد

ابن عطیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ یضاھئون عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: امرأۃ ضھیاء تو ان کا قول غلط ہے (2)۔ یہ ابوعلی نے کہا ہے، کیونکہ ضاھأ میں ہمزہ اصلی ہے اور ضھیاء میں ہمزہ زائدہ ہے جیسا کہ حمراء میں زائد ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں، کیونکہ ملعون مقتول کی مثل ہی ہوتا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ یہ تعجب کے معنی میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن کریم میں قتل سے مراد لعن (لعنت کرنا) ہی ہے۔ اور اسی معنی میں ابان بن تغلب کا قول ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 914

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24

قاتلها الله تَلحانِي وقد علمَتْ انّي لنفسي إفسادي و إصلاحي

نقاش نے بیان کیا ہے کہ قاتل اللہ کی اصل تو دعا ہے، پھر ان کا استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے خیر وشر میں اظہار تعجب کے لیے کہنے لگے اور اب وہ اس سے دعا کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور اصمعی نے شعر کہا ہے:

يا قاتل الله لَيْلَى كيف تعجبني وأخبر النّاس أنِّي لا أباليها

اس میں مراد تعجب کا معنی ہی ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

''انہوں نے بنا لیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو اپنے پروردگار اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح فرزند مریم کو بھی، حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں بجز اس کے کہ وہ عبادت کریں (صرف) ایک خدا کی، نہیں کوئی خدا بغیر اس کے، وہ پاک ہے اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ احبار، حبر کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ ہے جو اچھا قول کرتا ہو، اسے منظم کر سکتا ہو اور اپنے حسن بیان کے ساتھ اسے انتہائی مضبوط اور پختہ بنا سکتا ہو۔ اور اسی سے ثوب محبر ہے یعنی ایسا کپڑا جو حسن خوبصورتی کو جامع ہو(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاحبار کی واحد حبر حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور مفسرین حا پر فتحہ اور اہل لغت اس کے نیچے کسرہ پڑھتے ہیں۔ یونس نے کہا ہے: میں نے اسے نہیں سنا مگر حا کے کسرہ کے ساتھ، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے (مداد) حبر مراد عالم کی سیاہی ہے، پھر استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے مداد (سیاہی) کو ہی حبر (سیاہی) کہہ دیا۔ فراء نے کہا ہے: اس میں کسرہ اور فتحہ کی دونوں لغتیں ہیں۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: حبر کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی سیاہی ہے اور حبر فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عالم ہے۔ اور الرھبان، راھب کی مع ہے۔ یہ رھبۃ سے ماخوذ ہے، مراد وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر برانگیختہ کرے کہ وہ نیت کو اس کے لیے خالص کر دے نہ کہ لوگوں کے لیے۔ اور اپنا وقت اسی کے لیے، اپنا عمل اس کی معیت میں اور اپنا انس اسی کے ساتھ بنائے۔

قولہ تعالیٰ: اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اہل معانی نے کہا ہے: انہوں نے اپنے پادریوں اور راہبوں کو پروردگار کی طرح بنا لیا تھا اس طرح کہ انہوں نے ہر شے میں ان کی اطاعت و پیروی کی۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (الکہف: 96) یعنی آگ کی طرح بنا دیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

وهل أفسد الدّينَ إلا الملوكُ وأحبارُ سوء ورهبانها

کیا بادشاہوں، علماء سوء اور راہبوں کے سوا کسی نے دین کو فاسد کیا؟ (یعنی دین میں فساد انہوں نے ہی برپا کیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی

اعمش اور سفیان نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابوالبختری سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد باری تعالیٰ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے بارے پوچھا گیا کیا انہوں نے ان کی عبادت اور پرستش کی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، لیکن انہوں نے ان کے لیے حرام کو حلال قرار دیا تو انہوں نے اسے حلال سمجھ لیا اور انہوں نے ان پر حلال کو حرام قرار دیا تو انہوں نے اسے حرام ہی قرار دیا۔ اور ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عدی! یہ کیا ہے؟ اس بت کو اپنے سے پھینک دے'' اور میں نے آپ کو سورت براءت میں یہ پڑھتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ پھر فرمایا: ''خبردار سنو بے شک انہوں نے ان کی عبادت تو نہیں کی لیکن وہ جب کسی شے کو ان کے لیے حلال قرار دیتے تھے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب وہ ان پر کوئی شے حرام قرار دیتے تھے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے''۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، عبدالسلام بن حرب کی حدیث کے سوا اس کی کوئی پہچان نہیں۔ اور غطیف بن اعین حدیث میں معروف نہیں ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ اس کے اشتقاق کے بارے میں کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور مسیح سے مراد وہ پسینہ ہے جو پیشانی سے بہتا ہے، بعض متاخرین نے بہت خوب کہا ہے:

افرح　فسوف　تألف　الأحزانا　　إذا　شهدت　الحشر　والميزانا

تو خوش رہ پھر تو غموں سے مرکب ہوگا جب تو میدان حشر اور میزان کے پاس حاضر ہوگا۔

وسال　من　جبينك　المسيح　كأنه　جداول　تسيح

اور تیری پیشانی سے پسینہ بہے گا گویا کہ نالیاں بہہ رہی ہیں۔

اور مسیح کی نسبت اپنی ماں مریم کی طرف، اس کا معنی و مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''(یہ لوگ) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر''۔

قولہ تعالیٰ: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ مراد اللہ تعالیٰ کی توحید پر اس کے دلائل اور حجتیں ہیں۔ تو اس میں براہین و دلائل کو نور کے قائم و مقام رکھا ہے، کیونکہ ان میں بیان اور وضاحت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کا معنی نور اسلام ہے، یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنی تکذیب کے ساتھ بجھا دیں (ختم کر دیں) بِاَفْوَاهِهِمْ یہ اصل کی بنا پر فوہ کی جمع ہے، کیونکہ فم میں اصل فوہ ہے، جیسے حوض اور احواض ہے۔ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ کہا جاتا ہے: الا کیسے

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داخل کر دیا گیا حالانکہ کلام میں حرف نفی نہیں ہے اور ضربت إلا زیدا کہنا جائز نہیں ہے۔ تو فراء کا خیال یہ ہے کہ الا اس لیے داخل ہوا ہے کیونکہ کلام میں انکار کی ایک طرف (قسم) موجود ہے۔ زجاج نے کہا: انکار اور اثبات دونوں ذوی الاطراف نہیں ہیں۔ اور ادوات نفی: ما، لا، ان اور لیس ہیں۔ ان کی کوئی اطراف نہیں ہیں جن کے ساتھ کلام کی جاتی ہو اور اگر معاملہ اس طرح ہے جیسے انہوں نے ارادہ کیا ہے تو پھر کرھت الا زیدا کہنا جائز ہے، لیکن جواب یہ ہے کہ عرب اسے ابی کے ساتھ حذف کر دیتے ہیں۔ اور تقدیر کلام ہے: ویأبی اللہ کل شئ إلا أن یتم نورہ (اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے) اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: بلاشبہ ابی میں ایسا جائز ہے کیونکہ اس کا معنی روکنا یا رکنا ہے، پس یہ نفی کے مشابہ ہی ہے۔ اور یہ قول اچھا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وھل لِیَ اُمٌّ غیرُھا إن ترکتھا　　أبی اللہ إلا أن أکون لھا ابنَمَا

کیا میرے لیے اس کے سوا کوئی ماں ہے اگر میں اسے چھوڑ دوں، اللہ انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

''وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ بِالْهُدٰى یعنی فرقان (قرآن مجید) کے ساتھ۔ وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ یعنی دلائل اور براہین کے ساتھ (تمام دینوں پر اس دین حق کو غالب کر دے) تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے شرائع (اور احکام) پر غالب کر دیا یہاں تک کہ آپ پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہ رہی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِيُظْهِرَهٗ یعنی تا کہ وہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام مہدی کے خروج کے وقت ہوگا، اس وقت کوئی باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے گا یا پھر جزیہ ادا کرے گا (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہدی فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں اخبار صحیحہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں کہ امام مہدی علیہ السلام حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت میں سے ہوں گے (2)، لہٰذا انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر محمول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جو اس بارے میں وارد ہے کہ ''مہدی نہیں ہیں مگر عیسیٰ علیہ السلام'' وہ صحیح نہیں ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب البعث والنشور'' میں

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 428

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المہدی، حدیث نمبر 3735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب خروج المہدی، حدیث نمبر 4075، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: کیونکہ اس کے راوی محمد بن خالد جندی ہیں اور وہ مجہول ہیں، وہ ابان بن ابی عیاش سے روایت کرتے ہیں اور وہ متروک راوی ہیں اور وہ حسن سے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور وہ منقطع ہے۔ اور وہ احادیث جو اس سے قبل حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے بیان ہوئی ہیں اور ان میں یہ بیان ہے کہ امام مہدی علیہ السلام رسول اللہ کی عترت میں سے ہوں گے وہ اسناد کے اعتبار سے اصح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے اسے اپنی کتاب ''کتاب التذکرہ'' میں خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم نے امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں روایات مکمل طور پر ذکر کی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ سے جزیرہ عرب میں غلبہ مراد لیا ہے۔ تحقیق اس نے ایسا کر دیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾

''اے ایمان والو! بے شک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی''۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اس میں فعل مضارع پر لام داخل ہوا ہے (فَعَلَ) فعل ماضی پر لام داخل نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یفعل (فعل مضارع) اسماء کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور الاحبار سے مراد علماء یہود ہیں۔ اور الرهبان سے مراد وہ عیسائی ہیں جو عبادت میں مستغرق رہنے والے اور انتہائی کوشش کرنے والے ہیں۔ بالباطل کہا گیا ہے کہ بے شک وہ اپنے متبعین اور پیروکاروں کے اموال کئی شکلوں اور معین طریقوں سے کنیسوں، عبادت گاہوں اور کئی دوسرے ناموں پر لیتے تھے۔ جس سے وہ انہیں یہ وہم دلاتے تھے کہ ان میں مال خرچ کرنا شرعی حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ اور سبب ہے اور وہ اس دوران ان اموال کو روک لیتے تھے، جیسا کہ اسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس راہب سے ذکر کیا ہے جس نے اپنا جمع کیا ہوا مال نکالا۔ اسے ابن اسحاق نے سیر میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ دین کی حمایت اور شریعت کے قیام کے نام پر کئی طریقوں سے ان کے غلے (اناج) اور ان کے اموال لے لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ احکام میں رشوت لیتے تھے، جیسا کہ آج بہت سے والی اور حکمران کرتے ہیں۔ اور قولہ: بِالْبَاطِلِ ان تمام صورتوں کو جامع ہے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے دین والوں کو دین اسلام میں داخل ہونے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ لغت میں کنز کا اصلی معنی ملانا، جوڑنا اور جمع کرنا ہے۔

اور یہ سونے اور چاندی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں جانتے: ألا أخبركم بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة (1) (کیا میں تمہیں اس خیر اور بھلائی کے بارے خبر نہ دوں جسے ایک آدمی جمع کرتا ہے (اور وہ) نیک اور صالح عورت ہے، یعنی وہ اسے اپنے نفس کے لیے جوڑتا ہے اور اسے جمع کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

ولم تزوّد من جميع الكنز　غير حنوط و رَثيثِ بَزِّ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لا دَرَّ دَرِّی إن أطعمتُ جائعهم　قِرْفَ الحَتِیّ و عندی البُرُّ مكنوز

میری یہ خوبی خوبی نہیں ہے اگر میں ان کے بھوکوں کو گوگل کا پھل کھلاؤں حالانکہ میرے پاس گندم جمع پڑی ہوئی ہو۔

تو اس میں قرف الحتی سے مراد گوگل کا پھل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ ایک قوم کے پاس ٹھہرا ان کے نزدیک اس کی ضیافت گوگل کے پھل سے ہوئی اور وہی الحی ہے، پھر جب وہ لوگ اس کے پاس آئے اس وقت اس نے کہا: لَادَرَّ دَرِّی...... شعر۔ سونے اور چاندی کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جن پر مطلع نہیں ہوا جا سکتا، بخلاف دیگر ساز و سامان اور اموال کے (کہ ان پر اطلاع ہو سکتی ہے) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کنز سے مراد ہر وہ شے ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی اور جمع شدہ ہو، چاہے وہ زمین کے اندر ہو یا اس کے اوپر ہو۔ ذھب (سونے) کو ذھب اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلا جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے اور الفضۃ (چاندی) کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر متفرق ہو جاتی ہے اور بکھر جاتی ہے۔ اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد ہے: انْفَضُّوْٓا اِلَیْھَا (الجمعہ: 11)...... لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اس کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس آیت کے مراد بہ میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں اور یہی نظریہ اصم کا ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ اس قول کے بعد مذکور ہے: اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب اور ان کے علاوہ مسلمان بھی ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ صرف اہل کتاب کا ارادہ فرماتا تو پھر کلام اس طرح فرماتا: یَكْنِزُوْنَ یعنی اس کے ساتھ والذین مذکور نہ ہوتا۔ پس جب فرمایا: وَالَّذِیْنَ تو یہ ایک دوسرا نیا معنی ہے جو اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ یہاں جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ پس اَلَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ نیا کلام ہے اور یہ مبتدا کی بنا پر مرفوع ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد اہل قبلہ ہیں (2)۔ پس یہ تین اقوال ہیں۔ اور صحابہ کرام کے قول کے مطابق اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ان کے نزدیک کفار شریعت کے فروعی احکام کے مخاطب ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن وہب سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: میں مقام ربذہ سے گزرا تو اچانک میری ملاقات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی تو میں نے ان سے کہا: تمہیں اس منزل پر کس نے اتارا ہے؟ تو انہوں نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 426

فرمایا: میں شام میں تھا تو میرا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بارے اختلاف ہو گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور میں نے کہا: یہ ہمارے اور ان کے بارے نازل ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان یہی اختلاف تھا۔ تو انہوں نے میرے بارے شکایت لکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھے مدینہ طیبہ آنے کا لکھ بھیجا۔ پس میں وہاں حاضر ہوا تو بہت سے لوگ مجھ پر جمع ہو گئے یہاں تک کہ (یہ محسوس ہوا) گویا انہوں نے اس سے قبل مجھے نہیں دیکھا تھا۔ تو میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: اگر آپ چاہیں کہ کنارہ کش ہو جائیں تو بھی آپ ہمارے قریب ہی ہوں گے تو یہی وہ جملہ ہے جس نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے اور اگر آپ مجھ پر کسی حبشی کو امیر مقرر کر دیں تو میں یقیناً بات سنوں گا اور اس کی اطاعت کروں گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت سونے چاندی کی زکوٰۃ کے حکم کو بھی متضمن ہے اور وہ چار شرطوں کے ساتھ واجب ہوتی ہے: آزاد ہونا، مسلمان ہونا، سال کا گزرنا اور نصاب کا قرض سے محفوظ اور سلامت ہونا۔ نصاب دو سو درہم یا بیس دینار ہے یا دونوں میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا اور چالیسواں حصہ اس سے اور چالیسواں حصہ اس سے نکالا جائے گا۔ ہم نے کہا ہے کہ آزاد ہونا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ غلام کی ملکیت ناقص ہوتی ہے۔ اور ہم نے یہ کہا ہے کہ اسلام شرط ہے، کیونکہ زکوٰۃ پاکیزگی اور طہارت ہے اور کافر کو طہارت اور پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 110) تو اس میں زکوٰۃ کا مخاطب انہیں کو بنایا گیا ہے جنہیں نماز کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے: بے شک سال گزرنا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مال میں زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے'' اور پھر ہم نے یہ کہا ہے کہ نصاب شرط ہے۔ تو یہ اس لیے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو سو درہم سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور بیس دینار سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں''

سال کے شروع میں نصاب کے مکمل ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سال کے آخر میں اس کے مکمل ہونے کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ اس پر تمام (ائمہ) کا اتفاق ہے کہ نفع اصل کے حکم میں ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس آدمی کے پاس دو سو درہم ہوں پھر وہ انہیں تجارت اور کاروبار میں لگائے اور وہ سال کے آخر میں ایک ہزار ہو گئے تو وہ ایک ہزار کی زکوٰۃ ادا کرے گا، نفع کے لیے اسے از سر نو پورا سال گزارنے کی ضرورت نہیں۔ تو جب صورت حال اس طرح ہے تو پھر نفع کا حکم مختلف نہیں ہوگا، چاہے وہ نصاب سے حاصل ہو یا اس سے کم۔ اور اسی طرح اس پر بھی تمام نے اتفاق کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہوں، پھر انہوں نے سال کے شروع میں بچوں کو جنم دیا پھر ان میں سے سوائے ایک کے ساری مائیں (یعنی بڑی بکریاں) مر گئیں اور ان کے بچے نصاب کو مکمل کر رہے ہوں تو بلا شبہ ان سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے اس کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے کہ آیا اسے کنز کا نام

دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: ہاں (اسے کنز کہا جاسکتا ہے) اور اسے ابوالضحی نے جعدہ بن ہبیرہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار ہزار اور جو اس سے کم ہے وہ نفقہ اور خرچہ ہے۔ اور جو اس سے زیادہ ہے تو وہ کنز ہے اگرچہ تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: وہ مال جس سے تو زکوٰۃ ادا کر دے یا جس مال کی کسی دوسرے مال کے ساتھ زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ کنز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی تو وہ کنز نہیں ہے اگرچہ وہ سات زمینوں کے نیچے ہو اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو وہ کنز ہے اگرچہ وہ زمین کے اوپر ہو: ما أدی زکاته فلیس بکنز وإن کان تحت سبع أرضین، وکل مال لم تؤد زکاته فهو کنز وإن کان فوق الأرض اور اسی کی مثل حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ صحیح ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے اسے قیامت کے دن گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جس پر دو سیاہ نشان ہوں گے اور وہ قیامت کے دن اس کے گلے میں لپٹ جائے گا پھر اس کی باچھوں کو پکڑ کر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الآیہ (آل عمران: 180) (اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے)

اور اس میں بھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! یا قسم ہے اس کی جس کے بغیر کوئی الہٰ نہیں یا جیسے بھی آپ نے قسم کھائی۔ ہر وہ آدمی جس کے پاس اونٹ یا گائیں یا بکریاں ہوں اور وہ ان کا حق ادا نہ کرتا ہو تو قیامت کے دن انہیں اس سے بڑا اور موٹا کر کے لایا جائے گا جتنا وہ ہوتے ہیں اور وہ اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روند ڈالیں گے اور اسے اپنے سینگوں کے ساتھ ماریں گے جب بھی ان میں سے آخری آگے گزر جائے گا تو ان میں سے پہلے کو پھر اس پر لوٹا دیا جائے گا یہاں تک کہ اسے لوگوں کے درمیان ڈال دیا جائے گا''۔ پس ان دونوں حدیثوں کے خطاب کی دلیل اس مفہوم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس معنی کو صحیح بخاری میں بیان کیا ہے، ایک اعرابی نے آپ کو کہا: مجھے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی: وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کے بارے بتائیے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے انہیں جمع کیا اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے ہلاکت ہے، بلاشبہ یہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا، پس جب زکوٰۃ کا حکم نازل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مالوں کے لیے طہارت اور پاکیزگی بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز سے مراد وہ مال ہے جو حاجت اور ضرورت سے زائد اور فالتو ہو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور یہ جو نقل کیا گیا ہے یہ ان ہی کا مذہب ہے اور یہ ان کے ان شدائد اور سختیوں میں سے ہے جن کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ وہ مجمل ہے جو اس بارے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ جو روایت کیا گیا ہے کہ آیت انتہائی شدید حاجت کے وقت نازل ہوئی اور مہاجرین کی انتہائی کمزوری اور ضعف کے وقت اور ایسے وقت میں رسول

الله صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک ان کی کفایت سے انتہائی تنگ تھا اور بیت المال میں بھی ان کے لیے کوئی وسعت اور خوشحالی نہ تھی۔ اور خشک سالی ان پر حملہ آور تھی، تو اس حالت میں انہیں حاجت اور ضرورت کی مقدار سے زیادہ مال میں سے کوئی شے رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس جیسے وقت میں سونا، چاندی ذخیرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ پس جب الله تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور انہیں وسعت وخوشحالی عطا فرما دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسو دراہم میں سے پانچ درہم اور بیس دینار میں سے نصف دینار واجب کر دیا۔ اور کل واجب نہ کیے اور بڑھنے کی مدت کا اعتبار کیا، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیان اور وضاحت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز وہ مال ہے جس سے پیش آمدہ حقوق ادا نہ کیے جائیں، جیسا کہ قیدی کی رہائی، بھوکے کو کھانا کھلانا اور دیگر اسی طرح کے امور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کنز لغوی طور پر سونے چاندی کے مجموعہ اور ان کے علاوہ اس مال کو کہا جاتا ہے جسے قیاس کے ساتھ ان دونوں پر محمول کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان دونوں کا مجموعہ ہے جب کہ وہ زیور نہ ہو، کیونکہ ان سے زیور بنانے کی اجازت دی گئی ہے اور اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور صحیح وہی ہے جس کے ذکر سے ہم نے آغاز کیا اور بلاشبہ وہ سب کا سب لغۃً اور شرعاً کنز ہے۔ والله اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ زیورات کی زکوٰۃ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، امام احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابو عبید رحمہم اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور عراق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی تھا اور اس کے بعد مصر میں آپ نے اس میں توقف کیا ہے اور فرمایا ہے: میں اس بارے میں الله تعالیٰ سے استخارہ کروں گا۔ امام ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: ان تمام میں زکوٰۃ ہے۔ پہلے گروہ نے حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: نمو اور بڑھوتری کا پایا جانا سامان میں زکوٰۃ کو واجب کرتا ہے حالانکہ وہ زکوٰۃ واجب کرنے کا محل نہیں ہے۔ اسی طرح سونے چاندی سے اپنی ذات کے لیے زیور بنانے کے سبب نمو کا ختم ہو جانا زکوٰۃ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سونے چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے بارے عموم الفاظ سے استدلال کیا ہے اور آپ نے زیورات اور ان کے غیر میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اور حضرت لیث بن سعد نے فرق کیا ہے پس انہوں نے ان زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے جو محض زکوٰۃ سے بچنے کے ارادہ سے بنائے جائیں اور ان میں زکوٰۃ کو ساقط کر دیا ہے جو پہننے کے لیے اور عاریۃً دینے کے لیے بنوائے جائیں۔ زیورات کے بارے میں مذاہب میں تفصیل ہے، اس کا بیان کتب فروع میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ فرمایا: مسلمانوں پر یہ گراں ثابت ہوئی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم سے اس مشقت کو دور کر دوں گا، چنانچہ آپ چلے اور حضور کی بارگاہ میں عرض کی: یا نبی الله! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ کے اصحاب پر یہ آیت بھاری اور گراں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک الله تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی مگر اس لیے تاکہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور بے شک اس نے میراث کا حق مقرر کیا ہے۔ اور ایک کلمہ ذکر کیا...... تاکہ وہ تمہارے بعد آنے والوں کے لیے ہو جائے“۔ راوی کا قول ہے: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تکبیر بلند کی۔ پھر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

''کیا میں تمہیں اس بہترین خزانہ کے بارے خبر نہ دوں جسے آدمی جمع کر سکتا ہے وہ نیک اور صالح بیوی ہے جب آدمی اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کر دے اور جب اسے حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ اس سے غائب ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے۔ ألا أخبرك بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة إذا نظر إليها سرته وإذا أمرها اطاعته وإذا غاب عنها حفظته (1) اور ترمذی وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بیان کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی کی مذمت بیان کی ہے، پس اگر ہمیں علم ہو کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسے ہی کمائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کروں گا۔ پس آپ نے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایسی بیوی جو دین کے معاملے میں آدمی کی معاون اور مددگار ہو۔ لسان ذاکر وقلب شاکر وزوجة تعين المرء على دينه۔ (2)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں ولا ينفقونهما نہیں فرمایا۔ تو اس کے چھ جواب ہیں (۱) ابن الانباری نے کہا ہے: رب کریم نے اغلب اور اعم کا قصد کیا ہے اور وہ چاندی ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (البقرہ: 45) اس میں ہا ضمیر صلوٰۃ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ وہی اعم ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11) تو اس میں بھی ہا ضمیر تجارۃ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہ اعم ہے اور لھو کو چھوڑ دیا ہے، بہت سے مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے اس کا انکار بھی کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ او نے تجارت کو لھو سے جدا کر دیا ہے پس ضمیر کو ان دو میں سے ایک کی طرف لوٹانا اچھا ہے۔ (۲) اس کا برعکس ہے، اور وہ یہ ہے کہ ينفقونها سونے کے لیے ہو اور دوسرا اس پر معطوف ہو۔ اور الذهب (سونے) کو عرب مؤنث پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں: هي الذهب الحمراء (یہ سرخ سونا ہے) اور کبھی مذکر بھی پڑھا جاتا ہے لیکن تانیث زیادہ مشہور ہے۔ (۳) کہ یہ ضمیر کنوز کے لیے ہو۔ (۴) ضمیر جمع کیے گئے مالوں کے لیے ہو۔ (۵) ضمیر زکوٰۃ کے لیے ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ولا ينفقون زكاة الأموال المكنوزة (وہ جمع کیے گئے اموال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) (۶) صرف ایک ضمیر پر اکتفا کرنا جب کہ معنی سمجھا جا سکے اور یہ عرب کلام میں بہت زیادہ ہے۔ سیبویہ نے شعر بیان کیا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأي مختلفِ

اس میں راضون جمع نہیں کہا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

رَماني بأمرٍ كنتُ منه ووالدي بريئا ومن أجل الطَّوِيّ رماني

اس میں بریئین نہیں کہا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3019، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسی طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

إن شرخ الشباب والشعر الأسود مالم يُعاص كان جنونا

اس میں آپ نے یعاصیا تثنیہ نہیں کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اگر کہا جائے: جس نے مال جمع نہیں کیا اور نہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا بلکہ اسے گناہوں میں خرچ کیا، کیا وعید میں اس کا حکم اس کے حکم کی مثل ہی ہوگا جس نے مال جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا؟ تو جواب یہ ہے: بلاشبہ یہ اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، کیونکہ جس نے اپنا مال گناہوں اور معاصی میں خرچ کیا اس نے دو اعتبار سے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا۔ خرچ کرنے کے اعتبار سے اور مال حاصل کرنے کے اعتبار سے، جیسا کہ شراب کو خریدنا اور پھر اسے پینا، بلکہ کئی جہتوں سے وہ معصیت ہے جب کہ معصیت متعدی گناہوں میں سے ہو، جیسا کہ وہ آدمی جس نے کسی مسلم پر ظلم کرنے میں کسی کی مدد کی مثلاً اسے قتل کرنے میں یا اس کا مال چھیننے میں وغیرہ وغیرہ۔ اور مال جمع کرنے والے نے دو اعتبار سے معصیت کی ہے۔ اور وہ زکوٰۃ نہ دینا اور مال کو روکنا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور کبھی مال کو روکنے کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عذاب کی اپنے اس ارشاد کے ساتھ تفسیر اور وضاحت بیان کی ہے: ''ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بشارت دے دو داغ دینے کی جو ان کی پشتوں میں لگیں گے (اور) ان کے پہلوؤں میں ظاہر ہو جائیں گے اور ان کی گدی کی جانب سے لگائے جائیں گے اور ان کی پیشانیوں کی طرف سے نکل آئیں گے''۔ الحدیث اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک روایت میں بیان کیا ہے: ''ذخیرہ اندوزوں کو بشارت اس پتھر کے بارے جسے جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اسے ان میں سے ہر ایک کے سر پستان پر رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے کندھے کے اوپر کی جانب سے نکل جائے گا اور اسے اس کے کندھے کی اوپر کی جانب رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے سر پستان سے نکل جائے گا اور وہ لرز جائے گا''۔ الحدیث۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: پتھر کا سر پستان سے داخل ہو کر کندھے کے اوپر کی جانب سے نکلنا اس کے دل اور اس کے باطن کو عذاب دینے کے لیے ہے جب کہ دنیا میں وہ مال کی کثرت، فرحت و سرور سے بھرا رہا، تو اب آخرت میں غم و اندوہ اور عذاب کے ساتھ اسے سزا دی جائے گی (1)۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علمائے نے کہا ہے: آیت کا ظاہر وعید کو اس آدمی کے ساتھ معلق کیے ہوئے ہے جو مال جمع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتا اور وہ واجب وغیرہ کے لیے تعرض کرتا ہے، مگر کنز کے خاص طریقہ کا اعتماد کرنا مناسب نہیں، کیونکہ جس نے مال جمع نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روکتا رہا ضروری ہے کہ وہ بھی اس طرح ہو، مگر وہ آدمی جو زمین کے نیچے مال چھپا دیتا ہے وہ وہی ہے جو عرفاً اسے واجبات میں خرچ کرنے سے روکتا ہے، پس اسی لیے وعید کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 922

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

''جس دن تپایا جائے گا (یہ سونا چاندی) جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں (اور انہیں بتایا جائے گا) کہ یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے لیے تو (اب) چکھو (سزا اس کی) جو تم جمع کیا کرتے تھے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، يَّوْمَ ظرف ہے اور تقدیر عبارت ہے: یعذبون یوم یحمی (وہ عذاب دیئے جائیں گے اس دن جس دن اسے تپایا جائے گا) اور یہ صحیح نہیں ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: فبشرھم یوم یحمی علیھا کیونکہ اس دن بشارت نہیں ہوگی۔ کہا جاتا ہے: أحمیت الحدیدۃ فی النار، ای أوقدت علیھا (یعنی لوہے کو آگ پر جلایا گیا) اور کہا جاتا ہے: أحمیتہ (میں نے اسے گرم کیا) اور یہ نہیں کہا جاتا: أحمیت علیہ (میں نے اس پر گرم کیا) اور یہاں علیھا فرمایا ہے: کیونکہ یہاں علی، احماء کے معنی کا صلہ بنایا ہے اور احماء کا معنی ایقاد (بھڑکانا) ہے یعنی اسے آگ پر خوب گرم کیا جائے گا اور داغ دیئے جائیں گے۔ الکی کا معنی ہے: گرم ہونے والے لوہے اور آگ کو عضو کے ساتھ چپکانا یہاں تک کہ جلد جل جائے۔ اور الجباہ جبھۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد حاجب (ابرو) اور ناصیہ (پیشانی کے بال) کے درمیان والی ہموار جگہ ہے یعنی پیشانی۔ اور جبھت فلانا بکذا اس کا معنی ہے میں نے اس کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس کی پیشانی پر ضرب لگائی اور جنوب جنب کی جمع ہے (یعنی پہلو) اور چہرے پر داغ دینا زیادہ واضح اور زیادہ عیب ناک ہے اور پہلو اور پشت میں زیادہ دردناک اور زیادہ تکلیف دہ ہے، پس اسی وجہ سے تمام اعضاء کے درمیان سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا۔ اور علماء صوفیہ نے کہا ہے: جب انہوں نے مال و جاہ کو طلب کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو عیب ناک بنا دیا اور جب انہوں نے فقیر سے اعراض کیا، پہلو تہی اختیار کی جب وہ ان کے ساتھ آ کر بیٹھا تو ان کے پہلوؤں میں داغ دیئے گئے۔ اور جب انہوں نے اپنی پشتوں کو اپنے اموال کے ساتھ لگایا ان سے وثوق حاصل کرتے ہوئے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی پشتوں کو داغا گیا۔ (1)

اور علماء ظاہر نے کہا ہے: بلاشبہ ان اعضاء کو خاص اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ غنی اور دولت مند آدمی جب فقیر کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھوں کی درمیانی جگہ کو اکٹھا کر لیتا اور وہ اپنا منہ چڑھا لیتا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

یَزِید یَغُضّ الطرف عنی کأنما زوی بین عینیہ علیَّ المحاجِمُ
فلا ینبسط من بین عینیك ما انزوی ولا تَلْقَنی إلا وأنفُك راغِمُ

اور جب اس سے وہ مانگے تو وہ اعراض برت لیتا ہے اور جب وہ سوال میں اضافہ کرے اور کثرت سے اسے کہے تو وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 924

اس سے اپنی پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے معصیت کی حالت پر ہی سزا کو مرتب کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کے ساتھ داغ دینے کی کیفیت میں روایات مختلف ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اس میں پتھر کا ذکر ہے۔ اور اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بھی سونے اور چاندی کا مالک نہیں جو اس سے اس کا حق ادا نہیں کرتا مگر جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کے لیے آگ پر چوڑی سلاخیں بنائی جائیں گی پھر انہیں جہنم کی آگ پر گرم کیا جائے گا اور ان کے ساتھ اس کے پہلو، چہرے اور اس کی پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے اور جب بھی وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی تو اس کے لیے انہیں دوبارہ لوٹایا جائے گا اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ جنت یا جہنم کی طرف اپنا راستہ دیکھ لے گا'' (1)۔ الحدیث۔ اور بخاری میں ہے: ''بے شک اس کے خزانے کو اس کے لیے گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا''۔ اور غیر صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس کا کوئی مال ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اسے گنجے سانپ کا طوق پہنایا جائے گا اور وہ اس کے سر میں ڈنگ لگائے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید ایسا مختلف جگہوں میں ہوگا۔ ایک جگہ پر اس مال کو اژدہا کی مثل بنا دیا جائے گا۔ اور ایک جگہ وہ سلاخیں ہو جائے گا اور ایک جگہ وہ پتھر ہو جائے گا پس صفات بدلتی رہیں گی لیکن جسمیت ایک ہوگی۔ پس سانپ بھی ایک جسم ہے اور مال بھی ایک جسم ہے۔ اور یہ تمثیل حقیقت ہے، بخلاف اس قول کے: ''موت کو لایا جائے گا گویا کہ وہ ایک چتکبرہ مینڈھا ہے''۔ کیونکہ یہ ایک دوسرا طریقہ ہے۔ (3)

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور سانپ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ مخلوق کا دوسرا دشمن ہے اور الشجاع سانپوں میں سے وہ سانپ ہے جو شہسوار اور پیدل پر جھپٹ پڑتا ہے، حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنی دم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات گھڑ سوار تک جا پہنچتا ہے اور یہ صحراؤں میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اژدھا ہے۔ اللحیانی نے کہا ہے: سانپ کو شجاع کہا جاتا ہے اور ثلاثۃ اشجعہ ہیں اور پھر شجعان ہے۔ اور اقرع سانپوں میں سے وہ ہے جس کے سر کے بال گر جاتے ہیں (یعنی گنجا ہوتا ہے) اور زہر کے سبب سفید ہوتا ہے۔ اور موطا میں ہے: اس کی باچھوں میں دو نقطے (نشان) سے ابھرے ہوتے ہیں جیسا کہ جھاگ ہوتی ہے اور وہ انسان کی باچھوں میں بھی بن جاتے ہیں جب وہ غصے میں ہو اور گفتگو بہت زیادہ کرے (ام) غیلان بنت جریر نے کہا ہے: بسا اوقات میں اپنے باپ کے شعر پڑھتی رہتی ہوں یہاں تک کہ میری باچھوں میں جھاگ بن آتی ہے۔ یہ اس سانپ کی مثال بیان کی گئی ہے جس کا زہر بہت زیادہ ہوتا ہے پس مال کو اس حیوان کی مثل بنا دیا جائے گا جو اپنے مالک کو غصے میں گرا دیتا ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے: اس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ رنگ کے نقطے ہوتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے: اس کو ایسے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جو اس کا پیچھا کرے گا اور اسے مجبور کر دے گا پس وہ اسے اپنا ہاتھ دے گا اور وہ اسے چبا

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7563 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 921

ڈالے گا جیسے نر دانتوں کے ساتھ کاٹ ڈالتا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کسی کو جمع شدہ مال کے ساتھ عذاب نہیں دے گا پس نہ کوئی درہم درہم کو مس کرے گا اور نہ دینار دینار کو مس کرے گا، مگر اس کی جلد کو وسیع کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ہر درہم اور دینار کو علیحدہ علیحدہ رکھا جائے گا۔ اور یہ کافر کے بارے میں بلاشبہ صحیح ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ نہ کہ مومن کے بارے میں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ طبری نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ تک سند بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اہل صفہ میں سے ایک آدمی فوت ہوا اس کی چادر میں ایک دینار پایا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ایک داغ ہے'' پھر دوسرا فوت ہوا اور اس کے پاس دو دینار پائے گئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ دو داغ ہیں''(1) اور یہ یا تو اس لیے ہے کہ یہ دونوں مال صدقہ سے زندگی گزارتے تھے حالانکہ دونوں کے پاس سونا تھا اور یا اس لیے کہ یہ صدر اسلام کا دور تھا، پھر شریعت نے مال جمع کرنے اور اس کے حق ادا کرنے کے احکام مضبوط اور پختہ کر دیئے۔ اور اگر مال کو جمع کرنا ممنوع ہوتا تو پھر اس کا حق یہ ہوتا کہ وہ سارے کا سارا نکال دیا جائے اور امت میں ایسا کوئی نہیں جو یہ لازم کرتا ہو۔ اور تیرے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اموال ہی کافی ہیں۔ اور وہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے تو وہ انہی کا مذہب ہے۔ اور موسیٰ بنت عبیدہ نے عمران بن ابی انس سے، انہوں نے مالک بن اوس بن الحدثان سے اور انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دینار یا درہم یا سونا یا چاندی جمع کی اور اسے کسی قرض خواہ کو نہ دیا اور نہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو وہ کنز ہے قیامت کے دن اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لائق اور مناسب ہی ہے کہ وہ یہ کہیں اور یہ کہ جو حاجت اور ضرورت سے زائد ہے وہ کنز نہیں ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ کے لیے تیار کیا جائے۔

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جس نے چاندی یا سونا پیچھے چھوڑا اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا چاہے اس کی مغفرت کی گئی ہو یا مغفرت نہ کی گئی ہے۔ خبردار سنو! بلاشبہ تلوار پر لگا ہوا زیور بھی اسی میں سے ہے۔ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی اس حال میں فوت ہوتا ہے کہ اس کے پاس سونا یا چاندی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر قیراط کے ساتھ ایک سلاخ بنا دے گا اس کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں تک داغا جائے گا اس کے بعد اس کی بخشش ہو یا اسے عذاب دیا جائے''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اس صورت پر محمول کیا جائے گا جب اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور اس کی دلیل آیت کے ضمن میں ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی: وعندہ أحمر أو أبیض لم یؤد زکاتہ اور اسی طرح وہ روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جس نے دس ہزار چھوڑے اس کی سلاخیں بنائی جائیں گی اور اس کے ساتھ اس کے مالک کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا(2)، یعنی اگر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تاکہ احادیث میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 429
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923

تناقض لازم نہ جائے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی ان کو کہا جائے گا: یہ ہے وہ جو تم نے جمع کیا۔ پس اس سے یقال لھم کے الفاظ محذوف ہیں۔ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ یعنی چکھو اس کا عذاب جو تم جمع کرتے رہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶

"بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ہے کتاب الٰہی میں جس روز سے اس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو، ان میں سے چار عزت والے ہیں، یہی دین قیم ہے پس نہ ظلم کرو ان مہینوں میں اپنے آپ پر اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ، شهور، شهرٌ کی جمع ہے۔ پس جب کوئی آدمی اپنے بھائی سے کہے: لا اکلمك الشهور (میں تیرے ساتھ مہینے کلام نہیں کروں گا) اور وہ اس پر ہر قسم کھائے تو وہ ایک سال تک اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ یہ بعض علماء نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس کی کوئی نیت نہ ہو تو یہ قول تین مہینوں کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ وہ کم سے کم جمع ہے جس کا تقاضا فعول کا صیغہ کرتا ہے اور یہ فعل کی جمع ہے(1)۔ اور عند اللہ کا معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم میں اور اس میں جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اثنا عشر شهرا، اثنا عشر شهرا کو معرب پڑھا گیا ہے، بخلاف اس کی نظائر کے، کیونکہ اس میں اعراب کا حرف اور اس کی دلیل موجود ہے۔ عام قراء نے عشر عین اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے عشر شین کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔

فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ عِنْدَ اللّٰهِ کہنے کے بعد اس کا اعادہ کیا کیونکہ بہت سی اشیا کا وصف اس کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے (کہ وہ اللہ کے پاس ہیں) اور یہ نہیں کہا جا سکتا انه مکتوب فی کتاب اللہ (کہ وہ کتاب اللہ میں لکھی ہوئی ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان: 34) (بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بے شک اس نے کہا ہے: يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 925

وَ الْاَرْضَ، تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ اس کی قضاوقدر اس سے پہلے تھی۔ اور یہ کہ الله سبحانہ وتعالیٰ نے ان مہینوں کو وضع کیا اور ان کے نام ان اسماء کے ساتھ رکھے جن پر انہیں مرتب فرمایا اس دن سے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ اور انہیں اپنے انبیاء علیہم السلام پر اپنی نازل کردہ کتابوں میں نازل فرمایا۔ اور الله تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا کا یہی معنی ہے۔ اور ان کا حکم اسی حال پر باقی ہے جس پر یہ تھے مشرکوں نے ان کے ناموں کو بدلنے کے ساتھ انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا اور ان سے اسم میں مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے نے (انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا) اور اس سے مقصود ان کے بارے میں الله تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرنا ہے اور اس طریقہ کو چھوڑنا ہے جسے مہینوں کے ناموں کو مقدم و موخر کرنے اور احکام کو ان اسماء پر جن کو انہوں نے ان پر مرتب کیا تھا معلق کرنے میں سب اہل جاہلیت اپنائے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا: ''اے لوگو! بے شک زمانہ اپنی اس حالت پر گردش کناں ہے جس روز سے الله تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے''۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور وہ جو اہل جاہلیت نے کیا کہ انہوں نے محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنایا تو اس سے وہ وصف تبدیل نہیں ہوتا جو الله تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ یوم میں عامل وہ مصدر ہے جو فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں ہے اس سے مراد کتب کی واحد نہیں، کیونکہ اعیان ظروف میں عمل نہیں کر سکتے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے: فیما کتب الله یوم خلق السموات والأرض اور عند، عدۃ مصدر کے متعلق ہے اور وہی اس میں عامل ہے اور فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں فی محذوف کے متعلق ہے، وہ قول باری تعالیٰ: اثْنَا عَشَرَ کی صفت ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: اثنا عشر شهرا معدودة أو مكتوبة فی كتاب الله اور یہ جائز نہیں کہ یہ عدۃ کے متعلق ہو، کیونکہ اس میں صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ تفرقہ موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادات وغیرہ میں سے احکام کو معلق کرنا واجب ہے بلاشبہ وہ ان مہینوں اور سالوں کے ساتھ ادا ہوتے ہیں جنہیں عرب جانتے ہیں، نہ کہ ان مہینوں کے ساتھ جو عجم، روم اور قبط میں معتبر ہیں، اگرچہ یہ بارہ مہینوں سے زائد نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دنوں کی تعداد مختلف ہے، ان میں سے کچھ تیس دنوں سے زائد ہوتے ہیں اور کچھ تیس دنوں سے کم ہوتے ہیں اور عربوں کے مہینے تیس دنوں سے زائد نہیں ہوتے اگرچہ ان میں سے بعض ان سے کم ہوتے ہیں اور وہ جو کم ہوتا ہے وہ کوئی مہینہ متعین نہیں، بلاشبہ ان میں کم ہونے اور مکمل ہونے کے درمیان تفاوت بروج میں چاند کی چال کے مختلف ہونے کی بناء پر ہوتا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ وہ حرمت اور عزت والے مہینے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور وہ رجب ہے جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔ اور وہی رجب مضر ہے اور اس کو رجب مضر کہا گیا ہے: کیونکہ ربیعہ بن نزار رمضان کے مہینے کو حرام اور عزت والا مہینہ قرار دیتے تھے اور وہ اسے رجب کا نام دیتے تھے۔ اور مضر نفس رجب کو بھی حرمت والا مہینہ کہتے تھے، پس اس لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری

الذی بین جمادی و شعبان (یعنی وہ جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے) اور اس کے نام میں جو خلل تھا اسے اس بیان کے ساتھ ختم کر دیا۔ عرب بھی اسے **منصل الاسنه** کا نام دیتے تھے (کیونکہ ان کا طریقہ تھا کہ جب رجب آتا تو وہ اپنے تیر اور نیزوں کے بھالے اتار کر رکھ چھوڑتے تھے تاکہ اس مہینے میں کوئی ایسا فعل نہ صادر ہو جو اس کی حرمت کے خلاف ہو)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رجاء عطاردی سے روایت نقل کی ہے۔ اور ان کا نام عمران بن ملحان ہے اور یہ قول بھی ہے کہ نام عمران بن تیم ہے...... انہوں نے بیان کیا: ہم پتھروں کی پوجا کرتے تھے، پس جب ہم کسی پتھر کو پاتے کہ وہ اس (پہلے) سے بہتر اور اچھا ہے تو ہم اسے پھینک دیتے اور دوسرے کو اٹھا لیتے اور جب ہم کوئی پتھر نہ پاتے تو ہم کچھ مٹی جمع کرتے پھر ہم اسے بکریوں کے پاس لے کر آتے اور اس پر انہیں دوہتے پھر اسے لے کر گھومتے پھرتے رہتے اور جب رجب کا مہینہ آ جاتا تو ہم کہتے **منصل الاسنه**، پس ہم کسی نیزے میں اس کا بھالہ اور نہ کسی تیر میں اس کا لوہا چھوڑتے مگر ہم اسے اتار لیتے اور اسے پھینک دیتے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ مراد صحیح حساب اور پورا عدد ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے: ذٰلِكَ الدِّيْنُ سے مراد ذلك القضاء (وہ فیصلہ) ہے۔ حضرت مقاتل نے کہا ہے: مراد حق ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہاں دین سے مراد اس کی مشہور وجوہ ہوں، مراد وہ شرع اور طاعت ہے۔ الْقَيِّمُ یعنی سیدھا قائم ہونے والا، یہ قام یقوم سے ہے۔ اور یہ سید کی مثل ہے جو کہ ساد یسود سے ہے۔ اور اس کی اصل قیوم ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق هن ضمیر تمام مہینوں کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ صرف اشہر حرم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ یہ ان کے زیادہ قریب ہے اور ظلم بڑھنے کی صورت میں ان کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 197) (تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ من مانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں)

یہ مطلب نہیں کہ ان دنوں کے علاوہ میں ظلم جائز ہے جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ ظلم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے تم ان میں قتال کے ساتھ اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو، پھر تمام مہینوں میں قتال کو مباح قرار دے کر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ یہ حضرت قتادہ، عطا خراسانی، زہری اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ لوگوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ حرم پاک میں لڑیں اور نہ یہ حلال ہے کہ وہ اشہر حرام میں لڑیں مگر یہ کہ وہ ان میں باہم لڑیں اور یہ منسوخ نہیں ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہوازن کے ساتھ حنین میں اور ثقیف کے ساتھ طائف میں جنگ لڑی اور آپ نے شوال اور ذوالقعدہ کے کچھ دن ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور یہ بیان سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ تم ان مہینوں میں گناہوں کا ارتکاب کر کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 31

اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب ایک جہت سے کسی شے کو عظیم بنا دیتا ہے تو اس کے لیے ایک حرمت ہو جاتی ہے اور جب وہ اسے دو جہتوں سے یا کئی جہتوں سے عظیم بنا دے تو پھر اس کی حرمت بھی متعدد ہوتی ہے پس اس میں برے عمل کے سبب سزا دوگنا کر دی جاتی ہے اور اسی طرح عمل صالح کے سبب ثواب بھی دوگنا کر دیا جاتا ہے، کیونکہ جس نے حرمت والے مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس کا ثواب اس آدمی کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے حلال مہینے میں شہر حرام میں اس کی اطاعت کی اس کا ثواب اس کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حلال میں اس کی اطاعت کی۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب:30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا) (1)

مسئلہ نمبر 7۔ اس معنی کے اعتبار سے علماء نے اس آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے شہر حرام میں کسی کو خطاءً قتل کر دیا کہ کیا اس پر دیت مغلظہ ہوگی یا نہیں؟ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دیت کے بارے میں جو ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے شہر حرام میں اور حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس میں دیت مغلظہ لازم کی جائے گی، لہٰذا وہ دیت اور ایک ثلث مقرر ہوگی اور شبہ عمد کی صورت میں اونٹوں کی عمروں میں اضافہ کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرام مہینے اور بلد حرام اور ذوی الرحم میں کسی کو قتل کرنے اور زخم لگانے کی صورت میں دیت مغلظہ لازم ہوگی۔ قاسم بن محمد، سالم بن عبد اللہ، ابن شہاب اور ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے: جس نے حرام مہینے میں یا حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس کی دیت میں تہائی دیت کے برابر اضافہ کیا جائے گا۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور امام مالک امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: حل اور حرم پاک میں قتل کرنا برابر ہے۔ اسی طرح حرام مہینے میں اور دوسرے مہینے میں قتل کرنا برابر ہے اور یہی تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیتوں کا ذکر کیا اور ان میں حرم پاک اور حرام مہینوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حرام مہینے یا کسی دوسرے مہینے میں کسی کو خطاءً قتل کیا اس پر ایک جیسا کفارہ ہوگا، (یعنی کفارہ میں دونوں برابر ہوں گے) تو پھر قیاس یہ ہے کہ دیت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ نے چار اشہر حرام کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے اور ان میں ظلم سے منع کیا ہے: یہ ان کے شرف اور عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہے، اگرچہ ہر زمانے میں ظلم ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ:197) اکثر اہل تاویل کا موقف یہی ہے، یعنی تم چار مہینوں میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اور حماد بن مسلم نے علی بن زید سے، انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ کا معنی ہے تم بارہ مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو (2)۔ اور قیس بن مسلم نے حسن

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 927

2۔ تفسیر الطبری، جلد 11، صفحہ 444

سے اور انہوں نے محمد بن حنفیہ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: فیھن کلھن (ان تمام مہینوں میں) پس اگر پہلے قول کی بنا پر کہا جائے: فیھن کیوں فرمایا اور فیھا نہیں فرمایا؟ تو وہ اس لیے ہے کہ عرب لوگ تین سے لے کر دس تک کے لیے ھن اور ھولاء بولتے ہیں اور جب وہ دس سے تجاوز کر جائیں تو پھر ھی اور ھذہ بولتے ہیں، یہ ارادہ کرتے ہوئے کہ قلیل کو کثیر کا نام دینا معروف ہے (یعنی جمع قلت کا جمع کثرت سے نام رکھنا معروف ہے) اور کسائی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں عربوں کے اس فعل سے بڑا متعجب ہوں۔ اسی طرح وہ دس سے کم راتوں کے لیے کہتے ہیں: خلون اور اس سے زیادہ کے لیے خلت بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ بعض زمانوں کو بعض سے حرمت کے اعتبار سے عظیم کیسے بنا دیا گیا ہے؟ کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے فضیلت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے، اس کے عمل کی نہ کوئی علت ہے اور نہ اس پر کوئی پابندی، بلکہ جو وہ اپنی حکمت کے مطابق ارادہ فرماتا ہے وہ کر دیتا ہے، اور کبھی اس میں حکمت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مخفی ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اس میں ایک مسئلہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا یہ قتال کے بارے امر ہے۔ اور کافۃ کا معنی ہے جمیعا (سب کے سب) یہ مصدر ہے اور حال کے محل میں واقع ہے ای محیطین بھم و مجتمعین (اور تم جنگ کرو مشرکوں سے اس حال میں کہ تم ان تمام کو گھیرے ہوئے ہو اور وہ اکٹھے ہوں) زجاج نے کہا ہے: اس قسم کے مصادر عافاہ اللہ عافیۃ اور عاقبہ عاقبۃ بھی ہیں ان کی تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی اور اسی طرح عامۃ اور خاصۃ بھی ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے فرض عین قرار دیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور فرض کفایہ بنا دیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو انہوں نے کہا ہے یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں سے کبھی نہیں جانا گیا کہ انہوں نے ساری امت کو نفر (بھاگنے) کا الزام دیا ہے، بلکہ اس آیت کا معنی مشرکوں کے قتال پر ابھارنا، ان کے خلاف جماعت بندی کرنا اور کلمہ کو جمع کرنا ہے، پھر اسے اپنے اس قول کے ساتھ مقید کر دیا: كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ان کے ہمارے ساتھ قتال کرنے اور ہمارے خلاف جمع ہونے کے اعتبار سے ہمارا بھی ان کے لیے جمع ہونا فرض ہے (1)۔ واللہ اعلم

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾

"(حرمت والے مہینوں کو) ہٹا دینا، تو اور اضافہ کرنا ہے کفر میں۔ گمراہ کیے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال تاکہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں حرام کیا ہے اللہ نے تاکہ اس حیلہ سے حلال کر لیں جسے حرام کیا ہے اللہ نے آراستہ کر دیئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 312

گئے ہیں ان کے لیے ان کے برے اعمال۔ اور اللہ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ اسی طرح اکثر ائمہ پڑھتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: جہاں تک ہم جانتے ہیں حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے سوائے اکیلے ورش کے کسی نے بھی إنما النسی بغیر ہمزہ کے روایت نہیں کیا۔ اور یہ نسأه اور أنسأه سے مشتق ہے (اس کا معنی ہے) اس نے اسے موخر کر دیا۔ یہ دونوں لغتیں کسائی نے بیان کی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ النسئی فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: نسأت الشئ فهو منسؤ جب تو اسے موخر کر دے۔ پھر منسؤ کو نسئی کی طرف پھیر دیا گیا ہے جیسے مقتول کو قتیل کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور رجل ناسی اور قوم نساة یہ فاسق اور فسقۃ کی مثل ہے۔ علامہ طبری نے کہا ہے: النسئ ہمزہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے زیادتی کرنا۔ کہا جاتا ہے: نسا ینسأ جب وہ زیادہ ہو جائے۔ فرمایا: اگر ہمزہ کے بغیر ہو تو وہ فقط نسیان سے ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: 67) اور یہ حضرت نافع کی قراءت کا رد ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے: کہا جاتا ہے: نسأ الله في أجلك (اللہ تعالیٰ تیری موت کو مؤخر کر دے) جیسے تو کہتا ہے: زاد الله في أجلك (اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے) اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے: من سرّه أن يبسط له في رزقه وينسأ له في أثره فليصل رحمه (جس کے لیے یہ باعث مسرت ہو کہ اس کے لیے اس کا رزق وسیع کر دیا جائے اور اس کے لیے اس کی موت مؤخر کر دی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے)

ازہری نے کہا ہے: أنسأت الشئ انساء و نسیئا یہ اسم ہے جو مصدر حقیقی کی جگہ رکھا گیا ہے۔ وہ محرم میں جنگ وجدال کو حرام قرار دیتے تھے اور جب انہیں اس کی ضرورت پیش آتی تو وہ اس کے بدلے صفر کو حرام کر دیتے اور محرم میں جنگ شروع کر دیتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ عرب جنگ اور غارت گری کے دلدادہ تھے اور ان پر یہ شاق اور گراں گزرتا تھا کہ وہ لگاتار تین مہینے رکے رہیں جن میں وہ کوئی جنگ وجدال نہ کریں۔ تو انہوں نے کہا: اگر ہم پر مسلسل تین مہینے آ جائیں جن میں ہم کوئی شے حاصل نہ کریں تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ پس جب وہ منیٰ سے واپس لوٹتے تو بنی کنانہ میں ٹھہرتے تھے پھر بنی فقیم میں ایک آدمی تھا جسے قلمس کہا جاتا تھا، تو وہ کہنے لگا: میں وہ ہوں کہ میرا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جائے گا۔ تو وہ کہنے لگے: تو ہم سے محرم کی حرمت کو مؤخر کر دے اور اسے صفر میں رکھ دے۔ پس وہ ان کے لیے محرم کو حلال کر دیتا۔ تو وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک مہینہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ تحریم پورے سال میں گھوم گئی۔ پھر اسلام آیا اور محرم اپنی اسی جگہ کی طرف لوٹ گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا تھا (1)۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے إن الزمان قد استدار کهيئته يوم خلق الله السموات والأرض اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرک ہر مہینے میں دو سال حج کرتے رہے، پس انہوں نے دو سال ذوالحجہ میں حج کیا، پھر دو سال محرم میں حج کیا، پھر دو سال صفر میں حج کیا، اسی طرح تمام مہینوں میں وہ کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ حج جو آپ نے حجۃ الوداع سے پہلے کیا تھا وہ 9 ہجری میں ذوالقعدہ

1۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 290

کے موافق آیا، پھر آئندہ سال حضور نبی مکرم ﷺ نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اور وہ ذوالحجہ کے موافق آیا، اسی لیے آپ ﷺ کے خطبہ کا یہ ارشاد ہے: إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ (1) الحدیث۔ آپ ﷺ نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ حج کے مہینے اپنے اصل محل کی طرف لوٹ آئے ہیں اور حج ذوالحجہ کی طرف لوٹ آیا ہے اور نسئی باطل ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ ایاس بن معاویہ نے کہا کہ مشرک سال کا بارہ مہینے اور پندرہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے تھے، پس حج رمضان المبارک میں اور ذوالقعدہ میں اور سال کے ہر مہینے میں ہوتا رہتا پندرہ دنوں کی زیادتی کے سبب مہینے کی گردش کرنے کے حکم سے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی گردش کے حکم کے تحت 9 ھ میں ذی القعدہ میں حج ادا کیا اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حج ادا نہ فرمایا، پھر جب آئندہ سال 10 ھ میں حج ذوالحجہ کے موافق ہوگیا اور وہ چاندوں کے موافق بھی ہو گیا۔ اور یہ قول حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے: إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ یعنی حج کا زمانہ اپنے اس اصلی وقت کی طرف لوٹ آیا جسے اللہ تعالیٰ نے معین فرمایا تھا جس روز اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا اس اصل مشروعیت کے ساتھ جس کے بارے اسے پہلے علم تھا اور اس کے بارے اس کا حکم نافذ ہے۔ پھر فرمایا: سال بارہ مہینے کا ہے۔ اس کے ساتھ اس زیادتی کی نفی ہو رہی ہے جو انہوں نے اپنے فیصلے کے ساتھ سال میں اضافہ کر رکھا تھا۔ اور وہ پندرہ دن ہیں، پس وقت اصلی متعین ہوگیا اور تحکم جہلی باطل ہوگیا۔ امام مازری نے خوارزمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے سورج کو تخلیق فرمایا اور اسے برج حمل میں رکھا اور وہ زمانہ جس کے بارے حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے وہ سورج کے برج حمل میں اترنے کے موافق ہے۔ اور یہ توقیف کا محتاج ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے نقل کیے بغیر اس تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس بارے ان سے کوئی صحیح قول منقول نہیں۔ اور جو اس کا دعویٰ کرے اسے چاہیے کہ وہ اس کی سند بیان کرے۔ اور اس کے خلاف جو قول ہے عقل اسے جائز قرار دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بروج سے پہلے سورج کو تخلیق فرمایا ہے اور عقل اسے بھی جائز قرار دیتی ہے کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی بار تخلیق فرمایا ہے۔ پھر علماء تعدیل نے اس بارے تحقیق کی تو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کے وقت سورج کو برج الحوت میں پایا اور اس کے اور برج حمل کے درمیان بیس درجے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: ہے دس درجات ہیں۔ واللہ اعلم

اہل تاویل نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے جس نے پہلی بار (شہر حرام کو) مؤخر کیا۔ پس حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ مالک بن کنانہ کے بیٹے تھے اور وہ تین تھے (2)۔ اور جو یبر نے حضرت ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس نے پہلی بار یہ عمل کیا وہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے پہلی بار یہ فعل کیا وہ بنی کنانہ کا ایک آدمی تھا اسے نعیم بن ثعلبہ کہا جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک آدمی تھا اس کو جنادہ بن عوف کہا جاتا تھا اور یہ وہی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے پایا ہے۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پہلے بنی کنانہ کا ایک قبیلہ پھر بنی فقیم کا ان میں سے ایک آدمی تھا جسے القَلَمَّس کہا جاتا تھا اور اس کا نام حذیفہ بن عبید تھا۔ اور ایک

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 455 2۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 291

روایت میں ہے: وہ مالک بن کنانہ تھا۔ اور وہ جو نسئی تھا اور مختار تھا وہ ریاست اور حکومت کے ساتھ کامیاب تھا، کیونکہ عرب اس کی ریاست کو قبول کرتے تھے اور اسی بارے میں ان کا شاعر کہتا ہے:

ومنا ناسیٔ الشہر القلمس

اور ہم میں سے مہینے کو مؤخر کرنے والا القلمس ہے

اور کمیت نے کہا ہے:

ألسنا الناسئين على مَعَدٍّ شهورَ الحِلّ نجعلها حراماً

کیا ہم معد پر حلال مہینوں کو مؤخر کرنے والے نہیں ہیں کہ ہم انہیں حرام بنا دیتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ یہ اس کا بیان ہے جو عربوں نے انواع کفر میں سے مجموعی طور پر کیا، کیونکہ انہوں نے وجود تعالیٰ کا انکار کیا اور کہا: وَمَا الرَّحْمٰنُ (الفرقان: 60) اصح وجوہ میں یہی ہے۔ اور انہوں نے بعث بعد الموت کا انکار کیا اور کہا: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ (یٰسین) (جی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) اور انہوں نے رسل علیہم السلام کی بعثت کا انکار کیا اور انہوں نے کہا: اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ (القمر: 24) (کیا ایک انسان جو ہم میں سے ہے (اور) اکیلا ہے ہم اس کی پیروی کریں)

اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ حلال وحرام کرنا ان کے اختیار میں ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اپنی شہوات کو پورا کرنے کے لیے اس بدعت کا ارتکاب کیا اور اسے حلال قرار دیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا۔ اور کوئی اس کے کلمات کو تبدیل کرنے والا نہیں اگرچہ مشرک ناپسند بھی کریں۔

قولہ تعالیٰ: يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اس میں تین قراءتیں ہیں: اہل حرمین اور ابو عمرو نے يَضِل پڑھا ہے اور کوفیوں نے يُضَل فعل مجہول پڑھا ہے۔ حسن اور ابو رجا نے يُضِل پڑھا ہے۔ تینوں قراءتوں میں سے ہر ایک ایک معنی کو ادا کرتی ہے مگر تیسری قراءت کے مطابق اس سے مفعول محذوف ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: ويُضِل به الذين كفروا من يقبل منهم (اور اس کے ساتھ وہ کفر کرنے والے اسے گمراہ کرتے ہیں جو ان سے اسے قبول کرتا ہے) اور الذين محل رفع میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر اللہ عزوجل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اور تقدیر عبارت یہ ہو: يُضِل الله به الذين كفروا (اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں گمراہ کرتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا) جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: يضل من يشاء (وہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور جیسا کہ آیت کے آخر میں اس کا قول ہے: وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہوئے ہے)۔ اور دوسری قراءت يُضَلُّ به الذين كفروا یعنی اسے ان کے لیے شمار کیا گیا ہے۔ اس قراءت کو ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (ان کے لیے ان کے برے اعمال آراستہ کر دیئے گئے) اور پہلی قراءت کو ابو حاتم نے اختیار کیا ہے، کیونکہ وہ اس یعنی نسئی کے سبب

گمراہ ہوئے، کیونکہ وہ اسے شمار کرتے تھے اور اس کے سبب گمراہ ہو جاتے تھے اور یحلونہ میں ہاضمیر نسیٔ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ابو رجا سے یَضَل یا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور یہ ایک لغت ہے: کہا جاتا ہے: ضللت أضل اور ضللت أضل (یہ باب سمع یسمع اور باب ضرب یضرب دونوں ہے) لیوا طئوا لام کی کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، تاکہ وہ برابر اور پورے ہو جائیں۔ تو أطأ القوم علی کذا ای إجتمعوا علیه (یعنی وہ اس پر جمع اور متفق ہو گئے) یعنی انہوں نے ایک مہینے کو حلال نہیں کیا مگر ایک مہینے کو حرام بھی قرار دیا تاکہ حرام مہینے چار ہی باقی رہیں۔ اور یہی صحیح ہے، نہ کہ وہ جو ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پانچواں مہینہ بنا دیا۔ حضرت قتادہ نے کہا: بے شک انہوں نے صفر کا قصد کیا اور اس کا حرام مہینوں میں اضافہ کر دیا اور اسے تحریم میں محرم کے ساتھ ملا دیا۔ قطرب اور طبری نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے(1)۔ اور اسی کی بنا پر النسئی بمعنی زیادتی (اضافہ کرنا) ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

''اے ایمان والو! کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب کہا جاتا ہے تمہیں کہ نکلو راہ خدا میں تو بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو، کیا تم نے پسند کر لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں، سو نہیں ہے سر و سامان دنیوی زندگی کا آخرت میں مگر قلیل''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ اس میں ما حرف استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے، تقدیر عبارت ہے: أی شیٔ یمنعکم عن کذا (کون سی شی تمہیں اس طرح کرنے سے منع کرتی ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیا ہے تجھے کہ تو فلاں سے اعراض کر رہا ہے؟ مالك عن فلان معرضا؟ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہنے والوں کے لیے ان کے پیچھے رہنے پر بطور عتاب نازل ہوئی اور یہ فتح مکہ کے ایک سال بعد 9ھ کا واقعہ ہے، عنقریب اس کا ذکر سورہ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور النفر کا معنی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی نئے ہونے والے کام کی وجہ سے سرعت اور تیزی کے ساتھ منتقل ہونا۔ ابن آدم کے بارے میں کہا جاتا ہے: نَفَرَ إلی الأمر ینفر نفوراً (وہ بڑی تیزی کے ساتھ کام کی طرف گیا) اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ (الاسراء) (تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے) اور دابۃ (جانور) کے بارے کہا جاتا ہے: نَفَرَت تَنْفِرُ (فا کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے) نفارا و نفوراً۔ اور کہا جاتا ہے: فی الدابة نفار (جانور کا بدکنا وغیرہ) اور یہ الحران کی مثل اسم ہے۔ اور نفر الحاج من مِنًى نَفْرًا (اور حاجی منیٰ سے تیزی

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 454

کے ساتھ چل پڑے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ مفسرین نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم زمین کی نعمتوں کی طرف یا زمین پر اقامت اختیار کرنے کی طرف بوجھل ہو کر جھک جاتے ہو۔ اور یہ جہاد ترک کرنے پر زجر و توبیخ ہے اور نکلنے میں جلدی نہ کرنے پر عتاب ہے اور یہ اس کی طرح ہے جو زمین پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرلے۔ اثَّاقَلْتُمْ اصل میں تثاقلتم ہے۔ تا کو ثا میں مدغم کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس کے قریب المخرج ہے اور پھر ہمزہ وصل کی ضرورت پیش آئی تا کہ ساکن کو بولنا ممکن ہو سکے، اور اسی کی مثل ادّارَکوا اور ادّارأتم اور اطّیّرنا اور ازّیّنت ہیں۔ اور کسائی نے شعر بیان کیا ہے:

تُولِي الضَّجِيعَ إذا ما استافها خَصِرًا　　عذبَ المذاق إذا ما اتّابع القُبَلُ

اعمش نے تثاقلتم اصل کے مطابق قراءت کی ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے (1)۔ غزوۂ تبوک کی طرف شدید گرمی، پھل پکنے اور ٹھنڈے سایوں کے موسم میں آپ نے لوگوں کو دعوت دی، جیسا کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ پس لوگوں پر سستی اور کاہلی غالب آگئی، تو وہ بیٹھ گئے اور بوجھ سا محسوس کرنے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اس قول کے ساتھ زجر و توبیخ فرمائی اور ان پر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب کیا۔ اور اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ کا معنی ہے کیا تم نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پسند کرلی ہے؟ تقدیر کلام ہے: أرضيتم بنعيم الدنيا بدلاً من نعيم الآخرة (کیا تم نے اخروی نعمتوں کے بدلے دنیوی نعمتوں کو پسند کرلیا ہے؟) اس میں من بدل کے معنی کو متضمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ (الزخرف) ای بدلا منکم (اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے)

اور شاعر نے کہا ہے:

فليت لنا من ماء زمزم شربة　　مُبَرَّدة باتت على طَهَيان

اے کاش! ہمارے لیے ماء زمزم کے بدلے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی ہوتا جو رات کے وقت لکڑی پر پڑا ہوتا اس میں ماء حسنان (مکہ کا پانی) روایت کیا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے: لیت لنا بدلا من ماء زمزم شربۃ مبردۃ اور الطھیان سے مراد وہ لکڑی ہے جو گھر کی ایک طرف میں ہوا کے لیے نصب کی جاتی ہے، اس پر پانی لٹکا دیا جاتا ہے تا کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے (2)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی راحت اور سکون کو آخرت کی راحت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب فرمایا ہے، جب کہ آخرت کی راحت دنیا کی مشقت اور تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا درآنحالیکہ انہوں نے سوار ہو کر طواف کیا: أجركِ على قدر نصبكِ (تیرا اجر تیری مشقت کی مقدار کے مطابق ہوگا) اسے بخاری نے نقل کیا ہے۔ (3)

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 34　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 937　　3۔ ایضاً

''اور اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب۔ اور بدل کر لے آئے گا کوئی دوسری قوم تمہارے علاوہ اور تم نہ بگاڑ سکو گے اس کا کچھ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 1۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلَّا تَنْفِرُوْا شرط ہے، اسی لیے اس کے آخر سے نون حذف ہے۔ اور اس کا جواب یُعَذِّبْكُمْ اور وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ہے اور یہ شدید جھڑک ہے اور (جہاد پر) نکلنے کو ترک کرنے میں وعید موکد ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پختہ اور مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ امر جب وارد ہو تو اس کے ورود میں فعل کے اقتضا سے زیادہ کچھ مقصود نہیں ہوتا، پس رہا ترک امر کے وقت عقاب اور سزا تو وہ نفس امر سے اخذ نہیں کی جاتی اور نہ اقتضا اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ عقاب اور سزا اس کے بارے خبر سے ثابت ہوتی ہے، جیسے کسی کا یہ قول: ان لم تفعل كذا عذبتك بكذا (اگر تو نے اس طرح نہ کیا تو میں تجھے اس طرح سزا دوں گا) اسی طرح اس آیت میں وارد ہے، پس اس کے مقتضیٰ کے مطابق جہاد کے لیے نکلنا اور کفار کے ساتھ قتال کرنے کے لیے ان کی طرف جانا اس بنا پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہو۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا اور مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ...... تا قولہ ...... یَعْمَلُوْنَ (التوبہ) اسے اس کے پیچھے آنے والی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے: وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) اور یہی حضرت ضحاک، حسن اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ یُعَذِّبْكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ان سے بارش کو روک لینا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر یہ ان سے صحیح ہے تو وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہاں کہا ہے، ورنہ دنیا میں عذاب الیم دشمن کے غلبہ کے ساتھ ہے اور آخرت میں آگ کے ساتھ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ابن نفیع سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے پوچھا اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور یہی ان کے لیے عذاب تھا (1)۔ اور اسے امام ابو محمد بن عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں سے ایک قبیلہ والوں کو نکلنے کے لیے فرمایا تو وہ بیٹھ گئے (یعنی وہ نہ نکلے) تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور اس کے ساتھ انہیں عذاب دیا اور الیم کا معنی ہوتا ہے درد پہنچانے والا، یعنی انتہائی تکلیف دہ۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ یہ ایک وعید ہے کہ وہ اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک قوم کو بدل دے گا جو آپ کے انہیں نکلنے کا حکم دینے کے وقت پیچھے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کہا گیا ہے: مراد ابناء فارس ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد اہل یمن ہیں۔ وَّلَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا یہ معطوف ہے۔ اور اس میں ہا ضمیر کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی نسخ نفیر العامۃ الخ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے۔ اور جہاد سے بوجھل ہو کر بیٹھ جانا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ہر ایک پر حرام ہے۔ اور رہا وہ جس میں کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو تو جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معین فرما دیا تو اس پر کاہلی اور سستی کا اظہار کرنا اور بوجھل ہو کر بیٹھ جانا حرام ہے اور اگر وہ ان دونوں سے مامون و محفوظ ہو تو پھر یہ فرض کفایہ ہے۔ اسے علامہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حاجت کے وقت، کافروں کے غلبے کے وقت اور ان کی قوت و شوکت کے زیادہ ہونے کے وقت نکلنا واجب ہے، کیونکہ اس کا وجوب دعوت دینے کے ساتھ مختص نہیں، کیونکہ وہ متعین ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو جائے تو دعوت دینا اور نکلنے کا مطالبہ کرنا بعید ہے کہ وہ کسی ایسی شے کا موجب ہو جو اس سے پہلے واجب نہیں، مگر یہ کہ امام جب کسی قوم کو معین کر دے اور انہیں جہاد کی طرف بلائے تو ان کے لیے اس تعیین کے وقت بوجھل ہونا جائز نہیں اور اس تعیین کے سبب یہ ان کے لیے فرض عین ہو جائے گا، محض جہاد کی وجہ سے نہیں بلکہ امام کی اطاعت کی وجہ سے۔ واللہ اعلم

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

"اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تو (کیا ہوا) ان کی مدد فرمائی ہے خود اللہ نے جب نکالا تھا ان کو کفار نے۔ آپ دوسرے تھے دو سے جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ فرما رہے تھے اپنے رفیق کو کہ مت غمگین ہو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر نازل کی اللہ نے اپنی تسکین ان پر اور مدد فرمائی ان کی ایسے لشکروں سے جنہیں تم نے نہ دیکھا اور کر دیا کافروں کی بات کو سرنگوں اور اللہ کی بات ہی ہمیشہ سر بلند ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: اگر تم غزوۂ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں نکل کر آپ کی مدد نہ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوہ تبوک سے واپس لوٹنے کے بعد ان کو عتاب کیا۔ نقاش نے کہا ہے: پہلی آیت ہے جو سورۂ براءت میں سے نازل ہوئی۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اگر تم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرنا چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ آپ کا ضامن اور کفیل ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے قلت کے مواقع میں آپ کی مدد و نصرت فرمائی اور آپ کو اپنے دشمن پر عزت و غلبہ کے ساتھ واضح غلبہ عطا فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے غار میں آپ کے صاحب اور رفیق کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی اس طرح کہ وہ آپ کے ساتھ مانوس تھے، انہوں نے آپ کو کندھوں پر اٹھایا، آپ کے ساتھ وفا کی اور اپنی جان کے ساتھ آپ کی حفاظت کی اور اپنے مال کے ساتھ آپ کے لیے اظہار ہمدردی کیا (1)۔ لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

نے کہا: ہے، انبیاء علیہم السلام کے اصحاب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثل تھے۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس آیت کے ساتھ اس عتاب سے نکل گئے جس کا ذکر اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ کے ارشاد میں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ان سے دور ہو کر نکلے تھے، لیکن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مجبور کر دیا تھا یہاں تک کہ آپ نے ایسا کیا، پس رب کریم نے فعل کی نسبت ان کی طرف کی اور اس میں حکم ان پر مرتب کیا۔ پس اسی وجہ سے قتل پر مجبور کرنے والے کو قتل کیا جاتا ہے اور بالاکراہ ضائع ہونے والے مال کا ضامن مکرہ کو بنایا جاتا ہے، کیونکہ وہی قاتل کو قتل پر اور مال ضائع کرنے والوں کو مال ضائع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: ثَانِيَ اثۡنَيۡنِ یعنی دو میں سے ایک۔ اور یہ اسی طرح ہے ثالث ثلاثۃ (تین میں سے ایک) اور رابع اربعۃ (چار میں سے ایک) اور جب لفظ مختلف ہوں تو یہ کہے: رابع ثلاثۃ و خامس اربعۃ تو اس کا معنی ہے تین کو اپنی ذات کے ساتھ چار بنانے والا اور چار کو پانچ بنانے والا۔ اور ترکیب کلام میں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالا اس حال میں کہ آپ تمام لوگوں سے منفرد اور الگ تھے سوائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے (یعنی وہ آپ کے ساتھ تھے)۔ اس میں عامل نصرہ اللہ ہے نصرہ منفردا او نصرہ أحد اثنین (اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی اس حال میں کہ آپ منفرد تھے اور اس حال میں کہ آپ دو میں سے ایک تھے)۔ حضرت علی بن سلیمان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے فخرج ثانی اثنین (پس دو میں سے دوسرا نکلا) جیسا کہ وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ۝ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور جمہور لوگوں نے ثانی یا کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کے سوا کوئی معروف نہیں۔ اور ایک جماعت نے ثانی یا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو عمرو بن علاء نے اسے بیان کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یا کو الف کے مشابہ قرار دیتے ہوئے ساکن پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: پس یہ حسن کی قراءت کی طرح ہے ما بقی من الربا اور اسی طرح جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فَارْضَوا مَارَضِي لكُمْ　　ماضِي العزيمةِ مافي حُكْمه جَنَفُ

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِذۡ هُمَا فِي الۡغَارِ، الۡغَارِ سے مراد پہاڑی کی کھوہ ہے، مراد غار ثور ہے۔ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ ایسا مضبوط شر ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا، پس انہوں نے آپ کے لیے رات مقرر کر دی اور طویل رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس کے دروازے پر آپ کی تاک میں رہے تاکہ جب آپ باہر نکلیں تو وہ آپ کو قتل کر دیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ وہ ان پر اپنا اثر ڈال دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اس حال میں کہ ان پر نیند چھائی ہوئی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سروں پر مٹی ڈال دی اور چلے گئے، جب صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس باہر تشریف لائے اور انہیں بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو نکل گئے اور نجات پا گئے۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کا وعدہ فرما رکھا تھا۔ اور ان دونوں نے اپنی سواریاں عبداللہ بن ارقط کے حوالے کی ہوئی تھیں۔ اسے ابن اریقط بھی کہا جاتا ہے، وہ کافر تھا لیکن ان دونوں کو اس پر اعتماد اور یقین تھا اور یہ راستہ دکھانے کے لیے راہبر تھا۔ پس ان دونوں نے اسے اجرت پر لیا تا کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس گھر کے پچھلے دروازے سے نکلے جو بنی جمح میں تھا اور دونوں جبل ثور میں غار کی طرف چلے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ وہ باتیں سنے جو لوگ کریں اور اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ وہ اپنا ریوڑ چرائے اور رات کے وقت وہ اسے ان کے پاس لے آئے پس وہ اس طرح ان کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں چلے اور غار میں داخل ہو گئے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما ان کے پاس کھانا لاتی تھیں اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما خبریں لے کر آتے تھے، پھر ان کے پیچھے عامر بن فہیرہ ریوڑ لے کر آتا اور وہ ان کے نشانات کو مٹا دیتا تھا۔ پس جب قریش نے آپ ﷺ کو مفقود اور گم پایا تو وہ آپ ﷺ کو قیافہ شناسوں کے ساتھ تلاش کرنے لگے ایسے قیافہ شناس جو نشانات قدم کی پہچان میں بڑے معروف اور مہارت رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ (چلتے چلتے) غار پر جا ٹھہرے اور کہا: یہاں نشان ختم ہو گیا ہے پھر انہوں نے دیکھا تو مکڑی نے غار کے منہ پر اس وقت جالا سا بن رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پس جب انہوں نے مکڑی کا جالا دیکھا تو انہوں نے یقین کر لیا کہ اس میں کوئی نہیں ہے، چنانچہ وہ واپس لوٹ گئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے بارے میں اس آدمی کے لیے سو اونٹوں کا انعام مقرر کر دیا جو آپ کو ان کے پاس لوٹا کر لائے گا۔ یہ خبر مشہور ہے۔ اور سراقہ بن مالک بن جعشم کا قصہ اس میں مذکور ہے۔ اور حضرت ابوالدرداء اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبوتری کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے مکڑی کے جالے پر انڈے دے دیئے اور وہ اپنے انڈوں پر بیٹھنے لگی، پس جب کفار نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غار سے واپس لوٹا دیا (1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ بخاری نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنی دِیل کے ایک آدمی کو اجرت پر لیا اور وہ ماہر راہبر تھا اور وہ کفار قریش کے دین پر تھا، پس دونوں نے اپنی سواریاں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے تین راتوں کے بعد غار ثور آنے کا معاہدہ کیا، پس وہ تیسری صبح کو دونوں کی سواریاں لے کر آ گیا اور دونوں نے وہاں سے رخت سفر باندھا اور آپ کی معیت میں عامر بن فہیرہ اور دِیلی راہبر بھی چلا اور وہ انہیں لے کر ساحل (ایک جگہ کا نام ہے) کے راستہ پر چلا۔

مہلب نے کہا ہے: اس میں فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اہل شرک کو راز اور مال پر امین بنانا جائز ہے، بشرطیکہ ان کے بارے وفا اور مروت کا یقین ہو جیسا کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اس مشرک کو مکہ مکرمہ سے اپنے نکلنے کے بارے اور اونٹنیوں پر امین بنایا۔ ابن منذر نے کہا ہے: اس میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو راستے کی رہنمائی کے لیے کفار کو اجرت پر لینا جائز ہے۔ اور امام

1۔ الطبقات لابن سعد، جلد 1، صفحہ 229

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے: ''باب استئجار المشرکین عند الضرورۃ أو إذا لم یوجد اهل الاسلام ابن بطال نے کہا ہے: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے أوإذالم یوجد اهل الاسلام یا جب اہل اسلام میں سے کوئی نہ پایا جائے۔ اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاشبہ اہل خیبر کے ساتھ معاملہ کیا کہ وہ وہاں کی زمین پر کام کریں گے جب مسلمانوں میں سے ایسے نہ پائے گئے جو زمین پر کام کرنے میں ان کے نائب بن سکتے ہوں، یہاں تک کہ اسلام قوی ہو گیا اور ان کی ضرورت باقی نہ رہی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ اور عام فقہاء ضرورت کے وقت اور اس کے بعد بھی انہیں اجرت پر لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ دو آدمیوں کا ایک آدمی کو اس شرط پر اجرت پر لینا کہ وہ ان دونوں کے لیے کام کرے گا (یہ بھی جائز ہے) اور اس میں دشمن کے خوف سے دین کے ساتھ فرار اختیار کرنے کے جواز پر بھی دلیل ہے۔ اور غیرت وغیرہ کے معاملہ میں حقیر جاننے کے خوف سے فرار اختیار کرنا بھی جائز ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس کے لیے صلح اور سلامتی چاہتے ہوئے بذات خود دشمن کے حوالے نہ ہو جائے۔ اور اگر تمہارے رب نے چاہا تو وہ اسے ان کے ساتھ ہونے کے باوجود اس سے محفوظ رکھے گا، یہ انبیاء اور دیگر لوگوں کے لیے اللہ کا طریقہ ہے(1) اور تو اللہ کے طریقہ کو ہرگز بدلا ہوا نہ پائے گا۔ اور جس نے اس سے منع کیا ہے اس کے نظریہ کے فاسد ہونے پر یہ بہت بڑی دلیل ہے اور کہا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر سے بھی ڈرے تو یہ اس کے توکل میں نقص ہے اور اس کا تقدیر پر ایمان نہیں۔ اور یہ سب کا سب آیت کے معنی میں ہے۔ وللہ الحمد والهدایۃ۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل کو متضمن ہے۔ اصبغ اور ابو زید نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا میں صاحب سے مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو اپنے کلام کے ساتھ ثابت کر دیا ہے اور اپنی کتاب میں آپ کے وصف صحابیت کو بیان کیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے: جو کوئی حضرت عمر، حضرت عثمان یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب ہونے کا انکار کرے تو وہ کذاب اور بدعتی ہوگا۔ اور جس نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب ہونے کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہے، کیونکہ اس نے قرآن کریم کی نص کا رد کیا ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کا معنی ہے یعنی مدد و نصرت کرنے، لحاظ رکھنے اور حفاظت و نگہبانی کرنے کے اعتبار سے بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ترمذی اور حارث بن ابی اسامہ دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ہمام نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خبر دی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی اس حال میں کہ ہم غار میں تھے، اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہ یقیناً ہمیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا ابابکر، ما ظنك باثنین اللہ ثالثهما (اے ابوبکر تیرا ان دو کے بارے کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے) (1)۔ محاسبی نے کہا ہے: یعنی اللہ تعالیٰ مدد و نصرت اور دفاع کے اعتبار سے ان دو کے ساتھ ہے نہ کہ اس معنی کی بنا پر جس کے ساتھ وہ ساری مخلوق کو شامل ہے۔ پس فرمایا: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے) تو اس کا معنی عام ہے کہ وہ کفار اور مومنین میں سے سبھی کی سنتا ہے اور انہیں دیکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امامیہ نے کہا ہے: غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غمزدہ اور پریشان ہونا ان کے جہل، نقص اور دل اور رائے کی کمزوری پر دلیل ہے۔ تو ہمارے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ کی طرف حزن اور پریشانی کی نسبت کرنا یہ نقص نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں کوئی نقص نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے: نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ہود: 70) (تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اس قول سے کوئی نقص نہیں: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہٰ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا ہم نے فرمایا (اے کلیم) مت ڈرو) اور حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے: لَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ (العنکبوت: 33) (اور نہ رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تمہیں اور تیرے کنبہ کو)

پس یہ وہ عظیم انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات ہیں جن میں (خوف تقیہ) نصاً پایا گیا ہے۔ اور یہ نہ ان پر طعن ہے اور نہ ان کے لیے ایسا وصف ہے جو باعث نقص ہو۔ تو اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات میں بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس اظہار میں احتمال ہے، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کے نیچے (جھک کر) دیکھا تو یقیناً وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ حزن و ملال حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے اس خوف کی وجہ سے تھا کہ آپ کو کوئی ضرر اور تکلیف پہنچے اور اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معصوم اور محفوظ نہ تھے، بلاشبہ یہ ارشاد گرامی وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: 67) (اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے) مدینہ طیبہ میں نازل ہوا۔

مسئلہ نمبر 8۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابو الفضائل العدل نے ہمیں کہا ہے کہ جمال الاسلام ابو القاسم نے ہمیں کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (الشعراء) (ہرگز نہیں، بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا) اور حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، تو یقیناً جب اللہ تعالیٰ اکیلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے تو ان کے اصحاب ان کے بعد مرتد ہو گئے پس جب وہ اپنے رب کے پاس سے واپس لوٹ کر آئے تو انہیں پایا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کر رہے ہیں۔ اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہدایت یافتہ، موحد، عالم اور امر کے ساتھ یقینا قائم رہنے والے باقی رہے اور کوئی خلل وفساد آپ تک راہ نہ پا سکا۔ (1)

مسئلہ نمبر 9۔ ترمذی نے نبیط بن شریط کی حدیث نقل کی ہے انہوں نے حضرت سالم بن عبید رضی اللہ عنہ سے (انہیں شرف صحبت بھی حاصل ہے) بیان کی انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری کر دی گئی...... الحدیث۔ اور اس میں ہے: مہاجرین مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے اور کہنے لگے: چلو ہمارے ساتھ ہمارے انصار بھائیوں کی طرف ہم انہیں اس معاملہ میں اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں پھر انصار نے کہا: ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر تم میں سے ہوگا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کون ہے جس کے لیے اس کی مثل تین وصف ہوں؟ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کون ہے جو ان دو کی مثل ہو؟ راوی کا بیان ہے: پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر لوگوں نے بھی انتہائی حسین وجمیل انداز میں آپ کی بیعت کر لی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ خلیفہ ہمیشہ ثانی (دوسرا) ہی ہوتا ہے۔ اور میں نے ہمارے شیخ امام ابوالعباس احمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے لیے ثانی اثنین کہا جائے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انہوں نے معاملات کو اسی طرح قائم کیا جیسے پہلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قائم کیا۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو سارا عرب مرتد ہو گیا اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور جعواث (بحرین میں ایک جگہ ہے) کے بغیر کہیں اسلام باقی نہ رہا۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور آپ نے انہیں دین میں داخل کرنے کے لیے ان کے ساتھ قتال کیا جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ پس اس اعتبار سے آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ کے حق میں ثانی اثنین (دو میں سے دوسرے) کہا جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث صحیحہ موجود ہیں، جن کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفہ ہیں اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور کوئی مخالف باقی نہیں رہا۔ اور آپ کی خلافت میں شک اور جرح، قدح کرنے والا بالیقین خطاکار اور فاسق ہے۔ کیا وہ کافر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الفتح میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کتاب وسنت اور اقوال علماء سے جو بات قطعی ہے اور واجب ہے کہ دل اس کے ساتھ ایمان لائیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام سے افضل واعلیٰ ہے اور اہل تشیع اور اہل بدعت کے اقوال کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کفر کرنے والوں جن کی گردنیں ماردی جاتی ہے اور بدعت وفسق کا ارتکاب کرنے والوں کے درمیان ہیں ان کی کوئی بات قبول نہ کی جائے گی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ افضل

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 939

ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں لوگوں کے درمیان چناؤ اور انتخاب کا اختیار دیا جاتا تھا تو ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہلے پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو چنتے تھے۔ ائمہ اہل سلف نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف کیا ہے؟ ان میں سے جمہور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم جانتے ہیں۔ اور امام مالک کے بارے روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں توقف کیا ہے۔ اور ان کے بارے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے جمہور کے موقف کی طرف رجوع کر لیا ہے اور یہی اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: **فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ** اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی تسکین نازل فرمائی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے علماء نے کہا ہے: یہی زیادہ قوی ہے، کیونکہ آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے قوم سے خوف لاحق ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امن عطا فرما کر آپ پر تسکین اور راحت کو نازل فرمایا اور آپ کا اضطراب پرسکون ہو گیا، آپ کا ڈر اور خوف ختم ہو گیا اور امن وسکون حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ثمامہ (ایک بوٹی کا نام ہے) کو اُگا دیا اور اس میں کبوتری کے گھونسلا بنانے کا الہام کیا۔ اور مکڑی کو بھیجا پس اس نے اس پر جالا بن دیا۔ تو ظاہر دکھائی دینے میں یہ لشکر کتنا کمزور ہے اور باطنی معنی کے اعتبار سے یہ کتنا قوی ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت فرمایا جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھگڑا کیا: "کیا تم میرے لیے میرے صاحب (رفیق) کو چھوڑ دو گے، بے شک تمام لوگوں نے کہا: آپ جھوٹے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا آپ سچے ہیں"۔ اسے ابو درداء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: **وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا** یعنی ملائکہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ أیدہ میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور دونوں ضمیریں مختلف ہیں۔ اور قرآن کریم اور کلام عرب میں یہ کثیر الاستعمال ہے۔ **وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى** اس سے مراد کلمہ شرک ہے۔ **وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا** کہا گیا ہے کہ مراد **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مدد ونصرت کا وعدہ ہے۔ اعمش اور یعقوب نے **كَلِمَةُ اللّٰهِ** کو جعل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے استئناف کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور فراء نے یہ گمان کیا ہے کہ نصب کی قراءت بعید ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ تیرا قول یہ ہوتا ہے أعتق فلان غلام أبیہ (فلاں نے اپنے باپ کا غلام آزاد کیا) اور تو یہ نہیں کہتا: غلام ابی فلان اور ابو حاتم نے جو کہا ہے وہ اس کے قریب قریب ہے۔ انہوں نے کہا: واجب ہے کہ کہا جائے: وکلمتہ ھی العلیا۔ نحاس نے کہا ہے: جو کچھ فراء نے کہا ہے وہ آیت سے مشابہت نہیں رکھتا، لیکن سیبویہ نے جو شعر بیان کیا ہے وہ اس سے مشابہت رکھتا ہے:

لا أری الموت یسبق الموت شیءٌ　　نغص الموت ذا الغنی والفقیرا

پس یہ بہت اچھا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں، بلکہ ماہر نحوی کہتے ہیں: اس طرح کے محل میں دوبارہ ذکر کرنا فائدہ مند ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں تعظیم کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ (الزلزلۃ) پس اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اور کلمہ کی جمع کلم ہے۔ اور تمیم کہتے ہیں: ھی کلمۃ یعنی کاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس میں تین لغات بیان کی ہیں: کَلِمۃ و کِلْمۃ و کَلْمۃ جیسا کہ کَبِد، کِبْد اور کَبْد اور وَرِق، وِرْق اور وَرْق ہے۔ اور الکلمہ ایک طویل قصیدہ بھی ہے، اسے جوہری نے کہا ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"(جہاد کے لیے) نکلو (ہر حال میں) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم (اپنا نفع نقصان) جانتے ہو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت سفیان نے حصین بن عبدالرحمن سے انہوں نے ابو مالک غفاری سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: سورۂ براءت میں سے جو آیت سب سے اوّل نازل ہوئی وہ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ہے۔ اور ابوالضحاء نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس کے بعد اس کا اوّل اور اس کا آخر نازل ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس میں دس اقوال ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انفروا ثبات کا معنی ذکر کیا گیا ہے، متفرق جماعتوں اور دستوں کی صورت میں نکلو (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نکلو اس حال میں کہ چست ہو اور غیر چست ہو (۳) خفیف سے مراد غنی اور امیر ہے اور ثقیل سے مراد فقیر اور مفلس ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (۴) خفیف سے مراد جوان ہے اور ثقیل سے مراد بوڑھا ہے۔ یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۵) خفیف سے مراد وہ ہے جو کاروبار میں لگا ہوا ہو اور ثقیل سے مراد وہ جس کا کوئی کاروبار نہ ہو۔ یہ زید بن علی اور حکم بن عتیبہ نے کہا ہے (۶) ثقیل سے مراد وہ ہے جس کے اہل وعیال ہوں اور خفیف سے مراد وہ ہے جو عیال دار نہ ہو، یہ زید بن اسلم نے کہا ہے (۷) ثقیل وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین ہو جسے چھوڑنا وہ ناپسند کرتا ہو اور خفیف وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین نہ ہو۔ یہ ابن زید نے کہا ہے (۸) خفاف سے مراد پیدل ہیں اور ثقال سے مراد گھڑسوار ہیں۔ یہ امام اوزاعی نے کہا ہے (۹) خفاف سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ کی طرف آگے بڑھ جاتے ہیں جیسا کہ مقدمۃ الجیش وغیرہ اور ثقال سے مراد سارے کا سارا لشکر ہے (۱۰) خفیف سے مراد شجاع اور بہادر ہے اور ثقیل سے مراد بزدل ہے۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ آیت کے معنی میں صحیح یہ ہے کہ تمام لوگوں کو حکم دیا گیا ہے، یعنی نکلو تم پر حرکت کرنا سہل اور آسان ہو یا مشکل۔ روایت ہے کہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: کیا مجھ پر بھی نکلنا لازم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَیْسَ عَلَی

الْاَعْمٰى حَرَجٌ (النور: 61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے)

اور یہ اقوال بلاشبہ ثقل وخفت میں مثال کے معنی کی بنا پر ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لَیْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى (التوبہ: 91) (نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر)

بعض نے کہا ہے: اس کے لیے ناسخ یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ (التوبہ: 122) (تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی۔

اور صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مراد جوان اور بوڑھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی کا عذر نہیں سنا، پس وہ شام کی طرف نکلے اور جہاد کیا یہاں تک کہ فوت ہو گئے رضی اللہ عنہ۔

حماد نے ثابت اور علی بن زید سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے سورت براءت پڑھی پس وہ اس آیت پر پہنچے اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا تو فرمایا: اے میرے بچو! میرے لیے تیاری کرو میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ تو آپ کے بیٹوں نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، تحقیق آپ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معیت میں مصروف جہاد رہے یہاں تک کہ وہ بھی وصال فرما گئے پس اب ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ چنانچہ انہوں نے سمندر میں جہاد کیا اور سمندر میں ہی فوت ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے لیے کوئی جزیرہ نہ پایا جس میں انہیں دفن کرتے مگر سات دن گزرنے کے بعد۔ اور پھر انہوں نے آپ کو اس میں دفن کیا اور آپ میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔ (1)

علامہ طبری نے اس آدمی کی سند سے بیان کیا ہے جس نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو حمص میں صراف کے تابوت پر دیکھا اور وہ اپنے موٹا ہونے کے سبب تابوت پر بھاری تھے اور وہ جہاد کی تیاری کر رہے تھے۔ تو آپ کو عرض کی: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہمارے پاس سورۃ البعوث اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا آچکی ہے۔ اور زہری نے کہا ہے: حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ غزوے کی طرف نکلے درآنحالیکہ آپ کی ایک آنکھ کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ آپ کو کہا گیا: بلاشبہ آپ بیمار ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر خفیف (صحت مند) اور ثقیل (بیمار) کو نکلنے کے لیے فرمایا ہے۔ پس اگر اس نے مجھے جنگ لڑنے کی قدرت نہ دی تو میں تعداد میں اضافہ کروں گا اور سامان کی حفاظت کروں گا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ بعض لوگوں نے شام کے غزوات میں ایک آدمی کو دیکھا بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے تھے، تو اس آدمی نے اسے کہا: اے چچا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھے معذور قرار دیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا: اے

1۔ طبقات ابن سعد، جلد 3، صفحہ 507

میرے بھتیجے! تحقیق ہمیں جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اس حال میں کہ ہم خفیف (جوان) ہوں یا ثقیل (بوڑھے) ہوں۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے دن کہا۔ ان کا اسم گرامی عمرو تھا: میں نابینا آدمی ہوں، تو انہوں نے جھنڈا میرے سپرد کر دیا، کیونکہ جب علمبردار شکست کھا جائے تو پورا لشکر شکست سے دوچار ہو جاتا ہے اور میں نہیں جانتا تھا کہ کون اپنی تلوار کے ساتھ میرا قصد کرے گا پس میں کھڑا رہا۔ اس دن علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا تھا اس کا بیان سورۂ آل عمران میں پہلے گزر چکا ہے۔ پس اس وجہ سے اور جو کچھ اس کی مثل صحابہ کرام اور تابعین علیہم الرضوان سے مروی ہے ہم نے کہا ہے کہ نسخ کا بیان صحیح نہیں ہے۔ اور کبھی ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام کا نکلنا واجب ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 4۔ جب جہاد ملک کے حصص میں سے کسی حصہ میں دشمن کے غلبہ پا لینے کے سبب یا اس کے اپنا لشکر اتار لینے کے سبب متعین ہو جائے (یعنی فرض عین ہو جائے) تو ایسے حالات میں اس ملک کے جملہ باسیوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی طرف نکلیں، کوچ کریں ہلکے ہوں یا بوجھل، جوان ہوں یا بوڑھے، ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق شریک ہوگا، جس کا باپ ہو وہ اس کی اجازت کے بغیر نکلے اور وہ بھی جس کا باپ (زندہ) نہ ہو، جو بھی خروج کی قدرت رکھتا ہے وہ پیچھے نہیں رہے گا، چاہے وہ جنگجو ہو یا تعداد میں اضافہ کرنے والا۔ اور اگر اس ملک کے باسی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں تو پھر جو ان کے قریب رہ رہے ہیں اور ان کے پڑوس اور جوار میں واقع ہیں ان پر اسی طرح خرچ لازم ہے جس طرح اس ملک کے اپنے باسیوں پر یہاں تک کہ وہ جان لیں کہ ان میں دشمن کے سامنے کھڑا ہونے اور ان کا دفاع کرنے کی طاقت آگئی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس پر خروج لازم ہے جسے دشمن کے مقابلے میں ان کی کمزوری کا علم ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ انہیں پالے گا اور ان کے لیے ان کی مدد کرنا ممکن ہوگا تو اس پر بھی ان کی طرف نکلنا لازم ہے۔ پس مسلمان تمام کے تمام ان کے خلاف ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں جو ان کے سوا ہیں، یہاں تک کہ جب اس علاقے کے لوگ دشمن کو روکنے پر قادر ہو گئے جہاں دشمن اترا ہوا تھا تو پھر دوسروں سے وہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر دشمن دارالاسلام کے قریب آ گیا اور وہ اس میں داخل نہ ہوا تو پھر بھی اس کی طرف خروج کرنا ان پر لازم ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آ جائے، ملک بچا لیا جائے، سرحدیں محفوظ ہو جائیں اور دشمن کو ذلیل و رسوا کر لیا جائے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (1)

واجب جہاد میں دوسری قسم یہ ہے کہ امام وقت پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر سال ایک بار ایک طائفہ دشمن کی طرف بھیجے اور بذات خود ان کے ساتھ نکلے یا اسے بھیجے جس پر اسے مکمل یقین اور وثوق ہو تا کہ وہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دے اور انہیں رغبت دلائے اور ان کی اذیتوں کو روکے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ان پر کھول کر بیان کرے، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا وہ (احسان کے بدلے) جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اور جہاد میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ نفل ہے۔ اور وہ امام وقت کا یکے بعد دیگرے مختلف دستے روانہ کرنا اور غفلت و بے خبری کے اوقات میں اور فرصت کے لمحات میں سرایا بھیجنا ہے، ایسی جگہوں میں چھاؤنیاں بنا کر ان کی تاک میں رہنا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 943

جہاں سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہو اور اپنی قوت و طاقت کا اظہار کرنا ہے۔ پس اگر کہا جائے: ایک آدمی کیسے کر سکتا ہے جب بقیہ تمام کوتاہی اور غفلت برت رہے ہوں۔ تو وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: وہ ایک قیدی کا قصد کر سکتا ہے اور وہ اس کا فدیہ دے سکتا ہے، کیونکہ جب اس نے ایک کا فدیہ دے دیا تو اس نے ایک کے بارے میں اس سے زیادہ ذمہ داری ادا کر دی جو پوری جماعت پر لازم تھی، کیونکہ اگر اغنیاء قیدیوں کا فدیہ تقسیم کر لیں تو ان میں سے ہر ایک فقط درہم سے کم ہی ادا کرے گا۔ اور وہ آدمی بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوگا اگر وہ اس پر قادر ہو ورنہ وہ لڑنے کے لیے ایک آدمی تیار کرے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی لڑنے والے کو ساز و سامان کے ساتھ تیار کیا تحقیق اس نے خود جنگ میں حصہ لیا اور جس نے خیر اور بھلائی کے ساتھ اس کے گھر والوں کی خبر گیری اور دیکھ بھال کی تحقیق وہ بھی جنگ میں شریک ہوا'' (1)۔ اسے الصحیح نے نقل کیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ اس کا مکان اسے مستغنی نہیں کر سکتا اور اس کا مال اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ روایت ہے کہ کسی بادشاہ نے کافروں کے ساتھ معاہدہ کیا اس شرط پر کہ وہ کسی کو قیدی بنا کر محبوس نہیں کریں گے، پھر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی ان کے کسی شہر میں گیا اور اس کا گزر ایک بند گھر کے پاس سے ہوا، تو اسے ایک عورت نے آواز دی: میں قیدی ہوں، تو اپنے امیر تک میری خبر پہنچا دینا۔ پس جب وہ اس (امیر) سے ملا اور اسے اپنے پاس کھانے کی دعوت دی اور دونوں باتوں کے ضمن میں کش مکش کرنے لگے، تو اس نے بالآخر اس قیدی عورت کی خبر اس تک پہنچائی، ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ امیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور بالفور لڑنے کے لیے نکل پڑا اور سرحد کی طرف پیدل چل کر گیا یہاں تک کہ اس قیدی عورت کو نکال لایا اور اس جگہ کو اپنی ولایت میں لے لیا۔ رضی اللہ عنہ۔

اسے علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: تحقیق 527ھ میں دشمن ہماری طرف آنکلا (اللہ اسے ہلاک و برباد کرے) اور لوٹ مار کے لیے ہمارے گھروں میں آ گھسا، اس نے ہمارے شرفاء کو قیدی بنا لیا اور وہ ہمارے شہروں میں اتنی تعداد میں داخل ہوا جس نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ تعداد بہت زیادہ اور کثیر تھی اگرچہ وہ اس حد کو نہ پہنچے جو انہوں نے بیان کی۔ تو میں نے والی اور مولی علیہ کو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تحقیق یہ جال اور پھندے میں آ چکا ہے، پس چاہیے کہ تمہارے پاس برکت ہو اور چاہیے کہ تم سے دین کی مدد و نصرت کا اظہار ہو تم پر حرکت کرنا (نکلنا) فرض عین ہو چکا ہے، پس چاہیے کہ اس کی طرف مقابلے کے لیے تمام لوگ نکلیں یہاں تک کہ تمام اطراف میں لوگوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے اور اس کا گھیراؤ کر لیا جائے، کیونکہ یہ لامحالہ ہلاک ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے سبب خوش کرنا ہے۔ پس گناہ غالب آگئے اور دل گناہوں کے سبب کانپ گئے اور لوگوں میں سے ہر کوئی لومڑ کی مثل ہو گیا جو اپنی بل میں پناہ لیتا ہے اگرچہ وہ اپنے پڑوس میں فریب اور جال دیکھ بھی لے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ، وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ (2)

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَّ جَاهِدُوْا یہ جہاد کے بارے حکم ہے اور یہ امر الجھد سے مشتق ہے۔ بِاَمْوَالِكُمْ وَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 944　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 943

اَنْفُسِكُمْ ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مشرکوں کے ساتھ اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ساتھ جہاد کرو''۔ اور یہ وصف ہے جو جہاد کو کامل بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے نفع بخش بناتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کمال اوصاف پر برانگیختہ کیا اور ذکر میں مال کو اس لیے مقدم کیا، کیونکہ یہ جہاد کی تیاری میں پہلے خرچ ہونے والا ہے، لہٰذا امر کو اسی طرح مرتب کیا جیسے وہ فی نفسہ ہے۔(1)

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۴۲﴾

''اگر ہوتا وہ مال نزدیک یا سفر آسان تو ضرور پیچھے چلتے آپ کے لیکن دور معلوم ہوتی ہے انہیں مسافت۔ اور ابھی قسم کھائیں گے اللہ کی (اور کہیں گے) کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور نکلتے تمہارے ساتھ، ہلاک کر رہے ہیں اپنے آپ کو اور اللہ جانتا ہے کہ وہ قطعاً جھوٹے ہیں''۔

جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے قوم کا نفاق ظاہر کر دیا۔ العرض سے مراد وہ جو منافع دنیا میں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: اگر مال غنیمت قریب ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے خبر دی ہے کہ اگر انہیں مال غنیمت کی طرف بلایا جاتا تو وہ ضرور اس کی اتباع کرتے۔

عَرَضًا یہ کان کی خبر ہے۔ قَرِيبًا یہ اس کی صفت ہے۔ وَّسَفَرًا قَاصِدًا یہ اس پر معطوف ہے۔ اور کان کا اسم محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: لو کان المدعو الیہ عرضاً قریباً و سفراً قاصداً لاتبعوك (اگر وہ جس کی طرف دعوت دی گئی ہے وہ قریب ترین مال غنیمت ہوتا اور سفر آسان ہوتا جس کے راستے معلوم ہوتے تو وہ ضرور آپ کے پیچھے چلتے) یہ اشارہ منافقین کے لیے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ وہ فی الجملہ ان لوگوں میں داخل ہیں جنہیں جہاد کے لیے نکلنے کا خطاب کیا گیا ہے اور یہ کلام عرب میں موجود ہے، وہ جملہ کا ذکر کرتے ہیں پھر وہ ضمیر لاتے ہیں جو ان میں سے بعض کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا) کہ اس ہاء سے مراد قیامت ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ (مریم) (پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ نے ھا ضمیر سے مراد جہنم لی ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس آیت کی نظیر سنت میں بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو يعلم أحدهم إنه يجد عظما سمينا أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء (اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو نرم گوشت والی بوٹیاں پالے گا تو وہ ضرور عشاء کی نماز میں حاضر ہو) آپ فرما رہے ہیں: اگر ان میں سے کوئی جانتا کہ وہ کسی شے کو موجود اور جلدی پالے گا تو وہ یقیناً اس کی وجہ

1۔ المحرر الوجیز

سے مسجد میں آئے۔ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ابوعبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے: الشقه سے مراد دور دراز زمین کی طرف سفر کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: منه شقه شاقة (یہاں سے سفر مشقت آمیز ہے) اور اس سے مراد غزوۂ تبوک ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ شُقه اور شِقه کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الشقه ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد ہے کپڑوں کی پھٹن۔ اور الشقه کا معنی دور دراز کا سفر بھی ہے اور بسا اوقات انہوں نے اسے کسرہ کے ساتھ الشقة بھی کہا ہے۔ اور الشققوہ پھٹن ہے جو تختی یا لکڑی میں پائی جاتی ہے۔ اور غصے والے آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: احتد فطارت منه شقة (وہ غضبناک ہوا پس اس سے مشقت دور ہوگئی۔)

وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا یعنی اگر ہمارے لیے سواری اور مال کی وسعت ہوتی۔ لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: 97) (اور الله کے لیے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی) حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: مراد ''زادراہ اور سواری ہے'' اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یعنی وہ جھوٹ اور نفاق کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اور الله تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس علت اور سبب کے بیان میں قطعاً جھوٹے ہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

''درگزر فرمایا ہے الله نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپ پر وہ لوگ جنہوں نے سچ کہا اور آپ جان لیتے جھوٹوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ افتتاح کلام ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصلحك الله و أعزك و رحمك (الله تعالیٰ نے تیری اصلاح فرما دی، تجھے عزت عطا فرما دی اور تجھ پر رحم فرمایا) یہ بھی اسی طرح کا جملہ ہے۔ اس تاویل کی بنا پر اس قول عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا ہے۔ اسے مکی، مہدوی اور نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور الله تعالیٰ نے آپ کو ذنب سے قبل عفو کی خبر دی ہے تاکہ آپ کا قلب اطہر کسی خوف و اضطراب میں واقع نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے الله تعالیٰ نے آپ سے درگزر فرمایا ہے آپ کے اس ذنب کے بارے میں جو آپ کے انہیں اجازت دینے کی صورت میں صادر ہوا۔ تو اس تقدیر پر عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا نہیں (عفا الله عنك ما كان من ذنبك في أن أذنت لهم) اسے مہدوی نے بیان کیا ہے اور اسے نحاس نے اختیار کیا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اذن (اجازت دینے) کے بارے دو قول ہیں (۱) آپ نے انہیں اپنے ساتھ نکلنے کی کیوں اجازت دے دی تھی، حالانکہ بغیر تیاری اور سچی نیت کے بغیر ان کے نکلنے میں فساد ہے (۲) آپ نے انہیں بیٹھے رہنے کی اجازت کیوں دے دی تھی جب انہوں نے طرح طرح کے عذر پیش کیے، ان دونوں کو علامہ قشیری نے بیان کیا ہے، فرمایا: یہ لطف بھرا عتاب ہے۔ کیونکہ پہلے فرمادیا: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں وحی نازل ہوئے بغیر ہی اجازت عطا فرما دی تھی۔ حضرت قتادہ اور عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ نے

کہا ہے: دو کام ہیں جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے درآنحالیکہ آپ کو ان کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین کی جماعت کو اپنے سے پیچھے رہنے کے بارے میں اجازت دینا، حالانکہ اس کے بارے وحی کے ذریعہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدیوں کا فدیہ لینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب فرمایا جیسا کہ تم سن رہے ہو۔ بعض علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک اولیٰ صادر ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے عفو و درگزر کا ذکر اس خطاب سے مقدم کیا جو عتاب کی صورت میں فرمایا۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ تا کہ آپ کے لیے ظاہر ہو جاتے وہ جنہوں نے سچ بولا ان سے جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منافقین کو نہ پہچانتے تھے، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سورۃ التوبہ نازل ہونے کے بعد پہچانا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے کہا: ہم (پیچھے) بیٹھے رہنے کی اجازت طلب کریں، پس اگر آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی تو ہم بیٹھ رہیں گے اور اگر آپ نے ہمیں اجازت نہ دی تو بھی ہم بیٹھ رہیں گے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت سورۃ النور کی اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (النور: 62) (پس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لیے، تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں) اسے نحاس نے معانی القرآن میں ذکر کیا ہے۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۴۴ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝۴۵

''نہ اجازت مانگیں گے آپ سے جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر کہ نہ (جہاد) کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پرہیز گاروں کو۔ صرف وہی اجازت مانگتے ہیں آپ سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر اور شک میں مبتلا ہیں ان کے دل تو وہ شک میں ڈانواں ڈول ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی وہ بیٹھنے کے بارے میں اجازت نہیں مانگیں گے اور نہ خروج کے بارے میں، بلکہ جب آپ انہیں کسی شے کے بارے حکم دیں گے تو وہ فوراً اسے بجالائیں گے، تو گویا اس وقت بغیر عذر کے اجازت مانگنا نفاق کی علامات میں سے تھا۔ اسی لیے فرمایا: اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اسے اس آیت نے منسوخ کیا ہے جو سورۃ النور میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... تا قولہ ......

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۲﴾ (النور)۔

اَنۡ یُّجَاهِدُوۡا یہ فی کو مضمر کرنے کے سبب محل نصب میں ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر عبارت یہ ہے کراهیة ان یجاهدوا (جہاد کرنے کو ناپسند کرتے ہوئے) جیسا کہ یہ ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا (النساء:176) صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ) وَ ارۡتَابَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ اور ان کے دلوں نے دین میں شک کیا ہے۔ فَهُمۡ فِیۡ رَیۡبِهِمۡ یَتَرَدَّدُوۡنَ یعنی وہ اپنے شک میں ہی جا رہے ہیں اور لوٹ رہے ہیں (یعنی ڈانواں ڈول ہیں)

وَ لَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ فَثَبَّطَهُمۡ وَ قِیۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِیۡنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر انہوں نے ارادہ کیا ہوتا (جہاد پر) نکلنے کا انہوں نے تیار کیا ہوتا اس کے لیے کچھ سامان لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑے ہونے کو اس لیے پست ہمت کر دیا اور کہہ دیا گیا تم بیٹھے رہو بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَهٗ عُدَّةً یعنی اگر انہوں نے جہاد کا ارادہ کیا ہوتا تو وہ سامان سفر ضرور تیار کرتے۔ پس ان کا تیاری کو ترک کرنا ہی ان کے پیچھے رہنے کے ارادہ پر دلیل ہے۔

وَّلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ لیکن ان کے آپ کے ساتھ نکلنے کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا۔ فَثَبَّطَهُمۡ اس لیے اس نے انہیں آپ سے روک دیا اور انہیں رسوا کر دیا، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر آپ نے ہمیں بیٹھے رہنے کی اجازت نہ دی تو ہم فساد برپا کریں گے اور ہم مومنین کے خلاف (لوگوں کو) اکسائیں گے، برانگیختہ کریں گے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کے بعد اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو بجز فساد کے تم میں کچھ اضافہ نہ کرتے۔ وَ قِیۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِیۡنَ کہا گیا ہے کہ یہ اس قول میں سے ہے جو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں سے ہے۔ اور یہی وہ اجازت ہے جو آپ نے انہیں دی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

کہا گیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کی حالت میں انہیں یہ فرمایا اور انہوں نے اس کے ظاہر الفاظ کو پکڑ لیا اور کہنے لگے: تحقیق آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خذلان اور رسوائی سے عبارت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں بیٹھے رہنے کا تصور ڈال دیا۔ اور مَعَ الۡقٰعِدِیۡنَ کا معنی ہے یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو تکلیف زدہ، اندھے، اپاہج، عورتیں اور بچے ہیں تم بیٹھے رہو۔

لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡكُمۡ مَّا زَادُوۡكُمۡ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوۡضَعُوۡا خِلٰلَكُمۡ یَبۡغُوۡنَكُمُ الۡفِتۡنَةَ ۚ وَفِیۡكُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

"اگر نکلتے تمہارے (لشکر) میں تو نہ زیادہ کرتے تم میں بجز فساد کے اور دوڑ دھوپ کر کے تمہارے درمیان فتنہ پردازی کرتے۔ اور تم میں ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: **لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا** یہ مومنوں کو تسلی دی جارہی ہے اس بارے میں کہ منافق ان سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور الخبال سے مراد فساد برپا کرنا، چغل خوری کرنا، اختلاف پیدا کرنا اور جھوٹی خبریں اڑانا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے، ای ما زادوكم قوة ولكن طلبوا الخبال (یعنی وہ تمہاری قوت اور طاقت میں اضافہ نہ کرتے بلکہ وہ فساد اور اختلاف پیدا کرتے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے اس میں اضافہ نہ کرتے سوائے فساد کے جس بارے میں وہ رائے کے اعتبار سے ڈانواں ڈول ہیں۔ تو اس صورت میں یہ استثنا منقطع نہ ہوگا۔ لا يزيدونكم فيما يترددون (فيه) من الرأي إلا خبالا۔

قولہ تعالیٰ: **وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ** اس کا معنی ہے کہ وہ بڑی تگ ودو اور محنت کے ساتھ تمہارے درمیان فساد برپا کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ راجز نے کہا ہے:

يا　ليتني　فيها　جَذَع　أَخُبُّ　فيها　وَأَضَعُ

کہا جاتا ہے: وَضَعَ البعير جب اونٹ دوڑنے لگے يضع وضعا ووضوعا جب چال زیادہ تیز ہو۔ اور أوضعته اس کا معنی ہے میں نے اسے دوڑنے پر ابھارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الايضاع سے مراد ایسی چال ہے جو دوڑ کی چال کی مثل ہو۔ اور الخلل کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان شگاف کا ہونا، اس کی جمع الخلال ہے، مراد وہ شگاف ہیں جو صفوں کے درمیان ہوتے ہیں، یعنی وہ فساد برپا کر کے اور چغل خوری کے ذریعے تمہارے درمیان خلل اور دراڑیں ڈالنے کی کوشش کرتے۔ **يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ** یہ مفعول ثانی ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے فتنہ تلاش کرتے، یعنی فساد برپا کر کے اور (فساد پر) اکسا کر۔ اور کہا جاتا ہے: أبغيته كذا میں نے اس کی طلب اور تلاش میں اس کی مدد کی اور بغيته كذا میں نے اسے اس کے لیے تلاش کیا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے۔

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ اور تم میں ان کے جاسوس ہیں جو ان کی طرف تمہاری خبریں پہنچاتے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور تم میں وہ لوگ ہیں جو ان کی بات قبول کرتے ہیں اور ان کی اطاعت و پیروی کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: پہلا قول زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ دونوں معنوں میں سے غالب معنی یہ ہے کہ سماع کا معنی ہے وہ کلام کو سنتا ہے۔ اور اسی کی مثل سماعون للكذب بھی ہے اور دوسرا قول اس میں فقط سامع کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ قائل۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸

"(اے حبیب!) وہ کوشاں رہے فتنہ انگیزی میں پہلے بھی اور الٹ پلٹ کرتے تھے آپ کے لیے تجویزیں یہاں تک کہ آ گیا حق اور غالب ہوا اللہ کا حکم اور وہ ناخوش تھے"۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ یعنی انہوں نے فساد برپا کرنے اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش اور تگ ودو کی اس سے پہلے کہ ان کا معاملہ ظاہر ہوا اور اس کے بارے وحی نازل ہو جسے انہوں نے مخفی اور پوشیدہ رکھا اور اس کے بارے جو وہ عنقریب کریں گے۔ ابن جریج نے کہا ہے: مراد منافقین کے بارہ آدمی ہیں، وہ عقبہ کی رات ثنیۃ الوداع پر ٹھہرے تاکہ (نعوذ باللہ) وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ یعنی جو دین آپ لے کر آئے ہیں اس کو باطل کرنے کے بارے میں اپنی آراء اور تجاویز کو بدلتے رہتے تھے اور گھماتے رہتے تھے

حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ یعنی حق آ گیا اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو گیا۔ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (اور وہ ناخوش تھے)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ۝

''اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: اجازت دیجئے مجھے (کہ گھر ٹھہرا رہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، خبردار فتنہ میں تو وہ گر چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔ پہنچے آپ کو کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے آپ کو کوئی مصیبت تو کہیں گے کہ ہم نے درست کر لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ یہ أذن یأذن سے ہے۔ اور جب امر بنایا گیا تو اس میں ہمزہ مکسور زائد کیا گیا اور اس کے بعد ایک ہمزہ ہے جو فعل کا فاکلمہ ہے اور دو ہمزے جمع نہیں ہو سکتے۔ پس دوسرے کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا تو تو نے ایذن کہا۔ اور جب یہ وصل کلام میں ہو تو دو ہمزوں کے جمع ہونے کی علت ساقط اور زائل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ یا پھر ہمزہ ہوئی۔ اور تو نے یہ پڑھا: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ۔

ورش نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے: و منهم من یقول أوذن لی انہوں نے ہمزہ کو مخفف کیا ہے (یعنی اس کا ماقبل لام مضموم ہونے کی وجہ سے اسے واؤ سے بدل دیا ہے) نحاس نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ایذن لفلان ثم ایذن له پہلے اور دوسرے کے ہجے لکھنے میں ذال سے پہلے الف اور یا کے ساتھ ایک ہیں۔ اور اگر تو کہے: ایذن لفلان و أذن لغیرہ اس میں دوسرا بغیر یا کے ہے اور اسی طرح فاکلمہ بھی ہے۔ اور ثم اور واؤ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ثم پر وقف کیا جاتا ہے اور کلام منفصل ہو جاتی ہے اور واؤ اور فا ان دونوں پر وقف نہیں کیا جاتا اور نہ یہ دونوں جدا ہو سکتے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو بنی مسلمہ کے بھائی جد بن قیس کو فرمایا: ''اے جد! کیا تیرے لیے بنی الاصفر کی اونٹنیوں میں رغبت ہے تو ان سے لونڈیاں اور خدمت گار غلام بھی پالے گا''۔ تو جد نے کہا: میری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں کا دلدادہ ہوں اور بلاشبہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے بنی الاصفر کو دیکھ لیا تو پھر میں ان سے صبر نہیں کر سکوں گا، اس لیے آپ مجھے آزمائش اور فتنہ میں نہ ڈالیے اور مجھے گھر پر ہی بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور میں آپ کے

ساتھ مالی تعاون کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض فرمالیا اور فرمایا: "تیرے لیے اجازت ہے"۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، یعنی آپ مجھے ان کے چہروں کی چمک اور خوبصورتی کے ساتھ فتنہ میں نہ ڈالیے۔ اور اس کا سبب نفاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اصفر حبشہ میں رہنے والا ایک آدمی تھا اس کی بیٹیاں تھیں ان کے وقت میں ان سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا اور اس کی رہائش بلاد روم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ حبشہ والے روم پر غالب آگئے اور ان کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں پس انہوں نے روم کی سفیدی اور حبشہ کی سیاہی اپنے اندر سمو لی نتیجۃً وہ سیاہی مائل سرخ رنگ کی ہوگئیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن اسحاق کے قول میں فتور اور کمزوری ہے۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم جہاد کرو تم بنات اصفر کو غنیمت میں پاؤ گے"۔ تو جد نے آپ کو کہا: آپ ہمیں اجازت عطا فرما دیجئے اور عورتوں کے ساتھ ہمیں فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے۔ یہ (قول) پہلے کے سوا اور سے نکالا گیا ہے اور یہ نفاق اور عداوت کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سلمہ کو کہا...... اور جد بن قیس ان میں سے تھا: "اے بنی سلمہ! تمہارا سردار کون ہے؟" انہوں نے کہا: جد بن قیس، مگر وہ بخیل اور بزدل ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کون سا عیب ہے جو بخل سے بڑھ کر قبیح ہو بلکہ تمہارا سردار خوبرو نوجوان بشر بن براء بن معرور ہے"۔ پس حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں فرمایا:

و سوّد بشر بن البراء لجوده   وحق لبشر بن البراء أن يُسَوَّدَا

إذا ما أتاه الوفد أذهب ماله   وقال خذوه إنني عائد غدا

اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا یعنی وہ گناہ اور معصیت میں واقع ہو چکے۔ اور وہ نفاق اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنا ہے۔ **وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ** یعنی بلاشبہ ان کا سفر جہنم کی آگ کی طرف ہے اور وہ انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔

قولہ تعالیٰ: **اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ** یہ شرط و جزا ہے اور اسی طرح **وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِیْبَةٌ یَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ یَتَوَلَّوْا** اس پر معطوف ہے۔ اور الحسنۃ سے مراد غنیمت اور کامیابی ہے۔ اور المصیبۃ سے مراد شکست اور پسپائی ہے۔ اور ان کے اس قول: **اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ** کا معنی ہے ہم نے اپنے نفسوں کے بارے احتیاط برتی ہے اور ہم نے انتہائی حزم و احتیاط کو لازم پکڑا ہے لہٰذا ہم قتال کی طرف نہیں نکلے۔ **وَ یَتَوَلَّوْا** اور وہ ایمان سے پیٹھ پھر لیتے ہیں۔ **وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ** درآنحالیکہ وہ اس پر اتراتے اور اظہار فخر کرتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱

"آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایئے ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف بجز اس کے جو لکھ دی ہے اللہ نے ہمارے لیے وہی ہمارا حامی و ناصر ہے اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے مومنوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا** کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جس کے بارے اس نے ہمیں اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ ہم کون ہوں یا تو ہم کامیاب ہوں گے پس

کامیابی وکامرانی ہمارے لیے اچھی ہوگی اور یا ہم شہید کر دیئے جائیں گے تو شہادت ہمارے لیے بہت عظیم نیکی اور سعادت ہوگی، چنانچہ معنی یہ ہے ہر شے قضا وقدر کے مطابق ہے۔ سورۂ اعراف میں پہلے یہ گزر چکا ہے کہ علم، قدر اور کتاب سب برابر اور یکساں ہیں۔ هُوَ مَوْلٰىنَا یعنی وہ ہمارا حامی اور ناصر ہے۔ اور توکل سے مراد اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور جمہور کی قراءت میں یصیبنا، لن کے سبب منصوب ہے۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ بعض عرب اس کے ساتھ جزم دیتے ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے هل یصیبنا پڑھا ہے۔ اور رے کے قاضی اعین کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَّآ نون مشددہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ غلطی ہے، کیونکہ نون کے ساتھ اسے مؤکد نہیں کیا جاتا جو خبر ہو اور اگر یہ طلحہ کی قراءت میں ہوتا تو جائز ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ (الحج) (آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم وغصہ کو)(1)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

''فرمایئے کیا تم منتظر ہو ہمارے متعلق (کہ ہم مارے جائیں، یہ مرنا نہیں) مگر ایک بھلائی ان دو بھلائیوں سے (جن کے ہم خواہاں ہیں) اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے لیے کہ پہنچائے تمہیں اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ کوفی لام کو تا میں ادغام کرتے ہیں، پس جہاں تک لام المعرفہ کا تعلق ہے تو اس میں ادغام کے سوا کچھ جائز نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: التائبون کیونکہ ان (عربوں) کے کلام میں لام معرفۃ کا استعمال کثیر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: قل تعالوا میں ادغام جائز نہیں، کیونکہ اس میں قل معتل ہے، لہٰذا اس میں دو تعلیلیں جمع نہیں ہوسکتیں اور التربص کا معنی انتظار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: تربص بالطعام یعنی تو اناج کا انتظار کر اس کے مہنگا ہونے کے وقت تک۔ اور الحسنی، الاحسن کی تانیث ہے۔ اور حسنیین کا واحد حسنیٰ ہے اور جمع الحسن ہے۔ اور اسے فقط معرف باللام بولنا جائز ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا: رأیت امرأة حسنی، اور الحسنیین سے مراد غنیمت اور شہادت ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ سے منقول ہے۔ اس میں لفظ استفہام موجود ہے اور وہ زجر و توبیخ کے معنی کے لیے ہے۔ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ یعنی اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایسی سزا اور عذاب دے جو تمہیں ہلاک و تباہ کر دے، جیسا کہ اس نے تم سے پہلے امم ماضیہ کو پہنچایا۔ اَوْ بِاَيْدِيْنَا یعنی وہ ہمیں تمہارے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرما دے۔ فَتَرَبَّصُوْۤا یہ تہدید (جھڑک) اور وعید ہے یعنی تم شیطان کے وعدوں کا انتظار کرو بے شک ہم تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے منتظر ہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

''فرمایئے خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تم سے، بے شک تم ایک نافرمان قوم تھے''۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 219

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت جد بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جب اس نے یہ کہا: مجھے گھر بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور یہ میرا مال ہے میں اس کے ساتھ آپ کی اعانت کروں گا۔ اور اَنْفِقُوْا کا لفظ امر ہے اور اس کا معنی شرط اور جزا ہے۔ عرب اسی طرح اس معنی میں استعمال کرتے ہیں، وہ او کے ساتھ لاتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أسيئي بنا أو أحسني لا ملومةٌ لدينا ولا مَقْلِيَّةٌ إن تَقَلَّتِ

اور اس کا معنی ہے إن أساتِ أو أحسنتِ فنحن على ما تعرفين (اگر تو نے گناہ کیا یا نیکی کی پس ہم اسی حال پر ہیں جس پر تو جانتی ہیں) اور آیت کا معنی ہے: إن أنفقتم طائعين أو مكرهين فلن يقبل منكم (اگر تم خرچ کرو گے خوشی سے یا ناخوشی سے وہ ہرگز تم سے قبول نہیں کیا جائے گا) پھر اللہ تعالیٰ نے وضاحت بیان فرمائی کہ ان سے کیوں نہیں قبول کیا جائے گا؟ تو ارشاد فرمایا: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ (اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ) پس اس بارے میں واضح ترین دلیل یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافر کے افعال جب نیکی اور خیر کے ہوں مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ ان پر ثواب نہیں دیا جائے گا اور نہ آخرت میں اسے ان سے کوئی نفع حاصل ہو گا، مگر یہ کہ دنیا میں ان کے عوض اسے رزق اور نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے آپ فرماتی ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا، تو کیا وہ اسے کوئی نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اسے نفع نہیں دے گا، بے شک اس نے ایک دن بھی نہیں کہا: اے میرے رب! قیامت کے دن میرے گناہوں کی مغفرت فرما دے''۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کسی مومن پر ظلم نہیں کرے گا اس کی نیکی کا اجر اسے دنیا میں بھی عطا فرمایا جائے گا اور آخرت میں بھی اس کے بدلے اسے جزا دی جائے گی۔ اور رہا کافر تو دنیا میں اس نے جو نیک اعمال کیے ان کے بدلے دنیا میں اسے اجر عطا کیا جاتا ہے مگر جب وہ آخرت میں جا پہنچے گا تو اس کے لیے کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے'' اور یہ نص ہے۔

پھر کہا گیا ہے: کیا اس سچے وعدہ کے حکم کے مطابق ضروری ہے کہ وہ کافر کو عطا کرے اور دنیا میں اس کی نیکیوں کا بدلہ اسے دے یا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مقید ہے جس کا ذکر اس ارشاد میں کیا گیا ہے: عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء: 18) (ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں)۔ دونوں قولوں میں سے یہی صحیح ہے، واللہ اعلم۔

کافر سے صادر ہونے والے عمل کو نیکی کا نام دینا بلاشبہ یہ کافر کے ظن اور گمان کے مطابق ہے ورنہ اس سے قربت کا حاصل ہونا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ شرط جو اسے صحیح قرار دیتی ہے وہ موجود نہیں ہے اور وہ ایمان ہے۔ یا پھر اسے حسنہ (نیکی) کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہ صورۃً اور ظاہراً مومن کی نیکی کے مشابہ ہوتی ہے اس میں بھی دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ پس اگر کہا جائے: امام مسلم نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا ان امور کے بارے کیا خیال ہے جو عبادت، صدقہ، غلام کو آزاد کرنے یا صلہ رحمی وغیرہ میں زمانہ جاہلیت میں کرتا تھا کیا ان کا اجر ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان پر ہی اسلام لایا ہے جو تو نے ماضی میں خیر کے اعمال کیے''۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: أسلمتَ علی ما أسلفتَ من خیرٍ اس کا ظاہر اصول کے خلاف ہے، کیونکہ کافر کو اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کی طاعت و عبادت پر ثواب ہو جائے، کیونکہ قرب حاصل کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ اسے پہچانتا ہو جس کے وہ قریب ہو رہا ہے، پس جب شرط معدوم ہوگئی تو مشروط کے صحیح ہونے کی بھی نفی ہوگئی۔ پس حدیث میں معنی یہ ہے: بے شک تو نے جاہلیت میں حسین وجمیل مزاج اور طبیعت بنائی تو اسی اچھی اور خوبصورت عادت نے تجھے اسلام میں پہنچا دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت حکیم رضی اللہ عنہ ایک سو بیس برس تک زندہ رہے، ساٹھ سال اسلام میں اور ساٹھ سال جاہلیت کی حالت میں رہے۔ پس آپ نے جاہلیت میں ایک سو غلام آزاد کیے اور سو اونٹوں پر سوار کیا؟ اور اسی طرح آپ نے اسلام میں بھی کیا اور یہ بالکل واضح ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے اس فعل پر ثواب عطا فرمائے جو اس نے اسلام کے سبب کیا، جیسا کہ وہ اس سے ان گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے جن کا ارتکاب اس نے حالت کفر میں کیا۔ اور بلاشبہ اسے اجر و ثواب نہیں دیا جائے گا جو نہ اسلام لایا نہ اس نے توبہ کی اور حالت کفر میں ہی مر گیا۔ اور یہ حدیث کا ظاہر اً معنی ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نیکی اور خیر کا جو عمل وہ کرتا ہے اس پر ثواب نہ ہونے کا سبب ایمان کی شرط کا نہ پایا جانا نہیں ہے، پھر وہ اسلام لایا اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہی فوت ہوا شرط عقلی کے مطابق وہ تبدیل نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع کردے جب کہ اس کا اسلام حسین ہو۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جود و عطا اور کرم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع نہ کرے جب کہ اس کا اسلام حسین اور خوبصورت ہو) حربی نے حدیث کی اس معنی پر تاویل کی ہے اور کہا ہے: أسلمتَ علی ما أسلفتَ یعنی تو نے جو پہلے نیکی اور خیر کے اعمال کیے ہیں پس وہ تیرے لیے ہی ہیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أسلمتَ علی ألف درھم تو اسلام لایا ہزار درہم کی شرط پر یعنی اس شرط پر کہ اس نے اپنے لیے انہیں محفوظ کرلیا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس اگر کہا جائے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کی مدد و نصرت کرتے تھے، تو کیا اس کا انہیں کوئی نفع اور فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، میں نے انہیں آگ کی شدت اور سختی میں پایا تو میں نے انہیں تھوڑی آگ کی طرف نکال دیا''۔ آپ کو عرض کی گئی: بعید نہیں ہے کہ وہ کافر سے اس کے عمل خیر کے بدلے عذاب میں

تخفیف کر دے، لیکن شفاعت ملنے اور حاصل ہونے کے ساتھ جیسا کہ ابو طالب کے بارے میں آیا ہے، لیکن رہا اس کے بغیر تو قرآن کریم نے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ۝ (المدثر) (پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت) اور کافروں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَ لَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ (الشعراء) (تو (آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی اور نہ کوئی غم خوار دوست)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے چچا حضرت ابو طالب کا ذکر کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا: ''شاید قیامت کے دن میری شفاعت انہیں فائدہ اور نفع دے گی پس انہیں تھوڑی سی آگ میں رکھا جائے گا جو ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس سے ان کا دماغ کھول جائے گا''۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے درک اسفل میں ہوتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ اس میں فاسقین سے مراد کافرین ہیں۔

وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ۝

''اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور نہیں آتے نماز ادا کرنے کے لیے مگر سست سست اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ اس میں پہلا أن محل نصب میں ہے اور دوسرا محل رفع میں ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اور انہیں نہیں منع کیا ہے کہ ان کے اخراجات ان سے قبول کیے جائیں سوائے ان کے کفر کے۔ اور کوفیوں نے أن یقبل منھم یا کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ نفقات اور انفاق دونوں ایک ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اگر وہ جماعت کے ساتھ ہو تو نماز پڑھے اور اگر منفرد ہو تو نماز نہ پڑھے اور یہی وہ ہے جو نماز پر کسی اجر و ثواب کی امید نہیں رکھتا اور وہ اسے ترک کرنے میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتا نہیں ہے، پس نفاق بالیقین عبادت میں سستی کا وارث بنا دیتا ہے۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے اور وہاں ہم نے حضرت علاء کی حدیث مکمل طور پر ذکر کر دی ہے۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ کیونکہ وہ اسے ایک جرمانہ اور چٹی شمار کرتے ہیں۔ اور اسے غنیمت جان کر روک کر رکھتے ہیں۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو وہ قبول نہیں اور نہ ہی کوئی اس پر اجر و ثواب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝

''سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں''۔

یعنی آپ اسے اچھا نہ سمجھیں جو ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اور نہ آپ اس کی طرف مائل ہوں کیونکہ وہ استدراج ہے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے زکوٰۃ نکالنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور معنی یہ ہے پس دنیوی زندگی میں ان کے مال اور ان کی اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں۔ یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں آخرت میں ان کے ساتھ عذاب دے۔ اور یہ اکثر اہل العربیہ کا قول ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انہیں ان تمام میں تنگ و دو اور مشقت کرنے کے سبب عذاب دے۔ اور اس تاویل اور حضرت حسن کے قول کی بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور یہ حسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس ان کے مال تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں اور نہ ان کی اولاد یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں ان کے ساتھ دنیا میں عذاب دے کیونکہ وہ منافق ہیں۔ چونکہ وہ ناخوش ہو کر خرچ کرتے ہیں پس وہ ان کے سبب عذاب دیئے جائیں گے جو وہ خرچ کرتے ہیں (1)۔ وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یہ اس بارے میں نص ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ مریں اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اس کے بارے پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ بیان فرمایا کہ منافقین کے اخلاف میں سے یہ قسم اٹھانا ہے کہ وہ مومن ہیں اس کی نظیر یہ آیت ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ الآیہ (المنافقون: 1) ((اے نبی مکرم!) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں) الفرق کا معنی خوف ہے، یعنی وہ ڈرتے ہیں وہ نظریہ ظاہر کرنے سے جس پر وہ ہیں کہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝

''اگر مل جائے انہیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو (دیکھے گا) وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اسی طرح اس پر وقف ہے۔ اور لکھنے میں دو الف ہیں: پہلا ہمزہ ہے اور دوسرا تنوین کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 218

عوض ہے۔ اور اسی طرح رایت جزا ہے۔ اور ملجا کا معنی قلعہ ہے۔ یہ حضرت قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی پناہ گاہ ہے۔ اور یہ دونوں معنی برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: لجات إلیه لجاء و ملجا اور التجات الیه (میں نے اسی کی طرف پناہ لی) یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اور وہ جگہ بھی لجا و ملجا کہلاتی ہے۔ اور التلجئة کا معنی اکراہ، مجبور کرنا ہے۔ اور ألجاته إلی الشئ کا معنی ہے (میں نے اسے اس کی طرف مجبور کر دیا) اور ألجات أمری إلی اللہ میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اور عمرو بن لجا تیمی شاعر ہے اور یہ جوہری سے منقول ہے۔

اَوْ مَغٰرٰتٍ یہ مغارۃ کی جمع ہے اور یہ غار یغیر سے ماخوذ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ أغار یغیر سے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الحمد للہ مُمسانا و مُصْبَحَنَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المغارات سے مراد غاریں اور تہہ خانے ہیں اور یہ وہ جگہیں ہیں جن میں چھپا جا سکتا ہے۔ اور اسی سے غار الماء اور غارت العین (پانی نیچے اتر گیا) ہے۔

اَوْ مُدَّخَلًا یہ مفتعل کے وزن پر ہے اور دخول سے بنایا گیا ہے، مراد ایسا راستہ ہے جس میں داخل ہونے کے ساتھ ہم چھپ جاتے ہیں۔ اور لفظ مختلف ہونے کی وجہ سے اس کا اعادہ کیا (کیونکہ مفہوم تو دونوں لفظوں کا ایک ہے) نحاس نے کہا ہے: اس میں اصل مدتخل ہے، تا کو دال سے بدلا گیا ہے۔ کیونکہ دال حروف مجہورہ میں سے ہے اور تا مہموسہ میں سے اور یہ دونوں ایک مخرج سے ادا ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں اصل متدخل بروزن متفعل ہے، جیسا کہ حضرت ابی کی قراءت میں ہے: أو متدخلا اور اس کا معنی ہے دخول بعد دخول (یکے بعد دیگرے داخل ہونا) یعنی وہ قوم جو ان کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: متدخلا یہ تدخل سے ہے جیسے تفعل جب کوئی دخول میں تکلف کرے۔ اور حضرت ابی سے یہ بھی مروی ہے: مندخلا یہ اندخل سے ہے اور یہ شاذ ہے، کیونکہ یہ سیبویہ اور اس کے اصحاب کے نزدیک ثلاثی غیر متعدی ہے۔ اور حسن، ابن ابی اسحاق اور ابن محیصن نے أو مَدْخلا میم کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: او مدخلا میم کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ پہلا دخل یدخل سے ہے اور دوسرا أدخل یدخل سے۔ اسی طرح مصدر، ظرف مکان اور ظرف زمان بھی ہیں جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

مُغَارَ ابنِ همامٍ علی حَیٍّ خَثْعَمَا

اور حضرت قتادہ، عیسیٰ اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم سے **اَوْ مُدَّخَلًا** دال اور خا کی تشدید کے ساتھ مروی ہے (1)۔ اور جمہور نے صرف دال کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ مکان جس میں وہ اپنے نفسوں کو داخل کر لیتے ہیں۔ پس یہ چھ قراءتیں ہیں۔

لَّوَلَّوْا اِلَیْهِ یعنی وہ اس کی طرف لوٹ جائیں۔ **وَ هُمْ یَجْمَحُوْنَ** یعنی وہ تیزی کرتے ہیں کوئی شے ان کے چہروں کو واپس نہیں لوٹا سکتی۔ یہ جمح الفرس سے ہے جب لگام گھوڑے کو نہ لوٹا سکے۔ شاعر نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 46

سَبُوحًا جَمُوحًا واحضارها كَمَعْمَعة السَّعَف المُوقَدِ

اور اس کا معنی ہے: اگر وہ ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی کو پالیں تو وہ مسلمانوں سے بھاگتے ہوئے تیزی کے ساتھ اس کی طرف پھر جائیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝۵۸

''اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں سو اگر انہیں دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو اس وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ یعنی ان میں سے بعض آپ پر طعن کرتے ہیں، یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حسن نے کہا ہے: وہ آپ پر عیب لگاتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ آپ کا امتحان لیتے ہیں اور آپ سے سوال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اہل لغت کے نزدیک وہی قول ہے جو حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب وہ اس کو عیب لگائے۔ اور اللمز لغت میں وہ عیب ہے جو سراً اور خفیہ طور پر لگایا جائے (1)۔ جوہری نے کہا ہے: اللمز کا معنی عیب ہے اور اس کا اصل معنی تو آنکھ وغیرہ کے ساتھ اشارہ کرنا ہے۔ اور لَمَزَہٗ کا يَلْمِزُهٗ اور يَلْمُزُهٗ دونوں طرح (یعنی باب ضرب یضرب اور باب نصر ینصر) آتا ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم کے بارے میں)

اور رجل لماز و لمزۃ یعنی بہت زیادہ عیب لگانے والا آدمی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب کوئی کسی کو دور ہٹائے اور اسے مارے۔ اور الھمز بھی اللمز کی طرح ہی ہے۔ اور الھامز اور الھماز بھی کثرت سے عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے اور الھمزۃ بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ھمزۃ اور امرأۃ ھمزۃ بھی ہے۔ اور ھمزہ کا معنی ہے اس نے اسے دور کیا اور اسے مارا۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ اللمز وہ عیب ہے جو چہرے پر اور سامنے لگایا جائے، اور الھمز جو پیٹھ کے پیچھے لگایا جائے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک قوم کے بارے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدقات کی تقسیم کے بارے طعنہ زنی کی۔ اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ فقراء ہیں تاکہ آپ انہیں عطا فرمائیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اچانک خوارج کا سردار بلکہ اصل حرقوص بن زہیر آپ کے پاس آگیا اور اس کو ذوالخویصرۃ تمیمی کہا جاتا ہے، تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصاف اور عدل کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ہلاکت ہو اور کون عدل کرے گا جب میں عدل نہ کروں''۔

تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی معنی کے مطابق ایک صحیح حدیث ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اجازت عطا فرمائیے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ تو

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 220

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاذ اللہ لوگ باتیں کریں گے کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں بے شک یہ اور اس کے ساتھی قرآن کریم پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا وہ اس سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے نشانہ سے پار نکل جاتا ہے'' (1)۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۟۠

''اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ خوش ہو جاتے اس سے جو دیا تھا انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ۔ عطا فرمائے گا ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اس کا رسول، ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت کرنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ، لو کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہے لکان خیرا لھم تو وہ یقیناً ان کے لیے اچھا ہوتا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِی الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِیْنَ وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ؕ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۟

''زکوٰۃ تو صرف ان کے لیے ہے جو فقیر، مسکین اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والے ہیں اور جن کی دلداری مقصود ہے، نیز گردنوں کو آزاد کرانے اور مقروضوں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، یہ سب فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

اس میں تیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بعض کی نسبت بعض لوگوں کو وافر مال عطا فرمایا ہے اور یہ اس کی جانب سے ان پر بہت بڑا انعام اور احسان ہے اور ان پر بطور شکرانہ ایک خاص حصہ نکالنا لازم کر دیا ہے کہ وہ وہ حصہ اس کو ادا کریں جس کے پاس مال نہیں ہے۔ اور یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے نیابت ہے اس بارے میں جس کی ضمانت اس نے اپنے اس قول میں دی ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق) (2)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ یہ مصارف صدقات اور محل کی وضاحت ہے، تاکہ تو ان سے باہر نہ نکلے۔ پھر اختیار اور پسند تقسیم کرنے والے کے پاس ہے (یعنی ان میں سے جسے چاہے دے دے) یہ قول امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: السرج للدابۃ والباب للدار (زین گھوڑے کے لیے اور دروازہ گھر

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11537
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 945

کے لیے ہے)۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں لام تملیک کے لیے ہے، جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے: المال لزید و عمرو و بکر، تو ان تمام مذکورہ افراد کے درمیان مساوات اور برابری قائم کرنا لازم اور ضروری ہے۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی دو معین صنفوں کے لیے یا دو معین قوموں کے لیے وصیت کرے۔ اور انہوں نے انما کے لفظ سے استدلال کیا ہے کہ یہ آٹھوں اصناف پر صدقات کے موقوف ہونے کے بارے حصر کا تقاضا کرتا ہے اور انہوں نے اسے زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تقویت دی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ میری قوم کی طرف لشکر بھیجنے والے تھے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کو روک لیجئے پس میں آپ کو ان کے اسلام لانے اور طاعت اختیار کرنے کے بارے میں یقین دلاتا ہوں، پھر میں نے اپنی قوم کی طرف لکھا تو انہوں نے اسلام اور طاعت کو اختیار کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اخا صداء المطاع فی قومه (اے صدائی مطاع (جس کی اطاعت کی جاتی ہے) اپنی قوم میں) آپ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: بل من الله علیهم و هداهم بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اور انہیں ہدایت عطا فرمادی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پھر ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور وہ آپ سے صدقات کے بارے سوال کرنے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقات کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ راضی اور خوش ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے آٹھ اجزاء میں تقسیم کردے پس اگر تو ان اجزاء والوں میں سے ہوا تو میں تجھے عطا کردوں گا''(1)۔ اسے ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اور زین العابدین سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس مقدار کے بارے بتادیا ہے جو زکوٰۃ میں سے دی جائے گی اور اس کے بارے جس کے ساتھ ان اصناف کی کفایت ہو سکے گی اور اسے ان تمام کا حق قرار دیا ہے، پس جس کسی نے انہیں اس سے روکا تو وہ ان کے لیے ان کے رزق کے بارے میں ظالم اور زیادتی کرنے والا ہے۔ اور ہمارے علماء نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ: 271) (اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لیے)

اور صدقہ جب قرآن کریم میں مطلق ذکر کیا جائے تو مراد فرض صدقہ ہوتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء پر لوٹا دوں''۔ اور یہ قرآن وسنت میں سے آٹھ اصناف میں سے کسی ایک کے ذکر کے بارے نص ہے(2)۔ اور حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ اور تابعین کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آدمی زکوٰۃ اور صدقہ آٹھوں اصناف کو دے اور ان میں سے جس صنف کو بھی تو نے دے دیا تو وہ جائز ہے۔ منہال بن عمرو نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قول باری تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ کے

1۔ سنن ابی داؤد، باب من یعطی من الصدقة، حدیث نمبر 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 947

بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان اصناف کا ذکر کیا ہے تاکہ انہیں پہچان لیا جائے اور ان میں سے کسی صنف کو تو نے دے دیا تو وہ تیرے لیے جائز ہوگا۔

حضرت سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ کے بارے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس صنف کو بھی تو نے صدقہ دے دیا وہ تیری طرف سے جائز ہے۔ اور یہی قول حسن اور ابراہیم رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ کا بھی ہے۔ الکیا طبری نے کہا ہے: حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ اجماع صحابہ مراد لے رہے ہیں، کیونکہ ان کو ان میں سے کوئی مخالف معلوم نہیں جیسا کہ ابو عمر نے کہا ہے، واللہ اعلم۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جسے ہم نے اپنے اور ان کے درمیان فیصل قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ہر صنف کو اس کا حصہ عطا کر دیا جائے تو اس کی تعمیم واجب نہیں۔ پس اسی طرح اصناف کی تعمیم بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ علماء لغت اور اہل فقہ نے فقیر اور مسکین کے درمیان فرق بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے لہٰذا اس کے بارے نو اقوال ہیں۔ پس یعقوب بن سکیت، قتبی اور یونس بن حبیب نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ فقیر، مسکین سے احسن اور بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی بعض حاجات وضروریات کو پورا کر سکتا ہو اور وہ انہیں ادا کر سکتا ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی شے نہ ہو۔ اور انہوں نے راعی کے قول سے استدلال کیا ہے:

أما الفقير الذى كانت حَلُوبَتُه وَفْقَ العِيَال فلم يُترك له سَبَدُ

فقیر وہ ہے جس کے پاس عیال کے مطابق دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو اور اس کے لیے (ضرورت سے زائد) کچھ نہ چھوڑا جائے۔

اہل لغت اور حدیث میں سے ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے امام ابو حنیفہ اور قاضی عبد الوہاب ہیں۔ اور الوفق اس موافقت سے ہے جو دو چیزوں کے درمیان پائی جاتی ہے جیسا کہ التحام (دو چیزوں کا آپس میں جڑ جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے: حلوبته وفق عیاله یعنی اس کا دودھ ان کی کفایت اور ضرورت کے برابر ہے، اس سے فالتو اور زیادہ نہیں ہے۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے اس کے برعکس کہا ہے، پس انہوں نے مسکین کو فقیر سے احسن اور بہتر حالت میں قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (الکہف: 79) (وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں)

پس اس میں خبر دی گئی ہے کہ ان کے لیے سمندر کی کشتیوں میں سے ایک کشتی ہے اور بسا اوقات یہ تمام مال کے اعتبار سے مساوی اور برابر ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے اس نظریہ کو اس حدیث سے تقویت دی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر سے پناہ مانگی (2) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے دعا میں یہ عرض کی: اللّٰهم أحيني مسكينا

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری، جلد 3، صفحہ 206

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی الاستعاذة، حدیث نمبر 1320، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وأمتنی مسکینا (اے اللہ! مجھے مسکین حالت میں زندہ رکھ اور مسکین حالت میں موت عطا فرما) پس اگر مسکین کی حالت فقیر کی حالت سے زیادہ کمزور اور بری ہو تو دونوں خبروں کے درمیان تناقص آ جائے گا، کیونکہ یہ محال ہے کہ آپ ﷺ فقر سے پناہ مانگیں اور پھر اس کے بارے سوال اور التجا کریں جو حالت کے اعتبار سے اس سے برا اور کمزور ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کی روح اس حال میں قبض فرمائی کہ آپ کے پاس اس مال میں سے کچھ تھا جو اللہ تعالیٰ نے بطور فے آپ کو عطا فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ جملہ ضروریات کی کفایت نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے: رہارائی کا شعر تو اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس فی الحال دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کلام عرب میں فقیر کا معنی یہ ہے کہ وہ مفلس جس کی پیٹھ سے شدت فقر و افلاس کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی نکال لی جائے پس اس سے زیادہ شدید اور سخت اور کوئی حال نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (البقرہ: 273)

اور انہوں نے شاعر کے قول سے بھی استدلال کیا ہے:

لما رأى لُبَدُ النُّسورِ تطايرت رفعَ القوادمَ كالفقيرِ الأعزلِ

یعنی وہ اڑنے کی طاقت نہیں رکھتا پس وہ اس کی طرح ہو گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور وہ زمین کے ساتھ چپک جائے۔ اسی کی طرف اصمعی وغیرہ بھی گئے ہیں اور اسے امام طحاوی نے کوفیوں سے بیان کیا ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک اور آپ کے اکثر اصحاب کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دوسرا قول بھی ہے: وہ یہ کہ فقیر اور مسکین دونوں برابر ہیں، معنوی اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں اگرچہ اسم اور نام کے اعتبار سے وہ الگ الگ ہیں۔ اور یہی تیسرا قول ہے اور اسی کو ابن القاسم اور تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسکین فقیر کا غیر ہے اور یہ کہ یہ دونوں صنفیں ہیں، مگر ان دونوں میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ حاجت مند ہے۔ پس اسی وجہ سے یہ اس کے قول کے قریب ہے جس نے دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ان کے قول میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ (الکہف: 79) کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ وہ ان کے لیے اجرت پر لیا گیا ہو، جیسے کہا جاتا ہے: یہ فلاں کا گھر ہے، جب وہ اس میں رہ رہا ہو اگرچہ وہ ملکیت کسی اور کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے وصف میں کہا ہے: وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ (الحج) (اور ان (کو مارنے) کے لیے گرز ہوں گے لوہے کے) پس اللہ تعالیٰ نے اس کی اضافت ان کی طرف کی۔ اور مزید ارشاد گرامی ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال)

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من باع عبدا ولہ مال (جس نے غلام بیچا اور اس کا مال ہو) اور اس کا استعمال بہت زیادہ ہے کہ ایک شے کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے حالانکہ وہ اس کی نہیں ہوتی اور اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: بباب

الدار (گھر کا دروازہ) جل الدابة (جانور کی کل) سرج الفرس (گھوڑے کی زین) اور اس کی مشابہ تمام مثالیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انہیں رحمت اور مہربانی کی جہت پر مساکین کا نام دیا گیا ہو، جیسا کہ جس کو مصیبت اور تکلیف کے ساتھ آزمایا جائے یا جسے آزمائش اور تکلیف میں ڈال دیا جائے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: مساکین اهل النار (اہل جہنم میں سے مساکین) اور شاعر نے کہا ہے:

مساكين أهل الحب حتى قبورهم　　عليها تراب الذل بين المقابر

اہل محبت میں سے مساکین وہ ہیں کہ قبرستان کے درمیان ان کی قبور پر بھی ذلت کی مٹی ہوتی ہے۔ اور رہی وہ جو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد سے تاویل کی ہے: اللهم أحيني مسكينا، الحدیث اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، تو وہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہاں اس کا معنی یہ ہے: وہ تواضع اور انکساری جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اس میں نہ کوئی جبر ہو اور نہ رعونت ونخوت اور نہ اس میں بڑائی ہو اور نہ فخر اور نہ اس میں تکبر ہو اور نہ کوئی شر، ابو العتاہیہ نے کتنا خوب کہا ہے:

إذا أردت شريف اقوام كلهم　　فانظر الى ملك فى زى مسكين

جب تو ساری قوم کے شریف اور سردار کا ارادہ کرے تو تو بادشاہ کی طرف مسکین کے لباس میں دیکھ۔

ذاك الذى عظمت فى الله رغبته　　وذاك يصلح للدنيا و للدين

یہی وہ ہے جس کی رغبت اور چاہت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عظیم ہے اور وہ دین و دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور وہ سوال کرنے والا نہ ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کو ناپسند کیا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ نے اس سیاہ عورت کے بارے میں فرمایا جس نے آپ کے راستے سے ہٹنے سے انکار کر دیا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ انتہائی سرکش اور متکبر ہے''۔ اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (البقرہ: 273) ((خیرات) ان فقیروں کے لیے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لیے) چلنے پھرنے کی زمین میں) تو یہ ان کے لیے کوئی شے ہونے کے مانع نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور جس طرف امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب گئے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں وہ اچھا ہے۔ اور اس کے قریب قریب ہے وہ قول جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے۔ فرمایا: فقیر وہ محتاج ہے جو متعفف (بتکلف پاک دامن بنا) ہو اور مسکین وہ ہے جو مانگنے والا ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور یہ زہری نے کہا ہے اور اسے ابن شعبان نے اختیار کیا ہے اور یہی چوتھا قول ہے۔ اور پانچواں قول وہ ہے جو محمد بن مسلمہ نے کہا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کی رہائش گاہ اور خادم ہو یہاں تک کہ جو اس کے نیچے اور اسفل ہے وہ اس کے لیے ہو اور مسکین وہ ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے برعکس ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ کسی آدمی نے آپ سے سوال کیا اور کہا: کیا ہم مہاجرین کے فقراء میں سے نہیں ہیں؟ تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: کیا تیری

1۔ الناسخ والمنسوخ للنحاس، جلد 2، صفحہ 443

بیوی ہے جس کے ساتھ تو رہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا تیرا گھر ہے جس میں تو رہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو اغنیاء میں سے ہے۔ اس نے کہا: میرا ایک خادم بھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو ملوک میں سے ہے۔ (یعنی تو بادشاہ ہے)۔ اور چھٹا قول یہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ نے فرمایا: فقراء مہاجرین میں سے ہیں اور مساکین ان اعراب میں سے ہیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ یہ ضحاک نے کہا ہے۔

اور ساتواں قول یہ ہے کہ مسکین وہ ہے جو عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا ہے اگرچہ وہ سوال نہ بھی کرے۔ اور فقیر وہ ہے جو لے لیتا ہے اور شے کو سراً قبول کر لیتا ہے اور عاجزی کا اظہار نہیں کرتا۔ عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے۔ اور آٹھواں قول جو کہ حضرت مجاہد، عکرمہ اور زہری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مساکین وہ ہیں جو گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اور فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں۔ اور نانواں قول جو عکرمہ نے بھی کہا ہے وہ یہ ہے کہ فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں، عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور یہ فقراء اور مساکین کے درمیان اختلاف کا فائدہ ہے، کیا یہ دونوں ایک صنف ہیں یا ایک سے زیادہ؟ اس کا اظہار اس میں ہوتا ہے جو کوئی اپنے ثلث مال کی فلاں اور فقراء اور مساکین کے لیے وصیت کرتا ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک صنف ہیں انہوں نے کہا ہے: فلاں کے لیے ثلث کا نصف ہوگا اور فقراء و مساکین کے لیے ثلث کا دوسرا نصف ہوگا۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دو صنفیں ہیں ان کے مطابق ثلث ان تینوں کے درمیان تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فقر کی اس حد میں علماء کا اختلاف ہے جس کے ساتھ لینا جائز ہوتا ہے۔ محققین اہل علم میں سے اکثر کے اجماع کے بعد..... کہ جس کا گھر اور خادم ہو وہ ان سے مستغنی نہ ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور دینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے دے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر گھر اور خادم کی قیمت سے فالتو رقم اس قدر نہ ہو جس کا ان کے ہوتے ہوئے وہ محتاج اور ضرورت مند ہے تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نخعی اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس بیس دینار یا دو سو درہم ہوں تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ پس انہوں نے نصاب کا اعتبار کیا ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء میں لوٹا دوں'' (1)۔ یہ بالکل واضح ہے۔ اور اسے مغیرہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوری، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: جس کے پاس پچاس درہم ہوں یا ان کی مقدار سونا ہو تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور نہ ہی پچاس درہم سے زیادہ زکوٰۃ میں سے کسی کو دیئے جا سکتے ہیں مگر یہ کہ وہ مقروض ہو۔ یہ امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 959

سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم ہوں'' (1)۔ اس کی سند میں عبد الرحمن بن اسحاق ضعیف راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا بکر بن خنیس بھی ضعیف ہے۔ اور اسے حکیم بن جبیر نے محمد بن عبد الرحمن بن یزید سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور پچاس درہم کا ذکر کیا ہے۔ اور حکیم بن جبیر ضعیف ہے اسے شعبہ وغیرہ نے ترک کر دیا ہے۔ یہ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابو عمر نے کہا ہے: یہ حدیث حکیم بن جبیر کے گرد گھومتی ہے اور وہ متروک راوی ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم یا ان کی قیمت کا سونا ہو (2)۔ اسے دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس چالیس درہم ہوں وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور اسے واقدی نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے لوگوں سے مانگا اس حال میں کہ وہ غنی ہو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں لگی ہوں گی اور وہ چھیلا ہوا ہوگا'' (3)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کا غنا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چالیس درہم''۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے جو انہوں نے زید بن اسلم سے، انہوں نے عطا بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جس نے اس حال میں مانگا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ ہو یا اس کے برابر (مال سونا وغیرہ) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار مانگا اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے'' (4)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت مشہور ہے اسے ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا اسے زکوٰۃ دی جائے گی جس کے پاس چالیس درہم ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ آدمی ہو جو کمانے کی طاقت رکھتا ہو اور اچھی طرح تصرف کر سکتا ہو۔ اور دوسرا وہ ہو جو کمانے سے کمزور اور ضعیف ہو یا وہ عیال دار ہو۔ واللہ اعلم

اور امام شافعی اور ابو ثور رحمہما اللہ علیہما نے کہا ہے: جو کمانے کی اور کوئی پیشہ اپنانے کی قوت رکھتا ہو اس کے ساتھ ساتھ اس کا بدن قوی اور طاقتور ہو اور اچھی طرح تصرف پر قادر ہو یہاں تک کہ وہ اسے لوگوں سے غنی کر دے تو اس پر صدقہ حرام ہے۔ اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا ہے: ''کسی غنی کے لیے اور کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے'' (5)۔ اسے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اور ابو داؤد، ترمذی اور دار قطنی نے اسے نقل کیا

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121۔ سنن ابن داؤد، باب من یعطی من الصدقۃ، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب من مثل عن ظھر غنی، حدیث نمبر 1829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 122　　3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1392۔ ابن ماجہ، من سئل عن ظھر غنی، حدیث 1828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صدقہ آیا پس لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ کسی غنی کے لیے، کسی صحیح الاعضاء (یا تندرست) کے لیے اور کسی کام کرنے والے (عامل) کے لیے مناسب اور جائز نہیں'' (1)۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

اور ابوداؤد نے عبید اللہ بن عدی بن خیار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مجھے دو آدمیوں نے خبر دی ہے کہ وہ دونوں حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ صدقہ تقسیم فرما رہے تھے تو انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس میں سے کچھ مانگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری طرف نظر اٹھائی اور پھر اسے جھکا لیا، پس آپ نے ہمیں مضبوط دیکھا تو ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں ورنہ اس میں کسی غنی اور کسی کمانے والے قوی آدمی کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے'' (2)۔ کیونکہ وہ اپنی کمائی کے سبب اس طرح غنی ہے جیسے کوئی دوسرا اپنے مال کے سبب غنی ہو پس دونوں میں سے ہر ایک سوال کرنے سے غنی ہو گیا ہے۔ اور یہ ابن خویز منداد نے کہا ہے، اور اسے ''المذہب'' سے بیان کیا ہے، اور یہ مناسب نہیں کہ اس پر بھروسہ کر لیا جائے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقراء کو عطا فرماتے تھے اور اسے (صدقہ کو) اپاہج پر موقوف کرنا باطل ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں کہا ہے: جب آدمی قوی البدن محتاج ہو اور اس کے پاس کوئی شے نہ ہو اور اس پر صدقہ کر دیا جائے تو اہل علم کے نزدیک صدقہ کرنے والے کی طرف سے یہ جائز ہے (3)۔ اور بعض اہل علم کے نزدیک حدیث کی اطلاق سوال کی صورت میں ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوت اور اپنے بدن کے تندرست ہونے کے باوجود فقیر ہے۔ اور اسی طرح امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے۔

اور عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے: وہ آدمی جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اسے کافی ہو اور سال بھر اسے قائم رکھ سکتا ہو تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے ابن شہاب نے مالک بن اوس بن حدثان سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مال سے سال بھر کی خوراک جمع رکھتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور مال فے عطا فرمایا، پھر اس سے جتنا زائد ہوتا اسے گھوڑے اور ہتھیار خریدنے میں لگا دیتے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ (الضحیٰ)

اور بعض اہل علم نے کہا ہے: ہر ایک کے لیے صدقہ میں سے لینا ایسی حالت میں جائز ہے جس سے اسے کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: جس کے پاس رات کھانا ہو تو وہ غنی ہے۔ اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے ظہر غنیٰ کے ہوتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اس کے ساتھ جہنم میں گرم کیے گئے پتھروں کو کثرت سے طلب کیا'' (4)۔ صحابہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 119، حدیث نمبر 66 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 589، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121

کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ظہر الغنی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رات کا کھانا''۔ اسے دار قطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند میں عمرو بن خالد ہے اور وہ متروک ہے۔ اور اسے ابو داؤد نے سہل بن حنظلیہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے: ''جس نے سوال کیا اس حال میں کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کر رہا ہو تو بلاشبہ وہ آگ کی کثرت طلب کر رہا ہے اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام پر کہا ہے: ''وہ جہنم کے انگارے (کثرت سے اکھٹے کر رہا ہے) تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے اسے غنی کر سکتی ہے؟ اور نفیلی نے دوسری جگہ بیان کیا: وہ کون سا غنا ہے جس کے ہوتے ہوئے سوال نہیں کرنا چاہیے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اتنی مقدار جو صبح و شام کے کھانے میں کافی ہو''۔ اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام میں کہا ہے کہ ''اس کے پاس دن اور رات یا رات اور دن پیٹ بھرنے کے لیے کھانا موجود ہو'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ذکر ہوا یہ اس فقر کا بیان ہے جس کے ساتھ زکوۃ لینا جائز ہوتی ہے اور مطلق لفظ فقراء اہل ذمہ کے بغیر صرف مسلمانوں کے ساتھ اختصاص کا تقاضا نہیں کرتا، البتہ اس بارے میں اخبار بالکل ظاہر ہیں کہ صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لیے جائیں گے اور ان کے فقراء کو دے دیئے جائیں گے۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فقراء سے مراد فقراء المسلمین ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں (2)۔ اور ابو بکر العبسی نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو نابینا حالت میں شہر کے دروازے پر پڑا ہوا دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے عرض کی: انہوں نے مجھے اس جزیہ میں کرایہ پر لیے رکھا، یہاں تک کہ جب میری نظر ختم ہوگئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور میرے لیے اب کوئی نہیں ہے جو مجھے کوئی شے دے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تب تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، چنانچہ آپ نے اس کے لیے اس کی خوراک اور اس شے کا حکم دیا جو اس کی ضرورت پوری کر سکتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: یہ ان میں سے ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ، الآیہ اور وہ اہل کتاب کے اپاہج لوگ ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ، الآیہ اور جملے کا مقابلہ جملے کے ساتھ کیا اور یہ تمام صدقہ جملہ مصارف کے مقابل ہے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا جب انہیں یمن کی طرف بھیجا: ''تم انہیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے وہ ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء میں لوٹا دیا جائے گا'' (3)۔ پس ہر شہر کے باسی اپنے شہر کی زکوۃ کے ساتھ خاص ہیں۔ اور ابو داؤد نے بیان کیا ہے کہ زیاد یا کسی اور امیر نے عمران بن حصین کو زکوۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، پس جب وہ لوٹ کر آئے تو اس نے عمران سے پوچھا: مال کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: مال کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا! ہم نے اسے وہاں سے لیا جہاں سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لیتے تھے اور ہم نے اسے وہاں رکھ دیا جہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 67　　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 223

کے زمانہ میں رکھتے تھے۔ اور دارقطنی اور ترمذی نے عون بن ابی جحیفہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہمارے پاس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ وصول کرنے والا آیا پس اس نے ہمارے اغنیاء سے صدقہ لیا اور اسے ہمارے فقراء کو ادا کر دیا پس میں ایک یتیم بچہ تھا تو اس نے مجھے اس میں سے ایک جوان اونٹنی دی (1)۔

ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جحیفہ کی حدیث مروی ہے وہ حدیث حسن ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ زکوٰۃ کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے اور اس بارے میں تین قول ہیں: وہ منتقل نہیں کی جائے گی۔ یہ سحنون اور ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور یہ صحیح ہے ان دلائل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ابن قاسم نے یہ بھی کہا ہے: اگر ضرورت کے تحت زکوٰۃ کا کچھ حصہ منتقل کیا گیا تو میں اسے صحیح اور درست قرار دیتا ہوں۔ اور سحنون سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: اگر امام وقت کو یہ خبر موصول ہو کہ کچھ علاقہ شدید حاجت مند ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بعض کی فرض زکوٰۃ ان کی طرف منتقل کر دے، کیونکہ جب وہ حاجت ظاہر ہو جائے تو پھر اسے اس پر مقدم کرنا واجب ہے جو محتاج نہیں ''اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اسے (کسی ظالم یا مصیبت) کے حوالے کرتا ہے اور نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے'' (2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے اور اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو اس طرح مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو کہا: تم مجھے خمیس (پانچ گز کپڑا) یا بوسیدہ پہننے کے کپڑے دے دو میں تم سے وہ جو (مکئی) اور جو کی جگہ صدقہ میں لوں گا کیونکہ یہ تم پر آسان ہیں اور مدینہ طیبہ کے مہاجرین کے لیے زیادہ نفع بخش ہیں (3)۔ اسے دارقطنی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس روایت میں لفظ الخمیس مشترک ہے اور یہاں اس سے مراد پانچ گز لمبا کپڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ جس نے سب سے پہلے یہ عمل کیا وہ یمن کے بادشاہوں میں سے اخمس بادشاہ تھا۔ اسے ابن فارس نے مجمل میں اور جوہری نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یمن سے مدینہ طیبہ کی طرف زکوٰۃ منتقل کی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تقسیم کے والی تھے۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ اور اس میں ایک شہر کے فقیر اور دوسرے شہر کے فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم

دوسرا قول: زکوٰۃ میں قیمت لینا ہے۔ تحقیق زکوٰۃ میں قیمت نکالنے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت مختلف ہے۔ آپ نے ایک بار اس کی اجازت عطا فرمائی اور دوسری بار اس سے منع کر دیا، جواز کی وجہ یہ حدیث ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی جواز کا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: ''وہ آدمی جس کا اونٹوں میں سے صدقہ جذعہ (چار سال کا اونٹ) تک پہنچ چکا ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو بلکہ اس کے پاس حقہ (ایسا اونٹ جس کی عمر تین سال مکمل ہو چکی ہو) ہو تو اس سے وہ لے لیا جائے اور اس کے ساتھ دو بکریاں یا بیس درہموں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 330

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100، حدیث نمبر 24

میں سے جو آسان ہو"(1)۔ الحدیث۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم انہیں اس دن سوال سے غنی کردو"(2)۔ مراد یوم فطر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ انہیں اس چیز کے ساتھ غنی کیا جائے جو ان کی حاجت کو پورا کرسکتی ہے، پس جو چیز بھی ان کی حاجت ختم کرسکتی ہے وہ جائز ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (التوبہ:103) (تم ان کے مالوں سے صدقہ لو) اسے رب کریم نے کسی شے کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوٰۃ کے بدلے گھر کی رہائش نہیں دی جاسکتی، مثلاً کسی پر پانچ درہم واجب ہوں اور وہ ان میں ایک فقیر کو ایک مہینہ گھر میں رہائش دے دے تو یہ جائز نہیں۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے کیونکہ رہائش مال نہیں ہے۔

اور ان کے اس قول "قیمت دینا جائز نہیں ہے"۔ اور یہی ان کا ظاہر مذہب ہے۔ کی وجہ یہ ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پانچ اونٹوں میں (بطور زکوٰۃ) ایک بکری ہے اور چالیس بکریوں میں ایک بکری ہے"(3)۔ پس یہ بکری کے بارے نص ہے پس جب اس نے اس پر عمل نہ کیا تو گویا اس نے مامور بہ پر عمل نہ کیا اور جب مامور بہ پر عمل نہ ہو تو امر اپنی حالت پر باقی رہتا ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ فقراء اور مساکین کا حصہ اس جگہ تقسیم کیا جائے گا اور بقیہ تمام حصص امام کے اجتہاد کے ساتھ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7۔ کیا سال مکمل ہونے کے وقت مال کی جگہ کا بھی اعتبار ہے کہ صدقہ وہیں تقسیم کیا جائے یا مالک کی جگہ کا اعتبار ہے جب کہ مخاطب وہ ہے۔ اس بارے میں دو قول ہیں۔ دوسرے کو ابو عبد اللہ محمد بن خویز منداد نے اپنے احکام میں اختیار کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ انسان ہی زکوٰۃ نکالنے کے حکم کا مخاطب ہے اور مال اس کے تابع ہے۔ پس واجب ہے کہ اس میں حکم مخاطب کے اعتبار سے ہو، جیسا کہ ابن سبیل (مسافر) وہ اپنے شہر میں غنی ہوتا ہے اور دوسرے شہر میں فقیر ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے حکم اس دوسرے اعتبار سے ہے۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں جس نے کسی مسلمان فقیر کو صدقہ دیا پھر ایک دوسری حالت میں یہ ظاہر ہوا کہ اس نے غلام یا کافر یا غنی کو دے دیا تو آپ نے ایک بار فرمایا: وہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اور پھر فرمایا جائز نہیں ہوگا۔ وجہ الجواز...... اور یہی اصح ہے۔ وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: "ایک آدمی نے کہا میں آج کی رات ضرور صدقہ ادا کروں گا چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اس نے وہ زانیہ کے ہاتھ میں دے دیا جب انہوں نے صبح کی تو آپس میں باتیں کرنے لگے آج کی رات زانیہ کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے حیران ہو کر کہا: اے اللہ! تیرے لیے ہی حمد ہے کیا زانیہ کو دے دیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 195		2۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 153، حدیث نمبر 67

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 219۔ ایضاً، حدیث نمبر 1340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء فی زکوٰۃ الذهب الخ، حدیث نمبر 564، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے؟ میں اس صدقہ کے بدلے ضرور صدقہ کروں گا، پھر وہ صدقہ لے کر نکلا اور ایک غنی کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو باتیں کرنے لگے: غنی کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے کہا: اے اللہ! حمد کے لائق تو ہی ہے کیا غنی کو دے دیا ہے؟ میں اس صدقہ کے عوض ضرور صدقہ دوں گا۔ چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اسے چور کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو وہ باتیں کرنے لگے: چور کو صدقہ دیا گیا ہے، تو اس نے کہا: اے اللہ! حمد تیرے لیے ہی ہے کیا زانیہ، غنی اور چور کو صدقہ دیا گیا ہے؟ چنانچہ اسے لایا گیا اور اسے کہا گیا: جہاں تک تیرے صدقہ کا تعلق ہے وہ قبول کر لیا گیا ہے، رہی زانیہ تو شاید وہ اس کے سبب اپنے زنا سے بچ جائے پاک دامن ہو جائے۔ اور شاید غنی اس لیے معتبر ہے کہ وہ اس سے خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے اور شاید چور اس کے ساتھ چوری سے محفوظ ہو جائے'' (1)۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی اور اس نے وہ اپنے باپ کو دے دی۔ پس جب صبح ہوئی تو اسے اس بارے علم ہوا۔ پھر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تحقیق تیرے لیے تیری زکوٰۃ کا اجر اور صلہ رحمی کا اجر لکھ دیا گیا ہے پس تیرے لیے دو اجر ہیں''۔ اور معنی کی جہت سے یہ ہے کہ اس کے لیے معطی (جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے) کے بارے اجتہاد اور تتبع و تلاش کو جائز قرار دیا ہے، پس جب اس نے اجتہاد کیا اور اسے دیا جسے وہ اس کا اہل گمان کرتا ہے تو اس نے اپنا واجب ادا کر دیا۔

اور اس قول ''کہ وہ جائز نہیں ہے'' کی وجہ یہ ہے کہ اس نے وہ صدقہ اس کے مستحق کو نہیں دیا۔ پس یہ عمد (جان بوجھ کر عمل کرنا) کے مشابہ ہو گیا، کیونکہ اموال کی ضمان میں عمد اور خطا ایک ہی ہے پس واجب ہے کہ وہ اس کا ضامن ہو جو اس نے مساکین کا حصہ ضائع کیا ہے یہاں تک کہ اسے ان تک پہنچا دے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے زکوٰۃ اس کے محل کے وقت نکالی پھر وہ بغیر تفریط کے ضائع ہو گئی تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ وہ فقراء کا وکیل ہے۔ اور اگر اس نے اسے اس کی مدت گزرنے کے بعد نکالا پھر وہ ضائع ہو گئی تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ اسے اس کے محل سے مؤخر کرنے کے سبب وہ اس کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو چکی ہے اس لیے وہ اس کا ضامن ہوگا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب امام وقت زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے خرچ کرنے میں عدل کر رہا ہو تو پھر مالک کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بذات خود دراہم و دنانیر یا کسی اور مال میں تصرف کرنے کا والی بنے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دراہم و دنانیر کی زکوٰۃ ان کے مالکوں پر ہے۔ اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب صرف فقراء اور مساکین کے لیے خرچ کرنا ہو۔ اور اگر ان دو کے علاوہ دیگر اصناف میں خرچ کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ان پر امام کے سوا کوئی تقسیم نہیں کر سکتا۔ اس باب کی فروع کثیر ہیں اور یہ ان کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا مراد وہ بھاگ دوڑ کرنے والے اور خرچ وصول کرنے والے ہیں جنہیں امام وقت اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 329

ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسد کے ایک آدمی کو بنی سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل مقرر فرمایا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا، پس جب وہ آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا(1)۔ اور علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے جو زکوٰۃ وصول کرنے والے لے سکتے ہیں اس بارے میں تین قول ہیں:

حضرت مجاہد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ آٹھواں حصہ ہے۔ ابن عمر اور امام مالک نے کہا ہے: انہیں ان کے کام کے برابر اجرت دی جائے گی، اور یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے(2)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس نے فقراء کی مصلحت اور منفعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہے، پس اس کی کفایت اور اس کے معاونین کی کفایت ان کے مال سے ہوگی، جیسا کہ عورت نے جب اپنے آپ کو خاوند کے حق کے لیے معطل کر دیا تو اس کا نفقہ اور اس کے متبعین چاہے وہ ایک خادم ہو یا دو ہوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہے۔ اسے ثمن (آٹھواں حصہ) کے ساتھ مقرر نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں کفایت کا اعتبار کیا جائے گا چاہے وہ آٹھواں حصہ ہو یا اس سے زیادہ، جیسا کہ قاضی کی تنخواہ وغیرہ۔ اور ہمارے زمانے میں معاونین کی کفایت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ محض اسراف اور فضول خرچی ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ انہیں بیت المال سے دیا جائے گا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے یہی قول صحیح ہے اس روایت کے مطابق جو ابن ابی اویس اور داؤد بن سعید بن زنبوعہ سے ہے اور یہ دلیل کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے حصے کے بارے خبر دی ہے وہ اس میں نص ہے تو پھر استقراء اور سبر کے ذریعہ اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے(3)۔ اور صحیح یہ ہے کہ اجرت مقرر کرنے میں اجتہاد کرنے، کیونکہ یہ بیان اصناف شمار کرنے کے بارے ہے بلاشبہ وہ محل کے لیے ہے نہ کہ مستحق کے لیے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

علماء نے ایسے عامل کے بارے میں اختلاف کیا ہے جب وہ ہاشمی ہو، پس امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا ہے کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک صدقہ آل محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے بلاشبہ یہ لوگوں کی میل ہے''(4)۔ اور یہ بھی من وجہ صدقہ ہے، کیونکہ یہ (زکوٰۃ) صدقہ کا ایک جز ہے۔ پس اسے کرامۃً اور رسول اللہ ﷺ کی قرابت کو لوگوں کے غسالہ اور دھوون سے بچانے کے لیے من کل الوجوہ صدقہ سے ملحق کیا جائے گا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے کام کی اجرت بھی اسے دی جائے گی، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اور آپ کو یمن کی طرف زکوٰۃ کا عامل بنا کر بھیجا(5) اور آپ کو بنی ہاشم کی ایک جماعت کا والی بنایا اور آپ کے بعد اسی طرح خلفاء والی بنے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ عامل مباح عمل پر بطور اجیر ہوتا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 203
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 344
5۔ سنن ابی داؤد، باب کیف القضاء، حدیث نمبر 3111، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب ذکر القضاء، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی برابر ہوں جیسا کہ دیگر تمام کاروبار میں ہوتا ہے۔ احناف نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ کے لیے صدقہ میں سے کچھ مقرر کیا گیا، پس اگر آپ کے لیے صدقہ کے علاوہ (کسی اور مال) سے اجرت مقرر کی گئی تو وہ جائز ہے اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام امور جو فرض کفایہ میں سے ہیں جیسے صدقات کی وصولی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، کاتب، قسام (زمین کی تقسیم کرنے والا) اور محصول چنگی لینے والا (عاشر) وغیرہ پس ان امور کو سرانجام دینے والے کے لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور اس میں سے امامت بھی ہے، کیونکہ نماز اگرچہ تمام مخلوق کی طرف متوجہ ہے لیکن ان میں سے بعض کا امامت کے لیے آگے بڑھنا فروض کفایہ میں سے ہے، لہٰذا بلاشک اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہ باب کی اصل ہے اور اس کی طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا ہے: ''میں نے اپنی زوجات کے نفقہ اور اپنے عاملین کی محنت اجرت کے سوا جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے''۔ یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ قرآن کریم میں صدقات کی تقسیم کے سوا کہیں مولفۃ قلوب کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو ابتدائے اسلام میں ان لوگوں میں سے تھے جو اسلام ظاہر کرتے تھے، ان کے یقین کمزور ہونے کی وجہ سے صدقہ میں سے انہیں حصہ دیئے جانے کے سبب وہ دوستی قائم رکھتے تھے۔ زہری نے کہا ہے: المولفہ وہ ہیں جو یہود و نصاریٰ میں سے اسلام لائے اگرچہ وہ غنی اور دولت مند ہوں (1)۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: ان کی صفت اور تعریف میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ کفار کی ایک صنف ہیں انہیں اس لیے (صدقات) دیئے جاتے تھے تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل رہیں اور وہ غلبہ اور تلوار کے زور پر اسلام قبول نہ کرتے تھے، لیکن وہ عطا اور احسان کے ساتھ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام لائے لیکن ان کے دلوں نے یقین نہ کیا، پس انہیں عطا کیا جاتا تھا تاکہ اسلام ان کے سینوں میں راسخ ہو جائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مشرکین کے عظماء کی ایک جماعت ہے ان کے متبعین بھی تھے انہیں دیا جاتا تھا تاکہ ان کے متبعین اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ فرمایا: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان تمام سے مقصود ان کو عطا کرنا ہے جو عطا کے بغیر حقیقۃً اسلام لانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ تو گویا یہ جہاد کی ایک قسم ہے۔ اور مشرکین تین قسم کے ہیں: ایک قسم کی طرف دلائل قائم کر کے رجوع کیا جاتا ہے اور ایک قسم کی طرف قہر و غلبہ کے ساتھ اور ایک قسم کی طرف احسان و عطا کے ساتھ۔ اور وہ امام جو مسلمان کے لیے نظر و فکر کرنے والا ہے وہ ہر صنف کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جسے وہ کفر سے نجات اور خلاصی پانے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: ''بے شک میں ان لوگوں کو عطا کرتا ہوں جن کا زمانہ ابھی کفر کے قریب ہے تو میں ان کی تالیف قلوب کرتا ہوں'' (2)۔ الحدیث

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 49　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 338

ابن اسحاق نے کہا ہے: آپ انہیں عطا فرماتے اور ان کی تالیف قلوب فرماتے اور آپ ان کے سبب ان کی قوم کی بھی تالیف کرتے تھے اور وہ اشراف اور سردار تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب کو سو اونٹ دیئے اور اس کے بیٹے کو بھی سو اونٹ عطا فرمائے۔ حکیم بن حزام کو سو اونٹ دیئے، حارث ابن ہشام کو سو اونٹ دیئے، سہیل بن عمرو کو سو اونٹ عطا فرمائے، حویطب بن عبدالعزی کو سو اونٹ دیئے اور صفوان بن امیہ کو سو اونٹ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح مالک بن عوف اور علاء بن جاریہ کو بھی عطا فرمائے۔ فرمایا: یہ سب اصحاب المئین ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں سے بعض لوگوں کو سو سے کم بھی دیئے ان میں سے مخرمہ بن نوفل الزہری، عمیر بن وہب جمحی، ہشام بن عمرو العامری ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: یہ وہ ہیں جن کے بارے میں نہیں جانتا کہ آپ نے انہیں کتنے عطا فرمائے؟ اور سعید بن یربوع کو پچاس اونٹ دیئے اور عباس بن مرداس السلمی کو تھوڑے اونٹ دیئے تو وہ اس پر ناراض ہو گیا۔ تو اس نے اس بارے میں یہ کہا:

كانت نِهابًا تَلافَيْتُها　　بكَرّي على المُهْرِ في الأجْرَعِ

وإيقاظِيَ القومَ أن يرقدوا　　إذا هَجَعَ النّاسُ لم أهجعِ

فأصبحَ نَهْبِي ونَهْبُ العُبَيْدِ　　بين عُيَيْنه والأقْرَعِ

وقد كنتُ في الحرب ذاتُدْرَءٍ　　فلم أُعْطَ شيئًا ولم أمْنَعِ

إلّا أفائلَ أُعطيتَها　　عديدَ قوائِمه الأربعِ

وما كان حِصْنٌ ولا حابِسٌ　　يفوقان مِرْداسَ في المَجْمعِ

وما كنتُ دون أمرئ منهما　　ومن تضعِ اليومَ لا يُرْفَعِ

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جاؤ اور میرے بارے میں اس کی زبان بند کرو'' (1)۔ چنانچہ انہوں نے اسے اتنا دیا یہاں تک کہ وہ راضی ہو گیا۔ تو گویا اس طرح اس کی زبان کٹ گئی۔ ابو عمر نے کہا ہے: مولفۃ قلوب میں نضیر بن حارث بن علقمہ ابن کلدہ کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس نضر بن حارث کا بھائی تھا جو بدر میں ڈٹا رہا اور مارا گیا۔ اور دوسروں نے ذکر کیا ہے کہ یہ ان میں سے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پس اگر یہ ان میں سے ہے تو پھر اس کا مولفۃ قلوب میں سے ہونا محال ہے، کیونکہ جس نے سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کی تو وہ ان مہاجرین اولین میں سے ہوا جن کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا اور اس نے اپنے سوا کے ساتھ قتال کیا اور وہ ان میں سے نہیں جن کی تالیف قلوب کی جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن عوف بن سعد بن یربوع نصری کو ان پر عامل مقرر کیا جو قبائل قیس میں سے اس کی قوم سے اسلام لائے اور اسے ثقیف کی لوٹ مار کرنے کا حکم دیا پس اس نے ایسا ہی کیا اور اس پر جینا تنگ کر دیا اور اس کا اسلام اور ان کے مولفۃ قلوب کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا، سوائے عیینہ بن حصن کے وہ ہمیشہ متہم رہتا۔ تمام مولفۃ قلوب فاضل لوگ تھے، ان میں سے بہترین اور عمدہ فاضل بھی ہیں جن کے فضل پر اجماع ہے، مثلاً حارث

1۔ دلائل النبوۃ، رجوع النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلی الجعرانۃ، جلد 5 صفحہ 183

بن ہشام، حکیم بن حزام، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور ان میں سے کچھ ان میں سے کم ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے تمام مومن بندوں کو آپس میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور وہ انہیں بہتر جانتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حکیم بن حزام نے وہ مال نکال دیا جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مولفۃ قلوب کی صورت میں عطا فرمایا تھا پس انہوں نے اس کے بعد اسے صدقہ کر دیا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت حکیم بن حزام اور حضرت حویطب بن عبدالعزی میں سے ہر ایک ایک سو بیس برس تک زندہ رہا، ساٹھ سال اسلام کی حالت میں اور ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں۔ اور میں نے امام الشیخ، الحافظ ابو محمد عبدالعظیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو آدمی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ساٹھ برس تک اور زمانہ اسلام میں بھی ساٹھ برس تک زندہ رہے اور وہ دونوں مدینہ طیبہ میں 54ھ میں فوت ہوئے۔ ان میں سے ایک حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ہیں، ان کی ولادت جوف کعبہ میں عام الفیل سے تیرہ سال پہلے ہوئی۔ اور دوسرے حضرت حسان بن ثابت بن منذر بن حرام الانصاری ہیں۔ اور اسے ابو عمر اور عثمان الشہر زوری نے بھی کتاب ''معرفۃ انواع علم الحدیث'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں نے ان کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا۔ اور حویطب کا ذکر ابو الفرج علامہ الجوزی نے کتاب الوفاء فی شرف المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا ہے۔ اور اسے ابو عمر نے کتاب الصحابہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی اور ایک سو بیس سال کی عمر میں ان کا وصال ہوا۔ اور انہوں نے حمنن ابن عوف جو کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ حالت اسلام میں ساٹھ برس تک زندہ رہے اور جاہلیت میں بھی ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ اور **مولفۃ قلوبھم** میں حضرت معاویہ اور ان کے والد ابو سفیان بن حرب کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو آپ کا ان میں سے ہونا بعید ہے۔ اور آپ ان میں سے کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی قراءت پر امین بنایا اور انہیں اپنی ذات کے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں ان کی حالت اس سے زیادہ مشہور اور اظہر تھی۔ اور جہاں تک ان کے باپ کا تعلق ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ ان میں سے تھے۔ اور **مولفۃ قلوبھم** کی تعداد میں اختلاف ہے، بالجملہ وہ سب کے سب مومن تھے اور ان میں کوئی بھی کافر نہیں تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم واحکم۔

مسئلہ نمبر 13۔ علماء نے ان کے باقی رہنے میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت عمر، حسن اور شعبی وغیرہم نے کہا ہے: اسلام کے غلبے اور ظہور کے ساتھ یہ صنف ختم ہو چکی ہے۔ یہی امام مالک اور اصحاب رائے رحمۃ اللہ علیہم کا مشہور مذہب ہے۔ بعض علمائے حنفیہ نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اس کے ماننے والوں کو غلبہ عطا فرمایا اور کافروں کی جڑ کاٹ دی...... اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو...... تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دور میں ان کے حصہ کے ساقط ہونے پر اجماع کیا (2)۔ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ ابھی باقی ہیں، کیونکہ امام وقت کو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 963
2۔ تفسیر آیات احکام القرآن، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 64

بسا اوقات ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اسلام پر مائل کرے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دین کو غالب آتے دیکھا تو آپ نے انہیں ختم کر دیا۔ یونس نے کہا ہے: میں نے زہری سے ان کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں ان کے بارے میں نسخ کو نہیں جانتا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: پس اس بنا پر حکم ان کے بارے میں ثابت ہے، پس اگر کوئی ہو جس کی تالیف قلب کی ضرورت ہو اور ان کے بارے یہ خوف ہو کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی آفت آپہنچے گی یا یہ امید ہو کہ اس کا اسلام اس کے بعد اچھا ہو جائے گا تو اسے دے دیا جائے۔ قاضی عبد الوہاب نے کہا ہے: اگر بعض اوقات ان کی حاجت اور ضرورت پیش آ جائے تو انہیں صدقے میں سے دے دیا جائے۔ اور قاضی ابن عربی نے کہا ہے: جو میرے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام قوی اور طاقتور ہو تو وہ زائل ہو چکے ہیں (انہیں کچھ بھی نہ دیا جائے) اور اگر ان کی احتیاج اور ضرورت ہو تو ان کا حصہ انہیں دیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیتے تھے (1)، کیونکہ صحیح روایت میں ہے: ''اسلام کا آغاز غریب حالت میں ہوا اور عنقریب وہ پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جائے گا جس پر وہ شروع میں تھا'' (2)۔

مسئلہ نمبر 14۔ پس جب ہم نے اس پر تفریع ذکر کی ہے کہ ان کی طرف ان کا حصہ نہیں لوٹایا جائے گا کیونکہ وہ تمام اصناف کی طرف لوٹ جائیں گے یا اس کی طرف جسے امام مناسب دیکھے گا۔ اور زہری نے کہا ہے: ان کا نصف حصہ مساجد بنانے والوں کو دے دیا جائے گا۔ اور یہ تیری اس پر رہنمائی کرتی ہے کہ آٹھوں اصناف محل ہیں اور وہ سب برابر مستحق نہیں ہیں۔ اور اگر وہ مستحق ہوتے تو یقیناً ان کا حصہ ان کے سقوط کے ساتھ ساقط ہو جاتا اور وہ ان کے غیر کی طرف نہ لوٹتا، جیسا کہ اگر کوئی دو معین قوم کے لیے وصیت کرے پھر ان میں سے ایک مر جائے تو اس کا حصہ ان میں سے باقی رہنے والوں کی طرف نہیں لوٹتا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَفِي الرِّقَابِ یعنی گردنیں آزاد کرانے میں۔ اسے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ پس امام کے لیے جائز ہے کہ مال صدقہ سے گردنیں (غلام) خریدے اور انہیں مسلمانوں کی جانب سے آزاد کر دے اور ان کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی۔ اور اگر صاحب زکوٰۃ (زکوٰۃ ادا کرنے والا مالک) انہیں خریدے اور پھر انہیں آزاد کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور امام احمد، اسحاق، اور ابو عبید وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: صاحب زکوٰۃ کسی نفس کو زکوٰۃ سے نہیں خرید سکتا کہ وہ اسے ولاء کے حصول کے لیے پھر آزاد کر دے۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب الرائے کا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَفِي الرِّقَابِ پس جب صدقات میں گردنوں کی آزادی کا حصہ ہے تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک غلام خریدے اور اسے آزاد کر دے۔ اور اہل علم کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لیے گھوڑا خریدنا جائز ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سوار ہو کر جائے گا۔ (یعنی جہاد کے لیے) تو جب اس کے لیے گھوڑا مکمل طور پر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 966

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84

زکوٰۃ سے خریدنا جائز ہے تو پھر اس کے لیے غلام مکمل طور پر خریدنا بھی جائز ہوگا۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِی الرِّقَابِ یہ ولاء میں اصل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ گردن آزاد ہو جائے گی اور اس کی ولاء مسلمانوں کے لیے ہوگی۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اسے امام وقت نے آزاد کیا، تحقیق حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء بیچنے اور اسے ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولاء بھی نسبی قرابت کی طرح قرابت ہے لہٰذا نہ اسے بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولاء اس کے لیے ہوگی جس نے آزاد کیا''۔ اور عورتیں ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں ہو سکتیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''عورتیں ولاء میں کسی شے کی وارث نہیں ہوں گی سوائے اس کے جسے وہ آزاد کریں یا جسے اس نے آزاد کیا جسے انہوں نے آزاد کیا'' (1)۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو غلام کی جانب سے نصف کا اور نصف کا اس کی بیٹی کو وارث بنایا (2)۔ اور جب آزاد کرنے والا مذکر اور مونث اولاد چھوڑے تو ولاء اس کی اولاد میں سے مذکر افراد کے لیے ہوگی نہ کہ مونث کے لیے۔ اور اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے۔ اور ولاء کا وارث محض وہ ہوتا ہے جسے عصبہ بنایا جاتا ہے اور عورتیں عصبہ نہیں بن سکتیں پس وہ ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں بن سکتیں۔ پس تو سمجھ لے تو منزل کو پا لے گا۔

مسئلہ نمبر 17۔ علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ کیا مکاتب کی صدقات سے مدد کی جائے گی؟ تو کہا گیا ہے: نہیں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب گردن (غلام آزاد کرنے) کا ذکر کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اس نے کامل آزادی کا ارادہ کیا ہے۔ اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروض) کے کلمہ میں داخل ہے اس وجہ سے کہ اس پر کتابت کا دین (قرض) ہے۔ پس وہ الرقاب میں داخل نہ ہوگا (3)۔ واللہ اعلم۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مدنیین کی روایت سے مروی ہے اور زیاد نے ان سے روایت کی ہے کہ مال صدقہ سے مکاتب کی اس کی کتابت کی آخر میں اتنے مال سے مدد کی جائے گی کہ وہ آزاد ہو جائے (4)۔ اور اسی بناء پر جمہور علماء نے قول باری تعالیٰ: وَ فِی الرِّقَابِ کی تاویل کی ہے۔ اور ابن وہب، امام شافعی، لیث اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے۔ اور علی بن موسیٰ القمی الحنفی نے اپنی احکام میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مکاتب مراد ہے۔ اور گردنیں آزاد کرنے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے: الکیا طبری نے کہا ہے: اور انہوں نے اس کے انکار اور منع میں واضح اور بین وجہ ذکر کی ہے اور کہا ہے: بے شک آزاد کرنا ملکیت کو باطل کرنا ہے اور تملیک (مالک بنانا) نہیں ہے اور جو مکاتب کو دیا جائے گا وہ تملیک (مالک بنانا) ہے اور صدقہ کے حق میں سے ہے کہ وہ جائز نہیں ہوتا مگر تب جب اس میں تملیک جاری ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات بھی باعث تقویت ہے کہ اگر مقروض کی جانب سے اس کے حکم کے بغیر کوئی زکوٰۃ میں سے اس کا قرض ادا کر دے تو وہ اس حیثیت سے

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب البیوع، جلد 8، صفحہ 363، حدیث نمبر 16030

2۔ سنن ابن ماجہ، باب میراث الولاء، حدیث نمبر 2723، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 967　　4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 968

جائز نہیں کہ وہ اس کا مالک نہیں بنا تو وہ ادائیگی عتق میں بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عتق بھی ولاء کو اپنی ذات کی طرف لانا ہوتا ہے اور وہ مکاتب کو دینے میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ غلام کے ثمن جب اس نے ایک غلام کو دے دیئے تو غلام اس کا مالک نہیں ہو سکتا اور اگر اس نے وہ اس کے آقا کو دیئے تو اس نے اسے آزاد کرنے کا مالک بنا دیا۔ اور اگر اس نے اسے شراء اور عتق کے بعد دیئے تو وہ قرض کو پورا کرنے والا ہوگا اور وہ زکوٰۃ میں جائز نہ ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث موجود ہے جو اس معنی پر نص ہے جو ہم نے غلام کو آزاد کرنے اور مکاتب کی مدد کرنے کے جواز کے بارے ذکر کیا ہے، دارقطنی نے اسے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور اس نے عرض کی: آپ میری ایسے عمل پر راہنمائی فرمائیے جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور مجھے جہنم کی آگ سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خطبہ مختصر اور چھوٹا کرے تو تو نے مسئلہ (سوال) سے اعراض کیا، تو ایک آدمی کو آزاد کرا اور گردن چھوڑ دے''۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، نفس اور آدمی کو آزاد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ تو اسے آزاد کرنے میں منفرد ہو اور فك الرقبة کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کے ثمن میں معاونت کرے''(1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

مسئلہ نمبر 18۔ مال زکوٰۃ سے قیدیوں کو آزاد کرانے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ اور ابن قاسم کا قول ہے اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ جائز ہے (2)، کیونکہ یہ گردن ہے جس کا غلامی کی ملکیت کے ساتھ مالک بنایا گیا ہے پس یہ غلامی سے آزادی کی طرف نکل جاتی ہے اور یہ ان گردنوں کو آزاد کرنے کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، کیونکہ جب مسلمان کی غلامی سے مسلمان کو آزاد کرانا عبادت اور صدقہ کے مال سے جائز ہے، تو پھر زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے کہ کافر کی غلامی اور ذلت سے مسلمان کی گردن آزاد ہو۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: وَالْغٰرِمِيْنَ مراد وہ لوگ ہیں جن پر قرض ہو اور ان کے پاس اسے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، مگر وہ آدمی جس نے سفاہت اور بے وقوفی کی وجہ سے قرض لیا تو اس کی طرف سے مال زکوٰۃ یا کسی دوسرے مال سے قرض ادا نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے (3)۔ اور اس کا قرض مال زکوٰۃ میں سے ادا کیا جائے گا جس کے پاس مال ہو اور اس پر اتنا قرض ہو جو اس سارے مال کو محیط ہو جس کے ساتھ وہ اپنا قرض پورا کر سکتا ہے اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ فقیر بھی ہے اور غارم (مقروض) بھی لہٰذا دونوں وصفوں کے عوض اسے دیا جائے گا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں اس پھل میں جو اس نے خریدا تھا خسارہ پڑ گیا اور اس کا قرض بہت زیادہ ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس پر صدقہ کرو''۔ چنانچہ لوگوں نے اس پر صدقہ کیا اور وہ اس کے قرض کی پوری مقدار کو نہ پہنچ سکا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 135
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 968
3۔ ایضاً

قرض خواہوں کو فرمایا: ''تم وہ لے لو جو تم پاؤ اور تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں'' (1)۔

مسئلہ نمبر 20۔ صلح اور نیکی کے لیے دیت یا جرمانہ وغیرہ کا بوجھ برداشت کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ اسے صدقہ میں سے اتنا دیا جائے جس سے وہ اسے ادا کر سکے جو بوجھ اس نے اٹھایا ہے بشرطیکہ وہ اس پر واجب ہوا گرچہ وہ غنی ہو، جب کہ وہ اپنے مال سمیت برباد کیا جا رہا ہو جیسا کہ مقروض۔ اور یہ امام شافعی، آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اور کئی دوسروں نے کہا ہے۔ اور جس نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اس نے قبیصہ بن مخارق کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے ایک ذمہ داری (بوجھ) اٹھائی اور میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تا کہ اس بارے میں آپ سے سوال کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو ٹھہر یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقہ آ جائے تو ہم تیرے لیے اس سے حکم دیں گے...... پھر فرمایا...... اے قبیصہ! بے شک مانگنا، سوال کرنا تین آدمیوں میں سے ایک کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہوتا ایک وہ جس نے کسی کا بوجھ (دیت، خون بہا وغیرہ) اٹھا رکھا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہو جائے پھر وہ مانگنے سے رک جائے۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے کوئی تکلیف اور مصیبت آ پہنچی ہو اس کا مال برباد ہو گیا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے فاقے نے آ لیا ہو یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین آدمی شہادت دیں کہ تحقیق فلاں کو فاقے نے آ لیا ہے تو اس کے لیے سوال کرنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط اور صحیح زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اے قبیصہ! ان کے سوا سوال کرنا حرام ہے اور سوال کرنے والا اس طرح حرام کھائے گا'' (2)۔ پس آپ کا قول: ثم یمسك اس پر دلیل ہے کہ اب وہ غنی ہے، کیونکہ فقیر پر رکنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک سوال کرنا، مانگنا حلال نہیں ہے مگر تین میں سے ایک کے لیے ایک وہ جو شدید فقر میں مبتلا ہو یا وہ جو شدید اور پریشان کن قرض میں مبتلا ہو (3) یا جو دردناک اور تکلیف دہ دیت اور خون بہا کے بوجھ میں مبتلا ہو''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: ''سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہو گا'' (4)۔ الحدیث۔ عنقریب آئے گی۔

مسئلہ نمبر 21۔ اس میں اختلاف ہے کیا صدقہ کے مال سے میت کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صدقہ سے میت کا قرض ادا نہیں کیا جا سکتا اور یہی قول ابن المواز کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید کہا: مال صدقہ میں سے اسے بھی نہیں دیا جا سکتا جس پر کفارہ ہو اور حقوق اللہ میں سے اسی طرح کی کوئی اور شے لازم ہو، بے شک غارم وہ ہے جس پر ایسا قرض ہو جس میں اسے قید کیا جا سکتا ہو (5)۔ ہمارے علماء وغیرہم نے کہا ہے: مال صدقہ میں سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 83　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231　　5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 50

میت کا قرض ادا کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ غارمین میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ہر مومن کے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں، جس کسی نے مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جس نے قرض یا عیال (فقیر اور محتاج اولاد) چھوڑے تو وہ میری طرف اور میرے ذمہ ہے'' (1)۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس سے مراد جنگ لڑنے والے لشکری اور چھاؤنیوں کی جگہیں ہیں، انہیں وہ مال دیا جائے گا جو وہ اپنی جنگ میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ اغنیاء ہوں یا فقراء۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے ہیں۔ امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اسے ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ ان دونوں نے کہا ہے: سبیل اللہ حج ہے (2)۔ اور بخاری میں ہے: اور ابولاس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے حج کے لیے صدقہ کے اونٹ پر سوار کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا جاتا ہے: آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ سے (غلام) آزاد کرا سکتا ہے (3) اور حج میں دے سکتا ہے۔ ابو محمد عبدالغنی الحافظ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن خیاش نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا ابو غسان مالک بن یحییٰ نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا: یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا مہدی بن میمون نے محمد بن ابی یعقوب سے انہوں نے عبدالرحمن ابن ابی نعم سے اور ان کی کنیت ابوالحکم ہے، ہمیں خبر دی کہ انہوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! بے شک میرے خاوند نے اپنے مال کے بارے میں فی سبیل اللہ کے لیے وصیت کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس وہ اسی طرح ہے جیسے اس نے فی سبیل اللہ کہا ہے۔ تو میں نے ان کو کہا: جس بارے اس نے سوال کیا ہے تم نے اس کے لیے سوائے غم اور پریشانی کے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا: اے ابن ابی نعم تو مجھے یہ مشورہ دے رہا ہے کہ میں اسے یہ حکم دیتا کہ وہ اپنا مال وصیت ان لشکروں کو دے دے جو نکلتے ہیں اور زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔ تو میں نے پوچھا: تو آپ اسے کیا حکم دو گے؟ انہوں نے فرمایا: میں اسے حکم دے رہا ہوں کہ وہ یہ مال صالحین کی جماعت کو دے۔ بیت اللہ الحرام کو حج کرنے والوں کو دے۔ وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ شیطان کے وفد کی مثل نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ جملہ تین بار کہا۔ میں نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! شیطان کا وفد کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ قوم ہے جو ان امراء پر داخل ہوتے ہیں اور ان کے پاس جا کر باتوں کی چغلی کھاتے ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔ پس انہیں انعامات دیئے جاتے ہیں اور اس پر انہیں عطایا دیئے جاتے ہیں اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: صدقہ کے مال سے گھوڑوں، ہتھیاروں اور دیگر تمام آلات جن کی جنگ میں ضرورت ہوتی ہے دیا جاسکتا ہے اور سرحد سے دشمن کو روکنے کے لیے، کیونکہ یہ سب کا سب جنگ کی راہ اور اس کی منفعت میں سے ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل بن ابی حثمہ پر آنے والی آفت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 285
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 969
3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 198

میں اس فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لیے سو اونٹ عطا فرمائے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابوداؤد نے بشیر بن یسار سے بیان کیا ہے کہ انصار کا ایک آدمی جسے سہل بن ابی حثمہ کہا جاتا تھا اس نے انہیں خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ بطور دیت دیئے (2) یعنی اس انصاری کی دیت جو خیبر میں قتل ہوا تھا۔ اور عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے صدقہ حلال ہوتا ہے، بلاشبہ یہ اس کے لیے حلال ہوتا ہے جس کے پاس اس کا مال موجود نہ ہو اور یہ مذہب امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور جمہور اہل عالم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین نے کہا ہے: مجاہد کو صدقہ کا مال نہیں دیا جائے گا مگر جب کہ وہ فقیر ہو اور لشکر سے کٹ جانے والا ہو۔ اور یہ نص پر زیادتی ہے اور آپ کے نزدیک نص پر زیادتی نسخ کہلاتی ہے۔ اور نسخ ثابت نہیں ہوتا مگر قرآن کریم کے ساتھ یا خبر متواتر کے ساتھ اور وہ یہاں معدوم ہے (3)، بلکہ صحیح سنت میں حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد سے اس کا خلاف ثابت ہے: ''کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا سوائے پانچ کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے یا زکوۃ وصول کرنے والے عامل کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس نے صدقہ کو اپنے مال سے خرید لیا ہو یا غارم (مقروض) کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس کے پڑوس میں کوئی مسکین ہو اور وہ اس مسکین پر صدقہ کرے پھر وہ مسکین کسی غنی کو بطور ہدیہ دے دے'' (4)۔ اسے امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم عن عطاء بن یسار سے مرسل ذکر کیا ہے اور معمر نے زید بن اسلم عن عطا بن یسار عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ کی سند سے مرفوع ذکر کیا ہے۔ پس یہ حدیث آیت کے معنی کے لیے مفسر ہے۔ اور یہ کہ بعض اغنیاء کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے اور یہ حضور نبی مکرم ﷺ کے اس قول کے لیے مفسر ہیں: ''صدقہ حلال نہیں کسی غنی کے لیے اور نہ کسی طاقت ور تندرست کے لیے'' (5)۔ کیونکہ آپ ﷺ کا یہ قول مجمل ہے اور یہ اپنے عموم پر نہیں ہے اس کی دلیل مذکورہ پانچ اغنیاء والی روایت ہے۔ اور ابن القاسم کہتے تھے: کسی غنی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ صدقہ میں سے ایسا مال لے جس سے جہاد میں وہ مدد حاصل کر سکتا ہے اور اسے فی سبیل اللہ خرچ کر سکتا ہے اور بلاشبہ یہ فقیر کے لیے جائز ہے۔ فرمایا: اور اسی طرح غارم (مقروض) بھی ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صدقہ سے اتنا مال لے جس کے ساتھ وہ اپنا مال بچا سکتا ہو اور اس سے وہ اپنا قرض ادا کرے حالانکہ وہ اس (صدقہ) سے غنی ہو۔ فرمایا: جب مجاہد اپنے غزوہ میں محتاج ہو جائے حالانکہ وہ غنی تھا اس کا مال ہو جو اس سے غائب ہو (یعنی اس کے پاس موجود نہ ہو) تو وہ صدقہ میں سے کوئی شی نہ لے اور قرضہ لے لے اور پھر جب وہ اپنے شہر پہنچے تو اپنے مال سے اسے ادا کر دے۔ یہ سب کچھ ابن حبیب نے ابن القاسم سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے یہ

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 969　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 266　　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 269

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1393، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب لی تحل لہ الصدقۃ، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231

گمان کیا ہے کہ ابن نافع وغیرہ نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی ہے۔ ابوزید وغیرہ نے ابن قاسم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: زکوٰۃ سے غازی کو حصہ دیا جائے گا اگرچہ دوران جنگ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے کافی ہو اور وہ اپنے شہر میں غنی (دولت مند) ہو یہی صحیح ہے، کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے: ''سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا'' (1)۔ اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ مال زکوٰۃ میں سے مجاہدین اور گھوڑے باندھنے کی جگہوں یا سرحد کے قریب ان کی حفاظت کے لیے چھاؤنیوں وغیرہ کے لیے دیا جائے گا چاہے وہ فقراء ہوں یا اغنیاء۔

مسئلہ نمبر 23۔ قولہ تعالیٰ: وَابْنِ السَّبِيْلِ سبیل کا معنی راستہ ہے اور مسافر کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اسے لازم پکڑنے والا ہوتا ہے اور اس کا گزر اس پر ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إن تسألوني عن الهوى فأنا الهَوَى　　وابن الهَوَى وأخو الهَوَى وأبوهُ

مراد یہ ہے کہ جب کسی نے اپنے شہر، اپنی قیام گاہ اور اپنے مال سے سفر اختیار کر لیا اور راستے میں اس کے اسباب ختم ہو گئے، تو مال زکوٰۃ میں سے اسے دیا جائے گا اگرچہ وہ اپنے شہر میں غنی ہو اور اس میں یہ لازم نہیں کہ اس کا ذمہ قرض حسنہ سے مشغول ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے: جب وہ ایسے آدمی کو پالے جو اس کا قرض ادا کر دے گا تو پھر اسے مال زکوٰۃ میں سے نہ دیا جائے گا (2)۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک کے احسان کے نیچے داخل ہو حالانکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے احسان کو پا لیا ہے۔ اور اگر اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کر دے تو پھر ابن سبیل ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے مال زکوٰۃ لینے کے جواز میں دو روایتیں ہیں: مشہور یہ ہے کہ اسے مال زکوٰۃ نہیں دیا جائے گا۔ اور اگر اس نے لے لیا تو پھر اسے لوٹانا اس کے ذمہ لازم نہ ہو گا جب وہ اپنے شہر کی طرف جائے اور نہ بطور زکوٰۃ اسے (دیگر افراد کو دینا) اس پر لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ اگر کوئی آئے اور مذکورہ اوصاف میں سے کسی وصف کا دعویٰ کرے، تو کیا اس کا قول قبول کیا جائے گا یا نہیں اور اسے یہ کہا جائے گا کہ جو تو کہہ رہا ہے اسے ثابت کر؟ تو جہاں تک دین کا تعلق ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اسے ثابت کرے اور رہیں تمام صفات تو ظاہر حال اس کی شہادت دیتا ہے اور ان میں اسی پر اکتفا کر لیا جائے گا۔ اور اس پر دلیل دو صحیح حدیثیں ہیں۔ دونوں کو اہل الصحیح نے روایت کیا ہے اور یہی قرآن کریم کا ظاہر معنی بھی ہے۔ امام مسلم نے جریر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا: دن کے آغاز میں ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے۔ فرمایا: پس ایک قوم آپ کے پاس حاضر ہوئی وہ پراگندہ حال، ننگے پاؤں، سیاہ و سفید دھاری دار قمیصیں یا عبائیں پہنے ہوئے تھے اور تلواریں لٹکائے ہوئے تھے، ان میں سے عام قبیلہ مضر سے تھے بلکہ وہ تمام کے تمام ہی مضر میں سے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مقدس اس وقت متغیر ہو گیا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فاقے کی حالت میں دیکھا، پس آپ اندر تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 970

پڑھی۔ پھر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ...... الآیہ تا قولہ ...... رَقِیْبًا۝ (النساء) (اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں الخ)

اور وہ آیت جو سورۂ حشر میں ہے: وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر: 18) (اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے کل کے لیے) ہر آدمی اپنے درہم و دینار میں سے، اپنے کپڑے میں سے اور اپنی گندم کے صاع میں سے صدقہ کرے، حتیٰ کہ فرمایا: اگرچہ وہ آدھی کھجور ہی ہو"۔ فرمایا: پس انصار میں سے ایک آدمی ایک تھیلی لے کر آیا جس سے اس کا پہلو جھکنے کے قریب تھا بلکہ وہ جھکا ہوا تھا، فرمایا: پھر لوگ لگاتار تسلسل کے ساتھ آنے لگے یہاں تک کہ میں نے وہاں کھانے پینے کی چیزوں کے دو ڈھیر لگے ہوئے دیکھے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا تو وہ چمک رہا تھا گویا کہ اس پر سونے کا طلاء کیا گیا ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہوگا اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اجروں میں سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی اور جس نے اسلام میں برا طریقہ رائج کیا اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور اس کا بوجھ بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اپنے بوجھ اور گناہوں میں سے کسی شے کی کمی نہیں کی جائے گی" (1)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہر حال پر اکتفاء کیا اور آپ نے صدقہ دینے پر برانگیختہ کیا اور ان سے کوئی گواہ طلب نہ کیا اور نہ اس کی چھان بین کی کہ کیا ان کے پاس مال ہے یا نہیں؟ اور اسی کی مثل ابرص، اقرع اور اعمٰی والی حدیث ہے جسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور یہ ان کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک بنی اسرائیل میں ایک برص کا مریض، ایک گنجا اور ایک اندھا تھا پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ انہیں آزمائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا وہ پہلے برص والے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کون سی شی تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا خوبصورت رنگ اور اچھی جلد اور مجھ سے یہ بیماری دور ہو جائے جس کے سبب لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں، فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اس سے سارے داغ ختم ہو گئے اور اسے خوبصورت رنگ اور اچھی جلد عطا کر دی گئی۔ اس نے کہا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا اونٹ یا کہا گائیں، یہ شک اسحاق کو ہے، مگر یہ کہ برص والے یا گنجے میں سے ایک نے اونٹ کہا اور دوسرے نے گائے کہا۔ بیان کیا: پس اسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی دے دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے بعد ازاں وہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: خوبصورت بال اور وہ مجھ سے ختم ہو گئے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: پس اس نے اسے ہاتھ پھیرا تو اس سے گنجا پن دور ہو گیا اور اسے خوبصورت بال عطا کر دیئے گئے پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ تو اس نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327

گائے چنانچہ اسے حاملہ گائے عطا کر دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس میں برکت عطا فرمائے۔ فرمایا: پھر وہ اندھے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ اس نے کہا: یہ کہ اللہ تعالیٰ میری نظر مجھے واپس لوٹا دے کہ میں اس کے ساتھ لوگوں کو دیکھ سکوں۔ فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت اسے واپس لوٹا دی، پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: بکریاں پس اسے بچے جننے والی بکری عطا کر دی گئی۔ پس ان دونوں (گائے اور اونٹنی) اور اس بکری نے بچوں کو جنم دیا۔ فرمایا پس اس کے لیے اونٹوں کی ایک وادی ہوگئی اور دوسرے کے لیے گائیوں کی وادی ہوگئی اور تیسرے کے لیے بکریوں سے وادی بھر گئی۔ فرمایا: پھر وہ فرشتہ ایک اور صورت اور ہیئت میں اس برص والے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین آدمی ہوں میرے پاس اسباب سفر ختم ہو چکے ہیں آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی نہیں ہے میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے حسین رنگ، خوبصورت جلد اور اونٹوں کی صورت میں مال عطا فرمایا کیا تو میرے اس سفر میں اس میں سے کچھ معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: حقوق بہت زیادہ ہیں۔ تو اس نے اسے کہا: میں تجھے پہچانتا ہوں کیا تو برص زدہ نہ تھا لوگ تجھے فقیر ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تجھے (یہ مال) عطا فرمایا؟ تو اس نے جواب دیا: بلاشبہ میں تو اپنے جداعلیٰ کی جانب سے پشت در پشت اس مال کا وارث ہوں۔ تو اس نے کہا: اگر تو جھوٹ بول رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا، پھر وہ گنجے کے پاس اپنی صورت میں آیا اور اس سے اسی طرح کی گفتگو کی جیسے اس پہلے سے کی تھی، تو اس نے بھی اسے اس پہلے کی طرح جواب دیا تو اس (فرشتے) نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا۔ فرمایا: پھر وہ اپنی اسی صورت اور ہیئت میں اندھے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین اور ابن سبیل (مسافر) آدمی ہوں مجھ سے میرے اسباب سفر منقطع ہو گئے پس آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی سہارا نہیں میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے بصارت اور بکریاں عطا فرمائیں کیا تو ان کے ساتھ میرے سفر میں کوئی معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تحقیق میں اندھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف میری بصارت لوٹا دی تو جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے قسم بخدا! آج کے دن میں تجھے کسی مشقت میں نہیں ڈالوں گا تو اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر لے لے تو اس نے کہا: تو اپنا مال اپنے پاس رکھ، کیونکہ تم آزمائے گئے تجھ سے رضا اور خوشی حاصل ہوئی اور تیرے دونوں ساتھیوں پر ناراضگی ہوئی'' (1)۔ اس میں اس پر بڑی واضح دلیل ہے کہ جس نے اپنے فقیر پر زیادتی کا دعویٰ کیا عیال یا غیر عیال وغیرہ کا تو اس سے کوئی شواہد نہیں لیے جائیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے شواہد لیے جائیں گے اگر وہ قادر ہو، کیونکہ حدیث میں ہے'' کہ ایک مسکین آدمی اور ابن سبیل (مسافر) نے کہا میں تجھ سے بکری کا سوال کرتا ہوں'' تو وہ اسے سفر ثابت کرنے کا مکلف اور پابند نہ بنائے اور رہا مکاتب تو وہ کتابت ثابت کرنے کا پابند ہوگا، کیونکہ اس میں غلامی اصل ہے یہاں تک کہ حریت (آزادی) ثابت ہو جائے (2)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 2، صفحہ 408 2۔ احکام القرآن لابن العربی

مسئلہ نمبر 25۔ زکوٰۃ کی رقم اسے دینا جائز نہیں ہوتا جس کا نفقہ (خرچہ) آدمی کے ذمہ لازم ہوتا ہے اور وہ والدین، اولاد اور بیوی ہے اور اگر امام وقت نے کسی آدمی کا صدقہ اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کی بیوی کو دے دیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر اس نے یہ بذات خود دیا تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ سے ایک فرض ساقط کر دیتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی مال زکوٰۃ اپنے پوتے، اپنے نواسے کو نہیں دے سکتا اور نہ ہی وہ اپنے مکاتب غلام، مدبر غلام، ام ولد لونڈی (اور لونڈی جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) اور وہ غلام جس کا نصف حصہ اس نے آزاد کر رکھا ہو کو دے سکتا ہے''۔ کیونکہ اسے فقیر کو (سوال سے) روکنے کے واسطہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زکوٰۃ دینے اور نکالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور املاک کے منافع اس کے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، اسی وجہ سے ان میں سے بعض کی شہادت بعض کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ فرمایا: مکاتب وہ غلام ہے جس پر ابھی ایک درہم بھی باقی ہو (1) اور بسا اوقات وہ عاجز ہوتا ہے اور کمائی اس کے لیے ہو جاتی ہے۔ وہ غلام جس کا بعض حصہ آزاد کیا گیا ہو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مکاتب کے قائم مقام ہے۔ اور صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک وہ اس آزاد کے قائم مقام ہے جس پر قرض ہو پس اسے زکوٰۃ دینا جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 26۔ اور اگر زکوٰۃ انہیں دی جن کا نفقہ اس کے ذمہ لازم نہیں تو پھر اس میں اختلاف ہے۔ پس ائمہ میں سے بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے اسے مکروہ کہا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں تعریف کا خوف ہے۔ اور مطرف نے بیان کیا ہے: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زکوٰۃ اپنے اقارب کو دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور واقدی نے کہا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: افضل ترین آدمی جسے تو اپنی زکوٰۃ دے سکتا ہے وہ تیرے وہ رشتہ دار ہیں جن کا تو محتاج نہ ہو۔ تحقیق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ کو فرمایا: ''تیرے لیے دو اجر ہیں ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر''۔ عورت کا اپنی زکوٰۃ اپنے خاوند کو دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن حبیب سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ کے بارے میں اس مال سے مدد لیتے تھے جو وہ انہیں (بطور زکوٰۃ) دیتی تھیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے، لیکن صاحبین نے ان سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: یہ جائز ہے۔ اور یہی اصح ہے، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی: بے شک میں اپنے خاوند پر صدقہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں کیا وہ میرے لیے جائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں تیرے لیے دو اجر ہوں گے ایک صدقہ کا اجر اور دوسرا قرابت کا اجر'' (2)۔

اور صدقہ مطلقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر خاوند کا نفقہ لازم نہیں ہے، پس وہ اجنبی آدمی کے قائم مقام ہو گئی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ان دونوں کے درمیان املاک کے منافع مشترک ہیں، یہاں تک کہ ان دونوں میں سے ایک کی شہادت دوسرے کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ اور حدیث طیبہ کو نفلی صدقہ پر محمول کیا جائے گا۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی المکاتب، حدیث نمبر 3425، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

امام شافعی، ابوثور اور اشہب رحمہم اللہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جب کہ وہ اسے عورت کی طرف اس مال (نفقہ) میں خرچ نہ کر دے جو مرد پر اس کے لیے لازم ہوتا ہے۔ بے شک وہ اسے اپنے نفقہ اور لباس میں اپنی ذات پر خرچ کر سکتا ہے جو وہ اس سے لیتا ہے اور اس پر اپنے مال سے خرچ کرے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ دی جانے والی مقدار میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے، پس غارم (مقروض) کو اس کے قرضے کی مقدار کے برابر دیا جائے گا اور فقیر اور مسکین کو ان کی کفایت اور ان کے اہل وعیال کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا۔ نصاب کے برابر یا اس سے کم مقدار میں دینے کے جواز میں اختلاف ہے اور اس کا دارومدار اس سابقہ اختلاف پر ہے جو فقر کی تعریف میں ہے جس کے ساتھ اس کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے۔

علی بن زیاد اور ابن نافع نے بیان کیا ہے: اس میں کوئی مقرر حد نہیں ہے، بلکہ اس کا انحصار والی کے اجتہاد پر ہے۔ کبھی کبھی مساکین قلیل ہوتے ہیں اور صدقہ زیادہ ہوتا ہے پس ایک فقیر کو سال بھر کی خوراک دے دی جائے گی۔ اور مغیرہ نے بیان کیا ہے: نصاب سے کم مقدار دی جائے گی اور اسے نصاب تک نہیں پہنچایا جائے گا۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر شہر میں دو زکاتیں ہوں ایک نقد (درہم ودینار) اور دوسری حرث (عشر وغیرہ) تو وہ اتنی لے لے جو اسے دوسری تک پہنچا دے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ نصاب کی مقدار زکوۃ دے دے اگرچہ شہر میں دو یا اس سے زیادہ زکاتیں ہوں، کیونکہ غرض فقیر کو غنی کرنا ہے یہاں تک کہ وہ غنی ہو جائے۔ پس جب اس نے ایک لے لی تو اگر دوسری زکوۃ کا وقت آ گیا اور اس کے پاس اتنی مقدار ہو جو اسے کافی ہو تو اسے کوئی دوسرا لے لے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: نصاب کے برابر دینے میں یہ اصحاب الرائے کا مذہب ہے، تحقیق اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کے ساتھ ساتھ مکروہ قرار دیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ بعض اپنی حاجت کی وجہ سے فی الحال مشغول ہوتے ہیں۔ پس فی الحال اس کی حالت سے فالتو دو سو سے کم ہو اور جب اس نے اسے مجموعی طور پر دو سو سے زیادہ دیے اور فی الحال اس کی حاجت سے فالتو دو سو کی مقدار ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ اور متاخرین حنفیہ میں سے بعض نے کہا ہے: یہ تب ہے جب اس کے اہل وعیال نہ ہوں اور نہ اس پر قرض ہو اور اگر اس پر قرض ہو تو پھر اسے دو سو یا اس سے زیادہ اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں جس کے ساتھ اگر وہ اپنا قرض ادا کر دے تو اس کے پاس باقی دو سو سے کم رہ جائے۔ اور اگر وہ عیال دار ہو تو اسے اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں کہ اگر وہ اسے اپنے بچوں پر تقسیم کرے تو ان میں سے ہر ایک کو دو سو سے کم ملے، کیونکہ اس پر صدقہ کرنا معنوی طور پر اس پر اور اس کے اہل وعیال پر صدقہ کرنا ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ تو جان کہ قول باری تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ مطلق ہے اس میں نہ کوئی شرط ہے اور نہ کوئی قید، بلکہ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جملہ فقراء پر خرچ کرنا جائز ہے چاہے وہ بنی ہاشم میں سے ہوں یا ان کے سوا ہوں، مگر سنت کئی شروط کے اعتبار کے ساتھ وارد ہے۔ ان میں سے یہ ہے کہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ ہوں اور وہ ان میں سے بھی نہ ہوں جن کا نفقہ صدقہ

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 973

کرنے والے پر لازم ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کمانے کی قوت نہ رکھتا ہو، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے اور نہ ہی کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے'' (1)۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اور مسلمان علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فرضی صدقہ حضور نبی کریم ﷺ، بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے حلال نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ہاشمی کا ہاشمی کو صدقہ دینا جائز ہے، اسے الکیا طبری نے بیان کیا ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس سے علیحدگی اختیار کی ہے اور کہا: بے شک بنی ہاشم کے اموال پر صدقات میں سے کوئی شے حرام نہیں۔ اور یہ اختلاف حضور نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ابو رافع کے غلام کو کہا تھا: ''بے شک کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 29۔ بنی ہاشم کے لیے نفلی صدقہ کے جائز ہونے میں اختلاف ہے۔ پس وہ نظریہ جس پر جمہور اہل علم ہیں اور وہی صحیح ہے...... کہ نفلی صدقہ بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے جائز ہے، دینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرات علی، عباس اور فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے صدقہ کیا اور بنی ہاشم کی جماعت پر ہی اسے وقف رکھا۔ اور ان کے صدقات موقوفہ معروف و مشہور ہیں۔ اور ابن ماجشون، مطرف، اصبغ اور ابن حبیب نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نہ فرضی صدقہ میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ نفلی صدقہ میں سے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نفلی صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: وہ حدیث جو حضور نبی کریم ﷺ سے روایت ہے: ''آل محمد کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے''۔ بلاشبہ وہ نفلی زکوٰۃ کے بارے ہی ہے (3)۔ اور اس قول کو ابن خویز منداد نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: اور ان کے موالی کو دونوں صورتوں میں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ''الواضحہ'' میں کہا ہے: نفلی صدقہ میں سے آل محمد کو نہیں دیا جائے گا۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: تو ان کے موالی کو؟ انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا موالی کیا ہیں؟ تو میں نے ان پر رسول اللہ ﷺ کے قول سے استدلال کیا: ''کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے'' (4)۔ تب کہا تحقیق آپ نے کہا ہے: ''کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ حکم نیکی اور حرمت میں ہے (5)۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ سیبویہ کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فرض اللہ الصدقات فریضۃ (اللہ تعالیٰ نے یقیناً صدقات فرض کیے ہیں) اور امام کسائی کے قول کے مطابق قطع کی بنا پر رفع بھی جائز ہے، یعنی ھن فریضۃ۔ زجاج نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ اسے اس کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابراہیم بن عبلہ نے اس کو (رفع) کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے خبر بنایا ہے جیسا کہ آپ کہتے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83 2۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 366 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974
4۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 1000 5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974

ہیں: إنما زید خارج۔

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو (اپنی بدزبانی سے) اذیت دیتے ہیں نبی (کریم) کو اور کہتے ہیں یہ کانوں کا کچا ہے۔ فرمائیے وہ سنتا ہے جس میں بھلا ہے تمہارا، یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مومنوں (کی بات) پر اور سراپا رحمت ہے ان کے لیے جو ایمان لائے تم میں سے اور جو لوگ دکھ پہنچاتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ منافقین میں سے کچھ تھے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کے لیے غیبت اور تصادم کی زبان لمبی کرتے تھے اور کہتے تھے: اگر آپ نے مجھے جھڑکا تو میں قسم اٹھا دوں گا کہ میں نے یہ نہیں کہا ہے، تو آپ اسے قبول کرلیں گے، کیونکہ آپ کانوں کے کچے ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل اذن جب وہ آدمی ہر ایک کی بات سنتا ہو۔ اس میں واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں۔ اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: هُوَ اُذُنٌ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جو سننے والا اور قبول کرنے والا ہو۔ یہ آیت عتاب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی، اس نے کہا: بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سنتے ہیں اور ہر اس بات کو قبول کرتے ہیں جو انہیں کہی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نبتل بن حارث تھا۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ نبتل عظیم الجثہ آدمی تھا اس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، رنگ گندمی تھا، آنکھیں سرخ تھیں، رخسار سرخی مائل سیاہ رنگ کے تھے اور وہ بہت بدشکل تھا اور یہ وہی ہے جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شیطان کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ نبتل بن حارث کو دیکھ لے''(1)۔ السفعة (ضمہ کے ساتھ) ایسی سیاہی جس میں سرخی کی آمیزش ہو۔ اور الرجل أسفع (ایسا آدمی جس کا رنگ سیاہ سرخی مائل ہو) یہ جوہری کے نزدیک ہے اور اذن ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ، ای هو أذن خیر لا أذن شر یعنی وہ خیر اور بھلائی کی بات سنتا ہے اور شر اور برائی کی نہیں سنتا۔ اور قُلْ اُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ رفع اور تنوین کے ساتھ حسن اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اضافت کے ساتھ اور حمزہ نے رحمة کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے أذن پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے: قل هو أذن خیر وهو رحمة یعنی وہ خیر اور بھلائی سننے والا ہے شر سننے والا نہیں، یعنی وہ اسے سنتا ہے جس کا سننا وہ پسند کرتا ہے اور وہ رحمت ہے۔ اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ خیر پر عطف کی وجہ سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اہل عربیہ کے نزدیک بعید ہے، کیونکہ اس

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130، دار الکتب العلمیہ بیروت

کا دو اسموں کے درمیان ہونا بعید ہے اور مخفوض (مجرور) میں قبیح ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: اور جس نے رحمة کو جر دی ہے تو وہ خیر پر عطف کی بنا پر ہے اور معنی ہے خیر کو سننے والا اور رحمت کو سننے والا، کیونکہ رحمة خیر اور بھلائی میں ہی ہے اور رحمت کا عطف المومنین پر کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا معنی بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور مومنین کی تصدیق کرتا ہے۔ تو کوفیوں کے قول کے مطابق اس میں لام زائدہ ہے اور اس کی مثال لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝ (الاعراف) ای یرھبون ربھم (وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) اور ابوعلی نے کہا ہے: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے رَدِفَ لَكُمْ (النمل: 72) اور یہ مبرد کے نزدیک اس مصدر کے متعلق ہے جس پر فعل دلالت کرتا ہے، تقدیر عبارت ہے: ایمانه للمؤمنین یعنی اس کا مومنین کی تصدیق کرنا نہ کہ کفار کی یا یہ اس معنی پر محمول ہوگا کیونکہ یؤمن کا معنی یصدق (تصدیق کرنا) ہے پس اسے لام کے ساتھ متعدی کیا گیا جیسا کہ اس قول میں لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران: 3)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

"(منافق) قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی تمہارے سامنے تاکہ خوش کریں تمہیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی کریں اگر وہ ایمان دار ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ منافقین کی ایک قوم جمع ہوئی، ان میں جلاس بن سوید، ودیعہ ابن ثابت تھے اور ان میں انصار کا غلام بھی تھا جسے عامر بن قیس پکارا جاتا تھا، تو انہوں نے اسے بہت حقیر قرار دیا اور گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا: اگر وہ حق ہے جو محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں تو یقیناً ہم گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ تو وہ غلام غضب ناک ہوگیا اور اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ جو وہ کہتے ہیں وہ حق ہے اور تم گدھوں سے زیادہ شریر ہو، پھر اس نے ان کے قول کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، تو انہوں نے قسم اٹھا دی کہ عامر جھوٹا ہے، تو عامر نے کہا: وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور اس پر اس نے قسم کھائی اور کہا: اے اللہ! تو ہمیں متفرق نہ کرنا یہاں تک کہ سچ بولنے والے کا سچ اور جھوٹ بولنے والے کا جھوٹ واضح اور ظاہر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ تقدیر عبارت ہے: واللہ أحق أن یرضوہ و رسولہ أحق أن یرضوہ (حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اسے راضی کریں) پھر اس سے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأيُ مختلِفُ(2)

ہم اس کے ساتھ جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ جو تیرے پاس ہے راضی ہیں اور رائے مختلف ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130
2۔ المحرر الوجیز، جلد 11، صفحہ 53

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: کلام میں کوئی عبارت محذوف نہیں ہے اور تقدیر عبارت واللہ أحق أن یرضوہ و رسولہ (اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کے رسول کو) یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے و رسولہ أحق أن یرضوہ اور لفظ اللہ افتتاح کلام میں ہے، جیسے تو کہتا ہے: ما شاء اللہ و شئت (جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو چاہے) نحاس نے کہا ہے: سیبویہ کا قول ان میں سے اولیٰ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں اس سے نہی وارد ہے کہ یہ کہا جائے: ماشاء اللہ و شئت اور کسی شی میں تقدیم و تاخیر مقدر نہیں کی جا سکتی اور اس کا معنی صحیح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں، کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کو ان کی رضا میں رکھا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ اس نے فرمایا ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80) (جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی) اور ربیع بن خثیم جب اس آیت سے گزرتے تو وقف کرتے اور کہتے: ایک حرف ہے اور کتنا ہی شاندار حرف ہے، ان کے سپرد کر دیا گیا ہے پس وہ ہمیں خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت قسم کھانے والے کی قسم کو قبول کرنے کو متضمن ہے اگرچہ محلوف لہ کی رضامندی لازم نہیں اور قسم مدعی کا حق ہے۔ اور یہ اس کو متضمن ہے کہ قسم اللہ تعالیٰ کی ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو قسم اٹھائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے اور وہ جس کے لیے قسم اٹھاتا ہے پس اسے چاہیے کہ وہ اس کی تصدیق کرے'' (1)۔ قسم اور اس میں استثنا کے متعلق مکمل بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۳﴾

''کیا وہ نہیں جانتے کہ جو کوئی مخالفت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو اس کے لیے آتش جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں یہ بہت بڑی رسوائی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا یعنی کیا وہ منافق نہیں جانتے۔ ابن ہرمز اور حسن نے تعلموا صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہ یہ یعلموا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور ہا، حدیث یعنی گفتگو سے کنایہ ہے۔ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور المحادۃ اس کا معنی ہے اس کا اس کی حد میں داخل ہونا اور اس کا اس کی حد میں واقع ہونا، جیسا کہ المشاقۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: حاد فلان فلانا یعنی فلاں اپنی حد کے سوا دوسرے کی حد میں داخل ہو گیا۔ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ کہا جاتا ہے: شرط میں فا کا مابعد مبتدا ہے۔ پس واجب ہے کہ فان ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہو۔ تحقیق خلیل اور سیبویہ نے فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ میں ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: اور یہ جید اور عمدہ ہے اور یہ شعر بھی کہا ہے:

وعِلْمِی بأسْدامِ المیاہ فلم تزَل　　قَلائصُ تَخْدِی فی طریق طلائحُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 983

وأني إذا ملّت ركابي مُناخها فإني على حظّي من الأمر جامحُ

مگر عام قراءت فان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پس خلیل نے بھی اور سیبویہ نے کہا ہے: بے شک أنّ ثانیہ پہلے سے بدل ہے (1)۔ اور مبرد کا گمان ہے کہ یہ قول مردود ہے اور صحیح وہ ہے جو جرمی نے کہا ہے، انہوں نے کہا: بے شک دوسرا أنّ تو کید کے لیے مکرر لایا گیا ہے کیونکہ کلام طویل ہو گیا اور اس کی نظیر وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ (النمل) ہے اور اسی طرح فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا (الحشر: 17) ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فوجوب النار له پس آگ کا وجوب اس کے لیے ہے۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس وجہ سے غلط ہے بے شک أنّ مفتوحہ مشددہ سے ابتدا نہیں کی جا سکتی اور خبر کو مضمر کیا جا رہا ہے۔ اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فالواجب أن له نار جهنم پس واجب ہے کہ اس کے لیے جہنم کی آگ ہو، کیونکہ دوسرا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے فله أنّ له نار جهنم کیونکہ اسے فا اور ان کے درمیان ضمیر مجرور کی بنا پر ظرف مستقر کے ساتھ رفع دیا گیا ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝

”ڈرتے رہتے ہیں منافق کہ کہیں نازل (نہ) کی جائے اہل ایمان پر کوئی سورت جو آگاہ کر دے انہیں جو کچھ منافقوں کے دلوں میں ہے، آپ (انہیں) فرمائیے کہ مذاق کرتے رہو یقیناً الله ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم خوفزدہ ہو“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ یہ خبر ہے اور امر نہیں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خبر ہے اس کی جو اس کے بعد اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ہے کیونکہ انہوں نے عناد کی وجہ سے کفر اختیار کیا اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ منافقوں میں سے ایک نے کہا: میں تو پسند کرتا ہوں اگر مجھے آگے لایا جائے اور سو کوڑے مجھے مارے جائیں لیکن ہمارے بارے میں کوئی ایسی شے نازل نہ ہو جو ہمیں رسوا کر دے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یحذر بمعنی یتحرز وہ بچتے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے چاہیے کہ وہ ڈرے، پس یہ امر ہے (3)، جیسے کہا جاتا ہے: یفعل ذالك (چاہیے کہ وہ کرے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ اس میں اَنْ محل نصب میں ہے۔ یعنی مِن اَنْ تنزل اور سیبویہ کے قول کی بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ یہ من کے حذف ہونے کی بنا پر محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یحذر کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو (4)، کیونکہ سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے: حذرت زیدا اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

حَذِرٌ أمورا لا تَضِير و آمِنٌ ما ليس مُنْجِيَه من الأقدار

اور مبرد نے اسے جائز نہیں قرار دیا، کیونکہ حذر (ڈرنا) ہیئت میں ایک شی ہے۔ اور علیهم کا معنی ہے علی المومنین۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54 2۔ اسباب النزول، صفحہ 130 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54 4۔ ایضاً

سورۃ یعنی ایسی سورت جو منافقین کی شان میں ہو جو انہیں ان کی عداوت و دشمنی، ان کی برائی اور ان کے عیوب و نقائص کے بارے آگاہ کر دے۔ اسی وجہ سے اس کا نام الفاضحہ المثیرہ اور المبعثرۃ کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: مسلمان اس سورت کو الحفارۃ کا نام دیتے تھے، کیونکہ جو کچھ منافقین کے دلوں میں تھا اس نے اسے کھود کر ظاہر کر دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ اسْتَهْزِءُوْا یہ امر وعید اور تہدید کے لیے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ بے شک اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ مَّا تَحْذَرُوْنَ اسے جس کے ظاہر ہونے سے تم ڈرتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اسماء نازل کیے اور وہ ستر آدمی تھے، پھر رافت و رحمت کے سبب انہیں قرآن کریم سے مٹا دیا، کیونکہ ان کی اولاد مسلمان تھی اور لوگ آپس میں ایک دوسرے کو عار دلاتے رہتے ہیں، پس اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اسے ظاہر کر کے پورا فرما دیا جب کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے احوال اور ان کے اسماء سے آگاہ کر دیا نہ یہ کہ وہ قرآن کریم میں نازل ہوئے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: 30) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے) اور یہ الہام کی قسم ہے۔ اور منافقین میں سے کچھ متردد تھے نہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا اعتقاد رکھتے تھے اور نہ آپ کی تصدیق کا اور ان میں بعض وہ تھے جو آپ کی سچائی کو پہچانتے تھے اور آپ کے ساتھ عناد رکھتے تھے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''اور اگر آپ دریافت فرمائیں ان سے تو کہیں گے: بس ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ آپ فرمایئے (گستاخو!) کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسول سے تم مذاق کیا کرتے تھے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی۔ علامہ طبری وغیرہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: اس اثنا میں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی طرف چل رہے تھے آپ کے آگے منافقوں کی ایک جماعت بھی چل رہی تھی تو انہوں نے کہا: تم دیکھو، یہ شام کے محلات فتح کرتا ہے اور بنی الاصفر کے قلعے لیتا ہے! تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع کر دیا جو ان کے دلوں میں تھا اور جس کے بارے وہ بات کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس جماعت کو میرے لیے روک لو''۔ پھر آپ ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''تم نے اس اس طرح کہا ہے''۔ تو انہوں نے قسمیں اٹھا دیں: ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہم اس معاملہ میں سنجیدہ نہ تھے۔ اور علامہ طبری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے یہ بات کرنے والے ودیعہ بن ثابت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے تنگ کے ساتھ چمٹے ہوئے دیکھا وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے

اور وہ کہتا تھا: بلا شبہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے: اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (1) (کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسولوں سے تم مذاق کیا کرتے تھے) اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہ لٹکنے والا عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ اسی طرح قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ وہ تبوک میں حاضر نہ تھا۔ قشیری نے کہا ہے: اور کہا گیا ہے بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ودیعہ بن ثابت کے لیے ہے'' اور وہ منافقین میں سے تھا اور وہ غزوۂ تبوک میں حاضر تھا۔ اور الحوض کا معنی ہے پانی میں داخل ہونا، پھر یہ ہر اس دخول میں استعمال کیا گیا جس میں تلویث اور اذیت ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے: یہ اس سے خالی نہیں ہے کہ اس بارے میں جو انہوں نے کہا ہے وہ سنجیدہ ہو یا تمسخر اور مذاق ہو، وہ جس حالت میں بھی تھا وہ کفر تھا، کیونکہ کفر کے ساتھ تمسخر کرنا بھی کفر ہے اس میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ تحقیق أخو العلم والحق ہے اور ٹھٹھا مذاق أخو الباطل والجھل (2) ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھ: اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۗ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (البقرہ) (کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ نے کہا: میں پناہ مانگتا ہوں خدا کی اس سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں)

مسئلہ نمبر 3۔ تمام احکام میں مثلاً بیع، نکاح اور طلاق وغیرہ میں ہزل (ٹھٹھا، مذاق) میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے: مطلقاً حکم لازم نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ ہے کہ مطلق حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ بیع وغیرہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اور نکاح، طلاق میں حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور یہ طلاق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے۔ اور بیع میں حکم لازم نہیں ہوتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب عہد میں کہا ہے: ہازل کا نکاح لازم ہو جاتا ہے۔ اور ابو زید نے ابن القاسم سے العتبیہ میں کہا ہے: وہ لازم نہیں ہوگا۔ اور علی بن زیاد نے کہا ہے: پہلے اور بعد اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اور ہازل کی بیع کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے علماء سے دو قول ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ طلاق سنجیدہ حالت میں ہو یا مذاق کی حالت میں دونوں برابر ہیں (یعنی دونوں حالتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی)۔ اور ہمارے اصحاب میں سے بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر دونوں فریق نکاح اور بیع کی صورت میں ہزل (تمسخر) پر متفق ہوں تو پھر وہ لازم نہ ہوگا اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہو تو پھر سنجیدگی ہزل پر غالب ہوگی (3)۔ اور ابو داؤد، ترمذی اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں ہیں جن میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں تمسخر و مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ) نکاح، طلاق اور رجعت ہیں'' (4)۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 195　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 976　　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 977

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142۔ سنن ابی داود، باب فی الطلاق علی الھزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح حدیث میں والرجعة کے الفاظ ہیں۔ اور موطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن سعید سے اور انہوں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جن میں لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتق (آزاد کرنا) ہیں (1)۔ اور اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ان تمام نے کہا: تین چیزیں ہیں جن میں نہ لعب ہے (اور نہ ان میں رجوع ہے) ان میں خوش طبعی کرنے والا بھی سنجیدگی سے کرنے والا شمار ہوگا (اور وہ) نکاح، طلاق اور عتق ہیں۔ اور حضرت سعید بن مسیب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: چار چیزیں ہیں جو ہر ایک پر جائز ہیں عتق (آزاد کرنا) طلاق، نکاح اور نذر ماننا۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تین چیزیں ہیں جن میں کوئی لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور نذر ماننا ہیں۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

''(اب) بہانے مت بناؤ، تم کافر ہو چکے (اظہار) ایمان کے بعد، اگر ہم معاف بھی کر دیں ایک گروہ کو تم سے تو عذاب دیں گے دوسرے گروہ کو کیونکہ وہی (اصلی) مجرم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ یہ زجر و توبیخ کے انداز میں (نہی) ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: تم وہ نہ کرو جو نفع بخش نہ ہوگا، پھر ان پر کفر اور گناہ سے معذرت (اور توبہ) نہ کرنے کا حکم لگا دیا۔ اس میں اعتذر بمعنی اعذر ہے اسی صار ذا عذر یعنی وہ عذر والا ہو گیا۔ لبید نے کہا ہے:

ومَنْ یَبْكِ حَوْلًا کاملا فقد اعتذر

اور جو پورا سال روتا رہا تحقیق اس نے عذر پیش کر دیا۔

اور الاعتذار کا معنی ہے: موجود شے کا اثر (نشان) مٹا دینا۔ کہا جاتا ہے: اِعتذرتِ المنازلُ منزلیں مٹ گئیں (ختم ہو گئیں) اور الاعتذار کا معنی الدروس (مٹانا) ہے۔ شاعر کا قول ہے۔

أم كنتَ تعرِف آياتٍ فقد جعلتْ　　أطلالُ إلْفِك بالوَدْكاءِ تَعتذِرُ

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے کاٹ دینا۔ اور اِعتذرت إلیه کا معنی ہے میں نے وہ سب کاٹ دیا (ختم کر دیا) جو اس کے دل میں پایا جا رہا تھا۔ اور اسی سے عذرة الغلام ہے یعنی وہ چمڑا جو بچے کے ختنہ کے وقت کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور اسی سے عذرة الجاریہ بھی ہے کیونکہ اس کے کنوارپن کی مہر کو کاٹ دیا جاتا ہے (مراد پردہ بکارت کو زائل کرنا ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ کہا گیا ہے: یہ تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو نے استہزاء کیا اور ایک ہنسا۔ پس ان میں سے جسے معاف کیا گیا وہ وہی ہے جو ہنسا اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ اور

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 510

الطائفۃ سے مراد جماعت ہے۔ اور نفس معنی کی بنا پر واحد کو بھی طائفہ کہا جاتا ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے: جمع کے لفظ کا اطلاق واحد پر کیا جا سکتا ہے، جیسے تیرا قول ہے: خرج فلان علی البغال۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ الطائفۃ سے جب واحد مراد لیا گیا ہے تو وہ طائف ہو (1) اور ہا مبالغہ کے لیے ہو۔ اور وہ آدمی جس کو معاف کر دیا گیا اس کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ اس کا نام مخشی بن حمیر ہے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے اور ابن ہشام نے کہا ہے: اس کے بارے میں ابن مخشی کہا جاتا ہے۔ اور خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: اس کا نام مخاشن بن حمیر ہے۔ اور ابن عبد البر نے مخاشن حمیری ذکر کیا ہے۔ (اور سہیلی نے مخشن بن حمیر ذکر کیا ہے) اور تمام نے یہ ذکر کیا ہے کہ اسے جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا، اس نے توبہ کر لی تھی اور اس کا نام عبد الرحمن رکھا گیا تھا، اس نے الله تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اسے شہادت کی موت عطا کی جائے، اس کی قبر کے بارے معلوم نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی ہے کہ کیا وہ منافق تھا یا مسلمان؟ بعض نے کہا ہے: وہ منافق تھا پھر اس نے خالص سچی توبہ کر لی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ مسلمان تھا، مگر یہ کہ اس نے منافقین سے بات سنی تو ان کے ساتھ ہنس پڑا اور ان کا انکار نہ کیا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں، حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے اور بند رکھتے ہیں اپنے ہاتھ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے بھلا دیا ہے الله کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں، بے شک منافق ہی نافرمان ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ یہ مبتدا ہے۔ بَعْضُهُمْ یہ مبتدا ثانی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس سے بدل ہو اور مِّنْۢ بَعْضٍ خبر ہو۔ اور بَعْضُهُمْ، مِّنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے وہ دین سے نکلنے میں ایک شے کی مثل ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ متصل ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (التوبہ: 56) یعنی وہ مومنین میں سے نہیں ہیں۔ ولکن بعضھم من بعض یعنی وہ برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں باہم متشابہ اور ایک جیسے ہیں۔ ان کا اپنے ہاتھوں کو بند رکھنے سے مراد جہاد کو ترک کرنا ہے اور ہر اس چیز میں ہے جو ان پر حق میں سے واجب ہوتی ہے۔ اور یہاں نسیان کا معنی چھوڑنا ہے، یعنی انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کے بارے انہیں الله تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا، پس الله کریم نے انہیں اس شک کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے الله تعالیٰ کے امر کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ منسی (بھلا دیا گیا) کی طرح ہو گیا تو الله تعالیٰ نے انہیں اپنے ثواب سے منسی کے قائم مقام کر دی۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: نسیھم یعنی الله تعالیٰ نے انہیں خیر اور نیکی سے فراموش کر دیا۔ اور رہا شر تو وہ انہیں نہ بھولا (2)۔ اور فسق سے مراد اطاعت اور دین سے نکلنا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 56　　2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 351

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾

''وعدہ کیا ہے اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے دوزخ کی آگ کا ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں، یہی کافی ہے انہیں، نیز لعنت کی ہے ان پر اللہ نے اور انہی کے لیے ہے دائمی عذاب''۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ کے خیر اور بھلائی کے وعدہ کو وعدہ اور شر کے وعدہ کو وعید کہا جاتا ہے۔ خٰلِدِيْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا عامل محذوف ہے۔ یعنی یصلونها خالدین وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ جلیں گے۔ هِيَ حَسْبُهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی یہ ان کے اعمال کی جزا کے طور پر کافی ووافی ہے۔ اور اللعن کا معنی بعد (دوری) ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی ان کے لیے ہمیشہ ثابت رہنے والا عذاب ہے۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

''(منافقو!) تمہاری حالت بھی ایسی ہے جیسے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے وہ زیادہ تھے تم سے قوت میں اور مال اور اولاد کی کثرت میں، سو لطف اٹھایا انہوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور تم نے بھی لطف اٹھایا اپنے (دنیوی) حصہ سے اسی طرح جیسے لطف اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور (لذتوں میں) تم بھی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے رہے تھے، یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ زجاج نے کہا ہے: کاف محل نصب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ جہنم کی آگ کا اسی طرح وعدہ کیا جیسے اس نے ان لوگوں سے وعدہ کیا جو ان سے پہلے گزرے (ای وعد اللہ الکفار نار جهنم وعداً کما وعد الذین من قبلهم) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم نے برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں ان لوگوں کے افعال کی طرح افعال کیے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ (فعلتم کافعال الذین من قبلکم فی الأمر بالمنکر والنهی عن المعروف)(1) پس مضاف حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم ان کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے (أنتم کالذین من قبلکم) تو کاف محل رفع میں ہوا، کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور أشدّ غیر منصرف ہے کیونکہ افعل

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 78

کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ اور یہ اصل میں اشدد ہے، یعنی وہ قوت کے اعتبار سے تم سے زیادہ مضبوط تھے پس ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا اور نہ انہیں کسی نے اللہ تعالیٰ کا عذاب دور کرنے کی قدرت دی۔

مسئلہ نمبر 2۔ سعید نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں نے لیا ذراع کے بدلے ذراع، بالشت کے بدلے بالشت اور گز کے بدلے گز (دو بازؤں کو پھیلانے کی جگہ تقریباً چھ فٹ) یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کی بل میں داخل ہوا تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہوگے'' (1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو: **كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ** حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الخلاق سے مراد دین ہے۔ **فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ** یہاں تک کہ وہ آیت سے فارغ ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود و نصاریٰ نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ نہیں ہیں مگر وہی''۔ اور صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم یقیناً اپنے سے پہلے والے لوگوں کے طریقہ کار کی اتباع اور پیروی کرو گے بالشت کے بدلے بالشت اور گز کے بدلے گز یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم اس میں داخل ہو گے''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا یہود و نصاریٰ؟ تو آپ نے فرمایا: ''تو اور کون ہیں''؟ (2) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آج کی رات گزشتہ رات کے ساتھ کتنی مشابہت رکھتی ہے، وہ بنی اسرائیل ہیں ہم نے ان کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ** یعنی انہوں نے دین میں سے اپنے حصے کے ساتھ نفع حاصل کیا جیسا کہ انہوں نے کیا جو ان سے پہلے گزرے۔ **وَ خُضْتُمْ** یہ غیب سے خطاب کی طرف خروج ہے۔ **كَالَّذِيْ خَاضُوْا** یعنی ان کے لذتوں میں ڈوبنے کی طرح تم بھی لذتوں میں ڈوبے رہے، پس کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے (یعنی وخضتم خوضا کالذین خاضوا) اور الذی، من کی مثل اسم ناقص ہے، اس کے ساتھ واحد اور جمع کو تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: خضت الماء أخوضه خوضا وخیاضا (میں پانی میں غوطہ زن ہو گیا) اور اسم ظرف مخاضة ہے، مراد وہ جگہ جہاں لوگوں کے لیے پیدل اور سوار ہو کر جانا جائز ہو۔ اور اس کی جمع المخاض اور المخاوض بھی ہے۔ یہ ابوزید سے منقول ہے۔ اور أخضت دابتی فی الماء (میں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا) اور اخاض القوم یعنی ان کے گھوڑے داخل ہو گئے۔ اور خضت الغمرات (میں سختیوں میں گھس گیا)۔ اور کہا جاتا ہے: خاضه بالسیف یعنی اس نے اپنی تلوار کو مضروب میں حرکت دی۔ اور خوض فی نجیعه (وہ اس کے خون میں اندر تک گھس گیا) اس کی تشدید مبالغہ کے لیے ہے۔ اور المِخوَض للشراب کالمِجدح للسویق (شراب بنانے کا آلہ اسی طرح ہے جیسے ستو گھولنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199　2۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339　3۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199

کا آلہ) اسی سے کہا جاتا ہے: خصت الشراب (میں نے شراب بنائی) اور خاض القوم فی الحدیث و تخاضوا یعنی قوم گفتگو میں مشغول ہوگئی اور باہم ایک دوسرے میں مشغول ہو گئے۔ پس اس کا معنی یہ ہے: تم لہو ولعب کے ساتھ اسباب دنیا میں ڈوب گئے، کھو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم تکذیب اور جھٹلانے کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے میں مشغول ہو گئے۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ان کی نیکیاں باطل ہوگئیں، ضائع ہوگئیں۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۷۰

"کیا نہیں آئی ان کے پاس خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا، آئے تھے ان سب کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور نہ تھا اللہ (کا یہ دستور) کہ ظلم کرتا ان پر بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ اس میں نبأ کا معنی خبر ہے (کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی) الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ہمزہ استفہام تقریر و تحذیر کے لیے ہے، یعنی کیا انہوں نے اس سے پہلے ہمارے کفار کو ہلاک کرنے کے بارے نہیں سنا۔ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ یہ الذین سے بدل ہے۔ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ یعنی نمرود بن کنعان اور اس کی قوم۔ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ اس میں مدین اس شہر کا نام ہے جس میں حضرت شعیب علیہ السلام سکونت پذیر تھے، وہ سب بادل کے دن کے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیئے گئے۔ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ کہا گیا ہے: اس سے قوم لوط مراد لی جارہی ہے (1)، کیونکہ ان کی زمین ان کے ساتھ الٹ گئی تھی۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الْمُؤْتَفِكٰتِ سے مراد ہر وہ ہے جو ہلاک کیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: انقلبت علیهم الدنیا (ان پر دنیا بدل گئی، الٹ گئی) اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان بستیوں کے رہنے والوں کے پاس ان کے رسول آئے۔ اس بنا پر تو ان کے رسول اکیلے حضرت لوط علیہ السلام تھے، لیکن انہیں ہر بستی میں رسول بنا کر بھیجا گیا (2)۔ اور وہ تین بستیاں تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چار تھیں۔ اور دوسری جگہ پر قول باری تعالیٰ ہے: وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ یہ جنس کے طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسل سے مراد واحد لیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ (المومنون: 51) (اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ) اور آپ کے زمانے میں اور کوئی نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ نے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 80
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 201

مومنین کو خطاب کیا ان چیزوں کے بارے جن کا اس نے رسولوں کو حکم فرمایا(1)'' الحدیث۔ اور اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور مراد تمام رسول ہیں۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ دستور نہ تھا کہ وہ انہیں ہلاک کرتا یہاں تک کہ اس نے ان کی طرف انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن انہوں نے حجت قائم ہونے کے بعد خود ہی اپنے اوپر ظلم کیے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

''نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، حکم کرتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی، یہی لوگ ہیں جن پر ضرور رحم فرمائے گا اللہ، بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ یعنی باہم مودت، محبت اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے میں ان کے دل متحد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (توبہ: 67) کیونکہ ان کے دلوں میں اختلاف تھا لیکن وہ حکم میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کی توحید اور وہ تمام امور جو ان کے تابع ہیں ان کا حکم کرتے ہیں۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ بتوں کی عبادت اور وہ تمام امور جو اس کے تابع ہیں ان سے روکتے ہیں۔ علامہ طبری نے ابو العالیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے تو وہ بتوں اور شیاطین کی عبادت سے نہی مراد ہے(2)۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے تفصیلی بحث سورۃ المائدہ اور آل عمران میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اس کے بارے گفتگو سورۂ بقرہ کے شروع میں ہو چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں اور اسی اعتبار سے یہاں زکوٰۃ مفروضہ مراد ہو سکتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک نوافل پر مدح و تعریف کرنا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ جو نوافل پر کاربند ہوتا ہے وہ فرائض کی ادائیگی کے زیادہ لائق ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ اور وہ فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ وَرَسُوْلَهٗ اور اس کے رسول کی ان امور میں جو اس نے ان کے لیے سنت قرار دیے ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ میں سین

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 326
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 202

وعدہ میں مہلت (اور وقفے) کو داخل کرنے کے لیے ہے تا کہ نفوس اس کی امید پر خوشحال اور خوش ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل اسے پورا کرنے کا ضامن ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغات کا رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں یہ ہمیشہ رہیں گے ان میں نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ، جنات سے مراد باغات ہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جنت کے درختوں اور کمروں کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی۔ اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ وہ کھائیوں کے بغیر ہی منضبط اندازے اور مقدار کے مطابق بہہ رہی ہوں گی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً یعنی ان میں زبرجد، موتیوں اور یاقوت کے محلات ہوں گے اور اس کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے مہک رہی ہوگی۔ فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ مراد دار الاقامۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمکان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو جائے۔ اور اسی سے معدن (کان) ہے۔ اور عطا خراسانی نے کہا ہے: جَنّٰتِ عَدْنٍ یہ جنت کا قصبہ ہے اور اس کی چھت عرش الرحمن ہے۔ اور حضرت ابن مسعود نے کہا ہے: اس سے مراد جنت کا وسط ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ سونے کا محل ہے جس میں سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا عادل حاکم کے کوئی داخل نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے: عدن، جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے اور اسی میں تسنیم کا چشمہ ہے اور باغات ارد گرد سے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور یہ اس دن سے ڈھانپی ہوئی ہے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق فرمایا ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین اور جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ اس میں اتر پڑیں گے (1)۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اس سے بھی بڑی اور عظیم ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یہی تو بڑی کامیابی ہے)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

''اے نبی کریم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے ان پر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 81

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور اس میں آپ کے بعد آپ کی امت داخل ہے۔ کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کفار کے ساتھ تلوار سے جہاد کرنے اور منافقوں کے ساتھ زبان سے اور شدید جھڑک اور غصے کے اظہار کا حکم ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: منافقین کے ساتھ جہاد کیجئے اپنے ہاتھ سے اور اگر طاقت نہ رکھیں تو پھر اپنی زبان سے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھیں تو پھر ان سے انتہائی ترش روئی اور سختی سے پیش آؤ۔ اور حسن نے کہا ہے: منافقین سے جہاد کروان پر حدود قائم کرنے کے ساتھ اور زبان کے ساتھ......اور اسے حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے......اور وہ اکثر حدود کے مرتکب ہو جاتے ہیں (1)۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: رہا زبان کے ساتھ حجت قائم کرنا یہ تو دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے اور جہاں تک حدود کا تعلق ہے کہ اکثر حدود تک پہنچنا ان کے پاس ہوتا ہے (یعنی حدود کا اکثر ارتکاب ان کے پاس ہوتا ہے) تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں، حالانکہ گناہ اور معصیت کا ارتکاب کرنے والا منافق نہیں، بلاشبہ منافق اس شے کے سبب ہوتا ہے جو نفاق میں سے اس کے دل میں پوشیدہ ہوتی ہے، نہ کہ اس کے سبب جس کے بارے جوارح ظاہر التباس میں پڑ جاتے ہیں۔ اور محدودین کی اخبار کا سیاق اس کی شہادت دیتا ہے کہ وہ منافق نہیں ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ، الغلظ (سختی) یہ رأفت (نرمی) کی ضد ہے اور اس سے مراد امر کو نافذ کرنے کے لیے امر (حاکم) کا دل کو سخت کرنا ہے۔ اور یہ زبان میں نہیں ہوتی، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے حد کے کوڑے لگائے اور اس پر اسے جھڑکے نہیں'' (3)۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اور اسی سے وہ قول بھی ہے جو عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا: ''تم تو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تندخو اور سخت مزاج ہو (انت أفظ وأغلظ من رسول الله ﷺ) (4) اور الغلظ کا معنی ہے پہلو کا سخت ہونا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ضد ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۱۵﴾ (شعراء) (اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع و انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) اور اس آیت نے عفو، صلح اور درگزر میں سے ہر شے کو منسوخ کر دیا ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 383
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 978
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70
4۔ صحیح بخاری، فضائل الصحابہ، جلد 1، صفحہ 520

خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝

"وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا حالانکہ یقیناً انہوں نے کہی تھی کفر کی بات اور انہوں نے کفر اختیار کیا اسلام لانے کے بعد اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے۔ اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے، سو اگر وہ توبہ کر لیں تو یہ بہتر ہوگا ان کے لیے اور اگر وہ روگردانی کریں تو عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ عذاب الیم دنیا اور آخرت میں۔ اور نہیں ہوگا ان کا روئے زمین میں کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا روایت ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید بن صامت اور ودیعہ بن ثابت کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے کہا: قسم بخدا! اگر محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ان بھائیوں کے خلاف سچے ہیں جو ہمارے سردار اور ہمارے اشراف ہیں تو ہم یقیناً گدھوں سے برے ہیں۔ تو عامر بن قیس نے اسے کہا: ہاں! قسم بخدا بلاشبہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور آپ کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور بلاشبہ تو گدھے سے زیادہ برا اور شریر ہے۔ اور عامر نے اس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ اور پھر جلاس آیا اور اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا کہ عامر نے جھوٹ بولا ہے۔ اور عامر نے قسم کھائی۔ یقیناً اس نے یہ کہا ہے۔ اور پھر کہا: اے اللہ! اپنے سچے نبی پر اس بارے کوئی شے نازل فرما، پس یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ اور کہا گیا ہے: بے شک وہ جس نے یہ سنا وہ عاصم بن عدی تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ حذیفہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اسے اس کی بیوی کے بیٹے نے سنا تھا اور اس کا نام عمیر بن سعد تھا، اس بارے میں یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اس کا نام مصعب تھا۔ پس جلاس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ اس کی خبر کے بارے خبر نہ دے۔ تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جلاس کو جب اس کے ساتھی نے کہا تھا: بلاشبہ میں تیرے قول کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کروں گا، تو اس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا، پھر وہ ایسا نہ کر سکا، بلکہ اس سے عاجز آ گیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا کے ساتھ اسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے نازل ہوئی، اس نے بنی غفار کے ایک آدمی کو دیکھا جو جہینہ قبیلے کے ایک آدمی کے ساتھ لڑ رہا تھا اور جہینہ انصار کے حلیف تھے پس غفاری جہینی پر غالب آ گیا۔ تو ابن ابی نے پکار کر کہا: اے بنی اوس اور خزرج، اپنے بھائی کی مدد کرو! قسم بخدا! ہماری اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال تو اس طرح ہے جیسے کسی کہنے والے نے کہا: "اپنے کتے کو موٹا کرتا کہ وہ تجھے کھائے"۔ اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 82

وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا (1)۔ حضور نبی مکرم ﷺ کو اس بارے خبر دی گئی، تو عبداللہ بن ابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے قسم اٹھا دی کہ اس نے یہ بات نہیں کی، یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام منافقین کا قول ہے، یہ حسن نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ صحیح ہے، کیونکہ قول میں عموم ہے اور اس میں اور ان میں معنی موجود ہے اور اس میں ان تمام کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ نبی نہیں ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ نقاش نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا اس وعدے کو جھٹلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فتح کے بارے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد جلاس کا قول ہے: بے شک حضرت محمد (ﷺ) جو لے کر آئے اگر وہ حق ہے تو ہم یقیناً گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ اور عبداللہ بن ابی کا یہ قول ہے: اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو یقیناً وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد حضور نبی مکرم ﷺ کو گالیاں دینا اور اسلام میں طعن و تشنیع کرنا ہے (3)۔ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور انہوں نے کفر اختیار کیا اس کے بعد کہ ان کے لیے اسلام کا حکم لگ چکا تھا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ منافقین کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا (المنافقون) ((ان کا) یہ (طریق کار) اس لیے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لائے پھر وہ کافر بن گئے) میں قطعی دلیل ہے۔

اور یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ کفر ہر اس (قول) کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے جو تصدیق اور معرفت کی نقیض اور ضد ہو، اگرچہ ایمان ثابت نہیں ہوتا مگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اس کے سوا اقوال و افعال میں سے کسی سے ثابت نہیں ہوتا مگر نماز میں (ثابت ہو جاتا ہے)۔ اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: تحقیق علماء نے نماز میں ایسی شے پر اجماع کیا ہے جس پر باقی ساری شریعت میں انہوں نے اجماع نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے بالاجماع کہا ہے: جس کا کفر پہچان لیا جائے پھر لوگوں نے اسے نماز اپنے وقت میں پڑھتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ اس نے کثیر نمازیں پڑھیں اور انہیں اس کے اقرار باللسان کا علم نہ ہوا تو اس کے لیے ایمان کا حکم لگایا جائے گا اور انہوں (علماء) نے اس کے لیے روزے اور زکوٰۃ میں اس قسم کا حکم نہیں لگایا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا یعنی منافقین نے غزوۂ تبوک کے دوران لیلۃ العقبہ میں حضور نبی مکرم ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بارہ آدمی تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام بیان کیے حتی کہ آپ نے ان تمام کو شمار کیا۔ تو میں نے عرض کی: کیا آپ ان کی طرف (پیغام) نہیں بھیجیں گے کہ آپ انہیں قتل کر دیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ عرب کہیں کہ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کامیاب ہو گیا تو وہ انہیں قتل کرنے لگا بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں دبیلہ کے ساتھ کافی ہوگا'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ یہ دُبیلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جہنم کا شعلہ ہے جو ان میں سے ہر ایک کی رگ دل پر پڑے گا یہاں تک کہ اس کی روح نکل جائے گی''۔ (4) (اور وہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 131　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979
3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83　4۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 369

ہلاک ہو جائے گا) پھر اسی طرح ہوا۔ اسی کے ہم معنی مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابن ابی کے سر پر تاج رکھنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ اس پر جمع ہو جائیں۔ اس بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی وہ کسی شے کو ناپسند نہیں کرتے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے نابغہ نے کہا ہے:

ولا عَيْبَ فيهم غير أن سيوفهم　بهنّ فُلول من قِراعَ الكَتائب(1)

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں لشکروں کو کاٹنے کے سبب کند ہو چکی ہیں۔

اور کہا جاتا ہے: نَقَمَ ینقِمُ اور نَقِمَ ینقَمُ شاعر نے عین کے کسرہ کی صورت میں کہا ہے:

ما نقِموا من بنى أميّة إلا　أنهم يحلُمون إن غضبوا

اور زہیر نے کہا ہے:

يؤخَّر فيوضع في كتاب فَيُدَّخَرْ　ليوم الحساب أو يُعَجَّلْ فينقَمِ

یہ قاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ شعر میں کہا جاتا ہے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ دیت طلب کرتے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بارے ان کے لیے فیصلہ فرما دیتے تو وہ غنی (دولت مند) ہو گئے۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ بارہ ہزار تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ بے شک مقتول جلاس کا غلام تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے وہ انتہائی تنگ زندگی گزارتے تھے، نہ وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے اور نہ غنیمت تقسیم کرتے تھے، پس جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو وہ غنائم کے سبب غنی ہو گئے (2)۔ اور یہ مثل مشہور ہے (اتق شرّ من أحسنت إليه) تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے۔

علامہ ابونصر قشیری نے کہا ہے: بجلی کو کہا گیا کیا آپ قرآن کریم میں یہ پاتے ہیں تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ روایت ہے کہ جلاس اس وقت کھڑا ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے استغفار اور توبہ کی۔ تو یہ ایسے کافر کی توبہ پر دلیل ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہی وہ ہے جسے فقہاء زندیق کا نام دیتے ہیں۔ تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زندیق کی توبہ معروف نہیں ہے، کیونکہ وہ ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے اور اس کا ایمان معلوم نہیں ہو سکتا مگر اس کے قول کے ساتھ۔ اور اسی طرح اب وہ کرتا ہے اور ہر وقت وہ کہتا ہے: میں مومن ہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 60　2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83

حالانکہ جو کچھ وہ ظاہر کر رہا ہے اس کا خلاف وہ چھپا رہا ہے، پس جب وہ اس پر مطلع ہوا اور اس نے کہا: میں نے توبہ کی، تو اس کی حالت اس سے تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ پہلے تھا۔ پس جب وہ ہمارے پاس اپنی طرف سے توبہ کرتے ہوئے آیا اس سے پہلے کہ وہ اس پر مطلع ہو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی (1)۔ اور آیت سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا یعنی اگر وہ روگردانی کریں ایمان اور توبہ سے يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں قتل کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ عذاب دے گا۔ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ یعنی ان کے لیے روئے زمین پر کوئی بچانے والا نہ ہوگا جو انہیں بچائے گا۔ وَّلَا نَصِيْرٍ اور نہ کوئی معاون و مددگار ہوگا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

''اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا اللہ کے ساتھ کہ اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے اور ضرور ہو جائیں گے نیکوکاروں میں۔ پس جب اس نے عطا فرمایا انہیں اپنے فضل سے تو کنجوسی کرنے لگے اس کے ساتھ اور روگردانی کر لی اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔ پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے نفاق جما دیا ان کے دلوں میں اس دن تک جب ملیں گے اس کو اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف ورزی کی اللہ سے جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کے راز کو اور ان کی سرگوشی کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سارے غیبوں کا''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہ انصار میں سے ایک آدمی تھا اس نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی شے عطا فرمائی تو میں ضرور اس میں اس کا حق ادا کروں گا اور یقیناً خیرات دوں گا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرمایا تو اس نے وہ کیا جو تم پر بیان کیا گیا ہے۔ پس تم جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور تک پہنچا دیتا ہے۔ علی بن یزید نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابوامامہ باہلی سے روایت کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی: اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979

ہے اے ثعلبہ! وہ قلیل جس کا شکر ادا کیا جائے اس کثیر سے بہتر ہے جس کی تو طاقت نہ رکھے"۔ پھر وہ دوبارہ حاضر ہوا تو پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی کی مثل ہو اگر میں چاہوں کہ پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ چلیں تو وہ یقیناً چل پڑیں"۔ (أما ترضى أن تكون مثل نبي الله لو شئتُ أن تسير معي الجبال ذهبا لسارت) تو اس نے پھر عرض کی: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے تو میں ضرور ہر حق دار کو اس کا حق دوں گا۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی، پس اس نے بکریاں لیں تو وہ اس طرح بڑھیں جیسے کیڑے بڑھتے ہیں، تو اس پر مدینہ طیبہ تنگ ہو گیا پس وہ اس سے دور چلا گیا اور اس کی وادیوں میں سے ایک وادی میں جا کر رہنے لگا یہاں تک کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھنے لگا اور ان کے سوا اس نے جماعت چھوڑ دی۔ پھر وہ اور بڑھیں اور اتنی زیادہ ہو گئیں کہ اس نے سوائے جمعہ کے ساری نمازیں چھوڑ دیں اور وہ بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اس نے جمعہ بھی چھوڑ دیا۔ تو رسول اللہ نے فرمایا: یا ویح ثعلبه (ثعلبہ ہلاک ہو گیا) آپ نے یہ جملہ تین بار کہا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ:103) ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے اور آپ نے دونوں کو فرمایا: تم دونوں ثعلبہ اور فلاں کے پاس جاؤ...... یہ فلاں بنی سلیم کا ایک آدمی تھا...... اور تم ان سے زکوٰۃ لے آؤ"۔ چنانچہ وہ دونوں ثعلبہ کے پاس آئے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھ کر سنایا، تو اس نے کہا: یہ تو اخت جزیہ ہی ہے (یعنی زکوٰۃ جزیہ کی مثل ہی ہے) تم دونوں آگے جاؤ یہاں تک کہ جب فارغ ہو جاؤ تو پھر آنا۔ الحدیث اور یہ حدیث مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثعلبہ کے غنا کا سبب یہ بنا کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے کا وارث بنا۔ ابن عبد البر نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب وہ ہے جس کے بارے وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ، الآیہ والی آیت نازل ہوئی (1)۔ جب اس نے زکوٰۃ کو روکا، فاللہ اعلم۔ اور جو اس کے بارے میں آیا ہے جو بدر میں حاضر ہوا تو اس کا معارض آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ، الآیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آیت کے سبب نزول کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ سے اس کا مال شام میں پیچھے رہ گیا، تو اس نے انصار کی ایک مجلس میں قسم کھائی، اگر وہ محفوظ رہا تو میں ضرور اس سے خیرات کروں گا اور اس سے صلہ رحمی کروں گا پس جب اسے صحیح سالم مل گیا تو اس نے اس کے ساتھ بخل کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثعلبہ بدری انصاری اور ان میں سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایمان کی شہادت دی ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورہ ممتحنہ کے شروع میں آئے گا۔ پس اس کے بارے جو روایت کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: شاید اس کا قول جس نے ثعلبہ کے بارے یہ کہا ہے کہ اس نے اس زکوٰۃ کا انکار کیا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی وہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ آیت منافقین میں سے نبتل بن

1۔ اسباب النزول، صفحہ 132

حارث، جد بن قیس اور معتب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ نزول کے اعتبار سے ان کے ساتھ زیادہ موافق ہے، مگر یہ کہ قول باری تعالیٰ: **فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا** اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا وہ اس سے پہلے منافق نہ تھا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو: اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق میں اضافہ کر دیا پس وہ موت تک اس پر ثابت رہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ**، جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ** تو یہ اس کا احتمال رکھتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ اپنی زبان کے ساتھ کیا ہو اور اپنے دل سے اس کا اعتقاد نہ رکھا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ دونوں (زبان اور دل) کے ساتھ ہو پھر اسے سوء خاتمہ نے آ لیا ہو، کیونکہ اعمال اپنے خاتمہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور دل اپنے انجام اور اواخر کے ساتھ۔

اور من مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر مجرور میں ہے۔ اور قسم کا لفظ حدیث میں وارد ہے اور قرآن کریم کے ظاہر الفاظ میں یمین نہیں ہے مگر صرف ارتباط و التزام کے ساتھ، البتہ یہ معنوی اعتبار سے صیغہ قسم میں ہے کیونکہ لام اس پر دلالت کرتا ہے، یہ لفظ دو لاموں کے ساتھ مذکور ہے پہلا لام قسم کے لیے اور دوسرا لام الجواب ہے۔ اور یہ دونوں تاکید کے لیے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک یہ دونوں لام برائے قسم ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ واضح اور اظہر ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ وعدہ اور طلاق اور ہر وہ حکم جس کے ساتھ آدمی منفرد ہو سکتا ہے اور کسی غیر کا اس میں محتاج نہیں ہوتا، بے شک وہ اسے لازم ہو جاتا ہے جب وہ اپنے قصد و ارادہ سے اس کا التزام کرتا ہے اگرچہ وہ اس کے الفاظ نہ بھی کہے۔ یہ ہمارے علماء نے کہا ہے۔ امام شافعی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کسی پر کوئی حکم لازم نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے الفاظ ادا کرے۔ اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو موقف ان دونوں ائمہ نے اپنایا ہے اس کے صحیح ہونے پر دلیل وہ روایت ہے جسے اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، تحقیق آپ سے پوچھا گیا: جب آدمی اپنے دل سے طلاق کی نیت کر لے اور زبان کے ساتھ اس کا تلفظ نہ کرے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ اسے لازم ہو جائے گی، جیسا کہ آدمی اپنے دل کے ساتھ مومن ہو جاتا ہے اور اپنے دل کے ساتھ ہی کافر ہو جاتا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ایک عمدہ اصل ہے اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ کہا جائے: ایسا عقد جس میں آدمی اس کے التزام کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو تو فقط نیت کے ساتھ وہ اس پر منعقد ہو جائے گا۔ اس کی اصل ایمان اور کفر ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دوسرے قول کی حجت اور دلیل وہ روایت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے تجاوز اور

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 358
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 982

درگزر کی ہے ہر اس شے سے جو ان کے نفوس ان پر القا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کریں یا اس کے بارے کلام نہ کریں'' (1)۔ اور اسے ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی پر اہل علم کے نزدیک عمل بھی ہے کہ جب آدمی کا نفس طلاق کے بارے اس کے ذہن میں وسوسہ ڈالے تو کوئی شے واقع نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس بارے کلام کرے (2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: جس کسی نے دل کے ساتھ طلاق کا اعتقاد رکھا اور اپنی زبان کے ساتھ اس بارے کچھ نہ بولا تو اس سے کوئی شے واقع نہ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی زیادہ مشہور ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے طلاق لازم ہو جائے گی جب اس نے اپنے دل سے اس کی نیت کر لی جیسا کہ وہ اپنے دل کے ساتھ کافر ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اپنی زبان سے اس بارے کچھ نہ بولے۔ نظر و فکر اور ترجیح کے اعتبار سے پہلا قول اصح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ہر اس شے سے تجاوز فرمایا ہے جس کے بارے ان کے نفوس نے ان میں وسوسہ اندازی کی جب تک زبان اس کے بارے گفتگو نہ کرے یا ہاتھ اس کے مطابق عمل نہ کرے'' (3)۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر یہ نذر ہے تو بلا اختلاف نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اسے ترک کرنا معصیت ہے اور اگر یہ قسم ہے تو بالاتفاق قسم کو پورا کرنا واجب نہیں، مگر اس میں معنی یہ ہے اگر آدمی فقیر ہو تو اس پر فرض زکوٰۃ متعین نہیں ہوتی، پس اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے مال کی التجا کی جس میں زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور وہ اسے ادا کرے گا جو اس پر فرض زکوٰۃ میں سے متعین ہوگی، پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا جو اس میں سے چاہا تو اس نے اسے چھوڑ دیا جس کا اس نے التزام کیا تھا، اس میں سے جو اصل دین میں اسے لازم تھا اگر وہ اس کا التزام نہ کرتا، لیکن مال کی طلب کے ساتھ مال لینا حقوق کو ادا کرنے کے لیے ہے یہ وہ ہے جسے اس نے چھپا رکھا ہے جب اس نے اللہ تعالیٰ سے بغیر خالص نیت کے مال کا مطالبہ کیا یا خالص نیت کے ساتھ کیا لیکن اس میں اس کے بارے شروع سے لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے گئی اس میں شقاوت تھی (4)۔ نعوذ باللہ من ذالک

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی تمنا اور آرزو کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں غور و فکر کرے جس کی تمنا کر رہا ہے، کیونکہ وہ اسے نہیں جانتا جو اس کے لیے اس کی امیدوں میں سے اللہ تعالیٰ کے غیب میں لکھا ہوا ہے'' (5)۔ یعنی ان کے انجام میں سے۔ پس کتنی امیدیں ہیں جن کے ساتھ وہ فتنے میں پڑ جاتا ہے یا سرکش ہو جاتا ہے پس یہی دنیا و آخرت میں ہلاک ہونے کا سبب بن جاتا ہے، کیونکہ امور دنیا کے نتائج اور انجام مبہم ہیں اور ان کے فاسد ہونے کا خطرہ ہے۔ اور رہی امور دین اور آخرت کی آرزو تو بلاشبہ ان کی تمنا کرنا اس کا نتیجہ قابل ستائش ہے ان پر برانگیختہ کیا گیا اور ان کی طرف بلایا گیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142
3۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 104
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 983
5۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 357

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: لَئِنۡ اٰتٰىنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے کہا: اگر میں فلاں فلاں چیز کا مالک بن گیا تو وہ صدقہ ہے (ان ملکت کذا و کذا فھو صدقة) کیونکہ یہ اس کے ذمہ لازم ہو جاتی ہے۔ یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اس کے ذمہ لازم نہ ہوگی۔ اور طلاق میں اسی کی مثل اختلاف ہے اور اسی طرح عتق میں بھی ہے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عتق میں اس پر لازم ہو جائے گا اور طلاق کی صورت میں لازم نہ ہوگا (1)، کیونکہ آزاد کرنا قربت ہے اور یہ نذر کے ساتھ ذمہ میں ثابت ہو جاتی ہے۔ بخلاف طلاق کے کیونکہ وہ محل میں تصرف کرنا ہے اور وہ ذمہ میں ثابت نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کے لیے ان چیزوں میں کوئی نذر نہیں ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا اور ان میں اس کے لیے کوئی عتق نہیں جن کا وہ مالک نہیں اور نہ ہی ان میں اس کے لیے طلاق کا کوئی حق ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا'' (2)۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: اس باب میں حضرت علی، حضرت معاذ، حضرت جابر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور وہی بہترین شے ہے جو اس باب میں مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں ان میں سے کوئی شے صحیح نہیں اور اسے ان پر محمول کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ظاہر آیت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کر دیا۔ بَخِلُوۡا بِهٖ تو وہ بطور صدقہ مال دینے، خیر کے کاموں میں مال خرچ کرنے اور ان (نذروں) کو پورا کرنے میں جن کے وہ ضامن بنے تھے اور انہوں نے جن کا التزام کیا تھا، وہ کنجوسی کرنے لگے۔ بخل کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَ تَوَلَّوۡا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کر لی۔ وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ اور وہ اسلام سے منہ پھیرنے والے ہیں، یعنی اس سے اعراض کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا دو مفعول ہیں، ای أعقبھم اللہ تعالیٰ نفاقا فی قلوبھم (یعنی بطور نتیجہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق راسخ کر دیا) اسی لیے کہا: بَخِلُوۡا بِهٖ (وہ اس کے ساتھ بخیل ہو گئے) اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ یہ محل خفض (جر) میں ہے: ای یلقون بخلھم اس دن تک جب وہ اپنے بخل کو جا ملیں گے یعنی اپنے بخل کی جزا کو جا ملیں گے، جیسے کہا جاتا ہے: أنت تلقی غدا عملك (تو کل اپنے عمل کو جا ملے گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ، ای یلقون اللہ (اس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 141۔ ایضاً، حدیث نمبر 1101، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، باب فی الطلاق قبل النکاح، حدیث نمبر 1873، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

ون تک جب وہ اللہ تعالیٰ سے جاملیں گے) اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ نفاق کی حالت میں ہی مرا۔ اور یہ بعید ہے کہ اس میں جو حکم نازل کیا گیا ہے وہ ثعلبہ یا حاطب کے بارے ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''تجھے کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر مطلع ہوا اور اس نے فرمایا تم جو چاہو کرو تحقیق میں نے تمہیں بخش دیا ہے'' (1)۔ اور ثعلبہ اور حاطب ان میں سے ہیں جو بدر میں حاضر ہوئے اور اس کا مشاہدہ کیا۔ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ان کے کذب سے مراد ان کا وعدہ کو توڑنا اور ان کا اسے پورا کرنے کو ترک کرنا ہے جسے انہوں نے اپنے ذمے لازم کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: نِفَاقًا نفاق جب دل میں ہو تو وہ کفر ہے، لیکن جب وہ اعمال میں ہو تو وہ معصیت ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چار خصلتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو گی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دے''۔ اربع من کن فیه کان منافقا خالصا و من کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها: إذا ائتمن خان وإذا حدث کذب وإذا عاهد غدر وإذا خاصم فجر (2) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس کلمہ کے مادہ اشتقاق پر بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کی تاویل میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جو ایسی بات کرتا ہے جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور وہ ایسا وعدہ کرتا ہے جسے پورا کرنے کا وہ اعتقاد نہیں رکھتا اور وہ امانت میں خیانت کرنے کے لیے اس کا منتظر رہتا ہے۔ اور انہوں نے اسے ضعیف الاسناد حدیث کے ساتھ جوڑ دیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اس حال میں کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے باہر آرہے تھے اور وہ دونوں بوجھل تھے (یعنی رو رہے تھے) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مجھے کیا ہے میں تم دونوں کو روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ تو دونوں نے جواب دیا: ایک حدیث ہے جسے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافق کی خصلتوں کے بارے میں سنا ہے ''جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے''۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا نہیں؟ تو دونوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی۔ تو آپ نے کہا: لیکن میں اس کے بارے پوچھوں گا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اس حال میں نکلے ہیں کہ وہ دونوں رو رہے تھے، پھر آپ نے وہ ذکر کیا جو ان دونوں نے کہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے ان دونوں کو حدیث بیان کی اور میں نے اسے اس معنی میں نہیں بیان کیا جس میں ان دونوں نے اسے رکھا ہے کیونکہ منافق جب بات کرتا ہے درآنحالیکہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جب وہ وعدہ

1۔ صحیح بخاری، باب لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء، جلد 2، صفحہ 726
2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 10

کرتا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے گا اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے درآنحالیکہ وہ دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ خیانت کرے گا''۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: تحقیق اس پر واضح دلیل قائم ہوگئی کہ ان خصائل پر اعتماد کرنے والا کافر نہیں ہوگا، بلکہ وہ کافر ایسے اعتقاد کے ساتھ ہوگا جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے جہالت اور اس کی تکذیب کی طرف لوٹ جائے۔ (تعالی اللہ و تقدس عن اعتقاد الجاهلين وعن زيغ الزائغين)۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے منافقین کے ساتھ مخصوص ہے (1)۔ اور انہوں نے اس روایت کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے جسے مقاتل بن حیان نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے ان دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کے ہمراہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ آپ نے فرمایا ہے: ''تین خصلتیں ہیں جس میں موجود ہوں گی تو وہ منافق ہوگا اگرچہ اس نے روزہ بھی رکھا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو اور اس کا یہ گمان ہو کہ وہ مومن ہے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کا تہائی حصہ موجود ہے'' (2)۔ تو ہم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم ان سے یا ان میں سے بعض سے محفوظ اور سلامت نہیں اور لوگوں میں سے اکثر ان سے محفوظ و مامون نہیں۔ راوی نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ''تم کو اور ان کو کیا ہے بلاشبہ میں نے انہیں منافقین کے ساتھ خاص کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں خاص کیا ہے پس میرا قول اذا حدث کذب (جب وہ بات کرے تو وہ جھوٹ بولے) تو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ...... الآیہ۔

''کیا تم اس طرح ہو''؟ ہم نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو''۔ اور میرا قول اذا وعد أخلف (کہ جب وہ وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ الآیات الثلاث ''کیا تم اس طرح ہو؟'' ہم نے عرض کی نہیں۔ قسم بخدا! اگر ہم نے کسی شی کے بارے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تو ہم اسے ضرور پورا کریں گے۔ آپ نے فرمایا: ''تم پر کچھ نہیں تم اس سے بری ہو۔ اور رہا میرا قول واذا ائتمن خان (اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ الآیہ (الاحزاب: 72) پس ہر انسان کو اپنے دین پر امین بنایا گیا ہے پس مومن غسل جنابت کرتا ہے سراً بھی اور علانیۃً بھی (اور منافق صرف علانیۃ ایسا کرتا ہے) کیا تم اس طرح ہو؟'' ہم نے عرض کی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو'' (3)۔ بہت سے تابعین اور ائمہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: یہ اس کے بارے میں ہے جس پر یہ خصلتیں غالب ہوں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اہل علم کے مذہب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بری خصلتیں اسے منافق بنانے والی ہیں جو ان کے

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 984 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 985

ساتھ یوم قیامت تک متصف رہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر اس پر معاصی اور گناہ غالب آجائیں تو ان کے ساتھ وہ کافر نہیں ہوگا جب تک وہ اعتقاد میں موثر نہ ہوں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا پھر انہوں نے اس کا خلاف کیا اور انہوں نے ان سے گفتگو کی تو انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا اور آپ نے انہیں یوسف علیہ السلام پر امین بنایا تو انہوں نے اس میں خیانت کی اور وہ منافق نہیں ہوئے۔ حضرت عطا بن ابی رباح نے کہا ہے: ان خصلتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنایا اور وہ منافق نہیں ہوئے بلکہ وہ انبیاء ہوئے (۱) اور حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے: نفاق دو قسم کا ہے، ایک نفاق الکذب اور دوسرا نفاق العمل۔ جہاں تک نفاق الکذب کا تعلق ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا نفاق العمل تو وہ یوم قیامت تک ختم نہیں ہوگا (2)۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا آج (کا زمانہ) تو اس میں ایمان کے بعد فقط کفر ہے (3)۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور جب وہ جاننے والا ہے تو وہ عنقریب انہیں جزا اور بدلہ بھی دے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ؗ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

"جو لوگ (ریاکاری کا) الزام لگاتے ہیں خوشی خوشی خیرات کرنے والوں پر مومنوں سے اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ یہ بھی منافقین کی صفات میں سے ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یَلْمِزُوْنَ کا معنی ہے وہ عیب اور الزام لگاتے ہیں (4)۔ فرمایا: وہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال صدقہ کر دیا اور ان کا مال آٹھ ہزار تھا پس انہوں نے اس میں سے چار ہزار صدقہ کر دیئے، تو ایک قوم نے کہا: اس کا احسان کتنا زیادہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ اور انصار میں سے ایک آدمی کھجوروں کا نصف ڈھیر لے کر آیا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اس سے کتنا غنی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ، الآیہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مسعود سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے بیان کیا: ہم بوجھ اٹھاتے تھے۔ ایک روایت میں ہے: اپنی پشتوں پر۔ فرمایا: پس ابو عقیل نے نصف صاع صدقہ کیا اور ایک آدمی اس سے کچھ زیادہ چیز لے کر آیا تو منافقوں

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 987　2۔ ایضاً　3۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1054
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 88　(۱) صحیح یہ ہے کہ وہ انبیاء نہیں ہوئے کیونکہ ان کا عمل عصمت کے منافی ہے۔ حاشیہ 214

نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تو اس صدقہ سے غنی ہے (اسے اس کی حاجت نہیں ہے) اور اس دوسرے نے محض ریاکاری کے لیے کیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ مراد ابوعقیل ہیں اور ان کا نام حبحاب تھا(1)۔ اور الجھد سے مراد وہ تھوڑی سی شے ہے جس کے ساتھ ایک تنگ دست زندگی گزارتا ہے اور الجُھْد اور الجَھْد دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یلمزون کا معنی ہے وہ عیب لگاتے ہیں۔ اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ اور المطوعین اصل میں المتطوعین ہے اس میں تا کو طا میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو کوئی کام اپنی مرضی اور خوشی سے کرتے ہیں اس کے بغیر کہ وہ ان پر واجب ہو۔ والذین یہ محل جر میں ہے اور اس کا عطف المؤمنین پر ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ اسم پر اس کے مکمل ہونے سے پہلے معطوف ہو۔ اور فَیَسْخَرُوْنَ اس کا عطف یلمزون پر ہے۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ یہ مبتدا کی خبر ہے اور یہ ان کے لیے بددعا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ خبر ہے یعنی سخر منهم حیث صاروا الی النار (اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مذاق کی سزا اس طرح دی کہ وہ جہنمی ہو گئے) اور سخر اللہ کا معنی ان کے مذاق پر انہیں جزا اور بدلہ دینا ہے۔ اور یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۸۰﴾

"آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار جب بھی نہ بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، یہ محض اس لیے کہ انہوں نے انکار کیا اللہ کا اور اس کے رسول (مکرم) کا۔ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا نافرمان قوم کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اس کا بیان اس ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ:84) کے تحت آ رہا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا یَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

"خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور (دوسروں کو بھی) کہتے مت نکلو اس سخت گرمی میں، فرمایئے: دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، کاش! وہ کچھ سمجھتے"۔

قولہ تعالیٰ: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ یعنی اپنے بیٹھے رہنے کے سبب پیچھے چھوڑے جانے والے خوش ہو گئے۔ قعد

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327

قعودا و مقعدا اس کا معنی ہے وہ بیٹھا۔ واقعدہ غیرہ اور اسے کسی دوسرے نے بٹھا دیا۔ یہ جوہری سے مروی ہے اور المخلف کا معنی متروک (چھوڑا گیا) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا اور انہیں کمزور کر دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین نے پیچھے چھوڑ دیا جب انہوں نے ان کے جہاد پر نکلنے میں دیر اور سستی کرنے کو جان لیا۔ یہ دو قول ہیں: اور یہ غزوۂ تبوک کے وقت ہوا (1)۔ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ یہ مفعول من اجلہ ہے۔ اور اگر چاہیں تو مصدر بنا لیں۔ اور خلاف بمعنی مخالفت ہے۔ اور جنہوں نے خلف رسول اللہ پڑھا ہے انہوں نے جہاد سے پیچھے رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو یہ کہا (مت نکلو اس سخت گرمی میں) قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ آپ انہیں کہیے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جہنم کی آگ۔ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا یَفْقَهُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ حَرًّا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کا امر چھوڑ دیا تو اس نے اس آگ کو طلب کر لیا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

"تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ، یہ سزا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا یہ امر ہے اور یہ تہدید کے معنی کے لیے ہے اور یہ ہنسنے کے بارے امر نہیں ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ اس میں لام مکسور ہوتا پھر کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا انہیں چاہیے کہ وہ دنیا میں تھوڑا ہنسیں۔ وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا اور زیادہ روئیں جہنم میں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر بمعنی خبر ہے۔ ای أنھم سیضحکون قلیلا و یبکون کثیرا (بے شک وہ عنقریب تھوڑا ہنسیں گے اور زیادہ روئیں گے) جزاء یہ مفعول من اجلہ ہے، ای للجزاء (سزا کے لیے)

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں میں سے بعض شدید خوف کی وجہ سے اپنے نفس کو بچانے کی خاطر اور اپنے اعتقاد میں اپنی حالت کے فساد سے بچنے کی خاطر ہنستے نہیں ہیں اگرچہ وہ آدمی نیک اور صالح ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قسم بخدا! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم تھوڑا ہنسو اور روؤ زیادہ اور تم کھلے راستوں کی طرف نکل جاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگو کہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا" (3)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت حسن بصری ان میں سے تھے کہ کبھی آپ پر حزن و ملال غالب ہوتا تو آپ نہ ہنستے تھے۔ اور ابن سیرین ہنستے تھے اور حسن کے خلاف حجت بیان کرتے ہوئے کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہنسایا بھی ہے اور رلایا بھی۔ اور صحابہ کرام ہنستے تھے، مگر یہ کہ اس میں کثرت کرنا اور اسے لازم پکڑنا یہاں تک کہ وہ اپنے صاحب پر غالب آ جائے مذموم ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بے وقوف اور بیکار لوگوں کا فعل ہے اور حدیث میں ہے: "بے شک زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے"۔

اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خوف، اس کے عذاب اور اس کی سزا کی شدت سے رونے کا تعلق ہے تو وہ قابل تعریف

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 88 2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 228 3۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم رؤ اور اگر رونہ سکو تو رونے کی شکل بنالو کیونکہ اہل جہنم روئیں گے یہاں تک کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر بہیں گے گویا کہ وہ نالیاں ہیں یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے پھر خون بہنے لگ جائے گا اور آنکھیں زخمی ہو جائیں گی پس اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو وہ چل پڑیں" (1)۔ اسے ابن المبارک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾

"(اے حبیب!) پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ ان کے کسی گروہ کے پاس پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے جہاد پر نکلنے کی تو آپ فرمایئے نہیں نکلو گے تم میرے ہمراہ کبھی اور ہرگز جنگ نہیں کرو گے میری معیت میں کسی دشمن سے تم نے تو (خود) پسند کیا تھا (گھر) بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ یعنی پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ منافقین کے کسی گروہ کے پاس۔ بے شک فرمایا: اِلٰى طَآىِٕفَةٍ کیونکہ وہ تمام جو مدینہ طیبہ میں مقیم رہے وہ منافقین نہیں تھے، بلکہ ان میں معذور بھی تھے اور وہ بھی جن کا کوئی عذر نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی، جیسا کہ وہ تین جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ ان کا ذکر عنقریب آئے گا۔ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا یعنی ان کا انجام اور نتیجہ یہ ہے کہ آپ کبھی بھی انہیں ساتھ نہ ملائیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے سورۃ الفتح میں فرمایا: قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا (الفتح: 15) (فرمایئے تم قطعاً ہمارے پیچھے نہیں آسکتے) اور الْخٰلِفِیْنَ یہ خالف کی جمع ہے، گویا کہ وہ نکلنے والوں سے پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْخٰلِفِیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو منافقین میں سے پیچھے رہ گئے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جو عورتوں اور مردوں میں سے ضعیفوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے (2)، پس مذکر کو غلبہ دیا (اور جمع مذکر ذکر کی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس تم بیٹھے رہو فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ ان کے اس قول سے ہے فلان خالفة أهل بيته جب وہ ان میں فساد برپا کرنے والا ہو (اور یہ) خلوف فم الصائم سے ہے (روزے دار کے منہ کی بو) اور تیرے اس قول سے: خلف اللبن یعنی جب دودھ زیادہ دیر مشکیزے میں پڑے رہنے کے سبب خراب ہو جائے۔ پس اسی بنا پر فاقعدوا مع الفاسدین مراد لی گئی ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنگوں میں مدد چھوڑ دینے والوں کو ساتھ لینا جائز نہیں ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 89۔ سنن ابن ماجہ، باب صفة النار، حدیث نمبر 4314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 362

وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑے ہوں اس کی قبر پر، بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول مکرم کے ساتھ۔ اور وہ مرے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے"۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی بن سلول اور حضور نبی کریم ﷺ کے اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحیحین وغیرہ میں ثابت ہے۔ اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی اور یہ آیت اس کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب آگے بڑھے تاکہ آپ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں تو آپ کے پاس حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے آپ کا کپڑا کھینچا اور آپ پر یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا الآیہ تو حضور نبی کریم ﷺ واپس پھر آئے اور اس پر نماز جنازہ نہ پڑھائی۔ اور اس کے خلاف اور برعکس روایات بھی ثابت ہیں۔ پس بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی پھر آپ واپس لوٹ آئے اور آپ بالکل تھوڑی ہی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورت براءت کی دو آیتیں نازل ہوئیں: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا۔ (1) اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب عبد اللہ بن ابی بن سلول فوت ہوا تو اس کا بیٹا عبد اللہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی کہ آپ اسے اپنی قمیص عنایت فرمائیں وہ اس میں اپنے باپ کو کفن پہنائے گا تو آپ ﷺ نے وہ اسے عطا فرما دی پھر اس نے عرض کی کہ آپ اس پر نماز جنازہ بھی پڑھائیں، تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے تاکہ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز جنازہ پڑھنے سے آپ کو منع فرمایا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار عطا فرمایا ہے پس فرمایا: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (التوبہ: 80) (آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار) اور میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں گا"۔ فرمایا: بلاشبہ وہ منافق ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ (2) پھر آپ ﷺ نے ان پر نماز چھوڑ دی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک حضور نبی مکرم ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کے الفاظ اسلام کے ظاہر پر بنا کرتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا جب آپ کو منع کر دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے کہہ دیا: کیا آپ اس پر نماز پڑھیں گے جس پر نماز

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674 2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276

جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرما دیا ہے، حالانکہ پہلے ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے نہی وارد نہ تھی تو جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ بات آپ کے دل میں واقع ہوئی ہو اور وہ اس الہام اور تحدث کے قبیلہ سے ہو جس کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اور کبھی قرآن کریم آپ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کی مراد و مقصود پر نازل ہوتا تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے تین امور میں موافقت کی ہے (1)۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ چار میں (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے اور چاہت کے مطابق قرآن کریم کا حکم نازل کیا) اور یہ پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پس یہ بھی اس میں سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ**، الآیہ (آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں یا نہ کریں) یہ نہیں کہ نہی اس پر مقدم ہو جس پر بخاری اور مسلم کی حدیث نے دلالت کی ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: **مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ** (التوبہ: 113) (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے) کیونکہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ**، الآیہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں تو وہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اگرچہ استغفار کتنا زیادہ ہو۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: وہ ثابت نہیں جو یہ روایت کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں ضرور ستر سے زیادہ بار بخشش طلب کروں گا'' (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ثابت ہے: ''سازید علی سبعین (میں ستر سے زائد بار طلب کروں گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''اگر میں یہ جانتا کہ اگر میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں تو انہیں بخش دیا جائے گا تو میں یقیناً اس سے زیادہ بار بخشش طلب کرتا''۔ فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ** کی تاویل میں اختلاف کیا ہے کیا یہ ناامید کرنا ہے یا اختیار دینا ہے؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مقصود ناامید کرنا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ** (4) (جب بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا) اور ستر بار کا ذکر محض اتفاق ہے یا یہ ان کی عادت کے مطابق عبارت میں کثرت اور انتہا کا ذکر ہے پس جب ان میں سے کوئی کہنے والا کہتا: لا أكلمه سبعين سنة (میں اس سے ستر برس تک کلام نہیں کروں گا) تو یہ ان کے نزدیک اس قول کے قائم مقام ہے: لا أكلمه أبدًا (میں اس سے ہمیشہ کلام نہیں کروں گا) اور انتہا اور غایت کے بیان میں اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا** (الحاقۃ: 32) (پھر ستر گز لمبے زنجیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 673
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 674
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 990

میں اس کو جکڑ دو) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من صام یوما فی سبیل الله باعد الله وجهه عن النار سبعین خریفا (1) (جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آتش جہنم سے ستر برس تک دور کر دے گا)

اور ایک جماعت نے کہا: یہ تخییر ہے (2)۔ ان میں سے حسن، قتادہ اور عروہ رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے لیے بخشش طلب کیجئے اور اگر آپ چاہیں تو بخشش طلب نہ کریں یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے دشمن پر نماز جنازہ پڑھیں گے جس نے فلاں فلاں دن ایسے ایسے کہا؟ تو آپ نے فرمایا: "بلاشبہ مجھے اختیار دیا گیا ہے سو میں نے اختیار کر لیا ہے" (3)۔ انہوں نے کہا ہے: پھر یہ اختیار منسوخ ہو گیا جب یہ آیت نازل ہوئی: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (المنافقون: 6) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا (اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیہ (التوبہ: 113) یہ آیت حضرت ابو طالب کی موت کے وقت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جیسا کہ اس کا بیان آئے گا اور اس سے اس کے بارے میں استغفار کرنے سے نہی سمجھی جا سکتی ہے جو حالت کفر میں فوت ہوا۔ اور اس آیت پر متقدم ہے جس سے تخییر سمجھی گئی ہے آپ کے اس قول کے ساتھ: "بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے" (4) اور یہ مشکل ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک آپ کا اپنے چچا کے لیے استغفار کرنا بلاشبہ آپ کا مقصود قبولیت کی امید پر استغفار تھا تاکہ انہیں مغفرت حاصل ہو جائے۔ اور اس استغفار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ انہیں اپنی ماں کے لیے استغفار کرنے کی اجازت عطا فرمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کو اجازت نہ دی (5) (ا)۔ اور رہا منافقین کے لیے استغفار کرنا تو یہ وہ ہے جس بارے میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے اور یہ ایسا زبانی استغفار ہے جو نفع نہیں دے سکتا۔ اور اس کی غایت اور مقصود یہ ہے کہ ان زندوں میں سے بعض کے دلوں کو پاک کرنا جن کا اس کے ساتھ قرابت کا تعلق ہے جس کے لیے بخشش طلب کی گئی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عبداللہ کو قمیص عطا کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لیے عطا فرمائی کیونکہ عبداللہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بدر کے دن اپنی قمیص دی تھی۔ اور وہ اس لیے کہ بدر کے دن عباس کو قیدی بنا کر لایا گیا تو ان سے کپڑے چھین لیے گئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھا تو آپ پر گراں گزرا، چنانچہ آپ نے ان کے لیے قمیص طلب کی تو عبداللہ کی قمیص کے سوا کوئی قمیص نہ پائی گئی جسے وہ پہن سکتے ہوں، کیونکہ طویل القامۃ ہونے میں دونوں قریب قریب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص دینے سے یہ ارادہ فرمایا کہ دنیا میں اس کا احسان اتار دیا جائے تاکہ وہ آخرت میں آپ کو اس حال میں نہ ملے کہ اس کا آپ پر

1۔ سنن نسائی، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 314　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 991
3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674　4۔ ایضاً　5۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 314

(ا) اس بارے میں ضیاء النبی جلد دوم میں ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے مفصل بحث کی ہے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مترجم

احسان ہو اور آپ کو اس کا بدلہ دینا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی تکریم، اس کی حاجت اور طلب کو پورا کرنے کے لیے اور اس کے دل کی پاکیزگی کے لیے اسے قمیص عطا فرمائی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اسے امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: جب بدر کا دن تھا قیدیوں کو لایا گیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی لائے گئے اس حال میں کہ ان پر کپڑا نہ تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے قمیص کا مطالبہ کیا تو انہوں نے عبداللہ بن ابی کی قمیص پائی جو وہ پہن سکتے تھے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ قمیص پہنادی، پس اسی لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اتاری جو آپ نے اسے پہنائی (1)۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن قمیصی لا یغنی عنه من الله شیئا وإنی لأرجو أن یسلم بفعلی هذا ألف رجل من قومی (2) (بلاشبہ میری قمیص اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی کسی شے کو اس سے دور نہیں کر سکے گی اور بلاشبہ مجھے یہ توقع ہے کہ میرے اس عمل سے میری قوم کے ہزار افراد اسلام قبول کر لیں گے) اسی طرح بعض روایات میں ہے من قومی سے مراد عرب کے منافقین ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: رجال من قومه (3) (یعنی اس کی قوم کے ہزار افراد) اور مغازی ابن اسحاق اور بعض کتب تفسیر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے خزرج قبیلے کے ہزار آدمیوں نے توبہ کی اور مسلمان ہو گئے (فاسلم و تاب لهذه الفعلة من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ألف رجل من الخزرج)

مسئلہ نمبر 7۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے رکنے کے بارے نص ہے اور اس میں مومنین پر نماز جنازہ پڑھنے پر دلیل نہیں ہے۔ اس بارے اختلاف ہے کہ کیا اس کے مفہوم مخالف سے مومنین پر نماز جنازہ واجب ہونے کے بارے حکم اخذ کیا جائے گا؟ تو اس بارے میں دو قول ہیں: وہ حکم اخذ کیا جائے گا، کیونکہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کی علت ان کے کفر کو قرار دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا انکار کیا) تو جب کفر زائل ہو گیا تو نماز واجب ہو گئی۔ اور یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہوگا: كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (المطففین) (یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا) یعنی اس دن کفار کو رب کریم کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ غیر کفار اسے دیکھ سکیں گے اور وہ مومنین ہیں۔ پس یہ بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم۔ یا نماز کا حکم آیت کے علاوہ دلیل خارجی سے لیا جائے گا اور وہ اس باب میں وارد ہونے والی احادیث ہیں اور اجماع ہے۔ اختلاف کا منشاء دلیل خطاب کے ساتھ قول کرنا اور اسے چھوڑنا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک تمہارا بھائی فوت ہو چکا ہے پس تم اٹھو اور اس پر نماز جنازہ پڑھو'' (4)۔ آپ نے بیان کیا: پس ہم اٹھے اور دو صفیں بنائیں۔ اس میں مراد نجاشی (شاہ حبش) ہے۔ اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 442　2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 91
3۔ ایضاً　4۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نجاشی کی موت کی خبر اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا تھا، پس آپ انہیں ساتھ لے کر جنازہ گاہ کی طرف نکلے اور آپ نے چار تکبیریں کہہ کر نماز جنازہ پڑھائی (1)۔ اور مسلمانوں نے اس پر اجماع کر لیا کہ مسلمانوں کی میتوں پر نماز جنازہ ترک کرنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ کبیرہ گناہ کرنے والوں سے ہوں یا نیکوکاروں میں سے اور یہ قولاً و عملاً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ والحمد للہ۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے سوائے شہید کے اور سوائے اہل بدعت اور باغیوں کے (کہ ان کے بارے میں اختلاف ہے)

مسئلہ نمبر 8۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ تکبیریں چار ہیں۔ ابن سیرین نے کہا ہے: (نماز جنازہ میں) تکبریں تین تھیں پھر انہوں نے ایک کا اضافہ کر دیا۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: پانچ تکبیریں کہی جائیں گی اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چھ تکبیریں مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ تکبیرات تین ہیں اور ان پر چوتھی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نماز جنازہ پڑھی اور انہوں نے آپ پر چار تکبیریں کہیں اور انہوں نے کہا: اے بنی آدم! یہی تمہارے لیے (طریقہ) اور سنت ہے'' (3)۔

مسئلہ نمبر 9۔ نماز جنازہ میں قراءت نہیں ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہی ہے۔ اور اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء (4) (جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا مانگو) اسے ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق، محمد بن مسلمہ ہمارے علماء میں سے اشہب اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے'' (5)۔ اور انہوں نے اسے اپنے عموم پر محمول کیا ہے۔ اور اس روایت کے سبب جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جنازہ پر نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ کی قراءت کی اور فرمایا جان لو بلاشبہ یہ سنت ہے (6)۔ اور امام نسائی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا: جنازوں پر نماز پڑھنے میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ آہستہ آواز سے پڑھی جائے، پھر تین تکبریں کہی جائیں اور آخر میں سلام پھیرا جائے (7)۔

اور محمد بن نصر مروزی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309
2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281
3۔ سنن دارقطنی، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 70
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 100
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 118
6۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 178
7۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281

تکبیر کہے، پھر سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر حضور نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھے، پھر میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف پہلی تکبیر میں کی جائے گی پھر سلام پھیر دیا جائے گا۔ ہمارے شیخ ابوالعباس نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور یہ دونوں علماء اصول کے نزدیک مسند کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول لا صلوٰۃ اور میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا دونوں جمع ہیں اور اس میں سورۂ فاتحہ کی قراءت یہ دعا کے آغاز کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ مرد کے سر کی جانب تھوڑا ہٹ کر اور عورت کے سرین کی جانب ہو کر کھڑا ہو، کیونکہ ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی تو حضرت علاء بن زیاد نے انہیں کہا: اے ابوحمزہ! اسی طرح رسول اللہ ﷺ جنازوں پر نماز پڑھتے تھے جیسے تم نے پڑھی ہے، آپ چار تکبیریں کہتے اور آدمی کے سر کے نزدیک اور عورت کے سرین کی جانب کھڑے ہوتے؟ (1) انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور اسے مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے کعب کی ماں کی نماز جنازہ پڑھائی وہ فوت ہوئی اس حال میں کہ وہ حالت نفاس میں تھی تو رسول اللہ ﷺ اس پر نماز پڑھانے کے لیے اس کے وسط میں کھڑے ہوئے (2)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ جب میت کو دفن کر دیا جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس کی قبر پر ٹھہرتے اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا فرماتے (3)، جیسا کہ ہم نے اسے (التذکرہ میں) بیان کیا ہے۔ والحمدللہ

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''اور نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان سے دنیا میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں''۔

اسے تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا۔ اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور جب نازل کی جاتی ہے کوئی سورت (جس میں حکم ہوتا ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اللہ کے رسول کے ہمراہ تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے جو طاقت والے ہیں ان میں سے اور کہتے ہیں رہنے دیجئے ہمیں تاکہ ہوں ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 99

3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 311

2۔ التذکرۃ فی احوال الموتی، الوقوف عند القبر قلیلاً بعد الدفن، جلد 1، صفحہ 157، دار ابن زیدون بیروت

مومنوں نے دعوت کو قبول کرنے میں جلدی کی اور منافقوں نے عذر اور بہانے بنانے میں جلدی کی۔ پس مومنوں کے لیے یہ حکم ایمان پر قائم رہنے اور ثابت قدم رہنے کے بارے ہے اور منافقوں کے لیے یہ امر ابتدا ایمان لانے کے بارے میں ہے۔ اور ان محل نصب میں ہے۔ ای بأن أمنوا (یعنی اصل میں بأن ہے) اور الطول کا معنی ہے غنی، دولت مند اور اس کا ذکر پہلے چکا ہے۔

اور انہیں ذکر کے ساتھ خاص اس لیے کیا ہے، کیونکہ جو غنی اور طاقت ور نہ ہو اسے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو معذور ہے۔ وَقَالُوۡا ذَرۡنَا نَكُنۡ مَّعَ الۡقٰعِدِيۡنَ ہمیں رہنے دیجئے تا کہ ہم نکلنے سے عاجز لوگوں کے ساتھ ہوں۔

رَضُوۡا بِاَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَـوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ۝ لٰـكِنِ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ‌ؕ وَاُولٰۤـئِكَ لَهُمُ الۡخَيۡـرٰتُ‌ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا‌ ؕ ذٰلِكَ الۡـفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝

''انہوں نے یہ پسند کیا کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور انہی کے لیے ساری بھلائیاں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ تیار کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہنے والے ہیں ان میں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: رَضُوۡا بِاَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَـوَالِفِ اس میں الۡخَـوَالِفِ، خالفة کی جمع ہے یعنی وہ عورتوں، بچوں اور مردوں میں سے معذوروں کے ساتھ ہو جائیں۔ اور آدمی کے لیے خالف اور خالفة بھی کہا جاتا ہے جب وہ نجیب اور شریف نہ ہو، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان خالفة أهله جب وہ ان سے گھٹیا ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی اصل خلف اللبن یخلف سے ہے جب دودھ طویل وقت پڑے رہنے کے سبب کھٹا اور خراب ہو جائے اور خلف فم الصائم روزے دار کے منہ کی بو بدل جائے اور اسی سے فلان خلف سوٗ (فلاں برا پیچھے رہنے والا ہے) مگر یہ فاعلة کی جمع فواعل ہے اور فاعل صفت کی فواعل کے وزن پر جمع نہیں بنائی جاتی مگر شعر میں، مگر دو حرفوں میں۔ اور وہ دونوں فارس اور ہالک ہیں۔ اور مجاہدین کے وصف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاُولٰۤـئِكَ لَهُمُ الۡخَيۡـرٰتُ کہا گیا ہے: مراد خوبصورت عورتیں ہیں۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيۡهِنَّ خَيۡرٰتٌ حِسَانٌ ۝ (الرحمٰن) (ان میں اچھی سیرت والیاں اچھی صورت والیاں ہوں گی)

اور کہا جاتا ہے: هي خيرة النساء (یہ عورتوں میں سے اچھی اور خوبصورت ہے) یہ اصل میں خیرة ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، جیسے هَيِّنة اور هَيْنة ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خیر کی جمع ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ ان کے لیے دونوں جہان کے منافع ہیں۔ اور فلاح کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور جنات سے مراد بساتین (باغات) ہیں۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اور آئے بہانہ بنانے والے بدو تاکہ اجازت مل جائے انہیں اور بیٹھ رہے وہ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ اور اس کے رسول سے، عنقریب پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے عذاب دردناک''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ، اعرج اور ضحاک نے تخفیف کے ساتھ المُعْذِرون پڑھا ہے۔ اور ابو کریب نے اسے ابو بکر سے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسے اصحاب القراءات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وجاء المُعْذِرُون تخفیف کے ساتھ پڑھتے تھے(1)، یہ اعذر سے ہے۔ اور کہتے: قسم بخدا! یہ اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: مگر یہ کہ اس (قراءت) کا مدار کلبی پر ہے۔ اور یہ اعذر سے ہے، اور اسی سے ہے قد أعذر من أنذر یعنی جو آپ کے پاس آیا اس نے عذر میں اتنا مبالغہ اور غلو کیا کہ اس نے آپ کو ڈرا دیا۔ اور رہا المعذرون تشدید کے ساتھ تو اس میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سچ بیان کرنے والا ہو۔ پس یہ المعتذر کے معنی میں ہے، کیونکہ اس کا عذر ہے۔ پس المعذرون اس بنا پر اس کی اصل المعتذرون ہے، لیکن اس میں تا کو ذال سے بدل دیا گیا ہے اور پھر اس میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت عین کو دے دی گئی ہے، جیسے یخصمون خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور المعذرون اجتماع ساکنین کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ اور میم کی اتباع میں اس کا ضمہ بھی جائز ہے۔ اسے جوہری اور نحاس نے ذکر کیا ہے، مگر یہ کہ نحاس نے اسے اخفش، فراء، ابو حاتم اور ابو عبید سے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اصل المعتذرون ہو، پھر تا کو ذال میں ادغام کر دیا گیا۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا عذر ہو۔ لبید نے کہا ہے:

إلى الحَوْل ثم إسم السلام عليكما ومن يَبْكِ حولاً كاملاً فقد اعتذر(2)

اس میں اعتذر حقیقی عذر والے کے معنی میں ہی ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ المعذر کبھی اپنے عذر میں سچا نہیں ہوتا اور یہ وہ ہوتا ہے جو بہانہ بناتا ہے اور اس کا عذر نہیں ہوتا۔ جوہری نے کہا ہے کہ یہ معذر، مفعل کے وزن پر ہے، کیونکہ یہ بیماری کا بہانہ بنانے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوتا ہے یہ بغیر عذر کے عذر پیش کرتا ہے۔ اور دوسروں نے کہا: کہا جاتا ہے عذر فلان فی أمر کذا تعذیرا یعنی اس نے کوتاہی کی اور اس میں مبالغہ نہیں کیا۔ اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے جھوٹے عذر پیش کیے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: لعن اللہ المعذرین (اللہ تعالیٰ نے بہانے بنانے والوں پر لعنت کی ہے) گویا ان کے نزدیک امر یہ ہے کہ معذر تشدید کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے عذر کو ظاہر کرنے والا، بہانہ بناتے ہوئے اس کے عذر میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

نحاس نے کہا ہے: ابو العباس محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اس میں اصل المعتذرون ہو، اور نہ ادغام جائز

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 236
2۔ ایضاً

ہے کہ اس سے التباس واقع ہو جاتا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق ادغام سے اجتناب کیا گیا ہے کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی مذمت کی گئی ہے ان کا کوئی عذر نہیں ہے، فرمایا: کیونکہ وہ آئے تاکہ انہیں اجازت دی جائے۔ اور اگر وہ ضعیف اور مریض ہوتے اور وہ ہوتے جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے تو انہیں اجازت طلب کرنے کی حاجت اور ضرورت نہ تھی۔ نحاس نے کہا ہے: معذرۃ، اعذار اور تعذیر کی اصل ایک شے سے ہے اور وہ اس میں سے ہے جو مشکل اور معتذر ہوتی ہے۔ اور عربوں کا قول ہے: مَنْ عَذِیرِی من فلان اس کا معنی ہے تحقیق اس نے امر عظیم سرانجام دیا وہ یہ استحقاق رکھتا ہے کہ میں اسے اس پر اچھا بدلہ دوں اور لوگوں کو اس کے بارے علم نہ ہو (پس کون مجھے معذور جانے گا) اگر میں نے اسے اچھا بدلہ دیا۔ پس تخفیف کی قراءت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بہانے کے ساتھ پیچھے رہ گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرما دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ عامر بن طفیل کا گروہ تھا (1) انہوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم آپ کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں تو طئی قبیلے کے بدو ہماری بیویوں، ہماری اولاد اور ہمارے مویشیوں پر حملہ کر دیں گے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذر کو قبول کر لیا۔ اور تشدید کی قراءت کی بنا پر دوسرے قول میں کہا ہے: وہ غفار قبیلے کے لوگ تھے انہوں نے اپنے عذر پیش کیے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذروں کو قبول نہ کیا، کیونکہ آپ کو علم تھا کہ یہ سچے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور ایک قوم بغیر عذر کے بیٹھ گئی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جرأت کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور فرمایا: وَ قَعَدَ الَّذِیْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ان کے جھوٹ سے مراد ان کا یہ قول ہے: بے شک ہم مومن ہیں اور لیؤذن کو لام کی کے سبب نصب دی گئی ہے۔

لَیْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّ لَا عَلَى الَّذِیْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

”نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو نہیں پاتے وہ مال جسے خرچ کریں (اگر یہ پیچھے رہ جائیں) کوئی حرج جب کہ وہ مخلص ہوں اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے، نہیں ہے نیکوکاروں پر الزام کی کوئی وجہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور نہ ان پر (کوئی الزام ہے) جو جب حاضر ہوئے آپ کے پاس تاکہ آپ سوار کریں انہیں تو فرمایا آپ نے: میں نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ وہ لوٹتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں بہا رہی ہوتی ہیں آنسو اس غم میں کہ افسوس! نہیں ان کے پاس جو وہ خرچ کریں“۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 93

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ الآیہ، یہ ارشاد عاجز آدمی سے تکلیف اور پابندی کے ساقط ہونے میں اصل ہے۔ پس ہر وہ جو کسی شی سے عاجز ہو تو وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے، کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو فعل ہوتا ہے اور کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو کہ تاوان اور جرمانہ ہوتا ہے اور قوت و طاقت کے اعتبار سے عاجز ہونے یا مال کے اعتبار سے عاجز ہونے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ:286) (ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی) اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ (النور:61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے)

ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام کو چھوڑا ہے کہ تم نے کوئی سفر طے نہیں کیا اور نہ تم نے نفقہ میں سے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی عبور کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ ہیں''۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انہیں عذر نے روک لیا ہے''(1)۔ پس اس آیت نے اور اس کے ساتھ اس کی نظائر میں سے جو ہم نے ذکر کی ہیں یہ واضح کر دیا ہے کہ معذوروں پر کوئی حرج نہیں اور یہ وہ قوم ہے جن کا عذر معروف ہے مثلاً اپاہج ہونا، بوڑھا ہونا، نابینا ہونا، لنگڑا ہونا اور وہ اقوام جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ پائیں۔ تو فرمایا: ان تمام پر کوئی حرج نہیں ہے۔

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ جب وہ حق کو پہچان لیں اور اس کے اولیاء سے محبت کریں اور اس کے دشمنوں سے بغض رکھیں۔ علماء نے کہا ہے: پس حق سبحانہ وتعالیٰ نے عذر والوں کو معذور قرار دیا ہے اور دلوں نے اسے برداشت نہ کیا، چنانچہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ احد کے لیے نکلے اور مطالبہ کیا کہ علم انہیں عطا کیا جائے لیکن اسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا ہوا تھا۔ پس کفار میں سے ایک آدمی آیا اور اس نے ان کے اسی ہاتھ پر تلوار ماری جس میں وہ علم پکڑے ہوئے تھے تو اس نے اسے کاٹ دیا، آپ نے دوسرے ہاتھ کے ساتھ اسے پکڑ لیا پھر اس نے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو آپ نے اسے اپنے سینے سے تھام لیا اور یہ آیت پڑھی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران:144) (اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول) یہ اس قوم کے عزائم تھے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ (النور:61) اور یہ اول کے بارے میں ہے۔ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ (النور:61) اور حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ انصار کے نقباء میں سے تھے آپ لنگڑے تھے اور آپ لشکر کے اگلے حصہ میں موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں معذور قرار دیا ہے''۔ تو انہوں نے عرض کی: قسم بخدا! میں یقیناً اپنے اسی لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں نشان زد کرتے ہوئے چلوں گا۔ اس سورت میں اس طرح کی مثالیں گزر چکی ہیں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 340

جن میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کسی آدمی کو اس حال میں لایا جاتا تھا جیسے دو آدمیوں کے درمیان سہارا دے کر چلایا جاتا تھا یہاں تک کہ اسے صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا نَصَحُوْا، النصح کا معنی ہے اخلاص العمل من الغش عمل کا کسی کدورت کی آمیزش سے خالص ہونا اور اسی سے ہے التوبة النصوح (خالص توبہ) ہے۔ نفطویہ نے کہا ہے: جب کوئی شے خالص ہو تو کہا جاتا ہے: نصح الشئ اور نصح له القول کا معنی ہے اس نے بات کو اس کے لیے خالص کر دیا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحة (دین نصیحت (خالص) ہے) آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ ہم نے عرض کی: کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا: للہ ولکتابه ولرسوله ولائمة المسلمین وعامهم (1) (اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، ائمہ مسلمین کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے) علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے خالص ہونے کا معنی یہ ہے اس کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا، اسے صفات الوہیت کے ساتھ متصف کرنا، اسے نقائص سے پاک اور منزہ تسلیم کرنا، اس کی پسندیدہ چیزوں میں رغبت رکھنا اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے دور رہنا۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کرنا، امر و نہی میں نبی کی اطاعت کو لازم پکڑنا، ان سے محبت کرنا جن سے وہ محبت کرے، ان سے عداوت رکھنا جن سے وہ عداوت رکھے، اس کی عزت و توقیر کرنا، ان سے محبت کرنا اور ان کی آل سے محبت کرنا، ان کی تعظیم کرنا اور ان کی سنت کی تعظیم کرنا، نبی کے وصال کے بعد سنت سے بحث کر کے سنت کو زندہ کرنا، اس میں خوب غور و فکر کرنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی اطاعت کرنا، اس کی طرف دعوت دینا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ سے آراستہ اور مزین ہونا۔ اسی طرح کتاب اللہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے: اسے پڑھنا اور اس میں غور و فکر کر کے اسے سمجھنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی تعلیم دینا، اس کی تکریم کرنا اور اس کے مطابق عادات واخلاق سے آراستہ ہونا۔ اور مسلمانوں کے ائمہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے ان کے خلاف خروج نہ کرنا، حق کی طرف ان کی رہنمائی کرنا، مسلمانوں کے امور میں سے جس امر سے وہ غافل ہوں اس پر انہیں متنبہ کرنا، ان کی اطاعت کو لازم پکڑنا اور ان کے حق کے اثبات میں کوشش کرنا۔ اور عام مسلمانوں کے لیے خالص ہونے کا معنی ہے، ان کی عداوت اور دشمنی ترک کرنا، ان کی رہنمائی کرنا اور ان میں سے نیکوکاروں سے محبت کرنا، ان تمام کے لیے دعا کرنا اور ان تمام کے لیے خیر اور بھلائی کا ارادہ کرنا۔ اور حدیث صحیح میں ہے: ”مومنوں کی باہم ایک دوسرے سے محبت کرنے، آپس میں رحم کرنے اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے کی مثال ایک بدن اور جسم کی مثل ہے جب اس میں سے کوئی عضو شکایت کرے تو سارا بدن اس کے لیے جاگنے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے“ (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ، مِنْ سَبِيْلٍ یہ ما کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی من طریق الی العقوبة (یعنی نیکوکاروں پر سزا کا کوئی راستہ نہیں ہے) یہ آیت ہر نیکوکار سے سزا کے اٹھ جانے (ختم ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 54
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 321

جانے) کے بارے میں اصل ہے۔ اسی لیے ہمارے علماء نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنا ہاتھ کاٹنے والے سے قصاص (بدلہ) لیتا ہے پھر وہ اسے سرایت میں جان سے ہلاک کرنے تک پہنچا دیتا ہے تو بلاشبہ اس کے لیے کوئی دیت نہیں، کیونکہ وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والے سے قصاص لینے میں محسن ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لیے دیت لازم ہوگی۔ اور اسی طرح جب کوئی نر کسی آدمی پر حملہ کردے اور وہ اسے اپنی جان کی دفاع میں قتل کردے تو اس پر کوئی ضمان نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے مالک کے لیے قیمت اس پر لازم ہوگی۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اسی طرح تمام مسائل شرعیہ میں گفتگو ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عرباض بن ساریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ عائذ بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی مقرن کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے، وہ سات بھائی تھے تمام کے تمام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے، اور ان کے علاوہ کوئی بھی سات بھائی صحابہ میں شامل نہ تھے اور وہ نعمان، معقل، عقیل، سوید اور سنان تھے اور ساتویں کا نام ذکر نہیں کیا گیا (قاموس میں مذکورہ پانچ کے علاوہ عبد اللہ اور عبد الرحمن کے دو نام بھی ہیں) یہ مقرن کے بیٹے تھے مزینہ سے ان کا تعلق تھا۔ ساتوں بھائیوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہوئے اور اس اعزاز میں ان کے سوا کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا، اسے ابن عبد البر اور ایک جماعت نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام غزوۂ خندق میں حاضر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان سات افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو مختلف پیٹوں سے تھے اور وہ روتے ہوئے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں، لیکن آپ نے ایسی کوئی شے نہ پائی جس پر آپ انہیں سوار کرتے۔ ''پس وہ واپس لوٹے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھی اس غم میں کہ افسوس ان کے پاس وہ نہیں جو وہ خرچ کریں''۔ پس انہیں رونے والوں کا نام دیا گیا (یعنی بکائین) اور وہ سالم بن عمیر، بنی عمرو بن عوف میں سے اور علیہ بن زید، بنی حارثہ میں سے تھے۔ اور ابو لیلیٰ عبد الرحمن بن کعب بنی مازن بن نجار میں سے، عمرو بن حمام بنی سلمہ میں سے اور عبد اللہ بن مغفل مزنی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ عبد اللہ بن عمرو مزنی تھے اور ہرمی بن عبد اللہ بنی واقف میں سے اور عرباض بن ساریہ فزاری تھے، اسی طرح ابو عمر نے ''کتاب الدرر'' میں ان کے نام ذکر کیے ہیں۔ اور ان میں اختلاف ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: معقل بن یسار اور صخر بن خنسا اور عبد اللہ بن کعب انصاری، سالم بن عمیر، ثعلبہ بن غنمہ اور عبد اللہ بن مغفل اور دوسرے تھے۔ انہوں نے کہا: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق آپ نے ہمیں اپنے ساتھ نکلنے کی دعوت دی ہے۔ پس آپ ہمیں ''تیز رفتار گھوڑوں اور چمڑے کے نعلوں پر سوار کیجئے ہم آپ کی معیت میں جنگ لڑیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں کوئی چیز نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں'' پس وہ واپس چلے اس حال میں کہ وہ رو رہے تھے۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 995 2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 239

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ آپ انہیں سواریوں پر سوار کریں (1)، اس وقت ایک آدمی کو دو اونٹوں کی ضرورت تھی، ایک اونٹ جس پر وہ سوار ہوگا اور ایک اونٹ پر وہ اپنا پانی اور زادراہ لادے گا کیونکہ سفر دور کا تھا۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابوموسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ سے سواری کا مطالبہ کریں۔ اور آپ نے ذرا غصے کی حالت میں موافقت کی اور فرمایا: ''قسم بخدا! میں تمہیں سوار نہیں کروں گا اور نہ میں کوئی ایسی شے پاتا ہوں جس پر میں تمہیں سوار کروں'' (2)۔ پس وہ روتے ہوئے واپس چلے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور انہیں اونٹ عطا فرمائے۔ تو حضرت ابوموسیٰ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے قسم نہیں کھائی تھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان شاء اللہ میں جو قسم بھی کھاتا ہوں اور پھر اس کے غیر کو بہتر اور اچھا دیکھتا ہوں تو میں وہ کرتا ہوں جو بہتر اور اچھا ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں'' (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے، اسے بخاری اور مسلم نے انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور مسلم میں یہ بھی ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا اور ہمارے لیے پانچ سفید کوہانوں والے اونٹوں کا حکم دیا...... الحدیث۔ اور اس کے آخر میں ہے: ''پس تم چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سوار کر دیا ہے'' (4)۔ اور حسن نے بھی اور بکر بن عبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ سواری کا مطالبہ لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ جرجانی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے ای ولا علی الذین إذا ما أتوك لتحملهم وقلت لا أجد (اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں جب وہ آپ کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں اور آپ نے یہ کہا: میں نہیں پاتا) پس یہ مبتدا ہے اور یہ اپنے ماقبل پر بغیر واؤ کے معطوف ہے اور جواب تولوا ہے۔

وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ یہ جملہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ حزنا یہ مصدر ہے۔ **اَلَّا يَجِدُوْا** یہ ان کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: فراء نے کہا ہے ان لا یجدون بھی جائز ہے۔ اور وہ لا بمعنی لیس بناتے ہیں اور وہ بصریوں کے نزدیک أنهم لا یجدون کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جو وہ چیز نہ پائے جسے وہ اپنے غزوہ میں خرچ کر سکے تو وہ اس پر واجب نہیں ہے۔ اور ہمارے علماء نے کہا ہے: جب آدمی کی عادت مانگنا اور سوال کرنا ہو تو پھر اس پر لازم ہوتا ہے جیسا کہ حج۔ اور وہ عادت کے مطابق نکلا کیونکہ اس کی حالت جب تبدیل نہیں ہوئی تو اس کی طرف فرض اسی طرح متوجہ ہوگا جیسا کہ فرض نفقہ پانے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اسی قول باری تعالیٰ: **وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ** میں وہ موجود ہے جس کے ساتھ احوال کے قرائن پر استدلال ہوتا ہے، پھر ان سے وہ بھی جو علم ضروری کا فائدہ دیتے ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو تردید کا احتمال رکھتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 95
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 980
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47

ہیں۔ پس پہلی قسم جیسا کہ جو آدمی گھر کے پاس سے گزرے تحقیق اس میں رونے کی آواز بلند ہو، رخسار نوچیں جا رہے ہوں، بال مونڈ دیئے گئے ہوں اور آوازیں انتہائی بلند ہوں، گریبان چاک کر دیئے گئے ہوں اور وہ گھر کے مالک کو یا ثبورا (ہائے ہلاکت) پکار رہے ہوں، تو اس سے یقیناً جان لیا جائے گا کہ وہ مر گیا ہے۔ اور رہی دوسری قسم تو یہ حکام کے دروازوں پر یتیموں کے آنسو بہانے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ۞ (یوسف) (اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے) اور وہ جھوٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ (یوسف: 18) (اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر) اور اس کے ساتھ چونکہ ایسے قرائن ہیں جن کے سبب غالب طور پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور ظاہر اور غالب احوال کی بنا پر اس پر شہادات کی بنا رکھی جا سکتی ہے(1)۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا اشتبكتْ دموعٌ في خدودٍ　　تبيّن مَنْ بكَى ممن تباكَى

یہ معنی عنقریب سورۂ یوسف میں تفصیلاً آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞

''الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو اجازت مانگتے ہیں آپ سے حالانکہ وہ مال دار ہیں، وہ راضی ہو گئے اس پر کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر پس وہ (کچھ) نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا السَّبِيْلُ بے شک سزا اور گناہ ان پر ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ مراد منافقین ہیں، ان کے افعال بد سے ڈرانے کے لیے برائے تاکید ان کا دوبارہ ذکر کیا۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞

''وہ بہانے پیش کریں گے تمہارے پاس جب تم لوٹ کر جاؤ گے ان کی طرف، فرمایئے: بہانے مت بناؤ ہم نہیں اعتبار کریں گے تم پر، آگاہ کر دیا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خبروں پر۔ اور دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارا عمل اور اس کا رسول پھر لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے''۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 996

قولہ تعالیٰ: یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ یعنی منافقین بہانے پیش کریں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ یعنی ہم ہرگز تمہاری بات تسلیم نہیں کریں گے۔ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے رازوں اور خفیہ باتوں کے بارے خبر دے دی ہے۔ وَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ اور اللہ تعالیٰ تمہارا عمل دیکھے گا اس بارے میں جو تم نیا کرو گے۔ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی وہ تمہیں تمہارے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

”وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی طرف تاکہ تم معاف کر دو انہیں، سو منہ پھیر لو ان سے، یقیناً وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْهِمْ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم تبوک سے ان کی طرف لوٹو گے۔ اس میں محلوف علیہ محذوف ہے، یعنی وہ قسمیں کھائیں گے کہ وہ نکلنے پر قادر نہ تھے۔ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ تاکہ تم انہیں ملامت کرنے سے درگزر کرو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تم ان سے کلام نہ کرو۔ اور حدیث میں ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے آئے تو آپ نے فرمایا: ”نہ تم ان کے ساتھ بیٹھو اور نہ ان سے کلام کرو“ (1)۔ اِنَّهُمْ رِجْسٌ یعنی ان کا عمل ناپاک اور پلید ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: انهم ذو رجس یعنی ان کا عمل قبیح اور برا ہے۔ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کی منزل اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: ماوی سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس میں رات یا دن کے وقت کوئی شے پناہ لیتی ہے۔ وقد أوی فلاں الی منزلہ یأوی أویا (تحقیق فلاں نے اپنے گھر میں پناہ لی) یہ فعول کے وزن پر ہے اور اواء بھی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (ہود: 43) (میں پناہ لے لوں گا پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے) اور آویتہ أنا ایواء و أویتہ جب تو اسے اپنے ساتھ اتارے۔ یہ فعلت اور افعلت دونوں ایک معنی میں ہیں۔ یہ ابو زید نے کہا ہے۔ اور ماوی الإبل (واؤ کے کسرہ کے ساتھ) ایک لغت ہے جو مأوی الإبل میں خاص ہے اور یہ شاذ ہے۔

یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۹۶﴾

”وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے“۔

عبداللہ بن ابی نے قسم کھائی کہ وہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہے گا اور اس نے خواہش یہ کی کہ آپ اس سے راضی اور خوش ہو جائیں۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 96

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''اعرابی زیادہ سخت ہیں کفر اور نفاق میں اور حق دار ہیں کہ نہ جانیں وہ احکام جو نازل کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کے منافقین کے احوال ذکر کیے تو ان بدوؤں اور اعرابیوں کے احوال بھی ذکر کیے جو مدینہ طیبہ سے باہر اور دور تھے۔ پس فرمایا: ان کا کفر انتہائی شدید اور سخت ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کیونکہ وہ سنن کی معرفت سے بہت دور تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ وہ دل کے اعتبار سے سخت، قول کے اعتبار سے انتہائی خشک، مزاج کے لحاظ سے انتہائی اکھڑ اور قرآن کے سماع سے بہت دور تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا: وَّ اَجْدَرُ یعنی اور حق دار ہیں (موزوں اور مناسب ہے) اَلَّا يَعْلَمُوْا اس میں أن با کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ تو کہتا ہے: جدیر بأن تفعل وأن تفعل (تیرے لیے مناسب ہے کہ تو اس طرح کرے) پس جب با کو حذف کر دیا گیا تو یہ درست نہیں ہوا مگر أن کے ساتھ، اور اگر با کو لے آئیں تو پھر یہ أن کے ساتھ بھی اور اس کے بغیر بھی درست ہے۔ تو کہتا ہے: أنت جدیر أن تقوم و جدیر بالصیام اور اگر تو کہے: أنت جدیر القیام تو یہ غلط ہے۔ اور بلاشبہ أن کے ساتھ درست ہے کیونکہ أن استقبال پر دلالت کرتا ہے تو گویا یہ محذوف کے عوض ہے۔ حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مراد شریعت کے فرائض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ربوبیت اور رسولوں کی بعثت میں اللہ تعالیٰ کی دلیلیں ہیں (یعنی) اپنی قلت نظر و فکر کی وجہ سے (وہ انہیں نہ جانیں)

مسئلہ نمبر 2۔ جب صورت حال اس طرح ہے اور یہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے ناقص ہونے اور مرتبہ کاملہ سے ان کے گرے ہوئے ہونے پر دلیل ہے تو پھر اس پر تین احکام مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں کوئی حق نہیں، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث ہے۔ اس میں ہے: ''پھر تم انہیں دعوت دو اپنے گھروں سے مہاجرین کے گھروں کی طرف منتقل ہونے کی اور انہیں بتاؤ کہ انہوں نے اگر اس طرح کیا تو اس کے لیے وہ حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے لیے ہیں اور ان پر وہ فرائض ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں پس اگر وہ وہاں سے منتقل ہونے اور پھرنے سے انکار کر دیں تو پھر انہیں بتا دو کہ وہ مسلمان اعرابیوں کی طرح ہوں گے ان پر اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جاری ہوگا جو مومنوں پر جاری ہوتا ہے اور ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں سے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں'' (2)۔

(۲) شہریوں کے بارے جنگل میں رہنے والوں کی شہادت کو ساقط کرنا اس لیے ہے کیونکہ اس میں تہمت متحقق اور ثابت ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے انہوں نے فرمایا: کیونکہ ہر تہمت کی رعایت اور لحاظ نہیں رکھا جاتا اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 8 2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 82

تمام کے تمام مسلمان آپ کے نزدیک صفت عدالت پر ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ (شاہد) عادل اور پسندیدہ ہو اور یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے اسے سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے یہاں اعرابیوں کو تین اوصاف سے متصف کیا ہے: ان میں سے ایک کفر اور نفاق کے ساتھ۔ دوسرا اس کے ساتھ کہ وہ ایسا مال لیتا ہے جسے وہ تاوان میں خرچ کرتا ہے اور تمہارے بارے میں مصائب و آفات کا انتظار کرتا ہے۔ اور تیسرا اس کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور ایسا مال جمع کرتا ہے جسے وہ ایسے امور میں خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربت کا سبب ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور خوشنودی کا ذریعہ ہیں۔ پس وہ جو اس صفت کے ساتھ متصف ہے تو اس کے بارے میں تو بعید ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے کہ اسے دوسرے اور پہلے فریق کے ساتھ ملا دیا جائے۔ یہ باطل ہے۔ اور اس بارے میں گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

(۳) کہ ان کا اہل شہر کی امامت کرانا ممنوع ہے، کیونکہ یہ سنت سے جاہل اور جمعہ کو ترک کرنے والے ہیں۔ ابو مجلز نے اعرابی کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ امامت نہیں کرائے گا اگرچہ وہ ان سے بڑھ کر قاری ہو۔ اور حضرت سفیان ثوری، امام شافعی، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اعرابی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے جب وہ نماز کی حدود قائم کرے۔

قولہ تعالیٰ: اَشَدُّ اس کی اصل اشدد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ کُفْرًا یہ بیان (تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّنِفَاقًا یہ اس پر معطوف ہے۔ وَّاَجْدَرُ اس کا عطف اَشَدُّ پر ہے اور اس کا معنی ہے اخلق (زیادہ لائق اور مناسب ہونا) کہا جاتا ہے: فلان جدیر بکذا ای خلیق به (فلاں اس کے لائق اور مناسب ہے) اور أنت جدیر أن تفعل کذا (تیرے لیے مناسب اور لائق ہے کہ تو اس طرح کرے) اس کی جمع جدراء اور جدیرون ہے۔ اور اس کی اصل جدار الحائط سے ہے اور اس سے مراد دیوار کو بنیاد سے اٹھانا ہے۔ پس اس کا قول: هو اجدر بکذا کا معنی ہے وہ اس کے زیادہ قریب ہے اور وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اَلَّا یَعْلَمُوْا یہ اصل میں بأن لا یعلموا ہے۔ اور عرب: لوگوں کی نسل ہیں اور ان کی طرف عربی کی نسبت عردبہ کے درمیان ہے اور وہ اہل امصار (شہروں میں رہنے والے) ہیں اور ان میں اعراب صرف جنگل میں رہنے والے ہیں۔ اور شعر فصیح میں اعاریب آیا ہے۔ اور اعراب کی طرف نسبت سے اعرابی ہوا کیونکہ اس کی واحد کوئی نہیں اور اعراب عرب کی جمع نہیں ہے جیسا کہ انباط انبط کی جمع ہے، بلکہ عرب اسم جنس ہے۔ اور عرب عاربہ وہ ہیں جو ان میں سے خالص ہیں۔ اسے اپنے ہی لفظ سے لے کر اس کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے، جیسے تیرا قول: لیل لائل اور بسا اوقات انہوں نے کہا: العرب العرباء اور تعرب کا معنی ہے عرب کے ساتھ مشابہ ہونا۔ اور تعرب بعد هجرته یعنی اپنی ہجرت کے بعد وہ اعرابی ہو گیا۔ اور العرب المستعربه وہ ہیں جو خالص نہیں ہیں۔ اور اسی طرح متعربه ہیں۔ اور العربیه یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور یعرب بن قحطان نے سب سے پہلے عربی میں گفتگو کی اور وہ سارے یمن کا باپ ہے۔ اور العُرب اور العَرب دونوں ایک ہیں، جیسے العُجم اور العَجم ہیں۔ اور العُریب، العرب کی تصغیر ہے۔ شاعر کا قول ہے:

وَمَكَّن الضِّباب طعام العُرَيبِ . ولا تَشْتَهِيه نفوسُ العَجَم

بلا شبہ تعظیماً ان کی تصغیر بنائی، جیسا کہ کہا: أنا جُذَيْلُها المحكك وعُذَيْقُها المُرَجَّب میں امور کا تجربہ کار اور ان کا پاسبان ہوں (اس لکڑی کی مثل جو اجرب اونٹ کی خارش کے لیے گاڑھی جاتی ہے اور اس کھجور کے درخت کی طرح جس کے اردگرد حفاظت کے لیے پتھروں کی منڈیر بنادی جائے)

قشیری نے بیان کیا ہے کہ عربی کی جمع عرب ہے اور اعرابی کی جمع اعراب اور اعاریب ہے۔ اور اعرابی کو جب کہا جائے یا عربی تو وہ خوش ہوتا ہے اور عربی کو جب کہا جائے: یا اعرابی تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اور مہاجرین و انصار عرب ہیں اعراب نہیں۔ اور عرب کا نام عرب رکھا گیا کیونکہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں جنہوں نے عربہ میں نشوونما پائی اور یہ تہامہ میں سے ہے پس وہ اس کی طرف منسوب ہوئے اور قریش عربہ میں مقیم ہوئے اور وہ مکہ مکرمہ ہے اور تمام عرب اس کے جزیرہ میں پھیل گئے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞

''اور بعض بدو ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جو وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور منتظر ہیں تمہارے لیے (زمانہ کی) گردشوں کے (حقیقت میں) انہی پر ہے بری گردش اور اللہ تعالیٰ سمیع (و) علیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ اس میں من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا یہ دو مفعول ہیں: تقدیر کلام ینفقه ہے۔ پھر طول اسم کی وجہ سے ہا کو حذف کردیا گیا ہے۔ مغرما اس کا معنی تاوان اور خسارہ ہے۔ اس کا اصل معنی کسی شی کا لازم ہونا ہے۔ اور اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۞ (الفرقان) اس میں غراما بمعنی لازماً ہے، یعنی جو وہ جہاد اور صدقہ میں خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور اس پر کسی ثواب کی امید نہیں رکھتے۔ وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ اس میں التربص کا معنی انتظار کرنا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوائر، دائرۃ کی جمع ہے، اس سے مراد وہ حالت ہے جو نعمت سے آزمائش اور مصیبت کی طرف بدلی ہوئی ہو، یعنی وہ جہالت کے سبب خرچ کرکے باطن کی برائی اور دل کے خبث کو جمع کرتے ہیں۔ عَلَيْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ اسے ابن کثیر اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ الفتح میں سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے(1)۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ (مریم:28) میں سین کے فتحہ پر اجماع کیا ہے۔ اور دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ السوء ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یعنی ان پر ہزیمت (شکست) اور شر کی گردش ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ان پر عذاب و بلاء کی گردش ہے۔ دونوں نے کہا ہے: امرا سوء ضمہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ نہیں کہا جاتا: هو امرء عذاب ولا شر۔ اور محمد ابن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: السوء فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی رداءۃ ردی ہونا اور گھٹیا ہونا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: مررت برجل صدق اس کا معنی ہے میں ایک صالح آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور یہ صدق اللسان (زبان کا سچا ہونا) میں سے نہیں ہے اگرچہ وہ زبان کا سچا ہو کیونکہ تو یہ بھی کہتا ہے: مررت بثوب صدق (میں نے اچھا کپڑا دیکھا) اور مررت برجل سوٗ اس سے مراد اس کی ابتلاء اور عذاب نہیں، بلکہ اس کا معنی ہے میں ایک فسادی آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور فراء نے کہا ہے: السوء فتحہ کے ساتھ مصدر ہے سوتہ سوأ و مساءۃ و سوائیۃ۔ دوسروں نے کہا ہے: اس سے فعل ساء یسوء ہے۔ اور السوء ضمہ کے ساتھ اسم ہے مصدر نہیں اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: علیهم دائرۃ البلاء والمکروہ (ان پر ابتلاء اور مکروہ کی گردش ہے)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾

"اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں الله پر اور روز قیامت پر اور سمجھتے ہیں جو وہ خرچ کرتے ہیں قرب الٰہی اور رسول (پاک) کی دعائیں لینے کا ذریعہ ہے، ہاں ہاں وہ ان کے لیے باعث قرب ہے، ضرور داخل فرمائے گا انہیں الله تعالیٰ اپنی رحمت میں، بے شک الله تعالیٰ غفور ورحیم ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جنہوں نے الله تعالیٰ کو سچ تسلیم کیا ہے اور ان سے مراد مزینہ قبیلے کے بنو مقرن ہیں۔ اس کا ذکر مہدوی نے کہا ہے۔ قربات یہ قربۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کے سبب الله تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جمع قرب، قُربات، قَربات اور قُرُبات ہے۔ اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور القربات ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ الله تعالیٰ کے قریب ہوا جاتا ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: قربت لله قربانا (میں الله تعالیٰ کے انتہائی قریب ہوا) اور القربۃ قاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مشکیزہ ہے جس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ یہ تھوڑی تعداد میں ہوں تو جمع قربات، قِربات اور قربات آتی ہے، اور کثیر تعداد کے لیے قرب آتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس کی جمع آتی ہے جو فعلۃ کے وزن پر ہو، مثلاً سدرۃ اور فقرۃ، تیرے لیے عین کلمہ کو فتح دینا، کسرہ دینا اور سکون دینا سب جائز ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور نافع نے ورش کی روایت میں قربۃ را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اصل ہے۔ اور باقیوں نے اسے تخفیفاً سکون کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً کتب اور رسل اور قربات میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن سعدان نے بیان کیا ہے کہ یزید بن القعقاع نے الا انها قربۃ لهم پڑھا ہے۔ اور وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ کا معنی رسول کا استغفار کرنا اور دعا کرنا ہے۔ اور صلوٰۃ کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے پس الله تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ کا معنی رحمت فرمانا اور خیر و برکت عطا کرنا ہے۔

الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (الاحزاب: 43) (الله وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم

پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں)) اور ملائکہ کی طرف سے صلوٰۃ کا مطلب دعا کرنا ہے(1)۔
اور اسی طرح یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بھی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ:103) (نیز دعا مانگیے ان کے لیے بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے) یعنی آپ کی دعا ان کے لیے ثابت قدمی اور طمانیت کا باعث ہے۔ أَلَآ إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ یعنی ان کے اخراجات انہیں اللہ تعالیٰ کے رحمت کے قریب کرتے ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے اعرابیوں کی اقسام ذکر کیں تو پھر اس نے مہاجرین وانصار کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ ان میں سے پہلے پہلے ہجرت کرنے والے بھی ہیں اور ان میں سے ان کی اتباع اور پیروی کرنے والے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی۔ تحقیق ان کے طبقات اور ان کی اصناف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ہم اس میں سے کچھ ذکر کریں گے اور اس میں غرض اور مدعیٰ بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے وَالْاَنْصَارُ کو السّٰبِقُوْنَ پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے(2)۔ اخفش نے کہا ہے: الْاَنْصَارِ میں جر اور کسرہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقون مہاجرین وانصار دونوں میں سے تھے۔ اور الْاَنْصَارِ اسلامی نام ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: تمہارے لیے لوگوں کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے۔ الْاَنْصَارِ کیا یہ نام اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے یا زمانہ جاہلیت میں تمہیں اس کے ساتھ پکارا جاتا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا: بلکہ یہ وہ اسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں یاد فرمایا ہے۔ اسے ابو عمر نے ''الاستذکار'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ مہاجرین وانصار میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے پر قرآن کریم کی نص موجود ہے۔ اور وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے قول کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو بیعت رضوان میں حاضر ہوئے اور اس سے مراد

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

بیعت حدیبیہ ہے۔ یہ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (1)۔ اور محمد بن کعب اور عطا بن یسار نے کہا ہے: وہ اہل بدر ہیں۔ اور تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جس نے تحویل قبلہ سے پہلے ہجرت کی تو وہ مہاجرین اولین میں سے ہے اس میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اور رہے ان میں سے افضل تو وہ یہ ترتیب ہے:

مسئلہ نمبر 3۔ ابو منصور بغدادی تمیمی نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہوا ہے کہ ان میں افضل خلفائے اربعہ ہیں، پھر باقی چھ دس کی تکمیل تک، پھر اصحاب بدر، پھر اصحاب احد پھر بیعت رضوان یا حدیبیہ والے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا وہ جوان میں سے سب سے اول اسلام لایا تو مجالد نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، لوگوں میں اسلام لانے کے اعتبار سے اول کون ہے؟ تو انہوں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ کیا تو نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قول نہیں سنا:

إذا تذكرت شجوًا من أخي ثقة فاذكر أخاك أبابكر بما فعلا

جب تو قابل اعتماد اور ثقہ بھائی کے کارناموں اور جرأت کا تذکرہ کرے تو اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں کا ذکر کر جو انہوں نے کیے۔

خيرَ البرية أتقاها وأعدلها بعد النبيّ وأوفاها بما حَمَلا

وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقویٰ اور عدل کے اعتبار سے ساری مخلوق سے بہتر اور افضل ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں پورا کرنے والے ہیں۔

الثانيَ التاليَ المحمود مشهدُه و أوّلَ الناس منهم صدّق الرسلا (2)

وہ دوسرے ہیں، پیچھے آنے والے ہیں ان کی شہادت قابل ستائش ہے اور لوگوں میں سے سب سے پہلے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

اور ابو الفرج علامہ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف بن یعقوب بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے اپنے باپ اور اپنے مشائخ محمد بن منکدر، ربیعہ بن ابی عبدالرحمن، صالح بن کیسان، سعد بن ابراہیم، عثمان بن محمد اخنسی کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ اس بارے میں ذرا شک نہ کرتے تھے کہ قوم میں سے سب سے اول اسلام قبول کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہی قول حضرت ابن عباس، حضرت حسان اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے اول اسلام لایا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں (3)۔ حضرت زید ابن ارقم، حضرت ابوذر اور حضرت مقداد وغیرہم رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے، حاکم ابو عبداللہ نے کہا ہے: میں اصحاب تواریخ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے پہلے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 98 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1003 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 98

اسلام لائے وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں (1)۔ معمر نے حضرت زہری سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت سلیمان بن یسار، عروہ بن زبیر اور عمران بن ابی انس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا (2)۔ یہ کئی اسناد سے حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور یہی قول حضرت قتادہ، محمد بن اسحاق بن یسار اور ایک جماعت کا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور ثعلبی مفسر نے اس پر علماء کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے اسلام لائیں اور ان کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد کون اسلام لایا؟ اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ حنظلی ان روایات کے درمیان تطبیق کرتے ہیں، پس وہ فرماتے ہیں: مردوں میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلام لائے، عورتوں میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آزاد کیے ہوئے غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ (3) (سب سے پہلے اسلام لائے)۔ واللہ اعلم

اور محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے کہ مجھے مصعب بن ثابت نے خبر دی ہے انہوں نے کہا مجھے ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور وہ چوتھے یا پانچویں اسلام قبول کرنے والے فرد ہیں۔ لیث بن سعد نے بیان کیا ہے اور ابوالاسود نے مجھے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اس وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سات سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی عمر دس برس تھی۔

مسئلہ نمبر 5۔ محدثین کے طریقہ میں سے معروف یہ ہے کہ ہر وہ مسلمان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار کیا وہ آپ کے اصحاب میں سے ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ جس مسلمان نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی یا آپ کا دیدار کیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے ہے (4)۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کسی کو صحابی شمار نہ کرتے تھے مگر اسے جو ایک یا دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقیم رہا اور آپ کی معیت میں ایک یا دو غزوؤں میں شریک ہوا۔ اگر حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ قول صحیح ہے تو پھر یہ لازم کرتا ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو یا جو کوئی اس ظاہری شرط کے نہ پائے جانے میں ان کے ساتھ شریک ہے انہیں صحابہ کرام میں شمار نہ کیا جائے حالانکہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں صحابہ کرام میں سے شمار کرنے میں ہمیں کوئی اختلاف معلوم نہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مہاجرین میں سے اوّل السابقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور علامہ ابن عربی نے بیان کیا ہے: یہ سبقت تین چیزوں کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ الصِّفَة اور وہ ایمان ہے (5) اور زمان و مکان۔ ان وجوہ میں اصل صفات میں سبقت لینا ہے۔ اور اس پر دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو صحیح میں موجود ہے۔ "ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 99　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 515　　5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002

بعد میں آنے والے اوّلون ہیں مگر یہ کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہمیں کتاب ان کے بعد دی گئی پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے لیے ہدایت اور رہنمائی فرمائی پس یہودیوں کے لیے آنے والا کل ہے اور عیسائیوں کے لیے آنے والے کل کے بعد آنے والا دن (یعنی پرسوں) ہے" (1)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ سابقہ امم میں سے جنہوں نے زمان کے اعتبار سے ہم سے سبقت لی ہے تو ہم ایمان، اللہ تعالیٰ کے امر کی پیروی، اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری، اس کے امر کو تسلیم کرنے، اس کی تکلیف کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرنے اور اس کے فرائض و ذمہ داریوں کو برداشت کرنے میں سبقت لے گئے ہیں، ہم اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے اور نہ اس کے ساتھ کسی اور کو اختیار کرتے ہیں، نہ رائے سے اس کی شریعت کو بدلتے ہیں جیسا کہ اہل کتاب نے کیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے جو وہ عطا فرمائے۔ اس کے آسانی پہنچانے کے ساتھ ہے جس پر وہ راضی ہو۔ ہم ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ عطا فرماتا۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شریعت کے مناقب میں سے ہر منقبت کی طرف السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے کو متضمن ہے چاہے وہ علم ہو یا دین، شجاعت یا اس کے سوا کوئی اور وصف، اس کا تعلق مال عطا کرنے سے ہو یا اعزاز و اکرام میں رتبہ سے ہو۔ اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسروں پر عطا کے سبب سابقین کو فضیلت دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اس سے لوگوں کے درمیان کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے کہ ان میں سے بعض بعض کو عطا کرنے میں سبقت لے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کو کہتے تھے: کیا آپ سبقت لے جانے والے کو اس کی طرح قرار دیتے ہیں جس کے لیے سبقت نہیں ہے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کیا اور اس کا اجر بھی اسی پر ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دور میں فضیلت دیتے تھے۔ پھر آپ نے اپنے وصال کے وقت کہا: اگر میں کل تک زندہ رہا تو میں ضرور ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ کے ساتھ ملا دوں گا، پھر اسی رات آپ کا وصال ہو گیا اور خلافت ہمارے آج دن تک اس اختلاف پر قائم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وَالْاَنْصَارُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ الَّذِيْنَ کو انصار کی صفت قرار دے کر اس سے واؤ کو ساقط کر دیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں رجوع کرا لیا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے زید کی تصدیق کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور کہا: ہم نہیں دیکھ رہے مگر یہ کہ ہم اتنے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے کہ ہمارے ساتھ کوئی اور اسے نہیں پائے گا۔ تو حضرت ابی نے کہا: بلاشبہ میں کتاب اللہ میں سورۂ جمعہ کے شروع میں اس کا مصداق پاتا ہوں: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعہ: 3) (اور دوسرے لوگوں کا بھی ان

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمع، جلد 1، صفحہ 120

میں سے (تزکیہ کرتا ہے تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان سے آکر نہیں ملے) اور سورۂ حشر میں ہے: وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (الحشر: 10) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے)

اور سورۂ الانفال میں یہ قول ہے: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (الانفال: 75) (اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہی میں سے ہیں) پس قراءت واؤ کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول باحسان کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ امور خیر جن میں وہ ان کے افعال و اقوال کی اتباع کرتے ہیں، نہ کہ ان میں جو ہفوات و زلات ان سے صادر ہوئیں، کیونکہ وہ معصوم نہیں رضی اللہ عنہم۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے تابعین اور ان کے مراتب میں اختلاف کیا ہے۔ پس الخطیب الحافظ نے کہا ہے: تابعی وہ ہے جسے صحابی کی صحبت اور معیت حاصل ہو، ان میں سے ہر ایک کو تابع اور تابعی کہا جاتا ہے اور حاکم ابو عبداللہ وغیرہ کا کلام یہ شعور دلاتا ہے کہ اس میں اتنا کافی ہے کہ اس نے صحابی سے سماع کیا ہو یا اس سے ملاقات کی ہو اگرچہ صحبت عرفہ نہ پائی جائے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اسم تابعین کا اطلاق ان پر ہوتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے۔ جیسا کہ حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور وہ جو فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں میں سے ان کے قریب قریب ہیں، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو فرمایا: ''میرے لیے میرے صحابہ کو بلاؤ، پس قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی ہر روز احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان کے ایک مد کو اور نہ اس کے نصف کو پہنچ سکتا ہے'' (1)۔

اور تعجب کی بات ہے کہ حاکم ابو عبداللہ نے مقرن مزنی کے دو بیٹوں نعمان اور سوید کو تابعین میں شمار کیا ہے جب انہوں نے تابعین میں سے بھائیوں کا ذکر کیا، حالانکہ وہ دونوں معروف صحابی ہیں اور ان کا ذکر صحابہ کرام میں کیا گیا ہے اور وہ دونوں غزوۂ خندق میں حاضر تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اکبر التابعین اہل مدینہ میں سے فقہائے سبعہ ہیں اور وہ حضرت سعید بن مسیب، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید، ابو سلمہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور بعض بزرگوں نے انہیں ایک شعر میں نظم کر دیا ہے اور کہا ہے:

فخذهم عبيدُالله عروةُ قاسمٌ   سعيدٌ أبوبكر سليمانُ خارجه

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تابعین میں سے سب سے افضل حضرت سعید بن مسیب ہیں۔ تو آپ کو کہا گیا: ان کے متصل بعد علقمہ اور اسود ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت سعید بن مسیب اور علقمہ اور اسود۔ (یعنی یہ تینوں فضلیت کے ایک درجے میں ہیں) اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تابعین میں سے افضل قیس، ابو عثمان، علقمہ اور مسروق

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 310

ہیں۔ یہ تمام فاضل ہیں اور تابعین کے بلند رتبہ میں سے ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا: حضرت عطا مکہ مکرمہ کے مفتی تھے اور حضرت حسن، بصرہ کے مفتی تھے۔ پس یہ دو ہیں جو دوسروں کی نسبت زیادہ مال دار اور عام میل جول سے بچنے والے تھے۔ اور ابو بکر بن ابی داؤد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: عورتوں میں سے تابعین کی سردار حفصہ بنت سیرین اور عمرہ بنت عبدالرحمن ہیں اور ان کے ساتھ تیسری ام الدرداء ہیں اور وہ ان دو کی طرح نہیں ہے۔ حاکم ابو عبداللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ایک طبقہ تابعین میں شمار کیا جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا صحابہ کرام سے سماع صحیح نہیں۔ ان میں سے حضرت ابراہیم بن سوید نخعی ہیں اور یہ ابراہیم بن یزید نخعی فقیہ نہیں ہے۔ اور بکر بن ابی السمیط اور بکر بن عبداللہ الاشج ہیں۔ اور ان کے سوا کئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: اور ایک طبقہ ہے جن کا شمار لوگوں کے نزدیک اتباع التابعین میں ہے، حالانکہ انہوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے ان میں سے ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان ہیں، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی ہے۔ اور ہشام بن عروہ ہیں، انہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس لایا گیا اور حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہم کے پاس لایا گیا۔ تحقیق انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی پایا ہے۔ اور ام خالد بنت خالد بن سعید بھی ہیں۔ اور تابعین میں ایک طبقہ ہے جنہیں مخضرمین کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عہد جاہلیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو پایا اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور انہیں شرف صحبت حاصل نہ ہوا۔ ان کی واحد مخضرم (راء کے فتحہ کے ساتھ) ہے کأنه خضرم، یعنی گویا یہ اپنے ہم زمانہ ان لوگوں سے کٹ گیا جنہوں نے صحابیت وغیرہ کا رتبہ پالیا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعداد بیس افراد تک پہنچی ہے، ان میں سے ابو عمرو شیبانی، سوید بن غفلہ کندی، عمرو بن میمون الاودی، ابو عثمان النہدی عبد خبر بن یزید الخیرانی (یہ خا کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ ہمدان خاندان سے ہے، عبدالرحمن بن مل، ابو الحلال العتکی ربیعہ بن زرارہ ہیں۔ اور ان میں سے وہ جن کا مسلم نے ذکر نہیں کیا، ان میں سے ابو مسلم الخولانی عبداللہ بن ثوب اور احنف بن قیس ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام اور تابعین کی معرفت کے بارے مختصر تذکرہ ہے جن کی فضیلت کا ذکر قرآن کریم نے کیا، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) (ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے (لوگوں) کی ہدایت و بھلائی کے لیے) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الآیہ (البقرہ: 143) (اور اس طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے پسند کیا کہ اگر ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ لیں'' (1) ...... الحدیث پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنا بھائی قرار دیا۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اور اس کے احکام کی ہم نے پیروی کی تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے گروہ میں اٹھائے گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے وسیلہ سے وہ ہمیں اپنے راستے اور اپنے دین سے نہیں ہٹائے گا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے، پکے ہو گئے ہیں نفاق میں، تم نہیں جانتے ان کو، ہم جانتے ہیں انہیں، ہم عذاب دیں گے انہیں دوبارہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ یعنی قوم منافقون۔ اور یہ مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار اور اشجع کے قبائل تھے(1)۔ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ رہی قوم مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (یعنی اہل مدینہ میں سے ایک قوم ہے جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوا منافقین کی نعت میں سے ہے، پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی، اس کا معنی ہوگا: و ممن حولکم من الأعراب منافقون مردوا علی النفاق، و من اھل المدینۃ مثل ذالك (تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے بھی اسی طرح ہیں) اور مردوا کا معنی ہے وہ قائم اور مضبوط ہو گئے ہیں اور انہوں نے توبہ نہیں کی۔ یہ ابن زید سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: وہ اس سے ڈٹ گئے ہیں اور اس کے سوا کا انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں معنی باہم ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور کلمہ کا اصل معنی نرمی، ملائمت و ملاست اور خالی ہونا ہے اور خالص ہونا ہے۔ تو گویا وہ نفاق کے لیے خالص ہو گئے ہیں اور اسی سے رملۃ مرداء ہے یعنی ایسی خالص ریت (صحراء) جس میں کوئی بوٹی نہ ہو۔ اور غصن امرد ایسی ٹہنی جس پر کوئی پتا نہ ہو اور فرس امرد وہ گھوڑا جس پر لٹکنے والے بال نہ ہوں۔ اور غلام امرد ایسا بچہ جس کی جلد صاف ہو، بے ریش ہو۔ اور یہ نہیں کہا جائے گا: جاریۃ مرداء اور تمرید البناء سے مراد بناء کا ملائم اور نازک ہونا ہے۔ اور اسی سے یہ ارشاد بھی ہے: صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ (النمل:44) ((یہ پانی نہیں) یہ چمک دار محل ہے) اور تمرید الغصن سے مراد ٹہنی کو پتوں سے خالی کرنا ہے، کہا جاتا ہے: مرد یمرد مرودا و مرادۃ۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ یہ اس ارشاد کی مثل ہے: لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ (الانفال:60) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے امور کے انجام کو نہیں جانتے بلاشبہ ہم نے ان کا علم اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اور یہ معنی اس سے روک رہا ہے کہ کسی کے بارے جنت یا دوزخ کا حکم لگایا جائے۔

قولہ تعالیٰ: سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک بار (عذاب) دنیا میں بیماریوں کے ساتھ اور دوسرا عذاب آخرت (ہم انہیں دیں گے) پس مومن کی بیماری (گناہوں کا) کفارہ ہوتی ہے اور کافر کی بیماری سزا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلا عذاب رسوائی کا ہے (کہ ان کے بارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 396

دے کر (انہیں رسوا کیا) جیسا کہ اس کا بیان منافقین میں آئے گا۔ اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ایک دنیا کا عذاب ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: پہلا اموال و اولاد کے بارے میں مصائب و آلام میں مبتلا کرنا ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے (1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک بھوک اور دوسرا قتل کا عذاب ہے۔ فراء نے کہا ہے: ایک قتل اور دوسرا عذاب قبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک قید اور دوسرا قتل ہے۔ یہ قول بھی ہے: ایک ان کے مالوں سے زکوٰۃ لینا اور ان پر حدود جاری کرنا ہے اور دوسرا عذاب قبر ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دو عذابوں میں سے ایک وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (التوبہ: 55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں)

اور آیت سے مقصود عذاب کی اتباع ہے یا ان پر عذاب کو دوگنا کرنا ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

یعنی اہل مدینہ میں سے اور تمہارے آس پاس رہنے والوں میں سے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کر لیا ہے اور دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا امر مؤخر کر دیا گیا ہے وہ ان کے بارے میں وہی فیصلہ فرمائے گا جو چاہے گا۔ پس پہلی قسم یہ احتمال رکھتی ہے کہ وہ منافق تھے اور نفاق پر پختہ نہ ہوئے تھے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مومن ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت ان دس افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: اور ان کے بارے میں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً نازل ہوئی۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور زید بن اسلم نے کہا ہے: وہ آٹھ افراد تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چھ تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ پانچ تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابولبابہ انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں خاص کر بنی قریظہ کے ساتھ ان کے معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی (3)۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے ان سے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر قلعے سے نیچے اترنے کے بارے گفتگو کی تو آپ نے ان کے لیے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ مراد یہ تھی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ذبح کر دیں گے اگر وہ نیچے اترے۔ پھر جب غلطی کا احساس ہوا تو توبہ کی، ندامت ہوئی اور اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 101
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 16
3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 20

کے ساتھ باندھ دیا اور یہ قسم کھائی کہ وہ کوئی چیز نہ کھائے گا نہ پیئے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے یا وہ مر جائے۔ پس وہ اسی حالت پر رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا اور یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھولنے کا حکم فرما دیا۔ اسے علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے۔ اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وآخرون حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی شان میں نازل ہوئی اور اس وقت کہا جب ان سے گناہ صادر ہوا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں آپ کے پڑوس میں رہوں گا اور اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے ثلث تیرے لیے کافی ہوگا (1) تحقیق رب کریم نے ارشاد فرمایا: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا** ((اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں) اسے ابن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو اسی طرح باندھ دیا تھا جیسے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انہیں کھولیں گے اور آپ ان سے راضی ہوں گے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں میں انہیں نہیں کھولوں گا اور نہ میں انہیں معذور قرار دوں گا یہاں تک کہ انہیں کھولنے کا حکم دیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے اعراض کیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں جانے سے پیچھے رہے ہیں'' (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں کھولا اور ان کا عذر قبول فرما لیا۔ جب وہ کھول دیئے گئے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے وہ اموال ہیں جنہوں نے ہمیں آپ سے پیچھے رکھا، پس آپ ہماری طرف سے انہیں صدقہ کر دیجئے اور ہمیں پاک کیجئے اور ہمارے لیے مغفرت طلب کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالوں میں سے کوئی شے لوں'' (3)۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** الآیہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ دس افراد تھے ان میں سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالوں سے تیسرا حصہ لیا اور یہ ان کے ان گناہوں کا کفارہ تھا جن کا انہوں نے ارتکاب کیا۔ پس ان کا برا عمل پیچھے رہنا ہے اس پر اس بارے گفتگو کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کا اجماع ہے۔ اور عمل صالح کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس علامہ طبری وغیرہ نے کہا ہے: (اپنے گناہ کا) اعتراف کرنا، توبہ کرنا اور اس (گناہ) پر نادم ہونا (4)۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کا وہ عمل صالح جو انہوں نے کیا وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا اور انہوں نے کہا: ہم نہ اپنی بیویوں کے قریب جائیں گے اور نہ اپنی اولاد کے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عذر کے بارے حکم نازل فرما دے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلکہ عمل صالح ان کا ان غزوات میں شریک ہونا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے گزر چکے تھے۔ اور یہ آیت اگرچہ اعراب کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یوم قیامت

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 20　　2۔ اسباب النزول، صفحہ 135　　3۔ ایضاً　　4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 17

تک ہر اس آدمی کے حق میں عام ہے جس کے اعمال صالحہ بھی ہوں اور اعمال سیئہ بھی۔ پس یہ امید دلاتی ہے۔ علامہ طبری نے حجاج بن ابی زینب سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا میں نے ابو عثمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میرے نزدیک اس امت کے لیے قرآن کریم میں اس آیت سے بڑھ کر زیادہ امید افزا کوئی آیت نہیں: وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا (التوبہ:102)(1)

اور بخاری میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''آج کی رات میرے پاس دو آنے والے آئے اور وہ مجھے لے گئے پس ہم ایک ایسے شہر کے پاس رکے جس کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں کے ساتھ بنے ہوئے تھے ہمیں کچھ لوگ ملے جن کی خلقت میں نصف اتنا زیادہ حسین تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا اور نصف اتنا زیادہ قبیح تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا۔ ان دونوں نے انہیں کہا: تم جاؤ اور اس نہر میں کود جاؤ پس وہ اس میں داخل ہو گئے پھر ہماری طرف واپس لوٹ کر آئے تو ان سے وہ بدصورتی اور سیاہی دور ہو چکی تھی اور وہ انتہائی حسین و جمیل صورت میں بدل چکے تھے، تو ان دونوں نے مجھے بتایا: یہ جنت عدن ہے اور یہی آپ کی منزل اور مقام ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا: رہی وہ قوم جن کا نصف حصہ حسین اور خوبصورت تھا اور ان کا نصف قبیح اور بدصورت تھا (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرمالی ہے'' (2)۔

علامہ بیہقی نے ربیع بن انس کی حدیث سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حدیث اسراء ذکر کی ہے اور اس میں آپ نے فرمایا ہے: ''پھر مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا......'' پھر انہوں نے یہاں تک حدیث ذکر کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ساتویں آسمان کی طرف اپنے بلند ہونے اور چڑھنے کا ذکر فرمایا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھائی اور خلیفہ کے نام سے سلام فرمایا ہے پس کتنا اچھا بھائی اور کتنا اچھا خلیفہ ہے اور آنے والا کتنا اچھا ہے، پس اچانک دیکھا سامنے جنت کے دروازے کے پاس کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے جس کے سر کے بال سیاہ و سفید ہیں اور اس کے پاس ایک قوم ہے ان کے چہرے سفید ہیں اور ایک قوم ہے ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان کے رنگوں میں کوئی شے ہے، پس وہ نہر کے پاس آئے اور اس میں غسل کیا پھر وہ اس سے نکلے درآنحالیکہ ان کے رنگوں سے وہ شے صاف ہو چکی تھی، پھر وہ دوسری نہر پر آئے اور اس میں انہوں نے غسل کیا، پس اس سے نکلے تو ان کے رنگوں سے کوئی شے نکل چکی تھی بعد ازاں وہ تیسری نہر میں داخل ہوئے جب اس سے نکلے تو اس کے رنگ اپنے ساتھیوں کے رنگوں کی مثل ہو چکے تھے پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا: اے جبرئیل! یہ سفید چہروں والے کون لوگ ہیں اور یہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی پھر وہ نہر میں داخل ہوئے تو ان کے رنگ صاف ہو گئے؟ تو انہوں نے بتایا: یہ آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یہ پہلے آدمی ہیں سطح زمین پر جن کے بال سیاہ اور سفید ہے۔ اور سفید اور چمکتے چہروں والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا اور رہے وہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اور پھر اللہ

1۔ تفسیر طبری جلد 11، صفحہ 21　　2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674

تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ اور رہی پہلی نہر تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور رہی دوسری نہر تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور رہی تیسری نہر تو ان کے رب نے انہیں شراب طہور کے ساتھ سیراب فرمایا"۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا میں واؤ کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی با ہے اور یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ بمعنی مع ہے، جیسے کہ تیرا قول ہے: استوی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ برابر ہوگیا) کوفیوں نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: کیونکہ خشبہ کو الماء پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے اور آیت میں آخر کو پہلے پر مقدم کرنا جائز ہے لہٰذا یہ خلطت الماء باللبن کے قائم مقام ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"(اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے نیز دعا مانگیے ان کے لیے، بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یہ صدقہ جس کے بارے حکم دیا گیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ فرض صدقہ ہے۔ یہ جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور یہی عکرمہ کا قول ہے جس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ مخصوص ہے جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے مالوں کا تیسرا حصہ لیا۔ اور فرض زکوٰۃ میں سے یہ کسی میں نہیں ہے۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی آدمی اپنا تمام مال صدقہ کر دے تو ثلث نکالنا اس کے لیے جائز ہے۔ اور استدلال حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ پہلے قول کی بنا پر یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے آپ پر ہی محصور ہونے کا تقاضا کرتا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی یہ صدقہ نہیں لے سکتا اور اس بنا پر آپ کے ساقط کرنے کے ساتھ صدقہ کا ساقط ہونا اور آپ کے وصال کے ساتھ اس کا زائل ہونا لازم آتا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منکرین زکوٰۃ نے اسی کے ساتھ تعلق قائم کیا اور انہوں نے کہا: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے عوض ہمیں پاکیزگی اور برکت عطا فرماتے تھے اور آپ ہمارے لیے دعا فرماتے تھے، حالانکہ آپ کے سوا کسی اور سے ہم نے اسے معدوم پایا ہے اور اس بارے میں ان کے شاعر نے یہ کہا ہے:

أطعنا رسول الله ما كان بيننا　　فيا عجبا ما بال مُلْك أبي بكر(1)

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ہے آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں پس تعجب ہے ابوبکر کی بادشاہی کو کیا ہوا۔

وان الذي سألوكم فمنعتم　　لكالتمر أو أحلى لديهم من التمر(2)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006　　2۔ ایضاً

اور بے شک وہ جوانہوں نے تم سے مانگا اور تم نے انکار کیا وہ کھجور کی مثل یا ان کے نزدیک کھجور سے زیادہ میٹھا ہے۔

سنمنعهم　مادام　فينا　بقية　كرائم على الضراء في العسر واليسر(1)

ہم ان کا انکار کرتے رہیں گے جب تک ہم میں تنگی اور خوشحالی کی حالت میں مصیبت زدہ لوگوں پر سخاوت اور مہربانی کرنے والے باقی ہیں۔

یہ قسم ان لوگوں کی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف مضبوط اور پختہ طریقہ سے کھڑے تھے اور ان کے حق میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں ضرور ان کے ساتھ جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا(2)۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہا ان کا یہ قول کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لہٰذا آپ کے سوا کوئی اس کے ساتھ ملحق نہیں، تو یہ قرآن سے جاہل، ماخذ شریعت سے غافل اور دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا کلام ہے، کیونکہ قرآن کریم میں خطاب کوئی ایک طرز پر وارد نہیں بلکہ مختلف وجوہ پر وارد ہے، پس ان میں سے ایک خطاب تمام امت کی طرف متوجہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لیے)۔ اور يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ:183) (اے ایمان والو! فرض کیے گئے تم پر روزے) اور اسی طرح کی اور آیات۔

اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں نہ لفظوں میں نہ معنی میں، مثلاً ارشاد گرامی ہے: وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء:79) (اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز زائد ہے) اور قول باری تعالیٰ: خَالِصَةً لَّكَ (النور:50) یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے) اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے لفظی طور پر لیکن معنی اور فعلاً تمام امت اس میں شریک ہے، جیسا کہ فرمان ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الآیہ (الاسراء:78) (نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک الخ) اور قول باری تعالیٰ: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (النحل:98) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ کی الخ) اور یہ ارشاد گرامی: وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (النساء:102) (اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز) پس ہر وہ جس پر سورج غروب ہوا وہ نماز کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جس نے قرآن کریم پڑھا وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنے کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو ڈرا وہ اس صفت کے ساتھ نماز قائم کرے گا۔ پس اسی قبیلے سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی بھی ہیں: يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب:1) (اے نبی مکرم!) (حسب سابق ڈرتے رہیے اللہ تعالیٰ سے) اور يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق:1) (اے نبی (مکرم) (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو)(3)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006　2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 188　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1008

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ اَمْوَالِهِمْ بعض عرب اور وہ قبیلہ دوس کے آدمی تھے نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بے شک مال سے مراد کپڑے، ساز و سامان اور سامان تجارت ہے، عین (یعنی سونا، چاندی) کو مال کا نام نہیں دیا جا سکتا اور یہ معنی اس سنت میں آیا ہے جو مالک عن ثور بن زید الدیلی عن ابی الغیث سالم مولی ابن مطیع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم فتح خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ہم نے سونے اور چاندی میں سے کوئی مال غنیمت نہ پایا مگر اموال، کپڑے اور ساز و سامان (پایا) (1) الحدیث۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے کہ مال صامت سے مراد سونا اور چاندی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صرف اونٹ ہیں اور اسی سے ان کا قول ہے: المال الابل (مال تو اونٹ ہیں) اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد تمام جانور ہیں۔ ابن الانباری نے احمد بن یحییٰ (ثعلب) النحوی سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: سونے اور چاندی میں سے اتنا جو اس مقدار تک پہنچنے سے کم ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ مال نہیں ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

واللہ ما بلغتْ لی قطُّ ماشیۃٌ حدَّ الزکاۃ ولا إبل ولا مال

قسم بخدا! میرے لیے کبھی کوئی جانور زکوٰۃ کی حد کو نہیں پہنچا نہ اونٹ اور نہ ہی مال۔

ابو عمر نے کہا ہے: کلام عرب سے معروف و مشہور یہ ہے کہ ہر وہ جس سے خوشحالی حاصل کی جائے اور امارت حاصل کی جائے وہ مال ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال بلاشبہ مال میں سے اس کا وہ ہے جو اس نے کھایا اور فناہ کر دیا یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر دیا اور ختم کر دیا": یقول ابن آدم مالی مالی وانما لہ من مالہ ما أکل فافنی أو لبس فأبلی أو تصدق فأمضی (2)۔ اور حضرت ابو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس آپ نے مجھے ایک زرہ عطا فرمائی تو اس کے عوض میں نے بنی سلمہ میں کھجوروں کا چھوٹا سا قطعہ خریدا۔ وہ پہلا مال تھا جو میں نے اسلام میں حاصل کیا، کمایا۔ پس جس کسی نے اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے بارے قسم کھائی تو اس کا اطلاق اس کے مال کی ہر نوع اور ہر قسم پر ہوگا چاہے وہ اس میں سے ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہ ہو، مگر یہ کہ وہ اس میں سے معین شے کی نیت کرے تو پھر قسم کا اطلاق اسی پر ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق اموال زکوٰۃ پر ہوگا۔ اور علم محیط ہے اور زبان شاہد ہے کہ ہر وہ شی جس کا وہ مالک بنا اسے مال کا نام دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یہ مطلق ہے ماخوذ اور ماخوذ منہ میں موجود کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں اور نہ اس میں ماخوذ اور ماخوذ منہ (وہ مال جو لیا جائے اور جس سے لیا جائے) کی مقدار کی وضاحت اور بیان ہے۔ بلاشبہ اس کا بیان سنت اور اجماع میں ہے، جیسا کہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔ پس زکوٰۃ تمام مالوں سے لی جائے گی۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں، اناج اور سونے چاندی میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں اور جو کچھ ان کے سوا ہے مثلاً گھوڑے اور تمام سامان و اسباب ان میں اختلاف ہے۔ عنقریب گھوڑوں اور شہد کا ذکر سورۃ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 407 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 74

ائمہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھجوروں کے پانچ وسقوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور چاندی کے پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں بھی صدقہ نہیں ہے'' (1)۔ دانوں اور زمین سے اگنے والی ہر شے کی زکوٰۃ کے بارے گفتگو مکمل طور پر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ اور معادن کے بارے میں سورۃ البقرہ میں اور زیورات کے بارے اس سورت میں کلام گزر چکی ہے۔ اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے۔ پس جب ایک آزاد مسلمان چاندی سے بنے ہوئے دو سو درہموں کا مالک ہو، تو یہی وہ پانچ اوقیہ ہیں جن کا بیان حدیث طیبہ میں ہوا ہے۔ اور ان پر پورا سال گزر گیا تو ان کی زکوٰۃ اس پر واجب ہے اور وہ ان کا چالیسواں حصہ یعنی پانچ درہم ہے۔ اور سال کی شرط لگائی گئی ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مال میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے'' (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور چاندی میں سے جو دو سو درہم سے زائد ہو تو اس کے حساب سے ہر شے میں چالیسواں حصہ ہے مقدار کم ہو یا زیادہ۔ یہ قول امام مالک، امام لیث، امام شافعی، امام ابو حنیفہ کے اکثر اصحاب، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل، ابو ثور اور اسحاق اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: دو سو درہم سے جو زائد ہوں گے ان میں کوئی شے لازم نہ ہوگی یہاں تک کہ زیادتی چالیس درہم تک پہنچ جائے۔ اور جب وہ مقدار چالیس ہو جائے تو ان میں ایک درہم واجب ہوگا اور وہی چالیسواں حصہ ہے (3)۔ یہ قول حضرت سعید بن مسیب، حسن، عطا، طاؤس، شعبی، زہری، مکحول اور عمرو بن دینار اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہی سونے کی زکوٰۃ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جب وہ بیس دینار ہو جائے تو اس کی قیمت دو سو درہم ہوگی اور جو زیادہ ہوگا اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بنا پر ہے، اسے امام ترمذی نے ضمرہ سے اور حارث سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے محمد بن اسماعیل سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: میرے نزدیک دونوں ابو اسحاق سے صحیح ہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ حدیث دونوں سے اکٹھی مروی ہو (5)۔ اور الباجی نے ''المنتقی'' میں کہا ہے: یہ حدیث وہاں اس کی اسناد نہیں ہے، مگر علماء کا اس کے مطابق لینے پر اتفاق کرنا اس کے حکم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ واللہ اعلم

اور امام حسن اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی کے بعض اصحاب بھی مائل ہوئے ہیں کہ سونے میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چالیس دینار تک پہنچ جائے۔ اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی حدیث رد کرتی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیس دینار سے نصف دینار لیتے تھے اور چالیس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 196
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80
3۔ کتاب الآثار، کتاب الزکوٰۃ، صفحہ 92
4۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79

دینار میں سے ایک دینار لیتے تھے (1)۔ اسی پر اہل علم کی جماعت ہے سوائے ان کے جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ پانچ سے کم اونٹوں میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور جب ان کی تعداد پانچ ہو جائے تو ان میں ایک بکری لازم ہو جاتی ہے اور ''شاۃ'' کا اطلاق غنم (ریوڑ) میں سے ایک پر ہوتا ہے اور غنم بکری اور بھیڑ دونوں کے لیے ہے۔ اور اس پر بھی علماء کا اختلاف ہے کہ پانچ اونٹوں میں صرف ایک بکری لازم ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے اور جانوروں کی زکوٰۃ کو اس کتاب (تحریر) میں بیان کیا گیا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے لکھی جب کہ آپ نے انہیں بحرین کی طرف بھیجا۔ اسے امام بخاری، ابوداؤد، دارقطنی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور تمام اس پر متفق ہیں (2)۔ اور دو مقامات پر اس میں اختلاف ہے۔ ان میں ایک اونٹوں کی زکوٰۃ میں اور وہ یہ کہ جب ان کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچ جائے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صدقہ وصول کرنے والے کو اختیار ہے اگر چاہے تو تین بنات لبون (یعنی ایسی اونٹنی جس کی عمر دو سال مکمل ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) لے اور اگر چاہے تو دو حقے (ایک حقہ جس کی عمر تین سال مکمل ہو اور وہ چوتھے سال میں داخل ہو چکا ہو) لے لے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے کہ ابن شہاب نے کہا ہے: اس میں تین بنات لبون ہیں یہاں تک کہ تعداد ایک سو تیس تک پہنچ جائے تو پھر اس میں ایک حقہ اور دو بنت لبون لازم ہوں گی۔ ابن قاسم نے کہا ہے: میری رائے ابن شہاب کے قول کے مطابق ہے۔ اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور عبدالعزیز بن ابی حازم اور ابن دینار امام مالک کے قول کے مطابق کہتے ہیں۔ اور رہا دوسرا مقام تو وہ غنم (ریوڑ) کے صدقہ کے بارے ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کی تعداد تین سو ایک بکری سے زیادہ ہو جائے تو حسن بن صالح بن حیی نے کہا ہے: ان میں چار بکریاں لازم ہوں گی۔ اور جب تعداد چار سو ایک ہو جائے تو ان میں پانچ بکریاں لازم ہوں گی۔ اسی طرح جب بھی تعداد زیادہ ہوگی، تو ہر سو میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اور اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: دو سو ایک بکریوں میں تین بکریاں ہیں، پھر ان میں چار سو تک کوئی شے نہیں ہے اور پھر چار سو میں چار بکریاں ہو جائیں گی، پھر جب بھی ان میں ایک سو زائد ہوں گی تو ان میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں ابن المنذر کو وہم ہوا ہے اور اس میں علماء سے خطا ہوئی ہے، مسئلہ میں اختلاط اور اکثر غلط ہو گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ علیہما نے گائے کی زکوٰۃ کی تفصیل صحیحین میں ذکر نہیں کی اور اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارقطنی اور امام مالک رحمہما اللہ علیہما نے موطا میں روایت کیا ہے اور یہ روایت مرسل، مقطوع اور موقوف ہے (3)۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسے ایک قوم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، مگر وہ جنہوں نے اسے مرسل ذکر کیا ہے وہ ان سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہیں جنہوں نے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اسے مسند ذکر کرنے والوں میں سے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، حدیث نمبر 1339، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1789، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بقیہ نے مسعودی سے، انہوں نے حکم سے اور انہوں نے طاؤس سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اس روایت میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ بقیہ ثقہ راویوں سے منفرد ہوتے ہیں اور اسے حسن بن عمارہ نے حکم سے اسی طرح روایت کیا ہے جیسے اسے بقیہ نے مسعودی سے اور انہوں نے حکم سے روایت کیا ہے اور حسن کے ضعف پر اجماع ہے۔ اور یہ خبر طاؤس کی روایت کے علاوہ سے سند متصل کے ساتھ صحیح ثابت ہے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں معمر اور ثوری نے اعمش سے انہوں نے ابو وائل سے انہوں نے مسروق سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا اور حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ہر تیس گاؤں میں سے ایک تبیع یا تبیعہ (ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی) لے اور چالیس گاؤں میں سے ایک مسنہ (دو سال کا بچھڑا، بچھڑی) لے اور ہر عاقل بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر معافر کا کپڑا (1) (معافر یمن کا ایک قبیلہ ہے اس کی طرف منسوب چادر کو معافر کہا جاتا ہے) اسے دار قطنی اور ابو عیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (2)۔

ابو عمر نے کہا ہے: علماء کے درمیان اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گائیوں کی زکوٰۃ کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو زکوٰۃ مروی ہے وہ وہ ہے جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ تیس گائیں میں ایک تبیع اور چالیس میں ایک مسنہ ہے، مگر وہ جو حضرت سعید بن مسیب، ابو قلابہ، زہری اور قتادہ سے مروی ہے، کیونکہ وہ ہر پانچ گائیوں میں تیس تک ایک بکری واجب کرتے ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلقہ یہ تمام تفصیل اپنے اصول و فروع کے ساتھ کتب فقہ میں موجود ہے اور شرکت کا ذکر سورۂ ''ص'' میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: صَدَقَةً یہ الصدق سے ماخوذ ہے، کیونکہ ان کے ایمان کے صحیح ہونے اور اس کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کے سچا ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ یہ ان منافقین میں سے نہیں ہیں جو اطاعت و پیروی کرنے والے مومنین کو صدقات کے بارے میں الزام دیتے ہیں۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا یہ دونوں مخاطب کے لیے حال ہیں، تقدیر کلام یہ ہے: خذها مطهرا لهم و مزکیا لهم بها (تم صدقہ وصول کروان کو پاک کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ ان کو بابرکت بناتے ہوئے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ان دونوں کو صدقہ کی صفت بنا دیا جائے ای صدقة مطهرة لهم مزكية (ان کو پاک کر دینے والا صدقہ اور بابرکت بنانے والا) اور تُزَكِّيهِمْ کا فاعل مخاطب ہوگا اور وہ ضمیر جو بہا میں ہے وہ موصوف نکرہ کی طرف لوٹے گی۔ اور نحاس اور مکی نے بیان کیا ہے کہ تُطَهِّرُهُمْ صدقہ کی صفت ہے اور وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، خذ کی ضمیر سے حال ہے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الصدقہ سے حال ہو۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ یہ نکرہ سے حال ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: عمدہ یہ ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہو، یعنی بے شک آپ انہیں پاک کر دیں اور اس کے سبب انہیں بابرکت بنا دیں۔ یہ قطع (ماقبل سے تعلق کا منقطع ہونا) اور استئناف کی بنا پر ہے۔ اور جواب امر کی بنا پر جزم بھی جائز ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اگر آپ ان کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالوں سے صدقہ لیں گے تو وہ انہیں پاک کردے گا اور بابرکت بنادے گا اور اسی سے امرءالقیس کا قول بھی ہے:

قفانبك من ذکری حبیب و منزل

(تم دونوں ٹھہرو تاکہ ہم اپنے محبوب اور اس کی گھر کی یاد میں رولیں)

اور حسن نے طا کے سکون کے ساتھ تطہرھم پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے ساتھ طھر دأطھرتہ سے منقول ہے، مثلاً ظھرو أظھرتہ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ہر وہ امام جو صدقہ وصول کرتا ہے اس کے فعل میں اصل یہ ہے کہ وہ صدقہ دینے والے کے لیے برکت کی دعا کرے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ فرماتے: اللھم صل علیھم اے اللہ! ان پر رحمتیں نازل فرما۔ پس حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! آل ابی اوفی پر رحمتیں نازل فرما'' (1)۔ ایک قوم اسی طرف گئی ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (التوبہ: 84) (اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مرجائے کبھی) انہوں نے کہا ہے: پس یہ جائز نہیں ہے کہ کسی پر صلوٰۃ بھیجی جائے مگر یہ کہ یہ صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے، کیونکہ آپ کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا الآیہ (النور: 63) (نہ بنالو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو)

اور اس وجہ سے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی پر صلوٰۃ نہیں بھیجی جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ محصور نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور آیت میں اس کے بعد اس کا بیان آئے گا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنا اور اس کے ساتھ تسلی دینا اور دلجوئی کرنا واجب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل بنتا ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یعنی جب آپ ان کے لیے دعا کریں گے جس وقت وہ اپنے صدقات لے کر آئیں گے تو اس سے ان کے دلوں کو سکون حاصل ہوگا اور وہ اس سے خوش ہو جائیں گے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی کو کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کے بارے سوال نہ کرنا۔ تو اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے نکل جائیں گے اور ہم آپ سے کسی شی کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ پھر اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے خاوند کے لیے دعا فرمائیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے خاوند پر رحمت فرمائے''۔ یہاں پر صلوٰۃ کا لفظ رحمت اور ترحم (رحم کرنے) کے معنی میں ہے۔ صلی اللہ علیك و علی زوجك۔ نحاس نے کہا ہے: تمام اہل لغت نے اس بارے میں بیان کیا ہے کہ ہم اسے جانتے ہیں کہ کلام عرب میں لفظ صلوٰۃ دعا کے معنی میں ہے۔ اور اسی سے الصلوٰۃ علی الجنائز بھی ہے (یعنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 346

معیوں کے لیے دعا مانگنا)۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے اِنَّ صَلٰوتَكَ صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اسی طرح اختلاف اصلاتك تأمرك میں ہے۔ اور سكن کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہ ان کے لیے وقار ہے اور السکن سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ نفوس کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے اور لیتا ہے صدقات کو اور بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ کہا گیا ہے: پیچھے بیٹھے رہنے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی انہوں نے کہا: یہ لوگ گزشتہ کل تو ہمارے ساتھ تھے، نہ وہ کلام کرتے ہیں اور نہ وہ (ہمارے ساتھ) بیٹھتے ہیں، تو اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟ اور یہ کون سی خصوصیت ہے جس کے ساتھ ہمارے سوا وہ خاص کر دیئے گئے ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا پس يَعْلَمُوْٓا میں ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے توبہ نہیں کی پیچھے رہنے والوں میں سے۔ ابن زید نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہو جنہوں نے توبہ کی اور اپنے آپ کو باندھ دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: هُوَ، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان امور کے ساتھ منفرد اور یکتا ہونے کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر اس نے کہا ہوتا: ان اللہ یقبل التوبۃ تو اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس کے رسول کا قبول کرنا اس کی طرف سے ہی قبول کرنا ہو۔ پس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ ان امور میں سے ہے جس تک نہ کوئی نبی پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ یہ اس بارے میں صریح نص ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی صدقات لینے والا ہے اور ان پر ثواب و جزا عطا فرمانے والا ہے اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ جل وعز کا حق ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں اور اگر آپ کا وصال ہو گیا تو آپ کے بعد آپ کا نائب اور خلیفہ ہی واسطہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اور یہ اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر محصور نہیں ہے۔ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ قبول فرماتا ہے اور اسے اپنے دائیں دست قدرت کے ساتھ لیتا ہے پھر وہ اسے تم میں سے کسی کے لیے بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کی تربیت اور پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور اس کی تصدیق کتاب میں موجود ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 79

ربا (سود) کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے'' (1)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''کوئی بھی حلال اور طیب کمائی سے ایک کھجور صدقہ نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں دست قدرت سے لیتا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''پھر وہ رحمٰن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بڑھ جاتی ہے'' (2)۔ الحدیث۔

اور یہ بھی روایت ہے: ''بے شک صدقہ رحمٰن کی ہتھیلی میں واقع ہوتا ہے اس سے پہلے کہ سائل کے ہاتھ میں جائے پس وہ اسے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے یا اونٹنی کے بچے کی تربیت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اسے کئی گنا کر دیتا ہے'' (3)۔ ہمارے علماء نے احادیث کی تاویل میں کہا ہے: بلاشبہ یہ صدقہ کے قبول ہونے اور اس پر جزا واقع ہونے سے کنایہ ہے، جیسا کہ اس نے مریض پر انتہائی رحم اور مہربانی فرماتے ہوئے مریض سے اپنی ذات کریمہ و مقدسہ کنایۃً مراد لی ہے اور فرمایا: ''اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت اور بیمار پرسی نہیں کی'' (4)۔ الحدیث

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یمین اور کف کے الفاظ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ کسی شی کو قبول کرنے والا ہر کوئی بلاشبہ اسے اپنی ہتھیلی اور دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی اسے پکڑتا ہے یا اسے اس میں رکھا جاتا ہے۔ تو اسی بنا پر اسے ہی ذکر کیا جسے وہ جانتے اور پہچانتے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہر عضو سے پاک اور منزہ ہے۔ اور یمین کا لفظ عضو خاص (دایاں ہاتھ) کے بغیر بھی کلام عرب میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إذا ما رایةٌ رفعت لمجدٍ　تلقّا ها عَرابة بالیمینِ

یعنی اسے ہی مجد و شرف کا اہل بنایا گیا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد دایاں ہاتھ نہیں ہے، کیونکہ یہ معنوی طور پر بزرگی و شرف ہے پس وہ بزرگی اور شرف جو اس کے ساتھ حاصل ہوتا ہے میں نے اسے معنیً دیکھ لیا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی لفظ یمین ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ ''وہ رحمٰن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے'' (5) کا معنی ہے کہ یہ اس میزان عدل کے پلڑے سے عبارت ہے جس میں اعمال کا وزن کیا جائے گا، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہوگا، گویا کہ فرمایا: فتربو کفة میزان الرحمٰن (پس وہ رحمٰن کے میزان کے پلڑے میں بڑھ جائے گی) اور امام مالک، ثوری اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے کہ انہوں نے ان احادیث اور جو ان کے مشابہ ہیں ان کی تاویل میں کہا ہے: تم اسے بلا کیف پر ہی محمول کرو۔ یہ ترمذی وغیرہ نے کہا ہے اور اسی طرح اہلسنت والجماعت کے اہل علم کا قول ہے۔

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور فرمائیے عمل کرتے رہو پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مومن۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 84۔ ایضاً، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 326　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1011

4۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 318　5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 84

اور لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کا پس وہ خبردار کرے گا تمہیں اس سے جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَقُلِ اعْمَلُوْا یہ خطاب تمام کو ہے (کہ تم عمل کرتے رہو) فَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں تمہارے اعمال پر اطلاع دینے کے سبب (وہ تمہارے اعمال کو دیکھیں گے) اور حدیث میں ہے اگر کوئی آدمی ایسی چٹان میں عمل کرلے جس کا کوئی دروازہ نہ ہو اور نہ اسے کوئی سوراخ ہو تو پھر بھی اس کا عمل لوگوں کی طرف نکل جائے گا جیسے بھی وہ ہوا''۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰۶

''اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کر دیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے تو بہ قبول فرمائے ان کی۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

یہ آیت ان تین کے بارے میں نازل ہوئی جن کی توبہ قبول کرلی گئی: وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ یہ بنی واقف سے تھے اور مرارہ بن ربیع تھے (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ابن ربعی العمری تھا۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے حالانکہ یہ خوشحال تھے، جیسا کہ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اور تقدیر کلام ہے ومنهم آخرون مرجون یہ أرجاته سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کر دیا۔ اور اسی سے مرجئة کہا گیا ہے، کیونکہ ان کا معاملہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا۔ حمزہ اور کسائی نے مرجون بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أرجیته سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کر دیا (أخرته) اور مبرد نے کہا ہے: أرجیته بمعنی أخرته نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ الرجاء سے ہوگا۔ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ، إما عربی میں دو امروں میں سے ایک کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ چیزوں کے انجام کو جاننے والا ہے، البتہ بندوں کو خطاب اس بنا پر کیا جاتا ہے جسے وہ جانتے ہیں، یعنی چاہیے کہ ان کا معاملہ تمہارے نزدیک امید افزا ہو جائے کیونکہ بندوں کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۷

''اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد نقصان پہنچانے کے لیے، کفر کرنے کے لیے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مومنوں کے درمیان اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 105

سے اب تک۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا یہ کلام معطوف ہے، یعنی ومنھم الذین اتخذوا مسجدا (اور ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے مسجد بنائی) اس میں جملہ کا عطف جملہ پر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو مثلاً انھم یعذبون (بے شک وہ عذاب دیئے جائیں گے) یا اسی کی مثل کوئی اور۔ اور جنہوں نے بغیر واؤ کے الذین پڑھا ہے اور یہ اہل مدینہ کی قراءت ہے تو یہ ان کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ اور خبر لا تقم ہے تقدیر کلام ہے: الذین اتخذوا مسجدا لا تقم فیه أبدا، ای لا تقم فی مسجدھم (جنہوں نے مسجد بنائی آپ ان کی مسجد میں (نماز کے لیے) کبھی کھڑے نہ ہوں) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: مبتدا کی خبر یہ ہوگی۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (التوبہ: 110) (ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خبر یعذبون ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قیصر کے پاس گیا اور عیسائی ہو گیا اور قیصر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ عنقریب ان کے پاس آئے گا، پس انہوں نے مل کر مسجد ضرار بنائی اور وہ اس میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے اور اس کا واقعہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

اور اہل تفسیر نے کہا ہے: بے شک عمرو بن عوف نے مسجد قبا بنائی اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور اس میں نماز ادا فرمائی، پس ان کے بھائیوں بنو غنم بن عوف نے ان کے ساتھ حسد کیا اور یہ کہا: ہم مسجد بنائیں گے اور ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجیں گے اور آپ ہمارے پاس تشریف لائیں گے تاکہ آپ ہمیں اسی طرح نماز پڑھائیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بھائیوں کی مسجد میں نماز پڑھائی اور اس میں ابو عامر نماز پڑھے گا جب وہ شام سے آئے گا، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ تبوک کی طرف جانے کی تیاری فرما رہے تھے۔ اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق ہم نے صاحب حاجت، بیمار، سخت آندھی والی رات وغیرہ کے لیے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں ہمیں نماز پڑھائیں اور برکت کے لیے دعا فرمائیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ اب میں سفر پر جانے لگا ہوں اور انتہائی مشغول حالت میں ہوں پس اگر ہم واپس آئے تو ہم تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں اس میں نماز پڑھائیں گے'' (1)۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو وہ آپ کے پاس آئے درآنحالیکہ وہ اس کے کام

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012

سے فارغ ہو چکے تھے اور انہوں نے اس میں جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی نمازیں پڑھ لی تھیں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص منگائی تا کہ آپ اسے پہنیں اور آپ ان کے پاس جائیں تو اتنے میں آپ پر مسجد ضرار کے خبر کے بارے قرآن کریم نازل ہوا۔ پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن دخشم، معن بن عدی، عامر بن سکن اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو بلایا، اور انہیں فرمایا: ''جاؤ اس مسجد کی طرف اس کے بنانے والے ظالم ہیں اور تم اسے گرا دو اور اسے جلا کر راکھ کر دو'' (1)۔ پس وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نکلے اور مالک بن دخشم نے اپنے گھر سے آگ کا انگارہ لیا اور اٹھے پھر مسجد کو جلا دیا اور اسے گرا دیا اور جنہوں نے اسے بنایا تھا وہ بارہ آدمی تھے: خذام بن خالد یہ بنی عبید بن زید سے تھا اور یہ بنی عمرو بن عوف میں سے ایک تھا اور اس کے گھر سے مسجد ضرار (کی جگہ) نکالی گئی، معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن الازعر، عباد ابن حنیف یہ سہل بن حنیف کا بھائی تھا جو بنی عمرو بن عوف میں سے تھا، جاریہ بن عامر اور اس کے دو بیٹے مجمع اور زید ابنا جاریہ، نبتل بن حارث، بحزج، بجاد بن عثمان، ودیعہ بن ثابت اور ثعلبہ بن حاطب کا ذکر بھی ان میں کیا گیا ہے (2)۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ بدر میں حاضر تھا۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک آدمی سے پوچھا تو نے اس مسجد میں کیا مدد کی تھی؟ تو اس نے کہا: میں نے اس میں ایک ستون کے ساتھ مدد کی۔ تو آپ نے فرمایا: اس کے بارے تجھے بشارت ہو! جہنم کی آگ کا ایک ستون تیری گردن میں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: ضِرَارًا یہ مصدر مفعول من اجلہ ہے۔ وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا یہ سارا معطوف ہے۔ اور اہل تاویل نے کہا ہے: ضرارا بالمسجد (مسجد کے ساتھ نقصان پہنچانے کے لیے) نہ کہ للمسجد ضرار (مسجد کو نقصان پہنچانے کے لیے) بلاشبہ یہ نقصان مسجد بنانے والوں کو ہوا (3)۔ اور دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی نقصان نہیں اور کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں جس نے کسی کو نقصان اور ضرر پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اسے ضرر اور نقصان پہنچائے گا اور جس نے کسی کو تنگ کیا اللہ تعالیٰ اسے اس پر شاق پہنچائے گا'' (4)۔ بعض علماء نے کہا ہے: ضرر وہ ہے جس کے سبب تجھے منفعت حاصل ہو اور اس میں تیرے پڑوسی کے لیے نقصان ہو۔ اور ضرار وہ ہے جس میں تیرے لیے منفعت نہ ہو اور تیرے پڑوسی کے لیے اس میں نقصان ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ایک معنی میں ہیں، تاکید کی بنا پر دونوں کے ساتھ اکٹھی کلام کی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائی جائے اور اسے گرا دینا واجب ہے اور اس کو بنانے سے روکنا لازم ہے تا کہ پہلی مسجد والے پھر نہ جائیں کہ وہ اس حال میں باقی رہ جائے کہ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ محلہ بڑا ہو اور اس کے باسیوں کے لیے ایک مسجد کافی نہ ہو تو اس وقت دوسری مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: یہ مناسب نہیں کہ ایک شہر میں دو یا تین جامع مساجد بنائی جائیں، دوسری کو روکنا

1۔ اسباب النزول، صفحہ 136
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 29
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 228

واجب ہے اور جس نے اس میں جمعہ کی نماز پڑھی تو وہ جائز نہ ہوگی۔ تحقیق حضور نبی مکرم ﷺ نے مسجد ضرار کو جلانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور اسے گرا دیا تھا۔ علامہ طبری نے شقیق سے بیان کیا ہے کہ وہ آئے تا کہ مسجد بنی غاضرہ میں نماز پڑھیں تو انہوں نے نماز کو پایا کہ وہ فوت ہو چکی ہے (یعنی اس کا وقت گزر چکا ہے) تو آپ کو کہا گیا کہ بنی فلاں کی مسجد میں اس کے بعد نماز نہ پڑھیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس میں نماز پڑھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ ضرر پہنچانے کی نیت سے بنائی گئی ہے(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: ہر وہ مسجد جو ضرر پہنچانے یا ریاکاری اور شہرت کی خاطر بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کے حکم میں ہے اس میں نماز جائز نہ ہوگی۔ اور نقاش نے کہا ہے: اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آدمی کنیسہ (عیسائیوں کی عبادت گاہ) اور اس طرح کے دیگر مقامات میں نماز نہ پڑھے کیونکہ اسے شر کے ارادہ پر بنایا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے یہ لازم نہیں آتا، کیونکہ گرجا گھر کی تعمیر سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہوتا، اگرچہ اس کی اصل بنیاد شر پر ہے، عیسائیوں نے کنیسہ اور یہودیوں نے بیعہ (یہودیوں کا عبادت خانہ) بنایا یہ وہ جگہ ہے جس میں وہ اپنے زعم کے مطابق عبادت کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے لیے مسجد ہے، پس یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ تحقیق علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی نے کنیسہ یا بیعہ میں پاک جگہ پر نماز پڑھی ان کی نماز جائز گی اور ادا ہو جائے گی۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیعہ میں نماز پڑھ لیتے تھے جب اس میں بت اور تصاویر وغیرہ نہ ہوتیں (2)۔ اور ابوداؤد نے حضرت عثمان بن ابی العاص سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ طائف میں وہاں مسجد بنائیں جہاں ان کے بت تھے (3)۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: بے شک جو کوئی ظالم کا امام ہو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی، مگر یہ کہ اس کا عذر ظاہر ہو جائے یا وہ توبہ کر لے، کیونکہ وہ بنی عمرو بن عوف جنہوں نے مسجد قبا بنائی انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کے زمانہ خلافت میں پوچھا کہ آپ مجمع بن جاریہ کو اجازت عطا فرمائیں کہ وہ انہیں ان کی مسجد میں نماز پڑھائیں۔ تو آپ نے فرمایا: نہیں اور نہ یہ کوئی معین اور خاص انعام ہے! کیا یہ مسجد ضرار کا امام نہیں رہا۔ تو مجمع نے آپ کو عرض کی: اے امیر المومنین! آپ میرے بارے میں جلدی نہ کیجئے، قسم بخدا! میں نے اس میں نماز پڑھی اور میں اسے نہیں جانتا تھا جو انہوں نے اس بارے میں (اپنے ذہنوں میں) چھپا رکھا تھا، اگر میں جانتا ہوتا تو میں انہیں اس میں نماز نہ پڑھاتا، میں ایک قرآن پڑھنے والا بچہ تھا اور وہ شیوخ تھے، تحقیق انہوں نے اپنی جاہلیت پر ہی زندگی گزاری اور وہ قرآن میں سے کوئی شے نہ پڑھتے تھے، سو میں نے انہیں نماز پڑھائی اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ میں اس کے بارے جانتا ہوں جو ان کے دلوں میں تھا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معذور قرار دیا اور اسے تسلیم کیا اور انہیں مسجد قبا میں نماز کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 33　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 62
3۔ سنن ابی داؤد، باب فی بناء المساجد، حدیث نمبر 380۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب این یجوز بناء المساجد، حدیث نمبر 734، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے حکم ارشاد فرمایا۔ (1)

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب وہ مسجد جو عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے اور شریعت نے اس کے بنانے پر برانگیختہ کیا ہے اور کہا ہے: ''جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ اس گڑھے کی مانند ہو جو کونج نے انڈے دینے کے لیے بنایا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا''۔ اسے گرا دیا جائے گا اور اکھیڑ دیا جائے گا جب کہ اس میں دوسروں کے لیے ضرر اور نقصان ہو، تو پھر اس کے سوا کے لیے تیرا کیا خیال ہے، بلکہ وہ زیادہ اس لائق ہے کہ اسے زائل کیا جائے اور گرا دیا جائے یہاں تک کہ پرانی کسی چیز کے لیے ضرر اور نقصان نہ ہو۔ اور یہ اس کی طرح ہے جس نے تنور کے علاوہ روٹیاں پکانے کی جگہ یا چکی بنائی یا کنواں کھودا یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے بنائی جس کے سبب ضرر اور نقصان کسی دوسری شے کو پہنچ سکتا ہے، تو اس بارے ضابطہ یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی کو ضرر اور نقصان میں ڈال دیا تو اسے منع کیا جائے گا۔ اور اگر اس نے اپنے بھائی کو نقصان میں ڈالا ایسے فعل کے ساتھ جو فعل اس نے اپنے مال میں کیا تھا اور اس نے اپنے پڑوسی یا غیر پڑوسی کو نقصان پہنچایا تو پھر اس کے کام کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر اسے چھوڑنا فاعل کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو اس ضرر سے جو اسے کرنے سے ہے تو پھر دونوں نقصانوں اور ضرروں میں سے بڑے اور اعظم کو ختم کر دیا جائے گا اور ان دونوں میں سے اعظم اصول میں حرمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی آدمی نے اپنے گھر میں روشن دان کھولا وہ اس سے اپنے بھائی کے گھر جھانکتا ہو اور اس میں اس کے اہل و عیال ہوں اور عورتوں کی حالت اپنے گھروں میں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعض کپڑے اپنے کام کاج کے وقت اتار دیتی ہیں اور انہیں کھول دیتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ شرمگاہوں (عورتوں) پر جھانکنا حرام ہے اور اس بارے میں نہی وارد ہے۔ پس شرمگاہوں (یعنی عورتوں) پر جھانکنے کی حرمت کی وجہ سے علماء نے یہ رائے دی ہے کہ وہ کھلے دروازہ کو بند کر دیں اور اس روشن دان کو جو اس نے کھولا بلاشبہ اس کے کھولنے میں اس کے لیے منفعت اور راحت ہے اور اسے بند کرنے میں اس کا ضرر اور نقصان ہے لیکن انہوں (علماء) نے دو ضرروں میں سے بڑے کو ختم کرنے کا قصد کیا ہے، کیونکہ ان دو میں سے ایک کو ختم کرنے سے کوئی چارہ کار نہیں اور اس باب میں حکم اسی طرح ہے، بخلاف امام شافعی رحمۃ تعالیٰ علیہ اور ان کے جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی مملوکہ زمین میں کنواں کھودا اور دوسرے نے اپنی ملکیتی زمین میں کنواں کھودا کہ وہ اس میں پہلے کنوئیں کا پانی چرا لے تو یہ جائز ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی ملکیت میں کنواں کھودا ہے لہٰذا اسے منع نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کی مثال ان کے نزدیک یہ ہے: اگر کسی نے اپنے پڑوسی کے کنوئیں کے پہلو میں (بیت الخلاء کا) گڑا کھودا جو اس کے پانی کو خراب اور فاسد کر دے تو اس کے لیے اسے منع کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں اس قول کو رد کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق

اور اس باب میں ضرر کی دوسری وجہ ہے جس سے علماء نے منع کیا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً تنور کا دھواں، حمام کا دھواں، گندم وغیرہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 327

دانے گاہنے کا گرد وغبار، وہ کیڑے جو کھلی زمین میں پھیلی ہوئی لید اور گوبر میں پیدا ہوتے ہیں اور جو بھی ضرر اس قسم کا ہو تو جونہی اس کا ضرر ظاہر ہو اور اس کے پھیلنے اور بڑھنے کا خدشہ ہو تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور رہا وہ جو تھوڑے سے وقت کے لیے ہو مثلاً کپڑے جھاڑنا اور دروازوں پر پڑا ہوا گرد وغبار جھاڑنا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس سے لوگوں کو کوئی چارہ کار نہیں۔ اور یہ ان میں سے بھی نہیں ہے جس کے ساتھ کوئی شے لازم ہوتی ہو، پس اس کی مثل سے روکنے میں ضرر کی نفی تھوڑی دیر اس پر صبر کرنے سے اعظم اور بڑی ہے۔ اور ایک پڑوسی کے لیے اپنے پڑوسی کے ساتھ آداب معاشرت میں سے یہ ہے کہ وہ اس کی اذیت رسانی پر اتنا صبر کرے جس پر وہ قدرت رکھتا ہے، جیسا کہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اذیت نہ دے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اس باب میں داخل ہونے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے جسے اسماعیل بن ابی اویس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایک عورت کے بارے میں پوچھا گیا جسے جنوں میں سے کسی نے مس کیا ہو، پس جب اس کا خاوند اس کے پاس آتا ہے اور وہ جنبی ہو جائے یا وہ اس کے قریب ہو تو اس کے سبب وہ حملہ شدید ہو جاتا ہے (یعنی جن کی تکلیف اور اذیت بڑھ جاتی ہے) تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ وہ اس کے قریب جائے، بلکہ میں تو حاکم وقت کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس آدمی اور اس کی عورت کے درمیان حائل ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَّ كُفْرًا جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ نہ مسجد قبا کی کوئی حرمت ہے اور نہ ہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی (کوئی تکریم ہے) تو کیا وہ اس اعتقاد کے ساتھ کافر نہیں ہوئے؟ (1) یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَّ كُفْرًا یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو آپ لے کر آئے (کفر کرتے ہوئے انہوں نے مسجد بنائی) یہ علامہ قشیری وغیرہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ان کی جماعت اس کے ساتھ تفرقہ ڈال رہی ہے تاکہ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جائیں۔ اور یہ اس بات پر تیری راہنمائی کرتی ہے کہ جماعت قائم کرنے سے سب سے بڑا مقصد اور واضح اور ظاہر غرض تالیف قلوب ہے اور اطاعت پر کلام کرنا ہے اور ایک دینی فعل کے ساتھ عزت وحرمت کو لانا ہے تاکہ باہم ملنے سے انس ومحبت واقع ہو جائے اور دل حسد اور کینے کی میل سے صاف ہو جائیں (2)۔

مسئلہ نمبر 9۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ سمجھا اور کہا: ایک مسجد میں دو اماموں کے ساتھ دو جماعتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ نظریہ تمام علماء کے خلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منع کا حکم مروی ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ کو متفرق کرنا ہے اور جماعت کی حکمت کو باطل کرنا ہے اور یہ اس قول کا ذریعہ اور سبب ہے جو جماعت سے الگ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے لیے عذر ہو پس تو وہ اپنی جماعت کا اہتمام کر لے اور اپنا امام آگے کر لے نتیجۃً اختلاف پیدا ہو جائے گا اور نظام باطل ہو جائے گا اور یہ چیز ان پر مخفی ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہی نظریہ ہے جس کی یہ شان ان کے ساتھ ہے اور یہ حکمت میں ان سے زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہے اور شریعت کی قطعیت کے بارے زیادہ آگاہ کرنے والا ہے (3)۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1013　3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اس میں مراد ابو عامر راہب ہے (1)۔ اسے راہب کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ عبادت گزار تھا اور علم کی تلاش میں لگا رہتا تھا پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے قنسرین میں حالت کفر میں مر گیا۔ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا: میں جو قوم بھی تمہارے ساتھ قتال کرتے ہوئے پاؤں گا تو میں ان کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ قتال کروں گا، پس وہ غزوۂ حنین تک لگاتار آپ کے خلاف جنگ لڑتا رہا۔ اور جب بنو ہوازن شکست سے دو چار ہوئے تو وہ روم کی طرف نکل گیا اور عیسائی ہو گیا اور اس نے منافقوں کی طرف پیغام بھیجا تم طاقت اور ہتھیاروں میں سے جتنی استطاعت رکھتے ہو اس کے مطابق تیاری کرو اور ایک مسجد بناؤ کیونکہ میں قیصر کی طرف جا رہا ہوں اور میں رومیوں کے ایک لشکر کے ساتھ آؤں گا اور میں یقیناً حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال دوں گا، چنانچہ انہوں نے مسجد ضرار بنائی (2)۔ اور یہی ابو عامر حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ کا والد ہے۔ اور الارصاد کا معنی ہے انتظار کرنا، آپ کہتے ہیں: أرصدت کذا جب تو کام کے بارے اسے تیار کرے اس کا انتظار کرتے ہوئے۔ ابو زید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رصدته و أرصدته فی الخیر (یعنی یہ دونوں فعل مجرد اور مزید فیہ۔ خیر اور بھلائی کے کاموں کے لیے بولے جاتے ہیں) اور شر کے بارے میں أرصدت له بولا جاتا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: صرف أرصدت کہا جاتا ہے اور اس کا معنی ارتقبت (میں نے انتظار کیا) ہے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے مسجد ضرار بنانے سے پہلے۔ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى یعنی ہم نے اسے بنانے سے سوائے نیکی اور خیر کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور دوستی کرتا ہے جیسا کہ انہوں نے بیماروں اور حاجت مندوں کا ذکر کیا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ افعال مقصود اور ارادوں کے ساتھ مختلف ہو جاتے ہیں، اسی لیے فرمایا: وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے خبث باطن کو جانتا ہے اور جس پر وہ قسم کھا رہے ہیں اس میں ان کے جھوٹا ہونے کو بھی جانتا ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝۱۰۸

"آپ نہ کھڑے ہوں اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو۔ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا، فِيْهِ کی ہ ضمیر کا مرجع مسجد ضرار ہے، یعنی آپ اس میں نماز کے لیے کبھی کھڑے نہ ہوں۔ اور کبھی نماز کو قیام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یقوم اللیل یعنی فلاں رات کے وقت نماز

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013 2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 32 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013

پڑھتا ہے۔ اور اسی طرح صحیح حدیث بھی ہے: من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه (1) (جس نے رمضان المبارک میں ایمان اور اخلاص نیت کے ساتھ نماز پڑھی تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے گئے) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:...... پس اسے ذکر کیا۔ تحقیق یہ بھی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس راستے سے بھی نہ گزرتے تھے جس میں مسجد تھی اور اس کی جگہ کو کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ بنانے کا حکم دے دیا کہ اس میں مردار، گندگیاں اور کوڑا پھینکا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَبَدًا یہ ظرف زمان ہے اور ظرف زمان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ظرف جو مقدر اور معین ہے مثلاً الیوم، اور دوسری ظرف مبہم ہے جیسے الحین اور الوقت اور ابد بھی اسی قسم سے ہے اور اسی طرح دھر بھی ہے (2) اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ابد اگرچہ ظرف مبہم ہے اس میں عموم نہیں ہے لیکن جب یہ لا نافیہ کے ساتھ متصل ہوا تو اس نے عموم کا فائدہ دیا، پس اگر فرماتا: لَا تَقُمْ تو یہ مطلق رکھنے میں کافی ہوتا۔ اور جب فرمایا: ابدا تو گویا یہ فرمایا: فی وقت من الاوقات ولا فی حین من الأحیان (یعنی اوقات میں سے کسی بھی وقت میں اس میں کھڑے نہ ہوں) رہا وہ نکرہ جو مثبت کلام میں ہو تو جب وہ کسی واقعہ کے بارے خبر ہو تو وہ عام نہیں ہوتا، تحقیق اہل لسان نے یہی سمجھا ہے اور فقہائے اسلام نے اسی کے بارے فیصلہ کیا ہے پس انہوں نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی بیوی کو کہا: انت طالق ابدا تو وہ ایک طلاق کے ساتھ مطلقہ ہوگی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یعنی اس کی دیواریں بنائی گئیں اور اس کی بنیادیں اٹھائی گئیں تقویٰ پر۔ اور الاس کا معنی عمارت کی اصل اور بنیاد ہے اور اسی طرح اساس بھی ہے۔ اور الأسس یا سے محصور و مقصور ہے۔ اور الاس کی جمع اساس ہے، جیسا کہ عس کی جمع عساس ہے۔ اور الاساس کی جمع اُسُس ہے، مثلاً قذال کی جمع قذل ہے۔ اور الاسس کی جمع اساس ہے، مثلاً سبب کی جمع اسباب ہے۔ اور أسست البناء تاسیسا (میں نے مضبوط عمارت بنائی) اور ان کا قول ہے: کان ذالك على أُسِّ الدهر، وأَسِّ الدهر، وإسِّ الدهر اس میں یہ تینوں لغات ہیں، یعنی وہ قدم الدہر اور وجہ الدہر پر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ میں لام قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام ابتدا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لزید احسن الناس فعلا (یعنی زید کام کرنے کے اعتبار سے لوگوں میں انتہائی حسین ہے) اور یہ (لام) تاکید کا تقاضا کرتا ہے۔ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یہ لَمَسْجِدٌ کی صفت ہے۔ أحق یہ اس مبتدا کی خبر ہے جو لمسجد ہے اور یہاں تقویٰ کا معنی وہ خصلتیں ہیں جن کے ساتھ سزا سے بچا جاتا ہے اور یہ فعلیٰ کے وزن پر وقیت سے ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور علماء کا اس مسجد کے بارے میں اختلاف ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور انہوں نے قول باری تعالیٰ: مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ سے استدلال کیا ہے اور مدینہ طیبہ میں پہلے دن مسجد قبا ہی بنائی گئی تھی، کیونکہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد سے پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد 1، صفحہ 269 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014 3۔ ایضاً

بنائی گئی تھی۔ یہ حضرت ابن عمر اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(1)۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں بیان کیا ہے جسے آپ سے ابن وہب، اشہب اور ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: انہوں نے فرمایا: دو آدمی اس مسجد کے بارے جھگڑ پڑے جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ تو ایک آدمی نے کہا: وہ مسجد قبا ہے اور دوسرے نے کہا: وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **هومسجدی هذا** وہ میری یہ مسجد ہے(2)۔ امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔

پہلا قول واقعہ کے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ: **فیه** میں ظرف کی ضمیر رجال متطہرین کا تقاضا کرتی ہے پس وہ مسجد قبا ہے۔ اور اس پر دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: یہ آیت اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ **فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ** فرمایا: وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے پس ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی(3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل قبا کو فرمایا: ''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہاری پاکیزگی کی تعریف کرتے ہوئے تم پر احسان فرمایا ہے، تم کیا کرتے ہو''؟ انہوں نے عرض کی: بے شک ہم بول و براز کے اثر کو پانی کے ساتھ دھوتے ہیں(4)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے حضرت طلحہ بن نافع سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے حضرت ابو ایوب، حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت **فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ** کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے گروہ انصار! بے شک اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی اور طہارت کے بارے میں تمہاری بہت اچھی تعریف فرمائی ہے تمہاری یہ پاکیزگی کیسی ہے''؟ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: اس کے سوا کوئی نہیں، بے شک ہم میں سے کوئی جب بول و براز کے لیے نکلے تو وہ زیادہ پسند کرتا ہے کہ پانی کے ساتھ استنجا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ وہی ہے پس تم اسے لازم پکڑے رکھو''(5)۔ اور یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ آیت میں جس مسجد کا ذکر ہے وہ مسجد قبا ہے، مگر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر نص بیان کی ہے کہ وہ آپ کی مسجد ہے پس اس کے ساتھ کوئی نظر و فکر کا عمل نہیں ہے۔

اور ابو کریب نے بیان کیا ہے ہمیں ابو اسامہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا، ہمیں صالح بن حیان نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبد اللہ بن بریدہ نے قول باری تعالیٰ: **فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ** (النور: 36)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014　2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3024، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 136　4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 36

5۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 62۔ سنن ابن ماجہ، باب الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 348، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے میں بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: بے شک یہ چار مساجد ہیں جنہیں انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ کعبہ معظمہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اور بیت اریحا بیت المقدس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اور مدینہ طیبہ کی مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد قباوہ ہیں جن کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ، من نحویوں کے نزدیک یہ منذ کے مقابلے میں ہے، پس منذ ظرف زمان میں اور مکان میں من کے قائم مقام ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک یہاں من کا معنی منذ کے معنی کی مثل ہے اور تقدیر کلام ہے: منذ أوّل یوم ابتدی بنیانه (پہلے دن سے اس کی بنیادوں کی ابتدا کی گئی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے من تأسیس اوّل الایام (پہلے دن کی بنیاد سے) پس یہ اس فعل کے مصدر پر داخل ہے جو اسس ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لمن الدیار بقنة الحِجْرِ أقوین من حِجَجٍ ومن دَهْرِ(1)

یعنی من مَرّحجج ومن مَرّدهر

اور جس نے اس طرف دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ علمائے نحو کا یہ اصول ہے کہ من کے ساتھ ازمان کو جر نہیں دی جائے گی، بلکہ ازمان کو منذ کے ساتھ جر دی جائے گی، آپ کہتے ہیں: ما رأیته منذ شهر أو سنة أو یوم اور یہ نہیں کہہ سکتے: من شهر اور نہ من سنة اور نہ ہی من یوم کہہ سکتے ہیں، پس جب کلام میں من واقع ہو اور اس کے پیچھے متصل زمانہ ہو تو وہاں کوئی مضمر لفظ مقدر مانا جائے گا جسے من کے ساتھ جر دی جا سکتی ہو، جیسا کہ ہم نے شعر کی تقدیر میں ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اچھا یہ ہے کہ یہ آیت تقدیر عبارت سے مستغنی ہو اور یہ کہ من لفظ اوّل کو جر دے رہا ہو کیونکہ یہ البداءة (ابتداء) کے معنی میں ہے گویا کہ من مبتدا الأیام کہا ہے۔(2)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ یعنی یہ بان تقوم ہے۔ پس یہ محل نصب میں ہے اور احق یہ حق سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور افعل دو مشترک چیزوں کے درمیان داخل ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک میں وہ مشترک معنی دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ پس مسجد ضرار اگرچہ باطل ہے اس میں کوئی حق نہیں ہے، لیکن یہ دونوں حق میں مشترک ہیں یا تو اسے بنانے والے کے اعتقاد کی وجہ سے یا اس کے اعتقاد کی وجہ سے جو یہ گمان کرتا ہے کہ مسجد ہونے کی وجہ سے اس میں قیام جائز ہے، لیکن دونوں اعتقادوں میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطنا باطل ہے۔ اور دوسرا ظاہراً اور باطنا حق ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی)

اور یہ بات معلوم ہے کہ خیر اور اچھائی کو جہنم سے دور کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ہر فرقہ کے اس اعتقاد کے مطابق ہے کہ وہ خیر پر ہے اور اس کی طرف اس کا لوٹنا خیر ہے، کیونکہ ہر گروہ انہی کے ساتھ خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور یہ العسل أحلى من الخل (کہ شہد سرکے سے زیادہ شیریں ہے) کے قبیل سے نہیں ہے، کیونکہ شہد اگرچہ میٹھا ہے پس ہر وہ شی جو ملائم ہو وہ میٹھی

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 378 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہوتی ہے، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ بعض لوگ سرکے کو شہد پر مقدم کرتے ہیں درآنحالیکہ مفرد کے مقابلے میں مفرد ہو اور کسی غیر کی طرف مضاف مضاف کے مقابلے میں ہو۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فِیْهِ جنہوں نے کہا ہے کہ مسجد سے مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد لی جائے گی تو پھر اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ میں ہا ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور فِیْهِ رِجَالٌ میں بھی ضمیر اسی کے لیے ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے تو پھر فیہ میں ہا ضمیر اس کی طرف لوٹے گی۔ یہ اس اختلاف کی بنا پر ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کی تعریف بیان کی ہے جنہوں نے نظافت اور طہارت کو پسند کیا اور نظافت و پاکیزگی کو ترجیح دی اور یہ انسانی مروت ہے اور شرعی وظیفہ ہے(1)۔ ترمذی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم اپنے خاوندوں کو کہو کہ وہ پانی کے ساتھ صفائی اور پاکیزگی حاصل کریں، کیونکہ میں ان سے شرم وحیا محسوس کرتی ہوں۔ فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے(2)۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ استنجا کے لیے پانی لے جاتے تھے۔ پس آپ تخفیف اور خشک کرنے کے لیے پتھر استعمال کرتے تھے اور پاکیزگی اور طہارت کے لیے پانی(3)۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: قیروان کے علماء اپنے وضو کی جگہوں میں مٹی کے ڈھیلے رکھتے تھے ان کے ساتھ صفائی کرتے تھے پھر پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 9۔ مخرج سے نکلنے والی نجاست کو صاف کرنا لازم ہے اور تمام بدن اور کپڑے کی نجاست میں تطہیر (یعنی اسے پاک کرنا) لازم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں کے لیے پانی کے موجود ہونے اور نہ ہونے کی دونوں حالتوں میں رخصت ہے۔ اور اسی کے مطابق عام علماء نے کہا ہے۔ اور ابن حبیب نے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: پتھروں کا استعمال نہیں کیا جائے گا مگر صرف پانی نہ ہونے کی حالت میں (4)۔ اور وہ اخبار جو پانی کے موجود ہونے کے باوجود پتھروں کے استعمال کے بارے میں ثابت ہیں وہ اسے رد کرتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ بدنوں اور کپڑوں سے نجاست زائل کرنے کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے، حالانکہ ان کا پسوؤں کے خون کی معافی اور اس سے تجاوز پر اجماع ہے جب تک کہ وہ انتہائی فحش اور زیادہ نہ ہو۔ نجاست کے ازالہ میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ واجب فرض ہے، اس کی نماز جائز نہیں ہوتی جس نے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھی چاہے وہ اس کے بارے جاننے والا ہو یا بھولنے والا، یہ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی امام شافعی، امام احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اسے ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور یہی قول ابو الفرج المالکی اور علامہ طبری کا ہے، مگر علامہ طبری نے کہا ہے: اگر نجاست درہم کی مقدار ہو تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے دبر کے حلقہ پر قیاس کرتے ہوئے درہم کی مقدار کی رعایت کرنے کا قول کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 5 2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 19، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1015 4۔ ایضاً

اور ایک گروہ نے کہا ہے: کپڑوں اور بدنوں سے نجاست کو زائل کرنا سنت سے ثابت ہے، یعنی یہ وجوب سنت ہے فرض نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: جس نے نجس کپڑے کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے اور اگر وقت نکل گیا تو پھر اس پر کوئی شی نہیں ہے۔

یہ قول امام مالک اور ابوالفرج کے سوا آپ کے اصحاب کا ہے اور آپ سے ابن وہب کی ہدایت بھی ہے اور خون تھوڑا ہونے کی صورت میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا نہ وقت میں اور نہ ہی وقت کے بعد اور بول و براز میں سے تھوڑا بھی ہو تو نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں سے یہ سب لیث کا قول ہے۔ اور ان سے ابن القاسم نے کہا ہے: یاد ہونے کی حالت میں نجاست کو زائل کرنا واجب ہوتا ہے نہ کہ نسیان اور بھول کی حالت میں اور یہ ان کے مفردات میں سے ہے۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: انهما ليعذبان وما يعذبان في كبير أما أحدهما فكان يمشي بالنميمة وأما الآخر فكان لا يستتر من بوله الحديث (1) (بے شک ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور انہیں کسی بڑے گناہ میں عذاب نہیں دیا جا رہا ان میں سے ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہ بچتا تھا) اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور عنقریب اس کا ذکر سورۂ سبحان میں آئے گا۔ انہوں نے کہا ہے: اور آدمی کو عذاب نہیں دیا جاتا مگر واجب ترک کرنے پر اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: ''اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہے'' (2)۔ دوسروں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں اپنے نعلین مبارک اتارنے سے استدلال کیا ہے جب کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ ان میں قذر اور اذیت رساں شے لگی ہوئی ہے...... الحدیث۔ اسے ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے، اس کا ذکر عنقریب سورہ طٰہٰ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ انہوں نے کہا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کا اعادہ نہیں کیا جو آپ پڑھ چکے تھے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اسے زائل کرنا سنت ہے اور آپ کی نماز صحیح ہے اور کامل نماز کے حصول کے لیے آدمی نماز کا اعادہ کر سکتا ہے جب تک وقت موجود ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے: اور رہا قلیل و کثیر کے درمیان فرق تو یہ بغلی درہم کی مقدار کے برابر ہے (یعنی بڑے دراہم وہ ہیں جن کی گولائی دینار کی گولائی کی مقدار کے برابر ہو) اور اسے دبر کے حلقہ پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہ دو وجہوں سے فاسد ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ مقداریں قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں لہٰذا یہ مقدار قبول نہیں کی جائے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دبر کے بارے میں اس میں جو تخفیف کی گئی ہے وہ ضرورت اور حاجت کے سبب رخصت ہے اور حاجت اور رخصتوں پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ قیاس سے خارج ہیں پس انہیں اس کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا (3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 182 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 29۔ ایضاً، حدیث نمبر 341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1016

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞

''تو کیا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی الله کے تقویٰ پر اور (اس کی) رضا جوئی پر بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی وادی کے کھوکھلے دہانے کے کنارے پر جو گرنے والا ہے پس وہ گر پڑا اسے لے کر دوزخ کی آگ میں۔ اور الله تعالیٰ راہ حق پر نہیں چلاتا ظالم قوم کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ اَسَّسَ یعنی کیا وہ جس نے بنیاد رکھی، یہ استفہام برائے تقریر ہے۔ اور من بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر خیر ہے۔ حضرت نافع، ابن عامر اور ایک جماعت نے أُسِّسَ بنیانُہٗ پڑھا ہے یعنی یہ صیغہ فعل مجہول ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو رفع دیا گیا ہے۔ اور ابن کثیر، ابوعمرو حمزہ، کسائی اور ایک جماعت نے أسّس بنیانہ پڑھا ہے یعنی صیغہ فعل معروف ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو نصب دی گئی ہے (1) اور یہی ابوعبید کی پسند ہے، کیونکہ جنہوں نے اس طرح پڑھا ہے وہ کثیر ہیں اور فاعل کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور نصر بن عاصم بن علی نے أفمن اسس کو رفع کے ساتھ اور بنیانہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے أساس بنیانہ بھی مروی ہے۔ اور ان سے أُسُّ بنیانِہ جر کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور مراد عمارت کی بنیاد اور اصل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو حاتم نے چھٹی قراءت بیان کی ہے اور وہ أفمن آساسُ بنیانہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ أس کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: خف و أخفاف اور کثیر استعمال أساس خفاف کی مثل ہے، شاعر نے کہا ہے:

أصبح المُلْك ثابتَ الآسَاسِ　فی البهَالیل من بنی العباس

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ عیسیٰ ابن عمر کی قراءت جس کے بارے سیبویہ نے بیان کیا ہے تنوین کے ساتھ ہے، اور آخر میں الف، الف الحاق ہے جیسا کہ تَتْرٰی کا الف جب کہ اسے تنوین دی جائے (2) اور شاعر نے کہا ہے:

يَسْتَنُّ فی عَلْقَی وفی مُكُورِ

اور سیبویہ نے تنوین کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے؟ عَلٰى شَفَا۔ الشفا کا معنی کنارہ اور حد ہے، سورۂ آل عمران میں پوری بحث گزر چکی ہے۔ اور جُرُفٍ را کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ابوبکر اور حمزہ نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً الشُّغُل اور الشُّغْل، الرُّسُل اور الرُّسْل، یعنی ایسا کھوکھلا دھانہ جس کی کوئی بنیاد اور اصل نہ ہو۔ اور الجرف وہ کھوکھلے دہانے جو وادیوں میں سیلاب کے سبب بن جاتے ہیں اور یہ وہ کنارے ہیں جو پانی کے ساتھ کھد جاتے ہیں۔ اور اس کی اصل الجرف اور الاجتراف سے ہے۔ اور یہ کسی بھی شے کا اپنی اصل اور بنیاد سے پھٹ جانا ہے۔

هَارٍ اس کا معنی ہے گرنے والا۔ کہا جاتا ہے: تھوّر البناء جب کوئی عمارت گر جائے اور اس کی اصل هائر ہے اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 84　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 85

اسمائے مقلوب میں سے ہے اس میں قلب کیا جاتا ہے اور اس کی یا کو مؤخر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: ھار و ھائر یہ زجاج نے کہا ہے: اور اسی کی مثل لاث الشی بہ ہے جب وہ شے کو اس کے ساتھ گھمائے۔ فھو لاث ای لائث اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: شاکی السلاح و شائك (السلاح) (ہتھیارں سے مسلح) عجاج نے کہا ہے:

لاثٍ به الأشَاء والعُبْرِی (1)

اس میں الأشاء سے مراد کھجور کا درخت ہے اور العبری سے مراد وہ بیری کا درخت ہے جو نہروں کے کنارے پر ہوتا ہے۔ اور لاث به کا معنی مطیف به (گھمانے والا) ہے۔ اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ اس میں اصل ھاو ر ہے، پھر کہا جاتا ہے: ھائر جیسا کہ صائم، پھر قلب کیا جاتا ہے اور ھار کہا جاتا ہے۔ اور کسائی کا خیال ہے کہ یہ واوی الفاظ میں سے بھی ہے اور یائی الفاظ میں سے بھی اور کہا جاتا ہے: تھوّر اور تھیّر۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے اس میں امالہ کیا جاتا ہے اور فتحہ دیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ اس میں انھار کا فاعل الجرف ہے، گویا کہ یہ فرمایا: فانھار الجرف بالبنیان فی النار (پس عمارت کا کھوکھلا کنارہ جہنم میں گر پڑا) کیونکہ کنارہ (حرف) مذکر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ بہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہو اور وہ بنانے والا ہے اور تقدیر کلام ہے: فانھا من أسس بنیانه علی غیر تقوی (پس وہ گر پڑا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد غیر تقویٰ پر رکھی) اور یہ آیت ان کے لیے ضرب المثل ہے یعنی جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اسلام پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد شرک اور نفاق پر رکھی۔ اور یہ بیان کیا کہ کافر کی بنیاد اس بنیاد کی طرح ہے جو جہنم کے کھوکھلے کنارے پر ہو وہ اپنے باسیوں سمیت اس میں گر پڑتا ہے۔ اور الشفاء کا معنی کنارہ ہے اور أشفی علی کذا کا معنی ہے وہ اس کے قریب ہوا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ہر شے جس کی ابتداللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی نیت کے ساتھ اور اس کی ذات کریم کے ارادہ اور قصد کے ساتھ ہو تو وہی وہ ہے جو باقی رہتی ہے اور اس کا مالک اس کے ساتھ سعادت اندوز ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتی اور بلند ہوتی ہے، اور اس کے بارے وہ اپنے اس قول کے ساتھ خبر دیتا ہے: وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۞ (الرحمٰن) (اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے) یہ دونوں وجہوں میں سے ایک پر دلیل ہے۔ اور وہ اس کے بارے اپنے اس قول سے بھی خبر دیتا ہے: وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (الکہف: 46) (اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور علماء نے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے: فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ کیا یہ حقیقت ہے یا مجاز؟ اس کے بارے دو قول ہیں (1) کہ یہ حقیقت ہے اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کی طرف بھیجے گئے تو اسے گرا دیا گیا اور اس سے نکلنے والا دھواں دکھائی دیا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کی روایت ہے (2)۔ اور بعض نے کہا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 85
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1017

ہے: آدمی کو اس میں داخل کیا جائے گا اس حال میں کہ اسے سر اور منہ پر پھنسیاں ہوں گی جیسا کہ کھجور کے درخت کے تنا کی حالت ہوتی ہے اور اسے اس سے نکالا جائے گا درآنحالیکہ وہ سیاہ جلی ہوں گی۔ اور اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ جگہ کھودی جائے گی جو گر پڑی پس اس سے دھواں نکلے گا۔ اور عاصم بن ابی النجود نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہنم زمین میں ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک میں نے وہ دھواں دیکھا ہے جو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نکلتا رہا(1)۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے: وہ عمارت جہنم کی آگ میں ہوگی، تو گویا وہ اس میں گر پڑی اور اس میں جھک گئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (القارعۃ) (تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا) اور ظاہر پہلا قول ہے کیونکہ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

"ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں مگر یہ کہ پارہ پارہ ہو جائیں ان کے دل اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا اس میں عمارت سے مراد مسجد ضرار ہے۔ رِيْبَةً یعنی ان کے دلوں میں شک اور نفاق رہے گا(2)، یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور نابغہ نے کہا ہے:

حلفتُ فلم أترك لنفسك رِيبةً　　وليس وراء الله للمرء مَذْهَبُ

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے تیری ذات کے لیے کوئی شک نہیں چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے سوا آدمی کے لیے کوئی اور مذہب نہیں۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد حسرت اور ندامت ہے، کیونکہ وہ اسے بنانے پر نادم ہوئے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اسی طرح حبیب اور مبرد نے بھی کہ ریبۃ سے مراد شدید غیظ وغضب ہے۔ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: یعنی ان کے دل پھٹ جائیں اور وہ مر جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (الحاقۃ) (پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل) کیونکہ رگ دل کٹ جانے کے سبب زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حضرت سفیان نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: مگر یہ کہ ان کے دل ان کی قبروں میں پارہ پارہ ہو جائیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب یہ قراءت کرتے تھے: ريبة في قلوبهم ولو قطعت قلوبهم (3) (ان کے دلوں میں کھٹکا رہے گا اگرچہ ان کے دل کٹ جائیں) حسن، یعقوب اور ابوحاتم نے غایت کی بنا پر الی أن تقطع پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے مسلسل شک میں رہیں گے یہاں تک کہ وہ مر جائیں اور انہیں یقین حاصل ہو جائے اور سب واضح ہو جائے۔ قراء نے قول باری تعالیٰ: تَقَطَّعَ میں اختلاف کیا ہے پس جمہور نے تقطع تا کے

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 41　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 405

ضمہ، قاف کے فتحہ اور طا کی شد کے ساتھ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

ابن عامر، حمزہ، حفص اور یعقوب نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے تا کو فتحہ دیا ہے، اور یعقوب اور ابو عبدالرحمن سے تقطع فعل مجہول قاف کی تخفیف کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور شبل اور ابن کثیر سے تقطع قاف کی تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ قُلُوْبِهِمْ یہ منصوب ہے، یعنی تم ان کے ساتھ ایسا کرو۔ تحقیق ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی قراءت ذکر کی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے اللہ نے اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے (اے ایمان والو!) پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے۔ اور یہی تو سب سے بڑی فیروز مندی ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ کہا گیا ہے یہ تمثیل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ:16) ((یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے) اور یہ آیت بیعت ثانیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ بیعت عقبہ کبریٰ ہے اور یہ وہ ہے جس میں انصار کے مردوں کی تعداد ستر سے کچھ زائد تھی اور ان میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے (1) اور وہ اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عقبہ (گھاٹی) کے نزدیک جمع ہوئے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ اپنے رب کے لیے اور اپنے لیے جو چاہیں شرط لگالیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے رب کے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور تم اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری ہر اس شے سے حفاظت کرو جس سے تم اپنی جانوں اور اپنے مالوں کی حفاظت کرتے ہو''۔ انہوں نے عرض کی: جب ہم ایسا کریں گے تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت''۔ انہوں نے عرض کی: سود نفع بخش

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہے، ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اس کے فسخ کا مطالبہ کریں گے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، الآیہ (1)۔ پھر اس کے بعد یہ حکم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر جہاد کرنے والے کے لیے عام ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت آقا کے اپنے غلام کے ساتھ معاملہ کرنے کے جواز پر دلیل ہے، اگرچہ سب آقا کا ہوتا ہے لیکن جب وہ اسے مالک بنا دے تو وہ اس کے ساتھ اس بارے میں معاملات کرے جو اس نے اس کے سپرد کیا ہے (2)۔ اور آقا اور اس کے غلام کے درمیان وہ جائز ہے جو اس کے اور کسی دوسرے کے درمیان جائز نہیں ہوتا، کیونکہ اس (غلام) کا مال اسی (آقا) کا ہے اور اس کے لیے اسے چھین لینا بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مخلوق کے درمیان شراء (خرید و فروخت) کی اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے ہاتھوں سے نکلے وہ اس کے عوض اور بدلے میں ایسی چیز لیتے ہیں جو ان کے لیے ان کی نسبت زیادہ نفع بخش ہو یا نفع میں اس کی مثل اور برابر ہو جو ان کے ہاتھ سے نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں جانوں اور اپنے مالوں کو ضائع کرنے اور اپنی رضا اور خوشی میں انہیں ہلاک کرنے کو خریدا اور انہیں اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا جب وہ ایسا کریں گے۔ اور یہ اتنا عظیم عوض اور بدلہ ہے کہ معوض (جس کا بدلہ دیا گیا) نہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پس اسے مجازاً ایسی شے میں جاری کر دیا جسے بیع اور شراء میں لوگ جانتے ہیں۔

پس بندے کی طرف سے اپنی جان اور مال کو حوالے کرنا ہے اور اللہ کریم کی جانب سے اجر و ثواب اور بخشش و عطا ہے پس اسے شراء کا نام دیا گیا ہے۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ہر نیکی کے اوپر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ بندہ اپنا خون بھی قربان کر دیتا ہے پس جب اس نے ایسا کر لیا تو پھر اس سے اوپر اور کوئی نیکی نہیں''۔ اور شاعر نے بر (نیکی) کے معنی میں کہا ہے:

الجود بالماء جود فیه مکرمة　　والجود بالنفس أقصى غاية الجود

پانی کے ساتھ سخاوت کرنا بھی سخاوت ہے اس میں عزت و تکریم ہے لیکن جان قربان کرنا سخاوت کی آخری حد ہے۔

اور اصمعی نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو کہا:

أُثَامِنُ بالنفس النفيسة ربَّها　　وليس لها في الخلق كلِّهم ثَمَنُ

میں اس عمدہ اور نفیس جان کا سودا اس کے رب سے کروں گا اور اس کی ساری مخلوق میں اور کوئی قیمت نہیں۔

بها تُشْتَرى الجناتُ، إن أنا بعتها　　بشیء سواها إن ذالکُم غَبَنُ

اس کے ساتھ جنتیں خریدی جا سکتی ہیں اگر میں اسے بیچوں اس کے سوا کسی شے کے عوض تمہیں خسارہ ہو گا۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1019

لئن ذهبت نفسی بدنیا أصبتُها لقد ذهبت نفسی وقد ذهب الثمن

اگر میری جان دنیا کے عوض چلی جائے اور میں اسے (دنیا کو) پالوں تو تحقیق میری جان بھی گئی اور ثمن یعنی قیمت بھی ضائع ہوگئی۔

حسن نے بیان کیا ہے: ایک اعرابی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ تو اس نے عرض کی: یہ کس کا کلام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے''۔ اس نے کہا: قسم بخدا یہ بیع نفع بخش ہے ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اسے توڑنے کا مطالبہ کریں گے۔ پس وہ ایک غزوہ کی طرف نکلا اور شہید کردیا گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: جس طرح اللہ تعالیٰ نے بالغ اور مکلف مومنوں سے جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح اس نے بچوں سے بھی اسے خرید لیا ہے پس انہیں درد پہنچایا اور انہیں بیمار کر دیا، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے اور اس میں بالغوں کا اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کسی چیز کے لاحق ہونے کے وقت زیادہ فائدہ اور نفع حاصل نہیں کرتے اور بچوں کے دکھ درد کے وقت ان کی طرف سے فساد بہت کم ہوتا ہے اور وہ بھی ہے جو کفالت کرنے والے والدین کو اس بارے میں اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے جو غم اور تکلیف میں سے انہیں پہنچتا ہے اور جو تربیت و کفالت میں سے ان کے متعلق ہوتا ہے(1)، پھر وہ رب کریم ان بچوں کو ایک عوض عطا فرماتا ہے جب وہ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں اس کی نظیر یہ ہے کہ تو ایک مزدور کرائے پر لیتا ہے تاکہ وہ عمارت بنائے اور مٹی منتقل کرے اور اس تمام کام میں اس کے لیے درد اور اذیت ہے، لیکن یہ جائز ہے کیونکہ اس کے عمل اور کام میں مصلحت اور فائدہ ہے اور اس لیے کہ اسے اس کی اجرت ملتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ اس کا بیان ہے جس کے لیے اور جس کے خلاف وہ قتال کرتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ نخعی، اعمش، حمزہ اور خلف نے مفعول کو فاعل پر مقدم پڑھا ہے(2)۔ اور اس سے امرئ القیس کا قول ہے

فإن تَقْتُلونا نُقَتِّلكم......

(پس اگر تم ہمیں قتل کرو گے تو ہم تمہارے ساتھ قتال کریں گے یعنی اگر تم نے ہمارے بعض کو قتل کیا تو ہمارے بعض تمہیں قتل کریں گے (ان تقتلوا بعضنا یقتلکم بعضنا) اور باقیوں نے مفعول پر فاعل کو مقدم کر کے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جارہی ہے کہ یہ ان کتب میں ہے اور جہاد اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا اصلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ہے۔ اور وعدًا اور حقًا دونوں مصدر ہیں اور تاکید کے لیے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ یعنی کوئی بھی نہیں ہے جو اپنا وعدہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر پورا

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1019 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 381

کرنے والا ہو اور وہ وعدے اور وعید دونوں کو پورا کرنے کا ضامن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی وفا تمام کو متضمن نہیں ہوتی۔ پس جہاں تک اس کا وعدہ ہے تو وہ تمام کو شامل ہے (اور وہ اسے پورا کرتا ہے) اور رہی وعید تو وہ بعض گنہگاروں، بعض گناہوں اور بعض احوال کے ساتھ مخصوص ہے (1)۔ اور اس کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ یعنی تم اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرو۔ اور البشارۃ کا معنی پیشانی میں خوشی اور سرور کا اظہار کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! زمین پر کوئی مومن نہیں مگر وہ اس سودے میں داخل ہے، ہوسکتا ہے۔ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جنت حاصل کرنا اور اس میں ہمیشہ رہنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

"توبہ کرنے والے (اللہ کی) عبادت کرنے والے، حمد وثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور نگہبانی کرنے والے اللہ کی (مقررہ) حدوں کی (اے میرے رسول!) خوشخبری سنا دیجئے ان (کامل) مومنوں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ، اَلتَّآئِبُوْنَ سے مراد وہ ہیں (2) جو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں حالت مذموم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں حالت محمودہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور التائب سے مراد رجوع کرنے والا (3) اور لوٹنے والا ہے اور اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا (فقط) معصیت سے رجوع کرنے والے سے افضل واعلیٰ ہے کیونکہ وہ دونوں امروں کو جمع کیے ہوتا ہے (یعنی معصیت سے پھر کر اطاعت کی طرف رجوع کرتا) الْعٰبِدُوْنَ یعنی وہ اطاعت کرنے والے جنہوں نے اپنی اطاعت سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قصد وارادہ کیا۔ الْحٰمِدُوْنَ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے ساتھ راضی اور خوش ہونے والے ہیں اور اس کی نعمت واحسان کو اس کی اطاعت میں صرف اور خرچ کرنے والے ہیں (4)۔ اور وہ جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہیں۔

السَّآئِحُوْنَ روزے رکھنے والے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (التحریم: 5) (عبادت کرنے والیاں، روزہ دار) اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: بے شک صائم کو سائح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ کھانے پینے اور نکاح کی تمام لذات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور حضرت ابو طالب نے کہا ہے:

وبالسائحین لایذوقون قطرۃ لربھم والذاکرات العوامل

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 408
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020

اور قسم ہے ان روزے داروں کی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں چکھتے اور کام کے دوران اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والیوں کی۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

برًّا یصلّی لیلہ و نہارہٗ یظَلّ کثیر الذکر للہ سائحا

نیکوکار اپنے دن رات نمازیں پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر روزے دار کرتا ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: اس امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے (1)۔ اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرفوع روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے'' (2)۔ زجاج نے کہا ہے: حسن کا مذہب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فرض روزہ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ روزے رکھتے رہتے ہیں۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: السَّآئِحُوْنَ سے مراد جہاد کرنے والے، مجاہدین ہیں۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیاحت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میری امت کی سیاحت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے'' (3)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سائحون سے مراد ہجرت کرنے والے، مہاجرین ہیں۔ یہ عبدالرحمن بن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو حدیث اور علم کی طلب اور تلاش میں سفر کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے افکار کے ساتھ اپنے رب کی توحید اور اس کی بادشاہی میں غور وفکر کرتے ہیں اور ان چیزوں میں جو اس نے اپنی توحید اور تعظیم پر دلالت کرنے والی علامات اور نشانیاں تخلیق فرمائی ہیں۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ بعض بندوں نے لوٹا پکڑا تا کہ وہ رات کی نماز کے لیے وضو کرے اور اپنی انگلی اس کے دستے میں داخل کی اور غور وفکر کرتے ہوئے بیٹھ گیا یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی، تو اسے جب اس بارے میں کہا گیا تو اس نے جواب دیا: میں نے اپنی انگلی لوٹے کے دستے میں داخل کی تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آ گیا: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ (غافر: 71) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں) اور میں نے یہ یاد کیا میں کیسے اس طوق کو ملوں گا اور میری بقیہ ساری رات اسی میں گزر گئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ لفظ ''س ی ح'' ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ سیاحت کا اصل معنی سطح زمین پر چلنا ہے جیسے پانی بہتا ہے، پس روزے دار ان چیزوں کو چھوڑنے میں اطاعت وفرمانبرداری پر مسلسل قائم رہتا ہے جنہیں وہ طعام وغیرہ میں سے چھوڑ دیتا ہے، پس وہ سائح (سیاحت کرنے والے) کے قائم مقام ہی ہوگا۔ اور غور وفکر کرنے والوں کے دل ان چیزوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں جن کے بارے انہوں نے ذکر کیا ہے اور حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 48		2۔ تفسیر ماوردی، جلد 1، صفحہ 407

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 336۔ ایضاً، حدیث نمبر 2127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے کچھ فرشتے کائنات میں سیاحت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہیں وہ میری امت کا درود پاک مجھے پہنچاتے ہیں''(1)۔ اور یہ لفظ صاد کے ساتھ صیاحین بھی روایت کیا جاتا ہے۔ اور یہ الصیاح سے ماخوذ ہے۔ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ یعنی وہ فرض اور دوسری نماز میں رکوع وسجود کرنے والے ہیں۔ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی سنت کے بارے حکم دینے والے ہیں اور بعض نے کہا ہے: ایمان کے بارے حکم دینے والے۔ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بعض نے کہا ہے: وہ بدعت سے روکنے والے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ کفر سے روکنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہر نیکی اور برائی کو شامل ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ یعنی وہ اس پر قائم رہنے والے ہیں جس کے بارے اللہ کریم نے انہیں حکم دیا ہے اور اس سے باز رہتے ہیں جس سے اللہ کریم نے انہیں منع کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل تاویل نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ ماقبل آیت کے ساتھ متصل ہے یا منفصل؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: پہلی آیت بذات خود ایک مستقل آیت ہے اور اس سودے کے تحت ہر ایک موحد آتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کیا تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اگرچہ وہ اس دوسری آیت میں مذکور صفات کے ساتھ یا ان سے زیادہ کے ساتھ متصف نہ ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ اوصاف شرط کی جہت پر مذکور ہیں اور دونوں آیتیں باہم مربوط ہیں، پس اس سودے کے تحت داخل نہیں ہوں گے مگر وہی مومنین جو ان اوصاف پر ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرتے ہوں۔ یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حرج میں مبتلا کرنے والا اور تنگی میں ڈالنے والا ہے اور آیت کا معنی اس بنا پر جس کا تقاضا علماء اور شریعت کے اقوال کرتے ہیں کہ یہ کامل مومنین کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ہے تاکہ اہل توحید ان پر قائم اور برقرار رہیں یہاں تک کہ وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو جائیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہیں۔ اور اس کی خبر مضمر ہے۔ یعنی اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ...... اِلٰی اخر الآیۃ...... لھم الجنۃ ایضا یعنی ان تمام کے لیے بھی جنت ہے، اگرچہ انہوں نے جہاد نہ بھی کیا، بشرطیکہ ان کی طرف سے عناد اور جہاد ترک کرنے کا قصد اور ارادہ نہ ہو، کیونکہ جہاد میں بعض مسلمان بعض کی طرف سے کافی ہوتے ہیں۔ اس قول کو علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ بہت اچھا ہے (ہٰذا حسن) کیونکہ اگر یہ صفت ان مومنوں کی ہو جن کا ذکر اس قول باری میں ہے: اِشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ تو پھر یہ وعدہ مجاہدین کے لیے خاص ہو جائے گا۔ اور حضرت عبداللہ کے مصحف میں ہے: التائبین العابدین، اِلیٰ آخرہا اور اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اتباع کے طریقہ پر یہ مومنین کی صفت ہے (لہٰذا حالت جری میں ہیں) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ مدح کی بنا پر حالت نصبی میں ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قول باری تعالیٰ: وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں واؤ کے بارے علماء کا اختلاف ہے پس کہا گیا ہے کہ یہ ناہین (روکنے والوں کی) صفت میں داخل ہے(3) جیسا کہ اس ارشاد میں داخل ہے: حٰمٓ ۚ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 595
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 88
3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382

الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ (المومن) پس بعض کو واؤ کے ساتھ اور بعض کو بغیر واؤ کے ذکر کیا۔ اور یہ کلام میں جائز اور مروج ہے اور اس کی مثل کی نہ کوئی حکمت تلاش کی جائے گی اور نہ کوئی علت۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ برائی سے روکنے والے اور نیکی کا حکم دینے والے کی مصاحبت کے لیے داخل ہوئی ہے پس قریب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کا مفرد ذکر کیا جائے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ: ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ۝ (التحریم: 5) ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ الْحٰفِظُوْنَ میں یہ اس کے معطوف کے قریب ہونے کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زائد ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے اس کا کوئی معنی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ ثمانیہ ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک سات صحیح اور کامل عدد ہے (1)۔ اور اسی طرح انہوں نے اس قول میں کہا ہے: ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ۝ (التحریم: 5) اور اسی طرح جنت کے دروازوں کے بارے میں ارشاد ہے: وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 73) (اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے) اور قول باری تعالیٰ ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکہف: 22) (اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا)

اسے ابن خالویہ نے ابوعلی فارسی کے ساتھ مناظرہ میں وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 73) کے معنی میں ذکر کیا ہے اور ابوعلی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ النحو ابوعبداللہ الکفیف المالقی سے مجھے بیان کیا ہے ور یہ ان میں سے تھے جو غرناطہ میں سکونت پذیر رہے اور ایک مدت تک وہاں ابن حبوس کے زمانہ میں پڑھایا کہ انہوں نے کہا: بعض عربوں کے نزدیک یہ لغت فصیحہ ہے۔ ان کا طریقہ اور ان کی عادت یہ ہے کہ جب وہ عدد گنتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں: واحد اثنان ثلاثة اربعة خمسة ستة سبعة و ثمانية تسعة عشرة اسی طرح یہ ان کی لغت ہے۔ اور جب بھی ان کے کلام میں امر آٹھ تک پہنچتا ہے تو وہ واؤ داخل کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ قریش کی لغت ہے۔ اس کا بیان اور اس کا نقض عنقریب سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور سورۂ زمر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے اس کا بیان آئے گا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

"درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے اگرچہ وہ مشرک ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، جب کہ واضح ہو گیا ان پر کہ یہ دوزخی ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب ابوطالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے (2) اور آپ نے ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ ابن مغیرہ کو ان کے پاس پایا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے چچا! کہو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس بارے تیری شہادت پیش کروں گا"۔ تو ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90-89

کہا: اے ابوطالب! کیا تو عبدالمطلب کے دین سے اعراض کرے گا؟ رسول اللہ ﷺ مسلسل وہ کلمہ ان پر پیش کرتے رہے اور اس قول کا ان کے لیے اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ آخر میں ابوطالب نے ان سے کلام کرتے ہوئے کہا: وہ عبدالمطلب کے دین پر ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم بخدا! میں تمہارے لیے ضرور مغفرت طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے تم سے منع نہ کیا گیا'' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کو فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ (القصص)(1) (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں، البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو)

پس اس بنا پر یہ آیت حضور نبی مکرم ﷺ کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے لیے ناسخ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ان کی موت کے بعد ان کے لیے مغفرت طلب کی جیسا کہ صحیح کے علاوہ دیگر کتب میں روایت موجود ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ یہ سورت قرآن کریم میں سے آخر میں نازل ہونے والی (سورتوں) میں سے ہے اور ابوطالب نے عنفوان اسلام کے وقت وصال فرمایا اور حضور نبی مکرم ﷺ ابھی مکہ مکرمہ میں تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کفار کے ساتھ دوستی ختم کرنے کو متضمن ہے چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اجازت نہیں دی کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار کریں۔ پس مشرک کے لے مغفرت طلب کرنا ان امور میں سے ہے جو جائز نہیں۔ پھر اگر کہا جائے: تحقیق یہ بات صحیح ہے کہ غزوۂ احد کے دن جب کفار نے حضور نبی مکرم ﷺ کے سامنے والے دانت شہید کر دیئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا: اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (2) (اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے) تو یہ اس کلمہ کے ساتھ جمع کیسے ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ اور مومنوں کو مشرکین کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع فرما دیا ہے؟ تو یہ کہا جائے گا: بے شک حضور نبی مکرم ﷺ سے یہ قول سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی سے بر سبیل حکایت بیان ہوا ہے۔ اور اس پر دلیل وہ آیت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: گویا میں حضور نبی مکرم ﷺ کے طرف دیکھ رہا ہوں کہ آپ سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کے بارے بیان فرما رہے ہیں کہ اس کی قوم نے اسے مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (3) (اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)۔ اور بخاری میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بارے خبر دینے لگے کہ اس نے یہ کہا: اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (4) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 40
2۔ صحیح مسلم، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 108
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 495

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت اس بارے میں صریح ہے کہ یہ آپ سے قبل کسی اور نبی علیہ السلام کی جانب سے بطور حکایت ہے، نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ابتداء اپنی طرف سے ارشاد فرمایا جیسا کہ بعض کا گمان ہے۔ واللہ اعلم۔ اور وہ نبی علیہ السلام جن کی آپ نے حکایت بیان کی وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورت ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں استغفار سے مراد نماز ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: میں نہیں ہوں کہ میں اہل قبلہ میں سے کسی پر نماز (جنازہ) پڑھنا چھوڑ دوں اگرچہ وہ حبشہ کی رہنے والی زنا سے حاملہ ہو، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کو نہیں سنا کہ اس نے مشرکین کے سوا کسی کی نماز سے روکا ہو، کیونکہ اس نے مشرکین کے بارے میں فرمایا ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ، الآیہ (1)۔

حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت مشرکوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کے بارے میں ہے۔ اور یہاں استغفار سے مراد صلوٰۃ (نماز جنازہ) ہی ہوگا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ زندوں کے لیے استغفار کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کے ایمان لانے کی امید اور توقع ہو سکتی ہے اور اچھے اور خوبصورت قول کے ساتھ ان کی تالیف قلوب کرنا اور دین کی طرف انہیں راغب کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آدمی اپنے کافر والدین کے لیے دعا مانگے اور ان کے لیے بخشش طلب کرے جب تک وہ زندہ ہوں۔ اور رہا وہ جو فوت ہو گیا تو اس سے امید منقطع ہوگئی لہٰذا اس کے لیے دعا نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنے مردوں کے لیے مغفرت طلب کرتے تھے پھر یہ آیت نازل ہوئی، تو وہ استغفار کرنے سے رک گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں زندوں کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع نہیں کیا یہاں تک کہ مر جائیں (2) (یعنی مرنے کے بعد ان کے لیے مغفرت کی دعا نہیں ہے)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل معانی نے کہا ہے: ما کان قرآن کریم میں دو صورتوں میں آتا ہے۔ ایک نفی کے معنی میں جیسے ارشاد گرامی ہے: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: 60) (تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت) اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران: 145) (اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے)

اور دوسرا نہی کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو) اور مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝

''اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا اور جب ظاہر ہوگئی آپ پر یہ بات کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو آپ بیزار ہوگئے اس سے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90
2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 52

بے شک بڑے ہی نرم دل (اور) بردبار تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ نسائی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے ایک آدمی کو اپنے والدین کے لیے استغفار کرتے ہوئے سنا حالانکہ وہ دونوں مشرک تھے، تو میں نے کہا: کیا تو ان دونوں کے لیے مغفرت طلب کر رہا ہے حالانکہ وہ دونوں مشرک ہیں؟ تو اس نے کہا: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا نہیں کی؟ چنانچہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اس کا ذکر کیا تب یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ (1) اس کا معنی یہ ہے: اے مومنو! تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ وہ فقط ایک وعدہ کو پورا کرنے کی وجہ سے تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور شرکاء کو چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ کفر پر مر گیا تو آپ کو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، تو آپ نے اس کے لیے دعا چھوڑ دی، کلام میں اِيَّاهُ کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے اور وعدہ کرنے والا آپ کا باپ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدہ کرنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے اپنے باپ سے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ حالت شرک میں ہی فوت ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔ اور اس وعدے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) (میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے)

قاضی ابوبکر بن العربی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو طالب کے لیے استغفار کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ ہی تعلق قائم کیا: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے کی وجہ اس کا کفر ظاہر ہونے سے پہلے ایک وعدہ تھا، پس جب آپ کے لیے اس کی طرف سے کفر ظاہر ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے، تو اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ اپنے چچا کے لیے کیسے استغفار کر سکتے ہیں حالانکہ اس کی موت حالت کفر میں واقع ہو چکی ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ موت کے وقت آدمی کی ظاہر حالت کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے گا، پس اگر کوئی حالت ایمان پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس (ایمان) کا حکم لگایا جائے گا اور اگر حالت کفر پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔ اور اس کے باطن کی حالت تیرا رب بہتر جانتا ہے، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ نے اپنے چچا کو کسی شے کا نفع دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ اور وہ عذاب کی تخفیف کے بارے شفاعت اور سفارش ہے نہ کہ جہنم سے نکلنے کے بارے میں، جیسا کہ ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں بیان کیا ہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 286۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3026، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1023

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۔ الأواہ کے بارے میں علماء کے پندرہ مختلف اقوال ہیں۔(۱) کہ وہ ایسی دعا کرنے والے ہیں جو کثرت اور اصرار کے ساتھ ہو۔ یہ حضرت ابن مسعود اور عبید بن عمیر نے کہا ہے((۲) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ انتہائی رحم کرنے والے ہیں۔ یہ حسن اور قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلا قول اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے: (۳) کہ وہ یقین کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عطا اور عکرمہ نے کہا ہے اور اسے ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ (۴) کہ وہ مومن ہیں، یہ لغت حبشہ کے مطابق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہ کہا ہے(1)۔ (۵) کہ وہ ایسی تسبیح کرنے والا ہے جو چٹیل اور وحشت ناک زمین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ یہ کلبی اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے(۶) کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے والا ہے۔ یہ عقبہ بن عامر نے کہا ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح بیان کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: انہ لأواہ۔ (۷) کہ وہ وہ ہے جو کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اقوال ایک دوسرے میں داخل ہیں اور تلاوت قرآن ان تمام کو جامع ہے۔

(۸) کہ وہ آہ نکالنے والے ہیں۔ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے تھے: ''آتش جہنم سے آہ اس سے پہلے کہ آہ تجھے کوئی فائدہ نہ دے''۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک آدمی بیت اللہ شریف کا طواف کثرت سے کرتا تھا اور اپنی دعا میں کہتا تھا: أَوِّهْ أَوِّهْ تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسے چھوڑ کیونکہ وہ آہیں بھرنے والا ہے''۔ پس میں ایک رات نکلا تو اچانک دیکھا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی کو رات کے وقت دفن کر رہے ہیں اور آپ کے پاس چراغ بھی تھا(2) (۹) کہ وہ فقیہ ہیں۔ یہ حضرت مجاہد اور نخعی نے کہا ہے۔ (۱۰) کہ آپ بڑی عاجزی و انکساری اور خشوع کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن شداد بن الہاد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی شے کے بارے گفتگو کی، آپ نے اسے ناپسند کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے روک دیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ اواھۃ ہے''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم الأواھۃ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الخاشعۃ (خشوع کرنے والی، ڈرنے والی) (۱۱) کہ یہ وہ ہے جب اس کے گناہوں کا ذکر کیا جائے تو یہ ان سے استغفار کرے یہ حضرت ابو ایوب نے کہا ہے۔ (۱۲) کہ یہ گناہوں سے کثرت سے آہیں نکالنے والا ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ (۱۳) کہ یہ خیر کی علامت اور نشانی ہے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے (۱۴) کہ یہ شفیق ہے۔ یہ عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی شفقت اور نرمی کی وجہ سے الاواہ کا نام دیا جاتا تھا (۱۵) کہ یہ ہر اس شے سے رجوع کرنے والا ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔ یہ حضرت عطا نے کہا ہے۔ اور اس کی اصل التأوہ سے ہے اور اس سے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 61　　2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 62

مراد سینے سے سنائی دینے والی وہ آواز ہے جو سانس اوپر چڑھنے کے سبب ہوتی ہے۔ حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام جب جہنم کا ذکر کرتے تو آہ نکالتے تھے۔ جوہری نے کہا ہے: شکایت اور تکلیف کے وقت ان کا قول أوۡہ من کذا (واؤ ساکنہ کے ساتھ) بلاشبہ وہ درد کا اظہار کرتا ہی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

فأوْهِ لذكراها إذا ما ذكرتها　　ومن بُعد أرضٍ بيننا و سماء

اور بسا اوقات وہ واؤ کو الف سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آہ من کذا اور بسا اوقات واؤ کو شد اور کسرہ دیتے ہیں اور ہا کو ساکن کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أوِّہْ من کذا اور بسا اوقات انہوں نے تشدید کے ساتھ ہا کو حذف کر دیا ہے اور کہا ہے: أوِّ من کذا اسے بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: آوِّہْ یعنی مد اور تشدید کے ساتھ اس میں واؤ پر فتحہ اور ہا ساکن ہے یعنی یہ لمبی آہ بھرنے کے لیے ہے۔ اور بسا اوقات وہ اس میں تا کو بھی داخل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أوّتاہ وہ اسے مد کے ساتھ بھی اور بغیر مد کے بھی پڑھتے ہیں۔ تحقیق کہا جاتا ہے أوّہ الرجل تأويها وتأوّہ تأوّھا جب کوئی أوّہْ (آ) کہے اور اس سے اسم الآھۃ مد کے ساتھ ہے۔ مثقب عبدی نے کہا ہے:

إذا ما قمتُ أرحَلُهَا بليلٍ　　تأوّہ آھۃَ الرجلِ الحزين

اور الحلیم کا معنی بہت زیادہ حلم والا، برباد ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جو گناہوں اور غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور تکلیفوں اور اذیتوں پر صبر کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس نے کبھی بھی کسی کو سزا نہیں دی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی میں اور کسی کی مدد نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی طرح تھے اور جب آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہوتے تو دو میل تک آپ کے دل کا اضطراب اور دھڑکن سنائی دیتی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

”اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دستور کہ گمراہ کر دے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کر دے ان کے لیے وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہیے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے (ساری) بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی اور نہ کوئی مددگار“۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور نہیں ہے کہ وہ ان کے دلوں میں ہدایت کے بعد گمراہی اور ضلالت واقع کر دے یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں بیان کر دے جن سے انہیں بچنا چاہیے اور وہ ان سے نہ بچیں، تو اس وقت وہ گمراہ کرنے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں اس بات پر بہت واضح دلیل ہے کہ گناہوں کا جب ارتکاب ہو اور ان کے پردے

پھٹ جائیں تو یہ گمراہ اور ردی ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اور رشد و ہدایت کو ترک کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے احسان سے ثبات، توفیق اور ہدایت کی التجا کرتے ہیں۔

ابو عمرو بن علاء نے قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ میں کہا ہے: یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے امر کے ساتھ ان پر حجت قائم کر دے، جیسا کہ فرمایا: وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا (الاسراء: 16) (اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ خاص کر مشرکین کے لیے استغفار نہ کریں اور وہ ان کے لیے طاعت اور معصیت عام طور پر ظاہر اور واضح کریں۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا اور اس میں سختی کی گئی تو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو اس حال میں فوت ہوئے کہ وہ شراب پیتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اور یہ آیت معتزلہ اور ان کے علاوہ ان کا رد ہے جو اپنی ہدایت اور اپنے ایمان کے خلق کے بارے قول کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾ کئی مقام پر اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے پیروی کی تھی نبی کی مشکل گھڑی میں اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ٹیڑھے ہو جائیں دل ایک گروہ کے ان میں سے پھر رحمت سے توجہ فرمائی ان پر، بے شک وہ ان سے بہت شفقت کرنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے کہ عبد بن حمید نے ہمیں بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں عبد الرزاق نے بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں معمر نے زہری سے، انہوں نے عبد الرحمن بن کعب بن مالک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ہمیں خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک تک جتنے غزوات لڑے ہیں میں سوائے بدر کے کسی غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا اور غزوۂ بدر سے جو پیچھے رہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی کو عتاب نہیں فرمایا۔ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے اور قریش اپنے قافلے کی مدد کے لیے نکلے تھے، پس بغیر کسی معین پروگرام کے فریقین کا آمنا سامنا ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ مجھے میری عمر کی قسم! بلاشبہ لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی جنگوں میں سب سے اشرف اور بلند مرتبہ جنگ بدر کا ہے اور میں یہ پسند کرتا تھا اے کاش! میں لیلۃ العقبہ کی بیعت کی جگہ میں اس میں حاضر ہوتا اس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور یقین کیا تھا، پھر اس کے بعد میں کبھی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا یہاں تک کہ غزوۂ تبوک ہو گیا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے آخری غزوہ تھا۔ اور حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا، پھر آگے طویل حدیث ذکر کی۔ بیان کیا: پس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں چل کر حاضر ہوا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور مسلمان آپ کے اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کا چہرہ مقدس) چاند کے چمکنے کی طرح چمک رہا تھا (اور روشن تھا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام سے خوش اور مسرور ہوتے تو آپ کا رخ زیبا چمک اٹھتا۔ پس میں آیا اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: ''اے کعب بن مالک تجھے بشارت اور مبارک ہو اس خیر و برکت والے دن کی جو تجھ پر آیا (اور وہ ان تمام دنوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے) جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ تو میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ حتی کہ اس مقام تک پہنچ گئے...... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ انہوں نے بیان کیا: اور ہمارے بارے میں یہ آیت بھی نازل کی گئی: اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ) اور آگے حدیث ذکر کی (1)۔ عنقریب صحیح مسلم کے حوالہ سے مکمل حدیث تین آدمیوں کے قصہ میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء نے اس توبہ اور توجہ کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار پر فرمائی اس کے بارے کئی اقوال ہیں۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: وہ توبہ جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت کی توجہ فرمائی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقوں کو بیٹھے رہنے کی اجازت دینے کی وجہ سے تھی۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ: 43) (درگزر فرمایا ہے اللہ نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں) اور مومنین پر ان میں سے بعض کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے کی طرف میلان اور رغبت آنے کی وجہ سے تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت کی توجہ یہ تھی کہ انہیں تنگی کی شدت اور سختی سے بچا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کی اذیت اور تکلیف سے خلاصی اور نجات دلانا ہے۔ اور اسے توبہ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں توبہ کا معنی موجود ہے اگرچہ یہ اس کی تعریف سے خارج ہے اور وہ پہلی حالت کی طرف لوٹنا اور رجوع کرنا ہے۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: بے شک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر توبہ میں کیا گیا ہے کیونکہ جب آپ ہی ان کی توبہ کا سبب ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41) (تو اللہ تعالیٰ کے لیے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 137-136

ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے)

قولہ تعالیٰ: الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ یعنی جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کی اتباع کی۔ اور مراد اس غزوہ کے تمام اوقات ہیں۔ اور اس سے اس کی معین ساعت مراد نہیں لی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سَاعَةِ الْعُسْرَةِ سے مراد وہ شدید ترین ساعت ہے جو اس غزوہ کے دوران ان پر گزری۔ اور العسرۃ سے مراد معاملے کی صعوبت اور شدت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ان پر سواریوں کی تنگی، زادراہ کی تنگی اور پانی کی تنگی یہ سب ان پر جمع ہو گئی تھیں (1)۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں کی تنگی کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک اونٹ پر نکل رہے تھے جسے وہ اپنے درمیان رو کے ہوئے تھے۔ اور ان کا زادراہ گھن لگی کھجوریں، متغیر جو اور بدبودار چربی تھی اور کوئی گروہ نکل رہا ہے کہ ان کے پاس سوائے کھجوروں کے اور کچھ نہیں تھا اور جب ان میں سے کسی کو بھوک لگتی تو وہ کھجور کا ایک ٹکڑا لیتا یہاں تک کہ اس کا ذائقہ پا لیتا، پھر وہ اسے اپنے ساتھی کو دے دیتا یہاں تک کہ وہ اس پر پانی کا گھونٹ پی لیتا اسی طرح وہ کرتے رہتے یہاں تک کہ وہ کھجور ان کے آخری ساتھی تک پہنچ جاتی اور کھجور میں سوائے گٹھلی کے کچھ باقی نہ بچتا۔ پس وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورے صدق ویقین کے ساتھ چلتے رہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سَاعَةِ الْعُسْرَةِ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہم شدید گرمی میں نکلے اور ایک منزل پر جا اترے وہاں شدید پیاس نے ہمیں آلیا یہاں تک کہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ ہماری گردنیں پیاس سے کٹ جائیں گی، یہاں تک کہ ایک آدمی اپنا اونٹ ذبح کرتا اور اس کے گوبر کو نچوڑتا اسے پیتا اور باقی اپنے جگر پر رکھ لیتا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر وبرکت کی دعا کا عادی بنایا ہے سو آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟'' عرض کی: ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک اٹھائے اور انہیں واپس نہ لوٹایا یہاں تک کہ آسمان نے سایہ کر دیا اور پھر برسنے لگا۔ پس انہوں نے وہ سب برتن بھر لیے جو ان کے پاس تھے، پھر ہم اسے دیکھنے کے لیے گئے اور ہم نے اسے نہ پایا اور لشکر آگے گزر گیا۔ (2)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان کیا ہے: ہم غزوۂ تبوک میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے پس لوگوں کو بھوک نے آلیا اور انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ہمیں اجازت عطا فرمائیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کر لیں اور ہم انہیں کھائیں اور چکنائی حاصل کریں۔ (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کر لو'')۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگئے اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر انہوں نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، البتہ آپ انہیں ان کے فالتو زادراہ لانے کا کہیے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں برکت کی دعا فرمائیے شاید اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر چمڑے کا ایک ٹکڑا منگایا اور اسے بچھا دیا گیا، پھر آپ نے بچا ہوا زادراہ لانے کی دعوت دی، پس ایک آدمی ایک مشت مکئی لا رہا ہے اور دوسرا ایک مشت کھجور لے کر آتا ہے اور ایک اور گوشت کا ٹکڑا لے کر آتا ہے یہاں تک کہ اس چمڑے کے ٹکڑے پر تھوڑی سی شی جمع ہو گئی۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 67 2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: پس میں نے اسے پھیلایا تو وہ بکریوں کے باڑے کی مقدار تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: ''تم اپنے برتنوں میں ڈال لو''۔ پس انہوں نے اسے اپنے برتنوں میں ڈال لیا، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے! یہاں تک کہ لشکر میں کوئی برتن باقی نہ رہا مگر انہوں نے اسے بھر لیا اور قوم نے اسے کھایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گئے۔ اور کچھ فالتو بھی بچ گیا تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جو بندہ بھی اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے ساتھ ان میں شک کرتے ہوئے ملاقات کرے گا تو اسے جنت سے روک دیا جائے گا'' (1)۔ اسے مسلم نے اپنی صحیح میں انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور ابن عرفہ نے کہا ہے: جیش تبوک کو جیش عسرہ کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شدید گرمی میں لوگوں کو غزوہ کی دعوت دی۔ پس یہ ان پر انتہائی سخت اور تنگی کا باعث بنا اور پھلوں کا پکنا بھی ظاہر ہو چکا تھا۔ فرمایا: جیش عسرہ کے ساتھ مثال بیان کی گئی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس سے قبل اتنی تعداد کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے اصحاب کی تعداد غزوۂ بدر میں تین سو، اس سے کچھ زائد تھی اور احد کے دن سات سو اور خیبر کے دن ایک ہزار پانچ سو فتح مکہ کے دن دس ہزار اور غزوۂ حنین میں تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور غزوۂ تبوک میں آپ کا لشکر تیس ہزار سے زائد تھا اور یہ آپ ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ رجب میں نکلے اور تبوک میں شعبان اور رمضان کے کچھ دن قیام کیا اور اپنے دستے بھیجے اور کئی اقوام کے ساتھ جزیہ پر صلح کی۔ اور اس غزوہ میں آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تو منافقوں نے کہا: آپ ﷺ نے انہیں ان کے بغض کی وجہ سے پیچھے چھوڑا۔ پس وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نکلے اور آپ کو اس کی اطلاع دی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: أما ترضى أن تكون لي بمنزلة هارون من موسىٰ (2) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے پیچھے اسی طرح ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہارون علیہ السلام تھے)

اور بیان فرمایا کہ آپ ﷺ کے حکم سے آپ کا بیٹھنا اجر میں آپ کے ساتھ نکلنے والے کے برابر ہے، کیونکہ اس کا دارومدار شارع کے حکم پر ہے۔ بے شک اس کو غزوۂ تبوک کہا گیا ہے کیونکہ نبی مکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ تبوک کی دلدلی زمین میں پیالے لے کر داخل ہو رہے ہیں اور اسے حرکت دے رہے ہیں تاکہ پانی نکل آئے، تو آپ نے فرمایا: مازلتم تبوكونها بوكا پس اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ تبوک رکھ دیا گیا۔ الحسی (کسرہ کے ساتھ) وہ دلدل (پانی) جسے ریتلی زمین جذب کر لیتی ہے، پس وہ صلابت (سخت زمین) تک پہنچ جائے تو وہ اسے روک لیتی ہے پس تو اس سے ریت کو کھود کر اسے نکال سکتا ہے اور یہی احتساء (کھودنا) ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **مِنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ**، قلوب سیبویہ کے نزدیک تزیغ کے ساتھ مرفوع ہے اور کاد میں کان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے الحدیث مضمر ہوگا، کیونکہ خبر اسے اسی طرح لازم ہوتی ہے جیسے کان کو لازم ہوتی ہے۔ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 42 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد جلد 2، صفحہ 633

اگر تو چاہے تو کاد کے ساتھ اسے رفع دے، اور تقدیر عبارت ہوگی: من بعد ما کاد قلوب فریق منهم تزیغ اور اعمش، حمزہ اور حفص نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے یہ گمان کیا ہے کہ جس نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قلوب کو کاد کے ساتھ رفع دے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جسے انہوں نے جائز نہیں کہا وہ دوسرے کے نزدیک تمام کو مذکر قرار دینے کی بنا پر جائز ہے۔ فراء نے بیان کیا ہے: رَحُبَ البلاد و أرحبت (یعنی اس میں مذکر و مونث دونوں جائز ہیں) اور رحبت اہل حجاز کی لغت ہے اور تزیغ کے معنی میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ تھکاوٹ، مشقت اور شدت کے ساتھ وہ (دل) ضائع ہو جائیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ ممانعت اور نصرت میں حق سے پھر جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے بعد کہ ان میں سے ایک فریق نے پیچھے بیٹھے رہنے اور نافرمانی کا قصد کیا پھر وہ آپ کے ساتھ مل گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے واپس پلٹنے کا قصد کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی اور انہیں اس کے بارے حکم دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا ان پر توجہ فرمانا یہ ہے کہ اس نے ان کے دلوں کا تدارک کیا یہاں تک کہ وہ ٹیڑھے نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء اور دوستوں کے ساتھ یہی سنت ہے جب وہ کسی ہلاکت پر جھانکنے لگیں اور وہ اپنے آپ کو ہلاکت پر ٹھہرا لیں تو وہ ان پر سخاوت کا بادل برساتا ہے اور ان کے دلوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

منك أرجو ولستُ أعرف رَبًّا ... يُرتَجى منه بعضَ مامنك أرجو

وإذا اشتدت الشدائد في الأرض ... على الخلق فاستغاثوا و عجُّوا

وابتليتَ العباد بالخوف والجوع ... و صَرُّوا على الذنوب ولجُّوا

لم يكن لي سواك ربِّ ملاذ ... فتيقَّنت أنني بك أنجو

اور اللہ تعالیٰ نے ثلاثہ (تین) کے حق میں فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا (تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تاکہ وہ بھی رجوع کریں) پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق دی تاکہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں وسعت دے دی اور انہیں سزا دینے میں جلدی نہ کی تاکہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ قول بھی ہے: ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تاکہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تاکہ وہ ان سے حالت رضا کی طرف لوٹ آئیں۔ الختصر یہ کہ اگر ان کے بارے میں پہلے اس کے علم میں نہ ہوتا کہ اس نے ان کے لیے توبہ کا فیصلہ کیا ہے تو وہ توبہ نہ کرتے، اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "تم عمل کرو پس ہر وہ کام آسان بنا دیا گیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے (اعملوا فكلٌّ مُيَسَّر لما خلق له)(1)

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 334

اللهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۱۸﴾

''اوران تینوں پر بھی (نظر رحمت فرمائی) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ تعالیٰ سے مگر اسی کی ذات، تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تا کہ وہ بھی رجوع کریں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا کہا گیا ہے: اوران تینوں پر بھی نظر رحمت فرمائی جنہیں توبہ سے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ حضرت مجاہد اور ابو مالک سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جو غزوۂ تبوک سے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ اور محمد بن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ خلفوا کا معنی ترکوا (چھوڑ دیئے گئے) ہے، کیونکہ خلفت فلانا کا معنی ہے ترکتہ (میں نے اسے چھوڑ دیا) وفارقتہ قاعدا عما نھضت فیہ (اور میں نے اسے بیٹھے ہوئے چھوڑا اس وقت جب میں اس سے اٹھا)۔ اور عکرمہ بن خالد نے خَلَفُوا پڑھا ہے، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مقیم رہے۔ اور جعفر بن محمد سے روایت ہے کہ انہوں نے خالفوا پڑھا ہے (انہوں نے آپ کی مخالفت کی)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خلّفوا کا معنی ہے انہیں منافقین سے مؤخر کر دیا گیا اور ان کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ منافقین کی توبہ قبول نہیں کی گئی۔ اور کئی اقوام نے عذر پیش کیے تو آپ نے ان کے عذر قبول کر لیے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہی صحیح ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ان لوگوں کے معاملے سے ہم تینوں کا فیصلہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول کر لیے جب انہوں نے آپ کو حلف دے دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فیصلہ فرمادے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے وہ اس میں سے نہیں ہے خُلِّفنا تَخَلُّفَنا عن الغزو (ہمارے غزوہ سے پیچھے رہنے کو مؤخر کر دیا گیا) بے شک یہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملہ کو موخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ کے سامنے قسم کھائی اور عذر پیش کیے پس آپ نے ان سے وہ عذر قبول کر لیے (1)۔ اس بارے میں یہ حدیث طویل ہے۔ یہ اس کا آخر ہے۔

اور وہ تین جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا وہ حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع عامری اور ہلال ابن امیہ الواقفی رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ تمام انصار میں سے تھے۔ بخاری اور مسلم نے ان کی حدیث بیان کی ہے۔ پس مسلم نے حضرت کعب بن مالک سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے غزوات میں تشریف لے گئے میں کبھی بھی کسی غزوہ میں آپ سے پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے اور یہ کہ میں غزوۂ بدر میں پیچھے رہ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پیچھے رہنے والے کو عتاب نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 360

فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان قریش کے قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر کسی مقررہ وعدہ کے اکٹھا کر دیا۔ اور تحقیق میں عقبہ کی رات رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا جس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور وثوق کا اظہار کیا اور میرے لیے اس کے بدلے بدر کی حاضری زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہ تھی، اگرچہ لوگوں میں بدر کا تذکرہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور میرا امتحان اور آزمائش اس وقت تھی جب میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہا، کیونکہ میں کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں اس غزوہ میں آپ ﷺ سے پیچھے رہ گیا، قسم بخدا! اس سے پہلے کبھی میں نے دو سواریاں جمع نہیں کیں حتی کہ میں نے اس غزوہ میں دو جمع کیں، پس رسول اللہ ﷺ شدید گرمی میں اس غزوہ پر تشریف لے گئے اور آپ نے انتہائی دور اور جنگل کا سفر اختیار کیا اور آپ کا مقابلہ کثیر التعداد دشمن کے ساتھ تھا، پس آپ ﷺ نے مسلمانوں کے لیے ان کا معاملہ واضح کیا تاکہ وہ اپنے غزوے (جنگ) کی تیاری خوب اچھی طرح کریں اور آپ نے انہیں اس وجہ اور سبب کے بارے بتایا جو آپ ارادہ رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمان بھی کثیر تعداد میں تھے اور انہیں حافظ کی کتاب جامع نہیں اس سے مراد دیوان ہے حضرت کعب نے کہا: بہت کم ہی کوئی آدمی تھا جو غائب ہونے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کا یہ گمان تھا کہ وہ اس وقت تک مخفی اور چھپا رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بارے میں وحی نازل نہ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ اس غزوہ پر اس وقت تشریف لے گئے جب پھل پکے ہوئے تھے اور سائے گھنے تھے۔ اور میں ان کی طرف زیادہ مائل تھا، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمان اس کے لیے تیار ہو گئے اور میں صبح کے وقت نکلتا تاکہ میں ان کے ساتھ تیار ہو جاؤں پھر لوٹ آتا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتا اور اپنے دل میں کہتا: جب میں نے ارادہ کر لیا تو میں اس کی طاقت اور قدرت رکھتا ہوں۔ پس اسی طرح مسلسل مجھ سے دیر ہوتی رہی اور لوگوں نے تیاری جاری رکھی پس ایک صبح رسول اللہ ﷺ اور آپ کی معیت میں مسلمان غزوہ کے لیے چل پڑے اور میں نے اپنی تیاری کے بارے کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پھر میں صبح کے وقت گیا اور لوٹ آیا اور کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پس اسی طرح مجھ سے دیر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ غزوہ کی طرف آگے بڑھ گئے، پس میں نے کوچ کرنے کا ارادہ کیا کہ میں انہیں پالوں گا، اے کاش میں ایسا کرتا! پھر مجھے وہ قدرت نہ دی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب بھی میں لوگوں میں باہر نکلتا تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہو جاتی کہ میں اپنے لیے کوئی اسوہ اور نمونہ نہیں دیکھتا مگر ایسا آدمی جس پر نفاق کا طعن کیا گیا ہے یا ایسا آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے ضعفاء میں سے معذور قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مجھے یاد نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ تبوک پہنچ گئے پس آپ نے تبوک میں ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے فرمایا: ''کعب بن مالک نے کیا کیا ہے''؟ تو بنی سلمہ کے ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ اسے اس کی خوشحالی اور اپنی ذات میں اترانے نے روک لیا ہے۔ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: کتنا برا ہے جو تو نے کہا ہے! قسم بخدا! یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کے بارے میں سوائے خیر کے کچھ نہیں جانتے۔ پس رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔

پس اس اثنا میں کہ آپ اسی حال پر تھے کہ آپ نے سفید لباس میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے ساتھ سراب چل رہا ہے، تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوخیثمہ ہو''، تو وہ حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی نکلے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے ایک صاع کھجوریں صدقہ کیں یہاں تک کہ منافقوں نے آپ پر عیب لگایا اور طعنہ دیا۔ پس کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس چل پڑے ہیں تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ تو میں نے جھوٹ گھڑنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگا: میں کس کے سبب کل آپ کی ناراضگی سے بچ سکتا ہوں اور میں اپنے گھر والوں میں سے ہر صاحب رائے سے اس پر (مشاورت کے ذریعہ) مدد لینے لگا۔ پس جب مجھے بتایا گیا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں تو مجھ سے باطل زائل ہوگیا یہاں تک کہ میں نے جان لیا کہ میں ہرگز کبھی بھی آپ سے کسی شے کے سبب نہیں بچ سکوں گا، چنانچہ میں نے سچائی اور صدق کو جمع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت قدم رنجہ فرما ہوئے اور جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور اس میں دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر لوگوں کے لیے تشریف رکھتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو پیچھے رہنے والے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور وہ آپ کے پاس عذر پیش کرنے لگے اور آپ کو حلف دینے لگے اور وہ اسی سے کچھ زائد لوگ تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے ان کے ظاہر اعلان (عذر) کو قبول فرمایا اور ان سے بیعت لی اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ان کے باطن (یعنی مخفی امر اور راز) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، یہاں تک کہ میں حاضر ہوا پس جب میں نے سلام عرض کیا تو آپ نے اسی طرح تبسم فرمایا جیسے اس پر تبسم کیا جاتا ہے جس پر غصہ اور ناراضگی ہو۔ پھر فرمایا: ''آؤ'' پس میں آگے چلتا آیا یہاں تک کہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تجھے کس چیز نے پیچھے چھوڑ دیا، کیا تو نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ قسم بخدا! اگر میں آپ کے سوا اہل دنیا میں سے کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو مجھے یقین ہوتا کہ میں عذر کے سبب اس کی ناراضگی سے نکل جاؤں گا۔ تحقیق مجھے فصاحت اور قوت کلام عطا کی گئی ہے، لیکن قسم بخدا! میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے آج آپ کے ساتھ جھوٹی بات کر بھی دی اور اس کے ساتھ آپ مجھ سے راضی ہو بھی جائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ پر ناراض کر دے گا۔ اور اگر میں نے سچی بات آپ سے کر دی تو آپ اس میں مجھ پر ناراض ہوں گے تو بلاشبہ میں اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اچھے انجام کی امید رکھتا ہوں۔ قسم بخدا! میرے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ قسم بخدا! میں کبھی بھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں آپ سے پیچھے رہ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تک اس کی بات کا تعلق ہے تو اس نے بالکل سچ کہا ہے پس تو اٹھ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تیرے بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے''۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بنی سلمہ کے لوگ جھپٹ پڑے اور میرے پیچھے ہو گئے انہوں نے مجھے کہا: قسم بخدا! ہمیں تیرے بارے میں یقین ہے کہ تو نے اس سے پہلے کوئی گناہ اور غلطی نہیں کی! تحقیق تو اس بارے میں عاجز آ گیا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس طرح کا کوئی عذر پیش نہیں کیا جس طرح پیچھے رہنے والوں نے آپ کے پاس عذر پیش کیے۔ پس تیرے گناہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیرے لیے استغفار کرنا ہی کافی تھا۔ وہ کہتے ہیں: قسم بخدا! وہ مجھے لگاتار اور مسلسل تنبیہ کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ جاؤں اور اپنے آپ کو جھٹلا دوں۔

پھر میں نے ان کو کہا: کیا اس میں میرے ساتھ کوئی اور بھی ملا ہے؟ انہوں نے بتایا: ہاں تیرے ساتھ دو اور آدمی بھی اس میں شامل ہیں ان دونوں نے بھی اسی طرح کہا ہے جیسے تو نے کہا ہے۔ تو انہیں بھی اسی طرح کہا گیا ہے جیسے تجھے کہا گیا، میں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا: مرارہ بن ربیعہ عامری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ کعب کہتے ہیں: پس انہوں نے میرے سامنے دو نیک اور صالح آدمیوں کا ذکر کیا۔ تحقیق یہ دونوں غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور یہ دونوں قابل تقلید اور اسوہ تھے۔ پس میں بھی ڈٹ گیا جس وقت انہوں نے میرے سامنے ان دونوں کا ذکر کیا۔ اور رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہم تینوں سے کلام کرنے سے منع کر دیا۔ ان میں سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے۔ پس لوگوں نے ہم سے اجتناب کر لیا اور وہ ہمارے لیے بدل گئے یہاں تک کہ زمین بھی میرے لیے اجنبی ہوگئی اور اس زمین میں کوئی شے نہ تھی جسے میں پہچانتا، پس ہم پچاس راتیں اسی حالت پر رہے۔ پس رہے میرے دونوں ساتھی تو انہوں نے عاجزی اور اطاعت اختیار کی اور اپنے گھروں میں بیٹھے رونے لگے اور میں قوم کا جوان اور مضبوط آدمی تھا، لہٰذا میں باہر نکلتا رہا پس میں نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں چکر لگاتا لیکن کوئی آدمی مجھ سے کلام نہ کرتا اور میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کو سلام عرض کرتا درآنحالیکہ آپ نماز کے بعد اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے۔ تو میں دل میں کہتا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے جواب کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں؟ پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھنے لگتا اور نظر بچا کر آپ کی طرف دیکھتا، پس جب میں اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اعراض فرما لیتے، یہاں تک کہ جب مجھ پر مسلمانوں کی زیادتی طویل ہوگئی، بڑھ گئی تو میں چل پڑا یہاں تک کہ میں ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور وہ میرے چچا کا بیٹا تھا اور مجھے تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب تھا میں نے اسے سلام کیا، لیکن اس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا۔ تو میں نے اسے کہا: اے ابوقتادہ میں تجھے الله تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں! کیا تو جانتا ہے کہ میں الله تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس وہ خاموش رہا تو میں نے دوبارہ اسے کہا اور میں نے اسے قسم دی لیکن وہ خاموش رہا، میں نے پھر کہا اور اسے پکارا تو اس نے کہا: الله تعالیٰ اور اس کا رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں، تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں پیٹھ پھیر کر چل پڑا یہاں تک کہ میں دیوار کو پھلانگ آیا، پس اس اثنا میں کہ میں مدینہ طیبہ کے بازار میں چل رہا تھا تو اہل شام کے ان نبطیوں میں سے ایک نبطی سامنے آیا جو اناج لاتے تھے اور مدینہ طیبہ میں بیچتے تھے۔

وہ کہہ رہا تھا: کون کعب بن مالک پر میری رہنمائی کرے گا؟ آپ کہتے ہیں: پس لوگ اس کے لیے میری طرف اشارے کرنے لگے حتی کہ وہ میرے پاس آ گیا اور اس نے شاہ غسان کا ایک خط مجھے دیا، میں خود کاتب تھا پس میں نے اسے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا: اما بعد! چونکہ میرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تیرے صاحب نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے اور الله تعالیٰ نے کوئی کھلا یا تنگ گھر تیرے لیے نہیں بنایا، پس تو ہمارے ساتھ مل جا ہم تیری غمگساری کریں گے۔ پس جونہی میں نے اسے پڑھا تو کہا: یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ پس میں اسے لے کر تنور پر آیا اور اسے اس میں جلا دیا، یہاں تک کہ جب پچاس

میں سے چالیس دن گزر گئے اور وحی رکی رہی تب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: بے شک رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تجھے حکم دے رہے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جا۔ تو میں نے پوچھا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے اور اس کے قریب نہ جا۔ کعب کہتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دونوں ساتھیوں کی جانب بھی اسی طرح کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو کہا: تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا اور انہیں کے پاس رہ یہاں تک کہ الله تعالیٰ اس بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے۔

آپ کہتے ہیں: ہلال بن امیہ کی بیوی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہلال بن امیہ بوڑھا اور ناکارہ آدمی ہے اس کے پاس کوئی خادم نہیں ہے، تو کیا آپ ناپسند کرتے ہیں کہ میں اس کی خدمت کروں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں لیکن وہ تیرے قریب نہ آئے''۔ تو اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ اس میں کوئی حرکت نہیں ہے! اور قسم بخدا! جب سے اس کا معاملہ ہوا ہے وہ اس دن سے آج دن تک مسلسل رو رہا ہے۔ کعب کہتے ہیں: تو میرے بعض گھر والوں نے کہا: اگر تو بھی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت مانگ لے، تحقیق آپ نے ہلال بن امیہ کو اجازت عطا فرما دی ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے۔ تو میں نے کہا: میں اس بارے میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب نہیں کروں گا اور مجھے کیا معلوم کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں گے جب میں اس بارے اجازت طلب کروں اور میں جوان آدمی ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس اسی طرح دس راتیں گزر گئیں۔ اور ہمارے لیے اس وقت سے پچاس راتیں مکمل ہو گئیں جب سے ہمارے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ فرمایا: پھر میں نے پچاسویں رات کی صبح کو اپنے گھروں میں سے ایک مکان کی چھت پر فجر کی نماز پڑھی، پس اس اثنا میں کہ میں اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جس کا ذکر الله تعالیٰ نے ہمارے بارے میں کیا ہے کہ میری جان مجھ پر بوجھ ہے اور زمین وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہے میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز سنی جو سلع پہاڑ پر چڑھا ہوا تھا وہ اپنی بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! تجھے بشارت اور مبارک ہو۔ آپ فرماتے ہیں: پس میں سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ وسعت آ گئی ہے۔ فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے الله تعالیٰ کے ہماری توبہ قبول کرنے کے بارے لوگوں میں اعلان کیا۔ جس وقت آپ نماز فجر پڑھ چکے، تو لوگ ہمیں مبارکباد دینے چل پڑے اور میرے ساتھیوں کی جانب بھی بشارت اور خوشخبری دینے کے لیے گئے۔ اور ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے ہوئے میری طرف آیا اور ایک دوڑنے والا بنی اسلم میں سے میری جانب دوڑا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ پس آواز گھوڑے سے زیادہ تیز تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی وہ مجھے خوشخبری سنا رہا تھا تو میں نے اس کے لیے اپنے کپڑے اتار دیئے اور میں نے اس کی بشارت کے عوض وہ اسے پہنا دیئے۔ قسم بخدا! میں اس دن ان کے سوا کسی شی کا مالک نہ تھا اور میں نے دو کپڑے عاریۃً لیے اور انہیں خود پہنا پھر میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا قصد کرتے ہوئے چل پڑا۔ اور لوگ گروہ در گروہ مجھے ملے اور وہ مجھے توبہ کی قبولیت پر مبارکباد دینے لگے، وہ کہتے: تجھے مبارک ہو، الله تعالیٰ نے رحمت کی توجہ تجھ پر فرمائی ہے، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہو گیا اور رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد لوگ جمع تھے۔ پس طلحہ بن

عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھے، دوڑتے ہوئے آئے یہاں تک کہ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی۔ قسم بخدا! ان کے سوا مہاجرین میں سے کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ فرمایا: پس کعب ہے کہ وہ طلحہ کے اس عمل کو نہیں بھولے گا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مقدس فرحت و سرور سے چمک رہا تھا اور آپ نے فرمایا: ''تجھے وہ خیر و برکت والا دن مبارک ہو جو تجھ پر گزرا ہے اس وقت سے جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا ایسے لگتا گویا آپ کا چہرہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ آپ کہتے ہیں: اور ہم یہ جانتے تھے۔ پس جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی توجہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صدقہ کر دوں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے لیے اپنا بعض مال روک لے یہ تیرے لیے بہتر ہے''۔ تو میں نے عرض کی: میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ کے ساتھ نجات عطا فرمائی ہے۔ اور بلاشبہ میری توبہ میں سے یہ ہے کہ میں جب تک باقی رہا سچ کے سوا کوئی بات نہیں کروں گا۔ فرماتے ہیں: قسم بخدا! میں مسلمانوں میں سے کسی کو نہیں جانتا جسے اللہ تعالیٰ نے بات کی سچائی میں آزمایا ہو اس وقت سے لے کر میرے آج تک جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا وہ احسن (اور عمدہ) ہو اس سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمایا، قسم بخدا! میں نے آج تک جھوٹ کا قصد نہیں کیا۔ جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عرض کیا، اور بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ باقی عمر میں بھی میری حفاظت فرمائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۠ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: قسم بخدا! جب اللہ تعالیٰ نے مجھے دین اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کبھی کوئی احسان اور انعام نہیں فرمایا جو میرے خیال کے مطابق میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچ بولنے سے بڑا اور عظیم ہو، کیونکہ اگر میں آپ کے پاس جھوٹ بولتا تو ہلاک کر دیا جاتا جیسا کہ وہ ہلاک ہوئے جنہوں نے جھوٹ بولا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے کہا جنہوں نے جھوٹ بولا جس وقت اس نے وحی نازل فرمائی جو اس کی نسبت شر اور برا ہے جو کچھ اس نے کسی کو کہا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ) (قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی

طرف تا کہ تم معاف کردو انہیں سو منہ پھیر لو ان سے یقیناً وہ ناپاک ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تا کہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم تینوں کا معاملہ ان کے معاملے سے مؤخر کیا گیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول فرما لیے جس وقت انہوں نے قسمیں کھالیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرما دی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ مؤخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے فیصلہ فرما دے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا وہ اس میں سے نہیں ہے کہ غزوے سے ہمارے پیچھے رہنے کے سبب ہم چھوڑ دیئے گئے، بے شک وہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملے کو مؤخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قسم کھائی اور آپ کے پاس عذر پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرما لیا(1)۔

قولہ تعالیٰ: ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ یعنی ان پر زمین تنگ ہو گئی وسیع ہونے کے باوجود، کہا جاتا ہے: منزل رحب و رحیب و رحاب (وسیع منزل) اور ما مصدر یہ ہے ای ضاقت علیهم الأرض برحبها کیونکہ وہ چھوڑ دیئے گئے تھے نہ ان کے ساتھ معاملات کیے جاتے تھے اور نہ کلام کی جاتی تھی۔ اور اس میں گناہوں اور معصیت کا ارتکاب کرنے والوں کو چھوڑ دینے پر دلیل موجود ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی ان کے سینے غم اور وحشت کے ساتھ تنگ ہو گئے اور اس بدسلوکی کے سبب (ان کے سینے بوجھل ہو گئے) جسے انہوں نے صحابہ کرام سے پایا۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی جائے پناہ نہیں جہاں وہ پناہ لے سکیں ان سے درگزر فرمائے جانے اور ان کی توبہ قبول ہو جانے کی صورت میں مگر اسی کی ذات (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں) ابوبکر الوراق نے کہا ہے: التوبة النصوح (خالص توبہ) یہ ہے کہ توبہ کرنے والے پر زمین وسیع ہونے کے باوجود تنگ ہو جائے اور اس پر اس کی جان بوجھل ہو جائے، جیسا کہ حضرت کعب اور ان کے ساتھیوں کی توبہ رضی اللہ عنہم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کا آغاز ہوا۔ ابو زید نے کہا ہے: میں نے چار چیزوں میں غلطی کی ہے (اور وہ) اللہ تعالیٰ سے ابتداء ہونے کے بارے میں ہیں، میں نے گمان کیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (المائدہ: 54) (محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے) اور میرا گمان تھا کہ میں اس سے راضی ہوتا ہوں تب وہ مجھ سے راضی ہوتا ہے۔ (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (المائدہ: 119) (راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ سے)

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 63-360

اور میں نے گمان کیا کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں تب وہ میرا ذکر کرتا ہے، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (العنکبوت:45) (اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے) اور میں نے گمان یہ کیا کہ میں توبہ کروں گا تب وہ میری طرف رحمت کی توجہ فرمائے گا، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پھر ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تا کہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (النساء:136)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ان کو وسعت دے دی اور ان کی سزا میں جلدی نہ کی جیسا کہ اس نے ان کے سوا کے ساتھ کیا۔ اللہ جل وعز نے ارشاد فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء:160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لیے)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یہ اہل صدق کے ساتھ ہونے کے بارے امر ہے اور تین کے قصے کے بعد بہت اچھا ہے جنہیں سچ نے نفع پہنچایا اور انہیں منافقوں کے مراتب سے دور ہٹا دیا گیا۔ مطرف نے کہا ہے: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے ہوئے سنا ہے: جب کبھی کوئی آدمی سچ بولتا ہے اور وہ جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی عقل سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ بڑھاپے سے فساد عقل میں سے اس حد تک نہیں پہنچتا جہاں تک کوئی دوسرا پہنچ جاتا ہے (یعنی بڑھاپے اور فساد کے سبب اس کی عقل مختل اور ماؤف نہیں ہوتی)

یہاں مومنین اور صادقین سے جو مراد ہیں ان کے بارے مختلف اقوال ہیں، پس کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان کو ہے جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ خطاب تمام مومنین کو ہے، یعنی تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی تم ان کے ساتھ ہو جاؤ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکلے نہ کہ منافقین کے ساتھ، یعنی تم سچ بولنے والوں کے مذہب اور ان کے راستے پر ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں، یعنی تم اعمال صالحہ کر کے جنت میں ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد وہ ہیں جن کا ذکر اس قول میں ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ...... الآیہ تا قولہ...... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (البقرہ:177) (نیکی (بس یہ) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ...... یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں)

اور یہ قول بھی ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب:23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد مہاجرین ہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ کے دن کہا تھا: بے

شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں صادقین کا نام دیا ہے پس فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ، الآیہ (الحشر: 8) (نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لیے ہے) پھر اس نے جنہیں مفلحین کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ، الآیہ (الحشر: 9) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حکم ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن کے ظاہر اور باطن برابر ہیں، ایک جیسے ہیں۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول ہی حقیقت ہے اور یہی وہ غایت ہے جس پر انتہا ہوتی ہے، کیونکہ یہی صفت ہے جس کے ساتھ عقیدے سے نفاق اور فعل اور عمل سے مخالفت اٹھ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے اور اس صفت والے کو صدیق کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اور جو مراتب اور زمانے میں ان سے کم اور ادنیٰ ہیں (1)۔ اور رہے وہ جنہوں نے کہا: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو آیۃ البقرہ سے مراد ہیں تو وہ انتہائی اعلیٰ اور عظیم صدق ہے اور بہت کم لوگ اس کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہی آیت احزاب کا معنی ہے۔ اور رہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تفسیر تو وہ وہی ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے، کیونکہ ان میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کا حق ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے عقل و فہم حاصل کی کہ وہ اقوال میں سچ، اعمال میں اخلاص اور احوال میں صفا اور درستی کو لازم پکڑے، پس جو اس طرح ہوا وہ ابرار (نیکو کار لوگوں) کے ساتھ مل گیا اور غفار (بہت زیادہ مغفرت والا فرمانے) کی رضا اور خوشنودی تک پہنچ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم پر سچ کو اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور بے شک نیکی جنت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور سچ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صدیق لکھ دیا جاتا ہے'' (2)۔ اور جھوٹ اس کی ضد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فجور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور فجور جہنم کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کذاب لکھ دیا جاتا ہے'' (3)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس کذب (جھوٹ) عار اور شرم ہے اور جھوٹ بولنے والوں سے شہادت (گواہی) کا حق چھین لیا گیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جھوٹ میں آدمی کی شہادت رد کر دی جو اس نے بولا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے: میں نہیں جانتا کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ بولا یا لوگوں میں سے کسی کے بارے میں جھوٹ بولا؟

اور شریک بن عبداللہ سے پوچھا گیا: اے ابو عبداللہ! ایسا آدمی جس کے بارے میں نے سنا ہو کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک جھوٹ کے بارے کوئی صلح نہیں ہو سکتی نہ سنجیدگی کے ساتھ اور نہ استہزا اور تمسخر کے ساتھ۔ اور نہ اس کی کہ تم میں سے کوئی کسی شے کا وعدہ کرے پھر اسے پورا نہ کرے، اگر چاہو تو یہ پڑھ لو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کیا تم کذب میں کوئی رخصت دیکھتے ہو؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کی بات میں جھوٹ بولنے کی خبر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1027　2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 326　3۔ ایضاً

قبول نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سچ بولے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس کی حدیث قبول کی جائے گی۔ اور صحیح یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے کی شہادت اور اس کی خبر قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ قبول عظیم مرتبہ ہے اور ولایت شریفہ ہے لہٰذا یہ حاصل نہیں ہو سکتی مگر اس کو جس کی خصلتیں کامل ہوں اور جھوٹ سے بڑھ کر بری خصلت کوئی نہیں پس یہ ولایت سے معزول کر دیتی ہے اور شہادتوں کو باطل کر دیتی ہے (1)۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

”نہیں مناسب تھا مدینہ والوں کے لیے اور جو ان کے اردگرد دیہاتی لوگ ہیں کہ پیچھے بیٹھ رہتے اللہ کے رسول پاک سے اور نہ یہ کہ متوجہ ہوتے اپنے نفسوں کی طرف ان سے بےفکر ہو کر، یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی تکلیف اور نہ بھوک راہ خدا میں اور نہ وہ چلتے ہیں کسی چلنے کی جگہ جس سے کافروں کو غصہ آئے اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ مگر یہ کہ لکھا جاتا ہے ان کے لیے ان (تمام تکلیفوں) کے عوض نیک عمل، بےشک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکیوں کا اجر۔ اور وہ (مجاہدین) نہیں خرچ کرتے تھوڑا اور نہ زیادہ اور نہ طے کرتے ہیں کسی وادی کو مگر یہ کہ لکھ لیا جاتا ہے ان کے لیے تاکہ صلہ دے اللہ تعالیٰ بہترین ان کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے“۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ یہ کلام ظاہر کے اعتبار سے خبر ہے لیکن اس کا معنی ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا یہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ اور یہ عتاب اور جھڑک ہے ان مومنین کے لیے جو اہل یثرب میں سے تھے اور اس کے پڑوس میں رہنے والے عرب قبائل سے تھے، جیسا کہ مزینہ، جہینہ، اشجع، غفار اور اسلم جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے بیٹھے رہے تھے۔ اور اس کا معنی ہے: ان مذکورہ لوگوں کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ پیچھے بیٹھے رہتے، کیونکہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1028

جنگ کے لیے کوچ ان میں ہوا، بخلاف ان کے علاوہ کے کیونکہ انہیں جنگ کے لیے جمع کیا ہی نہیں گیا، یہ ان میں سے بعض کے قول کے مطابق ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کے لیے کوچ کرنے کا مطالبہ ہر مسلم کے لیے ہو اور ان کے قرب و جوار میں ہونے کی وجہ سے انہیں عتاب کے ساتھ خاص کیا گیا اور یہ کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ یعنی نہ یہ کہ وہ راضی ہوئے اپنے نفسوں کے لیے آسودگی اور راحت کے ساتھ اس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشقت میں ہوں۔ کہا جاتا ہے: رغبت عن کذا یعنی میں نے اسے اپنی برتری جتائی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس (اس میں ظمأ کا معنی پیاس ہے) عبید ابن عمیر نے ظماء مد کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں مثلا خطأ و خطاء، ولا نصب یہ ماقبل پر معطوف ہے، یعنی تکلیف، تھکاوٹ اور اس میں لا تاکید کے لیے زائدہ ہے۔ اور اسی طرح ولا مخمصة اور نہ بھوک۔ اس کا اصل معنی بطن کی کمزوری ہے۔ اور اسی سے رجل خمیص اور امراۃ خُمصانة (نحیف مرد اور نحیف عورت) ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا یعنی وہ کسی زمین کو طے نہیں کرتے)۔ يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ یعنی ان کے اسے طے کرنے کے ساتھ کافروں کو غصہ آئے۔ اور یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ موطئا کی صفت ہے بمعنی غائظا، وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ یعنی قتل یا ہزیمت۔ اس کی اصل نلتُ الشئ أنال سے ہے یعنی میں نے اسے پالیا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ ان کے اس قول سے ہے أمر منیل منه (وہ امر جو اس سے پایا گیا) یہ التناول سے نہیں ہے، کیونکہ التناول نلته العطية (میں نے اسے عطیہ دیا) سے ہے۔ کسی دوسرے نے کہا ہے: نلت أنول من العطية (میں نے عطیہ پایا) یہ واوی ہے اور النیل یہ یائی ہے۔ تو کہتا ہے: نلته فأنا نائل یعنی میں نے اسے پالیا (ای أدركته) وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا عرب کہتے ہیں: وادٍ و اودية یہ خطاب قیاس ہے۔ نحاس نے کہا ہے: جو میں جانتا ہوں اس میں اس کے سوا فاعل اور افعلة معروف نہیں۔ اور قیاس یہ ہے کہ جمع وداوی بنائی جاتی، پس انہوں نے دو واووں کے اجتماع کو ثقیل سمجھا حالانکہ وہ کبھی ایک واؤ کو بھی ثقیل جانتے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے وُقّتت میں أُقتت کہا ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ نے واصل جو کہ آدمی کا نام ہے کی تصغیر میں أويصل بیان کیا ہے اور وہ اس کے سوا میں یہ نہیں کہتے اور فراء نے واد کی جمع اوداء بیان کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی جمع أوداة بنائی جاتی ہے جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

عرفت بِبُرْقَة الأوداةِ رَسْمًا مُحِيلا طال عَهْدُك مِن رُسومِ

اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر خوف اور ڈر کے عوض ستر ہزار نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور صحیح روایت میں ہے: "گھوڑے تین قسم کے ہیں...... اس روایت میں ہے...... رہا وہ گھوڑا جو اس کے لیے اجر ہے کہ آدمی نے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اہل اسلام کے لیے چراگاہ یا باغ میں باندھ رکھا ہو پس اس نے اس چراگاہ یا باغ میں سے جو بھی کھایا اس کی تعداد کے مطابق اس کی نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی لید اور بول کی تعداد

کے بدلے بھی اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی''۔ الحدیث۔ یہ تو وہ ہے جوان کے لیے اپنی جگہوں میں ہے تو پھر کیا حالت ہوگی جب وہ اس کے دشمن کی زمین میں داخل ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مال غنیمت میں استحقاق دشمن کی زمین میں داخل ہونے اور ان کے شہروں میں پہنچنے سے ثابت ہو جاتا ہے، پس اگر وہ اس کے بعد فوت بھی ہو جائے تب بھی اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا، یہ قول اشہب اور عبد الملک کا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور امام مالک اور ابن القاسم رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس کے لیے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجر کا ذکر کیا ہے اور سہم (مال غنیمت کا حصہ) کا ذکر نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے علاقوں کو روندنے، ان کے اموال پانے اور انہیں ان کے گھروں سے نکالنے کے لیے اس کو اجر وثواب قرار دیا ہے اور یہی چیز انہیں غصہ دلاتی ہے اور ان پر ذلت و رسوائی داخل کرتی ہے، پس یہی مال غنیمت پانے اور قتل کرنے اور قیدی بنانے کے قائم مقام ہوا۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو پھر غنیمت کا استحقاق ان کی زمین میں داخل ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے نہ کہ فقط اونٹ ہانکنے سے، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو قوم بھی اپنے گھروں کے درمیان میں روندی گئی وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ منسوخ ہے: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے) اور یہ کہ اس کا حکم اس وقت تھا جب مسلمان قلیل تھے، جب زیادہ ہو گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو پیچھے رہنا چاہے اس کے لیے اسے مباح قرار دیا۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جماعت دیہاتیوں کی طرف بھیجی تا کہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور واپس لوٹ آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جب آپ بذات خود جنگ کے لیے تشریف لے جائیں تو پھر کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر عذر کے آپ سے پیچھے بیٹھا رہے۔ اور رہے آپ کے سوا دیگر ائمہ اور حکمران! تو جو چاہے مسلمانوں میں سے اس سے پیچھے رہ جائے بشرطیکہ اسے لوگوں کی اشد حاجت اور ضرورت نہ ہو۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ ولید بن مسلم نے کہا ہے: میں نے اوزاعی، ابن مبارک، فزاری، سبیعی اور سعید بن عبد العزیز کو اس آیت کے بارے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ آیت اس امت کے پہلوں کے لیے بھی ہے اور آخر کے لیے بھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قتادہ کا قول اچھا ہے اور اس کی دلیل تبوک کے غزاۃ ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام چھوڑی ہیں جو کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی

طے کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ رہے"۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے ہمارے ساتھ ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں عذر نے روک لیا ہے" (1)۔

مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ نے فرمایا: "بے شک مدینہ طیبہ میں ایسے لوگ ہیں کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کسی وادی کو طے کیا مگر وہ تمہارے ساتھ تھے (کیونکہ) انہیں مرض نے روک لیا ہے" (2)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذور کو اسی کی مثل اجر عطا کیا جتنا آپ نے طاقتور عمل کرنے والے کو اجر عطا فرمایا۔ اور بعض لوگوں نے کہا: بے شک معذور کے لیے اجر دوگنا کیے بغیر ہوتا ہے اور بذات خود کام کرنے والے کے لیے اجر دوگنا کر دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ تو اللہ تعالیٰ پر اپنی مرضی اور رائے کو ٹھونسنا ہے اور اس کی رحمت کی وسعت کو تنگ کرنا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے عیب قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک انہیں قطعی طور پر دوگنا ثواب دیا جائے گا اور ہم کسی بھی جگہ دوگنا ہونے کے بارے قطعیت کا قول نہیں کرتے، کیونکہ اس کا دار و مدار نیتوں کی مقدار پر ہے اور یہ ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے اور وہ جس کے ساتھ یقین کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ وہاں تضعیف ہے اور تیرا رب اس کے بارے خوب جانتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث اور آیات میں سے ظاہر یہ ہے کہ اجر میں مساوات اور یکسانیت ہے۔ ان میں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: "جس نے خیر اور نیکی پر راہنمائی کی تو اس کے لیے نیکی کرنے والے کے اجر کی مثل اجر ہوگا" (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے وضو کیا اور نماز کی طرف نکلا پھر اس نے لوگوں کو پایا کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مثل اجر عطا فرمائے گا جس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور اس میں حاضر ہوا" (5)۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظاہر ہے: وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء: 100) (اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آلے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ)

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سچی نیت ہی اصل اعمال ہے، پس جب فعل طاعت میں نیت صحیح ہوئی اور پھر کسی مانع کے سبب اسے کرنے والا اس سے عاجز آ گیا تو اس عاجز کے اجر اور قدرت رکھنے والے فاعل کے اجر کے مساوی اور برابر ہونے میں کوئی بعد اور دوری نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔ واللہ اعلم

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 340
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 141
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1029
4۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 137
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

"اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے، تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تا کہ تفقہ حاصل کر سکیں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تا کہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ بات یہ ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں) کیونکہ اگر تمام نکل پڑیں تو ان کے پیچھے اہل و عیال ضائع ہو جائیں، ہلاک ہو جائیں، پس چاہیے کہ ان میں سے ایک فریق جہاد کے لیے نکلے اور ایک فریق مقیم رہے تا کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں اور وہ حرام کی ہوئی اشیاء کو خوب یاد کریں، یہاں تک کہ جب جہاد پر جانے والے لوٹ کر آئیں تو مقیم رہنے والے انہیں وہ بتائیں جو احکام شرع میں سے انہوں نے سیکھیں ہیں اور وہ جن کا نزول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تازہ ہوا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قول الا تنفروا اور اس سے پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت طلب علم کے واجب ہونے میں اصل ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہیں اور آپ نہ نکلیں پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ دیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ یہ جاننے کے بعد کہ تمام کے نکلنے کی وسعت نہیں ہے پھر کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ہر قبیلہ سے چند آدمی۔ اور ان کے باقی ماندہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقی رہیں تا کہ وہ آپ سے دین کا علم حاصل کریں اور اس میں تفقہ حاصل کریں، پھر جب جہاد پر جانے والے ان کی طرف لوٹ کر آئیں تو یہ انہیں وہ سب بتائیں جو انہوں نے سنا اور جس کا علم حاصل کیا۔ اس میں کتاب و سنت میں تفقہ کے واجب ہونے کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ یہ کفایہ ہے عین نہیں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے) پس اس میں ہر وہ داخل ہے جو کتاب و سنت کو نہیں جانتا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَلَوْلَا نَفَرَ اخفش نے کہا ہے: یہ فھلا نفر کے معنی میں ہے پس کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لغت میں طائفہ سے مراد جماعت ہے اور کبھی اس کا اطلاق اس سے کم پر ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ آدمیوں تک پہنچ جاتا ہے اور ایک کے لیے اس کا اطلاق نفس طائفۃ کے معنی میں ہوتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً (التوبہ: 66) میں طائفہ سے مراد ایک آدمی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں مراد جماعت ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک عقلی وجہ ہے اور دوسری لغوی۔ عقلی وجہ یہ ہے کہ امر غالب یہ ہے کہ فرد واحد کے ساتھ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور رہی لغوی وجہ تو قول باری تعالیٰ: لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ جمع کی ضمیر کے ساتھ مذکور ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قاضی ابو بکر اور ان سے پہلے شیخ ابو الحسن کی رائے ہے کہ یہاں طائفہ سے مراد واحد (ایک) ہے اور اس میں وہ اس دلیل سے قوت حاصل کرتے ہیں کہ خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور یہ صحیح ہے اس جہت سے نہیں کہ طائفہ کا اطلاق واحد پر ہوتا ہے بلکہ اس جہت سے کہ ایک شخص یا کئی اشخاص کی خبر خبر واحد ہے(1) اور یہ کہ خبر واحد کے مقابل خبر متواتر ہے جو غیر محصور ہوتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کیا ایسی نص ہے جس سے اس پر استدلال کیا جا سکتا ہو کہ واحد کو طائفہ کہا جا سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا (الحجرات: 9) یعنی نفسین (دو نفس)۔ اگر مومنین میں سے دو آدمی لڑ پڑیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ (الحجرات: 10) (پس صلح کرا دو اپنے دو بھائیوں کے درمیان) پس یہ لفظ تثنیہ کے ساتھ مذکور ہے اور اقتتلوا میں ضمیر اگرچہ جمع کی ہے، پس اور جمع کا اقل فرد دو ہے یہ علماء کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لِیَتَفَقَّهُوْا، لِیَتَفَقَّهُوْا اور لِیُنْذِرُوْا میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقیم رہنے والوں کے لیے ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ دونوں ضمیریں جہاد پر نکلنے والے گروہ کے لیے ہیں۔ علامہ طبری نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ کا معنی ہے تاکہ وہ بصیرت اور یقین حاصل کریں اس کے ساتھ جو اللہ کریم انہیں مشرکوں پر غلبے اور نصرت دین میں سے دکھائے۔ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اور تاکہ وہ کفار میں سے اپنی قوم کو ڈرائیں۔ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ جب وہ ان کی طرف جہاد سے لوٹ کر آئیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس مدد و نصرت کے بارے انہیں مطلع کریں جو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی فرمائی۔ اور یہ کہ ان کے لیے ان کے ساتھ قتال کرنے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قتال کرنے کی طاقت نہیں ہے، پس وہ ان پر وہ کچھ نازل کرتا ہے جو اس نے ان کافر ساتھیوں پر نازل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ کا قول زیادہ بین اور واضح ہے، یعنی تاکہ وہ طائفہ تفقہ حاصل کرے جو سرایا میں کوچ کرنے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیچھے رہا۔ اور یہ علم کی طلب پر ابھارنے اور اس کے مندوب ہونے کا (متقاضی ہے) نہ کہ وجوب اور لازم ہونے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ کلام کی قوت میں نہیں ہے، بلاشبہ علم کو اس کے ادلہ کے ساتھ طلب کرنا لازم ہے۔ یہ ابو بکر بن عربی نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علم کی طلب، دو قسموں میں منقسم ہوتی ہے: فرض عین، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی میں حدیث طیبہ موجود ہے: "بے شک علم طلب کرنا فرض ہے"۔ عبد القدوس بن حبیب نے روایت کیا ہے۔ ابو سعید الوحاظی نے حماد بن ابی سلیمان سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1031

ہے: ''علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' (1)۔ ابراہیم نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوائے اس حدیث کے اور کوئی نہیں سنی۔

علم طلب کرنا فرض کفایہ ہے، جیسے حقوق حاصل کرنا، حدود قائم کرنا اور جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا وغیرہ۔ جب یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگ اسے سیکھیں کیونکہ اس سے ان کے احوال اور ان کے سرایا کے احوال فاسد اور ضائع ہو جائیں گے۔ اور ان کے معاملات معاش میں نقصان ہوگا یا وہ باطل ہو جائیں گے، پس دونوں حالوں کے درمیان متعین یہ ہوا کہ بغیر کسی تعیین کے بعض اس فریضہ کو ادا کریں اور یہ اس اعتبار سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں کے لیے آسان فرما دے اور اسے ان کے درمیان اپنی رحمت اور حکمت سے سابقہ قدرت اور کلام کے ساتھ تقسیم فرما دے۔

مسئلہ نمبر 6۔ علم کی طلب عظیم فضیلت ہے اور ایک شریف اور عالی شان مرتبہ ہے کوئی عمل اس کے مساوی نہیں ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو بندہ کسی راستے پر چلا وہ اس میں علم تلاش کرنے لگا تو اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کے راستے پر گامزن کر دیا اور بلاشبہ ملائکہ طالب علم کی خوشنودی اور رضا کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور بے شک عالم کے لیے زمین و آسمان میں رہنے والے استغفار کرتے ہیں اور پانی میں رہنے والی مچھلیاں بھی۔ اور بے شک عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے۔ اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء علیہم السلام نے بطور میراث دینار و درہم نہیں چھوڑے بلکہ انہوں نے علم کو میراث قرار دیا ہے پس جس نے اسے حاصل کیا تو اس نے حظ وافر حاصل کر لیا'' (2)۔

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابوالمغیرہ نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں امام اوزاعی نے حسن سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا گیا وہ دونوں بنی اسرائیل میں سے تھے، ان میں سے ایک عالم تھا وہ فرض نماز پڑھتا پھر بیٹھ جاتا اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا۔ اور دوسرا دن کو روزہ رکھتا اور رات کو قیام کرتا تھا، ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس عالم کی فضیلت جو فرض نماز پڑھتا ہے پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے اس طرح ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ پر مجھے فضیلت حاصل ہے'' (3)۔ اسے ابو عمر نے کتاب (بیان العلم) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند ذکر کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے میری فضیلت میری امت پر ہے'' (4)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: افضل جہاد اس کا ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، للمقدمہ باب فضل العلماء، جلد 1، صفحہ 20 — 2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

3۔ سنن دارمی، کتاب العلم، جلد 1، صفحہ 82۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، حدیث نمبر 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

جس نے مسجد بنائی اور اس میں قرآن، فقہ اور سنت کی تعلیم دیتا ہو۔ (افضل الجهاد من بنى مسجدا يعلم فيه القرآن والفقه والسنة) اسے شریک نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انہوں نے علی ازدی سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا: کیا میں تیری اس پر رہنمائی نہ کروں جو تیرے لیے جہاد سے بہتر ہے؟ تو مسجد میں آ اور اس میں قرآن کریم پڑھا اور اس میں فقہ کی تعلیم دے۔ اور ربیع نے کہا ہے میں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: علم حاصل کرنا نفلی نماز پڑھنے سے زیادہ واجب اور بہتر ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں'' (1)۔ یہ حدیث دو وجہوں کا احتمال رکھتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ وہ اس پر مہربان اور شفیق ہوتے ہیں اور اس پر رحم فرماتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر فرمایا ہے جہاں اس نے اولاد کو والدین کے ساتھ احسان کرنے کی نصیحت کی ہے فرمایا: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع اور انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) یعنی ان دونوں کے ساتھ تواضع سے پیش آ۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پر رکھنے سے مراد انہیں بچھانا ہو، کیونکہ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: وإن الملائكة تفرش أجنحتها یعنی بے شک ملائکہ جب کسی طالب علم کو دیکھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے اسے حاصل کر رہا ہے اور اس کے تمام احوال طلب علم کے موافق ہوں تو وہ اس کے لیے اس کے سفر میں اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور اسے ان پر اٹھا لیتے ہیں۔ پس جو وہاں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ ننگے پاؤں نہیں رہتا اگر وہ چلتا ہے اور نہ وہ تھکتا ہے اور اس کے لیے دور کا راستہ قریب ہو جاتا ہے اور مختلف انواع کا ضرر اور تکلیف جو کسی اور مسافر کو پہنچتی ہے وہ اسے نہیں پہنچتی، جیسا کہ مرض، مال کا ضائع ہو جانا اور راستے سے بھٹک جانا۔ اور ان میں سے کچھ چیزیں سورۂ آل عمران میں قول باری تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ، آیہ (آل عمران: 18) کے تحت گزر چکی ہیں۔

عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت سے ایک گروہ مسلسل حق پر قائم اور ثابت رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی'' (2)۔ یزید بن ہارون نے کہا ہے: اگر وہ اصحاب الحدیث نہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی تاویل میں یہ عبدالرزاق کا قول ہے، بے شک وہ اصحاب حدیث ہی ہیں۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے شیخ الاستاذ المقری النحوی المحدث ابوجعفر احمد بن محمد بن محمد القیسی القرطبی المعروف بابن ابی حجۃ رحمہ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی تاویل میں کہتے ہیں: لا يزال أهل الغرب ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة (3) (اہل غرب حق پر غالب رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے) کہ بلا شبہ وہ علماء ہیں۔ انہوں نے کہا: وہ اس لیے کہ الغرب لفظ مشترک ہے اس کا اطلاق بڑے ڈول پر بھی کیا جاتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کی سمت پر بھی اور اس کا اطلاق آنسو بہنے پر بھی کیا جاتا ہے، پس لا يزال أهل الغرب کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو بہانے

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93 2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 143 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 144

والے اس کا اور اس کے احکام کا علم رکھنے کے سبب ہمیشہ غالب رہیں گے۔ الحدیث۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: 28) (اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد جو صحیح مسلم میں ہے تقویت دیتا ہے: "جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرماتا ہے اور مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر قتال کرتی رہے گی یوم قیامت تک ان پر غالب آتے ہوئے جو ان سے لڑے" (1)۔ اس بیان کا ظاہر یہ ہے کہ اس کا اول اس کے آخر کے ساتھ مربوط ہے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۝

"اے ایمان والو! جنگ کرو ان کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے اور چاہیے کہ وہ پائیں تم میں سختی اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے"۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں جہاد کی کیفیت سے آگاہ فرمایا اور یہ کہ ابتداء قریبی دشمن سے ہو پھر جو اس کے بعد قریبی ہو، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز عرب سے کیا اور جب ان سے فارغ ہوئے تو روم کا قصد کیا اور وہ شام میں تھے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے قتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے نازل ہوئی۔ پس یہ اس تدریج میں سے ہے جو قبل از اسلام تھی۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس آیت سے اس کے نازل ہونے کے وقت مراد عرب تھے، پس جب آپ ان سے فارغ ہوئے تو پھر روم وغیرہم کے بارے میں قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (التوبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر) نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے دیلم مراد لیے گئے ہیں۔ اور مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کس سے ابتدا کی جائے گی روم یا دیلم سے؟ تو انہوں نے فرمایا: روم سے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ دیلم، ترک اور روم سے جنگ کرنا ہے (2)۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ الاقرب فالاقرب اور ادنیٰ فالادنیٰ (قریب تر پھر اس کے بعد قریب الخ) کے قتال میں آیت اپنے عموم پر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی آیت کا ظاہر ہے۔ اور ابن عربی نے یہ اختیار کیا ہے کہ دیلم سے پہلے روم سے ابتدا کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس کی تین وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، پس ان پر حجت زیادہ اور پختہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ وہ ہمارے یعنی اہل مدینہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے شہر ان کے شہروں میں زیادہ ہیں پس ان کو ان سے بچانا زیادہ واجب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 144　　2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 84، ملہوم

اور ضروری ہے(1)۔ واللہ اعلم

وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً اور چاہیے کہ وہ تم میں شدت، قوت اور حمیت پائیں۔ اور فضل نے اعمش سے اور انہوں نے عاصم سے غلظۃ غین کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت غین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بنی تمیم کی لغت غلظۃ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب کبھی نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعض ان میں سے وہ ہیں جو (شرارتاً) کہتے ہیں کہ کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا ہے اس سورت نے ایمان، تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں''۔

اس میں مسئلہ ہے اور مراد منافقین ہیں۔ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور سورت کا معنی بھی مقدمۃ الکتاب میں گزر چکا ہے، پس اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور حسن نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا: ''بے شک ایمان کے فرائض اور سنتیں ہیں جس نے انہیں مکمل کیا تحقیق اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے انہیں مکمل نہ کیا اس نے ایمان کو مکمل نہ کیا''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: ''اگر میں زندہ رہا تو میں تمہارے لیے ان کی وضاحت کر دوں گا اور اگر میں فوت ہو گیا تو پھر میں تمہاری صحبت پر حریص نہیں ہوں'' (2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے کہا ہے: میں نے اس سے کوئی چارہ نہ پایا کہ میں ایمان کی زیادتی کے بارے قول کروں، ورنہ میں قرآن کو رد کر دیتا۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورت نے ان میں اور پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی جن کے دلوں میں شک، ریب اور نفاق ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ یعنی اس سورت نے ان کے سابقہ شک پر شک کا اور سابقہ کفر پر کفر کا اضافہ کر دیا۔ اور مقاتل نے کہا ہے: ان کے سابقہ گناہ پر گناہ کو بڑھا دیا۔ تمام معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1032　2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 6

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ عام قرات یا کے ساتھ ہے اور یہ منافقین کے بارے خبر ہے۔ اور یہ حمزہ اور یعقوب نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ان کے بارے خبر ہے اور خطاب مومنین کو ہے۔ اور اعمش نے أولم یروا پڑھا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے أولا تری قراءت کی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے۔

اور يُفْتَنُوْنَ علامہ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ آزمائے جاتے ہیں (1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قحط اور شدت کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور عطیہ نے کہا ہے: وہ آزمائے جاتے ہیں بیماریوں اور بھوک کے ساتھ (2)۔ اور یہ موت کی علامات اور جاسوس ہیں۔ اور حضرت قتادہ، حسن اور مجاہد نے کہا ہے: وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد اور جنگ کرنے کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ اسے دیکھتے ہیں۔

ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ پھر بھی وہ اس کے لیے توبہ نہیں کرتے۔ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ اور نہ وہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۱۲۷

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو دیکھنے لگتے ہیں ایک دوسرے کی طرف کیا دیکھ تو نہیں رہا تمہیں کوئی پھر چل دیتے ہیں، پھیر دیئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کیونکہ یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ اس میں ما صلہ ہے اور مراد منافقین ہیں، یعنی جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوں اس حال میں کہ آپ قرآن کریم پڑھ رہے ہوں جس میں ان کی فضیحت و رسوائی یا ان میں سے کسی ایک کی فضیحت و رسوائی نازل کی گئی ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف علی جہۃ التقریر خوف کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کیا کوئی تمہیں دیکھتا ہے جب تم اس بارے گفتگو کرتے ہو کہ وہ اسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے ان کی جہالت ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب میں سے جس پر چاہتا ہے آپ کو مطلع کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس آیت میں نظر بمعنی انبا (خبر دینا) ہے۔ اور علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس آیت میں نظر، قال کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ انْصَرَفُوْا یعنی ہدایت کے راستے سے پھر جاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جس وقت ان کے لیے ان کے اسرار و رموز کھول کر بیان کر دیئے اور ان کے مخفی اور غیبی امور پر انہیں آگاہ کر دیا تو لامحالہ انہیں تعجب، توقف اور نظر و فکر لاحق ہوئی پس اگر وہ ہدایت پا لیتے تو یقیناً وہی وقت ان کے ایمان پائے جانے کا محل تھا، لیکن وہ جب کفر پر مصمم ارادہ رکھتے تھے اور اسی کا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 87 2۔ معالم التنزیل، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 132

ارتکاب کرتے تھے تو گویا وہ اس حالت سے پھر گئے جو نظر صحیح اور ہدایت کے پائے جانے کی حالت تھی۔ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کو اس کے سماع کی طرح نہیں سنا جو اس کی آیات میں تدبر اور غور و فکر کرتا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ (الانفال) (بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)

قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یہ ان کے لیے بددعا ہے، یعنی تم ان کے لیے یہ کہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دلوں کو خیر اور نیکی سے پھرنے کے بارے خبر ہو۔ ان کے عمل پر یہ جزا دی گئی ہو۔ اور یہ ایسا کلمہ ہے جس کے ساتھ دعا کی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ (التوبہ: 30) (اللہ انہیں قتل کرے) اور بأنھم میں باصرف کا صلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یہ مکروہ ہے کہ اس طرح کہا جائے: انصرفنا من الصلوٰۃ (ہم نماز سے پھر گئے) کیونکہ قوم جب پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دل پھیر دیتا ہے البتہ تم یہ کہو: قضینا الصلوٰۃ (1) (ہم نے نماز پوری کر لی)۔ علامہ طبری نے آپ سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے اور میں اسے صحیح گمان نہیں کرتا، کیونکہ نظم کلام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جاتا: کوئی یہ نہ کہے ہم نماز سے پھر گئے (لا یقل أحد إنصرفنا من الصلواۃ) کیونکہ ایک قوم کے بارے میں یہ کہا گیا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (التوبہ: 127) (2) (پھر وہ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پھیر دیئے)

محمد بن عبدالملک القیسی الواعظ نے ہمیں خبر دی ہے (انہوں نے کہا) ابوالفضل جوہری نے اس سے یہ سنتے ہوئے ہمیں بتایا جو کہتا ہے: ہم ایک جنازہ میں تھے تو اس سے ڈرانے والے نے کہا: انصرفوا رحمکم اللہ (پھر جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) تو اس نے کہا: کوئی یہ نہ کہے: انصرفوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت میں کہا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بلکہ تم یہ کہو: انقلبوا رحمکم اللہ (تم پلٹ جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مدح میں یہ کہا ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (آل عمران: 174) (کہ واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے)

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہی دلوں کو پھیرنے اور تبدیل کرنے والا ہے اور وہی انہیں پلٹنے اور الٹنے والا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ مخلوق کے دل ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں اور ان کے اعضاء ان کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق تصرف کرتے ہیں اور اپنے ارادے اور اختیار کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033 2۔ ایضاً

مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کہا ہے جسے ان سے اشہب نے روایت کیا ہے: قدریہ کے رد میں یہ کتنا واضح اور بین ارشاد ہے: لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ (التوبہ: 110) (ان کی وہ عمارت جوانہوں نے اپنے دلوں میں شک کی بنا پر بنائی وہ مسلسل رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل کٹ جائیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ہے: اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے) پس یہ نہ ہمیشہ ہوسکتا ہے اور نہ اس سے رجوع ہوسکتا ہے اور نہ یہ زائل ہوسکتا ہے(1)۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۲۹﴾

”بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت ہی خواہش مند ہے تمہاری بھلائی کا مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (اے حبیب!) پھر اگر منہ موڑلیں تو آپ فرمادیں کافی ہے مجھے اللہ، نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے“۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ دونوں آیتیں از روئے عہد کے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر کے قول میں ہے: قرآن کریم میں سے جو آیت آخر میں نازل ہوئی وہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرہ: 281) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس ارشاد: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ کے بعد یہ دونوں آیتیں عہد کے اعتبار سے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ واللہ اعلم

جمہور کے نزدیک یہ خطاب عربوں کو ہے اور یہ ان پر احسانات اور نعمتیں شمار کرنے کی جہت پر ہے، کیونکہ آپ ان کی زبان میں وہ لے کر آئے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کے ساتھ بقیہ ایام میں شرف وعظمت عطا کی گئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطاب تمام عالم کو ہے اور معنی یہ ہے: لقد جاءکم رسول من البشر (تحقیق تمہارے پاس انسانوں میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرب کا کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنم دیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: اے گروہ عرب! تحقیق تمہارے پاس بنی اسماعیل میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا۔ اور دوسرا قول حجت کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لیے ہے، یعنی وہ تمہاری مثل بشر ہیں تا کہ تم ان سے (احکام) سمجھ سکو اور آپ کی اقتدا اور پیروی کرسکو۔

قولہ تعالیٰ: مِّنْ اَنْفُسِكُمْ یہ ارشاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور یہ کہ آپ خالص اور پکے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033

عرب تھے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو چنا ہے اور کنانہ میں سے قریش کو چنا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب کیا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا ہے''(1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ میں نکاح سے (پیدا ہوا) ہوں اور میں زنا سے نہیں ہوں''۔ اس کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک اس میں ولادت نکاح سے ہوئی ہے، اس میں زنا نہیں ہوا۔

اور عبداللہ بن قسیط المکی نے مِّنْ اَنْفَسِكُمْ فا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ نفاسة سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کی گئی ہے(2)، یعنی جاء کم رسول من أشرفکم و أفضلکم (تم میں سے زیادہ شرف وفضل والا رسول تمہارے پاس تشریف لایا) یہ تیرے اس قول سے ہے: شئ نفیس جب وہ شی مرغوب فیہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: من أنفسکم یعنی تم میں سے بہت زیادہ اطاعت کرنے والا (رسول تمہارے پاس تشریف لایا)

قولہ تعالیٰ: عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ یعنی تمہاری مشقت آپ پر گراں گزرتی ہے۔ اور العنت کا معنی مشقت ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: أكمة عَنُوت جب ٹیلہ مشقت آمیز اور مہلک ہو۔ اور ابن انباری نے کہا ہے: تعنت میں اصل معنی تشدد کرنا، تکلیف پہنچانا ہے پس جب عرب کہیں: فلان یتعنت فلانا و یُعنته تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں اس پر تشدد کر رہا ہے اور اسے ایسی شے کے ساتھ لازم کر رہا ہے جس کی ادائیگی اس پر مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ اس کا ذکر سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور مَا عَنِتُّمْ میں ما مصدریہ ہے، اور یہ مبتدا ہے اور عزیز خبر مقدم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا عَنِتُّمْ عزیز کے ساتھ فاعل ہو۔ اور عزیز، رسول کی صفت ہو، اور زیادہ صحیح ہے۔ اور اسی طرح حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اور رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔ فراء نے کہا ہے: اور اگر عزیزا علیہ ما عنتم حریصا رؤفا رحیما پڑھا جائے تو یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوں گے اور یہ جائز ہے۔

ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اس کے معنی میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن جو کلام عرب سے موافقت رکھتا ہے وہ ہے کہ احمد بن محمد الازدی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا عبداللہ بن محمد خزاعی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا میں نے عمرو بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبداللہ بن داود خریبی کو رب کریم کے اس ارشاد میں یہ کہتے ہوئے سنا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ فرمایا (ان پر گراں گزرتا ہے) کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ فرمایا (وہ تمہارے بارے میں بہت خواہشمند ہیں) کہ تم جنت میں داخل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں بہت خواہش مند ہیں کہ تم ایمان لاؤ۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ بخیل ہیں اس بارے کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ اور الحرص علی الشئ کا معنی ہے الشح علیہ أن یضیع ویتلف (اس پر بخل کرنا کہ وہ اسے ضائع کرے اور تلف کرے)

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، الرءوف کا معنی ہے، بہت زیادہ نرمی اور شفقت کرنے والا۔ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ کا مکمل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 245
2۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 100

معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں سے دو اسم انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کے لیے بھی سوائے حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع نہیں فرمائے، پس اس نے ارشاد فرمایا: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ (بقرہ) اور عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: نظم آیت لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ سے مقصود تمہاری شان اور حالت ہے اور وہ تمہارے لیے شفاعت قائم کرنے والا ہے، پس تم مَا عَنِتُّمْ سے ان کا قصد نہ کرو جو تمہیں ان کی سنت پر قائم رکھیں کیونکہ تمہارا جنت میں داخل ہونا ہی انہیں راضی اور خوش کر سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر کفار اعراض کریں ان نعمتوں کے بعد بھی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے تو پھر کہو حَسْبِيَ اللّٰهُ! اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ نہیں کوئی معبود بجز اس کے میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا، اور اپنے تمام امور میں نے اسی کے سپرد کر دیئے۔ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ عرش کو خاص کیا، کیونکہ وہ اعظم المخلوقات ہے جب اس کا ذکر کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے اس میں داخل ہو جائے گی۔ اور قراءت عامہ کے مطابق العظیم مجرور ہے کیونکہ وہ عرش کی صفت ہے اور رب کی صفت بناتے ہوئے اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

یہ قراءت ابن کثیر سے مروی ہے اور یہی قراءت ابن محیصن کی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: جس نے صبح وشام سات مرتبہ پڑھا حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہے اس کام میں جس کا اس نے ارادہ اور قصد کیا چاہے وہ اس میں سچا ہو یا جھوٹا اور "نوادر الاصول" (1) میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے ہر نماز کے بعد دس کلمات کہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو ان کے پاس کافی اور جزا دینے والا پائے گا۔ ان میں سے پانچ دنیا کے لیے ہے اور پانچ آخرت کے لیے حسبی اللہ لدینی (اللہ تعالیٰ میرے دین کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لدنیای (اللہ تعالیٰ میری دنیا کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لما أھمنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس شے کے لیے جو مجھے غم میں ڈال دے) حسبی اللہ لمن بغی علی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو مجھ پر زیادتی کرے) حسبی اللہ لمن حسدنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو میرے ساتھ حسد کرے) حسبی اللہ لمن کادنی بسوء (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو برائی کے ساتھ میرے قریب ہو) حسبی اللہ عند الموت (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے موت کے وقت) حسبی اللہ عند المسألۃ فی القبر (اللہ تعالیٰ قبر میں سوال کے وقت مجھے کافی ہے) حسبی اللہ عند المیزان (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے میزان کے پاس) حسبی اللہ عند الصراط (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے پل صراط کے پاس) حسبی اللہ لا إلہ إلا ھو علیہ توکلت وإلیہ أنیب (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میں نے اعتماد کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹایا جانا ہے)

1۔ نوادر الاصول، الکلمات العشر بعد الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 217

نقاش نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: عہد کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے قریب ترین قرآن کی یہ دو آیتیں ہیں: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ سے آخر سورت تک ہم اسے بیان کر چکے ہیں۔ اور یوسف بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوئی: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اور یہ آیت ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ اور ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف ذکر کیا ہے، جیسا کہ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا پہلے نزول مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ اس میں بعد ہے، کیونکہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ واللہ اعلم

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصحف میں کوئی آیت ثبت نہ فرماتے تھے یہاں تک کہ اس پر دو آدمی شہادت دے دیں، پس انصار میں سے ایک آدمی سورت براءت کی آخری دو آیتیں لے کر آیا۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں تجھ سے ان پر کوئی بینہ (گواہ) طلب نہیں کروں گا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تھے، پس آپ نے ان دونوں کو لکھوا دیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو اکیلے آپ کی شہادت کے ساتھ لکھوا دیا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں اس کے صحیح ہونے پر دلیل قائم تھی، پس یہی قرینہ ہے جس نے دوسرے گواہ کی طلب سے مستغنی کر دیا، بخلاف سورۂ احزاب کی آیت کے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب:23)

کیونکہ یہ آیت حضرت زید اور حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہما کی شہادت کے ساتھ ثابت ہوئی کہ ان دونوں نے اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ یہ بحث مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے۔ والحمدللہ

تمت بالخیر

سورۃ توبہ کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 419

سورۂ یونس

آیاتھا ۱۰۹ ۱۰ سورۃ یونس مکیۃ ۵۱ رکوعاتھا ۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق سورۃ یونس علیہ السلام مکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سوائے تین آیات کے جو قول باری تعالیٰ: اِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ سے شروع ہو کر تین آیتوں کے آخر تک ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے: سوائے دو آیتوں کے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورت مکیہ ہے سوائے اس ارشاد کے: وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یُّؤۡمِنُ بِهٖ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِهٖ یہ آیت یہود کے بارے میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: اس کے اول سے تقریباً چالیس آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اس کی بقیہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (1)۔

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِیۡمِ ①

''الف، لام، را، یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی''۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ نحاس نے کہا ہے: اسے ابوجعفر احمد بن شعیب بن علی ابن حسین بن حریث پر پڑھا گیا تو انہوں نے کہا: ہمیں علی بن حسین نے اپنے باپ سے اور انہوں نے یزید سے یہ خبر دی ہے کہ عکرمہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: الٓرٰ، حٰمٓ اور نون یہ الرحمن کے حروف ہیں جو الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ تو میں نے اس کا ذکر اعمش سے کیا تو انہوں نے کہا: تیرے پاس اس کی مثل (اور) بھی ہیں اور تو مجھے اس کے بارے خبر نہ دے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا: الٓرٰ کا معنی ہے أنا اللہ أری (2) (میں اللہ ہوں دیکھ رہا ہوں) نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ اس قول کی طرف مائل ہیں، کیونکہ سیبویہ نے عربوں سے اس کی مثل بیان کیا ہے اور شعر بھی بیان کیا ہے:

بالخیر خیراتٍ وإن شرًّا فَا　　ولا أرید الشرَّ إلا أنْ تَا

اور حسن اور عکرمہ نے کہا ہے: الٓرٰ قسم ہے۔ اور سعید نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: الٓرٰ سورت کا نام ہے۔ مزید کہا: قرآن کریم میں تمام حروف تہجی اسی طرح ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورتوں کے فواتح اور آغاز ہیں۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ حروف تنبیہ ہیں اور اسی طرح تمام حروف تہجی ہیں۔ اور الٓرٰ کو بغیر امالہ کے پڑھا گیا ہے۔ اور امالہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے تاکہ یہ حروف میں سے ما اور لہ کے مشابہ نہ ہو جائیں۔

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 102　　2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 93

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی یہ جن کا ذکر جاری ہے کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کتاب سے مراد تورات، انجیل اور سابقہ کتب ہیں (1)، کیونکہ تِلْكَ مونث غائب کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تِلْكَ بمعنی ھذہ ہے، یعنی ھذہ آیات الکتاب الحکیم (یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں) اور اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

تلك خَیْلِی منه وتلك رِكَابِی　　هُنَّ صُفْرٌ أولادها كالزَّبِیب

مراد ھذہ خیلی ہے (2)۔ اور الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے اور یہی صواب کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ سابقہ کتابوں کا ذکر جاری نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ الْحَكِیْمِ قرآن کی صفت ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ (ہود: 1)

یہ معنی سورۃ البقرہ کے اوّل میں ہو چکا ہے۔ اور الحکیم: جس کے ساتھ حلال وحرام، حدود اور احکام کے بارے فیصلہ کیا جائے۔ یہ ابوعبیدہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حکیم بمعنی حاکم ہے، یعنی بے شک یہ حلال وحرام کے بارے فیصلہ کرنے والا ہے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (البقرہ: 213) (اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کردے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکیم بمعنی محکوم فیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں عدل واحسان کرنے اور ذوالقربیٰ کو دینے کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس میں فحشاء اور منکر سے نہی کے بارے فیصلہ کیا اور اس کے بارے جنت کا فیصلہ کیا جس نے اطاعت کی اور اس کے بارے جہنم کا فیصلہ کیا جس نے نافرمانی کی، تو یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکیم بمعنی محکم من الباطل (جو باطل سے محفوظ ہو) ہے اس میں نہ کذب ہے اور نہ اختلاف۔ یہ فعیل بمعنی مفعل ہے، جیسے اعشیٰ کا قول ہے وہ اپنا وہ قصیدہ بیان کرتا ہے جو اس نے کہا ہے:

و غریبۃ تأتی الملوكَ حكیمۃ　　قد قلتها لیقال من ذا قالها

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ۝

''کیا (یہ بات) لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دو انہیں جو ایمان لائے کہ ان کے لیے مرتبہ بلند ہے ان کے رب کے ہاں، کفار نے کہا بلاشبہ یہ جادوگر ہے کھلا ہوا''۔

قولہ تعالیٰ: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یہ استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے۔ اور عَجَبًا، کان کی خبر ہے اور اس کا اسم اَنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 102　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 420

اَوْحَیْنَاۤ ہے اور یہ محل رفع میں ہے: ای کان ایحاؤنا عجبا للناس (یعنی کیا ہمارا وحی کرنا لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے) اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں عجب ہے اس بنا پر یہ کان کا اسم ہوگا۔ اور خبر اَنْ اَوْحَیْنَاۤ ہوگی۔ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اس کو رجل جیم کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کے سبب نزول کے بارے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفار نے اس وقت کہا جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا: بے شک اللہ تعالیٰ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو(1)۔ اور انہوں نے کہا: ابو طالب کے یتیم کے سوا اللہ تعالیٰ نے کوئی نہیں پایا جسے وہ رسول بنا کر بھیجے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یعنی کیا اہل مکہ کو تعجب ہوا؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں بعث (بعد الموت) کے ذکر سے تعجب ہوا۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا یہ حرف جار کے اسقاط کے سبب محل نصب میں ہے ای بأن انذر الناس اور اسی طرح اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ بھی ہے اور نذارت بشارت اور آیت کے دوسرے الفاظ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور قَدَمَ صِدْقٍ کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد منزل صدق (صدق کی منزل، مرتبہ) ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (الاسراء: 80)

اور آپ سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد ان اعمال کا اجر حسن ہے جو انہوں نے آگے بھیجے۔ اور یہ بھی مروی ہے: قَدَمَ صِدْقٍ کا معنی ذکر اول میں سعادت کا سبقت لے جانا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی بلند مرتبہ ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

لكم قدم لا ينكر الناس أنها مع الحسب العالي طمّت على البحر

اس میں قدم بلند مرتبہ کے معنی میں ہی ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی سلف صدق (صحیح کامل) ہے(2)، ربیع نے کہا ہے: اس کا معنی ثواب صدق (سچ کا ثواب) ہے۔ عطا نے کہا ہے: مراد مقام صدق ہے۔ یمان نے کہا ہے: مراد ایمان صدق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ملائکہ کی دعوت ہے (فرشتوں کا دعا کرنا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ صالح بچہ ہے جسے وہ آگے بھیجیں۔ ماوردی نے کہا ہے تاکہ صدق طاعت، صدق جزا کے موافق ہو جائے (3)۔ اور حضرت حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ شفاعت فرمانے والے ہیں جن کی اطاعت کی گئی ہے آپ ان سے آگے ہوں گے، جیسا کہ آپ نے فرمایا: أنا فرطكم على الحوض (4) (میں تم سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: هي شفاعتي توسلون بي الى ربكم (یہ میری شفاعت ہے تم مجھے اپنے رب کی بارگاہ میں بطور وسیلہ پیش کرو گے) اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر مقدم کرے گا۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: مراد حضور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 421
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 422
4۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کا مصیبت اور تکلیف میں پڑنا ہے۔ اور عبد العزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) اور مقاتل نے کہا ہے: مراد وہ اعمال ہیں جنہیں انہوں نے آگے بھیجا۔ اس کو علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔ الوضاح نے کہا ہے:

صلّ لذی العرش واتخذ قَدَمًا تُنْجیك یوم العِثار والزّلل

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس امت کو قبروں سے اٹھائے جانے میں اور جنت میں داخل کرنے میں مقدم کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: نحن الآخرون السابقون یوم القیامة المقضی لهم قبل الخلائق (1) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن سبقت لے جانے والے ہیں ان کے لیے مخلوقات سے پہلے اس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے) اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل صالح میں سعی کرنے سے کنایہ ہے۔ پس اس کو بطور کنایہ قدم سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ انعام کا ذکر بطور کنایہ ید (ہاتھ) سے کیا جاتا ہے اور ثنا (تعریف) کو بطور کنایہ لسان (زبان) سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

لنا القَدَم العلیا إلیك وخَلْفُنا لأولنا فی طاعة الله تابع

ہمارے لیے تیری طرف عمل صالح کی کوشش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں ہمارے پیچھے آنے والے پہلوں کے تابع ہیں۔

وہ السابقة سے مراد اخلاص فی الطاعة لیتے ہیں (2)۔ واللہ اعلم۔ اور ابو عبید اور کسائی نے کہا ہے: خیر یا شر میں سے ہر سبقت لے جانے والا اعربوں کے نزدیک قدم ہے: کہا جاتا ہے: لفلان قدم فی الإسلام (فلاں اسلام میں سبقت لے جانا والا ہے) له عندی قدم صدق و قدم شر و قدم خیر (اس کی میرے نزدیک سچ میں سبقت ہے اور شر میں سبقت ہے اور خیر میں سبقت ہے)

یہ لفظ مونث ہے اور کبھی مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قدم حسن اور قدم صالحة۔ اور ابن الاعرابی نے کہا ہے: القدم سے مراد شرف میں آگے بڑھنا ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

زلّ بنو العَوّام عن آل الحَكَمْ وترکو المُلْك لمَلْك ذی قَدَمْ

اور صحاح میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پانچ اسماء ہیں: میں محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں، میں وہ ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کفر کو مٹا دے گا اور میں وہ حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں عاقب ہوں'' (3)۔ اس سے مراد آخر الانبیاء (تمام انبیاء سے آخر میں آنے والا) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1116
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 422
3۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 501-500

خَاتَمَ النَّبِيّنَ (الاحزاب:40)

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ابن محیصن، ابن کثیر، کوفیوں، عاصم، حمزہ، کسائی، خلف اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم ان تمام نے لساحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور باقیوں نے لسحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ قرآن کی صفت ہے۔ سحر کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③

"بے شک تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے، کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے سو عبادت کرو اس کی، تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اس کی تفسیر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ اکیلے ہر کام کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کو مقرر کرتا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اپنی خلق کی تدبیر میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ امر کے ساتھ بھیجتا ہے۔ یہ قول بھی ہے وہ امر کے سات نازل کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ہر کام کے بارے حکم دیتا ہے اور اسے کر گزرتا ہے۔ یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ پس حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی کے لیے اور حضرت میکائیل علیہ السلام بارش کے لیے، حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لیے اور حضرت عزرائیل علیہ السلام (روح) قبض کرنے کے لیے مقرر ہیں۔ اور يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کا حقیقی معنی امور کو ان کے انجام کے احکام کی بنا پر ان کے مراتب پر رکھنا ہے۔ اور یہ الدبر سے مشتق ہے اور الامر جنس امور کا اسم ہے۔ مَا مِنْ شَفِيْعٍ یہ محل رفع میں ہے اس کا معنی ما شفیع (کوئی شفاعت کرنے والا نہیں) ہے۔

اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ شفاعت کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ فلا یشفع أحد نبی ولا غیرہ إلا باذنہ سبحانہ (پس کوئی نبی شفاعت نہیں کر سکے گا اور نہ کوئی اور مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اجازت کے ساتھ) یہ کفار کے اس قول کا رد ہے جو انہوں نے ان کے بارے کہا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے: هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:18) (یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرما دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا پس بتوں کی شفاعت کیسے ممکن ہو سکتی ہے جو عقل ہی نہیں رکھتے؟

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ یعنی یہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں سے یہ کام کیے ہیں یہی

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 104

تمہارا رب ہے اس کے سوا تمہارا کوئی رب نہیں۔ فَاعْبُدُوْهُ پس تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اسی کے لیے عبادت کو خالص کرو۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے کہ یہ اس کی مخلوقات ہیں پس تم ان سے اس کی ذات پر استدلال کرو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

”اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے، یہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ بے شک وہی ابتدا کرتا ہے پیدائش کی پھر وہی دہرائے گا اسے تا کہ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ کفر کرتے رہتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور رجوع الی اللہ کا معنی اس کی جزا کی طرف لوٹنا ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا یہ دونوں مصدر ہیں، یعنی وعد الله ذالك وعدا و حققه، حَقًّا، صدقا لاخلف فيه یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرما رکھا ہے اور اس نے اسے سچ ثابت کیا ہے اس میں اس کا خلاف قطعاً نہیں۔ اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے وَعْدُ اللهِ حَقٌّ پڑھا ہے اور اسے استیناف پر محمول کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ بے شک وہی مٹی سے پیدائش کی ابتدا کرتا ہے۔ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے گا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہی اسے پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے مارتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھانے کے لیے اسے زندہ کرے گا(1) یا بے شک وہی اسے پانی سے پیدا کرتا ہے پھر اسے ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لوٹاتا ہے۔

یزید بن قعقاع نے أنه يبدأ الخلق پڑھا ہے اس میں ان محل نصب میں ہوگا۔ ای وعدكم أنه يبدأ الخلق (اس نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ وہی پیدائش کی ابتدا کرے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو لأنه يبدأ الخلق (کیونکہ وہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے)۔ جیسے کہا جاتا ہے: لَبَّيْكَ أنّ الحمد والنعمة لك اور اس میں کسرہ عمدہ ہے اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ان محل رفع میں ہو اور وہ اسم ہو۔ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہوگی حقا ابداؤه الخلق اس کی پیدائش کی ابتداء کرنا حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ تا کہ وہ انہیں عدل کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ یعنی کافروں کے لیے ایسا گرم پانی ہوگا جس کی گرمی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوگی، الحميمة بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: حَمَمْتُ الماء أُحِمُّه فهو حميم، ای محموم۔ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے (سخت گرم کیا ہوا) اور عربوں کے نزدیک ہر گرم کی ہوئی شی حمیم کہلاتی ہے۔ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی دردناک عذاب، اس کا درد اور تکلیف ان کے دلوں تک پہنچے گی۔ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب (یہ عذاب ہوگا) بڑے بڑے قریش یہ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 99

اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس ان کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے اور فرمایا ہے: جو ابتداء پر قادر ہے وہ فناہ کرنے کے بعد یا اجزاء کو متفرق کرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

''وہی ہے جس نے بنایا سورج کو درخشاں اور چاند کو نور اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تا کہ تم جان لو گنتی برسوں کی اور حساب، نہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے مگر حق کے ساتھ، تفصیل سے بیان کرتا ہے (اپنی قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً یہ دونوں (الشمس اور ضیاء) مفعول ہیں، ضیاء بمعنی مضیة (روشن کرنے والا) اور اسے مونث ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ مصدر ہے، یا پھر یہ بمعنی ذات ضیاء ہے (روشنی والا) وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا یہ ماقبل پر معطوف ہے۔ یہ بھی نور بمعنی منیرا یا ذا نور ہے (نور والا) پس ضیاء سے مراد وہ روشنی ہے جو چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اور نور وہ ہے جو ظاہر ہوتا ہے اور چھپ جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک ہی اصل نار سے ہے۔ اور ضیاء ضو کی جمع ہے، جیسا سیاط سوط (کوڑا) کی جمع ہے اور حیاض حوض کی جمع ہے۔ قنبل نے ابن کثیر سے ضئاء یا کو ہمزہ سے بدل کر پڑھا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی یاء واؤ مفتوحہ تھی اور یہ فعل کا عین کلمہ ہے، اس کی اصل ضواء ہے پھر اس میں قلب کیا گیا اور اسے یاء بنا دیا گیا جیسا کہ صیام اور قیام میں کیا گیا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے ضئاء ہمزہ کے ساتھ پڑھا تو وہ قلب کیا گیا ہے، الف کے بعد والے ہمزہ کو مقدم کیا گیا تو وہ الف سے پہلے آ گیا اور ضنایا ہو گیا، پھر یا کو ہمزہ سے بدل دیا گیا کیونکہ وہ الف زائدہ کے بعد واقع ہے۔ اسی طرح اگر تو مقدر مان لے کہ یاء جس وقت مؤخر ہو تو وہ اس واؤ کی طرف لوٹ جائے گی جس سے وہ بدلی تھی۔ اور پھر وہ بھی ہمزہ سے بدل جائے گی پس اس کا وزن فلاع ہے جو فعال سے مقلوب ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک سورج اور چاند ان دونوں کے چہرے سات آسمانوں کے باسیوں کو اور ان کی پشتیں سات زمینوں کے رہنے والوں کو روشن کرتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ یعنی اس کو منزلوں والا بنایا یا اس کی منزلیں مقرر کیں۔ پھر کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وقدرھما (یعنی دونوں کے لیے منزلیں مقرر کیں) لیکن ایجاز و اختصار کے لیے ضمیر واحد ذکر کی، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا اِنْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا (الجمعۃ: 11) (اور (بعض لوگوں نے) جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو بکھر گئے اس کی طرف) اور جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأي مختلِفُ

ہم اس کے ساتھ راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ راضی ہے جو تیرے پاس ہے اور رائے مختلف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ اکیلے چاند کے بارے میں خبر ہو، کیونکہ اسی کے ساتھ ان مہینوں کو شمار کیا جاتا ہے جن پر معاملات وغیرہ میں عمل ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور سورۂ یاسین میں ہے: وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ

(یٰسین: 39) یعنی مہینے کے عدد پر اس کی منزلیں مقرر کیں اور وہ اٹھائیس منزلیں ہیں۔ اور دو دن (اس کے) نقصان (کم ہونے) اور محاق (دکھائی نہ دینے) کے لیے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان وہاں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ دو سورج بناتا ایک سورج دن کے لیے اور ایک سورج رات کے لیے تو ان دونوں میں نہ تاریکی ہوتی اور نہ رات، نہ سالوں کی گنتی اور مہینوں کا حساب معلوم ہوتا۔ اور السِّنِيْنَ کی واحد سنۃ ہے۔ اور بعض عرب کہتے ہیں: جمع سنوات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: سنھات ہے اور تصغیر سنیۃ اور سنیھۃ ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق سے محض حکمت اور صواب کا ارادہ کیا ہے اور اپنی صنعت و حکمت کے اظہار کے لیے اور اپنی قدرت اور اپنے علم پر دلالت کرنے کے لیے ایسا کیا اور تاکہ ہر نفس کو اس کی جزا دی جائے جو اس نے کمایا۔ اور یہی حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ آیات کی تفصیل سے مراد ان کی تبیین اور وضاحت کرنا ہے تاکہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کیا جائے، اس لیے کہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ اور دن اپنی روشنی کے ساتھ خاص ہے لیکن نہ یہ ان دونوں کا استحقاق ہے اور نہ اللہ کریم پر واجب ہے، پس یہ ان کے لیے اس پر دلیل ہے کہ یہ مرید (ارادہ کرنے والے) کے ارادہ سے ہوا ہے۔ اور ابن کثیر، ابو عمرو، حفص اور یعقوب نے یفصل یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ اور اس کے بعد یہ ہے: وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ پس یہ اس کے تابع ہوگا۔ اور ابن السمیقع نے تُفَصَّل تاء کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ فعل مجہول پڑھا ہے۔ اور الْاٰيٰتِ کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ نُفَصِّل پڑھا ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

”بے شک گردش لیل و نہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں (ان میں اس کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو متقی ہے“۔

سورۃ البقرہ وغیرہ میں اس کا معنی و مفہوم گزر چکا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک اس کا سبب نزول یہ ہے کہ اہل مکہ نے علامت و نشانی کے بارے سوال کیا تو انہیں جواب یہ دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں تامل اور نظر و فکر کریں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: لِقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ یعنی اس قوم کے لیے جو شرک سے بچتے ہیں۔ پس جس نے شرک کا ارتکاب کیا اور راہنمائی حاصل نہ کی تو پھر یہ نشانی (آیت) اس کے لیے نشانی نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

''بے شک وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی اور خوش وخرم ہیں دنیوی زندگی سے اور مطمئن ہو گئے ہیں اس (کے ساز وسامان) سے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت برتتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے بہ سبب ان عملوں کے جو وہ کماتے رہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا اس میں یَرْجُوْنَ بمعنی یخافون ہے یعنی بے شک وہ لوگ جو ڈرتے نہیں۔ اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

إذا لسعته النحل لم يَرْجُ لَسْعَها و خالفها في بَيْت نُوبٍ عواسل(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یَرْجُوْنَ بمعنی یطمعون ہے بے شک وہ لوگ جو حرص اور طمع نہیں رکھتے اور اس معنی میں ایک دوسرے شاعر کا قول ہے:

أيرجو بنو مروان سمعي وطاعتي وقومي تميمٌ والفلاةُ ورائيا(2)

پس رجاء خوف اور طمع کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی نہ وہ سزا سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی حرص رکھتے ہیں۔ اور عذاب اور ثواب سے ملنے کو ان دونوں کو تفخیم کی خاطر لقاء اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لقاء اپنے ظاہر معنی پر بھی جاری ہے اور وہ رؤیت (دیکھنا) ہے یعنی وہ جو ہماری رؤیت کی حرص اور طمع نہیں رکھتے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: رجاء خوف کے معنی میں واقع نہیں ہوتا مگر تب جب انکار کے ساتھ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ⑬ (نوح) اور بعض نے یہ کہا ہے: بلکہ ہر جگہ اس معنی میں واقع ہو سکتا ہے یہ معنی اس پر دلیل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ آخرت کے عوض اس دنیوی زندگی سے خوش وخرم ہیں پس انہوں نے اسی کے لیے عمل کیے۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا یعنی وہ اس کے ساتھ خوش ہو گئے اور اسی میں راحت وسکون پا لیا، اطمأن کی اصل طأمن طمانینة ہے پس اس کی میم کو مقدم کیا گیا اور نون اور الف وصل (ہمزہ وصل) زائد کر دیا گیا، اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا اور وہ لوگ جو ہمارے دلائل سے غٰفِلُوْنَ غفلت برتتے ہیں یعنی نہ وہ ان کا اعتبار کرتے ہیں اور نہ ان میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ دوزخ ہے بسبب کفر اور تکذیب کے جس کا ارتکاب وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ⑨

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث، رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں نعمت (وسرور) کے باغوں میں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 423 2۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یقیناً وہ لوگ جنہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ اور نیک عمل کیے ان کے لیے ان کا رب ہدایت میں اضافہ فرمادے گا، جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: 17) (اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے الله تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی ایسے مکان کی طرف کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور ابوروق نے کہا ہے: ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی جنت کی طرف کردے گا۔ اور عطیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ وہ انہیں ثواب اور جزا دے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ ان کا رب نور کے ساتھ پل صراط پر ان کی راہنمائی جنت کی طرف کرے گا، (یعنی) وہ ان کے لیے ایک نور پیدا فرمادے گا جس کے ساتھ وہ چلتے رہیں گے (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو اسے تقویت پہنچاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کو اس کا عمل انتہائی حسین صورت میں ملے گا پس وہ اسے مانوس کرے گا اور اس کی راہنمائی کرے گا اور کافر کا عمل انتہائی قبیح صورت میں اس سے ملے گا پس وہ اسے وحشت زدہ کردے گا اور اسے گمراہ کردے گا'' (2)۔ یہ حدیث کا معنی ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: ان کا رب ان کے عمل کو ان کے لیے ہادی بنادے گا۔ اور حسن نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ، یرحمهم کے معنی میں ہے (یعنی ان کا رب ان پر رحم فرمائے گا)

قولہ تعالیٰ: تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کہا گیا ہے کہ کلام میں واؤ محذوف ہے، ای و تجری من تحتهم یعنی ان کے باغوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے تختوں اور محلات کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اور سیر وتفریح اور کشادگی میں یہی احسن ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾

''(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے الله اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں الله تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، دَعْوٰىهُمْ یعنی ان کی پکار (اور دعا) اور الدعوی دعا یدعو کا مصدر ہے، جیسا الشکوی شکا یشکو کا مصدر ہے، یعنی جنت میں ان کی دعا اور پکار یہ ہوگی کہ وہ کہیں گے پاک ہے تو اے الله۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ کوئی چیز مانگنے کا ارادہ کریں گے تو وہ سوال لفظ تسبیح سے شروع کریں گے اور اسے حمد کے ساتھ ختم کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی پکار اور ندا خدام کو ہوگی تاکہ وہ ان کے پاس وہ چیز لے کر آئیں جو ان کی خواہش اور چاہت ہے، پھر وہ الله تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں گے اور یہ قول بھی ہے: بے شک یہاں دعا بمعنی تمنی ہے الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَكُمْ فِیْهَا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 104 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 24-423

مَا تَدَّعُوْنَ (حم السجدہ) ای ما تتمنون (اور تمہارے لیے اس میں وہ ہوگا جس کی تم تمنا اور خواہش کرو گے)۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی دعا یا فرشتے کی دعا یا ان میں سے بعض کی بعض کے لیے دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور تحیہ کا مکمل مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ

قولہ تعالیٰ: وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ کہا گیا ہے: بے شک اہل جنت کے پاس سے جب کوئی پرندہ گزرے گا اور وہ اس کی خواہش کریں گے تو کہیں گے: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (پاک ہے تو اے اللہ!) تو فرشتہ اسے ان کے پاس لے آئے گا جس کی انہوں نے خواہش کی ہو گی، پس جب وہ کھا چکیں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں گے پس ان کا سوال لفظ تسبیح کے ساتھ ہوگا اور اس کا اختتام لفظ حمد کے ساتھ ہوگا۔ اور ابو عبید نے ان کو تخفیف کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے مابعد کو رفع دیا ہے۔ فرمایا: بلاشبہ ہم نے انہیں دیکھا ہے انہوں نے اسے اختیار کیا ہے اور انہوں نے اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے درمیان فرق کیا ہے: اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ (النور: 7) اور اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ (النور: 9) کیونکہ انہوں نے حکایت کا ارادہ کیا ہے جس وقت کہا جائے گا الحمد للہ۔

نحاس نے کہا ہے: خلیل اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اور اس کا معنی ہے انہ الحمد للہ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی جائز ہے اس میں خفیہ ثقیلہ کے عمل کی طرح عمل کرتا ہے، لیکن رفع عمدہ اور زیادہ بہتر ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ بلال بن ابی بردہ نے وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ابن محیصن کی قراءت ہے، اسے غزنوی نے بیان کیا ہے کیونکہ وہ ان سے بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ سبحان اللہ، الحمد للہ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو دعا کا نام دیا جا رہا ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت اور کرب کے وقت کہا کرتے تھے: لا الہ الا اللہ العظیم الحلیم، لا الہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الہ الا اللہ رب السموات و رب الأرض و رب العرش الکریم (1) علامہ طبری نے کہا ہے: سلف اس دعا کے ساتھ پکارتے تھے اور اسے دعاء الکرب کا نام دیتے تھے۔ اور ابن عیینہ نے کہا ہے اس حال میں کہ ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جب میرے بندے کو مجھ سے کچھ مانگنے سے ثناء مشغول رکھتی ہے تو میں اسے اس سے افضل اور بہتر عطا فرماتا ہوں جو میں سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں"۔ اور وہ چیز جس سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہ اس کا نام دعا رکھا جاتا ہے اگرچہ اس میں دعا کے معنی کی کوئی شے نہیں ہے تو بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے ہے اور اس کی ثنا اور تعریف کی بنا پر ہے، جیسا کہ وہ روایت جسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ مچھلی والے کی دعا ہے جب انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ مچھلی کے پیٹ میں دعا کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء) پس اب کوئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 939

مسلمان ان الفاظ کے ساتھ کسی شے کے بارے میں ہرگز دعا نہیں کرے گا مگر اس کی دعا قبول کی جائے گی (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ سنت میں سے ہے کہ جو بندہ کھانا شروع کرے تو وہ اہل جنت کی اقتداء کرتے ہوئے کھانے، پینے کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے اور جب اس سے فارغ ہو تو الحمدللہ کہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو ایک لقمہ کھاتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے یا ایک گھونٹ پانی پیتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ دعا مانگنے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنی دعا کے آخر میں اسی طرح کہے جو اہل جنت کہیں گے۔ ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے اور بہت خوب ہے کہ وہ سورۂ والصافات کی آخری آیات پڑھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور پاکی کو جامع ہیں ان چیزوں سے جو اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اور مرسلین پر سلام بھیجنے کو اور اختتام الحمدللہ رب العالمین کے ساتھ ہے۔

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪

''اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لیے تو پوری کر دی گئی ہوتی ان کی میعاد (لیکن یوں نہیں بلکہ) ہم چھوڑے رکھتے ہیں انہیں جو توقع نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتا جیسے وہ ثواب اور بھلائی کے لیے جلد بازی کرتے ہیں تو وہ یقیناً مر چکے ہوتے، کیونکہ وہ دنیا میں ضعیف اور کمزور مخلوق کی صورت میں پیدا کیے گئے ہیں اور قیامت کے دن وہ اس طرح نہ ہوں گے، کیونکہ قیامت کے دن انہیں باقی رہنے کے لیے تخلیق کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ مکروہ اور تکلیف وہ دعا کو قبول کرنے میں اسی طرح کرتا جیسے وہ چاہتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کی دعا قبول کرنے میں وہ ان کے ساتھ کرے تو یقیناً وہ انہیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ اور لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ کا معنی یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ کافر کے ساتھ خاص ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کافر کو اس کے کفر پر عذاب دینے میں جلدی کرتا جیسا کہ اس نے اس کو مال اور اولاد میں سے دنیا کی بھلائی عطا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 188، (جفیر قلیل) ایضاً، حدیث نمبر 3427، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، جلد 2، صفحہ 352

کرنے میں جلدی کی ہے تو یقیناً وہ اس کے لیے اس کی میعاد پوری کرنے میں جلدی کرتا تاکہ وہ آخرت کے عذاب کو جلدی پائے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے(1)۔

مقاتل نے کہا ہے: وہ نضر بن حارث کا یہ قول ہے: اے اللہ! اگر یہی تیری طرف سے سچ ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، پس اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے اس کی جلدی کرتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو جاتے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی ذات یا اپنے مال یا اپنی اولاد کو بددعا دیتا ہے جب وہ غصے میں ہوتا ہے: اے اللہ اسے ہلاک کر دے، اے اللہ! اس کے لیے اس میں برکت نہ دے اور اس پر لعنت بھیج یا اسی طرح کی اور بد دعائیں(2)۔ پس اگر اسے اس کی طرف سے قبول کر لیا جائے جیسے خیر اور بھلائی کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے تو ان کی میعاد پوری کر دی گئی ہوتی۔ پس یہ آیت اخلاق ذمیمہ کی مذمت کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ یہ ان بعض لوگوں کے بارے میں ہے جو خیر اور بھلائی کی دعا کرتے ہیں اور اس کی جلدی قبولیت کی خواہش رکھتے ہیں پھر کبھی کبھار بد اخلاقی انہیں شر کے بارے دعا پر ابھارتی ہے۔ پس اگر وہ ان کے لیے (اس کے بارے) جلدی کرتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس دعا کی قبولیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک میں نے اللہ تعالیٰ عزوجل سے التجا کی ہے کہ وہ کسی دوست کی دعا اپنے دوست کے خلاف قبول نہ کرے''۔ اور شہر بن حوشب نے کہا ہے: میں نے بعض کتب میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ملائکہ کو فرماتا ہے جو بندوں پر مقرر کیے گئے ہیں: تم میرے بندے کے خلاف اس حال میں کچھ نہ لکھو جو اسے غمزدہ کر کے کسی شی پر مجبور کر دے۔ یہ اللہ تالیٰ کی جانب سے اس پر لطف و عنایت ہے۔

بعض نے کہا ہے: کبھی ایسی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔ اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں غزوۂ بطن بواط (بواط جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے) میں چلے اور آپ مجدی بن عمرو جہنی کو تلاش کر رہے تھے اور ہم میں سے پانچ، چھ یا سات آدمیوں کے پاس ایک اونٹ تھا اور ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، پس انصار میں سے ایک آدمی کی باری اونٹ پر سوار ہونے کی آئی پس اس نے اسے بٹھایا اور اس پر سوار ہو گیا، پھر اس نے اسے اٹھایا اس نے توقف کیا اور نہ اٹھا۔ پس اس نے اسے کہا: شاء (یعنی اونٹ کو جھڑکا) اللہ تعالیٰ تجھ پر لعنت کرے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے اونٹ کو لعنت کرنے والا کون ہے''؟ اس نے کہا: میں ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس سے نیچے اتر آ اور تو ملعون کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ چل۔ تم نہ بددعا دو اپنی ذاتوں کو اور نہ بددعا دو اپنی اولاد کو اور نہ بددعا کرو اپنے مالوں کے لیے تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ساعت میں موافقت نہ کرو کہ جس میں اس سے عطا کا سوال کیا جاتا ہے اور تمہارے لیے وہ اسے قبول فرما لیتا ہے''(3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 425 2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 108 3۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 416

کتاب مسلم کے علاوہ کسی اور میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ ایک سفر میں تھے تو ایک آدمی نے اپنی اونٹنی کو لعنت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کہاں ہے وہ جس نے اپنی ناقہ پر لعنت کی ہے؟"۔ تو اس آدمی نے کہا: میں یہ ہوں یا رسول اللہ! ﷺ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تو اسے اپنے پیچھے چھوڑ دے تحقیق اس کے حق میں تیری بددعا قبول ہو چکی ہے"۔ اسے حلیمی نے منہاج الدین میں ذکر کیا ہے، شأ، یہ لفظ سین اور شین دونوں کے ساتھ روایت کیا جاتا ہے اور اس کا معنی اونٹ کو جھڑکنا ہے اور یہ بمعنی سر (تو چل) ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ علماء نے بیان کیا ہے کہ تعجیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور استعجال (عجلت کا مطالبہ) بندے کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے: یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور کلام میں حذف ہے ای ولو يعجل الله للناس الشر تعجيلا مثل إستعجالهم بالخير (اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں اتنی ہی جلدی کرے جیسے وہ انہیں خیر اور بھلائی پہنچانے کے لیے جلدی کرتا ہے) پھر تعجیلا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا، پھر اس کی صفت کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اخفش اور فراء کے قول کے مطابق یہ كأستعجالهم ہے پھر کاف کو حذف کر دیا اور اسے نصب دے دی۔ فراء نے کہا ہے: جیسے تو کہتا ہے: ضربت زيدً اضربك ای كضربك (یعنی اس میں کاف کو حذف کیا گیا ہے)

اور ابن عامر نے لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ پڑھا ہے اور یہ قراءت عمدہ ہے کیونکہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ۔

قولہ تعالیٰ: فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یعنی وہ انہیں شر پہنچانے میں جلدی نہیں کرتا بسا اوقات ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لیتا ہے یا ان کی پشتوں سے کوئی مومن پیدا ہوتا ہے۔ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ تاکہ وہ اپنی سرکشی میں متحیر رہیں۔ طغیان کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اہل مکہ مراد ہیں۔ اور یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الآیہ (الانفال: 32) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، واللہ اعلم

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

"اور جب پہنچتی ہے انسانوں کو کوئی تکلیف (تو اس وقت) پکارتا ہے ہمیں لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا ہو، پھر جب ہم دور کر دیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف (تو) چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں (کبھی) پکارا ہی نہیں تھا کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی، اسی طرح آراستہ کر دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لیے وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ کہا گیا ہے کہ یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ابو

حذیفہ بن مغیرہ مشرک ہے، اسے کوئی تکلیف، شدت اور مشقت پہنچی تھی۔ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ وہ ہمیں پکارتا اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے۔

اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا (یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہو) اس سے مراد اس کے جمیع حالات ہیں، کیونکہ انسان ان تین حالات میں سے کسی ایک سے بھاگ نہیں سکتا (1)۔ بعض نے کہا ہے: بے شک آغاز لیٹنے سے کیا ہے کیونکہ اسے امر غالب میں تکلیف جتنی شدید ترین ہوتی ہے، تو وہ اتنا زیادہ پکارتا ہے اور اس کی کوشش میں بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے، پھر بیٹھنے کا ذکر کیا اور پھر کھڑے ہونے کا۔

فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُ ضُرَّهٗ مَرَّ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے یعنی اپنے کفر پر برقرار رہتا ہے اور شکر ادا نہیں کرتا اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت سے مخلوط موحدین کی صفت ہے، جب اسے عافیت پہنچتی ہے تو وہ گناہوں کی اسی روش پر چل دیتا ہے جس پر وہ پہلے تھا۔ پس یہ آیت کافر اور غیر کافر تمام کو عام ہے۔ كَاَنۡ لَّمۡ يَدۡعُنَاۤ اخفش نے کہا: یہ کان ثقیلہ سے مخففہ بنایا گیا ہے اور اس کا معنی کأنہ ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

وَیْ كَأنْ مَنْ یکن له نَشَبٌ یُحْبَبُ ومن یفتقر یعش عیش ضُرّ

كَذٰلِكَ زُيِّنَ یعنی جس طرح اس کے لیے تکلیف اور آزمائش کے وقت دعا کو اور آسودگی اور خوشحالی کے وقت اعراض کو آراستہ کیا گیا۔ زُيِّنَ لِلۡمُسۡرِفِيۡنَ اسی طرح مشرکوں کے لیے کفر و معاصی میں سے ان کے اعمال آراستہ کر دیئے گئے۔ اور اس تزیین کے بارے میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہو۔ اور اس کا گمراہ کرنا اس کا کفر کی طرف دعوت دینا ہے۔

وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾

''اور بے شک ہم نے ہلاک کر دیا کئی قوموں کو جو تم سے پہلے تھیں جب وہ زیادتیاں کرنے لگے۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرم قوم کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا یعنی جب اہل مکہ سے قبل گزشتہ امتوں نے زیادتیاں کیں تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ لَمَّا ظَلَمُوۡا یعنی جب انہوں نے کفر اور شرک کیا۔ وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح معجزات اور روشن دلیلیں لے کر۔ وَ مَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر دیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ الله تعالیٰ کفار مکہ کو گزشتہ امتوں کے عذاب سے ڈرا رہا ہے، یعنی ہم ان کے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کے سبب انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہیں لیکن ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 142

وہ بھی ہیں جو ایمان لے آئیں گے یا ان کی صلبوں سے وہ نکلیں گے جو ایمان لائیں گے۔ یہ آیت ان گمراہ لوگوں کا رد ہے جو ہدایت اور ایمان کے مخلوق ہونے کا قول کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا کا معنی ہے یعنی الله تعالیٰ نے ان کے کفر پر انہیں جزا یہ دی کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ⑭

''پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ (کم اور خلائف) دونوں مفعول ہیں۔ اور الخلائف خلیفہ کی جمع ہے اور اس کا ذکر سورۂ انعام کے آخر میں گزر چکا ہے، یعنی ہم نے تمہیں زمین میں سکونت اختیار کرنے والا بنایا۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہلاک ہونے والی بستیوں کے بعد۔ لِنَنْظُرَ یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اور اس کی نظائر اور مثالیں پہلے گزر چکی ہیں، یعنی تاکہ تم سے وہ عمل واقع ہو جس کے سبب تم ثواب اور عقاب کے مستحق بن جاؤ گے اور وہ اسے مسلسل غیب جانتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ وہ تمہارے ساتھ اظہار عدل کے لیے مخیر (امتحان لینے والا) کے معاملہ کی طرح معاملہ کرے۔ اور یہ قول بھی ہے: نظر کی نسبت رسل کی طرف ہے، یعنی تاکہ ہمارے رسول اور ہمارے اولیاء دیکھ لیں تمہارے اعمال کیسے ہیں۔ اور كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کے سبب منصوب ہے، کیونکہ استفہام کے لیے صدر کلام ضروری ہے اور اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کر سکتا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری روشن آیتیں (تو) کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کر دیجئے اسی میں، فرمایئے مجھے اختیار نہیں کہ ردوبدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے، میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف، میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا، تُتْلٰى یعنی تقرء (اور جب ان پر پڑھی جاتی ہیں ہماری آیات) اور بینات حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی واضح اور بین آیتیں جن میں نہ کوئی التباس ہے اور نہ کوئی اشکال۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یعنی جو نہ یوم بعث اور حساب سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں (وہ کہنے لگتے ہیں) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد مکہ کے رہنے والے مشرک ہیں (1)۔ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 144

تبدیلی کرنے اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں فرق یہ ہے کہ اس کو تبدیل کرنے میں یہ جائز نہیں کہ یہ اس کے ساتھ ہو اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں یہ جائز ہو سکتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ ہو۔ ان کے اس قول میں تین وجوہ ہیں۔ (۱) کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ وہ وعدہ کو وعید میں اور وعید کو وعدہ میں، حلال کو حرام میں اور حرام کو حلال میں بدل دیں، یہ ابن جریر طبری کا قول ہے۔ (۲) انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ ان کے معبودوں کے عیوب کے بارے میں اور ان کے عقل مندوں کو احمق اور بے وقوف کہے جانے کے بارے میں جو کچھ قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کر دیں، ختم کر دیں۔ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ (۳) کہ انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ موت کے بعد زندہ کیے جانے اور اٹھائے جانے کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کر دیں، زائل کر دیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے میرے اختیار میں نہیں۔ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ کہ میں اپنی طرف سے اس میں رد و بدل کر دوں، جیسا کہ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے رد کر دوں اور جھٹلا دوں۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ یعنی میں اتباع نہیں کرتا مگر اس کی جس کی میں تم پر وعدہ و وعید، حرام و حلال اور امر و نہی میں سے تلاوت کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ اور اس استدلال میں خاصا بعد ہے، کیونکہ آیت مشرکوں کے اس مطالبے کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ نظم (والفاظ) کے اعتبار سے قرآن کی مثل لاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر نہیں اور انہوں نے آپ سے الفاظ کے بغیر حکم تبدیل کرنے کا سوال نہیں کیا، کیونکہ وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں تبھی ہو سکتا ہے جب یہ وحی ہو آپ کی اپنی مرضی سے نہ ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ یعنی میں ڈرتا ہوں اگر میں اس میں تغیر و تبدل کر کے یا اس کے مطابق عمل ترک کر کے اپنے رب کی مخالفت کروں۔ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ یعنی یوم قیامت کے عذاب سے (2)۔

قُلۡ لَّوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا تَلَوۡتُہٗ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَدۡرٰىکُمۡ بِہٖ ۫ۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

”آپ فرما دیجئے اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو میں نہ پڑھتا اسے تم پر اور نہ وہ آگاہ کرتا تمہیں اس سے، میں تو گزار چکا ہوں تمہارے درمیان عمر (کا ایک حصہ) اس سے پہلے، کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلۡ لَّوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا تَلَوۡتُہٗ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَدۡرٰىکُمۡ بِہٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ مجھے تمہاری طرف نہ بھیجتا اور (نہ) میں تم پر قرآن کریم پڑھتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بارے آگاہ کرتا اور نہ تمہیں خبر دیتا۔ کہا جاتا ہے: دریتُ الشیء (میں نے کسی شی کو جان لیا) و أدرانی اللہ بہ (اور اللہ نے مجھے اس کے بارے آگاہ کیا) و دریتُہ و دریتُ بہ (میں نے اسے جان لیا اور مجھے اس کے بارے آگاہ کیا گیا) اور درایت میں دھوکہ اور فریب دینا کا معنی پایا جاتا ہے اور اسی سے ہے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 426　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 427

دریتُ الرجل یعنی ختلته (میں نے اسے دھوکا دیا)۔ اسی وجہ سے الداری مطلق اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں استعمال کیا جاسکتا اور یہ بھی کہ اس میں توقیف نہیں ہے۔ اور ابن کثیر نے ولأدراکم بہ لام اور ہمزہ کے درمیان بغیر الف کے اسے پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں اس کے بارے آگاہ کردیتا بغیر اس کے کہ میں تم پر اس کی تلاوت کرتا پس یہ لام تاکید ہے جو فعل کے الف پر داخل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے ولا أدراتکم بہ یاء کو الف سے تبدیل کرکے پڑھا ہے، اور یہ بنی عقیل کی لغت پر ہے، شاعر نے کہا ہے:

لعمرك ما أخشى التّصعلك مابقي على الأرض قَيْسِيٌ يسوق الأباعرا(1)

اور دوسرے نے کہا ہے:

ألا آذنتْ أهلَ اليمامة طيّئ بحرب كناصات الأغرّ المشهّرِ(2)

ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے عمرو بن علاء سے پوچھا: کیا حسن کی قراءت ولا ادراتکم بہ کی کوئی وجہ اور دلیل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ اور ابوعبید نے کہا ہے: حسن کی قراءت ولا أدراتکم بہ کی سوائے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابوعبید کے قول کا معنی ہے: کوئی وجہ نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے غلط ہونے پر، کیونکہ کہا جاتا ہے: دریتُ أی علمتُ (میں نے جان لیا) اور أدریت غیری (میں نے اپنے غیر کو آگاہ کیا) اور کہا جاتا ہے: درأت أی دفعت (میں نے دور کیا، میں نے دفاع کیا) پس دریت اور درآت کے درمیان غلطی واقع ہورہی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حسن اس میں ولا أدریتکم بہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس انہوں نے بنی حارث بن کعب کی لغت کے مطابق یا کو الف سے بدل دیا ہے، (کیونکہ) وہ یا کو الف سے بدل دیتے ہیں جب اس کا ماقبل مفتوح ہو، جیسا کہ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (طٰہٰ: 63)

مہدوی نے کہا ہے: جس نے أدراتکم پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمزہ کی اصل یا ہے پس اس کی اصل أدریتکم ہے پھر یاء کو الف سے بدل دیا گیا اگرچہ وہ ساکن ہے، جیسا کہ کہا: یایس یہ اصل میں ییبس ہے۔ اور طائی اصل میں طیئ ہے۔ پھر الف کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے العالم میں العألم اور الخاتم اور الخأتم کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور حسن سے ایک روایت ولا أدرأتکم ہمزہ کے ساتھ بھی ہے اور ابو حاتم وغیرہ نے کلام کی ہے کہ وہ ہمزہ کے بغیر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ درأت بمعنی دفعت سے ہو، یعنی میں تمہیں حکم نہ دیتا تھا کہ تم دور ہو جاؤ اور قرآن کے بدلے کفر کو چھوڑ دو۔

قولہ تعالیٰ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا یہ ظرف ہے، یعنی زمانے کی ایک مقدار اور وہ چالیس برس ہے (یعنی میں تم میں اتنا عرصہ گزار چکا ہوں) مِّنْ قَبْلِهٖ قرآن کریم سے پہلے۔ تم مجھے صدق اور امانت کے سبب پہچانتے ہو، نہ میں پڑھتا ہوں اور نہ لکھتا ہوں، پھر میں تمہارے معجزات لے کر آیا۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 113 2۔ ایضاً

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ نہیں ہو سکتا مگر الله تعالیٰ کی جانب سے نہ کہ میری جانب سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا کا معنی ہے میں نے اپنی جوانی کی مدت تمہارے درمیان گزاری ہے میں نے الله تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی، کیا تم اب مجھ سے یہ چاہتے ہو حالانکہ میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں کہ میں الله تعالیٰ کے حکم کے خلاف کروں اور میں اس میں ردوبدل کروں جو وہ مجھ پر نازل فرماتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: آپ نے ان میں چالیس برس گزارے اور دو سال اس حال میں گزارے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب دیکھتے رہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باسٹھ برس کی عمر میں وصال فرمایا۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۱۷﴾

''پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افتراء باندھے الله تعالیٰ پر جھوٹا یا جھٹلائے الله تعالیٰ کی آیتوں کو بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے''۔

یہ استفہام بمعنی انکار ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جس نے الله تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھا اور اس کے کلام کو بدل دیا اور اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کر دی جو اس نے نازل نہیں کی۔ اور اسی طرح تم سے زیادہ کوئی ظلم کرنے والا نہیں جب تم نے قرآن کریم کا انکار کیا اور الله تعالیٰ پر جھوٹا افترا باندھا اور تم نے یہ کہا: یہ اس کا کلام نہیں۔ اور یہ اس میں سے ہے جس کے بارے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں یہ کہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ابتداءً الله تعالیٰ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ افترا باندھنے والا مشرک ہے اور آیات کو جھٹلانے والا اہل کتاب میں سے ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ۔

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۸﴾

''اور (یہ مشرک) عبادت کرتے ہیں الله تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ (معبود) ہمارے سفارشی ہیں الله تعالیٰ کے ہاں، آپ فرمایئے: کیا تم آگاہ کرتے ہو الله تعالیٰ کو اس بات سے جو وہ نہیں جانتا نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، پاک ہے وہ اور بلند و بالا ہے اس شرک سے وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ (اس میں من دون الله سے) مراد بت ہیں۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ یہ ان کی طرف سے جہالت کی انتہا ہے، اس حیثیت سے کہ انجام کار کے طور پر شفاعت کا انتظار ان سے کر رہے ہیں جن سے حال میں نہ نفع پایا جا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شُفَعَآؤُنَا یعنی یہ ہمارے لیے الله تعالیٰ کے پاس دنیا میں ہماری معاشی اصلاح کے بارے میں سفارش کریں گے۔

قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ عام قراءت تنبئون تشدید کے ساتھ ہے۔ اور ابو السحال

العدوی نے أتنبئون اللہ مخفف کر کے پڑھا ہے۔ یہ أنبا ینبیٔ سے ہے۔ اور عام قراءت نبا ینبی تنبئۃ سے ہے۔ اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دونوں جمع ہیں: مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ (التحریم) یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کو خبر دے رہے ہو کہ اس کا اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے یا اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا آسمانوں میں اور زمین میں، کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں پس اسی لیے وہ اسے نہیں جانتا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ (الرعد: 33) پھر اس نے اپنی ذات کی پاکی بیان کی اور اسے شرک سے پاکیزہ قرار دیا اور فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ یعنی وہ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ عبادت کرتے ہیں ان کی جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ (معبود) اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ پس وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا اس نے تمہیں تیار کیا ہے کہ تم اسے اس بات کے بارے آگاہ کرو جو وہ نہیں جانتا، اس کی ذات پاک ہے اور اس سے بلند تر ہے جسے وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے تشرکون تا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہی ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور نہیں تھے لوگ (ابتداء میں) مگر ایک ہی امت پھر (اپنی کجروی سے) باہم اختلاف کرنے لگے اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں''۔

اس کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ عرب شرک پر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر وہ بالغ ہونے کے وقت مختلف ہو جاتے ہیں۔ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ یہ قضاء وقدر کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگر اس کے حکم میں پہلے سے نہ ہوتا کہ وہ ان کے درمیان ان امور میں قیامت سے پہلے فیصلہ نہیں کرے گا جن میں ثواب وعقاب کے اعتبار سے وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کے درمیان دنیا میں فیصلہ کر دیا جاتا، پس وہ مومنوں کو ان کے اعمال کے عوض جنت میں اور کافروں کو ان کے اعمال کے بدلے جہنم میں داخل کر دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے کرتوتوں کا علم رکھنے کے باوجود پہلے سے ایک مدت مقرر ہے اور اس نے ان کے لیے جائے وعدہ قیامت کو بنا رکھا ہے(1)۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور ابو روق نے کہا ہے: لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ تو ان پر قیامت قائم کر دیتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو وہ ان کی ہلاکت سے فارغ ہو چکا ہوتا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الكلمة یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مہلت دی ہے کہ وہ انہیں دنیا میں یوم قیامت تک عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا، پس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 146

اگر یہ مہلت نہ ہوتی تو ان کے درمیان عذاب نازل کرتے یا قیامت قائم کر کے فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث تسلی ہے ان لوگوں سے عذاب کی تاخیر کے بارے میں جنہوں نے آپ کے ساتھ کفر اختیار کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلمہ سابقہ یہ ہے کہ وہ کسی کو بغیر حجت اور دلیل کے نہیں پکڑے گا اور وہ رسولوں کو بھیجتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: سبقت رحمتی غضبی (1) (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے) اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گنہگاروں کو توبہ کی مہلت نہ دیتا۔ اور عیسیٰ نے لَقَضٰی کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

''اور کہتے ہیں کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت ان کے رب کی طرف سے؟ سو آپ فرمایئے: غیب تو صرف اللہ کے لیے ہے پس انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں''۔

مراد اہل مکہ ہیں، یعنی کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت، یعنی معجزہ جو اس معجزہ کے سوا ہوتا کہ وہ ہمارے لیے پہاڑوں کو سونا بنا دے اور اس کے لیے انتہائی خوبصورت (سونے کا) گھر ہو اور ہمارے لیے انہیں زندہ کرے جو ہمارے آباء واجداد میں سے مر چکے ہیں۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد عصا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا (یعنی ایسا معجزہ کیوں نہ نازل کیا گیا) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ یعنی آپ فرما دیجئے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آیت کا نازل ہونا غیب ہے۔ فَانْتَظِرُوْا پس تم انتظار کرو۔ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ بے شک میں بھی اس کے نازل ہونے کا تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حق کو باطل پر غالب کرنے کے بارے ہمارے درمیان تم اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرو۔

وَاِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا ۗ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۗ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝

''اور جب ہم لطف اندوز کرتے ہیں لوگوں کو (اپنی) رحمت سے اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تو فوراً وہ مکر وفریب کرنے لگتے ہیں ہماری آیتوں میں، فرمایئے: اللہ زیادہ تیز ہے اس فریب کی سزا دینے میں، بے شک ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قلم بند کر رہے ہیں جو فریب تم کر رہے ہو''۔

مراد کفار مکہ ہیں۔ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ کہا گیا ہے: مراد شدت اور تنگی کے بعد آسودگی اور خوشحالی کا آنا ہے اور خشک سالی کے بعد شادابی کا آنا ہے (2)۔ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا اس میں مکر سے مراد استہزا اور تکذیب ہے۔ (تو فوراً وہ ہماری آیتوں کے ساتھ استہزا اور ان کی تکذیب کرنے لگتے ہیں) اور خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق وَاِذَاۤ اَذَقْنَا کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1127　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 429

جواب اِذَا لَهُمْ ہے۔ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَكْرًا یہ بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی وہ ان کے مکر وفریب کی جزا کے طور پر سزا دینے میں بہت جلدی کرنے والا ہے، یعنی جو کچھ انہوں نے مکر وفریب سے کیا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ انہیں ہلاک کرنے کے لیے وہ ان پر عذاب لا سکتا ہے۔ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ یہاں رسل سے مراد کراماً کاتبین ہیں۔ اور قراءت عامہ تمکرون تا خطاب کے ساتھ ہے اور یعقوب نے اردیس کی روایت میں اور ابو عمرو نے ہارون العتکی کی روایت میں یمکرون یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قول کی وجہ سے: اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْۤ اٰیَاتِنَا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو سفیان نے عرض کی: آپ کی دعا سے ہم پر قحط مسلط کر دیا گیا ہے پس اگر آپ ہمیں سیراب کر دیں تو ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارش کی دعا کرنے کے ساتھ انہیں بارش عطا کر دی گئی لیکن وہ ایمان نہ لائے، پس یہی ان کا مکر اور دھوکا تھا۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

”وہی ہے جو سیر کراتا ہے تمہیں خشک زمین اور سمندر میں یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر موافق ہوا کی وجہ سے اور وہ مسرور ہوتے ہیں اس سے (تو اچانک) آ لیتی ہے انہیں تند و تیز ہوا اور آ لیتی ہیں انہیں موجیں ہر جگہ (طرف) سے اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں گھیر لیا گیا تو (اس وقت) پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے (کہتے ہیں اے کریم!) اگر تو نے بچا لیا ہمیں اس (طوفان) سے تو ہم یقیناً ہو جائیں گے (تیرے) شکر گزار (بندوں) سے۔ پھر جب وہ بچا لیتا ہے انہیں تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق، اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تمہیں پر پڑے گا لطف اٹھا لو دنیوی زندگی سے پھر ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تمہیں، پھر ہم آگاہ کریں گے تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ یعنی وہ تمہیں خشکی میں چوپاؤں پر اور سمندر میں کشتیوں پر سوار کرتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ سیر میں تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ اور یہ آیت ان نعمتوں کے شمار کرنے کو متضمن ہے جو اس کے راستے میں لوگوں کو جانوروں پر اور سمندر میں سوار کرنے میں سے پائی جاتی ہیں۔ سمندر میں سوار ہونے کے بارے میں کلام سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور یُسَیِّرُكُمْ قراءت عامہ ہے۔ ابن عامر

نے ینشرکم نون اور شین کے ساتھ قراءت کی ہے، یعنی وہ تمہیں پھیلاتا ہے اور متفرق کر دیتا ہے۔ اور الفلك کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے۔ اور اس کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور قولہ: وَجَرَيْنَ بِهِمْ یہ خطاب سے غیب کی طرف خروج ہے اور قرآن کریم اور اشعار عرب میں ایسا کثرت سے موجود ہے، جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

یا دارمیّة بالعَلْیاء فالسَّنَد أقْوَت وطال علیها سالف الأمَد

ابن انباری نے کہا ہے: لغت میں یہ جائز ہے کہ غیب کے خطاب سے صراحۃً لفظ خطاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (الدہر) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں) تو اس میں کاف کو ہا کے بدلے لایا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ، جاءتها میں ہا ضمیر سفینہ (کشتی) کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مرجع ریح طیبة ہے۔ اور العاصف کا معنی شدید اور تند و تیز (ہوا) ہے۔ کہا جاتا ہے: عصفت الریح و أعصفت، فهي عاصف و معصف و معصفه أي شدیدة (یعنی شدید آندھی) شاعر کا قول ہے:

حتی إذا أعصفت ریح مُزَعزِعة فیها قطار ورعد صوته زَجِل(1)

اور فرمایا: عاصف مذکر لایا گیا ہے، کیونکہ لفظ ریح مذکر ہے اور یہی قاصف (ہر شے کو توڑنے والی) بھی ہے۔ اور طیبہ سے مراد ایسی ہوا ہے جو نہ تند و تیز ہو اور نہ انتہائی سست ہو۔ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ موج سے مراد وہ لہر ہے جو پانی سے اٹھتی ہے۔ وَّ ظَنُّوْٓا یعنی وہ یقین کر لیں۔ اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ کہ انہیں مصیبت اور آزمائش نے گھیر لیا ہے۔ جو کوئی کسی مصیبت اور آزمائش میں واقع ہو جائے تو کہا جاتا ہے: قد أحیط به گویا آزمائش اور مصیبت نے اسے گھیر لیا ہے۔ اور اس کی اصل یہ ہے کہ دشمن جب کسی جگہ کو گھیر لے اور وہاں کے رہنے والے ہلاک ہو جائیں۔ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی اس وقت صرف اکیلے اسی کو پکارتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں جن کی پرستش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے کہ وہ شدائد اور مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتی ہے اور یہ کہ مضطر (مجبور محض) کی دعا کو قبول کر لیا جاتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو، اس لیے کہ اس کے اسباب ختم ہو چکے ہیں اور اس نے وحدہ لاشریک رب الارباب کی طرف رجوع کر لیا ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: بے شک انہوں نے اپنی دعا میں أهیا شراهیا یعنی یاحی یا قیوم کہا ہے۔ اور یہ عجم کی لغت ہے۔

مسئلہ: یہ آیت مطلق سمندر میں سوار ہونے پر دلالت کرتی ہے اور سنت سے ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 117

میں ہے: بے شک ہم سمندر میں سوار ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی بھی اٹھا لیتے ہیں (1)...... الحدیث۔ اور ام حرام کے قصہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جنگ کے دوران سمندر میں سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور سورۂ اعراف کے آخر میں سمندر کے موجیں مارنے اور اس میں طوفان آنے کی حالت میں اس میں سوار ہونے والے کا حکم گزر چکا ہے کیا اس کا حکم تندرست آدمی کا حکم ہے یا اس مریض کا جس کو روک دیا گیا ہے؟ وہاں اس میں غور کرلو۔

قولہ تعالیٰ: لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو ہمیں بچالے اس شدید طوفان اور ہولناکی سے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس ہوا سے۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ تو ہم یقیناً اس نجات اور خلاصی پانے کی نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے تیری اطاعت و فرمانبرداری میں عمل کرنے والوں میں سے ہوجائیں گے۔ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ پس جب وہ انہیں بچالیتا ہے اور خلاصی عطا فرمادیتا ہے۔ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ تو پھر وہ زمین میں فساد اور معاصی کا عمل ہی کرتے ہیں۔ اور البغی کا معنی فسا اور شرک ہے: یہ بغی الجرح سے ہے جب زخم فاسد اور خراب ہوجائے۔ اس کا اصل معنی طلب ہے یعنی وہ فساد برپا کر کے غلبہ چاہتے ہیں۔ بِغَیْرِ الْحَقِّ یعنی جھٹلانے کے ساتھ۔ اور اسی سے بغت المرأة ہے جب عورت خاوند کے سوا کسی اور کی خواہش کرے (یعنی زنا کا ارتکاب کرے)

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ یعنی اس کا وبال تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ یہاں کلام مکمل ہوگئی۔ پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی یہ دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، اس کے لیے کوئی بقا نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بَغْیُكُمْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ہے اور عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ، البغی کے فعل کے معنی کا مفعول ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو اور مبتدا مضمر ہو یعنی ذالك متاع الحیاة الدنیا یا هو متاع الحیاة الدنیا اور دونوں معنوں کے درمیان انتہائی لطیف اور باریک سا فرق ہے۔ جب تو متاع کو بَغْیُكُمْ کی خبر ہونے کی وجہ سے رفع دے تو معنی یہ ہوگا: بے شک تم میں سے بعض کا وبال بعض پر پڑے گا، مثلاً فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) (تم سلامتی کی دعا دو اپنوں کو) اور اسی طرح لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے) اور جب خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو تو معنی ہوگا بے شک تمہارا فساد تمہیں پر لوٹے گا۔ جیسا کہ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7)

سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ارادہ یہ کیا ہے کہ فساد دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، یعنی اس کی سزا دنیا میں اس کے مالک کے لیے جلدی آتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: البغی مصرعة (فساد تو پچھاڑ ہے) اور ابن ابی اسحاق نے متاع کو منصوب پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدر ہے، یعنی تم دنیوی زندگی سے انتہائی لطف اندوز ہوتے ہو یا پھر حرف جر کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے اصل میں لمتاع تھا یا یہ مصدر ہے اور حال ہونے کی بنا پر بمعنی مفعول ہے، ای متمتعین یا یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1048

ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فی متاع الحیاۃ الدنیا اور ظرف، جار مجرور اور حال کا متعلق البغی میں فعل کا معنی ہے اور علیٰ اَنۡفُسِکُمۡ اس معنی کا مفعول ہے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡكُلُ النَّاسُ وَ الۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتۡ وَ ظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِیۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

''پس حیات دنیوی (کے عروج وزوال) کی مثال ایسی ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے سو گھنی ہو کر اگی پانی کے باعث سرسبزی زمین کی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی اور یقین کر لیا اس کے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پالیا ہے اس پر (تو اچانک) آپڑا اس پر ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کے وقت پس ہم نے کاٹ کر رکھ دیا اسے گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں، یونہی ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ آیت کے معنی میں تشبیہ اور تمثیل ہے، یعنی دنیوی زندگی اپنے فناہ ہونے، زوال پذیر ہونے، اپنے رتبہ کے کم ہونے اور اس پر فخر کرنے کے اعتبار سے پانی کی مثل ہے، پس آیت میں کاف رفع کے محل میں ہے۔ اس تشبیہ کا مزید بیان سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ یہ ماء کی صفت ہے۔ فَاخۡتَلَطَ حضرت نافع سے روایت ہے کہ انہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف کیا ہے یعنی پانی زمین کے ساتھ مل گیا، پھر ابتدا کی۔ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ یعنی پانی کے ساتھ زمین کی سرسبزی ہے۔ پس زمین نے طرح طرح کی نباتات نکالیں پس اس بنا پر نبات مبتدا ہے اور اس کے مذہب کے مطابق جنہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف نہیں کیا نبات اختلط کے سبب مرفوع ہے یعنی نباتات بارش کے ساتھ مل گئیں یعنی نباتات بارش سے سیراب ہوئیں اور نمی حاصل کی، خوبصورت ہوئی اور خوب سرو سبز و شاداب ہو کر اگی اور اختلاط کا معنی ہوتا ہے ایک چیز کا آپس میں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو جانا۔

قولہ تعالیٰ: مِمَّا یَاۡكُلُ النَّاسُ جس سے انسان بھی کھاتے ہیں مثلاً دانے (اناج) پھل اور سبزیاں وَ الۡاَنۡعَامُ اور حیوان بھی، مثلاً گھاس، بھوسہ اور جو وغیرہ۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا یہاں تک کہ جس زمین نے اپنا حسن اور اپنا سنگار لے لیا۔ اور الزخرف کا معنی ہے کسی شے کا حسن و کمال۔ اور اسی وجہ سے سونے کو بھی زخرف کہا گیا ہے۔ وَ ازَّیَّنَتۡ یعنی وہ دانوں، پھلوں اور پھولوں کے ساتھ خوب آراستہ ہوگئی۔ یہ لفظ اصل میں تزینت ہے اس میں تا کو زا میں ادغام کیا گیا ہے اور ابتدا میں ہمزہ وصل لایا گیا ہے، کیونکہ حرف مدغم قائم مقام دو حرفوں کے ہوتا ہے ان میں سے پہلا ساکن ہوتا ہے اور ساکن

سے ابتدا ممکن نہیں ہوتی۔ اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے وتزینت اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور حسن، اعرج اور ابو العالیہ نے وازینت پڑھا ہے یعنی غلہ اور کھیتی اس پر زینت اور سنگار لائی۔ اور یہ فعل کو اپنے اصل کے مطابق لائے ہیں اگر چہ اس کی تعلیل کی ہے اور کہا ہے: وازانت۔ اور عوف بن ابی جمیلہ اعرابی نے کہا ہے: ہمارے اشیاخ نے واز یانت پڑھا ہے اس کا وزن اسوادت ہے۔ اور مقدمی کی روایت میں واڑاینت ہے اور اس میں اصل تزاینت ہے، اس کا وزن تفاعست ہے پھر اس میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور حضرت شعبی اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے وازینت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ابو عثمان نہدی نے وازْیَنَت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ان سے وازیانت، أفعالت کی مثل بھی ہے اور ان سے ازیأنت ہمزہ کے ساتھ بھی مروی ہے، یہ تین قراءتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: **وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ** اور اس کے مالکوں نے یقین کر لیا۔ **اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ** کہ اب وہ اس کے کاٹنے اور اس سے نفع اٹھانے پر قادر ہیں۔ زمین کے بارے خبر دی ہے اور اس سے مقصود نباتات ہے جب اس کو سمجھا گیا اور رد اسی سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر غلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زینت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ **اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا** تو اس پر اچانک ہمارا عذاب آ پڑا یا اسے ہلاک کرنے کے بارے ہمارا حکم آ پڑا۔ **لَیْلًا اَوْ نَهَارًا** یہ دونوں ظرفیں ہیں۔ **فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا** یہ دو مفعول ہیں، یعنی پس ہم نے اسے کٹا ہوا بنا دیا (گویا) اس میں کوئی شے نہ تھی اور فرمایا: **حَصِیْدًا** اور اسے مونث ذکر نہ کیا گیا کیونکہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: الحصید کا معنی مستاصل جڑ سے کٹا ہوا ہے۔ **كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ** یعنی گویا کہ وہ کل آباد نہ تھی، یہ غنی سے ہے جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے آباد کرے۔ اور لغت میں مغانی سے مراد وہ منازل (گھر) ہیں جنہیں لوگ آباد کرتے ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: گویا وہ خوشگوار اور سر سبز ہوئی ہی نہیں۔ لبید نے کہا ہے:

وغَنِیتُ سَبْتًا قبل مَجْرَی داحس		لو کان للنفس اللَّجُوج خلودُ(1)

عام قراءت تغن تا کے ساتھ ہے، کیونکہ الارض مونث ہے۔ اور حضرت قتادہ نے یغن یاء کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ اس کی نسبت زخرف کی طرف کرتے ہیں، یعنی جس طرح وہ اس کھیتی کو ہلاک کر سکتا ہے اسی طرح وہ دنیا کو بھی ہلاک و برباد کر دے گا۔ **نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ** یعنی ہم نشانیاں اور علامات بیان کرتے ہیں۔ **لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ** اس قوم کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۲۵

"اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف۔ اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف"۔

قولہ تعالیٰ: **وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ** جب اللہ تعالیٰ اس دار یعنی دار دنیا کا وصف ذکر کر چکا تو اس نے آخرت کا وصف

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 431-430

بیان فرمایا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا جمع کرنے کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ وہ تمہیں طاعت کی طرف بلاتا ہے تاکہ تم دار السلام یعنی جنت کے اہل ہو جاؤ۔ حضرت قتادہ اور حسن نے فرمایا: السلام تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا دار جنت ہے (1)۔ اور جنت کو دار السلام کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جو اس میں داخل ہو گیا وہ آفات سے محفوظ و مامون ہو جائے گا۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں سے ''السلام'' ہے، تحقیق ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں بیان کیا ہے اور اس کا ذکر سورۃ الحشر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور السلام اور السلامۃ ایک ہی معنی میں ہیں جیسے الرضاع اور الرضاعۃ ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

تُحَيِّي بالسلامة أمُّ بكرٍ وهل لكِ بعد قومِكِ من سلام

اور کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دار التحیہ کی طرف بلاتا ہے، کیونکہ اس کے باسی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تحیہ اور سلام پائیں گے اور اسی طرح ملائکہ کی طرف سے بھی (سلام پائیں گے)۔ حسن نے کہا ہے: بے شک اہل جنت سے سلام منقطع نہ ہوگا اور یہ ان کا تحیہ ہے، جیسا کہ فرمایا: وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ (یونس: 10) اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور یحییٰ بن معاذ نے کہا ہے: اے ابن آدم! اللہ تعالیٰ تجھے دار السلام کی طرف بلا رہا ہے سو تو دیکھ ہم اسے کہاں سے جواب دے رہے ہیں۔ پس اگر تو نے اسے اپنی دنیا سے جواب دیا تو تو اس میں داخل ہو جائے گا اور اگر تو نے اسے اپنی قبر سے جواب دیا تو تو اس سے روک دیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جنتیں سات ہیں: دار الجلال، دار السلام، جنت عدن، جنۃ الماویٰ، جنۃ الخلد، جنۃ الفردوس اور جنۃ النعیم۔

قولہ تعالیٰ: وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اپنی حجت کے اظہار کے لیے دعوت کو عام کیا اور اپنی مخلوق سے استغنا برتتے ہوئے ہدایت کو خاص کر دیا۔ اور صراط مستقیم کے بارے کہا گیا ہے کہ مراد کتاب اللہ ہے (2)۔ اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اسے نواس بن سمعان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حق ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں صحابی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے سر کے پاس اور حضرت میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کے پاس کھڑے ہیں تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ان کی مثال بیان کیجئے، تو اس نے اسے کہا: تو سن تیرے کان سنیں اور اپنے دل کی عقل کے ساتھ اسے سمجھ بلاشبہ تیری اور تیری امت کی مثال اس بادشاہ کی مثل ہے جس کا ایک دار ہو پھر وہ اس میں گھر بنائے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 121
2۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 114، (مفہوم)

پھر اس میں ایک دعوت کا اہتمام کرے پھر وہ ایک قاصد بھیجے جو لوگوں کو اس کے کھانے کی دعوت دے پس ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اس قاصد کی دعوت کو قبول کیا اور بعض وہ ہیں جنہوں نے اسے چھوڑ دیا، پس اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے اور وہ دار السلام ہے اور وہ بیت (گھر) جنت ہے اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ وہ قاصد اور رسول ہیں پس جس نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو جنت میں داخل ہوگا وہ اس سے کھائے گا جو کچھ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) اس میں ہیں'' (1)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تلاوت فرمائی۔ پھر حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے یہ آیت تلاوت کی وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ اور یہ آیت قدریہ کے خلاف ان کے رد میں واضح اور بین دلیل ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے: وَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ پر نصوص قرآن کو واپس لوٹا دیا (اور انہیں قبول نہ کیا)

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ۭ وَ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''ان کے لیے جنہوں نے نیک عمل کیے نیک جزا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور نہ چھائے گا ان کے چہروں پر (رسوائی کا) غبار اور نہ ذلت (کا اثر ہوگا)، یہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قول باری تعالیٰ وزیادۃ کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: للذین أحسنوا العمل فی الدنیا لهم الحُسنیٰ وهی الجنة والزيادة النظر الى وجه الله الكريم (2) (ان کے لیے جنہوں نے دنیا میں نیک عمل کیے ان کے لیے نیک جزا ہے اور وہ جنت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ اللہ کریم کے چہرہ قدرت کا دیدار ہے) یہی قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور حضرت حذیفہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابو موسیٰ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے اور یہی تابعین کی جماعت کا قول ہے اور یہی اس باب میں صحیح ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے، آپ نے فرمایا: ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تم کوئی چیز چاہتے ہو میں تمہارے لیے اس کا اضافہ کر دوں، تو وہ عرض کریں گے: کیا تو نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا، کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا فرما دی؟ آپ نے فرمایا: پس اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دے گا پھر انہیں کوئی چیز عطا نہیں کی گئی جو اس کے نزدیک اپنے رب کریم کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو'' (3)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 109۔ ایضاً، حدیث نمبر 2787، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 115 3۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 535

اور ایک روایت میں ہے: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ اور اسے نسائی نے بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یہ آیت لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک نداد ینے والا پکارے گا: اے اہل جنت! بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے وہ چاہتا ہے کہ اسے تمہارے لیے پورا کر دے تو وہ کہیں گے: کیا اس نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا اور ہمارے میزانوں کو بھاری نہیں کر دیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا نہیں فرما دی؟ آپ نے فرمایا: پس وہ حجاب اٹھا دے گا اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں گے پھر قسم بخدا! اللہ کریم نے انہیں کوئی چیز عطا نہیں فرمائی جو ان کے نزدیک اس رؤیت سے زیادہ محبوب ہو اور ان کی آنکھوں کو زیادہ ٹھنڈا کرنے والی ہو'' (1)۔

اور اسے ابن المبارک نے اپنے دقائق میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کیا ہے اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ہم نے وہاں کشف الحجاب کا معنی بھی ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔ اور ترمذی حکیم ابوعبداللہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں علی بن حجر نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں ولید بن مسلم نے زہیر سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو زیادتیوں کے بارے پوچھا جن کا ذکر کتاب اللہ میں ہے۔ ایک اس قول میں لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: النظر الی وجہ الرحمن (2) (رحمٰن کے چہرہ قدرت کا دیدار کرنا) اور دوسرا اس ارشاد میں: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴿﴾ (الصافات) تو آپ نے فرمایا: ''(اس سے مراد) بیس ہزار ہیں''۔

تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک زیادة سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزا کو دس نیکیوں سے لے کر اس سے زیادہ گنا تک کر دیا جائے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زیادة ایک موتی سے بنا ہوا کمرہ ہے جس کے چار ہزار دروازے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد نیکی کی مثل نیکی ہے، اور زیادة سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رضامندی کا حاصل ہونا ہے (3)۔ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد جنت ہے، اور زیادة سے مراد وہ افضل ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور قیامت کے دن وہ اس کے بارے ان کا محاسبہ نہیں کرے گا (4)۔ اور عبدالرحمن بن سابط نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد بشارت اور خوشخبری ہے اور زیادة سے مراد رب کریم کے چہرہ قدرت کی طرف دیکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿﴾ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿﴾ (القیامہ)

اور یزید بن شجرہ نے کہا ہے: زیادة یہ ہے کہ اہل جنت کے پاس سے ایک بادل گزرے گا اور وہ ان پر ایسی تمام نادر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 137 — 2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 198
3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 126 — 4۔ ایضاً

نعمتیں برسائے گا جو انہوں نے نہ دیکھی ہوں گی اور وہ کہے گا: اے اہل جنت! کیا تم کوئی شے چاہتے ہو کہ میں تم پر اسے برسا دوں؟ پس وہ جو بھی خواہش کریں گے وہ ان پر اسے برسا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زیادۃ یہ ہے کہ ان پر ایام دنیا میں سے ایک دن کی مقدار بھی نہیں گزرے گی مگر یہ کہ ان میں سے ہر ایک گھر کا ستر ہزار فرشتے طواف کریں، ہر فرشتے کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسے تحائف اور ہدایا ہوں گے جو اس کے ساتھی فرشتے کے پاس نہ ہوں گے اور انہوں (اہل جنت) نے ان ہدایا کی مثل کبھی نہ دیکھے ہوں گے، پس پاک ہے وہ جو الواسع، العلیم، الغنی، الحمید، العلی، الکبیر، العزیز، القدیر، البر، الرحیم، المدبر، الحکیم اور اللطیف، الکریم ہے جس کی مقدورات لامتناہی اور لامحدود ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أحسنوا جنہوں نے لوگوں کے ساتھ معاملہ نیکی اور اچھائی کے ساتھ کیا۔ اور الحسنیٰ ان کے لیے شفاعت ہے اور زیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس (شفاعت) کی اجازت دینا اور اسے قبول کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَرْهَقُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یلحق (اور لاحق نہ ہوگا) اور اسی معنی میں کہا گیا ہے: غلام مراھق جب بچہ (بالغ ہونے کے قریب پہنچ کر) مردوں کے ساتھ مل جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یعلو (بلند ہونا، غالب ہونا)۔ اور بعض نے کہا ہے: یغشی (ڈھانپ لینا) یہ معنوی اعتبار سے آپس میں قریب قریب ہیں۔ قتر اس کا معنی ہے غبار۔ ولا ذلۃ اور نہ ذلت و رسوائی، جیسا کہ اہل جہنم کو لاحق ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب انہیں اٹھائے جانے کے وقت غبار انہیں لاحق نہیں ہوگا اور نہ ذلت و رسوائی انہیں ڈھانپے گی۔ ابو عبیدہ نے فرزدق کا یہ شعر بیان کیا ہے:

مُتَوَّجٌ برداء الملك يتبعه مَوج ترى فوقه الراياتِ والقَتَرا(1)

حسن نے قَتْرًا تا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور القَتَر و القَتَرة و القَتْر تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور القَتَر کی واحد قَتَرَة ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۞ (عبس) یعنی ان پر گرد و غبار غالب یعنی چھایا ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے: قتر کا معنی غمزدہ ہونا اور حالت کا خراب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: القتر سے مراد چہروں کا سیاہ ہونا ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: اس سے مراد آگ کا دھواں ہے۔ اور اسی سے قتار القدر (ہنڈیا کی بھاپ) ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے: یہ ان کا اپنے رب کے دیدار سے محروم رہنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۞ ...... تا قولہ ...... لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی، تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے ...... نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور دوسری آیت میں فرمایا: لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۞ (یونس) (اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لیے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور مزید فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا، الآیہ (حم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 433

السجدہ: 30) (بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو)۔ اور یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ نیکی کرنے والے کا چہرہ غم و اندوہ کی سیاہی کے ساتھ کسی مقام میں بھی متغیر اور تبدیل نہیں ہوگا نہ دیدار الٰہی سے پہلے اور نہ اس کے بعد اور جہنم وغیرہ کے دھوئیں میں سے کوئی شے اس پر غالب نہیں آئے گی۔ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران) (اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی اور چھا رہی ہوگی ان پر ذلت، نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے، وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ اور جنہوں نے گناہ کے اعمال کیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد شرک ہے (یعنی جنہوں نے شرک کیا) جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا، جَزَآءُ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر بِمِثْلِهَا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: اس میں با زائدہ ہے اور اس کا معنی ہے جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا (برائی کی سزا اس کی مثل ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: با اپنے مابعد سمیت خبر ہے اور یہ محذوف کے متعلق ہے اور یہ اس کے قائم مقام ہے اور اس کا معنی ہے: جزاء سيئة كائن بمثلها (برائی کی سزا اسی جیسی ہوگی) جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: إنما أنا بك یعنی إنما انا كائن بك اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جزا کے متعلق ہو، تقدیر کلام ہو: جزاء سيئة بمثلها كائن پھر مبتدا کی خبر حذف کر دی گئی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ جزاء مرفوع ہو اور تقدیر کلام یہ ہو فلهم جزاء سيئة پس یہ اس قول کی مثل ہو جائے گا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (البقرہ: 185) یعنی فعليه عدة اور اس کے مشابہ کوئی شے۔ اور اس تقدیر کے مطابق با محذوف کے متعلق ہوگی، گویا کہ یہ کہا: لهم جزاء سيئة ثابت بمثلها (ان کے لیے برائی کی سزا اسی کی مثل ثابت ہے) یا پھر یہ با مؤکدہ یا زائدہ ہوگی۔

اور اس مثلیت کا معنی یہ ہے کہ وہ سزا جو شمار کی جا رہی ہے وہ ان کے گناہوں کے مماثل ہے، یعنی وہ مظلوم نہیں ہیں، ان پر کوئی زیادتی نہیں کی جا رہی۔ اور اللہ تعالیٰ کا فعل کسی علت کے ساتھ معلل نہیں ہوتا۔ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ یعنی انہیں یبوست اور ذلت و رسوائی ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ان کے لیے اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا جو انہیں اس سے بچالے گا۔ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں۔ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا ان کے چہرے۔ قطع، قطعة کی جمع ہے اور اس بنا پر مظلما، الليل سے حال ہوگا، یعنی ان کے چہرے ڈھانپ دیئے گئے ہیں رات کے ٹکڑے سے اس

حال میں کہ وہ تاریک اور اندھیری تھی۔

کسائی اور ابن کثیر نے قطعا طا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور اس بنا پر مظلما صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللیل سے حال ہو۔ اور القطع نام ہے اس شے کا جس کو کاٹ دیا جائے اور وہ گر جائے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: رات کا ایک حصہ اور طائفہ ہے۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝

''اور (ان کی پشیمانی کا تصور کرو) جس روز ہم جمع کریں گے ان سب کو (میدان حشر میں) پھر ہم حکم دیں گے مشرکوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ تم اور تمہارے جھوٹے معبود، پھر ہم منقطع کر دیں گے ان کے باہمی تعلقات اور کہیں گے ان کے معبود (اے مشرکو!) تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ اور جس دن ہم انہیں جمع کریں گے اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہے۔ ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پھر ہم حکم دیں گے ان کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنائے۔ مَكَانَكُمْ یعنی تم اپنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو اور اسی پر ثابت قدم رہو۔ اور اپنی جگہوں پر ٹھہرے رہو۔ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ (تم اور تمہارے جھوٹے معبود) اور یہ وعید ہے۔

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ یعنی ہم تفریق ڈال دیں گے اور ہم اس دوستی اور تعلق کو توڑ دیں گے جو ان کے درمیان دنیا میں قائم تھا، کہا جاتا ہے: زيلتُه فتزيل، أي فرقته فتفرق (میں نے اسے علیحدہ کیا پس وہ علیحدہ ہو گیا) اور یہ فعلت، کیونکہ اس کے مصدر میں تو تزییلا کہتا ہے (مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ باب تفعیل ہے) اور اگر فیعلت ہوتا تو پھر تو مصدر زيلة کہتا۔ اور المزايلة کا معنی المفارقة ہے: کہا جاتا ہے: زايله الله مزايلة و زيالا جب اللہ تعالیٰ اسے جدا اور علیحدہ کر دے۔ اور التزايل کا معنی التباين (جدا ہونا) ہے۔ فراء نے کہا ہے: بعض نے فزايلنا بينهم پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: لا أزايل فلانا، ای لا أفارقه (میں اسے جدا نہیں کروں گا) اور اگر تو کہے: لا ازاوله تو اس کا معنی دوسرا ہے اور وہ ہے لا أخاتله (میں اسے فریب اور دھوکہ نہیں دوں گا)۔

وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ اس میں شرکاء سے مراد ملائکہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے: شیاطین ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: بت ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی قدرت دے گا اور یہ گفتگو ان کے اپنے درمیان ہو گی۔ اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ان شیاطین کے خلاف دعویٰ کیا جن کی انہوں نے اطاعت و پیروی کی اور ان بتوں کے خلاف دعویٰ کیا جن کی وہ عبادت کرتے رہے کہ انہوں نے انہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا اور وہ کہیں گے: ہم نے تمہاری عبادت نہیں کی یہاں تک کہ تم نے ہمیں حکم دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ بتوں کو بولنے کی قدرت دے گا، پس وہ کہیں گے: ہم تو اس بارے شعور ہی نہیں رکھتے تھے کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو اور نہ ہم نے تمہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا۔ اور اگر شرکاء کو شیاطین پر محمول کیا جائے تو معنی یہ ہو گا کہ وہ مدہوش ہو کر یہ کہتے ہیں یا وہ جھوٹ اور خلاصی کا حیلہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ اور اس کی

مثل کل جاری ہوگا، اگرچہ معارف ضروریہ اور بدیہی ہے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۞

''پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے''۔

قولہ تعالیٰ: فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ، شَهِيْدًا یہ مفعول ہے یعنی كفى الله شهيدا یا یہ تمیز ہے، یعنی اكتف به شهيدا بيننا و بينكم یعنی اللہ تعالیٰ پر اکتفا کرو بطور گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان اگر ہم نے تمہیں اس بارے حکم دیا ہے یا ہم نے اسے تم سے پسند کیا ہے (اور رضامندی کا اظہار کیا ہے) اِنْ كُنَّا یعنی ہم نہیں تھے۔ عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ تمہاری پرستش کے بارے میں بالکل بے خبر، نہ ہم سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے اور نہ عقل رکھتے تھے، کیونکہ ہم تو جمادات تھے ہم میں روح نہ تھی۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۞

''وہاں آزمالے گا ہر شخص جو اس نے آگے بھیجا تھا اور انہیں لوٹا دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا باندھا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تَبْلُوْا یعنی اس وقت میں (آزمالے گا) تبلو بمعنی تذوق یعنی چکھ لے گا۔ اور کلبی نے کہا: بمعنی تعلم ہے یعنی ہر شخص جان لے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بمعنی تختبر ہے یعنی آزمالے گا۔ كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ یعنی اس عمل کی جزا جو اس نے کیا اور آگے بھیجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بمعنی تسلم (وہ حوالے کردے گا) یعنی حقوق میں سے جو اس پر تھے وہ ان کو ان کے مالکوں کے حوالے کردے گا ان کے اختیار اور ان کی پسند کے بغیر۔ اور حمزہ اور کسائی نے تتلوا پڑھا ہے یعنی ہر نفس اپنے اس نامہ عمل کو پڑھ لے گا جو اس میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تتلوا بمعنی تتبع ہے یعنی ہر نفس اس کی اتباع کرے گا جو اس نے دنیا میں آگے بھیجا۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

إن المُرِيبَ يتبع المُرِيبَا　　كما رأيت الذِّيب يتلو الذِّيبا(1)

قولہ تعالیٰ: وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ، الْحَقِّ بدل یا صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ اور حق کو نصب دینا بھی جائز ہے اس کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں: تقدیر کلام ہو: و ردوا حقا (اور انہیں لوٹا دیا جائے گا حق) پھر اسے الف لام کے ساتھ لایا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: مولاهم حقا لا ما يعبدون من دونه (جو ان کا مالک ہے از روئے حقیقت کے نہ کہ وہ جن کی وہ اس کے سوا عبادت کرتے ہیں)۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ بطور مدح کے منصوب ہو أي أعني الحق (میری مراد حق ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ الحق کو رفع دیا جائے۔ اس صورت میں معنی ہوگا: مولاهم الحق یہ مبتدا اور خبر ہوگا

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 434

اور ماقبل سے منقطع ہوگا۔ (اللہ ان کا حقیقی مالک ہے) نہ کہ وہ جن کو وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بالحق کے ساتھ اپنا وصف بیان کیا ہے کیونکہ حق اسی کی طرف سے ہوتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی ذات کو عدل کے ساتھ متصف کیا ہے کیونکہ عدل اسی سے ہوتا ہے، یعنی ہر عدل اور حق وہ اسی کی طرف سے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ یعنی وہ جو انہیں حق کے ساتھ جزا دے گا۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ یعنی باطل ہے۔

مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ، یَفْتَرُوْنَ محل رفع میں ہے اور یہ مصدر کے معنی میں ہے، أی افتراؤهم (یعنی ان کا افتراء باندھنا باطل ہے) پس اگر کہا جائے: کیسے یہ کہا: وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ حالانکہ خبر یہ دی گئی ہے کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا: ان کے لیے مدد و نصرت کرنے کا کوئی مالک نہیں اور وہ رزق اور نعمتیں عطا کرنے میں تو ان کا مولیٰ ہے۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱

"آپ پوچھیے کون رزق دیتا ہے تمہیں آسمان اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھ کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زمین سے اور کون ہے جو انتظام فرماتا ہے ہر کام کا؟ تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ! پس آپ کہیے: (جب حقیقت یہ ہے) تو تم (شرک سے) کیوں نہیں بچتے"۔

اس کلام کو چلانے کا مقصد مشرکوں کا رد ہے اور ان کے خلاف حجت کو پختہ کرنا ہے۔ پس جنہوں نے ان میں سے اعتراف کرلیا تو ان پر تو حجت بالکل ظاہر ہے اور جنہوں نے اعتراف نہیں کیا تو ان پر اسے پختہ اور مضبوط کیا کہ یہ آسمان اور زمین ہیں ان دونوں کے لیے خالق کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ اور کوئی عقل منداس میں شک نہیں کرسکتا۔ اور یہ مرتبہ ضرورت کے بالکل قریب ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ یعنی بارش کے ساتھ۔ وَ الْاَرْضِ یعنی زمین سے اگنے والے اناج کے ساتھ (1)۔ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ یعنی کون ہے جس نے ان دونوں (کان اور آنکھ) کو بنایا ہے اور انہیں تمہارے لیے پیدا کیا ہے؟ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ یعنی کون ہے جو نباتات کو زمین سے اور انسان کو نطفہ سے اور کھیتی (کی) بالی کو دانے سے، پرندے کو انڈے سے اور مومن کو کافر سے نکالتا ہے؟ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی کون ہے جو امور کو مقرر کرتا ہے اور ان کا فیصلہ کرتا ہے؟ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ (تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے یا وہ کہیں گے: وہ اللہ ہی ہے اگر وہ غور و فکر کریں اور انصاف سے کام لیں۔ فَقُلْ، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمایئے۔ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ یعنی کیا وہ دنیا اور آخرت میں اس کی سزا اور اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں؟

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 117

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲

''یہ ہے اللہ جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے، پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے، پھر تمہیں (حق سے) کدھر موڑا جا رہا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی وہ جو اس قسم کے کام کرتا ہے وہ تمہارا حقیقی پروردگار ہے، نہ کہ وہ جنہیں تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ، ذا صلہ ہے أی ما بعد عبادة الإله الحق إذا ترکت عبادته إلا الضلال (یعنی الٰہ حقیقی کی عبادت کے بعد جب تو اس کی عبادت کو چھوڑ دے گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے) اور بعض متقدمین نے کہا ہے: اس آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد جو ہے وہ گمراہی ہے، کیونکہ اس کا اول حصہ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ہے اور آیت کا آخر فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ہے پس یہ ایمان اور کفر کے بارے میں ہے، اعمال کے بارے میں نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا: بے شک کفر حق کو ڈھانپ دیتا ہے اور ہر وہ جو حق کے سوا ہے وہ اس کے قائم مقام ہوگا، پس حرام گمراہی ہے اور مباح ہدایت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مباح کرنے والا اور حرام کرنے والا ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ پہلے فرمایا: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ پھر فرمایا: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی یہ ہے وہ جو تمہیں رزق دیتا ہے اور یہ سب اس کا فعل ہے۔ رَبُّكُمُ الْحَقُّ وہی تمہارا حقیقی پروردگار ہے الوہیت جس کا حق ہے اور اس کی عبادت واجب ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو پھر کسی اور کا شریک ٹھہرانا گمراہی اور غیر حق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس آیت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان کوئی تیسری منزل نہیں یہ اس مسئلہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے ہے اور اس کی نظائر میں بھی حکم اسی طرح ہے اور یہ ان اصولی مسائل میں سے ہے جن میں ایک طرف میں حق ہے، کیونکہ کلام اسی میں ہے بلاشبہ وہ وجود ذات کے بیان میں ہے کہ وہ کیسے ہے اور یہ ان فروعی مسائل کے خلاف ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''حلال بین اور واضح ہے اور حرام بھی بین اور واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان امور متشابہات ہیں'' (1)۔ اور کلام فروع کے بارے ہے اور بلاشبہ یہ ایسے احکام کے بارے ہے جو طاری ہوتے ہیں ایسے پختہ اور مضبوط اصول پر جن میں کوئی اختلاف نہیں کیا جاتا بلکہ ان سے متعلقہ احکام میں اختلاف کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وسط میں نماز کے لیے قیام فرما ہوتے تو کہتے: ''اے اللہ تیرے لیے ہی حمد ہے'' الحدیث۔ اور اس میں یہ ہے ''تو حق ہے اور تیرا وعدہ حق ہے اور تیرا قول حق ہے اور تیری ملاقات حق ہے اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور قیامت حق ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 13

اور انبیاء حق ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں'' (1) الحدیث۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: انت الحق اس کا معنی ہے تو واجب الوجود ہے۔ اور اس کی اصل حق الشیء سے ہے، یعنی جب کوئی شے ثابت اور واجب ہو جائے۔ حقیقی طور پر یہ وصف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کیونکہ اس کا وجود اپنا ذاتی ہے نہ اس سے پہلے عدم تھا اور نہ اسے عدم لاحق ہوگا (یعنی کوئی ایسی ساعت نہیں گزری جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات موجود نہ ہو اور کوئی ایسی ساعت نہیں آئے گی جس میں وہ موجود نہ ہوگا وہ ہمیشہ سے ہمیشہ تک رہے گا) اور اس کے سوا جس پر بھی یہ اسم بولا جائے گا اس سے پہلے عدم ہے اور اور اس پر عدم کا لاحق ہونا جائز ہے اور اس کا وجود اپنے موجد کی جانب سے ہے اپنی ذات کی طرف سے نہیں ہے۔ اور اس معنی کے اعتبار سے صحیح ترین کلام وہی ہے جو شاعر نے کہا ہے، لبید کا قول ہے:

أَلا كل شي ما خلا الله باطل

خبردار سنو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے۔

اور اسی کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ ؕ لَهُ الۡحُكۡمُ وَاِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝
(ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا)

مسئلہ نمبر 4۔ حق کا مقابلہ ضلال کے ساتھ کرنا لغۃً اور شرعاً معروف ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اسی طرح حق کا مقابلہ باطل کے ساتھ کرنا بھی لغۃً اور شرعاً معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ (الحج: 62) (نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے)

اور ضلال کا حقیقی معنی حق سے نکلنا ہے۔ یہ ضلال الطریق سے لیا گیا ہے اور یہ ہے راستے کی سمت سے پھر جانا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک ضلالۃ سے مراد ایسے راستے پر چلنا ہے جو مقصود اور منزل کا نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ضل عن الطریق (وہ راستے سے بھٹک گیا) اور أضل الشئ جب وہ کسی شے کو ضائع کر دے۔ اور شرعاً یہ اس عبارت کے ساتھ خاص ہے۔ العدول عن السداد فی الأعتقاد دون الأعمال (اعتقاد میں صحیح (سمت) سے پھر جانا نہ کہ اعمال میں) اور اس کے بارے میں غریب قول یہ بھی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے بارے معرفت نہ ہونے کو ضلال سے تعبیر کیا جاتا ہے جب اس کے مقابلے میں غفلت ہو اور اس کے عدم کے ساتھ جہالت یا شک مقترن نہ ہو۔ اور اسی پر علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو محمول کیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝ (الضحیٰ) ای غافلا یہ اس کی کئی تاویلات میں سے ایک ہے اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے مَا كُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ (الشوریٰ: 52) (نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے)۔

مسئلہ نمبر 5۔ عبداللہ بن عبدالحکم اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ: فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، جلد 1، صفحہ 151

الضَّلٰلُ میں روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: شطرنج اور چوسر (نرد) کھیلنا گمراہی میں سے ہے۔ اور یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ چودہ گوٹیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میرے لیے یہ کتنی تعجب کی بات ہے، حالانکہ یہ مومنین کی شان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (پس حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے) اور یونس نے اشہب سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شطرنج کھیلنے کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں خیر اور بھلائی نہیں ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور یہ باطل ہے اور کھیل تمام کے تمام باطل میں سے ہیں۔ بلاشبہ صاحب عقل کو چاہیے کہ اس کی ریش اور بڑھاپا اسے باطل سے رد کے (1)۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ سے جب شطرنج کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: یہ باطل میں سے ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے شطرنج وغیرہ کھیلنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے جب یہ جوئے کی صورت پر نہ ہو۔ پس شطرنج کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقاء کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ جوا نہ کھیلے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ گھر میں چھپ کر مہینے میں یا سال میں ایک بار کھیلے۔ اس پر نہ کوئی مطلع ہو اور نہ اس کے بارے کسی کو علم ہو تو وہ اس کے لیے معفو عنہ ہے، نہ اس پر حرام ہے اور نہ اس کے لیے مکروہ ہے۔ اور اگر وہ اس میں منہمک ہو گیا اور اس میں مشہور ہو گیا تو اس کی مروت اور عدالت ساقط ہو جائے گی اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ اور رہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو ان کے اصحاب کے مذہب میں نرد (چوسر) اور شطرنج کھیلنے والے کی شہادت ساقط نہیں ہوتی، جب کہ وہ اپنے جمیع ساتھیوں میں عادل ہو اور اس کی طرف سے سفاہت، شک اور گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو مگر یہ کہ وہ اس کے ساتھ جوا کھیلنے لگے، پس اگر اس کے ساتھ اس نے جوا کھیلا اور وہ اس کے ساتھ معروف ہو گیا تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی اور باطل کے ذریعے مال کھانے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو سفیہ (بے وقوف) بنا دیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شطرنج، نرد، اربعہ عشر کھیلنا اور ہر لہو مکروہ ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ کھیلنے والے سے گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو اور اس کی خوبیاں اور نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں تو ان کے نزدیک اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شافعیہ نے کہا ہے بے شک شطرنج نرد کے مخالف ہے، کیونکہ اس میں فہم کو تیز کرنے اور طبیعت کو عمل کے قابل بنانے کی صلاحیت ہے اور نرد جوا ہے، دھوکا ہے وہ اسے نہیں جانتا جو اس میں اس کے لیے نکلے گا جیسا کہ فال کے تیروں کے ساتھ تقسیم کا مطالبہ کرنا۔

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: نرد وہ کٹا ہوا ٹکڑا ہے جو بقس کی لکڑی سے اور ہاتھی کی ہڈی سے بھرا ہوا ہو اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، کیونکہ یہ اس کا بھائی ہے اسی کے دودھ سے اسے غذا دی گئی ہے اور نرد وہ ہے جو باطل کے نام سے معروف ہے، اس کی پہچان کعاب کے نام سے بھی ہے اور اسے دور جاہلیت میں ارن کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور یہ نردشیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 1052

کے نام سے بھی معروف ہے۔

اور صحیح مسلم میں سلیمان بن بریدہ سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی نردشیر کے ساتھ کھیلا تو گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور اس کے خون میں ڈالا'' (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت میں ڈالا جو اس نے تیار کیا ہوا تھا تاکہ اسے کھائے اور خنزیر میں ایسا کرنا حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسے بیان کرتا ہے: ''جو نرد کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی'' (2)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور آپ نرد کے ساتھ کھیلنا کلی طور پر حرام قرار دے رہے ہیں اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، آپ نے کسی وقت کی استثنا نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی حال کی استثنا کی ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا ہے، مگر اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نرد جس کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد جوئے کی طرز پر کھیلنا ہو، کیونکہ بغیر جوئے کے شطرنج کھیلنے کی اجازت تابعین سے مروی ہے، (لیکن) اسے عموم پر محمول کرنا چاہیے اس میں جوا ہو یا نہ ہو زیادہ اولیٰ ہے اور اس میں احتیاط زیادہ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابوعبداللہ حلیمی نے کتاب ''منہاج الدین'' میں کہا ہے: شطرنج کے بارے میں جو حدیث آئی ہے اس میں اسی طرح روایت کیا گیا ہے جیسے نرد کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی شطرنج کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بنی تمیم کی مجالس میں سے ایک مجلس کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور فرمایا: ''خبردار سنو! قسم بخدا! تم اس کے سوا کے لیے پیدا کیے گئے ہو! خبردار سنو! قسم بخدا! اگر یہ سنت نہ ہوتی (۱) تو میں اسی کے ساتھ تمہارے چہروں پر مارتا''۔

اور آپ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ آپ ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ نے فرمایا: یہ کیسے بت ہیں جن کے ساتھ تم چمٹے پڑے ہو، کیونکہ تم میں سے کسی کا (آگ کا) انگارہ پکڑنا اسے پکڑنے سے بہتر ہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بجھادے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے شطرنج کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ نرد سے زیادہ بری ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج کے ساتھ نہیں کھیلتا مگر خطا اور گناہ کرنے والا۔ اور ابوجعفر سے شطرنج کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: ہم نے اس مجوسیت کو چھوڑ دیا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث میں ہے: ''بے شک جو کوئی نرد، شطرنج، جوز (اخروٹ) اور کعاب کے ساتھ کھیلا اللہ تعالیٰ اس سے نفرت رکھتا ہے اور جو کوئی نرد اور شطرنج کھیلنے والوں کے پاس بیٹھا تاکہ ان کی طرف دیکھے تو اس سے اس کی ساری نیکیاں مٹادی گئیں اور وہ ان میں سے ہو گیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب تحریم اللعب، جلد 2، صفحہ 240 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 275۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 724

۱۔ المنہاج میں یہاں لفظ سبۃ ہے۔ مترجم

جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبغوض بنا دیا''۔ یہ تمام آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بغیر جوئے کے بھی ان کے ساتھ کھیلنا حرام ہے، واللہ اعلم۔ اور ہم نے سورۃ المائدہ میں اس کی تحریم کا بیان ذکر کیا ہے اور یہ کہ یہ تحریم میں خمر (شراب) کی مثل ہے، کیونکہ یہ اسی کے ساتھ مقترن ہے، واللہ اعلم۔

ابن عربی نے قبس میں کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور ان میں سے بعض کی حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ کہنے لگے: یہ مندوب (مستحب) ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے مدرسہ میں رکھ دیا اور جب طالب پڑھنے سے تھک جاتے تو وہ اس کے ساتھ مسجد میں کھیلتے۔ اور انہوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت کی طرف اس کی نسبت کی ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوا۔ قسم بخدا! کسی متقی کے ہاتھ نے اسے مس نہیں کیا۔ اور وہ کہتے ہیں: بے شک یہ ذہن کو تیز کرتی ہے اور ظاہر ان کی تکذیب کرتا ہے، کسی ذہین آدمی نے اس میں کبھی تجربہ حاصل نہیں کیا۔ میں نے امام ابوالفضل عطا مقدسی کو مسجد اقصیٰ میں مناظرہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ (فن) حرب سکھاتی ہے، تو انہیں طرطوشی نے کہا: بلکہ یہ تو جنگ کی تدبیر کو فاسد کرتی ہے، کیونکہ جنگ سے مقصود تو بادشاہی اور اس کی مدہوشی ہوتا ہے۔ اور شطرنج میں تو کہتا ہے: شاہ تو بچ! بادشاہ کو میرے راستے سے دور کر دے، پس اس نے حاضرین کو ہنسا دیا۔

اور کبھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں سختی کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے اور اس بارے میں کہا ہے: **فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ** اور کبھی اس میں تھوڑی سہولت اور آسانی پیدا کی ہے۔ لیکن پہلا قول ہی اصح ہے۔ واللہ اعلم

اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے شطرنج کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے پوچھا: شطرنج کیا ہے؟ تو آپ کو بتایا گیا: بے شک ایک عورت کا ایک بیٹا تھا اور وہ بادشاہ تھا پس وہ جنگ میں اپنے ساتھیوں کے بغیر مارا گیا، تو اس نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے تم مجھے یہ واضح اور ظاہر کر کے دکھاؤ، تو اس کے لیے شطرنج کا عمل کیا گیا، پس جب اس نے اسے دیکھا تو اسے اس سے تسلی ہو گئی اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شطرنج کا وصف بیان کیا تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے۔ تو اسے جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ آپ نے شطرنج کے بارے لا باس (کوئی حرج نہیں) کے الفاظ نہیں کہے بلکہ آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلة الحرب (اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے) بلاشبہ آپ نے یہ کہا: کیونکہ آپ پر یہ مشتبہ ہو گیا کہ شطرنج کے ساتھ کھیلنا ان میں سے ہے جن کے ساتھ اس جنگ کی پہچان میں مدد حاصل کی جاتی ہے۔ پس جب آپ کو یہ بتایا گیا اور آپ کا علم اسے محیط نہ ہوا تو آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلة الحرب اگر اسی طرح ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح صحابہ کرام میں سے وہ جس نے آپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ نے اس سے منع نہیں کیا، تو بے شک آپ سے اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ آپ کا گمان تھا کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ مشغولیت اور غفلت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے جنگ اور اس کے دوران باہم ضرب لگانے کے علم کا سبب بننے کا ارادہ کیا جاتا ہے یا اس بنا پر کہہ دیا کہ خبر مسندان تک پہنچی ہی نہیں۔ حلیمی نے کہا ہے: جب خبر صحیح ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی کے لیے کوئی حجت نہیں، بلاشبہ اس میں تمام کے

خلاف حجت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابن وہب نے اپنی اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بچوں کے پاس سے گزرے وہ کجہ کے ساتھ کھیل رہے تھے اور یہ (چھوٹا سا) گڑھا کھود کر اس میں سنگریزوں کے ساتھ کھیلتے تھے، ابن وہب نے بیان کیا ہے: پس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بند کر دیا اور انہیں اس سے منع فرمایا۔ اور ہروی نے باب (الکاف مع الجیم) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ذکر کیا ہے: ہر شے میں جوا ہے حتی کہ کجہ کے ساتھ بچوں کے کھیل میں بھی ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ ایک بچہ کپڑے کا ٹکڑا لیتا ہے اور اسے گول بنالیتا ہے گویا کہ وہ گیند ہے۔ پھر اس کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ اور دکج جب کوئی کجہ کے ساتھ کھیلے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ یعنی تمہاری عقلوں کو کیسے ان کی عبادت کی طرف پھیرا جا رہا ہے جو نہ رزق دے سکتے ہیں، نہ زندہ کر سکتے ہیں اور نہ موت دے سکتے ہیں۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

"یونہی ثابت ہو چکی ہے آپ کے رب کی بات ان پر جو فسق و فجور کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ یعنی یونہی آپ کے رب کا حکم، اس کا فیصلہ اور اس کا علم سابق ثابت ہو چکا ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا ان پر جو طاعت سے نکل گئے اور انہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی۔ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ وہ تصدیق نہیں کریں گے۔ اور اس میں قدریہ کے خلاف مکمل دلیل موجود ہے۔ نافع اور ابن عامر نے یہاں اور اس کے آخر میں كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اور سورۂ غافر میں تینوں مقامات پر اسے جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ مفرد کے ساتھ۔ اور ان محل نصب میں ہے، یعنی بانهم یا لأنهم۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ فراء نے کہا ہے: استیناف کی بنا پر کسرہ کے ساتھ انهم پڑھنا بھی جائز ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

"(اے حبیب!) آپ پوچھیے کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو آغاز آفرینش بھی کرے پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے، آپ ہی فرمایئے: اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹاتا بھی ہے پس (ہوش کرو) تم کدھر پھرے جاتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ یعنی کیا تمہارے الٰہوں اور تمہارے معبودوں میں کوئی ہے؟ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم زجر و توبیخ اور تقریر کی جہت پر آپ انہیں فرمایئے (جو آغاز آفرینش بھی کرے اور پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے) پس اگر وہ آپ کو جواب دیں (تو بہتر) ورنہ آپ انہیں فرمائیں: قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دیتا ہے) اور اس کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔

فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ یعنی تم کیسے حق سے باطل کی طرف پلٹ رہے ہو اور پھر رہے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

''آپ فرمائیے کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے (خود ہی جواباً) فرمائیے اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے، تو کیا جو راہ دکھائے حق کی وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہ پائے مگر یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے (اے مشرکین!) تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے غلط فیصلے کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ کہا جاتا ہے: هداه الطریق والی الطریق دونوں کا معنی ایک ہے (اس نے اسے راستے کی رہنمائی کی) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو دین اسلام کی طرف رہنمائی کر سکتا ہو۔ پس جب وہ کہیں نہیں اور یہ ضروری ہے۔ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ تو پھر آپ انہیں فرمائیے: اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے۔ پھر آپ انہیں زجر و توبیخ کرتے ہوئے اور بات کو پختہ کرتے ہوئے فرمائیے: اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ تو کیا وہ جو رہنمائی کرتا ہے۔ اِلَى الْحَقِّ (حق کی طرف) اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى مراد وہ بت ہیں جو کسی کی رہنمائی نہیں کر سکتے، نہ وہ چل سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں اٹھایا جائے اور نہ وہ اپنی جگہ سے منتقل ہو سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں منتقل کیا جائے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

للفتی عقلٌ یعیش به حیث تَهْدِی ساقه قدَمُه

نوجوان کے لیے عقل ہے جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے اس طرح کہ اس کے پاؤں اس کی پنڈلی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ رؤسا اور گمراہ کرنے والے ہیں جو اپنی بھی ہدایت کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے مگر یہ کہ ان کی رہنمائی کی جائے اور یَهِدِّیْ میں چھ قراءتیں ہیں: (۱) سوائے ورش کے اہل مدینہ نے یَهْدِّی یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پس انہوں نے اپنی قراءت میں دو ساکنوں کو جمع کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول: لَا تَعْدُّوا اور تَخْصِّمُوْنَ میں کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: دو ساکنوں کے جمع ہونے کی صورت میں کوئی بھی اسے بولنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: جو بھی اس طرح کا قصد کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسرہ کی طرف مائل کر کے خفیف سی حرکت دے اور سیبویہ اسے اختلاس حرکت کا نام دیتے ہیں۔

(۲) ابو عمرو اور قالون نے ایک روایت میں اسے فتحہ اور اسکان کے درمیان پڑھا ہے، یہ اخفا اور اختلاس کے بارے میں ان کے مذہب کی بنا پر ہے۔

(۳) ابن عامر، ابن کثیر، ورش اور ابن محیصن نے یَهَدِّی یا اور ہا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے

کہا ہے: یہ قراءت عربی میں بین اور واضح ہے، یہ اصل میں یھتدی ہے تا کو دال میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت ہا کو دے دی گئی ہے۔

(۴) حفص، یعقوب اور اعمش نے ابوبکر سے ابن کثیر کی قراءت کی مثل قراءت کی ہے، مگر یہ کہ انہوں نے ہا کو کسرہ دیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ جزم کو جب مجبوراً حرکت دی جائے تو اسے کسرہ کی حرکت دی جاتی ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے: یہ سفلی مضر کی لغت ہے۔

(۵) ابوبکر نے عاصم سے یِہِدّی یا اور ہا کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے، یہ تمام کسرہ کی اتباع کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں یَخْطَف کے تحت گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی لغت ہے جنہوں نے نِسْتَعِين اور لن تِمَسَّنا النار وغیرہ پڑھا ہے۔ اور سیبویہ یِہِدّی کو جائز قرار نہیں دیتے البتہ تِہِدّی، نِہِدّی اور اِہِدّی میں جائز قرار دیتے ہیں انہوں نے فرمایا: کیونکہ یا میں کسرہ ثقیل ہوتا ہے۔

(۶) حمزہ، کسائی، خلف، یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے یَھْدِی یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ھَدَی یَھْدِی سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں اس قراءت کی دو وجہیں ہیں اگرچہ وہ بعید ہیں، دو وجہوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسائی اور فراء دونوں نے کہا ہے: یھدی بمعنی یھتدی ہے۔ ابوالعباس نے کہا ہے: یہ معروف نہیں ہے، لیکن تقدیر عبارت ہے أمن لا یھدی غیرہ (کیا وہ جو غیر کی رہنمائی نہیں کر سکتا) کلام مکمل ہوگئی۔ پھر کہا: إِلَّا أَنْ يُهْدَى یہ اول سے نیا کلام ہے، یعنی لیکن وہ محتاج ہے کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔ پس یہ استثنا منقطع ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان لا يُسمِع غيره إلا أن يسمع ای لكنه يحتاج أن يُسْمَع (فلاں غیر کو سنا نہیں سکتا لیکن وہ محتاج ہے کہ اسے سنایا جائے)

ابو اسحاق نے کہا ہے: فَمَا لَكُمْ یہ کلام تام ہے اور اس کا معنی ہے: پس بتوں کی عبادت میں تمہارے لیے کون سی شے ہے۔ پھر انہیں کہا گیا: كَيْفَ تَحْكُمُونَ تم اپنے لیے کیسے فیصلے کرتے ہو اور تم یہ صریح باطل فیصلے کر رہے ہو، تم ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہو جو اپنے آپ کو بھی کسی چیز کا نفع نہیں دے سکتے مگر یہ کہ ان کے ساتھ کوئی عمل کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور تم اس کی عبادت چھوڑ رہے ہو۔ پس كَيْفَ تَحْكُمُونَ کے سبب محل نصب میں ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

''اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی، بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا مراد ان کے رؤسا (سردار) ہیں، یعنی وہ اس بارے میں محض تیز فہمی اور ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں کہ وہ معبود ہیں اور وہ شفاعت کریں گے اور ان کے پاس اس پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اور رہے ان کی اتباع کرنے والے تو وہ صرف تقلید کے طور پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا یعنی اللہ

تعالیٰ کے عذاب سے (وہم وگمان انہیں بے نیاز نہیں کر سکتا) اور حق تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الحق سے مراد یقین ہے، یعنی ظن یقین کی مثل نہیں ہے۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عقائد میں صرف ظن پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کفر اور تکذیب کا عمل کرتے ہیں، یہ آیت تہدید (جھڑک) کے محل میں واقع ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾

''اور نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ تعالیٰ (کی وحی آئے بغیر) بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے ذرہ شک نہیں اس میں کہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس میں أن، یفتری کے ساتھ مل کر مصدر ہے اور اس کا معنی ہے: وما کان هذا القرآن إفتراء (یہ قرآن گھڑا ہوا نہیں ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان یحب أن یرکب، ای یحب الرکوب (فلاں سوار ہونے کو پسند کرتا ہے) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران: 161) (اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أن بمعنی لام اور تقدیر کلام یہ ہو: وما کان هذا القرآن لیفتری(1) (اور نہیں ہے یہ قرآن کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی لا ہے، ای لا یفتری (اسے گھڑا نہیں گیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ غیر اللہ کی جانب سے اس قرآن کی مثل لائے پھر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے اس قرآن کے اعجاز، اس کے وصف، اس کے معانی اور اس کی تالیف و ترکیب کی وجہ سے۔ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ کسائی، فراء اور محمد بن سعدان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے ولکن کان تصدیق (بلکہ یہ تصدیق کرنے والا ہے) الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے) یعنی تورات، انجیل اور دیگر کتب، کیونکہ انہوں نے اس کی بشارت دی اور یہ اس بشارت میں اور توحید اور قیامت کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت میں ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے بلکہ یہ تو اس نبی کی تصدیق کرنے والا ہے جو قرآن سے پہلے آیا ہے اور وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کا مشاہدہ کیا ہوا تھا اس سے پہلے کہ وہ آپ سے قرآن سنتے۔ وَتَفْصِيْلَ میں نصب اور رفع دونوں جائز ہیں انہی دو وجہوں کی بنا پر جو تصدیق میں مذکور ہیں۔ اور التفصیل کا معنی تبیین (وضاحت کرنا) ہے، یعنی قرآن کریم اس کی

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 157

وضاحت کرتا ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتابوں میں لکھا۔ اور الکتاب اسم جنس ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تفصیل الکتاب سے مراد وہ ہے جو قرآن کریم میں احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ لَا رَيْبَ فِيهِ اس میں ہا ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی قرآن کریم میں کوئی شک نہیں یعنی اس کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾

"کیا یہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے، آپ فرمایئے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور (امداد کے لیے) بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ یہاں اَم ہمزہ استفہام کے محل میں ہے، کیونکہ یہ اپنے ماقبل کے ساتھ متصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اَم منقطعہ ہے جو بل اور ہمزہ کے معنی کے ساتھ مقدر ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓمٓ ﴿١﴾ تَنزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ (السجدہ) ای بل أیقولون افتراہ (بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: اَم بمعنی واؤ ہے، اور یہ جائز ہے: و یقولون افتراہ (اور وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میم صلہ ہے اور تقدیر کلام ہے: أیقولون افتراہ، ای إختلق محمد القرآن من قبل نفسه (کہ محمد ﷺ نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے) پس یہ استفہام تقریع اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے معنی میں ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ کلام کا معنی حجت بیان کرنا ہے، کیونکہ پہلی آیت اس پر دلیل ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، کیونکہ یہ اپنے سے پہلے ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے ساتھ موافقت کرتا ہے بغیر اس کے کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ نے کسی سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اور یہ آیت ان پر یہ لازم کر رہی ہے کہ وہ اس کی مثل ایک سورت لے آئیں اگر یہ گھڑا ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کے اعجاز کے بارے میں کلام پہلے مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے کہ یہ معجز ہے۔ والحمد للہ۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾

"بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام، اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے پھر دیکھ لو کیسا انجام ہوا ظالموں کا"۔

قولہ تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ یعنی انہوں نے قرآن کو جھٹلایا اور وہ اس کے معانی اور اس کی تفسیر سے جاہل اور ناواقف تھے اور ان پر لازم ہے کہ وہ اسے سوال کے ذریعے جانیں۔ پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ واجب ہے کہ تاویل میں غور و فکر کی جائے۔ اور قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ یعنی ان پر عذاب نازل ہو کر جھٹلانے کے انجام کی حقیقت ظاہر نہیں

ہوئی یا انہوں نے اسے جھٹلایا جو موت کے بعد اٹھائے جانے، جنت اور دوزخ کے ذکر میں سے قرآن کریم میں موجود ہے اور جو ان کے لیے کتاب میں وعید کی گئی اس کی حقیقت ان کے پاس نہیں آئی، یہ حضرت ضحاک نے کہا ہے۔ اور حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم قرآن کریم میں یہ پاتے ہو (جو کسی شی سے جاہل ہو وہ اس کا دشمن ہوتا ہے)؟ آپ نے فرمایا: ہاں، یہ دو مقام پر ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ۔ اور ایک قول باری تعالیٰ ہے: وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴿۱۱﴾ (الاحقاف) (اور کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی قرآن سے تو اب ضرور کہیں گے کہ (اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے) كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں مراد گزشتہ امتیں ہیں (1)، یعنی جیسے ان کا طریقہ تھا۔ اور کاف محل نصب میں ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ یعنی کیسے انہیں ہلاکت اور عذاب نے پکڑ لیا (اس میں دیکھ لو)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

''ان میں سے کچھ ایمان لائیں گے اس پر اور ان میں سے کچھ ایمان نہیں لائیں گے اس پر اور آپ کا رب خوب جانتا ہے مفسدوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ کہا گیا ہے: اس سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی ان میں سے کچھ مستقبل میں آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اگرچہ ان کی تکذیب طویل ہو جائے، کیونکہ ان کے بارے میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ انہیں یہ سعادت حاصل ہوگی۔ اور مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر جار و مجرور ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ اور اس کا معنی ہے اور ان میں سے کچھ اپنے کفر پر مصر رہیں گے یہاں تک کہ مر جائیں گے، جیسا کہ ابو طالب، ابولہب وغیرہما۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اہل کتاب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کفار کے لیے عام ہے۔ اور یہی صحیح ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک به میں ضمیر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ اس نے سزا اور عذاب کو مؤخر اس لیے کیا ہے کیونکہ ان میں سے کچھ عنقریب ایمان لے آئیں گے۔ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ یعنی آپ کا رب انہیں خوب جانتا ہے جو اپنے کفر پر اصرار کر رہے ہیں۔ اور یہ ان کے لیے تہدید اور جھڑک ہے۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ، عَمَلِيْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کا معنی ہے: تبلیغ کرنے، ڈرانے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بارے میں میرے عمل کا ثواب میرے لیے ہے۔ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ اور تمہارے عمل شرک وغیرہ کی جزا تمہارے لیے ہے۔ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ اس کی مثال یہ ہے، یعنی کسی ایک سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 158

دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ آیت آیت السیف سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد، کلبی، مقاتل اور ابن زید کے قول میں ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ان میں سے کچھ (بظاہر) کان لگاتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ سناتے ہیں بہروں کو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں سے کچھ (بظاہر) دیکھتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ راہ دکھاتے ہیں اندھوں کو خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ مراد ان کے ظواہر ہیں۔ اور ان کے دل تو اس میں سے کسی چیز کو محفوظ نہیں کرتے جو آپ انہیں حق میں سے کہتے ہیں اور جو قرآن کریم میں سے ان پر تلاوت کرتے ہیں، اسی لیے فرمایا ہے: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ، ای لا تُسْمِعُ (یعنی آپ نہیں سناتے) کلام میں بظاہر استفہام ہے لیکن اس کا معنی نفی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دلوں پر مہر لگ جانے کی وجہ سے بہروں کی مانند بنا دیا، یعنی آپ اسے ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے جسے ہدایت کی بات سننے سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ کر دیا ہو۔ اور اسی طرح معنی اس میں بھی ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ کوئی بھی اس کی توفیق اور اس کی ہدایت کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا(1)۔ یہ اور جو کلام اس کی مثل ہو وہ قدریہ کے اقوال کا رد کرتا ہے۔ جب کہ کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اور فرمایا ہے: یستمعون تو یہ من کے معنی کے اعتبار سے ہے اور ینظر، من کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، یعنی جس طرح آپ اسے سنانے کی قدرت نہیں رکھتے جس کی قوت سماعت سلب کر لی گئی ہو اور آپ یہ قدرت نہیں رکھتے کہ اندھے کے لیے بصارت کو پیدا کر دیں کہ وہ اس کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکے، پس اسی طرح آپ ان کو ایمان کی توفیق دینے کی قدرت نہیں رکھتے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور يَّنْظُرُ اِلَيْكَ کا معنی ہے یعنی وہ مسلسل آپ کی طرف دیکھتا ہے، جیسا کہ فرمایا: يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِیْ يُغْشٰی عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (الاحزاب:19) (کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو) کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت استہزا کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں''۔

جب شقی (اور بدبخت) لوگوں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا کہ اس نے ان کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا اور یہ کہ ان پر شقاوت کا چھا جانا اور دل کی سماعت اور بصارت کا سلب ہو جانا اس کی طرف سے ظلم اور زیادتی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ملکیت

1۔ تفسیر الطبری، زیر آیت ہذہ

میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے اور وہ اپنے جمیع افعال میں عادل ہے۔ وَلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن لوگ اپنے نفسوں پر کفر، معصیت اور اپنے خالق کے حکم کی مخالفت کر کے ظلم کرتے ہیں (1)۔

حمزہ اور کسائی نے وَلٰكِنْ مخفف اور النَّاسُ کو مرفوع پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: نحویوں کی جماعت جس میں فراء بھی ہیں ان کا خیال ہے کہ عرب جب کہیں ولکن واؤ کے ساتھ تو تشدید کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی ولکنّ پڑھتے ہیں) اور جب واؤ کو حذف کر دیں تو تخفیف کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی لکنْ پڑھتے ہیں) اور اس میں علت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جب بغیر واؤ کے ہو تو یہ بل کے مشابہ ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مخفف کر دیا تا کہ اس کا مابعد بل کے مابعد کی طرح ہو جائے اور جب یہ واؤ کے ساتھ آئے تو بل کے مخالف ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مشدد کر دیا اور اس کے ساتھ (مابعد کو) نصب دی، کیونکہ یہ ان ہے جس پر لام اور کاف کا اضافہ کیا گیا ہے اور اسے ایک حرف بنا دیا گیا ہے اور شاعر کا قول ہے:

ولکنني من حبها لعميد

پس لعمید لام کے ساتھ ہے، کیونکہ (لکن) اصل میں أن ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۴۵

''اور جس روز اللہ تعالیٰ جمع کرے گا انہیں (وہ خیال کریں گے) گویا وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی دن کی پہچانیں گے ایک دوسرے کو (تب حقیقت کھلے گی کہ) گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا یہ بمعنی کأنھم ہے پھر اسے مخفف کر دیا گیا، یعنی گویا کہ وہ اپنی قبروں میں نہیں ٹھہرے۔ اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یعنی دن کی ایک گھڑی کی مقدار، مراد یہ ہے کہ وہ قبروں میں اپنے طویل قیام کو اس خوف اور ڈر کی وجہ سے کم اور قلیل سمجھیں گے جو خوف دوبارہ اٹھائے جانے کے سبب وہ دیکھ رہے ہوں گے، اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (ہم ٹھہرے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت اس ہول اور خوف سے کم ہے جو انہیں مستقبل میں ہوگا نہ کہ ان کے قبروں میں ٹھہرنے کی مدت۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنی عمروں کی طوالت کو خلود (اور دوام) کے مقابلہ میں ایک گھڑی کی مثل دیکھیں گے۔ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ یہ یحشرھم میں ہا اور میم (ہم) سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (اس سے) منقطع ہو اور گویا یہ فرمایا: فھم یتعارفون (پس وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے)۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ان میں سے بعض بعض کو پہچان لیں گے جیسا کہ وہ دنیا میں پہچانتے تھے جب وہ اپنی قبور سے نکلیں گے اور یہ تعارف زجر و توبیخ اور ذلت و رسوائی کا تعارف ہوگا۔ ان میں سے بعض بعض کو کہیں گے: تو نے مجھے گمراہ کیا تھا اور تو نے مجھے بھٹکایا تھا اور تو نے مجھے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 159

کفر پر ابھارا تھا۔ یہ شفقت، نرمی اور مہربانی و رحم کا تعارف نہیں ہوگا۔ پھر معرفت اور پہچان ختم ہو جائے گی جب قیامت کے دن کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے جیسا کہ فرمایا: وَ لَا یَسْـَٔلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) (اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کا حال نہ پوچھے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زجر و توبیخ کا تعارف باقی رہے گا اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ...... تا قولہ...... وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (سبا) (کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے ہو جائیں گے اپنے رب کے روبرو...... اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے)

اور قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا، الآیہ (الاعراف: 38) (جب بھی داخل ہوگی کوئی امت وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر)

اور قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا، الآیہ (الاحزاب: 67) (اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی)

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ لَا یَسْـَٔلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) (تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان) تو اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی رحمت و شفقت کا سوال اس سے نہیں پوچھے گا، واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے کئی مقامات اور جگہیں ہیں (ان کے احکام مختلف ہوں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَتَعَارَفُوْنَ کا معنی یتسألون ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے تم کتنی مدت ٹھہرے ہو، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) (اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے) اور یہ اچھا ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ مومنین کے ایک دوسرے پر مہربان ہونے اور رحم کرنے کا تعارف ہے۔ اور کافروں پر کوئی مہربانی اور رحم نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) اور پہلا قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کو جھٹلایا۔ پھر کہا گیا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہو بعث و نشور پر دلالت کرنے کے بعد، یعنی وہ جنت کے ثواب سے محروم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کی حالت میں خسارے میں رہے، کیونکہ خسارہ اس حالت میں ہوتا ہے جس میں اقالہ کی امید نہ ہو اور نہ ہی توبہ فائدہ اور نفع دے۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ہو، وہ یہ کہتے ہیں۔ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہدایت یافتہ نہ تھے۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ ۝

”اور خواہ ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان سے یا (پہلے ہی) ہم اٹھا لیں

آپ کو (ہر حالت میں) ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ یہ شرط ہے۔ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ یعنی آپ کی حیات میں آپ کے دین کو غالب کرنے کا (جو وعدہ ہم نے کیا ہے) اور مفسرین نے کہا ہے: وہ بعض جس کا ان کے ساتھ وعدہ تھا وہ ان کے قتل اور قید کا تھا جو بدر میں قتل کر دیئے گئے اور قیدی بنا لیے گئے۔

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ اس کا عطف نُرِيَنَّكَ پر ہے یعنی یا ہم آپ کو اس سے پہلے اٹھا لیں۔ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ یہ اِما کا جواب ہے۔ اور مقصود یہ ہے اگر آپ نے ان سے جلدی انتقام نہیں لیا تو ہم نے ان سے تاخیر کے ساتھ انتقام لے لیا۔ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ یعنی اللہ تعالیٰ شاہد (گواہ) ہے جو کسی شاہد کا محتاج نہیں۔ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ اس پر جو وہ آپ کے ساتھ جنگ اور آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور اگر کہا جائے: ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بمعنی هناك (پھر اللہ تعالیٰ وہاں گواہ ہوگا) یہ بھی جائز ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول (اور انہوں نے اس کو جھٹلایا) تو فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ معنی یہ ہوگا: ہر امت کے لیے ایک رسول ہے وہ ان پر شاہد ہوگا، جب ان کا رسول قیامت کے دن آئے گا تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کی مثل یہ ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ (النسا: 41) (تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کل (قیامت کے دن) کفار اپنے پاس رسولوں کے آنے کا انکار کر دیں گے، تو ایک رسول لایا جائے گا اور وہ کہے گا: تحقیق میں نے تم تک پیغام پہنچایا، تو اس وقت ان کے خلاف عذاب کا فیصلہ کر دیا جائے گا، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: 43) (اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہوگا)

اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو بے شک وہ دنیا میں عذاب نہیں دیئے جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجے پس جو ایمان لایا وہ کامیاب ہوا اور نجات پا گیا اور جو ایمان نہ لایا وہ ہلاک ہو گیا اور اسے عذاب دیا گیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو) اور القسط کا معنی عدل ہے۔ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی بغیر گناہ کے نہ انہیں عذاب دیا جائے گا اور نہ بغیر حجت کے ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (عذاب کا) وعدہ اگر تم سچے ہو"۔

مراد کفار مکہ ہیں کیونکہ وہ اپنے انکار کی زیادتی اور اپنے لیے عذاب کے جلدی آنے کی طلب میں یہ کہتے تھے: عذاب کب آئے گا یا وہ قیامت کب آئے گی جس کے بارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے وعدہ کرتے ہیں؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عام

ہے ہر اس امت کو جس نے اپنے رسول کو جھٹلایا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مگر جتنا چاہے اللہ تعالیٰ، ہر قوم کے لیے میعاد مقرر ہے، جب آئے گی ان کی مقرر میعاد تو نہ وہ پیچھے رہ سکیں گے ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا جب انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مالک نہیں ہوں، یعنی اس کی ملکیت نہ اپنے لیے ہے اور نہ اپنے سوا کسی اور کے لیے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے کہ میں اس کا مالک ہوں اور اس پر قادر ہوں۔ تو میں کیسے قادر ہو سکتا ہوں کہ میں اس کا مالک بنوں جس کے جلدی آنے کا تم نے مطالبہ کیا پس تم جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ یعنی ہر قوم کی ہلاکت اور اس پر عذاب آنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں ایک معین وقت ہے۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ جب ان کی میعاد گزرنے کے ساتھ وہ معین وقت آئے گا۔ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ تو پھر ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں باقی رہتے ہوئے ایک لمحہ بھی پیچھے رہ سکیں اور نہ وہ آگے بڑھ سکیں گے پس انہیں مہلت دی جا رہی ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّا ذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

''آپ فرمائیے (اے منکرو!) ذرا غور کرو اگر آ جائے تم پر اس کا عذاب راتوں رات یا دن دہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) کس چیز کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں اس سے مجرم''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا یہ دو ظرفیں ہیں۔ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (یونس: 48) اور یہ ان کے عذاب کے جلدی آنے کے مطالبہ میں ان کی آراء کی بے وقوفی اور احمقانہ پن ہے، یعنی اگر تم پر عذاب آ جائے تو اس میں تمہارا نفع کیا ہے اور اس وقت ایمان تمہیں کوئی نفع نہیں دے سکے گا۔ مَّا ذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی تہویل و تعظیم ہے، یعنی کتنی بڑی اور عظیم ہے وہ شے جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں، جیسے اس کے لیے کہا جاتا ہے جو ایسے امر کا مطالبہ کرتا ہو جس کا انجام مضر ہو: تو اپنے خلاف کون سی چیز چن رہا ہے؟ منه میں ضمیر کے بارے بعض نے کہا ہے: وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اگر تو منه میں ھاء ضمیر کو بنائے کہ وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تیرے لیے ماذا میں دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور ذا بمعنی الذی ہو اور وہ ما کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو۔ اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ ماذا ایک اسم مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور مابعد جملہ اس کی خبر ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور اگر منه کی ہا ضمیر کو بنائیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تو ما اور ذا کو ایک

شے بنائے گا اور یہ یستعجل کے سبب محل نصب میں ہوگا۔ اور اس کا معنی ہوگا: أئ شی یستعجل منه المجرمون من الله عزوجل (کون سی شے کو مجرم اللہ تعالیٰ سے جلدی طلب کر رہے ہیں)

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۞

''کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا تب ایمان لاؤ گے اس پر (فرشتے انہیں کہیں گے) اب (آنکھیں کھلیں) تم تو اس عذاب کے لیے بڑی جلدی مچا رہے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ اس کلام میں حذف ہے، تقدیر کلام ہے: أتأمنون أن ینزل بکم العذاب ثم یقال لکم إذا حل: آلان آمنتم به؟ (کیا تم ایمان لاؤ گے کہ تم پر عذاب نازل کیا جائے پھر تم کو کہا جائے گا جب وہ آ جائے: اب تم اس کے ساتھ ایمان لاؤ گے؟ کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ بطور استہزا ملائکہ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے قول میں سے ہے اور ہمزہ استفہام ثم پر داخل ہوا ہے یہ تقریر و توبیخ کے لیے ہے اور تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ دوسرے جملے کا معنی پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہاں ثم بمعنی ثمّ (ثا کے فتحہ کے ساتھ) ہے پس یہ ظرف ہوگی اور اس کا معنی ہوگا: أهنالك یہ علامہ طبری کا مذہب ہے(1)، اور اس وقت اس میں استفہام کا معنی نہ ہوگا۔ اور الآن کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں حان کی مثل فعل مبنی ہے اور پھر اسے اسم کی طرف پھیرنے کے لیے اس پر لام لگایا گیا ہے۔ اور خلیل نے کہا ہے: اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے بنایا گیا ہے اور الف لام عہدی ہے اور اشارہ وقت کی طرف ہے، اور یہ دو زمانوں کی حد ہے۔ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تم تو اس عذاب کے لیے تَسْتَعْجِلُوْنَ جلدی مچا رہے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۞

''پھر کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو (اب) دائمی عذاب (کا مزہ) کیا تمہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو تم کمایا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی ان کو جہنم کے داروغے کہیں گے۔ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ یعنی چکھو وہ عذاب جو ختم نہیں ہوگا۔ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ یعنی تمہارے کفر کا بدلہ تمہیں دیا جائے گا۔

وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۞

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے کیا یہ واقعی سچ ہے؟ آپ فرمائیے: ہاں! بخدا یہ سچ ہے اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ سے عذاب آنے اور قیامت قائم ہونے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اَحَقٌّ یہ مبتدا ہے۔ هُوَ یہ سد مسد الخبر ہے۔ اور سیبویہ کا قول ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ هو مبتدا ہو اور أحق خبر ہو۔ یہ قسم ہے۔ اِنَّهٗ لَحَقٌّ یہ جواب قسم ہے، یعنی بے شک یہ ہونے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 141

یعنی تم اس کے عذاب اور اس کے بدلے سے بچ نہیں سکتے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

''اور اگر ہر ظالم شخص کے لیے روئے زمین کی دولت ہو تو بھی وہ ساری دولت بطور فدیہ دے دے۔ اور وہ ظالم دل ہی دل میں پچھتانے لگے جب دیکھا انہوں نے عذاب کو اور فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ یعنی اگر ہر شخص کے لیے جس نے شرک کیا اور کفر کیا۔ مَا فِي الْاَرْضِ یعنی وہ سب اس کی ملکیت ہو جو زمین میں ہے۔ لَافْتَدَتْ بِهٖ وہ ساری دولت اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بدلے فدیہ دے دے، تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى (آل عمران: 91) (جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا) اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ یعنی انہوں نے ندامت کو مخفی رکھا، یعنی ان کے سرداروں نے۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ندامت کو اپنے متبعین سے چھپا کر رکھا(1)۔ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ (جب انہوں نے عذاب کو دیکھا) اور یہ آگ میں جلائے جانے سے پہلے ہے۔ اور جب وہ جہنم میں واقع ہوں گے تو آگ انہیں ایسا کرنے سے غافل کر دے گی۔ اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (المومنون: 106) (اے ہمارے رب! غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی) پس ظاہر ہو گیا کہ وہ اسے نہیں چھپا سکیں گے جو انہیں لاحق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أسروا بمعنی أظهروا (یعنی وہ ظاہر کر دیں گے) اور یہ کلمہ اضداد میں سے ہے اور اس پر دلیل یہ بھی ہے کہ آخرت مضبوطی اور صبر دکھانے کا دار نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنے دلوں میں حسرت کا درد پانے لگے، کیونکہ ندامت کو ظاہر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کثیر نے کہا ہے:

فأسرت الندامة يوم نادى برد جمال غاضرة المنادى

اور مبرد نے اس میں ایک تیسری وجہ ذکر کی ہے کہ ان کے چہروں کے خطوط ندامت کو ظاہر کر دیں اور یہ پیشانی کی لکیریں (اور خدوخال) ہیں، اور اسرة کا واحد سرار ہے۔ اور ندامت سے مراد وہ حسرت ہے جو کسی شے کے واقع ہونے یا فوت ہونے کی وجہ سے ہو۔ اور اس کا اصل معنی تو لازم ہوتا ہے۔ اور اسی سے ندیم ہے کیونکہ وہ مجالس کو لازم پکڑتا ہے۔ اور فلان نادم سادم (فلاں نادم اور غمگین ہے)

اور السدم اللهج بالشئ (سدم کا معنی شیفتہ ہونا ہے) اور ندم وتندم بالشئ یعنی کسی شی کے سبب غمگین ہوا۔ جوہری نے کہا ہے: السدم کا معنی ندامت اور حزن ہے۔ اور سدم کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی غمگین ہونا اور پریشان ہونا ہے۔ اور رجل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 438

نادم سادم، وندمان سدمان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس (نادم) کے تابع ہے اور مالہ ھمٌ ولا سدمٌ إلا ذالك یعنی اس کے لیے نہ کوئی غم ہے نہ پریشانی سوائے اس کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الندم الدمن کا مقلوب ہے۔ اور الدمن کا معنی لازم ہونا ہے۔ اور اس سے ہی فلان مدمن الخمر فلاں شراب کو لازم پکڑنے والا ہے یعنی ہمیشہ شراب پینے والا ہے) اور الدمن سے مراد وہ شے ہے جو گھر میں جمع ہو اور تلبّد من الأبوال والأبعار (اور بول و براز اور گوبر (کھاد) جمع ہو گیا) اس کے لازم ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ اور الدمنۃ اس سے مراد وہ کینہ ہے جو سینے کو لازم پکڑے ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع دمن ہے۔ اور قد دَمِنَتِ قلوبھم (ان کے دل کینے سے بھر گئے) کہا جاتا ہے: دَمِنْتُ علی فلان ای ضَغِنْتُ (یعنی میں نے فلاں کے لیے کینہ رکھا)۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ یعنی رؤسا اور ادنی لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کر دیا گیا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾

"سن لو! بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

أَلَآ سامع کے لیے یہ حرف تنبیہ ہے یہ کلام کے اوّل میں زائد کیا جاتا ہے، یعنی تم ان کے بارے آگاہ ہو جاؤ جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔ إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے) لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (البقرہ: 107) (آسمانوں اور زمین میں اسی کی بادشاہی ہے) اور کوئی مانع نہیں جو اسے اپنے وعدہ کو نافذ کرنے سے روک سکے(1)۔ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾

"وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"۔

اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾

"اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آ گئی ہے) شفا ان روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں اور (آ گئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لیے"۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 259

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ مراد قریش ہیں۔ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ اس میں موعظة کا معنی نصیحت ہے۔ مِّنْ رَّبِّكُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یعنی قرآن کریم جس میں نصیحتیں اور حکمت آموز باتیں ہیں۔ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ اور (آ گئی ہے) ان روگوں سے شفا جو شک، نفاق، اختلاف اور افتراق میں سے سینوں میں ہیں۔ وَ هُدًی اور ان کے لیے رشد وہدایت جنہوں نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ وَّ رَحْمَةٌ اور رحمت ونعمت لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (اہل ایمان کے لیے) انہیں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہی ایمان کے ساتھ نفع حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قرآن کی صفات ہیں اور عطف مدح کی تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إلى المَلِكِ القَرْمِ و ابنِ الهُمامِ ولیثِ الکَتِیبةِ فی المُزْدَحَمْ

اس میں بھی یہ تمام صفات بادشاہ کی ہیں اور عطف برائے تاکید ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝

''(اے حبیب!) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں، یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم اور رحمت سے مراد اسلام ہے۔ اور انہی دونوں سے یہ بھی روایت ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں اس کے اہل بنایا (1)۔ اور حضرت حسن، ضحاک، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے: فضل اللہ سے مراد ایمان ہے اور رحمته سے مراد قرآن ہے (2)، یہ پہلے قول کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یہ اشارہ فضل اور رحمت کی طرف ہے۔ اور عرب، ذالک کو واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے بطور اشارہ لاتے رہتے ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فبذالك فلتفرحوا تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ یزید بن قعقاع اور یعقوب وغیرہ کی قراءت ہے۔ اور حدیث میں ہے۔ لتأخذوا مصافکم (3) (چاہیے کہ تم اپنی صفوں میں رہو) اور الفرح سے مراد لذة فی القلب بادراك المحبوب (وہ لذت ہے جو محبوب کے ملنے سے دل میں محسوس ہوتی ہے) اور کئی مقامات پر فرح (خوشی) کی مذمت بیان کی گئی ہے، مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ۝ (القصص) (زیادہ خوش نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو) اور اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ (ہود) (بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا اترانے والا ہے) لیکن یہ مطلق ہے اور فرحت کو مقید کر دیا جائے تو وہ مذموم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا ارشاد ہے: فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 170) (شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے) اور یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یعنی قرآن

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 144
2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164
3۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ ص، حدیث نمبر 3159، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسلام کے ساتھ چاہیے کہ وہ خوشی منائیں، پس یہ مقید ہے۔

ہارون نے کہا ہے: حضرت ابی کی قراءت میں فذالك فافرحوا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لام کے ساتھ ہوتا کہ اس کے ساتھ حرف جازم ہو جیسا کہ نہی کے ساتھ حرف ہوتا ہے، مگر وہ امر سے مخاطب کے لیے حذف کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے خطاب کے سبب اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات وہ اسے اپنے اصل کے مطابق لے آتے ہیں۔ اور اسی سے فبذالك فلتفرحو ہے۔

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ یعنی یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ دونوں فعلوں میں عام قراءت یا کے ساتھ ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے فلیفرحوا یا کے ساتھ اور تجمعون تا کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اس لیے کہ یہ خطاب کافروں کو ہے۔ اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے پہلے میں تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور يَجْمَعُوْنَ میں یا کے ساتھ یعنی پہلے قول کا برعکس ہے۔ اور ابان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور قرآن کریم کا علم سکھایا پھر وہ فاقہ کی شکایت کرے اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے درمیان فقر لکھ دے گا اس دن تک جس میں وہ اسے ملے گا''۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی......
قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (من هداه الله الإسلام و علمه القرآن ثم شكا الفاقة كتب الله الفقر بين عينيه الى يوم يلقاه)(2)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

''آپ فرمائیے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا پس بنا لیا ہے تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال، پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ یہ کفار مکہ کو خطاب ہو رہا ہے۔ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ اس میں ما محل نصب میں ہے، أرایتم کے سبب۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ أنزل کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور أنزل بمعنی خلق ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر:6) (اور پیدا کیے تمہارے لیے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے) اور وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (الحدید:25) (اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے) پس یہ بھی جائز ہے کہ خلق کو انزال کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا گیا ہو کیونکہ زمین میں جو بھی رزق ہے وہ وہی ہے جو آسمان سے بارش کے سبب نازل ہوتا ہے۔ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو انہوں نے بحیرہ،

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 439، تفسیر در منثور

سائبہ، وصیلہ اور حام کی تحریم کے بارے حکم لگایا۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (الانعام: 136) (اور انہوں نے بنا رکھا ہے اللہ کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ) قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال وحرام کرنے کی اجازت دی ہے۔ اَمْ عَلَى اللّٰهِ اس میں ام بمعنی بل ہے۔ تَفْتَرُوْنَ یہ ان کا قول ہے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے (یعنی یہ کہہ کر تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہو)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے قیاس کی نفی کے بارے استدلال کیا گیا ہے اور یہ بعید (از حقیقت) ہے کیونکہ قیاس اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے، پس تحریم و تحلیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے ایسی دلیل کے پائے جانے کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے حکم پر قائم کی ہے، پس اگر کوئی قیاس کے اللہ تعالیٰ کی دلیل ہونے میں اختلاف کرے تو یہ اس غرض (اور مقصد) سے خروج ہے اور اس کے غیر کی طرف رجوع ہے۔

وَ مَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

”اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا کہ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا، بے شک اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے“۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اس میں یوم ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا ظن کی وجہ سے جیسا کہ ما ظننك زیدا ہے اور اس کا معنی ہے کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ان کا مواخذہ نہیں فرمائے گا(1)۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ بے شک اللہ تعالیٰ (اس میں) تاخیر کر کے اور مہلت دے کر لوگوں پر فضل و کرم فرماتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے اہل مکہ کا ارادہ کیا ہے جس وقت انہیں حرم پاک میں پرامن بنا دیا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یعنی کفار لَا یَشْكُرُوْنَ اللہ تعالیٰ کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے سے عذاب کو مؤخر کرنے میں (اس کا شکر ادا کرتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لا یشکرون کا معنی ہے لا یوحدون یعنی اس کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتے۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَ مَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۱﴾

”اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کچھ قرآن اور (اے لوگو!) نہ تم کچھ عمل کرتے ہو مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں۔ اور

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 165

نہیں چھپا ہوتا آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ اس میں ما برائے انکار ہے، یعنی آپ کسی حال میں نہیں ہوتے، مراد یہ کہ چاہے وہ عبادت کی حالت ہو یا اس کے سوا کی مگر اللہ تعالیٰ آپ پر مطلع ہے۔ شان حالت اور امر (کام) کو کہتے ہیں اس کی جمع شئون ہے۔ اخفش نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: ما شأنت شأنه یعنی میں نے اس کا کام نہیں کیا (ما عملت عمله)، وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ فراء اور زجاج نے کہا ہے: منہ کی ہا ضمیر شان کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی آپ جو نیا کام کرتے ہیں پھر اس کی وجہ سے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا حکم کیا ہے یا اس بارے میں قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: منہ سے مراد من کتاب الله تعالیٰ ہے(1) (یعنی نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے) مِنْ قُرْاٰنٍ تفخیم شان کے لیے اس کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ (القصص: 30) (بے شک میں اللہ ہوں) وَ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اللہ تعالیٰ حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کی امت کو خطاب فرما رہا ہے: (اور نہ تم کچھ عمل کرتے ہو)

اور قول باری تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ یہ خطاب آپ ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ اور آپ کی امت ہے۔ اور کبھی خطاب رسول کو کیا جاتا ہے اور مراد وہ اور اس کے متبعین ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں مراد کفار قریش ہیں۔ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا (مگر ہر حال میں ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں) یعنی ہم اسے جانتے ہیں، اور اس کی نظیر یہ ارشاد ہے۔ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلۃ: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے)

اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ یعنی جب تم اس میں شروع ہوتے ہو۔ فیہ میں ہا ضمیر عمل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے: أفاض فلان فی الحدیث والعمل جب وہ بات اور کام میں لگ جائے۔ الراعی کا قول ہے:

فأفضن بعد كظومهن بجرة من ذی الأباطح إذ رعين حقيلا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ، تفعلونه (جب تم اس میں داخل ہوتے ہو) ابن کیسان نے کہا ہے: تنشرون القول (جب تم بات مشہور کرتے ہو)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ہا ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا معنی ہوگا: جب تم قرآن میں جھوٹ ملاتے ہو۔

وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آپ کے رب سے غیب نہیں ہوتا(2)۔ اور ابو روق نے کہا ہے: آپ کے رب سے دور نہیں ہوتا۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: وہ آپ کے رب سے جا نہیں سکتا۔ اور کسائی نے یعزب زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں واقع ہوا ہے اور باقیوں نے عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، جیسے یَعْرِش اور یَعْرُش ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 149
2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 151

مِنْ مِّثْقَالِ اس میں من صلہ ہے۔ ذرۃ یعنی ذرے کا وزن۔ مراد یہ ہے کہ آپ کے رب سے ذرے کے وزن کے برابر بھی کوئی شی مخفی اور چھپی ہوئی نہیں، یعنی سرخ رنگ کی چھوٹی سی چیونٹی کے برابر بھی۔ اور سورۃ النساء میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اس کا عطف لفظ مثقال پر ہے اور اگر چاہیں تو ذرہ پر کر لیں۔

اور یعقوب اور حمزہ نے دونوں میں را کو رفع کے ساتھ مثقال کے محل پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ من زائدہ تاکید کے لیے ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: مبتدا ہونے کی بنا پر رفع بھی جائز ہے اور اس کی خبر اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونے کے ساتھ لوح محفوظ میں بھی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: اِلّا واؤ نسق کے معنی میں ہے یعنی وھو فی کتاب مبین (اور وہ لوح محفوظ میں ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ (النمل) ای ومن ظلم (میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) اور قول باری تعالیٰ: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (البقرہ:150) ای والذین ظلموا منهم (تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے) پس الا بمعنی واؤ نسق ہے، اور اس کے بعد ھو مضمر ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ (البقرہ:58) ای ھی حطۃ (اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں)

اور قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ (النساء:171) ای ھم ثلاثۃ (اور نہ کہو تین خدا ہیں) اور اس کی نظیر اس میں بھی ہے جس میں ہم ہیں: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الانعام) ای وھو فی کتاب مبین (اور نہیں گرتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی بے شک آخرت میں اولیاء اللہ کو کوئی خوف نہیں۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ دنیا کے مفقود ہونے کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یعنی جس کا والی اللہ تعالیٰ ہو اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اس نے لی ہوئی ہو اور وہ اس سے راضی اور خوش بھی ہو تو قیامت کے دن نہ اسے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا ..... یعنی جہنم سے ..... مُبْعَدُوْنَ ۝ ..... تا قولہ ..... لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء:103) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: الذین یذکر اللہ برؤیتھم (یعنی وہ جنہیں دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی (وضاحت) میں فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں (لیکن) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مرتبے کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام اور شہداء ان پر رشک کریں گے''۔

عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمیں خبر دیجئے وہ کون ہیں اور ان کے اعمال کیا ہیں تاکہ ہم ان سے محبت کرنے لگ جائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسی قوم ہے جو آپس میں نسبی رشتہ داری کے بغیر اور ایسے مالوں کے بغیر جن کے سبب وہ ایک دوسرے سے مہربانی کرتے ہوں محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ قسم بخدا! بے شک ان کے چہرے نور ہوں گے اور بلاشبہ وہ نور کے منبروں پر ہوں گے وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے جب لوگوں کو خوف ہوگا اور وہ غمگین نہیں ہوں گے جب لوگ غمزدہ ہوں گے''۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (1) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اولیاء اللہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے جاگنے کے سبب زرد ہوں، آنسوؤں کے سبب آنکھیں کمزور ہوں، بھوک کے سبب پیٹ دبلے اور خالی ہوں اور ان کے ہونٹ گرمی یا پیاس کے سبب خشک ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی انہیں اپنی اولاد کے بارے میں کوئی خوف نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ انہیں اپنی دنیا پر کوئی غم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں عوض عطا فرما دیتا ہے ان کے پہلوں میں بھی اور ان کے پچھلوں میں بھی کیونکہ وہ ان کا ولی اور ان کا مددگار ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیزگاری کرتے رہے''۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی صفت ہے پس الَّذِيْنَ، اِنَّ کے اسم سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور وہ اولیاء ہے اور اگر چاہیں تو اس سے پہلے اعنی مقدر مان لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ہے پس اس طرح یہ (ترکیبی اعتبار سے) ماقبل سے کٹ جائے گا، یعنی وہ جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

''انہیں کے لیے بشارت ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں، نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں یہی بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''جب سے یہ آیت نازل ہوئی ہے تیرے سوا کسی نے اس کے بارے مجھ سے نہیں پوچھا، یہ سچے خواب ہیں جنہیں ایک مسلمان دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں'' (2)۔ اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرحم، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138

ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے۔ اور زہری، عطا اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بشارت سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ ملائکہ دنیا میں موت کے وقت ایک مومن کو خوشخبری دیتے ہیں۔ اور محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب بندہ مومن کی روح نکلنے کے ارادہ سے جمع ہو جائے اس کے پاس ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور کہتے ہیں: السلام علیك ولی اللہ اللہ یقرئك السلام (1) (اے اللہ تعالیٰ کے دوست (ولی) تجھ پر سلام ہو اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرما رہا ہے) پھر وہ اس آیت کے ساتھ نکال لیتے ہیں: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (النحل: 32) (وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو!) سلامتی ہو تم پر۔ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت قتادہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: بشارت یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے جان لیتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی کتاب میں جنت اور عظیم ثواب کے بارے عطا فرما دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ (التوبہ: 21) (خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی) مزید ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ (البقرہ: 25) (اور خوشخبری دیجیے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لیے باغات ہیں) مزید فرمایا: وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (فصلت) (تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اور اسی لیے ارشاد فرمایا: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدوں کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ اس لیے ہے کیونکہ اس کے وعدے اس کے کلمات ہیں۔

وَ فِي الْاٰخِرَةِ کہا گیا ہے: آخرت میں جنت کے بارے بشارت ہوگی جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے: جب روح نکلتی ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی بشارت دی جاتی ہے۔ اور ابو اسحاق ثعلبی نے ذکر کیا ہے: میں نے ابو بکر محمد بن عبد اللہ جوزقی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے ابو عبد اللہ الحافظ کو خواب میں ترکی گھوڑے پر سوار دیکھا وہ اپنے اوپر کمبل لیے ہوئے اور عمامہ باندھے ہوئے تھے، میں نے انہیں سلام کیا اور انہیں کہا: خوش آمدید، بے شک مسلسل تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں اور تمہارے محاسن اور خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں، تو انہوں نے کہا: اور ہم بھی تمہارا ذکر کرتے ہیں اور تمہاری خوبیاں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ (ان کے لیے) اچھی تعریف ہے اور اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ بھی کیا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خبریں تبدیل نہیں ہوتیں، یعنی وہ انہیں کسی شے کے ساتھ منسوخ نہیں کرتا اور وہ نہیں ہوتیں مگر اسی طرح جیسے وہ فرمائے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جس مقام پر اولیاء اللہ ہوں گے وہی عظیم کامیابی ہے۔

وَ لَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 361، حدیث نمبر 402 (بتغیر قلیل)
2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 168

''اور نہ غمزدہ کریں آپ کو ان کی باتیں یقیناً ساری عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ م کلام مکمل ہوگئی، یعنی ان کا افترا باندھنا اور ان کا آپ کو جھٹلانا آپ کو غمزدہ نہ کرے، پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ یعنی بے شک قوت کاملہ، غلبہ شاملہ اور قدرت تامہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہے پس وہی آپ کا ناصر، مددگار اور محافظ ہے۔ جَمِیْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس کے معارض نہیں ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون: 8) (حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے) کیونکہ تمام عزتیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں اور وہ تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (الصافات) پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان (ناسزا باتوں سے) جو وہ کیا کرتے ہیں) هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وہ ان کی باتیں اور ان کی آوازیں سننے والا ہے اور ان کے اعمال، ان کے افعال اور ان کی جمیع حرکات کو جاننے والا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

''خبردار! بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور کس کی پیروی کر رہے ہیں جو لوگ پکار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے) شریکوں کو؟ نہیں پیروی کر رہے مگر وہم و گمان کی اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی (بے شک جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک میں ہے) وہ ان کے بارے میں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جو وہ ارادہ فرماتا ہے اور ان میں وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اس میں مانفی کے لیے ہے، یعنی وہ حقیقۃً دوسرے شریکوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ شفاعت کریں گے یا نفع دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے، یعنی کون سی شی ہے جس کی وہ پیروی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے شریکوں کو پکار رہے ہیں (1)۔ (یہ) ان کے فعل کی قباحت (اور برائی) بیان کرنے کے لیے ہے، پھر جواب دیا اور فرمایا: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ یعنی وہ محض تخمینے لگا رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

''وہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا بے شک اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 169

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ یہ بیان فرمایا کہ واجب اس کی عبادت ہے جو رات اور دن کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو اس چیز پر قدرت نہیں رکھتا وہ عبادت کے لائق نہیں۔ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ تاکہ تم اس میں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ آرام کرو تاکہ تم سے تھکاوٹ اور سستی زائل ہو جائے۔ اور سکون سے مراد اضطراب اور پریشانی سے پر سکون ہونا ہے، آرام پانا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس کے ساتھ اپنی حوائج وضروریات میں ہدایت اور رہنمائی پا سکو اور المبصر وہ ہوتا ہے جو دیکھنے والا ہو، اور دن میں دیکھا جاتا ہے۔ اور فرمایا: مُبْصِرًا یہ مجازا ہے اور عربوں کی عادت کے مطابق اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ ان کا قول ہے، لیل قائم (رات قیام پذیر ہے) اور نہار صائم (اور دن روزے دار ہے) اور جریر نے کہا ہے:

لقد لُمْتِنا یا أمّ غَیْلان فی السُّرَی　　ونمتِ وما لیلُ المَطِیّ بنائم(1)

اور قطرب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے أظلم اللیل یعنی رات تاریکی والی ہو گی۔ (صار ذا ظلمة) اور أضاء النهار و أبصر (دن روشن اور دیکھنے والا ہو گیا) أی صار ذا ضیاء و بصر۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ بے شک اس میں علامات اور دلائل ہیں۔ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ یعنی ان لوگوں کے لیے جو گہری غور وخوض سے سنتے ہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

"انہوں نے کہا بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا، وہ پاک ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں تمہارے پاس کوئی دلیل اس (بیہودہ بات) کی، کیا بہتان باندھتے ہو اللہ تعالیٰ پر جس کا تمہیں علم ہی نہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یعنی کافروں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا بنالیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ سُبْحٰنَهٗ اس نے اپنے آپ کو بیوی اور اولاد سے اور شرکاء اور مدمقابل الٰہوں سے پاک رکھا ہوا ہے۔ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مطلق غنی اور بے نیاز ہونے کی خبر دی اور یہ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملک، اس کی مخلوق اور اس کی غلام ہے: اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ (مریم)

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا یعنی تمہارے پاس اس بیہودہ بات پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے کو ثابت کر کے (کیا تم اس پر بہتان باندھتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں) کیونکہ بیٹا تو

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 130

مجانست اور مشابہت کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نہ کسی شے سے مجانست رکھتا ہے اور نہ کسی شے سے مشابہت رکھتا ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''آپ فرمایئے جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ یعنی بے شک وہ جھوٹ گھڑتے ہیں۔ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ یعنی نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ پرامن ہو سکتے ہیں، کلام مکمل ہوئی۔ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا یعنی ذالك متاع او هو متاع فی الدنیا (یہ دنیا میں (چند روزہ) لطف اندوزی ہے) یہ کسائی نے کہا ہے اور اخفش نے کہا ہے: لهم متاع فی الدنیا (ان کے لیے لطف اندوزی ہے دنیا میں) ابو اسحاق نے کہا ہے: قرآن کے علاوہ (دوسری عبارت میں) نصب پڑھنا بھی جائز ہے معنی یہ ہوگا يتمتعون متاعا (وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں دنیا میں) ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ پھر ہماری طرف ان کا رجوع ہے۔ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ پھر ہم انہیں انتہائی سخت عذاب چکھائیں گے۔ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

''اور آپ پڑھ سنایئے انہیں نوح (علیہ السلام) کی خبر جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر گراں ہے تم پر میرا قیام اور میرا پند و نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا سو تم بھی کوئی متفقہ فیصلہ کر لو اپنے شریکوں سے مل کر پھر نہ ہو تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی پھر کر گزرو میرے ساتھ (جو جی میں آئے) اور مجھے مہلت نہ دو''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان کے سامنے پہلے لوگوں کے قصے اور واقعات بیان فرمائیں اور انہیں کفر اختیار کرنے پر دردناک عذاب سے ڈرائیں (اور خوفزدہ کریں) اتل میں واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ امر ہے، یعنی آپ ان پر حضرت نوح علیہ السلام کی خبر پڑھ کر بیان کریں۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اس میں اذ محل نصب میں ہے۔ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ یعنی اگر تم پر بھاری اور ثقیل ہے۔ مَّقَامِيْ، المقام (میم کے فتحہ کے ساتھ ہو) تو معنی وہ جگہ ہے جس میں قیام ہوتا ہے۔ اور المقام (میم کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی الاقامة (قیام کرنا ہوتا ہے)۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کے ساتھ نہیں پڑھا گیا، یعنی اگر تم میں میرا ٹھہرنا تم پر گراں ہے۔ وَتَذْكِيْرِيْ اور

تمہیں میرا پند و نصیحت کرنا اور تمہیں میرا ڈرانا۔ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی آیات سے) اور تم نے میرے قتل کا اور مجھے بھگانے کا ارادہ کرلیا ہے(1)۔ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ تو میں نے اللہ پر اعتماد کرلیا۔ اور یہ جواب شرط ہے۔ اور آپ علیہ السلام تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکل کرتے رہے، لیکن یہاں خاص طور پر بیان فرمایا کہ وہ متوکل ہیں تاکہ ان کی قوم جان لے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ میں آپ کے لیے کافی ہوگا، یعنی اگر تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں بلاشبہ اس پر اعتماد اور توکل کرتا ہوں جو میری مدد کرے گا۔

قولہ تعالیٰ: فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ عام قرات میں فاجمعوا ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے اور شرکاءکم منصوب ہے اور عاصم جحدری نے فاجمعوا ہمزہ وصلی اور میم کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے یہ جمع یجمع سے ماخوذ ہے اور شرکاءکم نصب کے ساتھ ہے۔ اور حسن، ابن اسحاق اور یعقوب نے فاجمعوا کو ہمزہ قطعی کے ساتھ اور شرکاءکم کو مرفوع پڑھا ہے۔ پس پہلی قرات أجمع علی الشئ سے ہے جب کوئی اس کا عزم کرلے۔ اور فراء نے کہا ہے: أجمع الشئ کا معنی ہے اس نے اسے تیار کیا۔ اور مورج نے کہا ہے: أجمعت الأمر، أجمعت علیه سے زیادہ فصیح ہے۔ اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

يا ليت شعری والمُنَى لا تنفع هل أَغْدُوَنْ يوما و امری مُجْمَعُ

نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے مطابق شرکاء کی نصب میں تین وجہیں ہیں: کسائی اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی وادعوا شرکاءکم لنصرتکم ہے (اور تم اپنے شریکوں کو اپنی مدد کے لیے بلالو) ان دونوں کے نزدیک اس فعل مضمر کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ معنی پر معطوف ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

يا ليت زوجَك فی الوَغَی متقلّد سیفاً و رُمْحًا(2)

تو اس رمح (نیزہ) کو لٹکایا نہیں جاتا، مگر یہ کہ وہ تلوار کی طرح اٹھایا جاتا ہے (لہٰذا اس معنوی مشابہت کی وجہ سے رمحاً سیفاً پر معطوف ہے) اور ابواسحاق الزجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: مع شرکائکم علی تناصرکم (پس تم بھی اپنے شریکوں سمیت ایک دوسرے کی مدد کرنے پر جمع ہو جاؤ) جیسے کہا جاتا ہے: التقی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ مل گیا) اور دوسری قراءت جمع کے بارے ہے، اس میں اس قول باری تعالیٰ کا اعتبار کیا گیا ہے: فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝ (طٰہٰ) (اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا)۔ ابو معاذ نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ جمع اور أجمع دونوں ایک ہی معنی میں ہوں، اس قراءت کے مطابق وشرکاءکم، أمرکم پر معطوف ہے یا پھر یہ معنی ہے فأجمعوا أمرکم وأجمعوا شرکاءکم (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کرلو) اور اگر چاہیں تو بمعنی مع بنالیں (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر)۔

ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: میں نے ابواسحاق کو سنا ہے وہ قام زید و عمروا کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور تیسری قراءت اس بنا پر ہے کہ شرکاءکم اجمعوا میں ضمیر مرفوع پر عطف کیا جائے۔ اور یہ اچھا ہے، کیونکہ کلام طویل ہو چکی ہے۔ نحاس وغیرہ نے

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 171
2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 163

کہا ہے: اور یہ قراءت بہت بعید ہے، کیونکہ اگر یہ مرفوع ہوتا تو پھر واجب تھا کہ اسے واؤ کے ساتھ لکھا جاتا اور مصاحف میں و شرکاء کم میں واؤ نہیں دیکھی گئی اور یہ بھی کہ ان کے شرکاء بت تھے اور بت کچھ نہیں کر سکتے اور ان کا کوئی فعل نہیں یہاں تک کہ انہیں جمع بھی کر لیا جائے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ شرکاء مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، یعنی و شرکاء کم لیجمعوا أمرهم (اور تمہارے شرکاء چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر متفق ہو جائیں) اور اس کی نسبت شرکاء کی طرف کی گئی ہے حالانکہ یہ نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں، تو یہ ان کی عبادت کرنے والوں کی زجر و توبیخ کے لیے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً یہ یکن کا اسم اور اس کی خبر ہے۔ اور غمة اور غم دونوں برابر ہیں اور اس کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: غم الهلال جب چاند چھپ جائے، یعنی چاہیے کہ تمہارا فیصلہ ظاہر ہو اور واضح ہو تم اس میں اس کی قدرت رکھتے ہو جو تم چاہو۔ اس کی طرح نہ ہو جس کا فیصلہ مخفی ہوتا ہے اور وہ اس پر قادر نہیں ہوتا جو وہ ارادہ کرتا ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

لعمرك ما أمری علیّ بغُمة　　نهاری ولا لیلی علیّ بسَرمَد

زجاج نے کہا ہے: غمة کا معنی ذاغم ہے اور الغم والغمة کرب اور کربة (غم و پریشانی، تکلیف) کی طرح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک غمة سے مراد امر کی وہ تنگی ہے جو غم اور پریشانی کو واجب کر دیتی ہے پس جسے یہ لاحق ہو وہ اپنے لیے کوئی ایسا ماخذ اور مصدر نہیں پاتا جس کے سبب وہ اس کیفیت سے نکل جائے جو اسے پریشان اور غمزدہ کر رہی ہے۔ اور صحاح میں ہے کہ الغمة کا معنی الکربة (تکلیف) ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

بل لو شهدت الناس إذ تُكُمُّوا　　بغُمّة لو لم تفرّج غُمُّوا(1)

کہا جاتا ہے: أمر غمة یعنی ایسا امر جو مبہم ہو اور اس میں التباس ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ابو عبیدہ نے کہا ہے: اس کا مجازی معنی ظلمة (تاریکی) اور تنگی ہے اور الغمة کا معنی گھی کی مشک کا پیندا بھی ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس میں اصل یہ ہے کہ یہ تمام الغامة سے مشتق ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ، اقْضُوْٓا میں الف ہمزہ وصل ہے، یہ قضی یقضی سے ہے۔ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: اور اسی کی مثل یہ ہے: وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ (الحجر: 66) یعنی ہم نے اسے اس تک پہنچا دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ کے معنی میں فرمایا: پھر تم گزر جاؤ اور تم مجھے مہلت نہ دو۔

نحاس نے کہا ہے: لغت کے مطابق یہ قول صحیح ہے اور اسی سے قضى الميت یعنی (میت گزر گیا) ہے۔ اور انہیں یہ بتایا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یہ نبوت کے دلائل میں سے ہے۔

اور فراء نے بعض قراء سے ثُمَّ افْضُوْٓا اِلَیَّ بیان کیا ہے یعنی یہ فا اور ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے، یعنی پھر تم میری طرف توجہ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 132

کرو۔ کہا جاتا ہے: أفضت الخلافة إلى فلان و أفضى إلى الوجع (میں نے فلاں کی طرف خلافت (نیابت) کو متوجہ کیا اور اس نے مجھے درد اور تکلیف پہنچائی) اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ساتھ یقین رکھتے تھے اور ان کی تدبیر اور مکر و فریب سے خوفزدہ نہ ہوئے، کیونکہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ خود اور ان کے معبود نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان اور نہ تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ حضور نبی مکرم ﷺ کے لیے تسلی اور آپ کے دل کے لیے باعث تقویت ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۷۲﴾

"پاس ہمہ اگر تم منہ موڑے رہو تو نہیں طلب کیا میں نے تم سے کچھ اجر، نہیں میرا اجر مگر اللہ کے ذمہ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں مسلمانوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ یعنی پس اگر تم نے اس سے اعراض کر لیا ہے جو میں لے کے تمہارے پاس آیا ہوں تو یہ اس لیے نہیں کہ میں نے تم سے کوئی اجر طلب کیا ہے پس میرا معاوضہ اور بدلہ تم پر بھاری اور ثقیل ہو جائے گا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں میرا اجر تو فقط اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک ماننے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اہل مدینہ ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے أجریَ میں یاء کو فتحہ دیا ہے جہاں بھی واقع ہوا اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۷۳﴾

"تو آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلایا پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے بنا دیا انہیں ان کا جانشین اور ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ذرا دیکھو کیسا انجام ہوا ان کا جنہیں ڈرایا گیا تھا"۔

قولہ تعالیٰ: فَكَذَّبُوْهُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے جھٹلایا۔ فَنَجَّیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ پس ہم نے آپ کو اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دی۔ فِی الْفُلْكِ یعنی جو کشتی میں آپ کے ساتھ سوار تھے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ اور ہم نے انہیں زمین کی باسی اور غرق ہونے والوں کا جانشین بنا دیا۔ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ یعنی ذرا دیکھو ان کے معاملے کا انجام کیسا ہوا جنہیں رسولوں نے ڈرایا اور وہ ایمان نہ لائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر ہم نے بھیجے نوح (علیہ السلام) کے بعد اور رسول ان کی قوموں کی طرف پس وہ لائے ان کے پاس روشن دلیلیں تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ جھٹلا چکے تھے پہلے یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی پھر ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھیجے۔ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ رسول جیسے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ۔ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ پس وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے۔ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ تقدیر کلام ہے: تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سے پہلے جھٹلا چکی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ یعنی جسے وہ پہلے یوم الذر (یوم میثاق) کو جھٹلا چکے تھے، کیونکہ ان میں وہ تھے جنہوں نے اپنے دل سے جھٹلایا تھا اگرچہ تمام نے بلیٰ (ہاں) کہا تھا۔ نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اس قوم کے سرداروں کے بارے ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرہ) (چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے) كَذٰلِكَ نَطْبَعُ یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ کفر اور تکذیب میں حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر، پس وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اور یہ آیت قدریہ کے قول کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝

''پھر ہم نے بھیجا ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام) کو فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ تو فرعونیوں نے غرور و تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ پھر ہم نے ان رسولوں اور امتوں کے بعد بھیجا۔ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے اشراف کی طرف۔ بِاٰیٰتِنَا یہاں مراد آیات تسع (نو معجزات) ہیں، ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ فَاسْتَكْبَرُوْا تو انہوں نے حق (قبول کرنے سے) غرور و تکبر کیا۔ وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ اور وہ مشرک لوگ ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝

''پھر جب آیا ان کے پاس حق ہماری طرف سے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یقیناً یہ کھلا جادو ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا (عقل کے اندھو) کیا تم کہتے ہو (ایسی بات) حق کے متعلق جب وہ تمہارے پاس آیا (سوچو!) کیا یہ جادو ہے؟ اور نہیں کامیاب ہوتے جادوگر''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا اس سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے (یعنی جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا) قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ تو انہوں نے معجزات کو سحر (جادو) پر محمول کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا: اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا۔ کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو یہ سحر ہے، پس اتقولون یہ انکار ہے اور ان کا قول هٰذَا السِّحْرُ (یہ جادو ہے) محذوف ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ازسرنو دوسرا انکار ہوا اور فرمایا: اَسِحْرٌ هٰذَا (کیا یہ جادو ہے) پس ان کا پہلا قول ان کے دوسرے قول پر اکتفاء کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا، درآنحالیکہ اس میں فرعون اور اس کے درباریوں کا انکار کیا گیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ ان کے قول میں سے ہے اور ان کے قول کی حکایت کے لیے اس پر الف استفہام داخل کر دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: اَسِحْرٌ هٰذَا تو انہیں کہا گیا: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آیا: کیا یہ جادو ہے؟ اور یہ حسن سے مروی ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ یعنی وہ کامیاب نہیں ہوتے جو اس کے ساتھ آئے (یعنی جادو لے کر آئے)

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

"کہنے لگے کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس تاکہ ہٹا دو ہمیں اس (دین) سے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو اور ہو جائے صرف تم دونوں کے لیے بڑائی سرزمین (مصر) میں اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو تاکہ ہمیں پھیر دو اور موڑ دو۔ کہا جاتا ہے: لفتہ یلفتہ لفتا جب وہ اسے موڑ دے اور پھیر دے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

تلفتُّ نحو الحيِّ حتى رأيتُني　　وجِعْتُ من الإصغاء لِيتًا وأخدَعا

اور اسی سے التفت (میں مڑ گیا) ہے بے شک اس کا معنی سامنے کی جہت سے پھر جانا اور مڑ جانا ہے۔

عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا مراد بتوں کی عبادت سے ہٹا دینا ہے۔ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ اور صرف تم دونوں کے لیے عظمت، بادشاہی اور سلطنت ہو جائے۔ فِي الْاَرْضِ مراد سرزمین مصر ہے۔ اور بادشاہی (ملک) کے لیے الکبریاء کہا جارہا ہے کیونکہ یہ سب سے بڑی (شے) ہے جس کی طلب دنیا میں کی جاتی ہے۔ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے)۔ حضرت ابن مسعود اور حسن رضی اللہ عنہما وغیرہ نے ویکون یا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مونث غیر حقیقی ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: حضر القاضی الیوم امرأتان (آج قاضی کے پاس دو عورتیں حاضر ہوئیں)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾

"اور فرعون نے حکم دیا (فوراً) لے آؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر"۔

اس نے یہ تب کہا جب اس نے عصا مبارک اور ید بیضا دیکھا اور یہ اعتقاد بنایا کہ یہ دونوں چیزیں جادو ہیں۔ حمزہ، کسائی، ابن وثاب اور اعمش نے سحار پڑھا ہے اور سورۃ الاعراف میں ان دونوں کی بحث گزر چکی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝

''پھر جب آگئے جادوگر تو کہا انہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے ڈالو (میدان میں) جو تم ڈالنے والے ہو''۔

یعنی انہیں زمین پر پھینکو جو تمہارے پاس رسیاں اور لاٹھیاں ہیں۔ اس کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۸۱

''پھر جب ڈال دیا انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ جو تم لائے ہو یہ جادو ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ ملیا میٹ کر دے گا اسے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سنوارتا شریروں کے کام کو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ اس میں ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہوگا اور اس کی خبر جِئْتُمْ بِهِ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: أی شئ جئتم به (جو شے بھی تم لے کر آئے ہو) یہ ایک تو زجر و توبیخ کے لیے ہے اور دوسرا جو جادو لے کر آئے اس کی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عمرو کی قراءت السحر استفہام کی طرز پر ہے اس صورت میں مبتدا مضمر ہوگا اور تقدیر عبارت ہوگی أھو السحر (کیا وہ جادو ہے)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو اور تقدیر عبارت ہو: السحر جئتم به۔ اور جنہوں نے استفہام کی صورت میں قراءت کی ہے ان کے مطابق ما بمعنی الذی نہیں ہوگا، کیونکہ اس کی کوئی خبر نہیں۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر السحر پڑھا ہے۔ اور اس قراءت کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے: ما جئتم به سحر اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت: ما آتیتم به سحر (جو تم لائے ہو جادو ہے) پس ما بمعنی الذی ہے اور جئتم به صلہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے ما محل رفع میں ہے۔ اور السحر مبتدا کی خبر ہے اور ما کو جب بمعنی الذی بنائیں گے تو پھر وہ منصوب نہیں ہوگا کیونکہ صلہ موصول میں عمل نہیں کر سکتا۔ اور فراء نے السحر کو جئتم کے سبب نصب دینے کو جائز قرار دیا ہے اور ما شرط کے لیے ہو، اور جئتم محل جزم میں ہو اور فاء محذوف ہو۔ اور تقدیر ہوگی: فان الله سیبطله (تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے باطل (ختم) کر دے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ السحر کو مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی جائے۔ ای ما جئتم به سحرا، پھر اس پر الف لام زائدہ داخل کر دیا گیا ہو، پس اس تقدیر پر حذف فا کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوگی اور نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اور کہا ہے: مجازات میں فاء کے حذف کو اکثر نحوی جائز قرار نہیں دیتے مگر ضرورت شعر کے لیے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

من یفعل الحسنات الله یشکرھا

''جو نیکیاں کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی قدر کرتا ہے''۔

بلکہ بسا اوقات بعض نے کہا ہے: یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، مجھے محمد بن یزید نے بیان کیا اس نے کہا مجھے مازنی نے بیان کیا، اس نے کہا میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نحویوں نے اس شعر کو بدل دیا ہے اور روایت یہ ہے: من یفعل الخیر فالرحمن یشکرہ۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: مجازاۃ میں فا کا حذف جائز ہے، انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ: 30)

وما اصابکم من مصیبۃ بما کسبت ایدیکم اس میں یہ دونوں قراءتیں (فا کے ساتھ اور فا کے بغیر) مشہور و معروف ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ مراد سحر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو کوئی رات کے وقت اپنے بستر پر گیا پھر یہ آیت پڑھی: مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ کسی جادوگر کی تدبیر اور مکر اسے نقصان نہیں دے گا اور اگر کسی سحر زدہ کو یہ لکھ کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ اس سے سحر دور فرما دے گا۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور اللہ تعالیٰ حق کو حق کر دکھاتا ہے اپنے ارشادات سے اور خواہ ناپسند ہی کریں (اسے) مجرم"۔

قولہ تعالیٰ: وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ یعنی اللہ تعالیٰ حق کو بیان کرتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ بِكَلِمٰتِهٖ یعنی اپنے کلام، حجج اور اپنے دلائل کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اپنی مدد و نصرت عطا کر کے (حق کو حق کر دکھاتا ہے) وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ آل فرعون کے مجرم اسے ناپسند ہی کریں۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

"پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر بجز ان کی قوم کی اولاد کے (وہ بھی) ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اپنے سرداروں سے کہ کہیں وہ انہیں بہکا نہ دے۔ اور واقعی فرعون بڑا سرکش (بادشاہ) تھا ملک میں اور واقعی وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا"۔

قولہ تعالیٰ: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ اس میں ہا ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کوئی ایمان نہ لایا، بلاشبہ بنی اسرائیل میں سے ان کی اولاد ایمان لائی جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، طویل وقت گزر گیا آباؤ اجداد ہلاک ہو گئے اور بیٹے باقی رہے پس وہ ایمان لائے (1)۔ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے اور ذریت سے مراد انسان کی پیچھے آنے والی نسل ہے اور کبھی یہ کثیر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت سے بنی اسرائیل کے مومن مراد لیے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ چھ لاکھ تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں بہتر افراد کے ساتھ داخل ہوئے پھر وہ مصر میں بچوں کی ولادت کے سبب بڑھتے رہے یہاں تک کہ چھ لاکھ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 172، (مفہوم)

تک پہنچ گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا: مِّنْ قَوْمِهٖ یعنی فرعون کی قوم سے۔ ان میں سے آل فرعون کے مومن اور فرعون کا خازن اور اس کی بیوی اور فرعون کی بیٹی کی ماشطہ (اسے بناؤ سنگار کرنے والی) اور اس کے خازن کی بیوی (یہ مومن تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اقوام ہیں جن کے آباء قبطی تھے اور ان کی مائیں بنی اسرائیل میں سے تھیں پس انہیں ذریت کا نام دیا گیا جیسا کہ ان گھوڑوں کی اولاد کو ابناء کا نام دیا جاتا ہے جو یمن اور بلاد عرب سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی مائیں ان کے باپوں کی جنس سے نہیں۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اس بنا پر قومہ میں ہا ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ انہیں ماؤں کی جہت سے قرابت حاصل ہے اور فرعون کی طرف لوٹتی ہے جب وہ (آباء) قبطی ہوں۔

قولہ تعالیٰ: عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ کیونکہ وہ سرکشی کرتے ہوئے ان پر مسلط ہے (اس لیے وہ فرعون سے ڈرتے ہیں) وَ مَلَاۡئِهِمْ (اور اپنے سرداروں سے) یہاں وملئہ نہیں کہا۔ اس کے چھ جواب دیئے گئے ہیں: (۱) کہ فرعون جب جابر و ظالم تھا تو اس کی طرف سے تمام کے فعل کی خبر دی گئی (۲) کہ فرعون کا جب ذکر کیا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ اور بھی ہیں پس ضمیر اس (فرعون) کی طرف اور دوسرے تمام کی طرف لوٹائی۔ یہ فراء کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ (۳) کہ فرعون کو ثمود کی طرف جماعت کا نام دیا گیا ہے (اس لیے ضمیر جمع لوٹائی گئی) (۴) تقدیر عبارت یہ ہو: علی خوف من آل فرعون پس یہ مضاف کے حذف کے باب سے ہوگا جیسا کہ واسئل القریۃ میں ہے اور یہ فراء کا دوسرا قول ہے۔ اور یہ جواب سیبویہ اور خلیل کے مذہب کے مطابق غلط ہے۔ ان دونوں کے نزدیک یہ جائز نہیں قامت ھند کہہ کر تیری مراد اس کا غلام ہو۔ (۵) اخفش سعید کا مذہب یہ ہے کہ ضمیر ذریۃ کی طرف لوٹ رہی ہے مراد ذریۃ (اولاد) کے سردار ہیں اور یہی علامہ طبری کی پسند ہے (۶) کہ ضمیر فرعون کی قوم کی طرف لوٹ رہی ہو۔ نحاس نے کہا ہے: یہ جواب گویا زیادہ بلیغ ہے۔ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ فرعون کے بارے خبر دینے کی بنا پر یفتنھم کو واحد ذکر کیا ہے کہ وہ انہیں سزاؤں کے سبب اپنے دین سے پھیر دے اور یہ محل جر میں ہے اس بنا پر کہ یہ بدل اشتمال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خوف کے سبب نصب کے محل میں ہو اور فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمی اسم ہے اور یہ معرفہ ہے۔ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ یعنی فرعون سرکشی کرنے والا متکبر ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ اور بے شک وہ کفر میں حد سے بڑھنے والوں میں سے ہے، کیونکہ وہ بندہ ہے اور اس نے دعویٰ ربوبیت کا کیا ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! اگر تم ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ (کا موجب) ظالم قوم کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ یعنی اگر تم نے تصدیق کی ہے۔ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اللہ تعالیٰ کی تو اسی پر اعتماد کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ شرط بطور تاکید مکرر ذکر کی گئی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کمال ایمان امر کو اللہ تعالیٰ کے حوالے

اور سپرد کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا انہوں نے عرض کی ہم نے اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے۔ اور ہم اس کی قضاء وقدر کے ساتھ راضی ہیں اور ہماری انتہا اس کے امر تک ہے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی تو ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کر، پس وہ ہمارے لیے دین کے بارے فتنہ ہو جائے گا یا تو ہمیں نہ مٹا دے کہ تو ہمیں ان کے سامنے عذاب دے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہمیں ہمارے دشمنوں کے سامنے ہلاک نہ کر اور ہمیں اپنی طرف سے کوئی عذاب نہ دے، پس ہمارے دشمن کہیں گے: اگر وہ حق پر ہوتے تو ہم ان پر مسلط نہ کیے جاتے پس کہ وہ آزمائے جائیں (1)۔ ابو مجلز اور ابو الضحاء نے کہا ہے: مراد یہ ہے تو انہیں ہم پر غلبہ نہ دے کہ وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ وہ ہم سے بہتر ہیں، پس ان کی سرکشی بڑھ جائے گی۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم و ستم) سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ یعنی ہمیں خلاصی عطا فرما اپنی رحمت کے ساتھ۔ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی فرعون اور اس کی قوم سے، کیونکہ وہ انہیں مشقت آمیز اور تکلیف دہ کاموں کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر اور بناؤ اپنے گھروں کو قبلہ رخ اور قائم کرو نماز۔ اور (اے موسیٰ!) خوشخبری دو مومنوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ تم بناؤ۔ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا کہا جاتا ہے: بوأت زیدا مکانا اور بوأت لزید مکانا (میں نے زید کے لیے مکان بنایا) اور المبواوہ گھر اور منزل ہے جسے لازم پکڑا گیا ہو۔ اور اسی سے ہے بواہ اللہ منزلا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے لازم کر دیا ہے اور اسے سکونت عطا کر دی۔ اور اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے: ''جس نے جان بوجھ کر میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے'' (2)۔ اور راجز کا قول ہے:

نحن بنو عدنان لیس شك تبوأ المجد بنا والملك (3)

ہم بنو عدنان ہیں اس میں کوئی شک نہیں بزرگی اور بادشاہی ہمارے ساتھ لازم ہے۔

اس آیت میں مصر سے مراد اسکندریہ شہر ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہ ایک

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 175
2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 90
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 446

شہر ہے جس کا نام مصر ہے اور مصر بحر (سمندر) سے اسوان کی طرف جاتے ہوئے درمیان میں واقع ہے اور اسکندریہ سرزمین مصر میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل صرف اپنی مساجد اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے اور وہ ظاہر تھے، پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا گیا تو فرعون نے بنی اسرائیل کی مساجد کے بارے میں حکم دیا اور تمام کی تمام گرا دی گئیں اور انہیں نماز سے روک دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ دونوں بنی اسرائیل کے لیے مصر میں چند گھر بنائیں اور پسند کریں، اللہ تعالیٰ نے رہائشی گھر مراد نہیں لیے۔ یہ قول ابراہیم، ابن زید، ربیع، ابی مالک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: تم اپنے گھر بناؤ جو بعض بعض کے بالمقابل ہوں، آمنے سامنے ہوں۔ پہلا قول اصح ہے، یعنی تم قبلہ رخ اپنی مساجد بناؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ بیت المقدس ہے اور وہی آج تک یہودیوں کا قبلہ ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد کعبہ معظمہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ کعبہ معظمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (1) اور ان کے ساتھیوں کا قبلہ تھا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ نماز میں قبلہ (رخ ہونا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی۔ (لہٰذا) نماز میں طہارت، ستر عورت اور قبلہ سمت منہ کرنے کی شرط لگانے سے اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تکلیف اور پابندی تک زیادہ پہنچانے والی ہیں اور عبادت کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے تم اپنے گھروں میں چھپ کر نماز پڑھو تا کہ تم امن میں رہو۔ اور یہ اس وقت ہوا جب فرعون نے انہیں خوفزدہ کیا تو انہیں صبر اختیار کرنے اور گھروں میں مساجد بنانے کا حکم دیا گیا اور نماز اور دعا کا اقدام کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما دے۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے: قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا الآیہ (الاعراف: 128) (فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و استقامت سے کام لو) اور ان کے دین میں سے یہ تھا کہ وہ فقط عبادت گاہوں اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے جب تک وہ امن و سلامتی میں رہے اور جب انہیں خوف لاحق ہوا تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: دونوں قولوں میں سے پہلا زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ دوسرا تو دعویٰ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قولہ دعوی یہ صحیح ہے، کیونکہ صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرے لیے زمین کو مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے''۔ اور یہ ان میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے نہ کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، پس ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے ساتھ مساجد اور گھروں میں نماز پڑھتے ہیں اور ہر اس جگہ جہاں نماز (کا وقت) ہمیں پالے، مگر گھروں میں نفل نماز ادا کرنا مساجد میں پڑھنے کی نسبت افضل ہے، یہاں تک کہ جمعہ سے پہلے اور بعد کی

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 176

رکعتیں بھی۔ اور فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں (بھی دیگر نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے) کیونکہ نوافل میں ریا کا امکان ہوتا ہے اور فرائض میں اس کا امکان نہیں ہوتا۔ اور جب بھی کوئی عمل ریا سے خالص اور پاک ہو تو وہ زیادہ وزنی اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والا ہوتا ہے۔

مسلم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شقیق سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا، میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نفل نماز کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے حجرہ میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ مسجد میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز ادا فرماتے تھے، پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ لوگوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے اور میرے حجرہ میں تشریف لاتے اور دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے..... الحدیث''۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں، پس جہاں تک مغرب، عشاء اور جمعہ کا تعلق ہے تو میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ کے کاشانہ اقدس میں نماز پڑھی ہے۔ اور ابو داؤد نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی اشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور اس میں مغرب کی نماز پڑھائی۔ پس جب وہ اپنی نماز پوری کر چکے تو آپ نے انہیں اس کے بعد نفل پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ گھروں میں پڑھی جانے والی نماز ہے''۔(1)

مسئلہ نمبر 3۔ اس باب میں قیام رمضان کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، کیا گھر میں رمضان کی تراویح ادا کرنا افضل ہے یا مسجد میں؟ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے اس کے لیے گھر میں قیام کرنا افضل ہے جو اس کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور یہی امام ابو یوسف اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن عبدالحکم، امام احمد اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ انہیں جماعت کی صورت میں پڑھنا افضل ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: اگر لوگ اپنے گھروں میں قیام کریں اور کوئی بھی مسجد میں قیام نہ کرے تو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس (مسجد) کی طرف نکلیں۔ امام مالک اور جس نے یہ قول کیا ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے، کیونکہ فرض نماز کے سوا آدمی کی بہترین نماز اس کے گھر میں ہے''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

مخالف کا استدلال یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں جماعت کے ساتھ یہ نماز پڑھائی، پھر اس مانع کے بارے بھی بتایا جس نے آپ کو اس پر دوام اختیار کرنے سے روک دیا اور وہ ان پر فرض ہونے کا خوف اور اندیشہ تھا پس اسی لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب رکعتی المغرب این تصلیان، حدیث نمبر 1106، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما ذکر فی الصلاۃ بعد المغرب، حدیث نمبر 549، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: فعلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم (پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے) پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسجد میں متفرق گروہوں کی صورت میں نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک قاری پر جمع کر دیا اور اسی پر یہ امر پختہ ہو گیا اور سنت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور جب ہم اس پر آ چکے ہیں کہ ان کے لیے اپنے گھروں میں نماز پڑھنا مباح ہے جب کہ انہیں اپنے آپ پر خوف اور خطرہ ہو تو پھر اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ معذور آدمی کے لیے خوف کے ساتھ اور خوف کے بغیر دونوں حالتوں میں جماعت اور جمعہ ترک کرنا جائز ہے۔ اور وہ عذر جو اس کو مباح قرار دیتا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً وہ بیماری جو روکنے والی ہو یا خوف کا زیادہ ہونا یا مال یا بدن میں بغیر کسی حق کے فیصلے کے حاکم وقت کے ظلم کا خوف ہونا اور موسلا دھار بارش کیچڑ کے ساتھ یہ بھی عذر ہے اگر وہ نہ رکے اور وہ آدمی جس کے لیے وہ قریبی ولی ہے وہ قریب المرگ ہو جائے اور اس کے پاس اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ ہو (تو یہ بھی ایک عذر ہے) تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ کہا گیا ہے: یہ خطاب حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ اور یہ زیادہ واضح اور بین ہے، یعنی بنی اسرائیل کو بشارت دے دو کہ عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دشمن پر غالب کر دے گا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۸۸﴾

''اور عرض کی موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! تو نے بخشا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامان آرائش اور مال و دولت دنیوی زندگی میں اے ہمارے مولا! کیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرتے پھریں (لوگوں کو) تیری راہ سے۔ اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو تاکہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ اس میں اٰتَیْتَ بمعنی اعطیت (تو نے عطا کیا ہے) زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی مال دنیا، ان کے لیے فسطاط مصر سے لے کر سرزمین حبشہ تک ایسے پہاڑ تھے جن میں سونے، چاندی، زبرجد، زمرد اور یاقوت کی کانیں تھیں۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ اس لام کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کہا گیا ہے اصح وہ ہے جو خلیل اور سیبویہ کا قول ہے وہ یہ کہ لام برائے عاقبت اور صیرورت ہے۔ اور حدیث میں ہے ''بے شک اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو ہر روز ندا دیتا ہے جنو موت کے لیے اور بناؤ ویران اور خراب ہونے کے لیے'' یعنی جب ان کے معاملہ کا انجام گمراہی ہے تو وہ اس طرح ہو گیا گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا کہ وہ گمراہ ہو جائیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے یعنی میں نے انہیں (مال) دیا تا کہ وہ گمراہ ہوں اور رعونت و تکبر اختیار کریں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام اجل ہے یعنی میں نے انہیں عطا کیا ان کے آپ سے اعراض کرنے کی وجہ سے کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں کہ ان سے اعراض کر لیا گیا ہے۔ اور ایک قوم نے گمان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: میں نے انہیں یہ اس لیے دیا ہے تا کہ وہ گمراہ نہ ہوں۔ پھر لا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے (اعطیتم ذالك لئلا یضلوا، فخذفت لا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء:176) اس کا معنی ہے لان لا تضلوا (تا کہ تم گمراہ نہ ہو)

نحاس نے کہا ہے: ظاہراً یہ جواب اچھا ہے، مگر عرب ان کے بغیر صرف لا کو حذف نہیں کرتے۔ اور اس جواب والے نے قول باری تعالیٰ: اَنْ تَضِلُّوْا کے بارے میں محض بناوٹ کی ہے (یعنی جھوٹ بولا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام دعا کے لیے ہے، یعنی تو انہیں اپنے راستے سے گمراہ کر کے آزما، کیونکہ اس کے بعد یہ ارشاد ہے: اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ (برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فعل مصدر کے معنی میں ہے یعنی اضلالھم

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ (توبہ:95) (یعنی یہ بمعنی اعراضھم ہے) اور کوفیوں نے لیضلوا یاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضلال سے ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ یعنی انہیں ان کے کفر پر ان کے مالوں کو ہلاک و برباد کر کے سزا دے۔ زجاج نے کہا ہے: طمس الشیء کا معنی ہے کسی چیز کو اپنی اصل صورت سے ختم کر دینا (شکل بگاڑ دینا)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: ان کے اموال اور ان کے دراہم منقش پتھر بن گئے جیسا کہ ان کی ہیئت تھی مکمل، تہائی اور نصف۔ اور ان کی کوئی معدن باقی نہ رہی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے مٹا دیا اور اس کے بعد کوئی اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ان کے اموال اور ان کی کھیتیاں پتھر ہو گئیں۔ اور حضرت مجاہد اور حضرت عطیہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا یہاں تک کہ وہ دکھائی نہ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے: عین مطموسۃ (ایسی آنکھ جس کی بینائی جاتی رہے) اور طمس الموضع جب کسی جگہ کو مٹا دیا جائے بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے دنانیر و دراہم، ان کے قالین اور ان کی ہر شی پتھر ہو گئی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: ان میں سے ایک آدمی اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے بستر میں تھا اور وہ دونوں پتھر ہو گئے۔ بیان کیا: حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس کے بارے آپ کو ذکر کیا تو آپ نے ایک تھیلا منگایا جو مصر سے لایا گیا تھا تو آپ نے اس سے پھل، دراہم اور دنانیر نکالے اس حال میں کہ وہ سب پتھر تھے اور علامہ سدی نے کہا ہے یہ نو معجزات میں سے ایک تھا۔ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تو انہیں ایمان لانے سے روک دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو انہیں (ان کے دلوں کو) سخت کر دے اور ان پر مہر لگا دے تا کہ وہ ایمان کے لیے کھل نہ سکیں۔ اس کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے۔ فَلَا یُؤْمِنُوْا کہا گیا ہے: اس کا عطف لِیُضِلُّوْا پر ہے۔

ای آتیتھم النعم لیضلوا ولا یومنوا (یعنی میں نے انہیں سامان دنیا عطا فرمایا تا کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور ایمان نہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 262

لائیں) یہ زجاج اور مبرد نے کہا ہے: اس بنا پر اس میں دعا کے معنی میں سے کوئی شے نہ ہوگی۔ اور قولہ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ کلام معترض ہوگا اور فراء اور کسائی اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ دعا ہے، پس وہ ان کے نزدیک جزم کے محل میں ہے۔ ای اللھم فلا یؤمنوا (اے اللہ! پس چاہیے کہ وہ ایمان نہ لائیں) یعنی پس وہ ایمان نہ لائے۔ اور اس سے اعشٰی کا قول ہے:

فلا ینبسطْ من بین عینَیْك ما انزَوی　　ولا تَلْقَنی الا وأنفُسك راغِمُ

یعنی لا أنبسط ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ لِيَضِلُّوا دعا ہے یعنی تو انہیں گمراہی میں مبتلا کردے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر فلا یؤمنوا کا عطف کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے ای واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا (تو ان کے دلوں کو سخت کردے تاکہ وہ ایمان نہ لائیں) یہ قول اخفش اور فراء کا بھی ہے۔ اور فراء نے یہ شعر بھی کہا ہے:

یا　ناق　سیری　عَنَقًا　فسیحا　إلی　سلیمان　فنستریحا

پس اسی بنا پر فلا یؤمنوا میں نون کو حذف کردیا گیا ہے، کیونکہ وہ منصوب ہے۔ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہی فرق ہے۔ تحقیق بعض لوگوں نے اس آیت میں اشکال ظاہر کیا ہے اور کہا ہے: یہ ان کے لیے بددعا کیسے ہوسکتی ہے حالانکہ رسل علیہم السلام کو تو حکم اپنی قوم کے ایمان لانے کی دعا کرنے کا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کہ کوئی نبی علیہ السلام اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بددعا کرے اور اس اطلاع کے بغیر کہ ان میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لائے گا اور نہ ان کی پشتوں سے کوئی ایسا نکلے گا جو ایمان لائے گا، اس کی دلیل حضرت نوح علیہ السلام (کی طرف وحی کیا گیا اللہ تعالیٰ) کا یہ قول ہے: اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لاچکے) اور اس وقت آپ نے یہ دعا مانگی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ ، الآیہ (نوح) واللہ اعلم (اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا)

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قبول کرلی گئی تمہاری دعا پس تم ثابت قدم رہو اور ہرگز نہ چلنا اس طریقہ پر جو جاہلوں کا (طریقہ) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا ابوالعالیہ نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہی، چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا پر امین کہی اسی وجہ سے انہیں داعی (دعا مانگنے والا) کہا گیا اور التامین علی الدعاء کا معنی آمین کہنا ہے۔ اور تیرا قول ''آمین'' یہ بھی دعا ہے، یعنی اے میرے پروردگار! میرے لیے اسے قبول فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دعا بھی کی۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: یہ اس قبیل میں سے ہے جس میں عرب واحد کو خطاب تثنیہ کے صیغے کے ساتھ خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فقلت لصاحبی لا تعجلانا بنزع أصوله فأجتز شیحا

یہ اس بنا پر ہے کہ آمین دعا نہ ہو اور یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا نہ کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اس پر دلیل کہ دعا دونوں نے کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ربنا ہے کیونکہ آپ نے رب (اے میرے رب) نہیں کہا۔ اور علی اور سلمی نے دعواتکما پڑھا ہے اور اس کے بعد دعوتکو نصب دی ہے۔ اور آمین کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الفاتحہ کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو خاص کیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں اسلام اور اہل جنت کا تحیہ اور سلام ہے اور ملائکہ کا صفیں بنانا اور آمین مگر یہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے پاس بھی تھی“ (1)۔ اسے حکیم ترمذی نے ”نوادر الاصول“ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِيْمَا فراء وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں کو اپنے امر پر استقامت اختیار کرنے اور فرعون اور اس کی قوم کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے معاملہ میں ثابت قدم رہنے کا حکم ہے یہاں تک کہ دونوں پر دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہو جائے۔ محمد بن علی اور ابن جریج نے کہا ہے: فرعون اور اس کی قوم اس دعا کے قبول ہونے کے بعد چالیس برس تک باقی رہے پھر ہلاک کر دیے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: استقیماتم دونوں دعا پر استقامت اختیار کرو۔ اور دعا میں استقامت کا معنی حصول مقصود میں جلدی کرنے کو ترک کرنا ہے اور یہ جلدی کا مطالبہ دل سے زائل نہیں ہوتا مگر اس میں راحت اور سکون کے آنے کے ساتھ اور وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا مگر اس سب کے ساتھ حسن رضامندی کے ساتھ جو غیب سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ نون مشددہ کے ساتھ ہے اور صیغہ نہی ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور نون تو کید ہے اور اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دی گئی ہے اور اس کے لیے کسرہ کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نون تثنیہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن ذکوان نے نفی کی بنا پر نون کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استقیما سے حال ہے ای استقیما غیر متبعین اور اس کا معنی ہے تم دونوں اس کے راستے پر نہ چلو جو میرے وعدہ اور وعید کی حقیقت کو نہیں جانتا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

”اور ہم پار لے گئے بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے حتیٰ کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو (بصد یاس) کہنے لگا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 185

کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل اور (میں اعلان کرتا ہوں کہ) میں مسلمانوں میں سے ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں اس قول وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (البقرہ:50) کے تحت گزر چکی ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے وجوزنا قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ کہا جاتا ہے: تبع اور اتبع دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جب کوئی پیچھے سے جا ملے اور اسے پا لے اور اتبع (تشدید کے ساتھ) جب کوئی کسی کے پیچھے چلے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: اتبعہ (ہمزہ قطعی کے ساتھ) جب وہ اسے پیچھے سے جا ملے اور اسے پا لے۔ اور اتبعہ (ہمزہ وصلی کے ساتھ ہو) جب وہ اس کے پیچھے چلے چاہے اسے پائے یا نہ پائے۔ اور اسی طرح ابوزید نے کہا ہے۔ اور قتادہ نے فَاتَّبَعَهُمْ ہمزہ وصل کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اتبعہ (ہمزہ وصل کے ساتھ ہو) فی الامر یعنی اس نے کام میں اس کی اقتدا کی۔ اور اتبعہ (ہمزہ قطعی کے ساتھ ہو) خیرا و شرا (اور اس نے خیر یا شر میں اس کی اتباع کی) یہ ابوعمرو کا قول ہے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور ان کی تعداد چھ لاکھ بیس ہزار تھی اور فرعون صبح کے وقت چھبیس لاکھ کا لشکر لے کر ان کے پیچھے نکلا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ بغیا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّ عَدْوًا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی سرکشی اور ظلم و زیادتی کی حالت میں (نکلا)۔ کہا جاتا ہے: عدا یعدو عدوا جیسا کہ غزا یغزو غزوا ہے۔ اور حسن نے وعدوا یہ عین اور دال کے ضمہ کے ساتھ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ ہے، جیسے علا یعلو علوا ہے۔

اور مفسرین نے کہا ہے: بغیا کا معنی ہے قول میں بغیر حق کے بلندی اور غلبے کا طالب ہونا۔ وعدوا فعل میں (غلبے کا طالب ہونا) اور یہ دونوں مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ یہاں تک کہ جب غرق نے اسے پا لیا اور اس تک پہنچ گیا (مراد یہ کہ وہ ڈوبنے لگا) قَالَ اٰمَنْتُ تو کہنے لگا میں نے تصدیق کی۔ اَنَّهٗ یعنی بأنه، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ پس جب حرف جار حذف کر دیا گیا تو فعل متعدی ہوا اور اس نے اسے نصب دی اور اسے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی میں مومن ہو گیا پھر یہ نیا کلام ہے۔ اور ابوحاتم کا خیال یہ ہے کہ قول محذوف ہے، یعنی أمنت فقلت أنه اور اس وقت کا ایمان نفع بخش ثابت نہیں ہوتا اور توبہ وہ مقبول ہوتی ہے جو عذاب دیکھنے سے پہلے ہو اور رہی وہ توبہ جو عذاب دیکھنے یا اس کے آجانے کے بعد ہو تو وہ قبول نہیں کی جاتی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک فرعون سمندر میں داخل ہونے سے ڈر گیا وہ سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی بھی مونث گھوڑا نہ تھا، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام ہامان کی صورت میں انتہائی شہوت والی گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور اسے کہا: آگے بڑھ، پھر وہ سمندر میں اتر گئے اور اس کے پیچھے فرعون کا گھوڑا بھی اتر گیا۔ اور حضرت میکائیل علیہ السلام انہیں پیچھے سے ہانکتے رہے تاکہ ان میں سے کوئی بھاگ نہ جائے۔ پس جب ان میں سے آخری آدمی سمندر میں اتر گیا اور ان کے پہلے نے باہر نکلنے کا قصد کیا تو ان پر سمندر رل گیا اور پانی فرعون کو منہ تک آگیا تو اس نے کہا: میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے۔ تو حضرت جبرئیل علیہ

السلام نے اس کے منہ میں سمندر کی مٹی ڈال دی۔(1)

اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا: میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کاش تم مجھے دیکھتے اس حال میں کہ میں سمندر کی مٹی لے رہا ہوں اور اسے اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اس ڈر اور خوف سے کہ رحمت اسے پالے گی''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔(2)

حال البحر سے مراد وہ سیاہ مٹی ہے جو سمندر کی تہہ میں ہوتی ہے۔ یہ اہل لغت نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ یہ ذکر کیا گیا ہے: ''حضرت جبرائیل علیہ السلام فرعون کے منہ میں مٹی دینے لگے اس ڈر اور خوف سے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگے اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمادے یا اس خوف سے کہ وہ اس پر رحم کردے''۔ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے(3)۔ اور عون بن عبداللہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا: ابلیس نے میرے نزدیک فرعون سے زیادہ مبغوض کسی کو جنم نہیں دیا، کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے کہا ''میں ایمان لایا'' الآیہ۔ تو مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ یہ کلمہ کہے اور اس پر رحم ہو جائے، تو میں نے مٹی اٹھائی اور اسے اس کے منہ میں دبا دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے ساتھ اس عمل کی سزا کے طور پر کیا گیا جو وہ انتہائی سرکشی کا عمل کر رہا ہے۔ اور کعب الاحبار نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے میں دریائے نیل کو چلنے سے روک لیا، تو قبطی نے اس کو کہا: اگر تو ہمارا رب ہے تو ہمارے لیے پانی جاری کردے، پس وہ سوار ہوا اور اپنے لشکر کو آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور وہ اپنے درجات پر ٹھہرنے لگے اور وہ وہاں بیٹھ گیا جہاں وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور اپنی سواری سے نیچے اترا اور اپنا دوسرا لباس پہنا اور سجدہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی خشوع وخضوع اور زاری کی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پانی جاری کردیا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس آئے اس حال میں کہ وہ اپنی ہی حالت پر اکیلا تھا اور اس سے فتویٰ طلب کرنے لگے: امیر اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا ہے جس کا ایک غلام ہے اور وہ اس کے احسان اور نعمت میں ہی پروان چڑھا اور اس کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں، پھر اس نے اس کی نعمت کی ناشکری کی اور اس کے حق کا انکار کردیا اور اس نے اس کے سوا کسی کے سردار ہونے کا دعویٰ کردیا۔ پس فرعون نے لکھ دیا: ابوالعباس الولید بن مصعب بن ریان کہتے ہیں اس کی سزا یہ ہے کہ اسے سمندر میں غرق کردیا جائے۔ پس حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے لے لیا اور چلے گئے پس جب وہ ڈوبنے لگا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کا لکھا ہوا اسے دے دیا۔ یہ سورۃ البقرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مسند روایت کے ساتھ گزر چکا۔ اور یہ عاشورا کا دن تھا۔ اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ
2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ یونس، حدیث نمبر 3032، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 3033

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ یعنی موحدین میں سے ہوں اور طاعت و پیروی کے ساتھ تسلیم کرنے والوں میں سے ہوں۔

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

''کیا اب؟ اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور تو فتنہ و فساد برپا کرنے والوں سے تھا''۔

کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت میکائیل علیہ السلام کا قول ہے یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور فرشتے کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرعون کا اپنی ذات کے بارے میں قول ہے۔ اور وہاں زبان کے ساتھ یہ قول نہیں ہوا بلکہ یہ اس کے دل میں واقع ہوا ہے پس اس نے اپنے دل میں کہا ہے جو کہا ہے اس حیثیت سے کہ ندامت نے اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور اس کی نظیر یہ ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر: 9) اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے اس کے سبب جو ان کے دلوں میں مخفی تھا، نہ کہ انہوں نے یہ اپنے لفظوں میں کہا اور حقیقی کلام دل کا کلام ہی ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

''سو آج ہم بچا لیں گے تیرے جسم کو (سمندر کی تند موجوں سے) تا کہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی) نشانی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ یعنی ہم تجھے زمین کے ایک بلند حصے پر پھینک دیں گے اور یہ اس لیے کہا کیونکہ بنی اسرائیل تصدیق نہ کرتے کہ فرعون غرق ہو چکا ہے۔ اور وہ کہتے: اس کی شان اس سے کہیں زیادہ اور عظیم ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اسے زمین کے ایک بلند حصہ پر پھینک دیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا مشاہدہ کر لیا۔ اوس بن حجر بارش کا وصف بیان کرتا ہے۔

فَمَن بَعقوتَه كمن بنَجْوَته والمُسْتَكِن كمَنْ يَمْشِي بِقِرْ واحِ

یزیدی اور ابن السمیقع نے ننحیك حا کے ساتھ پڑھا ہے یہ تحیة سے ماخوذ ہے اور اسے علقمہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، یعنی تو سمندر کے کنارے پر ہوگا۔ ابن جریج نے کہا ہے: پس اسے ساحل سمندر پر پھینک دیا گیا یہاں تک کہ اسے بنی اسرائیل نے دیکھ لیا، وہ چھوٹے قد کا اور سرخ رنگ کا تھا گویا کہ وہ بیل ہے۔ علقمہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بندائك پڑھا ہے اور یہ النداء سے ماخوذ ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: اور یہ ہمارے مصحف کے حروف ہجا کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے یا اور دال کے بعد کاف سے لکھا جائے، کیونکہ مصحف کے خط کی ترتیب میں ندائك سے الف گر جاتا ہے جیسا کہ ظلمات اور سموات سے ساقط ہو گیا ہے، پس جب اس میں حذف واقع ہوا تو بدنك اور ندائك کے حروف ہجا برابر ہو گئے، اسی بنا پر اس قراءت سے اعراض برتا گیا ہے، کیونکہ یہ شاذ ہے اور جو عام مسلمانوں کی قراءت ہے وہ اس کے خلاف ہے، قراءت سنت ہے اسے بعد میں آنے والا پہلے سے لیتا ہے اور ہماری قراءت کی تاویل کے سبب اس کے معنی میں نقص ہے، کیونکہ اس میں زرہ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور وہ معنی جس کے بارے مسلسل آثار

ہیں وہ یہ ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بارے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ انہیں غرق شدہ فرعون دکھائے چنانچہ انہوں نے اسے زمین کے بلند حصہ پر اس کے بدن سمیت پا لیا اور یہ اس کی وہ زرہ ہے جو وہ جنگوں میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اس کی زرہ پروئے ہوئے موتیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سونے کی تھی اور وہ اسی کے سبب پہچانا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ لوہے کی تھی۔ ابو الصخر نے کہا ہے: البدن سے مراد چھوٹی سی زرہ ہے۔

اور ابو عبیدہ نے اعشیٰ کا شعر بیان کیا ہے:

وبيضاء كالنِّهْي مَوْضُونة لها قَوْنَس فوق جَيْب البَدَنْ

اور عمرو بن معدیکرب کا بھی شعر بیان کیا ہے:

ومضى نساءهم بكل مُفاضةٍ جَدْلَاء سابغةٍ وبالأبدانِ

اور کعب بن مالک نے کہا ہے:

ترى الأبدان فيها مسبغات على الأبطال واليَلَب الحصِينا

اس میں ابدان سے مراد زرہیں ہیں اور یلب سے مراد یمنی زرہیں ہیں، یہ چمڑے سے بنائی جاتی تھیں اسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سیا جاتا تھا۔ اور یہ اسم جنس ہے اس کا واحد یلبة ہے عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

علينا البيضُ واليَلَبُ اليماني وأسيافٌ يُقمن و يَنْحَنِينا

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ببدنك سے مراد وہ جسم ہے جس میں روح نہ ہو۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: رہا ان کا قول جنہوں نے بدرعك (تیری زرہ کے ساتھ) تو یہ کوئی شے نہیں ہے۔ ابوبکر نے کہا ہے: کیونکہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زاری کی اور غرق شدہ فرعون کو دیکھنے کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لیے ظاہر کر دیا اور انہوں نے وہ جسم دیکھ لیا جس میں روح نہ تھی، پس جب بنی اسرائیل نے اسے دیکھ لیا تو کہا: ہاں، اے موسیٰ! یہ فرعون ہی ہے اور غرق کر دیا گیا ہے۔ پس ان کے دلوں سے شک نکل گیا اور سمندر نے فرعون کو نگل لیا جیسے وہ پہلے تھا۔ اس بنا پر نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے؟ ایک یہ ہے کہ ہم تجھے زمین کے بلند حصے پر پھینک دیں گے اور دوسرا یہ کہ ہم نے تیرے اس جسم کو ظاہر کر دیں گے جس میں روح نہیں۔ اور شاذ قراءت بندائك اس کا معنی جمہور کی قراءت کے معنی کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ ندا کی دو تفسیریں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے ہم تجھے تیرے کلمہ توبہ کہنے کے سبب بلند جگہ پر ڈال دیں گے اور تیرے اس قول کے سبب جو اس کا دروازہ بند ہونے کے بعد اور اس کے قبول ہونے کا وقت گزر جانے کے بعد تو نے کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آج ہم تجھے سمندر کی گہرائی سے تیری ندا کے سبب جدا کر دیں گے جو تو نے یہ کہا: أنا ربكم الأعلى پس اسے بدن سمیت نجات دینا رب العالمین کی طرف سے بطور سزا تھا اس کے اس کفر میں انتہائی غلو اور زیادتی کرنے کے سبب جس میں اس نے اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا اور مبہوت ہو

گیا۔ اور قدرت اور ایسے امر کا دعویٰ کیا جس کے بارے وہ جانتا تھا کہ وہ اس میں جھوٹ بول رہا ہے، اس سے عاجز ہے اور اس کا مستحق نہیں ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا ہے: پس ہماری قراءت ان معانی کو متضمن ہے جو قرأت شاذہ میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان سے زائد کو بھی متضمن ہے۔ قولہ تعالیٰ: لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً یعنی بنی اسرائیل کے لیے اور قوم فرعون کے ان باقی ماندہ لوگوں کے لیے جو غرق نہیں ہوئے اور ان تک یہ خبر نہیں پہنچی۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ یعنی بہت سے لوگ ہماری آیات میں غور و فکر کرنے اور ان میں سوچ و بچار کرنے سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور لِمَنْ خَلْفَكَ لام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی ان کے لیے جو تیرے بعد باقی رہیں گے اور تیری زمین میں تیرے پیچھے آئیں گے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لمن خلقك قاف کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی تاکہ تو اپنے خالق کی نشانی ہو جائے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

”اور ہم نے عطا فرمایا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق بخشا، پس انہوں نے اختلاف نہ کیا حتیٰ کہ آ گیا ان کے پاس حقیقت کا علم (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت جن باتوں میں وہ جھگڑا کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ قابل ستائش اور بہترین ٹھکانا عطا فرمایا، مراد مصر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اردن اور فلسطین ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ مصر اور شام ہے۔ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق یعنی پھل وغیرہ عطا فرمایا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد قریظہ، نضیر اور بنی اسرائیل میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لوگ ہیں، کیونکہ وہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لاتے تھے اور آپ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ آپ کے ساتھ حسد کرنے لگے اور اسی لیے فرمایا: فَمَا اخْتَلَفُوْا پس انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے معاملہ میں اختلاف نہ کیا۔ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ یہاں تک کہ ان کے پاس قرآن کریم اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ اس میں علم بمعنی معلوم ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو آپ کے خروج سے پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ علامہ ابن جریر طبری نے کہا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ یعنی آپ کا رب ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور فرق کر دے گا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ قیامت کے دن جن باتوں میں وہ دنیا میں جھگڑا کیا کرتے تھے، پس وہ طاعت کرنے والے کو ثواب دے گا اور نافرمانی کرنے والے کو سزا دے گا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور (اے سننے والے!) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے ذریعے) تیری طرف اتارا تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بے شک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے۔ اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کے سوا دوسرے ہیں، یعنی آپ تو شک میں نہیں ہیں لیکن آپ کے علاوہ دوسرے شک میں ہیں۔ ابو عمر محمد بن عبد الواحد الزاہد نے کہا ہے: میں نے دو اماموں ثعلب اور مبرد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ کا معنی ہے: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کافر کو فرما دیجئے کہ اگر تو اس سے متعلق شک میں ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی اے بتوں کی پوجا کرنے والے اگر تجھے قرآن کریم کے بارے میں کوئی شک ہے تو ان لوگوں سے دریافت کر لے جو یہود میں سے اسلام لا چکے ہیں، یعنی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور انہی کی مثل دیگر افراد کیونکہ بتوں کی پرستش کرنے والے یہودیوں کے بارے میں یہ اقرار کرتے تھے کہ وہ اس بارے ان سے زیادہ عالم ہیں، کیا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی اور رسول مبعوث فرمائے گا؟ اور قتبی نے کہا ہے: یہ خطاب ان کو ہے جو نہ یقین کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اور نہ تصدیق کرتے ہیں، بلکہ شک میں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خطاب سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے کوئی اور نہیں اور اس کا معنی ہے: اگر آپ کو کوئی شک لاحق ہو جائے اس بارے میں جس کے متعلق ہم نے آپ کو خبر دی ہے تو آپ اہل کتاب سے دریافت کر لینا میں آپ سے شک زائل کر دوں گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شک سے مراد سینے کی تنگی ہے، یعنی اگر آپ کا سینہ ان کے کفر کے سبب تنگ ہو جائے تو آپ صبر کیجئے۔ اور ان سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں وہ آپ کو بتائیں گے آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کی اذیت پر کیسے صبر کیا اور ان کے معاملے کا انجام کیا ہوا؟ لغت میں شک کا اصل معنی تنگی ہے۔ کہا جاتا ہے: شك الثوب یعنی وہ اس کے سوراخوں کو بند کر دے یہاں تک کہ وہ برتن کی طرح ہو جائے۔ اور اسی طرح مسافر کا توشہ دان ہے اس کے علائق (یعنی باندھنے کے دھاگے) کو کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بند ہو جائے، پس شک سینے کو بند کر دیتا ہے اور اسے سکیڑ دیتا ہے یہاں تک کہ وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: حروف شرط کے ساتھ فانہ فعل کو واجب کرتی ہے اور نہ اسے ثابت کرتی ہے، اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی: واللہ لا اشك قسم بخدا میں شک نہیں کرتا۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ یعنی شک کرنے والوں سے نہ ہو جانا۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ان دونوں آیتوں میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے

اور مراد کوئی اور ہے۔(1)

اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَوۡ جَآءَتۡہُمۡ کُلُّ اٰیَۃٍ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۹۷﴾

"بے شک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے، اگرچہ آجائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ اسی سورت میں اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی وہ لوگ جن پر ان کی معصیت اور گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور اس کی ناراضگی ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ لَوۡ جَآءَتۡہُمۡ کُلُّ اٰیَۃٍ اس میں کلا کو مونث ذکر کیا ہے اس لیے کہ اس کلام کا معنی یہ ہے۔ ولو جاءتھم الآیات (اگرچہ ان کے پاس نشانیاں آجائیں) حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے (لیکن) وہ انہیں نفع نہیں دے گا۔

فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَہَاۤ اِیۡمَانُہَاۤ اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا کَشَفۡنَا عَنۡہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ مَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾

"پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونس کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: فلولا بمعنی فھلا (پس کیوں ایسا نہ ہوا) ہے اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصحف میں فھلا ہی ہے۔ دراصل کلام میں لولا تخصیص (ابھارنے اور برانگیختہ کرنے) کے لیے آتا ہے یا غیر کے پائے جانے کی وجہ سے کسی کام سے روکنے پر دلالت کرنے کے لیے۔ اور آیت کے معنی سے بستی والوں کے ایمان کی نفی سمجھی جا رہی ہے پھر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی استثنا کی گئی ہے، پس یہ لفظ کے اعتبار سے تو استثنا منقطع ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے استثنا متصل ہے، کیونکہ اس کی تقدیر عبارت یہ ہے ما أمن أھل قریۃ إلا قوم یونس (یعنی بستی والوں میں سے سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کوئی ایمان نہ لایا) اور قوم کے منصوب ہونے کی یہی وجہ ہے اور اسی طرح سیبویہ نے اسے باب مالا یکون إلا منصوبا (یعنی ان کا بیان جو فقط منصوب ہوتے ہیں) میں داخل کیا ہے(2)۔ اور نحاس نے کہا ہے: اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ اسے نصب دی گئی ہے، کیونکہ یہ استثنا ہے جو اول (کلام میں) سے نہیں ہے۔ ای لکن قوم یونس (یعنی لیکن حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لائی) یہ کسائی، اخفش اور فراء کا قول ہے۔ اور یہ بھی

1۔ بغوی، (معالم التنزیل) زیر آیت ہذہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 143-144

جائز ہے کہ یہ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ رفع کے ساتھ ہو۔ اور رفع کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے احسن وہ ہے جو ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہوگا غیر قوم یونس، پس جب کلام الا کے ساتھ آیا تو اس کے مابعد اسم کو غیر کا اعراب دے دیا گیا، جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

وکلُّ أخٍ مفارِقه أخوه لَعَمْرُ أبیك إلّا الفَرْقدانِ

(اس میں الا بمعنی غیر ہے)

مفسرین کی ایک جماعت سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم موصل کی سرزمین میں نینویٰ کے مقام پر آباد تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا اور آپ انہیں اسلام کی طرف اور جن نظریات پر وہ تھے انہیں ترک کرنے کی دعوت دینے لگے لیکن انہوں نے انکار کیا۔ پس کہا گیا ہے کہ بے شک آپ علیہ السلام انہیں نو سال تک دعوت دیتے رہے بالآخر آپ ان کے ایمان سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔ تو آپ کو کہا گیا: آپ انہیں اطلاع کریں کہ تین دن تک ان پر عذاب آنے والا ہے چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور وہ کہنے لگے: یہ آدمی جھوٹ نہیں بولتا ہے پس تم اس کی تاک میں رہو پس اگر یہ تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان مقیم رہے تو پھر تم پر کچھ بھی نہیں آئے گا اور اگر یہ تم سے کوچ کر جائے (نکل جائے) تو بلاشک وہی عذاب کے نازل ہونے کا وقت ہوگا۔ پس جب رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام نے زادِ راہ لیا اور ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی تو آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگے اور انہوں نے ٹاٹ پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں میں سے ماؤں اور بچوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس حالت میں انہوں نے مظالم چھوڑ دیئے۔(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ایک آدمی پتھر لا رہا تھا اور اس پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھتا تو وہ اسے اکھیڑنے لگا اور اسے رد کرنے لگا۔ جو کچھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اس کے مطابق عذاب ان سے ایک میل کے دو تہائی فاصلے پر تھا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہیں بادل نے ڈھانپ لیا اور اس میں سرخی تھی پس وہ مسلسل قریب آ رہا تھا کہ وہ اس کی گرمی اپنے کندھوں کے درمیان پانے لگے۔ اور حضرت ابن جبیر نے بیان کیا ہے: عذاب نے انہیں اس طرح ڈھانپ لیا جیسے کپڑا قبر کو ڈھانپ لیتا ہے، پس جب انہوں نے صحیح توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب اٹھا لیا۔ اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے: تمام امتوں میں سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا یہ خاصا ہے کہ عذاب کا معائنہ کر لینے کے بعد ان پر رحمت کی توجہ کی گئی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔ اور انہوں نے اسے مفسرین کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: بے شک ابھی ان پر عذاب واقع نہیں ہوا تھا، بلکہ انہوں نے فقط اس علامت اور نشانی کو دیکھا تھا جو عذاب پر دلالت کرتی ہے اور اگر وہ عین عذاب کو دیکھ لیتے تو پھر ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: زجاج کا قول اچھا ہے، کیونکہ وہ مشاہدہ جس کے ساتھ توبہ نفع بخش نہیں ہوتی وہ عذاب کے ساتھ

1۔ تفسیر الطبری، المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ملتبس ہونا اور اس میں واقع ہو جانا ہے جیسا کہ فرعون کا واقعہ ہے۔ اور اسی لیے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا واقعہ فرعون کے قصہ کے پیچھے ذکر ہوا کیونکہ وہ اس وقت ایمان لایا جب اس نے عذاب دیکھ لیا پس وہ اس کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہوا اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے اس سے پہلے توبہ کر لی۔ اور اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی تقویت دیتا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک غرغر کی آواز نہ نکلے''۔ اور الغرغرۃ کا معنی ہے جان کنی کے وقت سانس کا غرغرانا۔ اور یہ موت کے ساتھ ملنے کی حالت ہوتی ہے۔ اور اس سے پہلے اس طرح نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

اور جو معنی ہم نے بیان کیا ہے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب ان سے تین دن تک عذاب آنے کا وعدہ کیا اور آپ ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی اور آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور انہوں نے ماؤں کو اپنے بچوں سے علیحدہ کر دیا(1)۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی توبہ عذاب کی علامت دیکھنے سے پہلے ہوئی۔ عنقریب سورۂ والصافات میں اس کا واضح اور کھلا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

اور كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ کا معنی ہوگا یعنی ہم نے ان سے وہ عذاب دور کر دیا جس کے بارے حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان پر نازل ہوگا، نہ یہ کہ انہوں نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور نہ یہ کہ انہیں اس کا خیال تھا۔ اس بنا پر اس میں نہ کوئی اشکال ہے، نہ تعارض اور نہ ہی کوئی خصوصیت ہے واللہ اعلم۔ المختصر یہ کہ نینویٰ کے باسی اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں سعادت مند تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بے شک خوف اور ڈر تقدیر کو رد نہیں کرتا، بلکہ دعا تقدیر کو رد کر دیتی ہے، یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عاشوراء کا دن تھا (یعنی دسویں محرم)

قولہ تعالیٰ: وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ کہا گیا ہے: اور ہم نے انہیں ان کی مقررہ مدت تک لطف اندوز ہونے دیا۔ یہ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: اور ہم نے انہیں لطف اندوز ہونے دیا اس وقت تک کہ وہ جنت کی طرف چلے جائیں یا جہنم کی طرف۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾

''اور اگر چاہتا آپ کا رب تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب، کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا یعنی وہ ان تمام کو ایمان لانے پر مجبور کر دیتا۔ كُلُّهُمْ، من کی تاکید ہے اور جَمِيْعًا سیبویہ کے نزدیک حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے کہ جمعیا کا لفظ بھی کل کے بعد تاکید کے لیے آیا ہے، جیسا کہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (النحل: 51) (یعنی اس میں اثنین الہین کی تاکید کے لیے ہے) قولہ تعالیٰ: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

1۔ تفسیر الطبری، جلد 12، صفحہ 296

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے ایمان لانے کے حریص تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ کوئی ایمان نہیں لا سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے سعادت مند ہو اور کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے شقی ہو (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد ابو طالب ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

''اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں کہ وہ ایمان لا سکے بغیر حکم الٰہی کے۔ اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ ڈالتا ہے (گمراہی کی) آلودگی ان لوگوں پر جو بے سمجھ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اس میں ما نافیہ ہے، یعنی یہ مناسب نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور اس کی مشیت و ارادہ کے بغیر ایمان لا سکے۔ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ حسن، ابوبکر اور مفضل نے ونجعل تعظیم کے لیے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اس کی دو لغتیں ہیں۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ یعنی ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو نہیں سمجھتے۔ (2)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یہ کفار کے لیے ان مصنوعات میں غور و فکر اور تدبر کرنے کے بارے امر ہے جو صانع پر اور اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بارے میں مکمل بحث کئی مقامات پر پہلے گزر چکی ہے۔ وَ مَا تُغْنِي یہ ما نافیہ ہے ای ولن تغنی (یعنی آیتیں ہرگز فائدہ نہیں پہنچائیں گی) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما استفہامیہ ہے اور تقدیر کلام ہے أی شیء تغنی (کون سی شے کا نفع آیات پہنچا سکتی ہیں)

الْاٰيٰتُ مراد دلالات اور نشانیاں ہیں۔ وَ النُّذُرُ یعنی رسل علیہم السلام اور یہ نذیر کی جمع ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اس قوم کو جن کے بارے پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

''پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات کا جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے، آپ فرمایئے اچھا انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ یہاں ایام سے مراد واقعات ہیں یعنی بمعنی وقائع

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 298 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 370

ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان عالم بایام العرب یعنی فلاں عرب میں پیش آنے والے واقعات کا عالم ہے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ میں پیش آئے۔ اور عرب عذاب اور انعام دونوں کو ایام کا نام دیتے ہیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (ابراہیم: 5) اور ہم وہ جو خیر و شر میں سے گزر چکا ہے وہی ایام ہے۔ فَانْتَظِرُوْٓا یعنی تم انتظار کرو یہ تہدید (ڈانٹ ڈپٹ) اور وعید ہے۔ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ بے شک میں بھی تمہارے ساتھ اپنے رب کے وعدہ کا انتظار کرنے والوں رہے ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

"(جب وہ عذاب آجائے گا) پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے بلاشبہ ایسا ہی ہوگا، یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم بچالیں گے اہل ایمان کو"۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی ہماری سنت میں سے ہے کہ جب ہم کسی قوم پر عذاب نازل کریں تو ان کے درمیان سے اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو نکال لیتے ہیں۔ اور ثُمَّ اس کا معنی ہے ثم اعلموا إنا ننجی رسلنا (پھر تم جان لو کہ ہم اپنے رسولوں کو بچالیں گے)

كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا یعنی ہم پر واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے اور اس کی خبر میں خلاف نہیں ہو سکتا۔ اور یعقوب نے ثُمَّ نُنَجِّيْ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی، حفص اور یعقوب نے ننجی المؤمنین کو مخفف پڑھا ہے اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں فصیح ہیں۔ انجی ینجی انجاء اور نجی ینجی تنجیۃ دونوں کا معنی ایک ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"فرمایئے اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو میرے دین کے بارے میں تو (سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان (بتوں) کی جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا، لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جو مارتا ہے تمہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں اہل ایمان سے"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ مراد کفار مکہ ہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ اگر تمہیں اس دین اسلام کے بارے میں کوئی شک ہو جس کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں۔ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو (سن لو) میں ان بتوں کی عبادت نہیں کرتا جو عقل اور سمجھ نہیں رکھتے جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ کے سوا۔ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں مارتا ہے اور تمہاری ارواح قبض کرتا ہے۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان اہل ایمان سے ہو جاؤں جو اپنے رب کی آیات کی تصدیق کرتے ہیں۔ (1)

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 203

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کر لے اس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے۔ اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے۔ اور اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہوگا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ، أن کا عطف ان اکون پر ہے یعنی مجھے کہا گیا ہے کہ مومنین سے ہو جا اور اپنا رخ سیدھا کر لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اور اپنا عمل سیدھا کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنا آپ سیدھا کر لے، یعنی اپنی توجہ اس پر مرکوز کر لے دین میں سے جس بارے آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ حَنِيْفًا یعنی ہر دین سے بچتے ہوئے سیدھا اس کی طرف کر لے (جس کا حکم دیا گیا ہے) حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

حمدت الله حين هدى فؤادی من الإشراك الدين الحنيف

میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جس وقت اس نے میرے دل کو شرک سے خالص دین کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔

اس کے مادہ اشتقاق کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے والحمد للہ۔ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی اور مجھے کہا گیا ہے: تو شرک نہ کر۔ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد غیر ہے۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَدْعُ یعنی تو عبادت نہ کر۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ اگر تو نے اس کی عبادت کی (تو وہ تجھے کوئی نفع نہ دے گا) وَ لَا يَضُرُّكَ اگر تو نے اس کی نافرمانی کی (تو وہ تجھے ضرر نہ دے سکے گا) فَاِنْ فَعَلْتَ یعنی اگر تو نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کی۔ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ تو بے شک تو عبادت کو تو اس کے غیر محل میں رکھنے والا ہو جائے گا۔ (1)

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے۔ اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لیے کسی بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو، سرفراز فرماتا ہے اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور وہی بہت مغفرت فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ یعنی اگر تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے۔ فَلَا كَاشِفَ یعنی کوئی دور کرنے والا نہیں۔ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ اس کو بجز اس کے اور اگر وہ تجھے آسودگی اور نعمت پہنچائے۔ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ تو کوئی رد کرنے والا نہیں ہر اس کو جس کا خیر و شر میں سے وہ ارادہ فرمائے۔ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ اور وہی اپنے بندوں کے گناہوں اور ان کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے الرَّحِيْمُ اور آخرت میں اپنے اولیاء کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔ (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 371 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 305

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾

''(اے حبیب!) فرمایئے اے لوگو! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے، تو جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ ہدایت قبول کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو وہ گمراہ ہوتا ہے اپنی تباہی کے لیے اور میں تم پر نگران نہیں ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ اس میں حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ یعنی جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور اس (دین) کے ساتھ ایمان لایا جو آپ لے کر آئے۔ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وہ اپنے نفس کی نجات اور خلاصی کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے۔ وَمَنْ ضَلَّ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور بتوں کی پیروی اور اتباع کی۔ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا تو بلا شبہ اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ یعنی میں تم پر محافظ و نگران نہیں ہوں کہ تمہارے اعمال کی نگرانی کروں بلاشبہ میں تو رسول اور پیغامبر ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آیۃ السیف نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

''اور (اے حبیب!) آپ پیروی کرتے رہیں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور (ظلم کفار پر) صبر کیجئے یہاں تک فیصلہ فرما دے اللہ، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے اطاعت کرنے پر اور معصیت سے بچنے پر صبر کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو جمع کیا اور آپ نے ان کے ساتھ کسی غیر کو جمع نہ کیا اور فرمایا: ''بے شک تم میرے بعد بلا استحقاق دوسروں کی فضیلت اور ترجیح کو پاؤ گے پس تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھے حوض پر آملو''۔ إنكم ستجدون بعدي أثرة فاصبروا حتى تلقوني على الحوض (2) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت ہے، پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس انہوں نے صبر نہ کیا تو آپ نے انہیں صبر کرنے کا حکم دیا جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ اس بارے میں عبد الرحمٰن بن حسان کہتے ہیں:

ألا أبلغ معاوية بن حرب أمير المومنين نثا كلامي
بأنا صابرون و منظروكم إلى يوم التغابن والخصام

حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ یہ مبتدا اور خبر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سوائے حق کے کوئی فیصلہ نہیں فرماتا۔

تمت ترجمہ سورۂ یونس

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف، حدیث نمبر 3986، ضیاء القرآن پبلی کیشنز